# جرمنی نامہ

حکیم محمد سعید دہلوی

# جرمنی نامہ

## ایک زندہ و تابندہ ملک کے سفر کی داستان

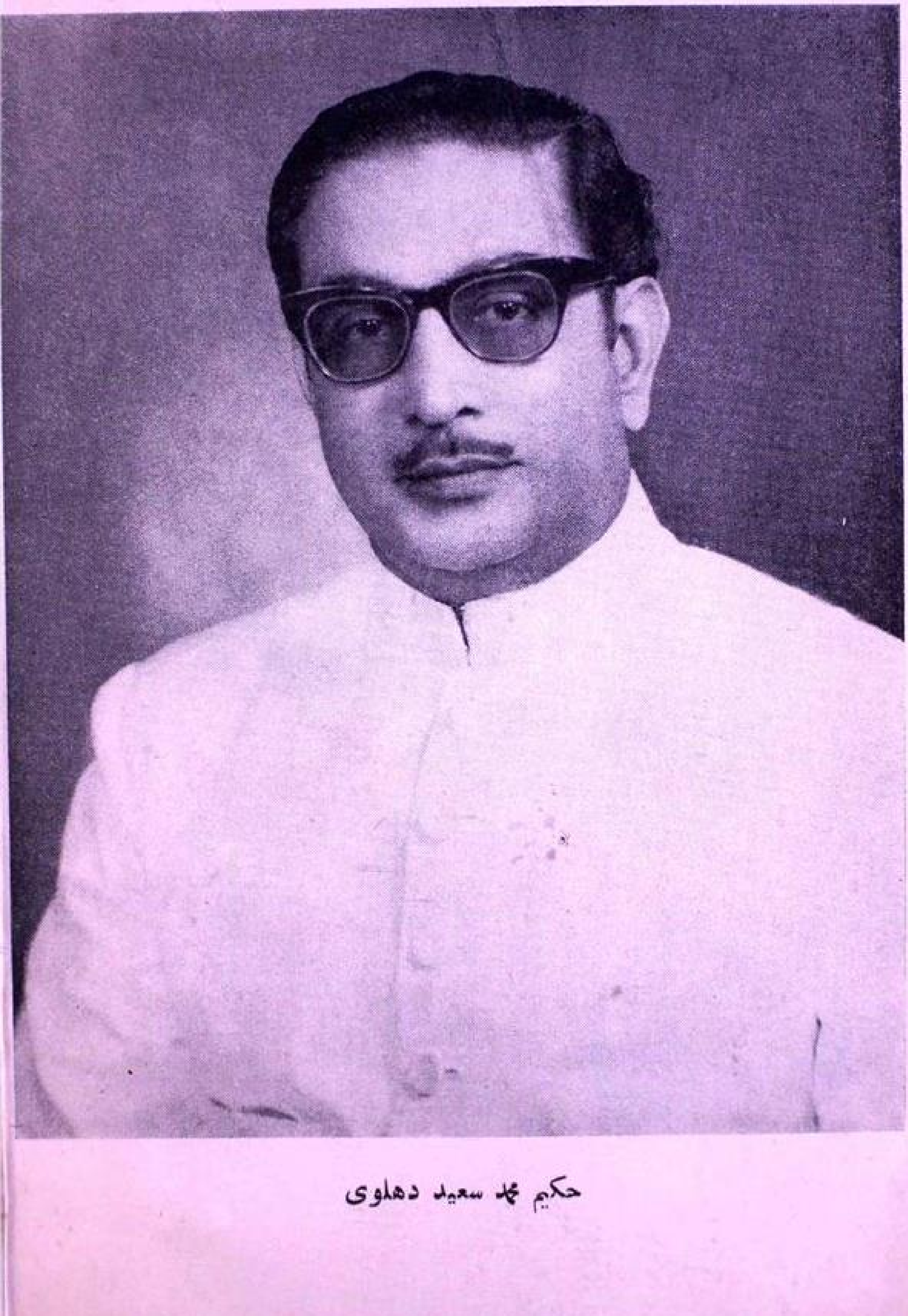
حکیم محمد سعید

مکتبۂ جدید

۴ - کوئنز روڈ - لاہور

جملہ حقوق محفوظ

| | | |
|---|---|---|
| بار اول | .... | مئی ۱۹۶۶ء |
| ناشر | ... | رشید احمد چودھری |
| طابع | ... | اشرف پریس ۔ لاہور |
| تصاویر و سرورق | ... | مکتبۂ جدید پریس ۔ لاہور |



حکیم محمد سعید دہلوی

# وَالدِ محترم

شہیدِ فنِ طب، ہمدردِ خلائق

# جناب حکیم حافظ عبدالمجید رح

# کے نام

جنھوں نے اپنی کتاب زندگی کے چالیسویں ورق پر
(۹ر جنوری ۱۹۲۰ء ش) میرے نقوش ابھارے اور
بیالیسویں ورق پر (۲۲ر جون ۱۹۲۲ء ش) حرفِ آخر
لکھ کر جنّت الفردوس میں حقیقی زندگی کا آغاز کردیا۔
ان بیالیس اوراق کے نقوش میں چھیالیس سال سے
رنگ بھر رہا ہوں۔

۹ر جنوری ۱۹۶۶ء ش

# فہرست

یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء ــــــ پیر



۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء ــــــ منگل

# پیش لفظ

(حکیم عبد الحمید دہلوی)

آج سے تقریباً نو سال پہلے جب کہ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کو بھی نو سال گزر چکے تھے، میں نے دہلی سے اور برادر عزیز حکیم حافظ محمد سعید نے کراچی سے رختِ سفر باندھا اور ہم دونوں بھائی یورپ کے چند ملکوں کی سیاحت کے لیے چل پڑے۔ یہ سفر جو دو ماہ پچیس دن بیس گھنٹے تیس منٹ میں ختم ہوا تھا، ہمارے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ منجملہ اور فائدوں کے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میاں سعید نے اس سفر کے حالات روزنامچے کی صورت میں لکھے جنھیں نظرِ ثانی اور اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ اس طرح وہ اب تک ایک چھوڑ دو سفرناموں کے مصنّف بن گئے اور جیسا کہ میں نے ان کے پہلے سفرنامے کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ "اگر ان کے روزنامچے کی وسعت اور آمد کا یہی حال رہا تو مغربی جرمنی، ہالینڈ، برطانیہ، فرانس، اسپین، یونان اور اٹلی بلکہ آخر میں دارالسلطنت ایران کے مختصر قیام کی سیاحت کے حالات ایسی ایسی کئی جلدوں میں آسکیں گے اور اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے وہ ممتاز ہوں گے" — تو میری یہ قیاس آرائی غلط ثابت نہیں ہوئی۔

پہلی جلد، جسے "یورپ نامہ" کے نام سے شائع کیا گیا ہے، ممالک، ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کے حالاتِ سفر پر مشتمل ہے لیکن پیشِ نظر سفرنامہ صرف جرمنی کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ اس ملک کی دیرینہ عظمت کا

اعجاز ہے یا اس کامرانی کا کرشمہ جو اس سرزمین کو ہٹلر کی ظاہری شکست کے رُوپ میں حاصل ہوئی تھی کہ نقشِ ثانی حقیقتاً نقشِ اوّل سے نہ صرف زبان و بیان کے اعتبار سے بلکہ ضخامت کے لحاظ سے بھی بڑھ گیا۔ ساڑھے پانچ سو سے زیادہ صفحات کے بعد یہ مناسب بھی نہیں تھا کہ لگلے کسی ایک شہر کو بھی اس میں ملایا جاتا۔ پہلے تو میرا محض قیاس تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ زورِ قلم کی رفتار یہی رہی تو سفرناموں کے سلسلے کی کڑیاں اور بڑھتی چلی جائیں گی۔

مَیں ان سفرناموں کی پہلی قسط ـــــ یورپ نامہ ـــــ میں لکھ چکا ہوں کہ ہماری اس مشترک سیاحت کے مقاصد کیا تھے۔ یہاں ان کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ تھے:

(۱) دوا سازی کے کارخانوں کو دیکھنا۔

(۲) دوا سازی کی مشینری بنانے والی فرموں سے تعلقات پیدا کرنا۔

(۳) فارمیسی کالجوں کو دیکھنا۔

(۴) تاریخِ طب کے اداروں کا معائنہ، ان کے کارناموں کا مطالعہ اور ان کا لٹریچر حاصل کرنا۔

(۵) قدرتی علاج کے اداروں کو دیکھنا اور سمجھنا۔

(۶) نفسیاتی علاج کے کلینک دیکھنا۔

(۷) لائبریریوں اور کتب فروشوں سے قدیم طبی کتابوں کی فہرستیں حاصل کرنا۔

(۸) عوامی صحت کے اداروں کی معلومات حاصل کرنا۔

(۹) صحتِ اطفال کے مراکز کو دیکھنا اور ان کے طریقۂ عمل کو سمجھنا۔

(۱۰) اسلامی مطالعے اور تحقیق کے مرکزوں کو جہاں یہ موجود ہیں، دیکھنا۔

ان میں سے بعض مقاصد پہلے چار ملکوں میں پورے ہو گئے تھے اور بعض نہیں

ہوئے تھے لیکن جرمنی ایسا ہمہ گیر ملک ہے کہ دو حصّوں میں کٹ جانے کے باوجود اپنے وسیع دامن میں وہ سب کچھ سمیٹے ہوئے ہے جسے دیکھنے اور سمجھنے کے ہم خواہاں تھے۔ بالفاظِ دیگر ہم صرف مغربی جرمنی جاتے اور کسی دوسرے ملک کا رُخ نہ کرتے، تب بھی ہمارے مقاصد کی تکمیل ہو جاتی۔ مثال کے طور پر معدنی اثرات رکھنے والے گرم چشموں کے پانی سے جو قدرتی علاج وہاں کیے جاتے ہیں، وہ ہمارے سلسلۂ سفر کی ابتدائی چار کڑیوں میں ناپید تھے اور شاید ان کی مثال کہیں اور نہ مل سکے۔ جرمنی میں اس قدرتی دولت سے اس درجہ فائدہ اٹھایا گیا ہے کہ اس کا نظام قائم کرنے والوں کو داد دینی پڑتی ہے۔ یہ چشمے ہماری توجہ کا خاص مرکز رہے تھے۔ میاں سعید نے ان پر گہری نظر ڈال کر سیر حاصل بحث کی ہے۔

جرمنی میں دَوا سازی کے کارخانوں اور دَوا سازی کی مشینری بنانے والی فرموں کی بھی بہتات ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے ہر لحاظ سے ان کا مطالعہ کیا اور تعلقات استوار کیے۔ اگر یہ سفرنامہ روزنامچے کی صورت میں نہ ہوتا تو میاں سعید یہ ضرور بتلاتے کہ ہم نے وطن واپس آنے کے بعد ان اداروں کے ساتھ اپنے تعلقات کو کیوں کر فروغ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نو سال کی طویل مدّت میں ہماری ترقی کی بہت سی اسکیمیں اسی سفر کے مشاہدات و معلومات کے نتائج کی رہینِ منّت ہیں۔

ان نو سال میں سیاسی حالات میں بھی ہر جگہ بڑی تیزی کے ساتھ تغیرات رُونما ہوئے ہیں۔ جرمنی میں تبدیلیوں کی رفتار تیز تر رہی ہے، کیوں کہ اس کی مثال تو اس مظلوم کی سی تھی جو شدید صدمات سہہ کر اپنے حواس عارضی طور پر کھو بیٹھا ہو اور موقع ملتے ہی ہوش میں آگیا ہو۔ اس نے اپنے حالات سنوارنے اور پنپنے کی جو مثال قائم کی ہے، وہ ایسا ریکارڈ ہے جو مشکل سے ٹوٹ سکے گا۔ ہر ملک کی طرح وہاں کے اربابِ حل و عقد میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں لیکن ہر تبدیلی پُرامن رہی۔ بعض اور ملکوں

کی طرح انقلاب آفریں نہیں کہی جا سکتی۔ اس سے ملک کی سالمیت اور استحکام کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس قوم میں نامساعد حالات کے تحت بھی ترقی کرنے کی امنگ، جذبے اور صلاحیت و استعداد کی فراوانی پائی جاتی ہے انھی باتوں کے وجود و عدم سے قوموں کے عروج و زوال کا پتہ چلتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم نے اہلِ جرمنی کی کمر جس بُری طرح توڑی تھی، اس کے پیشِ نظر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ یہ قوم اس قدر جلد اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی۔ نہ صرف اپنا مستقبل سنوار لے گی بلکہ دوسری ترقی پذیر قوموں کے لیے بھی اس کا دستِ تعاون دراز ہو جائیگا۔

پچھلے آٹھ نو سال میں حکومتِ جرمنی نے جتنے ملکوں کو جتنی کثیر مقدار میں مالی امداد دی ہے، اس کا تصور ہوش رُبا ہے۔ اس نے اپنی روایتی شان برقرار رکھی۔ عالمگیر لڑائی کی بساطِ سیاست کا یہ پٹا ہوا مہرہ ایک ایسا پیدل تھا جو آگے بڑھ کر آخری خانے تک پہنچ کر فرزیں بن گیا، جس کی چال ہر طرف ہر خانے میں ممکن ہوتی ہے۔ اس کی اقتصادی جادوگری نے ایک بار پھر شاطرانِ یورپ کو اچنبھے میں ڈال دیا ہے۔ اس نے جو راہیں معیّن کی ہیں وہ اس لائق ہیں کہ ہم جیسے پس ماندہ ملک جنھیں استعماریت پسند قومیں جان بوجھ کر پس ماندہ چھوڑ گئی ہیں سبق حاصل کریں اور ان بنیادوں پر اپنی عمارات کھڑی کریں تاکہ اس ایٹمی دور میں پوری طرح ابھرنے کا موقع مل جائے۔

مطلب اس تحریر کا یہ ہے کہ جرمنی نامہ کو عام سفر نامے کی طرح محض تفریحِ طبع کا ذریعہ نہ سمجھا جائے، بلکہ بیانیہ واقعات کے پس منظر میں جو روحِ عمل ایمائی انداز میں کارفرما دکھائی گئی ہے، اس سے سبق حاصل کیا جائے جو صاحبِ تحریر کا اصل مقصد ہے۔

اِس جرمنی نامے میں اور اس کے ماسبق یورپ نامے میں ایک یہ نمایاں

فرق قارئین محسوس کریں گے کہ یورپ کے ابتدائی چار ملکوں، خصوصاً سوئٹزرلینڈ کی سیاحت کے وقت ہم دونوں بھائی قدرتی مناظر سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ان کا لطف بھی اٹھایا۔ جرمنی میں اس اعتبار سے کسی قدر مایوسی ہوئی کیونکہ ہمارے راہ نامے میں جو علاقے شامل ہوئے، وہ خالص شہری حصّے تھے اور شہر بھی وہ جو مسمار ہو کر دوبارہ بنے تھے۔ میں نے یورپ نامے کے پیشِ لفظ میں اشارۃً لکھا تھا کہ "معلوماتِ عامّہ کے باب میں بھی یورپ نامہ دل چسپ ہے۔ سائٹ سیئنگ کے نتیجے کے طور پر ان کو دل چسپ ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہونا چاہیے۔ مسافروں نے سائٹ سیئنگ کا حق بھی، جہاں تک ان سے ہو سکا ہے، ادا کیا ہے۔" یہ لطف جرمنی میں اس حد تک حاصل نہ ہو سکا۔ تاہم دوسری غیر معمولی باتوں نے اس کمی کو محسوس نہ ہونے دیا، خصوصاً گرم پانی کے چشمے جو قدرت ہی کا بیش بہا عطیہ ہیں، مناظرِ قدرت کا نعم البدل بن گئے۔

ہم دونوں بھائی نہ سیاسی آدمی ہیں، نہ کبھی عملی سیاست میں حصّہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ آج افلاطون کا زمانہ نہیں ہے کہ جب سیاست چند ہستیوں کے لیے مخصوص ہوا کرتی تھی اور عوام اسے شجرِ ممنوعہ سمجھتے تھے۔ اب تو یہ روزمرّہ کی چیزوں میں اس طرح رس بس گئی ہے کہ اس سے فرار ممکن نہیں۔ عام استعمال کی چیزوں کے نرخ سے لے کر رموزِ مملکت تک وہ ہر چیز پر چھائی رہتی ہے۔ اِس لیے جرمنی نامے کے مصنّف براہِ راست نہ سہی بالواسطہ اس موضوع سے، جو متعدّی مرض سے کسی طرح کم نہیں ہے، اپنا دامن نہ بچا سکے۔ خاص طور پر انھوں نے ہر ہٹلر کے کردار کو اعلا سیاست کی کسوٹی پر پرکھا اور اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔ ہر شخص کو ذاتی رائے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس پر کسی کو چیں بہ جبیں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹھنڈے دل سے سب پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت

ہے۔ چڑھتے سورج کی پرستش تو سبھی کرتے ہیں، ڈوبتے تاروں کی ضیا کا لطفِ نظارہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اِس تضاد کو ایک ایسے مُعالج کی حسیّات میں اعلا مقام حاصل ہے جو مریض کی ڈوبتی نبضوں کو بھی ٹٹول کر ان میں زندگی کی لہر محسوس کرتا اور اسے قابلِ غور سمجھتا ہے۔ سوال صرف یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر ہٹلر اپنے عزائم میں کامیاب ہو جاتا تو کیا دنیا آج بھی اسے ظالم اور وحشی جیسے ناموں سے یاد کرنے کی جرأت کر سکتی تھی؟

جرمنی نامہ، یورپ نامے کی اشاعت کے تقریبًا پانچ سال بعد کتابی صورت میں آیا ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو میاں سعید اپنے سفرنامے کی آخری جلد بڑھاپے کی منزل میں پہنچنے تک پوری کر سکیں گے۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔ یہ مفید کام تو بہر نوع پایۂ تکمیل کو پہنچنا ہی ہے۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۶۵ء

عبدُالحمید

۱۸ ستمبر ۱۹۵۶ء ــــــ منگل

# بازل سے ہائیڈل برگ

سوئزرلینڈ کو خیرباد کہتے ہوئے ہمیں واقعی کچھ دکھ سا ہوا، خصوصاً اس لیے کہ ہم نے پوری طرح سیر ہو کر اس کی سیر نہیں کی۔ پروگرام اتنا نپا تلا تھا کہ ہم اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے تھے۔ اتنی قلیل رات میں یہاں کی صحت بخش فضا کا معقول اثر بھی ہم پر نہیں پڑ سکتا تھا۔ بہت سے لوگ دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں اس سرزمین پر رہنے آتے اور تر و تازہ بلکہ تنومند ہو کر لوٹتے ہیں۔ ہم ۷ ستمبر ۱۹۵۶ء کی رات کو پونے دس بجے بذریعہ ریل ویانا سے زیورخ پہنچے تھے اور ۱۷ ستمبر کی رات تک اس ملک میں رہے۔ اس دوران میں زیورخ کے علاوہ گرنڈل والڈ، جنیوا، برن اور بازل میں نہایت مصروفیت کے دن گزارے[1]۔ ایسی صورت میں صحت بہتر ہونے کے بجائے کچھ بگڑ ہی جاتی ہے۔ تاہم میں اور بھائی جان محترم حکیم حاجی عبدالحمید صاحب جس مقصد سے آئے تھے وہ پورا ہو گیا اور زیادہ خوشی اسی بات کی تھی۔ اب ہماری منزلِ سفر ہٹلر کی سرزمین ہے جسے عرفِ عام میں جرمنی کہا جاتا ہے۔

**یہ دن اور یہ تاریخ:**۔ آج منگل ہے اور ستمبر کی اٹھارہ تاریخ۔ منگل کو جرمن زبان میں "دینز ٹاگ" کہتے ہیں اور عقائد کے لحاظ سے نہ اسے منحوس دن سمجھا جاتا ہے اور نہ بھاگوان جس طرح انگریزی زبان میں ہر دن کے نام کے ساتھ "ڈے" یا ہندی زبان میں "وار" یا فارسی میں اکثر دنوں کے نام کے ساتھ "شنبہ" لاحقے کے طور پر لگتا ہے، اسی طرح جرمن زبان میں "ٹاگ" استعمال ہوتا ہے۔ صرف بدھ کا دن اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے۔ بدھ کو "مٹ ووخ" کہتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی ہوئے "ہفتے کا درمیانی دن" یعنی اتوار، پیر اور منگل ایک طرف اور

---

[1] ملاحظہ ہو "یورپ نامہ" جلد اول۔ صفحات ۱۷۲ تا ۲۶۸

جمعرات، جمعہ اور ہفتہ دوسری طرف اور بیچ میں بدھ۔ اس طرح یہ ہفتے کا درمیانی دن ہوا۔

ہفتہ (دن) کو جنوبی جرمنی میں "زمس ٹاک" اور باقی علاقوں میں "زون آبنٹ" کہتے ہیں جس کے لفظی معنی ہوئے "اتوار کی رات" بالکل اسی طرح جیسے ہماری زبان میں جمعہ سے پہلے کے دن کو جمعرات کہا جاتا ہے۔ زون آبنٹ یعنی ہفتے کے بعد اتوار کو زون ٹاک عام قاعدے کے مطابق کہا جاتا ہے۔

انگریزی زبان میں دنوں کا ستاروں کے ناموں سے تعلق قائم کیا گیا ہے۔ مثلاً پیر کو "منڈے" کہتے ہیں جو مون ڈے" (چاند والے دن) سے بنا ہے۔ جرمن زبان میں بھی پیر کو "مون ٹاک" کہتے ہیں۔

بیشتر اعداد بھی ایک اصول کے مطابق ہیں۔ اکثر زبانوں میں ایک سے دس تک کے ہندسے کسی اصول کے مطابق نہیں ہوتے۔ جرمن زبان میں بھی یہی صورت ہے۔ البتہ اس کے بعد قاعدہ چلتا ہے۔ دس کو "تسین" کہتے ہیں۔ پھر گیارہ بارہ کو چھوڑ کر انیس تک باقی ہندسے تسین کے لاحقے کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً اٹھارہ کو "آخٹ تسین" کہتے ہیں۔ صرف آٹھ کو "آخٹ" کہا جاتا ہے۔ (لفظ تسین میں حرف ت کی آواز بہت ہی خفیف ہوتی ہے اور جہاں بھی س سے پہلے ت آئے گا، اس کی آواز ہلکی ہو گی۔ ہماری زبان میں اس کی مثال امرتسر سے دی جا سکتی ہے۔ اس لفظ میں ت کی آواز بہت ضعیف لہجے میں ادا کی جاتی ہے)۔

چوں کہ ہمیں اٹھارہ ستمبر کو منگل کے دن جرمنی کی سرحد میں قدم رکھنا تھا، اس لیے محض ذاتی دل چسپی کی غرض سے اِنی تحقیقات پہلے سے کر لینی مناسب سمجھی گئی۔ علاوہ ازیں عام بول چال کے چند اور جملے بھی یاد کر لیے تاکہ وقتِ ضرورت کام آسکیں۔

**غائبانہ تعارف** : جیسا کہ میں "یورپ نامہ" کی پہلی جلد میں کسی جگہ لکھ چکا ہوں، ہم دونوں بھائیوں نے عزمِ سفر کرنے سے پہلے ہی ان ملکوں سے متعلق، جن کی سیاحت ہمیں کرنی تھی، کچھ کتابچے اور پمفلٹ وغیرہ جمع کر لیے تھے اور ان پر سرسری نظر ڈال لی تھی تاکہ ہلکا سا اندازہ ہر نئی سرزمین کے بارے میں ہو جائے۔ البتہ جرمنی کا جہاں تک تعلق ہے، ایک کرم فرمانے، جو کافی عرصے جرمنی میں رہ چکے تھے اور اس ملک سے بخوبی واقف ہیں، بلکہ ان کے بڑے مداح ہیں "منہ زبانی" ہماری معلومات میں بڑا اضافہ کرنا چاہا یا یوں کہیے کہ اس قوم سے غائبانہ تعارف کرا دینے کی کوشش کی۔ ان کی گفتگو سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ وہ اس ملک میں امریکیوں،

انگریزوں اور فرانسیسیوں کے وجود کو اور اس سے قبل ان کے مکمل اقتدار کو بُرا سمجھتے رہے تھے۔ لیکن ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ ان کی توجہ سے ہماری معلومات میں کوئی اضافہ ہوا یا نہیں۔

انھوں نے کہا، مشکل یہ ہے کہ اہل جرمنی کی بڑی خوبی پر بھی اعتراض ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اس کی تضحیک کی جاتی ہے اور اس کے برعکس ان کی کوتاہیوں، کمزوریوں اور برائیوں کو سراہا جاتا، بلکہ ان کو بیان کر کر کے ان کی تعریف کے پُل باندھے جاتے ہیں۔ مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اخلاقی پستی کا شکار ہو جائیں۔ لیکن جرمن بدھو نہیں ہیں وہ امریکیوں کے دلی منشا کے خلاف ہر سنجیدہ بات پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں۔

عام طور پر انگریزوں کی اس اعتبار سے تعریف کی جاتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف خندہ پیشانی سے کر لیتے ہیں اور جرمنوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ہر قول و فعل کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ہمارے دوست کا کہنا ہے کہ یہ حقیقت نہیں ہے لیکن حقیقت سے کچھ زیادہ دُور بھی نہیں ہے۔

قلیل وقفے سے ظہور میں آنے والی دو بڑی لڑائیوں نے اہل جرمنی کو بڑا محتاط بنا دیا ہے۔ اس قوم کے عوام بھی ہر کام کو ضرورت سے زیادہ سوچ سمجھ کر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دُور رس منصوبہ سب کے دلوں میں چھُپا ہوا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ انگریز اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کس بات کو غلطی سے تعبیر کیا جائے اور کسے نہیں۔ بنیادی نکتہ تو یہی ہے۔ اعتراف کرنے یا نہ کرنے کی منزل بعد میں آتی ہے۔

جرمنوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ امریکیوں سے زیادہ اور انگریزوں سے اور بھی زیادہ باقاعدگی پسند ہیں۔ اور ان کی اس خوبی کو بھی ان کی ایک بُرائی سمجھا جاتا ہے۔ کینیڈا کے مشہور مزاح نگار اسٹیفن لی کاک نے اپنے کسی مضمون میں لکھا ہے کہ جرمنی میں جب طیورِ آوارہ ذرا دیر سستانے کے لیے کسی شاخ پر بیٹھتے ہیں تو بڑی نفاست پسندی کے ساتھ ایک خاص ترتیب میں صف بناتے ہیں اور جب مل کر گاتے ہیں تو صحیح ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے پہلے سے ایک ہدایت کار چن لیتے ہیں۔ معلوم نہیں اس بیان کو محض مبالغہ آمیز

مزاح سمجھا جائے یا طنز۔ طنز کے لیے کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔

جرمنوں پر طنز کرنے والے ایک اور مصنف نے لکھا ہے — اگر آپ جرمن بننا چاہتے ہیں تو ضروری نہیں ہےکہ آپ کوئی طیوطانی دیوتا ہوں، یا آپ کا قد چھے فیٹ لمبا ہو، سینہ چوڑا چکلا ہو، رنگ گورا ہو، آنکھیں نیلی ہوں اور چہرے سے تقدس ظاہر ہوتا ہو۔ اگر آپ اس طرح ہنسنے کے عادی ہیں جیسے دریائے رہائن کے کنارے کلیساؤں کی گھنٹیاں ایک افسانوی ترنم کے ساتھ بجتی ہیں، تو یہ اچھی بات ہے اور اگر ہنسی حد سے تجاوز کرکے ایک قہقہہ بن جائے جس سے پیٹ میں مروڑ کی کیفیت پیدا ہونے لگے تو اس کا بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر آپ ان کے قومی ہیرو سیگفریڈ کی طرح بہادر اور ساتھ ہی ساتھ کینہ پرور ہیں تو یہ ایک خوبی ہو سکتی ہے، لیکن اگر آپ بزدل اور منکسر المزاج ہیں، تب بھی کام چل جائے گا۔ اگر آپ بی بے لنگن لیٹ کے سوداؤں کی طرح قوی ہیکل ہیں تو یہ ہمیشہ کے لیے آپ کی عمدہ صحت کی ضمانت ہے لیکن اگر آپ کی گردن اتنی دبیز ہے کہ شانوں کے درمیان اس کے نقطہ عروج کا صحیح اندازہ نہ ہو سکتا ہو اور سر جھکا کر بیٹھنے کی صورت میں آپ کی اصل ٹھوڑی کے نیچے دو اور مصنوعی ٹھوڑیاں بن جائیں تو آپ کے لیے حقوقِ قومیت مل جانے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ بس آپ جائیے اور فوراً اپنے بال ترشوا لیجیے، لیکن انگریزوں کی طرح نہیں کہ صرف گدّی کا نچلا سرا صاف ہو بلکہ گدّی کے علاوہ چندیا تک سے "فارغ البال" ہو جائیے۔ صرف پیشانی کی بالائی حد پر بالوں کی ایک لہر اس طرح نظر آئے جیسے کسی جوان گھوڑے کی ایال اس کی گردن پر اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ پھر لباس بدلیے بالکل شکاریوں کی طرح لیکن شکار کھیلنے کبھی نہ جائیے بلکہ اکڑتے ہوئے کسی شہر یا گاؤں میں چلے جائیے، شہر والے آپ کو دہقانی سمجھیں گے اور گاؤں والے شہری۔ اور یہی اس بات کی علامت ہوگی کہ آپ ہر لحاظ سے جرمن بن گئے ہیں۔ اس کے بعد جب کسی سے بات چیت کا موقع ملے تو لب و لہجے کو نرم بنائیں اور ایسا ہی انداز اختیار رکھیں جو غیر ملکی سفیروں کو اپنے فرائض منصبی انجام دیتے وقت اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جب بھی کسی کو مخاطب کریں، خواہ یہ موقع ایک دن میں دو سو چھتیس بار آئے، ہمیشہ اس کے نام سے پہلے لفظ "ہر" شامل کریں جو عزت مآب اور عالی جناب کے مترادف ہے۔ خواہ ذکر کسی متوفی کا ہو، یہ طرۂ امتیاز ہر حال میں استعمال کیا جائے۔ آپ کروڑ پتی ہوں یا قلاش، آپ کا لباس عمدہ اور صاف ستھرا رہے گا، فرانسیسیوں کی طرح نہیں جو لذیذ خوراک کھانے اور بہترین شراب پینے پر بہت رقم ضائع کر دیتے ہیں اور اچھے لباس کی مطلق پروا نہیں کرتے۔ جرمن وہ ہے جو بھوکا سونا اور بھوکا

اٹھنا گوارا کرے گا لیکن لباس کی نفاست میں فرق نہ آنے دے گا۔ یہ اس قوم کا کردار ہے جو لیسے فقیر کو بھیک بھی نہیں دیتی جس کا لباس درست نہ ہو —— اور جب آپ کو کسی سے بات چیت کا موقع ملے تو باتیں بالکل واضح اور متین ہوں، ان کو بھی ثبوت اور دلائل کے ساتھ بیان کیجیے لیکن یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ آپ کا مخاطب بدھو اور گھا مڑ ہے۔ گفتگو کے دوران میں حسبِ ضرورت اور کبھی بلاضرورت بھی اصل زبان میں یونانی ادیبوں اور مفکروں کے اقوالِ زریں بالکل نقل کرنے کے انداز میں اس طرح زبان پر لایئے گویا آپ ان سے پوری طرح متفق ہیں خواہ ان کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ آپ کے برتاؤ میں بزرگانہ شفقت کا رنگ پایا جائے قطع نظر اس سے کہ آپ کا مخاطب آپ سے عمر میں بڑا ہے یا چھوٹا۔

ان سب باتوں پر غور کیا جائے تو حیرت سے سوچنا پڑتا ہے کہ یہ جرمنوں کی تعریف کی جا رہی ہے یا منشا ان کی تضحیک کرنا ہے۔

**روانگی:** بازل سے ہماری ٹرین ٹھیک دس بج کر پندرہ منٹ پر روانہ ہوئی۔ جرمنی کی سرحد یہاں سے کچھ دور نہیں ہے اور اگر دور ہو بھی تو قابلِ ذکر نہیں کیوں کہ برق رفتار ذرائع حمل ونقل کی موجودگی میں طویل مسافت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بس گاڑی کے پہیے کھسکنے کی دیر ہوتی ہے، فوراً حرکت ہوئی اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ گئے۔

جنوبی امریکا میں ایک مقام ایسا ہے جسے بین الاقوامی نوعیت حاصل ہے۔ جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے اسے عرفِ عام میں "بول پی برا" کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس علاقے کو تین ملکوں یعنی بولیویا، پیرو اور برازیل نے گھیر رکھا ہے۔ اگرچہ قبضہ واقتدار کے لحاظ سے اسے برازیل کا حصہ کہنا چاہیے لیکن عملی طور پر وہ بالکل آزاد ہے۔ وہاں کسی بھی ملک کا قانون نہیں چلتا۔ مگر اس فقدانِ قانون کے باوجود وہاں کوئی ایسی بات عمل میں نہیں آتی جس پر کسی قسم کا قانون عائد ہو سکے یا جسے قانونی، اخلاقی، معاشرتی یا مذہبی اعتبار سے برا کہا جا سکے۔ بازل کو بھی اس لحاظ سے بین الاقوامی نوعیت دی جا سکتی ہے۔ وہاں تین ملکوں یعنی جرمنی، فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحدیں کچھ اسی انداز میں ملتی ہیں۔ تاہم یہ سوئٹزرلینڈ کا حصہ ہے اور اسی ملک کا قانون وہاں رائج ہے۔

جب میں نے سینڈوز (بازل میں دنیا کی مشہور دوا ساز کمپنی) کی چھت پر کھڑے ہو کر آس پاس کا جائزہ دیا تو پتہ چلا کہ فرانس کا علاقہ بالکل سامنے ہے یعنی اتنا سامنے ہے کہ

سینڈونگ دیوار سے بیس فیٹ دور فرانس کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ یہی حال جرمنی کی سرحد کا ہے۔ بالکل سامنے ایک اونچا اور بڑا پہاڑ دکھائی دیا۔ بس اسی کے پیچھے جرمنی شروع ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر تینوں ملکوں کی سرحدیں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔

جرمنی کے اس علاقے میں بجلی کی ریل گاڑیاں نہیں ہیں۔ اسی لیے تو ہماری ریل کو دھوئیں والا انجن کھینچے لیے جا رہا ہے۔ وہی سیٹی، وہی چھک چھک کی آواز جس سے کان بچپن سے آشنا ہیں، یہاں بھی سنی گئی۔ دھوئیں کا غبار نکلتے دیکھا اور کوئلے کے ریزے آنکھوں میں پڑتے پڑتے رہ گئے۔ تاہم ریل کے آرام دہ ہونے کا وہی حال ہے جو سوئزرلینڈ یا آسٹریا کی ریلوں میں محسوس ہوا تھا۔ کوئی کمی نہیں ہے بلکہ نظم و نسق بھی ہر دو جگہ یکساں ہی ہے۔

اگر ہمارے پروگرام میں جو جرمنی کے لیے مرتب ہوا تھا، میونک جانا شامل ہوتا تو ہم دوسری گاڑی میں بیٹھتے جو فرانس کی سرحد کے ساتھ ساتھ جانب شمال بل کھا کر چلنے کے بجائے جانب شرق دوسرا راستہ اختیار کرتی اور جھیل کونسٹنس کے شمالی ساحل کو، کیوں کہ اس کے جنوبی ساحل پر سوئزرلینڈ ہے، دور سے چومتی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کو اپنی تپش سے گرماتی، بویریا کے علاقے میں داخل ہو جاتی۔ اس وقت پاسپورٹ، ویزا اور کسٹم کے اعتبار سے ہمارا اور ہمارے سامان کا چیکنگ والڈشٹ کے مقام پر ہوتا۔

جس طرح چوہے کے بل میں داخل ہونے کے بہت سے راستے ہوتے ہیں، اسی طرح فضائی اور بحری راستوں سے قطع نظر بری اور خصوصاً ریل کے ذریعے پڑوسی ملکوں سے جرمنی میں داخل ہونے کے بہت سے "آہنی" راستے ہیں۔ میں نے بین الاقوامی نظام نامہ اوقات پر نظر ڈالی اور اندازہ لگایا کہ چیکوسلواکیہ سے ایک، آسٹریا سے چھے، سوئزرلینڈ سے دو، فرانس سے تین، لکسمبرگ اور ڈنمارک سے ایک ایک اور نیدرلینڈ سے چار مقامات پر ریل کے ذریعے اس ملک میں داخل ہونا ممکن ہے۔ دوسری گاڑیوں کے اور پیدل کے راستے ان کے علاوہ ہیں۔ نیز فضائی اعتبار سے جہاز راں کمپنیوں اور ان کے جہازوں کا حساب و شمار مشکل ہے کیوں کہ جرمنی کے کئی ہوائی مستقر بین الاقوامی نوعیت کے ہیں جہاں رات دن بے گنتی جہاز اترتے چڑھتے رہتے ہیں۔

ان بہت سے راستوں کو مدنظر رکھ کر سوچا جائے تو یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ آج جب کہ متعدد سیاسی اور قانونی پابندیاں عائد ہیں اور جرمنی میں داخل ہونے کے اتنے

راستے موجود ہیں تو اب سے ہزار سال پہلے جب کہ سرحدوں کا تعین اور ان کی نگہداشت کا کوئی خاص نظام نہیں تھا، نہ پاسپورٹ کا رواج تھا اور نہ ویزا سسٹم کا نفاذ، تو کتنی تعداد میں لوگ اس ملک کی سرحدوں کو عبور کرتے ہوں گے۔ آس پاس کے کتنے فرمانرواؤں کی حریص نظریں بدنیتی کے ساتھ اس پر پڑتی ہوں گی۔ اور خود اس کے حاکموں کی جولانگاہ کے ڈانڈے کن کن ملکوں سے جاملتے ہوں گے۔

ہل ویتیا ایکسپریس :- ہم بازل سے جس گاڑی میں سوار ہوئے وہ ہل ویتیا ایکسپریس کہلاتی ہے۔ ہل ویتیا سوئٹزرلینڈ کا قدیم نام ہے جو اسی جنگ جو قبیلے کے نام کی یاد دلاتا ہے۔ جس نے تہذیب اور شائستگی کے دور سے بھی صدیوں پہلے اس زمانے میں جسے لوہے کا زمانہ کہا جاتا ہے، پہلے پہل اس سرزمین کو اپنا وطن بنایا تھا (ملاحظہ ہو یورپ نامہ حصہ اول صفحہ ۲۷)

ہل ویتیا ایکسپریس کو ہمارے ملک کی چناب ایکسپریس کہنا چاہیئے۔ اکثر مقامات پر ٹھیرتی لیکن خاصی تیز چلتی ہے۔ وہ زیورخ سے فرینکفرٹ تک آتی جاتی ہے۔ یعنی بازل اُس کے لیے ایک درمیانی اسٹیشن ہے۔ اکثر لوگ زیورخ سے ٹکٹ خریدتے اور بازل تک سوئٹزرلینڈ کا علاقہ طے کرکے جرمنی میں داخل ہوتے اور منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایک ہی ٹکٹ دونوں ملکوں میں کام دیتا ہے۔ سرحد پہ بدلنے یا نیا ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وسط یورپ میں چلنے والی اکثر گاڑیاں ایسی ہیں جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچتی اور بعض صورتوں میں دوسرے ملک کو عبور کرکے تیسرے میں پہنچ جاتی ہیں۔ بعض ریل گاڑیوں کے محض نام سے پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ کس ملک سے چلی ہیں اور کہاں تک جائیں گی۔ مثلاً پیرس روہر ایکسپریس، ہالینڈ اٹلی ایکسپریس وغیرہ۔ لیکن اکثر کے نام اس انداز کے نہیں بھی ہیں حالاں کہ وہ دو ملکوں کے درمیان چلتی ہیں۔ مثلاً اورینٹ ایکسپریس، جو پیرس سے چلتی اور راسٹرزرٹ گارٹ ہوتی ہوئی میونخ پہنچ جاتی ہے۔

کراچی اور حیدرآباد یا لاہور اور راولپنڈی کے درمیان تھوڑے فاصلے کی گاڑیوں کی طرح جرمنی میں بھی بعض گاڑیاں ایک شہر سے دوسرے شہر تک جاتی اور پھر لوٹ جاتی ہیں۔ چند گاڑیاں سرحدی اسٹیشنوں سے بھی شروع ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ہم ہل ویتیا ایکسپریس میں نہ بیٹھتے تو گومسٹ میں بیٹھ سکتے تھے جو بازل سے فرینکفرٹ ہوتی ہوئی ہیمبرگ تک جاتی ہے۔

اس کی رفتار زیادہ ہے۔ اسے مغربی پاکستان کی تیز گام کہنا چاہیے۔ ہر گاڑی میں تین درجے ہوتے ہیں لیکن تیسرا درجہ بھی تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ عموماً لوگ اپنی نشست بک کرا لیتے ہیں تاکہ دقت نہ ہو۔ ایسی گاڑیوں میں جو دن ہی دن میں اپنا سفر کریں، صرف بیٹھنے کا انتظام ہوتا ہے۔ رات کے وقت چلنے والی گاڑیوں میں سونے کے لیے برتھ ہوتے ہیں۔ ان کا معاوضہ عام کرائے کے علاوہ لیا جاتا ہے۔ چار سال تک کے بچے کا کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا لیکن اسے سیٹ بھی نہیں ملتی۔ البتہ رات کی گاڑی ہو تو کرایہ ادا کر کے اس کے لیے برتھ بک کرایا جا سکتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے بعض بڑے شہروں میں یہ عام رواج ہے کہ اتوار کے دن صبح سے شام تک کام آنے والا بس کا ایک ٹکٹ خرید لیا اور جس گاڑی میں چاہا بیٹھ گئے۔ عموماً نووارد یا ایسے لوگ جنھیں اپنے کام کاج کے سلسلے میں دن بھر گھومتے رہنا پڑتا ہے، ایسے ٹکٹ ضرور خریدتے اور دن بھر مزے کرتے ہیں۔ جرمنی میں ریلوں کے ہفتہ وار اور ماہانہ ٹکٹ خریدے جا سکتے ہیں۔ انھیں خریدنے والا ہر وقت ہر ایک گاڑی سے سفر کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اگر مجھے فرصت ہوتی اور ایک مہینہ جم کر جرمنی میں رہ سکتا تو ایسا ٹکٹ ضرور خریدتا اور سارے ملک کی سیر کر ڈالتا۔ جب ایک لائن پر سفر کرتے کرتے طبیعت اکتا جاتی تو اپنا سامان کسی اور لائن کی گاڑی میں منتقل کرا لیتا۔

یہ حقیقت ہے کہ یہاں کی ریل گاڑیوں میں درجہ اول تو کیا درجہ دوم کے ڈبوں میں بھی اتنی آسائش ہوتی ہے کہ بعض گھروں کے ڈرائنگ روم میں بھی وہ بات میسر نہیں آسکتی۔ پورے ایک مہینے کے لیے درجہ اول کے ٹکٹ کی قیمت پاکستانی روپے میں تقریباً ساڑھے چھ سو روپے، درجہ دوم کے ٹکٹ کی قیمت سوا چار سو روپے اور درجہ سوم کے ٹکٹ کی قیمت سوا تین سو روپے ہوتی ہے۔ ان ٹکٹوں سے ملک بھر کی ریلوں میں ہزارہا میل کی مسافت طے کی جا سکتی ہے۔ اور اگر واقعی انسان ہر وقت کسی نہ کسی گاڑی کے ڈبے میں سوار رہے تو فاصلہ اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے جب کہ بعض لائنوں پر دوبارہ بھی سفر کیا جائے۔ یہ خصوصی ٹکٹ "نٹس کارتے" کہلاتے ہیں۔

مشکل سے یقین کیا جا سکے گا کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ایسے بہت سے ٹکٹ فروخت ہوتے ہیں۔ خریدنے والوں میں ان کاروباری ایجنٹوں کے علاوہ، جو واقعی ہر وقت مصروف

لیتے ہیں اور ملک کے گوشے گوشے کی خاک چھانتے ہیں۔ ایسے سیاح بھی شامل ہوتے ہیں جو تمام جرمنی کی ایک جھلک دیکھنے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کی آرزو دل میں لے کر وہاں پہنچتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ایسے ٹکٹ ان دُخانی کشتیوں میں بھی استعمال ہو سکتے ہیں، جو ریلوے نظام کے ماتحت چلتی اور عموماً ان دو گاڑیوں کے درمیان ان کا سلسلہ ملانے کے لیے ہوتی ہیں جن کو وسیع قطعاتِ آب کے باعث ریل کی پٹڑیاں نہیں ملا سکتیں۔

ہم دونوں بھائیوں نے اپنی مختصر مگر بھرپور سیاحت میں جتنے دن جرمنی کے لیے مخصوص کیے تھے ان کا تقاضا تھا کہ ہم یورپ کے اس اہم ملک میں ان چند بڑے شہروں کو جو محل وقوع کے لحاظ سے ایک سیدھ میں آتے ہوں، دیکھنے پر اکتفا کریں۔ اگر ذرا بھی گنجائش ہوتی تو ہم بویریا کو نظرانداز نہ کرتے اور بطور خاص اس صوبے کے صدر مقام میونک کو ضرور دیکھتے جو سیاسی اور ثقافتی دونوں اعتبار سے اور صحت افزا مقام ہونے کے لحاظ سے بھی اس سرزمین یورپ پر ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

**بویریا**: مشرق میں چیکوسلواکیہ سے اور جنوب مشرق میں آسٹریا سے وفاقی جمہوریہ جرمنی کے اس صوبے کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں، جسے جرمن خود اپنی زبان میں "بایرن" کہتے ہیں۔ عہدِ قدیم میں یہاں کے رہنے والے چند ٹیوطانی قبیلوں کے اختلاط پر مشتمل تھے جو عام طور پر "بایووارئی" کہلاتے تھے۔ یہ لفظ "بایا" سے مشتق ہے کیوں کہ یہ لوگ "بایوہیم" یا "بوہیمیا" کے علاقے سے چل کر یہاں آئے تھے۔ اس کے شمال میں مشرقی جرمنی ہے، جسے فی الحال ایک غیر ملک ہی کہا جا سکتا ہے۔

اس صوبے کا رقبہ ستائیس ہزار ایک سو باؤن مربع میل ہے اور آبادی ۱۹۵۵ء میں اکیانوے لاکھ چھبیس ہزار تھی، جس میں تقریباً بیس فی صدی یعنی اٹھارہ لاکھ چھیاسی ہزار پناہ گزیں ہیں۔ ڈاکٹر ہنس ایہارڈ اس کے موجودہ وزیر اعلیٰ ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد جب غریب جرمنی کے حصے بخرے ہوئے تو یہ علاقہ فرانس کے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۴۵ء تک دریائے رہائن کے غربی ساحل کا ایک حصہ جو پالاٹینیٹ کہلاتا ہے اسی صوبے کا جزو تھا، لیکن ۳۰ اگست ۱۹۴۶ء کو فرانسیسی کمانڈر انچیف نے ایک حکم نامے کے ذریعے اسے الگ کر کے دوسرے صوبے رہائن لینڈ میں ملا دیا۔ اس سے پہلے بھی تاریخ کے مختلف ادوار میں اس علاقے کے کچھ حصے کبھی اس سے جُدا کیے جاتے اور کبھی آس پاس کے حصے اس میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً ۱۸۰۹ء میں ٹائرول اور سالسبرگ بھی اس کے ماتحت آ گئے تھے۔

اس علاقے کے پہاڑ ذرا بھی بنجر نہیں ہیں۔ زمین کا ایک ایک حصہ سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔ تقریباً نصف حصہ زیر کاشت ہے۔ گیہوں، جو، جوار اور رائی کی فصلیں اس علاقے کے لیے بڑی نعمت ہیں۔ پھلوں میں سے انگور اس کثرت سے پیدا ہوتا ہے کہ ملک کے دوسرے صوبے مشکل سے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ نورمبرگ کے علاقے میں جرمنی کا بہترین تمباکو کاشت کیا جاتا ہے۔ ایک تہائی علاقہ جنگلات سے پٹا ہے ان میں عمارتی لکڑی فراہم کرنے والے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ انہی جنگلات میں ایسی چراگاہیں بھی ہیں جہاں بھیڑ بکریوں کی خوب پرورش ہوتی ہے۔ سبزہ زاروں میں قدرت نے ایسے پرندے بھی پیدا کیے ہیں جو انسان کی غذا بن سکتے ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ باہر سے زمین کی سطح ہی سرسبز و شاداب ہو، اندر سے اس کا سینہ بھی قیمتی معدنیات سے مالا مال ہے۔ لوہے اور کوئلے کی وسیع اور عمیق کانوں کے باعث ہی یہ صوبہ صنعتی اعتبار سے بھی بہت ترقی کر گیا ہے۔ چار ضلعوں میں نمک کی کانیں ہیں اور کچھ نمک بعض کھاری چشموں سے بھی تیار کیا جاتا ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہاں کے تقریباً ۳۷ فی صد باشندے کاشتکاری، مویشی بانی اور جنگلات سے متعلق پیشوں پر گزر اوقات کرتے ہیں۔ ۴۷ فی صد صنعت۔ حرفت، تجارت اور حمل و نقل رکھنے والے کاروبار میں گھرے رہتے ہیں۔

۱۸۶۸ء میں منظور کیے جانے والے ایک قانون کے بموجب اس علاقے کے عوام کو پہلی بار صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ دینے کی خاطر وسیع مراعات دی گئی تھیں۔ اس سے قبل چند غیر ملکی کمپنیاں اجارہ دار بن بیٹھی تھیں جن کے ترغیباتی منصوبے صرف ذاتی مفاد پر مبنی ہوتے تھے۔ عوام کو کھلی چھوٹ ملنے کا نتیجہ تھا کہ آج ہر بڑے شہر کے مضافات میں صنعت کاروں کی بستیاں قائم ہیں اور گھریلو دست کاریاں بھی پنپ رہی ہیں۔

اس وقت آج تک مختلف لڑائیوں میں تباہی و بربادی کے باوجود بویریا صنعتی اعتبار سے جرمنی کا بہت ہی مشہور حصہ ہے۔ خاص طور پر پنسلوں کی صنعت کے لحاظ سے ہمارے کان بچپن سے اس نام سے آشنا ہیں بلکہ قیاس کہتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہماری پیدائش کی تاریخ بویریا کی بنی ہوئی کسی پنسل ہی سے درج کی ہوگی۔

ثقافتی قدروں کے اعتبار سے بھی اس کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہاں کے فرمانرواؤں نے ہمیشہ علوم و فنون اور ادب و شعر کو نوازا اور ان کے علمبرداروں کی قدر کی ہے۔ پرانے عقیدوں اور روایتوں کا مرکز ہونے کے باوجود یہاں نصرانیت نے بھی خوب رنگ

جمایا جس کے آثار اب بھی اس حقیقت کے شاہد ہیں، بلکہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں جب یورپ کے چپے چپے میں عیسائیوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور دین کے نام پر اس دنیا میں ہر طرف ایسے ہنگامے برپا ہوئے کہ ایک طرف خود اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا اور دوسری طرف انسانیت پناہ مانگنے لگی تو جرمن زبان بولنے والی دنیا میں کیتھولک عقیدہ رکھنے والوں کی پشت پناہی صرف بویریا میں کی گئی اور اسی کی بدولت یہ مسلک برقرار رہا۔ اگرچہ یہاں کے بہت سے گرجا گھروں کے بام و در اور محراب و منبر پہلی اور خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے دوران میں انگریزوں اور روسیوں کی بمباری سے تباہ و برباد ہو گئے تھے لیکن حکومت نے خود سنبھالا لیتے ہی انھیں بھی دوبارہ زندگی بخش دی۔ اس وقت اس صوبے کے بہتر فی صد عیسائی کیتھولک عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہاں کے باشندوں میں امدادِ باہمی کا جو عمیق جذبہ ہمیشہ سے کارفرما ہے، وہ اکثر مفید ثابت ہوا ہے۔ چناں چہ ۱۹۴۵ء کے بعد بھی جب مشرقی علاقے کے تقریباً ۱۹ لاکھ انسان ترکِ وطن کر کے یہاں آ گئے، تو مقامی باشندوں نے ان سے بے اعتنائی نہیں برتی بلکہ اپنی اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں اس طرح مدغم کر لیا کہ کچھ ہی عرصے بعد وہ غیر نہیں رہے اور اب تو ان کے مابین فرق و امتیاز کرنا بھی آسان نہیں رہا۔ صرف شمالی سرحد پر جو آہنی پردے سے بالکل متصل ہے، بعض لوگوں کے خیالات ڈانواڈول ہوتے رہتے ہیں اور وہ خود کوئی فیصلہ نہ کر سکنے کے باعث کسی قدر الگ تھلگ سے ہیں۔

جنوب اور جنوب مشرق میں کوہ ایلپس کی چوٹیاں اسے آسٹریا سے جدا کرتی ہیں تو مشرقی سمت میں ایک گھنا ناقابل عبور جنگل اس کے اور چیکوسلواکیہ کے درمیان حائل اور ایک قدرتی دیوار بنا ہوا ہے۔ لیکن یہ رکاوٹیں اور حد بندیاں سیاسی تصورات نے پیدا کی ہیں۔ کائناتی نظام پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ ہوا کے جھونکوں اور دریا کی لہروں کو بھلا کون روک سکتا ہے۔ ملبا لہکار دریائے ڈینیوب سرحدی اصولوں کو توڑتا ہوا چلتا ہے تو اس کے پاؤں پر کوئی بھی بیڑی نہیں لگا سکتا۔

ڈینیوب کو جرمن زبان میں ڈوناؤ، ہنگری کی زبان میں ڈونا، رومانیہ کی زبان میں ڈوناریہ، روسی زبان میں ڈونائی، بلغاریہ کی زبان میں ڈوناف اور لاطینی میں ڈانوبی اس کہتے ہیں۔ یہ وولگا کے بعد یورپ کا سب سے بڑا دریا ہے، لیکن ایک لحاظ سے اسے وولگا پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہ کئی ملکوں کی سرزمین سے گزرتا ہے۔ اگرچہ اس کا بڑا حصہ جرمنی اور آسٹریا سے تعلق رکھتا ہے تاہم

قلبِ ہنگری سے گزر کر شمالی یوگوسلاویہ میں پہنچتا اور شمال مشرقی یوگوسلاویہ کو رومانیہ سے جُدا کرتا ہوا پھر بلغاریہ اور رومانیہ کے درمیان قدرتی سرحد کا کام دیتا اور مشرقی رومانیہ میں جانب شمال بہتا ہوا روس کی سرحد کو پرٹ کے مقام پر چھوتا تین بڑے دہانوں کے ذریعے بحیرہ اسود میں جا گرتا ہے۔ مجموعی طور پر اس کی لمبائی ایک ہزار سات سو ستر میل ہے۔ لیکن سارے پاٹ کو ناپا جائے تو یورپ کے تین لاکھ بیس ہزار مربع میل پر حاوی ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی اٹھتر گز اور کم سے کم گہرائی ساڑھے تین فیٹ ہے۔ اس کے معاون دریاؤں کی تعداد تین سو کے قریب ہے، جن میں سے بعض بجائے خود تیز رفتار دریا ہیں۔ یہ دو ہزار دو سو فیٹ کی بلندی سے بہتا ہوا سمندر کی تہہ تک آتا ہے۔ اس نے اپنے دونوں کناروں پر بہت سے بادشاہوں کے عروج و زوال دیکھے ہیں۔ چنانچہ سرد و گرمِ زمانہ چشیدہ ہونے کے باعث کبھی اس کا پانی کسی زمین پر منجمد ہو جاتا ہے اور کہیں کسی وقت کھولنے بھی لگتا ہے۔ سنگلاخ چٹانوں پر سر پٹکنے کے بعد جب اندھیرے (سیاہ) جنگل سے گزرتا ہے تو سنسان علاقے میں اس کی گزرگاہ کے نشانات بھی مشکل سے ملتے ہیں۔

شمالی بویریا کا جسے زیریں بویریا بھی کہتے ہیں، صنعتی مرکز نیورمبرگ ہے جہاں دوسری جنگِ عظیم کے جرمن قیدیوں پر اتحادیوں نے مقدمہ چلایا تھا اور چوں کہ قانون ان کے ہاتھ میں تھا اور عدالتیں ان کے اشارے پر ان کی مرضی کے مطابق "انصاف" کر رہی تھیں، اس لیے ہر ملزم پر سنگین جرم عائد ہوا اور ہر مجرم کو عبرت ناک سزا دی گئی۔ صرف وہ جس نے اپنے وطن سے غداری کی اور اتحادیوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا، صاف بچ گیا۔

یہ اس صوبے میں دوسرے نمبر کا شہر ہے۔ جرمن زبان کے اعتبار سے اس کا تلفظ نورن بورگ ہے۔ اس کے جنوب میں شرقاً غرباً دریائے ڈینیوب بہتا ہے اور دریا کے ساحل سے صوبے کی سرحد تک سارا علاقہ جو پہاڑی ہونے کے باعث بالائی بویریا کہلاتا ہے، بے حد زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے۔ اسی سبزہ زار کے بیچوں بیچ صوبے کا صدر مقام ہے جسے مختلف انداز میں میونک، میونخ اور میونچ کہتے ہیں۔ اہلِ زبان اسے موئن چن کہتے ہیں۔ البتہ جرمنی سے باہر میونک ہی کہلاتا ہے۔

روایت ہے کہ عیسائی مذہب کے چند تارک الدنیا درویشوں نے جو راہبوں کے زمرے میں آتے اور انگریزی زبان میں "مونک" کہلاتے ہیں، اس مقام پر جسے اب میونک کہا جاتا ہے، آج سے سینکڑوں سال پہلے دنیا والوں سے دور رہ کر ایک چھوٹی سی بستی بسائی تھی۔ مونک ہی سے میونک بنا ہے۔ ان راہبوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کی یہ نگری کبھی ترقی پا کر ایک ایسا عظیم الشان

شہر بن جائے گی جس میں تارک الدنیا درویشوں کے بجائے تسخیرِ عالم کی طمع رکھنے والے آباد ہوں گے اور یہاں کی دل فریب صنعتیں انسان کو دنیا سے الگ تھلگ رکھنے کے بجائے اس کا گرویدہ بنادیں گی۔ سچ ہے انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوجاتا کچھ اور ہے۔ اسی کا نام دُنیا ہے۔

**میونک** ایک بہت بڑا شہر ہے۔ ایک قدیم شہر ہے۔ رنگ رلیاں منانے والوں کا شہر ہے۔ صنعت و حرفت کا مرکز ہے۔ یہاں بم بنانے والے کارخانے تھے۔ یہ خود بموں کے حملے سے تباہ ہوگیا۔ اِس بُری طرح تباہ ہوا کہ جنگ سے پہلے کے نشانات مدھم پڑگئے، لیکن آج اس کے گلی کوچوں میں گھوما پھرا جائے تو مشکل سے یقین آئے گا کہ پندرہ سال پہلے اس کی عظیم الشان عمارتیں ملبے کے انبار بن گئی تھیں۔ قبرستانوں اور بستیوں میں کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ جہاں ذرا آرام سے سونے کے لیے کسی چھت کا سایہ نہیں رہا تھا اور سوکر اٹھنے کے بعد بیٹھنے کے لیے ہموار جگہ نہیں ملتی تھی لیکن بہت جلد نئی بنیادوں پر اس کی دوبارہ داغ بیل پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسا شہر زیادہ شان و شوکت کے ساتھ آباد ہوگیا جسے عہدِ اساطیر میں علاء الدین کے چراغ والا دیو ہی بنا سکتا تھا یا عصرِ جدید میں پختہ ارادے اور جوان امنگیں رکھنے والے جرمنوں نے نئے سرے سے تعمیر کرکے دنیا کو محوِ حیرت کردیا۔ دوسری جنگ عظیم میں دنیا کے اور علاقے بھی تباہ ہوئے تھے لیکن اس قدر سرعت کے ساتھ کسی کو پنپنا نصیب نہ ہوا۔ اہل جرمنی کے عزائم اس پہاڑ کی طرح پختہ اور اٹل ثابت ہوئے جس کے دامن میں یہ شہر آباد ہے جسے کوہ ایلپس کہتے ہیں، جس کی چوٹیاں یخ بستہ اور جس کے دامن سبزہ زار ہیں۔

کوہ ایلپس کی چوٹیاں جب برف پڑنے سے بالکل سفید ہوجاتی ہیں تو دامن کا سبزہ عجیب رنگِ تضاد پیدا کرتا ہے۔ اس وقت جھیلیں بھی دلفریب اور جاذبِ نظر بن جاتی ہیں اور سطح ارض کے نشیب و فراز مختلف کھیلوں کے میدان ثابت ہوتے ہیں۔ اس وقت دور دراز علاقوں کے سیاح تازگی حاصل کرنے اور دل بہلانے کے لیے یہاں آتے ہیں۔

کوہ ایلپس بھی دریائے ڈینیوب کی طرح بین الاقوامی نوعیت کا حامل ہے۔ یہ جنوب مشرقی فرانس کے کچھ حصے کو، سوئزرلینڈ کے بیشتر علاقے کو، شمالی اٹلی کے جنوبی نیز جرمنی، آسٹریا اور یوگوسلادیہ کے کچھ کچھ حصوں کو اپنے سینے پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کی مجموعی لمبائی چھ سو میل اور چوڑائی نوّے سے ایک سو اسّی میل تک ہے۔ سب سے اونچی چوٹی جو پندرہ ہزار آٹھ سو اکہتر فیٹ ہے، موئٹ بلانک کہلاتی ہے اور فرانس اور اٹلی سے سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ اس کے

اکثر حصے برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ سب سے بڑا تودۂ برف تیرہ میل طویل ہے۔ اسے بھی ڈینیوب کی طرح مختلف زبانوں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ جرمن زبان میں آلپین، اطالوی میں آلپ، لاطینی اور فرانسیسی میں آلپس اور انگریزی میں ایلپس کہتے ہیں۔ یورپ نامہ کے حصۂ اول میں ہم اس پہاڑ کا ذکر متعدد صفحات میں کر چکے ہیں۔

سیاحوں کی بدولت جرمنی کے یوں تو سبھی علاقوں میں کافی گہما گہمی رہتی ہے لیکن اوبرامرگاؤ نامی قصبے میں بعض اوقات کافی سامانِ کشش پیدا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ہر دس سال کے بعد جب وہاں ایک مذہبی ناٹک کھیلا جاتا ہے تو اسے بین الاقوامی شہرت نصیب ہوتی ہے کیونکہ دور دراز سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ۱۶۳۳ء میں وہاں طاعون کی زبردست وبا پھیلی تو لوگوں نے منت مانی کہ اگر یہ بلائے ناگہانی دور ہو جائے تو وہ یسوع ناصری ؑ کی زندگی اور موت سے متعلق ایک ڈرامہ ہر دس سال بعد کیا کریں گے۔ تین صدی سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد بھی لوگ وعدہ وفا کرنے کے پابند ہوئے ہیں۔ ہر سال رچرڈ ویگنر کے شیدائی شہر بیروت کے باہر ایک شاداب پہاڑی پر بنے ہوئے ایک وسیع ہال میں جمع ہوتے اور محفلِ سماع منعقد کر کے اس خالقِ نغمات کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں جو ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۳ء میں فوت ہو گیا اور اپنی زندگی کے ستر سال میں ہزاروں ایسے گیت لکھ گیا جن کا آہنگ آج بھی دلوں کو تڑپا دیتا ہے۔ بویریا کے اور بھی بہت سے شہروں میں اوپیرا ہاؤس بڑے مشہور ہیں، جہاں مقامی باشندوں کے علاوہ سیاحوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

یہ صوبہ ہر قسم کے عجائب گھروں اور یادگاروں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ بعض تاریخی عمارتیں جو لڑائی کے ہاتھوں تباہ ہو گئی تھیں لیکن قیامِ جمہوریت کے بعد دوبارہ بن گئی ہیں، صدیوں پرانی ہیں۔ البتہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے بعض نمونے زیادہ قابلِ دید ہیں۔ اس وقت کا مشہور ماہرِ تعمیرات بالتھازر نوامن (۱۶۸۷ء تا ۱۷۵۳ء) خاص طور پر ویوزبرگ میں اپنے متاثر کر دینے والے نقوش چھوڑ گیا ہے۔

اس صوبہ کے قدامت پسند باشندے ملک کے باقی لوگوں سے دل کھول کر نہیں ملتے بلکہ ایک لحاظ سے پرخاش رکھتے ہیں اور قومی معاملات میں بعض اوقات مرکزی حکومت کا اقتدار بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس عناد کا بڑا سبب یہ ہے کہ بویریا کے نواب قدیم زمانے میں اپنے زیرِ نگیں علاقے کی حدود کو وسیع تر کرنے کی خاطر بادشاہ شارلیمین سے الجھ پڑے تھے، جو شروع میں

لیائن لینڈ کا اور پھر وسطی یورپ کے بہت بڑے علاقے کا فرماں روا تھا۔ ان نوابوں کی دلی مراد بر نہ آئی اور انھیں ہر بار ہزیمت اٹھانی پڑی، بلکہ انجام کار عنانِ حکومت ان کے ہاتھ سے جاتی رہی۔ اسی زمانے کی جد و جہد آج بھی ان کے بغض و عناد کی بنیاد ہے۔ اگرچہ کھویا ہوا اقتدار سترھویں صدی میں دوبارہ حاصل ہو گیا تھا جب کہ میکسی لین اول یہاں کا حاکمِ اعلیٰ بن بیٹھا تھا اور اس نے بڑا عروج پایا تھا، تاہم جو کسک دل میں پیدا ہو گئی تھی، برقرار رہی اور اب تک رگِ جان میں نوکِ نشتر بنی ہوئی ہے۔

سی سالہ جنگ کے بعد جو ۱۶۱۸ء میں شروع ہو کر ۱۶۴۸ء میں ختم ہوئی تھی، بویریا میں علوم و فنون اور ادبیات کا ایک عظیم دور شروع ہو گیا تھا اور بعض ماہرین نے بڑا نام پیدا کیا، لیکن نپولین کی فتوحات کے دوران میں بویریا کو ایک اور دھکا لگا۔ بہت سے کاموں میں رخنے پڑ گئے اور کوتاہیوں نے ہر طرف سے آگھیرا۔ یہاں تک کہ بڑی مشکل سے انیسویں صدی میں سنبھالا لیا اور اس بار یہاں کی عام اقتصادی اور ثقافتی ترقیوں نے مغربی یورپ میں اس کے لیے ایک اعلیٰ مقام پیدا کر دیا۔ خاص طور پر میونک ثقافت کا مرکز بن گیا۔ بڑے بڑے علما اور فن کار، مصنف اور نغمہ ساز یہاں آکر جمع ہو گئے۔

اس عہدِ زریں کو فروغ دینے کا سہرا یکے بعد دیگرے تین بادشاہوں: لڈوگ اول، میکسی ملین دوم اور لڈوگ دوم کے سر ہے۔ آخر الذکر فرماں روا نے جس کی دردناک موت جھیل اشٹارنبرگ میں ڈوب جانے سے واقع ہوئی، شان دار محل بنوائے اور پہلی بار شہر پناہ بھی تعمیر کرائی تھی۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد بھی یہاں کی دل کشی اور رعنائی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چناں چہ شہرۂ آفاق مصنف تھامس مین نے جو کئی سال بویریا کے صدر مقام میں مقیم رہا، وہاں کی فنی نعمتوں کو خوب سراہا ہے ——— یہاں فنِ لطیف نے فروغ پایا، فنِ لطیف نے رنگ جمایا، فنِ لطیف نے دیکھنے والوں کے دلوں پر نقش بٹھایا اور فنِ لطیف نے مشعل اٹھا کر دوسروں کو راستہ دکھایا ہے، میونک کا سکہ چلتا ہی رہے گا۔

شہر کے ایک علاقے شوابنگ میں فن کاروں، ادیبوں، شاعروں اور نغمہ سازوں نے اپنی بستی علیحدہ بسائی۔ ایک نئی زندگی کی راہ ہموار کی اور اپنی سادہ دلی کے مطابق لطف و نشاط کا ایک اچھوتا طریقہ اختیار کیا۔ ۱۸۷۰ء میں یہ علاقہ بسمارک کی جرمن سلطنت کا ایک جزو بن گیا، لیکن وائمار دستور العمل کے ماتحت جو ۱۱ اگست ۱۹۱۹ء کو منظور ہوا تھا، اس کے وہ اختیارات

سلب ہو گئے جو ۱۸۷۰ء میں نصیب ہوئے تھے اور جب قومی اشتمالیت کا سکہ چلنا شروع ہوا تو اس کی وہ خصوصیت یکسر بدل گئی جو صدیوں سے رسی بسی ہوئی تھی اور قومی کردار کا جزو بن گئی تھی۔

پھر دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد اپریل اور مئی ۱۹۴۵ء میں امریکی فوج کے دستے اس علاقے پر قابض ہو گئے۔ اس فوجی حکومت نے نیا دستور العمل مرتب کیا، جس کی رو سے بویریا کو ایک آزاد عوامی ریاست بنا دیا گیا لیکن اس طرح معاشرہ کی تشکیل پر جو اثر پڑا وہ قابلِ غور ہے۔ یہ یکسر کسانوں اور کاشت کاروں کی سرزمین بڑی حد تک صنعت کاروں، تاجروں اور دوسرے کاروباری لوگوں کا مسکن بننے لگی، تاہم زراعت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور یہ ممکن بھی کیسے تھا جب کہ قدرت کی نعمتیں بدستور وافر تھیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ کہیں کہیں دریاؤں کی روانی پر بند لگا کر برقِ آبی پیدا کی جانے لگی جو صنعتی فروغ کے لیے ضروری تھی۔ اس طرح پانی کے دھاروں کا رخ جو بدلا تو کہیں کہیں سبزہ زاروں کے نقشے بھی تبدیل ہو گئے۔ بہت سے بے روزگاروں کے لیے وسائلِ معاش پیدا ہو گئے اور بیرونی تجارت بڑھ جانے سے غیر ملکی زرِ مبادلہ زیادہ مقدار میں حاصل ہونے لگا جو ہمیشہ قومی خوشحالی کا باعث ہوتا ہے۔ بڑی بڑی مشینوں، کل پرزوں اور ہر قسم کے آلات کی ساخت کے علاوہ پارچہ بافی اور چرم سازی کی صنعتیں بھی فروغ پا گئی ہیں۔ یہاں کے چینی کے ظروف دنیا بھر کی منڈیوں میں مقبول ہو رہے ہیں۔

**پُر لطف حماقتیں**: میونک میں بہت سے گرجا گھر قدیم و جدید فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور عمارتیں خوب صورت، قابلِ دید اور دل کو لبھانے والی ہیں۔ ایسی ہی بعض عمارتوں میں عجائب گھر ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دور و نزدیک مشہور ہیں۔ ان میں سے دو چار ایسے بھی ہیں جو کسی ایک ہی موضوع کے لیے مخصوص ہیں مثلاً اس کے ایک علاقے شوابنگ میں جہاں مشہور المانوی فن کار ویلنٹین رہتا تھا، ایک عجائب گھر ایسا ہے جو صرف اسی فن کار کی یادگار ہے اور عام طور پر "دل چسپ پُر لطف حماقتوں کا مرکز" سمجھا جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر ہر زائر کسی قدر بیوقوف بنتا لیکن ناراض ہونے کے بجائے لطف اٹھاتا ہے اور اسی لیے اپنے دوستوں اور واقف کاروں کو وہاں ضرور بھیجتا بلکہ اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا ہے۔

کارل ویلنٹین اپنے عہد کا نہ صرف اعلیٰ مصور بلکہ ناٹک کا مزاحیہ اداکار بھی تھا، چناں چہ اس کی تصویروں میں بھی اس کی طبیعت کا یہ رنگ جھلک دکھائے بغیر نہ رہ سکا اور مرنے سے کچھ عرصے پہلے اس نے اپنی قیام گاہ کو اس طرح آراستہ کیا کہ وہ ایک عجائب گھر بن گئی۔

یوں تو یہ عمارت آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے یعنی ۱۳۲۰ء میں تعمیر ہوئی تھی لیکن ویلنٹن نے بہت عرصے بعد اسے اپنا مسکن بنایا اور حسبِ ضرورت و منشا اس میں تبدیلیاں کرلیں اور اپنے ذوق کے مطابق اسے آراستہ کرلیا۔ اس بات کو ایک مدت گزر چکی ہے تاہم آج بھی اس عمارت میں رکھی ہوئی ہر چیز لوگوں کے لیے جاذبِ نظر اور دلچسپی کا باعث ہے۔

چیزوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، پھر بھی دو منزلہ عمارت کے بہت سے کمروں میں ان کو پھیلایا جاسکتا ہے۔ نیچے کی منزل کے ایک وسیع ہال میں جسے کمرۂ استقبالیہ کہا جاسکتا ہے، ان چیزوں کی ایک فہرست تین زبانوں میں مرتب کرکے رکھی گئی ہے۔ پہلے خانے میں بویریا کی مقامی بولی میں جسے تقریباً سبھی جرمن سمجھ لیتے ہیں، دوسرے خانے میں کلاسیکی جرمن زبان میں اور تیسرے خانے میں انگریزی زبان میں ہر چیز کا اندراج کیا گیا ہے۔

عجائب گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس عجائب گھر کی جدت پسندی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ داخلے کے ٹکٹ کی رقم ۱۵ فننگ ہے جو بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کیوں کہ ۵ فننگ کی رقم ادا کرنا بہت آسان ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ جیسے ہمارے ملک میں کسی چیز کی قیمت یا اجرت ایک روپیہ اور ایک پیسہ مقرر کی جائے تو عجیب سی معلوم ہوگی۔ اگر جیب میں ایک پیسہ الگ نہ ہو تو گاہک چاہے گا کہ دکان دار ایک ہی روپیہ قبول کرلے۔ ایک پیسے کی خاطر مزید ایک روپیہ کیوں بھنایا جائے یا کوئی اور سکہ دے کر بہت سے چھوٹے سکے کیوں لیے جائیں اور اکثر صورتوں میں خود دکان دار بھی یہ چاہے گا کہ میں ایک پیسہ چھوڑ کر گاہک پر احسان کروں اور ایک روپیہ لے کر پونے سولہ آنے کی ریزگاری کیوں دوں لیکن اس عجائب گھر کے منتظمین اس معاملے میں سخت ہیں۔ وہ ذرا بھی رعایت نہیں برتتے۔ ۱۵ فننگ ہی وصول کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے انھیں بہت زیادہ ریزگاری اپنے پاس رکھنی پڑتی ہے تاکہ سیر کرنے والے کو عذر کا موقع نہ ملے۔

اندر داخل ہونے والے دروازے پر اس کے پٹ کھولنے کے لیے کسی عام ہتھی کے بجائے خاصے بڑے شیر کا مجسمہ پیوست ہے اور لوگ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر یا گردن پکڑ کر دروازہ کھولتے ہیں۔ جسے کے نیچے لکڑی کی تختی پر لکھا ہے "اسے کھلائیے مت"۔

اندر داخل ہوتے ہی اٹلی کے آتش فشاں پہاڑ ویسوویس کا ماڈل نظر آتا ہے، جسے دیکھ کر کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پھٹ پڑنے کے قریب ہے۔ اس کے نیچے ذومعنی الفاظ کندہ ہیں۔

ایک مفہوم تو وہ ہے جو مشرقی دنیا میں اکثر مقامات، خصوصاً بسوں وغیرہ میں لکھا ہوا نظر آتا ہے "سگریٹ نوشی منع ہے" اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ "دھواں اڑانا منع ہے"۔

ایک بل کھاتا ہوا زینہ اوپر کی منزل تک لے جاتا ہے۔ اس پر چڑھیے تو ایک جگہ دیوار میں گھسے ہوئے دو جوتے نظر آتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک راج نے دیوار کے اس حصے میں اپنے آپ کو زندہ چنوا دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ میرے جوتے بھی دیوار میں اس طرح لگا دیے جائیں کہ نصف باہر ہوں اور نصف اندر تاکہ اصل مقام کی پہچان رہے۔

اوپر جائیے تو ایک کمرے کے کونے میں طاق کے اندر "سورج کی خشک کرنیں" محفوظ ہیں۔

"قدرت کی ستم ظریفی" کے عنوان سے پرندے کا ایک پنجرہ دکھایا گیا ہے جس کے اندر ایک بڑے کچھوے کو انڈے سیتے ہوئے دکھایا ہے۔ کچھوا اتنا بڑا ہے کہ سوچنا پڑتا ہے کہ چھوٹی سی کھڑکی میں سے کیوں کر اندر داخل ہوا ہوگا۔ قریب ہی تلنے کی ایک کڑھائی گندے پانی سے بھری رکھی ہے۔ اس پر لکھا ہے "برف کے ایک نفیس انسان کے گھل جانے کے بعد جو کچھ حاصل ہوا، اس کڑھائی میں محفوظ ہے"۔

بانس کی تیلیوں کے ایک بنڈل کے قریب یہ الفاظ کندہ ہیں! "اے اہلِ میونک! سردی سے بچنے کے لیے تیار رہو، موسمِ سرما میں دانت کریدنے کے لیے خلال یہاں مل سکتے ہیں"۔

برلن کی آب و ہوا اتنی صحت بخش ہے کہ ضرب المثل بن گئی ہے۔ چناں چہ ایک شیشی پر "برلن کی ہوا" کا لیبل چسپاں ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس میں کوئی چیز نظر نہیں آسکتی۔ ہوا کو بھلا کس نے دیکھا ہے۔ یہ اور اسی قماش کی چند چیزیں ایسی ہیں کہ پوری وضاحت کے بغیر غیر جرمنوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

ایک کھلے مقام پر ایک بہت بڑی چٹان رکھی ہے۔ اس کی بابت لکھا گیا ہے کہ "حضرت مریمؑ اس پتھر پر بیٹھا کرتی تھیں"۔ تاریخی اعتبار سے یہ کس حد تک درست ہے؟ نصرانی عقیدے کے لوگ ہی تصدیق کر سکتے ہیں۔

دل میں ایک قسم کا تجسس پیدا کر دینے والی عبارت ایک دروازے پر نظر آتی ہے۔ "صرف بالغوں کے لیے" زائرین نہایت بے تابی کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں تو سامنے ایک چکنی، صاف اور ہموار دیوار نظر آتی ہے، جس کے وسط میں بہت ہی باریک حروف میں لکھا ہے "تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے"۔

یہاں سے مایوس ہو کر آگے بڑھیے تو انجیر کے دو پتے نظر آتے ہیں۔ ان کی بابت درج ہے کہ ماما حوا نے اپنا جسم ڈھانکنے کے لیے ایک پتا سترہ سال کی عمر میں اور دوسرا ترپن سال کی عمر میں استعمال کیا تھا۔ اس بیان کے جھوٹ سچ پر سوچنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا، کیوں کہ بہت جلد ایک لحیم شحیم بڑی بڑی مونچھوں والے انسان کی تصویر جاذبِ نظر ہو جاتی ہے۔ وہ شاید کوئی تاریخی شخصیت ہو، لیکن خالص جرمن انداز میں لکھا ہوا اس کا نام اتنا ثقیل ہے کہ ہمارے خاندان میں صرف ہمارے مشفق بھائی ڈاکٹر محبوب الٰہی ہی (اس ملک میں رہنے کے باعث) اس کا صحیح تلفظ کر سکتے ہیں۔ اس کی بابت یہ صراحت کی گئی ہے کہ وہ دنیا کا پہلا شخص ہے جس نے ٹب میں بیٹھ کر نہانے کا فن ایجاد کیا تھا۔

ان دل چسپ حماقتوں کے ساتھ ساتھ، جن پر ایمان لانے میں کسی قدر تذبذب ہو سکتا ہے، جیتے جاگتے انداز میں بعض ایسی تصویریں بھی اس عجائب گھر میں دیکھی جا سکتی ہیں جو خود ویلنٹین کی مزاحیہ اداکاری کی ترجمان ہیں۔ انھیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے کن کن ڈراموں میں کس کس کا پارٹ ادا کیا ہے۔ اس کے کھیلوں کی تشہیر کیسے کیسے پوسٹروں اور ہینڈ بلوں سے کی گئی تھی۔ اس زمانے کے اخباروں میں اس کی اداکاری پر کن کن الفاظ میں تبصرہ ہوا اور اس کا فن ہر خاص و عام میں کس درجہ مقبول تھا۔ بعض کھیلوں میں خود اسی کے لکھے ہوئے گیت گائے جاتے تھے اور پھر بچے اور بڑے ان کو گلی کوچوں میں گاتے پھرتے تھے۔

چھے سو سال پرانی اس عمارت کا کچھ حصہ دوسری جنگِ عظیم میں منہدم ہو گیا تھا، لیکن فضائے امن قائم ہونے کے بعد بہت جلد مکرر تعمیر کر دیا گیا۔ اسے پرانے انداز میں دوبارہ آراستہ کرنے کی ذمے داری عصرِ جدید کے ایک مصوّر کے سپرد کی گئی، جو عقیدے اور فن کے اعتبار سے ویلنٹین کا پرستار کہا جا سکتا ہے۔ اسی جذبے نے عجائب گھر کو دوبارہ چار چاند لگا دیے ہیں۔

اس عجائب گھر کا تصور کرتے ہوئے میرے دل نے دعا کی کہ کبھی پاکستان میں بھی ایک ایسی چیز قائم کی جا سکے بلکہ اسے میونک کے عجائب گھر سے بھی زیادہ مضحکہ خیز انداز میں آراستہ کیا جائے۔ پاکستان میں مضحکات کی کمی نہیں ہے، بلکہ یہاں کی بہت سی سنجیدہ چیزوں پر بھی مضحکہ خیز ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے بعض اربابِ اقتدار کو ذرا سجا کر سنوار کر ایک خاص عمارت میں بٹھا دیا جائے تو جرمنی کے مذکورہ بالا عجائب گھر کے نوادر سے بازی لے جائیں گے۔

**موسیقی کا کتب خانہ** : اسی شہر میونک میں موسیقی کا ایک ایسا کتب خانہ بھی قائم ہے جو اپنی

نوعیت کے اعتبار سے دنیا میں سب سے بڑا ہے اور ایک لحاظ سے نوادر کا سب سے قیمتی ذخیرہ بھی ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے لاتعداد دل دادگانِ موسیقی کا ایک ایسا مرکز بھی ہے کہ اس کی مثال کہیں اور جگہ ملنی مشکل ہے۔ کیوں کہ وہاں رہ کر صرف نظریاتی مطالعہ ہی ممکن نہیں ہے بلکہ مختلف ملکوں، زبانوں اور عہدوں کے گیتوں اور ان کی دھنوں کو سامنے رکھ کر عملی طور پر درسِ موسیقی بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر قسم کے ساز بھی وہاں میسّر آسکتے ہیں جن کو بجانے اور مشق کرنے کے لیے عظیم الشان عمارت میں بہت سے کمرے ہیں۔ اگر ہم میونک جاتے اور اس مرکز کی زیارت کرتے تو یہ ضرور پتہ چلانے کی کوشش کرتے کہ اپنے بندوخاں کی سارنگی یا اس سے ملتا جلتا کوئی ساز بھی وہاں موجود ہے یا نہیں۔ ہم اس کے کسی تار کو چھیڑنے اور ایک جھنکار پیدا کرنے کی کوشش تو نہ کرتے، کیوں کہ اس فن لطیف سے ناآشنا ہیں، لیکن تشنگیٔ معلومات کی تسکین ضرور کر لیتے۔

یہاں چھے سال کے بچّے سے لے کر ستر چھتر سال کے بوڑھے تک ہر شخص کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ یہاں آکر مائیں پرانے زمانے کی دل پذیر لوریاں سیکھتی ہیں جنھیں سُنا کر وہ اپنے بچوں کو آرام کی نیند سُلا سکیں۔ عاشق مزاج آکر مدھ بھرے گیت الاپتے ہیں تاکہ اپنی محبوباؤں کے سامنے ان کو دُہرا کر اپنی عمیق محبت کا سکّہ جما سکیں۔ قومی ترانے اور مذہبی مناجاتیں بھی سیکھی جا سکتی ہیں اور دل ہلا دینے والی وہ تانیں بھی جو سورماؤں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے صرف محاذِ جنگ پر بلند ہو سکتی ہیں —— محاذِ جنگ! — جرمنی کی نئی پود کا کوئی بھی فرد اس کے تصوّر سے خالی الذہن نہیں ہے، کیوں کہ لڑائی ختم ہو جانے کے باوجود لڑائی کا ردِ عمل ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا سلسلہ جاری ہے۔

میونک میں موسیقی کا یہ کتب خانہ ۱۹۰۲ء میں قائم ہوا تھا۔ اس کے بانی ایک یہودی عالم پال مارسوپ تھے جن کی تمنا یہ تھی کہ غریب طبقے کے وہ لوگ جو بڑے اور مہنگے سماع خانوں میں جانے کی استطاعت نہیں رکھتے، یہاں آکر اپنا شوق پورا کر لیا کریں۔ کتب خانے نے بتدریج ترقی کی اور اب یہ حال ہے کہ فنِ موسیقی کے مختلف پہلوؤں پر لکھی ہوئی سات ہزار کتابوں کے علاوہ نوّے ہزار سے زیادہ گیتوں کی دُھنیں اس جگہ محفوظ ہیں۔ موضوع سے متعلق رسالے اور مختلف زبانوں کے اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین کے تراشے ان کے علاوہ ہیں۔

بعض چیزیں اتنی پرانی ہیں کہ ان کی تاریخی تحقیقات کے لیے ولادتِ مسیحؑ سے پہلے کی خاک

چھاننی پڑتی ہے تب کہیں تھوڑا بہت سُراغ ملتا ہے۔

ان نوادرِ قدیم کے پہلو بہ پہلو عہدِ جدید کے غنائی ریکارڈ اور فیتے (ٹیپ) بھی جمع ہیں جن کو حسبِ ضرورت بجایا اور لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ چار کمرے صوتی اثرات سے محفوظ سمجھے جاتے ہیں، کیوں کہ وہاں باہر کی آواز اندر سُنائی نہیں دیتی۔ یہاں پچاس فننگ فی گھنٹے کے حساب سے فیس ادا کر کے لوگ اپنی آواز فیتوں میں بھرتے، سنتے اور مٹوا کر چلے جاتے ہیں۔ بعض محض اپنا شوق پورا کرتے ہیں اور بعض مشق کے ذریعے اپنی استعداد اور صلاحیت بڑھاتے ہیں۔ اِس طرح کتب خانہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسے ایک تربیت گاہ بھی کہا جا سکتا ہے۔

مجلسِ بلدیہ کے ماتحت ہونے کے باعث اخراجات کا بیشتر حصّہ اس کے خزانے سے ملتا ہے اور پھر دوسرے عطیوں اور فیسوں سے پوری ڈالی جاتی ہے۔ کبھی کبھی بین الاقوامی موسیقی کے ہنگامے اور مقابلے ہوتے ہیں جو گہما گہمی کے علاوہ آمدنی کا باعث بنتے ہیں اور وہ اس مرکز کے رکھ رکھاؤ اور اس کی مسلسل توسیع کے لیے ضروری ہے۔

دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ پاکستان میں اس قسم کا بھی ایک کتب خانہ قائم کیا جائے کیوں کہ ہمارے ملک میں اس فنِ لطیف کا چرچا کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ یہاں کے استادانِ فن نے دوسرے ملک والوں کو تربیت دی ہے اور اپنا کمال دکھا کر ان سے خراج تحسین بھی حاصل کیا ہے، تاہم حکومت کی سرپرستی کے بغیر نہ تو ایسا کوئی منصوبہ مرتب ہو سکتا ہے، نہ اسے عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

میں امیدوں کے قلعے بناتا رہا اور ریل گاڑی راستے کے نشیب و فراز طے کرتی رہی۔ میں اپنے تصوّرات کی دنیا میں جس سرزمین کا جائزہ لے رہا تھا، وہ اس سے برعکس سمت میں چلی جا رہی تھی۔ جب میرے خیالات کا طلسم ٹوٹا تو مجھے اپنے گرد و پیش کا احساس ہوا۔ بھائی جان محترم ایک کتابچہ "جرمنی سے متعلق بنیادی باتیں" پڑھنے میں مصروف تھے اور ڈبے کے باقی دو مُسافر جو ہماری طرح غیر ملکی تھے، باہر کے دل کش ماحول سے لطف اٹھا رہے تھے۔ میں بھی کھڑکی کے ذرا قریب ہو کر ریل گاڑی کی مخالف سمت میں بھاگتے ہوئے درختوں کو دیکھنے لگا۔

یہ بھی عجیب فریبِ نظر ہے۔ سامنے دور تک پھیلے ہوئے سبزہ زار کا شباب اپنے اِنتہائی عروج پر کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ بہت جلد خزاں کا دَور شروع ہونے والا ہے۔ ستمبر کے آخری ہفتے میں درختوں کے پتے پیلے پڑنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے عروسِ بہار کا سہاگ لٹ جاتا ہے۔

اکتوبر میں تو یہ حالت ہوتی ہے کہ صرف سایہ دار مقامات کے علاوہ کہیں بھی سبزہ نظر نہیں آتا۔

**جانچ پڑتال** : کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ہماری گاڑی چلتے چلتے ایک دم سے راستے میں رک گئی۔ اگر صبح کے بجائے شام کا وقت ہوتا تو حضرت جوش ملیح آبادی کا یہ شعر حسب حال ہو جاتا۔

ناگاہ چلتے چلتے رستے میں ریل ٹھیری تھیں آخری کرن سے سب وادیاں سنہری

وادیاں شاداب ضرور تھیں مگر سنہری نہیں تھیں کیوں کہ سورج کافی چڑھ چکا تھا اور مطلع صاف تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ گاڑی کوئی اسٹیشن راہ میں نہ ہونے کے باوجود ایک دم ٹھیر گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ ایک گاڑی سے کراسنگ ہے جو فرانس کے ایک علاقے مل ہاؤس سے چلتی اور مول ہیم ہوتی ہوئی باڈن ویلر پہنچ جاتی ہے۔ اس شہر مول ہیم کا نام بھی عجیب ہے۔ غیر ملکیوں کے لیے اس کا صحیح تلفظ ادا کرنا مشکل ہے محض آسانی کے لیے میں نے اسے مادُ اللحم کہنا مناسب سمجھا خصوصاً اس لیے بھی کہ اکسیر اعظم کا اثر رکھنے والی ایک دوا یاد آجاتی ہے جس کی ایجاد پر اپنے دواخانے کو ناز ہے۔

چھوٹی لائن کی گاڑی کو گذارنے کے لیے ہی ہماری ٹرین نہیں رکی بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ راستے میں سامان اور کاغذات کی جانچ پڑتال ہو جائے۔ سمجھ لیجیے کہ یہاں سے نظم و نسق کے لحاظ سے جرمنی شروع ہو رہا ہے۔ ایک افسر ڈبے میں داخل ہوا اور اس نے ہمارے پاسپورٹ طلب کیے اور ایک نگاہ ڈال کر واپس کر دیے۔ پھر سوال کیا "کوئی چیز ڈیکلئر تو نہیں کرنی ہے"۔ (مطلب یہ کہ کیا آپ کے پاس ایسا کوئی سامان ہے جس پر کسٹم ادا کرنا ہے)۔ ہم نے نفی میں سر ہلایا اور جرمن زبان میں جواب دیا۔ "اِش ہابے نکتس سُو فیر سولن" یعنی میرے پاس کوئی چیز ظاہر کرنے کے لیے نہیں ہے۔" چیکر صاحب نے ہمیں غیر ملکی جان کر اپنی زبان کے بجائے انگریزی میں سوال کیا تھا کیوں کہ برطانیہ کی یہ زبان سارے یورپ میں بلکہ دنیا کے بہت سے حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن انگریزی میں ادا کیے ہوئے اپنے سوال کا جواب جرمن زبان میں سن کر وہ کسی قدر حیران سا رہ گیا۔ بھائی جان محترم کی جیبی گھڑی ان کے سامنے سیٹ پر رکھی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں، اس نے وقت دیکھنے کے لیے اس پر گہری نظر ڈالی، یا یہ جاننے کے لیے کہ گھڑی کہاں سے آئی اور کس مقصد کے لیے ہے۔ میں نے فوراً کہا "فیر پر زون لیشن گیبراوخ" یعنی "یہ ہمارے استعمال کی ہے۔"

چیکر صاحب مسکرائے اور فوراً آگے بڑھ گئے۔ چلیے چھٹی ہوئی۔ اس نے ہمارا پورا اعتبار کیا اور یہ حقیقت ہے کہ ہم غیر آئینی کام کے بالکل عادی نہیں ہیں۔ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو کسٹم کی تعریف میں آتی ہو۔ بس یہاں پاسپورٹ، ویزا اور کسٹم والی اشیا کی جانچ پڑتال

کا یہ حال ہے۔

دراصل جرمنی میں عام استعمال کی بہت سی چیزیں بلا روک ٹوک لے جائی جاسکتی ہیں۔ نہ ان کے بارے میں باز پرس ہوتی ہے اور نہ کسٹم ڈیوٹی ادا کرنی پڑتی ہے۔ ایسی چیزوں میں ٹائپ رائٹر اور کیمرے اور کیمروں کے فلم تک شامل ہیں۔ اشیائے خوراک کی صرف اتنی مقدار ساتھ رکھنے کی اجازت ہے جو منزلِ مقصود پر پہنچنے تک مسافر کے لیے کافی ہو سکے۔ سگریٹوں اور سگاروں کی تعداد محدود ہے۔ اسی طرح کافی، چائے اور تمباکو کی مقدار بھی مقرر ہے۔ یورپی ملکوں سے داخل ہونے والوں کے لیے علیحدہ مراعات ہیں۔ ان سب کے برعکس اس ملک کی مصنوعات اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ چناں چہ اکثر لوگ جن کو سفارتی مراعات حاصل ہوتی ہیں اس کھلی اجازت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جرمنی میں داخل ہونے والے ہر مسافر کو یہ بھی اجازت ہے کہ وہ جس ملک کا زرِ مبادلہ جتنی مقدار میں چاہے، اپنے ساتھ لے جائے، البتہ واپسی کے وقت اگر وہ اپنی رقم میں سے ایک سو پچیس ڈالر کے مساوی زرِ مبادلہ ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے شروع ہی میں اپنے اس عندیہ کا اعلان ضرور کرنا پڑے گا۔ تین سو سے زیادہ جرمن مارک نہ کوئی شخص ملک میں لاسکتا ہے اور نہ وہاں سے باہر لے جاسکتا ہے۔

چند منٹ بعد ریل گاڑی چلی اور پھر فراٹے بھرنے لگی۔

**ریلوے نظام:** جرمنی میں ریلوے کا نظام دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ریلوے نظاموں میں شمار ہوتا ہے۔ بجلی سے چلنے والی ریلیں بھی آہستہ آہستہ رواج پا رہی ہیں۔ ان میں چھے ہزار گھوڑوں کی طاقت کے انجن استعمال ہوتے ہیں۔ خام تیل والے انجنوں کا بھی رواج ہے جن کی قوت دو ہزار دو سو گھوڑوں کی طاقت سے کم نہیں ہوتی۔ بھاپ والے انجنوں کو ختم نہیں کیا گیا، وہ بھی برابر چل رہے ہیں اور انھیں بھی اتنی ترقی دی گئی ہے کہ بجلی یا خام تیل والے انجنوں سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ تاہم بھاپ کے پرانے انجنوں کو بجلی کے انجنوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ چونکہ ریلوے لائنوں کا نظام سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے، اس لیے چھوٹے بڑے ریلوے اسٹیشنوں کی تعداد ساڑھے سات ہزار کے قریب ہے۔ انجنوں اور گاڑیوں کی معمولی ٹوٹ پھوٹ کا خیال رکھنے کے لیے ملک بھر میں تین سو دس چھوٹے کارخانے اور انجنوں کی بہت زیادہ مرمت کرنے کے لیے پچاس بڑے کارخانے موجود ہیں۔ تمام لائنوں پر گشت کرنے کے لیے مال گاڑیاں،

دو لاکھ اسّی ہزار ڈبّے اور مسافر گاڑیوں کے بائیس ہزار پانچ سو ڈبے ہر وقت بھاگتے دوڑتے اور مصروفِ حرکت و عمل رہتے ہیں۔ ان گاڑیوں کو چلانے اور کھینچتے رہنے کے لیے بھاپ سے چلنے والے تیرہ ہزار بجلی کے ساڑھے سات سو اور خام تیل کے تین سو ساٹھ انجن ہر وقت سر گاڑی اور پاؤں پہیہ بنے رہتے ہیں۔

اِس ملک میں پہلی ریلوے لائن ۱۸۳۵ء میں تعمیر ہوئی جو نورمبرگ سے لے کر فرتھ تک صرف چھے کلومیٹر لمبی تھی۔ اس کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا فریڈرک لِسٹ کے سر ہے جو امریکا میں ایک عرصے تک جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد ۱۸۳۱ء میں جرمنی واپس آیا اور یہ آرزو ساتھ لایا تھا کہ کسی طرح اپنے وطن میں ریلوں کا وہ نظام قائم کرا دے جس سے یورپ کے بہت سے ملک فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جرمنی میں ریلوے لائن کا اس وقت تک نہ پڑنا اس کے نزدیک ایک شرم ناک کم ہمتی کے مترادف تھا لیکن دراصل اس کوتاہی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں پرشیا کے فرماں روا جرمنی کے بھی حکمراں تھے اور وہ اس علاقے کو کسی لحاظ سے ترقی پذیر دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ چناں چہ اس سے متعلق ایک منصوبہ پیش ہونے کے بعد فریڈرک ولیم چہارم کا اولین فیصلہ یہی تھا کہ "اگر پوٹسڈم سے برلن تک میں چند دن کے بجائے چند گھنٹے میں پہنچ جاؤں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس طرح زندگی کی مقررہ مدت کچھ زیادہ طویل نہیں ہو سکتی۔"

تاہم عوام کے بے حد اصرار پر اس منصوبے کو عمل میں لانا ہی پڑا اور اسّی سال کے اندر اندر سارے ملک میں ریلوے لائنوں کا جال بچھا دیا گیا۔ یہ کام جس رفتار سے ہوا، اس کی ہلکی سی جھلک یہ ہے کہ ۱۸۳۵ء میں ۶، ۱۸۴۰ء میں تقریباً پانچ سو، ۱۸۴۵ء میں تقریباً ۲ ہزار ۳ سو، ۱۸۸۰ء میں تقریباً ۱۹ ہزار، ۱۸۹۰ء میں تقریباً ۴۱ ہزار ۵ سو اور ۱۹۱۳ء میں ۶۳ ہزار ۷ سو ۹۴ کلومیٹر میں لائنیں پھیلتی چلی گئیں۔

شروع میں جرمن ریلوے لائنیں بہت سی پرائیویٹ کمپنیوں نے تعمیر کی تھیں اور یہی کمپنیاں ان کی مالک بھی تھیں۔ جب یہاں پہلی ٹرین چلی تو دوسری صنعتوں کی طرح بہت سے سرمایہ دار میدان میں آ گئے اور الگ الگ اپنے لیے دائرۂ عمل بنا کر اجارہ دار بن بیٹھے مگر دس برس بعد ہی یہ سب کمپنیاں متحد ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ ۱۸۴۶ء میں فیڈریشن آف پرشین ریلویز قائم ہوئی اور ۱۸۴۷ء میں ایسوسی ایشن آف جرمن ریلویز کا وجود عمل میں آیا۔ ان

انجمنوں کا قیام دراصل سرکاری ملکیت کی طرف پہلا قدم تھا۔

۱۸۷۱ء میں بسمارک نے یہ تحریک پیش کی کہ تمام ریلوں کو مرکزی حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے، لیکن صوبوں کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی، تاہم جس چیز کو انھوں نے ملک گیر پیمانے پر پسند نہ کیا، اسے علاقائی سطح پر عملی جامہ پہنا دیا۔ ۱۸۸۰ء میں پروشیا، بویریا اور سیکسنی کی حکومتوں نے اپنے اپنے علاقے کی تمام ریلیں خرید لیں۔ بعد میں چھوٹے چھوٹے صوبوں نے بھی ان کی پیروی کی۔

۱۹۱۹ء میں ایک قانون بنایا گیا کہ ریلیں براہِ راست مرکز کے زیرِ اہتمام ہوں گی۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں مرکزی حکومت اور صوبوں نے ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کے تحت صوبائی حکومتوں نے اپنی اپنی ریلیں مرکزی حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں

پہلی جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد جرمنی کی سرحدوں میں ردّ و بدل ہوا اور اسے ۸ ہزار کلومیٹر سے زیادہ ریلوے لائن سے محروم ہو جانا پڑا۔ ۱۹۲۰ء میں جرمنی کے پاس کل ۵۳ ہزار ۵ سو کلومیٹر ریلوے لائن تھی۔ ۱۹۲۵ء میں مزید کمی ہوئی اور ۵۲ ہزار ۷ سو کلومیٹر رہ گئی کیوں کہ حکومتِ وقت نے غیر نفع بخش ٹکڑے بند کر دیے۔ ۱۹۲۶ء میں پھر ریلوے لائن ۵۴ ہزار ۸ سو کلومیٹر تک پہنچ گئی۔

۱۹۳۶ء کے آخر میں حساب پھیلایا گیا تو پتہ چلا کہ اس ملک کی ریلوں کے نظام میں ۲۷ ارب ۴۰ کروڑ جرمن مارک کی رقم لگی ہوئی ہے۔ اس میں سے ساڑھے چھے ارب مارک کی مالیت کے انجن اور ریلوں کے ڈبے تھے اور ساڑھے پانچ ارب مارک کی پٹریاں وغیرہ تھیں۔ اس وقت بھاپ، بجلی اور خام تیل سے چلنے والے انجنوں کی تعداد پونے چھے سو کے قریب اور مسافر گاڑیوں کی تعداد ۶۴ ہزار تھی۔ لائنوں کی کُل لمبائی ۵۵ ہزار کلومیٹر تھی جن پر کم و بیش ایک ارب مسافر سال بھر میں سفر کرتے تھے۔ دیہی علاقوں میں چلنے والی مقامی ٹرینوں اور ان سے سفر کرنیوالے لوگوں کی تعداد ان کے علاوہ تھی۔

دوسری جنگِ عظیم میں بھی اس ملک کے ریلوے نظام پر بہت ہی بُرا اثر پڑا۔ ہوائی جہازوں سے گرائے جانے والے بموں، مشین گنوں اور ڈائنامیٹ کے ذریعے ایسی تباہی پھیلی کہ اس کا تصور محال ہے۔ بڑے شہروں کے تقریباً سبھی ریلوے اسٹیشن مسمار ہو گئے اور اسٹیشنوں کے قریب سامان کے گودام اور سائبان بھی تباہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اندازہ ہے کہ اگر چار لاکھ انسانوں کی آبادی والے کسی شہر کی کل عمارتیں ایک دم منہدم کر دی جائیں تو وہ جرمن ریلوے اسٹیشنوں

کی تباہی کے برابر ہوں گی۔

شدید بربادی کا اندازہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ جب لڑائی ختم ہونے کے بعد احتساب ہوا تو بموں سے اڑ جانے والی پٹریاں کئی کئی میل پرے سے اٹھائی گئیں جن کو جوں کا توں استعمال میں نہیں لایا جا سکتا تھا، سوائے اس کے کہ انھیں پگھلا کر دوبارہ ڈھال لیا جائے۔ ایسی پٹریوں کی کل لمبائی سوا چار ہزار کلومیٹر سے زیادہ تھی۔

مختلف مقامات پر بنے ہوئے ریلوے پلوں کی تعداد ۲۳ ہزار سے زیادہ تھی۔ ان میں سے ۳ ہزار ۲ سو کے قریب تباہ ہو گئے۔ حریف نے زیادہ تر ان پلوں کو نشانہ بنایا جو کثرتِ استعمال کے اعتبار سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ مثلاً دریائے رہائن کے پورے ۲۳، دریائے ویزر کے پورے ۱۱، دریائے مین کے ۲۴ میں سے ۲۳ اور دریائے ڈینیوب کے ۲۴ میں سے ۲۲ پُل بالکل بے کار ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ریلوں کی صحیح نقل و حرکت ایک دشوار مسئلہ بن گئی۔

اور جب ہتھیار ڈال دیے گئے تو عوام کا یہ حال تھا کہ وہ ہر قیمت پر نقل سکونت کرنے کے لیے مُصر تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بڑے شہروں میں اشیائے خورد و نوش کی ایک دم کمی ہو گئی تھی اور بھوک سے مرنے والے انسان چاہتے تھے کہ جلد سے جلد ایسے علاقوں میں پہنچ جائیں جہاں اور کچھ نہیں تو موٹا اناج ہی میسر آ جائے جس سے دوزخِ شکم کو بھرا جا سکے۔ قابض حکومتوں نے، جو ملک کے حصے بخرے کر کے دھنا دے کر بیٹھ گئی تھیں، اس نقل و حرکت کو روکنے کی بہت کوشش کی اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ریل کے کرائے دوگنے کر دیے اور وہ بھی اس طرح کہ مال گاڑی کے ڈبے مسافروں کے لیے استعمال کیے جانے لگے کیوں کہ آرام دہ ریل گاڑیاں تو صرف حکمرانوں اور ان کی فوجوں کے افراد کے لیے مخصوص ہو گئی تھیں۔ پھر روانگی کے وقت کسی مسافر کو پوری طرح یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ میں اس جگہ تک پہنچوں گا بھی یا نہیں جہاں کا ٹکٹ خریدا ہے یا راستے ہی میں اتار دیا جاؤں گا کیوں کہ ایسا کبھی کبھی ہوتا رہتا تھا لیکن جب روانگی بے سر و سامانی کے عالم میں ہو اور کنبے کے پورے افراد ساتھ نہ ہوں بلکہ ان کا پتہ بھی نہ چل سکتا ہو کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں، تو اس فکر سے حاصل بھی کیا تھا۔ ان کے لیے ہر ٹھیراؤ ایک منزل کا کام دیتا تھا۔

۱۹۴۹ء میں جب وفاقی جمہوریت قائم ہوئی تو کل ۳۰ ہزار ۹ سو کلومیٹر ریلوے لائن اس علاقے کے حصے میں آئی۔ اندازہ لگایا گیا کہ اس میں سے ۸ ہزار ۶ سو کلومیٹر سے زیادہ نجی ملکیت میں تھا جس کا کوئی نصف حصہ کارخانوں، کانوں اور مزدوروں کے استعمال میں تھا۔

**باد کروزنگن**: چند منٹ بعد ہماری گاڑی ایک آبادی کے قریب سے گزرنے لگی جسے باد کروزنگن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عموماً اس مقام پر تیز رفتار گاڑیاں نہیں رکتیں کیوں کہ یہاں سے آس پاس کے علاقوں تک لوگ زیادہ تر بسوں سے یا پرائیویٹ کاروں سے سفر کرتے ہیں جن میں کم سے کم وقت صرف ہوتا ہے۔ "باد" جرمن زبان میں ایسے مقام کو کہتے ہیں جو عام اعتبار سے صحت بخش ہونے کے علاوہ گرم معدنی پانی والے چشموں کا مرکز بھی ہو۔ چناں چہ اس مقام کی بیشتر آبادی ایسے مسافروں کی ہے جو حصول صحت کے لیے یہاں آتے، ہوٹلوں اور سراؤں میں ٹھہرتے، گرم اور سرد چشموں کے پانی میں نہاتے، چیڑ کے گھنے جنگل میں سانس لیتے اور عموماً تن درست ہو کر چلے جاتے ہیں۔ صرف ہوٹلوں میں بیک وقت دو ہزار چار سو مسافر ٹھیر سکتے ہیں۔

یہاں کے بعض حمام دو ہزار سال پرانے یعنی رومیوں کے عہد کے ہیں اور اسی زمانے کا ایک محل بھی قابل دید ہے، حالاں کہ اب اس کی حالت ایک کھنڈر سے زیادہ نہیں ہے۔ چوں کہ یہ آبادی ایک تین ہزار آٹھ سو فیٹ اونچے پہاڑ کے دامن میں واقع ہے اور بذاتِ خود سطح سمندر سے ڈیڑھ ہزار فیٹ کی بلندی پر ہے، اس لیے آب و ہوا کے لحاظ سے واقعی عمدہ جگہ کہی جا سکتی ہے۔ اس حقیقت کا ہلکا سا اندازہ تو ہوا کے ان لطیف جھونکوں سے ہو گیا جو اس علاقے میں داخل ہوتے ہی ریل کی کھڑکی سے اندر آنے لگے تھے۔

**گرم معدنی چشمے**: گرم پانی کے چشمے شاید اتنے ہی قدیم ہیں جتنا قدیم اس کرۂ ارض کو کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ اگر ماہرینِ طبقات الارض کا یہ نظریہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ یہ دنیا اپنے قدیم ترین عہد میں آگ کی مانند دہکتے ہوئے ایک نہایت گرم گولے کی مانند تھی تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب پانی پہلے پہل زمین کے دل کی گہرائیوں سے رسنا شروع ہوا یا اُبل کر باہر آیا تو وہ کھولتی ہوئی گرم حالت میں ہوگا۔ پھر کہیں کہیں حرارت پیدا کرنے والے مادوں کی کمی ہو جانے سے پانی کی یہ کیفیت سرد پڑ گئی ہو گی اور چشموں کی سوت نے اپنی سرد مہری دکھانے کے لیے ٹھنڈا پانی اگلنا شروع کر دیا ہو گا لیکن جہاں ان مادوں کی کثیر اور شاید کبھی ختم نہ ہونے والی مقدار نے اپنی "گرم بازی" کا سلسلہ جاری رکھا، وہ چشمے آج بھی اپنی روایتی شان برقرار رکھتے ہوئے برابر کھولتا ہوا گرم پانی اگل رہے ہیں اور شاید رہتی دنیا اگلتے رہیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سے آتش فشاں پہاڑوں کی طرح جو اپنی گرم تابی کے جوہر دکھانے کے بعد ٹھنڈے پڑ گئے ہیں، اسی طرح بہت سے گرم چشموں کا دُف بھی مر گیا ہے اور وہ یا تو

بالکل خشک ہو گئے یا سرد پڑ گئے ہیں اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بہت سے نئے چشموں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ تاہم اس وقت جتنے بھی گرم چشمے دنیا میں موجود ہیں اگر ان کے اوّلین دَور کی چھان بین کی جائے تو شاید انسان کے علم و وقوف سے بہت پہلے کی کوئی تاریخ نکلے گی۔

یوں تو گرم پانی کے چشمے دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں لیکن قدرتی طور پر ان کا زیادہ زور ان علاقوں سے متعلق ہے جو زلفِ محبوب میں پروئے ہوئے دلوں کی طرح طبقاتی اعتبار سے آتش فشاں پہاڑوں کی زنجیر سے وابستہ ہیں اور دیکھا جائے تو یہ زنجیر شیطان کی آنت سے زیادہ طویل اور دنیا کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس زنجیر کی کڑیاں کہیں ایک دوسرے سے الگ ہیں اور کہیں ملی ہوئی ہیں اور چوں کہ سلسلہ طویل ترین بلکہ لامتناہی ہے، اِس لیے اس کی ساخت میں قدرت نے مختلف مادّے استعمال کیے ہیں جن میں گندگ اور شورے کے اجزا سب سے زیادہ ہیں اور باقی کھاری اور نمکین مادّوں کا تناسب اس درجہ متنوع ہے کہ ایک کڑی دوسری سے عموماً کوئی مماثلت نہیں رکھتی۔ اس لیے ایک لحاظ سے یگانگت کا عالم پائے جانے کے باوجود تضاد کا رنگ زیادہ نمایاں محسوس ہوتا ہے۔

پھر جس طرح انسان نے اپنے عہدِ جاہلیت میں ہر چیز کو اس کی خام حالت میں اور عموماً پورے سوچ بچار کے بغیر برتنا شروع کر دیا تھا، یہی حال چشموں کا بھی ہوا۔ ہر شخص نے اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق انھیں استعمال کرنا چاہا اور استعمال کیا۔ کبھی تیر اتفاقاً نشانے پر لگا اور خاطر خواہ فائدہ ہو گیا اور کبھی گناہِ بے لذت کی طرح کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ موخر الذکر صورت میں نمے دار خود چشمے اور اس کے پانی کو ٹھیرایا گیا اور عموماً یہ نہ سمجھا کہ جب ایک زہر بھی صحیح طریقِ استعمال سے، جسے بہت غور و خوض اور عمیق تجربوں کے بعد متعین کیا گیا ہو، تریاق ثابت ہو سکتا ہے تو گرم چشموں کے پانی کی کیفیات اور صلاحیتوں پر کیوں اچھی طرح غور نہ کیا جائے۔

تجسس اور چھان بین کی اسی کمی نے کہیں کہیں قدرت کی دوسری نعمتوں کی طرح ان چشموں کو آسمانی کرامات کا نتیجہ قرار دیا اور بعض قوموں نے ان کی ماہیت و خاصیت کو علمی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی بجائے ان کی پرستش شروع کر دی، بالکل اسی طرح جیسے آتش فشاں پہاڑوں کی تباہ کاری یا سحاب و برق کی گرج اور چمک سے مرعوب و خائف ہو کر ان کی پوجا شروع کی گئی تھی۔

کچھ بعد کے زمانے میں نظریات کسی قدر بدلے لیکن چشموں کے پانی کا تجزیہ کر کے ان کی صحیح افادیت سے باخبر ہونا پھر بھی ضروری نہ سمجھا گیا۔ عام طور پر یہ تسلیم کر لینا تو آسان تھا کہ پانی کا

اثر جلدی، اعصابی یا نظام جسم سے تعلق رکھنے والی بعض بیماریوں کی اصلاح کر سکتا ہے، لیکن نہ تو اصل سبب معلوم کرنے کی کوشش کی اور نہ یہ جاننا چاہا کہ کون سا چشمہ کس بیماری کے لیے کس حد تک اور کس حالت میں مفید ہو سکتا ہے اور یہ یقین کرنے کی تو نوبت ہی نہ آئی کہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی ایسے چشمے بجائے فائدے کے ضرر رساں ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس وقت بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں حقیقتوں کو سمجھے بغیر چشموں کے پانی کا استعمال بہت مقبول ہے لیکن شاید جرمنی ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں عام روش سے ہٹ کر چشموں کے طریقِ استعمال کو ایک مستقل سائنس بنا دیا گیا ہے اور وہ قاعدے منضبط کیے گئے ہیں جو معالجے کے اصولوں کے عین مطابق کہے جا سکتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چشمے کے منبع پر کوئی ماہر کیمیاداں اپنی معدنی دواؤں کا پٹارا لیے بیٹھا ہے اور ترازو میں تول تول کر پیمانوں سے ناپ ناپ کر مخصوص نسخوں کے مطابق ایسے محلول تیار کر رہا ہے جن کے سالہا سال پرانے اسرار و رموز کو سمجھنے میں صرف اہلِ جرمنی کو کامیابی ہوئی ہے۔ چناں چہ اندھا دھند ان چشموں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس ملک میں ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہر مریض تفصیل کے ساتھ اپنا حال بیان کر کے کسی ماہرِ چشمہ جات سے مشورہ لے کر کس علاقے کا کون سا چشمہ کس موسم میں اور کس طرح استعمال کرنے سے اس کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ ایسے ماہرین اپنی تحقیقات کی بنیاد پر جانتے ہیں کہ کس چشمے کے پانی میں کون سے معدنی اجزا کس کس مقدار میں کس درجۂ حرارت کے ساتھ موجود ہیں اور موسمی تغیرات کے ساتھ وہ کب کب بدلتے رہتے ہیں۔ جب تک ان پہلوؤں پر غور نہ کر دیا جائے، کسی مریض کے لیے کسی چشمے کا تعین مناسب نہیں ہوتا۔

ان ماہرین کا دعویٰ ہے کہ مزمن امراض میں خاص طور پر جدید طریقہ ہائے علاج ناکافی ہیں تا وقتیکہ قدرت کا سہارا نہ لے لیا جائے۔ مثلاً تپِ دق کے باب میں محض انجکشن، گولیاں، سفوف یا دوسرے مرکبات اتنا فائدہ نہیں پہنچاتے جتنا کہ آب و ہوا اور غذا کے اثرات اپنا رنگ جماتے ہیں۔ اس ملک میں چشموں کے ماہرین نے تو اپنے فن کو اس درجہ ترقی دی ہے کہ وہ ہر اندرونی اور بیرونی مرض کا علاج صرف چشموں کے پانی سے کر لینے کے دعوے دار ہیں۔ اس موضوع پر کتابیں مرتب ہو گئی ہیں جن کے مطالعے سے ہر مریض کے لیے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ جب تک کس علاقے کے شفاخانوں کے منتظمِ اعلیٰ کو اپنی شکایات کی تفصیل بھیج کر اس کی انقطاعی رائے نہ معلوم کر لی جائے، اس طرف کا رخ نہیں کرنا چاہیے۔

معالج شفاخانے کا تعین کرنے کے ساتھ ساتھ مریض کے رہائشی انتظامات کے بارے میں ہدایات بھی دیتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ گرم چشموں کے قریب جا کر انھی ہوٹلوں یا سراؤں میں ٹھیرا جائے جنھیں اس مقصد کے لیے شفاخانوں کے طور پر تعمیر کیا گیا ہے اور جن میں معالجے کے جملہ لوازم کا خیال رکھا جاتا ہے اور ماہرین کی نگرانی میں ان پر عمل ہوتا ہے۔ اگر چشمے کے صرف گرم پانی میں نہا لینا ہی کافی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مریض شفاخانے کے باہر بھی رہ سکتا ہے اور حسبِ ضرورت غسل کر سکتا ہے لیکن اکثر صورتوں میں مختلف نلکیوں، فواروں یا ٹونٹیوں کے ذریعے انسان کے جسم پر پانی کی دھار، بوچھاڑ، چھینٹے یا چھپکے مارے جاتے ہیں۔ غسل کی مدت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ غسل سے پہلے یا بعد میں جسم پر بعض مفرد یا مرکب دواؤں کی مالش کی جاتی ہے تاکہ سونے پر سہاگہ کے مصداق زیادہ موثر صورت میں فائدہ حاصل ہو۔ غسل کے ساتھ مالش بھی بجائے خود ایک فن ہے اور اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس دوران میں مخصوص غذائیں استعمال کرنی پڑتی ہیں، بلکہ دن رات کے چوبیس گھنٹے ایک مقررہ نظام اوقات کے ماتحت گزارنے پڑتے ہیں۔

جرمنی کا سرکاری سیاحتی ادارہ اس مقصد کے لیے سب سے عمدہ وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے خط و کتابت کرنے اور کسی آخری فیصلے پر پہنچنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈوئشر باڈر بانڈ "یعنی صحت گاہوں کی جرمن انجمن" کے نام سے ایک نجی ادارہ بھی قائم ہے جس کی شاخیں اور دفاتر ہر جگہ موجود ہیں۔ ادارے کے دفاتر اطلاعاتی اور مشاورتی اور پھر معالجوں سے متعارف کرانے میں "مشاطگی" کی خدمات انجام دیتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض صحت گاہوں میں جا کر رہنا اور وہاں کا خرچ برداشت کرنا اکثر لوگوں کے لیے بار ثابت ہوتا ہے، اس لیے غریب طبقے کے افراد مجبوراً ان سے اجتناب کرتے اور گرم چشموں سے اسی طرح استفادہ کرتے ہیں جیسے کراچی شہر میں بہت سے ضرورت مند لوگ منگھو پیر جا کر وہاں کے گرم چشمے کے پانی میں نہا لیتے ہیں اور صرف آمد و رفت کا کرایہ ادا کرتے ہیں۔ کراچی کے علاوہ بھی سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے کئی علاقوں میں گرم پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں لیکن افسوس کا مقام ہے کہ حکومت نے اب تک صحیح انداز میں ان سے فائدہ اٹھانے کی صورت پیدا نہیں کی ہے، اس لیے اکثر مقامات پر قدرت کی یہ ایک عظیم نعمت ضائع ہوتی رہتی ہے۔ دوائی خصوصیات کا

حائل گرم پانی چھپی ہوئی سوت سے باہر نکلتا اور گھاٹیوں، وادیوں یا میدانوں میں بہہ کر خشک یا واپس زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ بجائے فائدے کے اس سے الٹا نقصان پہنچتا ہے یعنی اپنی گزرگاہ کے آس پاس کی زمین کو بنجر بنا دیتا ہے اور اس طرح انسان کی غفلت و بے اعتنائی کا انتقام لیتا ہے۔ منگھو پیر میں ایک چشمے کی سوت سے کوڑھیوں کے اسپتال کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن اسے بھی خاطر خواہ نہیں کہا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک میں ہر گرم چشمے کی معدنی صلاحیتوں کا باقاعدہ جائزہ لے کر معلوم کیا جائے کہ وہ کن کن مریضوں کے لیے صحت و تن درستی کا ضامن بن سکتا ہے۔ اگر حکومت ہمدرد وقف کو یہ نیک کام کرنے کا موقع دے تو اس منزل میں اس کا پہلا قدم رفاہِ عوام کے لیے اٹھ سکتا ہے اور وہ پاکستان میں جرمنی کی صحت گاہوں کا نمونہ پیش کر سکتا ہے۔

جرمنی میں ہم دونوں بھائیوں کی سیاحت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ گرم چشموں اور ان سے متصل صحت گاہوں کو دیکھا جائے اور ان کے طریق کار اور اندازِ علاج کو اچھی طرح سمجھا جائے۔ اگرچہ اس مقصد کو پورا کرنے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اکثر چشمے بڑی آبادیوں سے دور پہاڑوں کے ایسے دامنوں میں واقع ہیں جو ہمارے راہ نامے میں شامل نہیں ہیں لیکن اس خیال سے کہ اکثر شفا خانے ایک ہی نظام کے ماتحت چل رہے ہیں، ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ فرینکفرٹ پہنچ کر اس کے آس پاس کے شفا خانوں کو دیکھ لینے پر اکتفا کریں گے جن تک نہ صرف ہماری رسائی ممکن ہے بلکہ وہ کئی لحاظ سے مشہور ہیں اور مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ وہاں مثانے، جگر، معدے اور آنتوں کے مزمن امراض کے علاوہ ان بہت سی رئیسانہ بیماریوں کا علاج بھی ہوتا ہے جو عہدِ حاضر کی تہذیب نے انسان کو تحفے کے طور پر دی ہیں جسے بخوشی قبول کر کے وہ بری طرح پچھتا رہا ہے کیوں کہ اب اس سے دامن کش ہو جانا بھی ممکن نہیں ہے۔

میں نے عارضی طور پر مطالعۂ کتب کو ترک کر کے مشاہدۂ قدرت سے لطف اٹھانا شروع کر دیا۔ یہاں سے بہت دور تک کا سارا علاقہ عرفِ عام میں "سیاہ جنگل" کہلاتا ہے جسے جرمن زبان میں شوارز والڈ کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے مقامات پر آسمان سے باتیں کرنے والے گھنے درختوں، ان پر لپٹی ہوئی بیلوں، جھاڑیوں اور پودوں نے مل ملا کر اندھیرے کی حد تک گہرے سایوں کے نقش جما رکھے ہیں۔ کہیں کہیں چھن چھن کر سورج کی شعاعیں دھوپ چھاؤں کا جو لطیف سماں پیدا کرتی ہیں، وہ بجائے خود دل فریب ہو جاتا ہے اور دل فریب

ہی نہیں، شاید دل کی لگی بجھانے کے مواقع بھی پیدا کر دیتا ہے۔ غالباً کسی ایسی ہی فضا میں رہ کر شاعر نے بے تابانہ انداز میں کہہ دیا ہے ؎

یہ ہوائے سرد، یہ سبزہ، یہ منظر دیکھ کر
کیا بتائیں، ہم کہ کیا عالم ہمارے دل کا ہے

لیکن اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ یہ سارے کا سارا علاقہ جو کئی ہزار مربع میل میں پھیلا ہوا ہے ایک گوشۂ تاریک کی مانند ہے اور اس لیے یہاں انسانی آبادیاں کم ہوں گی اور ان کے بجائے یہ ان جنگلی جانوروں کی آماجگاہ ہوگا جو فطرتاً تاریکی پسند ہوتے ہیں اور روزِ روشن کے بجائے شبِ تاریک میں اپنے کنجوں سے باہر آتے ہیں۔ حقیقتاً ایسا سوچنا یکسر غلطی ہے کیونکہ دراصل یہ پہاڑی علاقہ اتنا شاداب ہے کہ سبزہ زاروں میں گویا کائی کی تہہ جمی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کا رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ دور سے سیاہ معلوم ہوتا ہے۔ چناں چہ اسے "سیاہ جنگل" کہنے کا اصل سبب یہی ہے۔ بلکہ ہمارے خیال میں تو لفظ "جنگل" کا اطلاق بھی اس علاقے پر نہیں ہوتا کیوں کہ یہاں چپے چپے پر روایاتِ قدیم کے حامل باشندوں کی بستیاں ہیں جو نہ صرف کھیتی باڑی بلکہ صنعت و حرفت اور ہر قسم کے کاروبار میں حصہ لیتے ہیں اور چوں کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لباس قدیم قومی انداز میں نہایت شوخ خصوصاً سرخ اور قرمزی رنگ کے ہوتے ہیں، اس لیے قدرتی سبزے کے سامنے وہ آنکھوں میں کھپ جانے والی ایسی چمک دمک پیدا کرتے ہیں کہ تاریکی کا گمان بھی قریب آنے نہیں پاتا۔

یہاں ہر طرف وسیع چراگاہیں اور دل پذیر مرغزار ہیں جن کے سروں پر سر اٹھانے والی ساڑھے تین چار ہزار فیٹ بلند پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں جن میں سے بعض موسمِ سرما میں برف سے ڈھک کر سفید بھی ہو جاتی ہیں اور یہ سفیدی بھی قدرتی سبزے کے سامنے وہ رنگِ تضاد پیدا کرتی ہے جس سے سیاہ جنگل کی تاریکیاں ویسے بھی راہِ فرار اختیار کرتی ہیں۔

سیاہ جنگل دریائے رھائن کے مشرقی ساحل پر سوئزرلینڈ کی سرحد پر شروع ہوتا اور جانبِ شمال کارلس روھے تک پہنچ جاتا ہے جو ایک قدیم تاریخی شہر ہے جس کے بعض آثارِ قدیمہ اس علاقے میں رومی عظمت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چند اور شہر بھی قابلِ ذکر ہیں، مثلاً فریئی برگ اور باڈن باڈن جن کی تاریخی حیثیت تو زیادہ اہم نہیں لیکن حسنی اور لحاظ سے انھیں نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

سیاہ جنگل کا سارا علاقہ جس صوبے کے جنوب مغربی سرے پر واقع ہے، وہ باڈن ورٹم برگ کہلاتا ہے اور یہ بھی ملک کے اہم صوبوں میں شمار ہوتا ہے۔ ہمارے پروگرام کا ابتدائی حصّہ اسی صوبے میں عملی جامہ پہنے گا۔

**کتابوں کی خریداری**: کچھ دیر بعد فرئی برگ کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں نیچے اتر گیا۔ بھائی جان محترم ڈبے ہی میں بیٹھے کچھ پڑھتے رہے۔ یہاں بھی اپنے ملک اور بعض دوسرے ملکوں کی طرح پلیٹ فارم پر بڑی چہل پہل تھی۔ قلیوں کی کمی کے باعث اکثر لوگ اپنا سامان خود اٹھائے لیے جا رہے تھے۔ بعض سودا بیچنے والے بھی گشت کر رہے تھے۔ لیکن میرے لیے سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ایک بک اسٹال ہوا جہاں پہنچ کر اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ جرمن زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی بھی کچھ کتابیں اور رسالے موجود ہیں۔ شاید اس لیے کہ وفاقی جمہوریہ بن جانے کے بعد بھی وہاں امریکی اثر و اقتدار بیّن طور پر محسوس ہوتا ہے اور یہ بھی غنیمت ہے کہ میری معلومات کی حد تک یہ اثر و اقتدار زبان تک محدود ہے، جاپان کی طرح نہیں جہاں امریکی تہذیب نے طلوعِ شمس والی سرزمین کی دیرینہ روایات کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا اور معصومیت کے بجائے فحاشی اپنا رنگ جمائے نظر آتی ہے۔

قصے کہانیوں اور ناولوں کے بجائے میں نے تاریخی کتابوں کا جائزہ لیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ کتاب جس کی مجھے عرصے سے تلاش تھی، یہاں مل گئی۔ میں نے پاکستان کے کسی انگریزی اخبار یا رسالے میں ہٹلر کے پریس چیف اوٹو ڈائٹریخ کی کتاب "ہٹلر میری نظر میں" پر تبصرہ پڑھا تھا اور اس روز سے بالاستیعاب پوری کتاب پڑھنے کی آرزو تھی۔ اس سے قبل جتنی کتابیں پڑھی تھیں، ان میں تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کیا گیا ہے۔ یعنی جرمنی پر فتح پانے والوں نے اپنی ہمت و شجاعت کا رنگ جمانے اور سیاست دانی و جنگ آزمائی میں اپنی برتری کا لوہا منوانے کے لیے ہٹلر کے عزائم کو اوہام خیالی اور اس کے اجتہاد کو جارحانہ اقدامات سے تعبیر کیا ہے اور سنجیدگی کی سطح سے گر کر اس بطلِ عظیم کے خلاف وہ مذموم اندازِ بیان اختیار کیا ہے کہ اسے پڑھ کر ہٹلر کی بعض کمزوریوں کو ماننے والے بھی اس کی عظمت کا اعتراف کرنے لگتے اور اس کی شکست میں دوسروں کی ہزیمت کا احساس پانے لگتے ہیں۔

میں نے کتاب کے تبصرے میں پڑھا تھا کہ مصنف نے بڑی حد تک غیر جانب دار رہ کر اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ابتدائی ورق گردانی کرتے ہی دیباچ کے یہ الفاظ میری توجہ کا

مرکز بن گئے :-

"خود میری طرف سے اور اہلِ جرمنی کی طرف سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان کے پیشِ نظر اپنی دانست میں یہ سراپا میں نے بڑے خلوص کے ساتھ کھینچا ہے، ایک ایسے مبلّغ کی طرح جو ناتسی مسلک پر ایمان رکھتا ہو۔ میں نے ہٹلر کے کردار کی عکاسی بہت صفائی لیکن ایمان داری کے ساتھ کی ہے اور اس طرح اس کو بہت سے اہلِ جرمن کے دلوں کے قریب تر لانے میں ممد و معاون ہوا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ میرے بیان میں حسبِ ضرورت تلخی اور بے باکی بھی پائی جاتی ہے، جس کے اظہار میں حقیقت سے زیادہ انحراف نہیں کیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے ہٹلر کے بجائے اس کی قوم کے مفاد کو مدِ نظر رکھا ہے۔ یہ آخری الفاظ بھی کس درجہ غور طلب اور معنی خیز ہیں۔

مجھے حقیقتاً ایسی ہی کتاب کا مطالعہ کرنے کی ضرورت تھی۔ حالاں کہ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ان تمہیدی الفاظ کے باوجود مصنف نے خود ہی اپنے قلم پر کافی احتساب روا رکھا ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو نہ تو کتاب کسی لندن کے مطبع سے شائع ہوتی اور نہ امریکی اور برطانوی دل و دماغ جنھیں جرمنی کی سرزمین سے کنارہ کشی کر لینے کے باوجود وہاں ہنوز اقتدار حاصل ہے، اسے کبھی معاف کرتے اور کتاب کو کھلے بندوں بکنے بھی نہ دیتے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ تصنیف مصنف کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔

اوٹو ڈائٹریچ نے حقِ قربت ادا کرنے کے لیے نہ تو ہٹلر کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی ہے اور نہ دوسرے مصنفوں کی طرح دباغت میں رہ کر اس کی مذمت کی ہے۔ اس نے ہٹلر کو نوعِ انسان کا ایک فرد سمجھا اور اسی رنگ میں پیش کیا ہے —— ایک ایسا فرد جو اپنی غیر معمولی صلاحیت و استعداد بلکہ ذہانت و نابغیت کے باوجود غلطی بھی کر سکتا ہے، جس کے اٹل فیصلوں کو بعض لوگ عزمِ صمیم اور بعض ہٹ دھرمی سے تعبیر کرتے ہیں۔ سوچنے کی بات صرف یہ ہوتی ہے کہ لوگوں نے اپنی رائے اس فرد کی ناکامی سے قبل قائم کی ہے یا اس وقت جب کہ وہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن تھا۔ شیر جب مر جاتا ہے تو چیل کوّے اس کی نعش پر بیٹھ کر ٹھونگیں مارا ہی کرتے ہیں، لیکن اس سے شیر کی خداداد طاقت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یہ عین ممکن تھا کہ ہٹلر اپنی بے پناہ یلغار میں مسلسل فتح و نصرت کی دیوی سے ہمکنار ہوتے

کی طرح انجام کار اپنے آخری عزائم میں بھی کام یاب رہتا اور آج دنیا کی تاریخ بالکل بدلی ہوئی نظر آتی۔ اس سے اپنی حدود کے سمجھنے میں جو غلطی ہوئی وہ اس کی عظمت پر پانی پھیرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ تنی ہوئی رسی پر چل کر کرتب دکھانے والا کوئی مانا ہوا بازی گر اگر اتفاقاً توازن بگڑ جانے سے گر جائے تو اسے اناڑی نہیں کہا جاتا۔ اس کے کمالات کی تعریف اہلِ نظر پھر بھی کرتے ہیں۔ تو پھر ہٹلر کو برا کہنے والے اپنے ضمیر کی آواز کیوں نہیں سنتے؟

مجھے ایک اور کتاب بھی خرید لینی پڑی ——" جرمنی کی موت اور زندگی" —— یہ امریکی عہدِ تسلط کا قصیدہ ہے۔ اس کے مصنف یوجین ڈیوڈسن نے گویا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امریکا نے جرمنی کو ہٹلر کے ہاتھوں نیست و نابود ہو جانے کے بعد نئے سرے سے زندگی عطا کی ہے۔ اس میں جرمن رائخ کے اس چانسلر کو خوب کوسا پیٹا اور ملعون کیا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ تلاشِ حقیقت کی سعی و کاوش میں تصویر کے اس دوسرے رُخ کو دیکھ لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

**ڈبے میں اجنبی:** جب میں ریل کے ڈبے میں واپس آیا تو میں نے محسوس کیا کہ بازل سے سوار ہونے والے بعض مسافر اس اسٹیشن پر اتر گئے ہیں اور بعض نئے مسافر سوار ہو گئے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ سفر کی ہر منزل پر یہی ہوتا ہے۔ لیکن قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ ایک صاحب جو شکل و صورت سے جرمن ہی معلوم ہوتے تھے، بھائی جان محترم کے قریب میری نشست پر اس طرح بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے تھے جیسے وہی شروع سے ان کے ہم سفر تھے اور اب نووارد یا اجنبی وہ نہیں بلکہ میں تھا۔

مجھے ایک لمحے کے لیے اپنی ہستی پر شبہ سا ہونے لگا۔ میں میں ہوں، وہ وہ ہے، یا میں وہ ہوں اور وہ میں ہے؟ —— لیکن یہ سوال تو کچھ تصوف کا سا گورکھ دھندا بن گیا تھا۔ اسے ترک کر کے میں سامنے کی سیٹ پر جو اس وقت خالی پڑی تھی، خاموش بیٹھ گیا۔

بھائی جان محترم جو میری واپسی سے قبل یقیناً اس اجنبی سے باتیں کرتے رہے تھے، میری طرف متوجہ ہونا اور نئی خریدی ہوئی کتابوں کا جائزہ لینا چاہتے تھے، لیکن اجنبی نے موقع نہ دیا۔ اس نے گفتگو کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سنبھال لیا۔ وہ بہ ظاہر انگریزی زبان سے کم واقف معلوم ہوتا تھا اور ذرا رک رک کر بول رہا تھا لیکن جب جوش میں آیا تو اپنا رنگ جما دیا۔

۔ ۔ ۔ تو سمجھے آپ ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ دس سال سے زیادہ مدت گزر جانے کے بعد اب بھی محسوس ہوتا ہے کہ لوہے کا خود سر پر رکھ کر، ہتھیار سنبھال کر فوراً صف آرا ہو جانے کے لیے کوئی ہمیں حکم دے رہا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ہم ایک بار پھر گولیاں برسانے بلکہ بم پھینکنے کے لائق ہو جائیں۔ ہاں گولیاں اور بم ان پر جو ہم سے زیادہ قرمزی رنگ کے ہیں، جو سمندر پار سے ہماری اصلاح کے لیے آئے ہیں۔ ہمیں جمہوریت کا سبق دینے، انسانی حقوق کے احترام کی تلقین کرنے۔ ان کم بختوں نے اس منزل تک پہنچنے کے لیے وہ ہتھکنڈے استعمال کیے جنھیں دوسرے عمل میں لائیں تو بُرا کہتے ہیں۔ یہ کم بخت قرمزی لوگ۔ خدا انھیں غارت کرے۔ بظاہر یہاں سے چلے گئے لیکن اپنی ذرّیات اور اپنے فاسد اثرات چھوڑ گئے ہیں۔ ایک زہر باد ہماری قوم میں پھیلا دیا ہے۔ اسی کے زیرِ اثر خود ہماری قوم کے افراد ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو بُرا کہتے ہیں۔ اخلاقی اعتبار سے یہ ہماری پستی کی انتہا ہے۔ صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اگرچہ اس منزل میں آگے بڑھنا بھی ہمارا قومی شعار ہے لیکن زمانے کے تغیّر کے ساتھ جو اخلاقی قدریں بدلی ہیں، ان کا ماتم کس طرح کیا جائے، ان قرمزی لوگوں کا سینہ کوٹ کر؟ ہاں جی تو چاہتا ہے لیکن مجبوری ہے۔ خود ہماری قوم نامرد ہو چلی ہے۔ اپنے دل و دماغ سے سوچنا نہیں چاہتی۔ ہر چیز امریکی چھلنی میں چھن کر آتی ہے اور آسانی سے قبول کر لی جاتی ہے۔"

اس نے مبہم پیرایۂ بیان سے ہٹ کر اپنے ہدفِ ملامت کو بے نقاب کر دیا۔ جرمنی کی ریل گاڑیوں میں خفیہ پولیس کے افراد یا تو "غداروں" کی ٹوہ میں سفر نہیں کرتے یا یہ اجنبی ان سے بے خوف تھا بلکہ انھیں چیلنج کر رہا تھا کہ ہمت ہو تو اس مردِ میدان کو پکڑ لو۔

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیا اور پھر شروع ہو گیا:

"ہمارے نوجوان اپنے قومی گیت تک بھول گئے۔ بیتھوون اور موزارٹ کے نغمے ساز کے تاروں میں سو گئے۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ۔۔۔۔ گاڈ۔ چہرے کو قرمزی بنا دینے والا گیت جس میں وحشیانہ پن زیادہ اور سُبک خرام ندیوں کا سا لوچ کم ہے۔ بھلا وہ گیت کیا ہوئے جو اولوالعزمی اور ثابت قدمی کی تخلیق کرتے ہیں۔ اِس وقت کی ہماری موسیقی موت کا ایک رقص ہے جس کا مظاہرہ قومی نعش کے سرہانے ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ کانوں میں رُوئی ٹھونس لیں یا ہمیشہ کے لیے بہرے ہو جائیں۔"

"اوہ! تم نے بھی یہ کتابیں خرید لیں!" ــــــ وہ ایک دم میری طرف اس طرح متوجہ ہوا کہ

غیر متوقع ہونے کے باعث میں چونک پڑا۔ میں اس کی سب باتیں کانوں سے سن رہا تھا اور ذہنی اعتبار سے نہ جانے کہاں پہنچا ہوا تھا۔ جرمنی کے نشیب و فراز اور فراز و نشیب مجھے مٹتے ہوئے نقوش والی مدھم تصویر کی طرح نظر آرہے تھے۔ مجھے اس شخص سے ہمدردی ہو رہی تھی جس کا دل یقیناً رو رہا تھا لیکن آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔

"تم نے اپنی جیب خواہ مخواہ ہلکی کردی۔ یہ رقم کسی بہتر کام پر صرف ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ جانتے ہو یہ کتابیں کیسی ہیں؟ ایک کونین کی گولی ہے، جس طرف سے چکھو، کڑوی ہوگی اور دوسری شکر چڑھی ہوئی وہی چیز ہے۔ قرمزی لوگوں کے دلوں کی طرح۔ اندر سے کڑوی اور بظاہر میٹھی۔ دونوں جلا دینے کے لائق ہیں لیکن مجھے کیا حق ہے کہ تمھیں نقصان پہنچاؤں۔ پڑھنے کے بعد تم خود محسوس کروگے کہ یہ سودا اچھا نہیں رہا۔ وہ مصنف تو اب خواب و خیال کی دنیا سے بھی پرے جا بسے، جو اپنی مرضی، اپنے ارادے، اپنے فیصلے اور اپنی صائب رائے کے مطابق قلم اٹھاتے اور بے خوف و خطر تنقید و احتساب کے اندیشے سے خالی الذہن ہو کر سب کچھ لکھ جاتے تھے، بالکل بے کانہ انداز میں ——— اور اب یہ حال ہے کہ واقف کاروں کے گلے شکوے، ان جانوں کے تبصرے اور ارباب اقتدار کی کڑی نظریں انھیں معینہ دائرے سے باہر نکلنے نہیں دیتیں ان کے قلم اٹھتے نہیں، اٹھائے جاتے ہیں۔ پھر تحریر میں خلوص، صداقت اور اثر انگیزی کہاں سے پیدا ہو۔ یہ کتابیں جو تم نے خریدی ہیں، کیا تم سمجھتے ہو کہ مصنفین کے اصل خیالات و محسوسات کی آئینہ دار ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت جلد نہ وہ صفحۂ ہستی پر رہتے اور نہ ان کی کتابیں اپنا رنگ جمانے کے لیے باقی رکھی جاتیں۔ تم ان کو پڑھوگے تو میرے بیان کی تکذیب کروگے، کیوں کہ بعض باتیں کھری بلکہ طنز آمیز معلوم ہوں گی۔ یہی تو اعلیٰ سطح کی سیاست ہے۔ میٹھی چیزیں کھاتے کھاتے جب منھ کا مزا خراب ہو جاتا ہے تو کسی سلونی یا کھٹی چیز سے اسے بدلا جاتا ہے تاکہ دوبارہ میٹھی چیزوں کی حلاوت زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہو اور اس کا نتیجہ سحر انگیز رہے۔ تمھیں "ہٹلر میری نظر میں" کا مطالعہ کرنے سے پہلے جرمن قوم کے کردار، اس کی خصلت اور اس کے میلانات و رجحانات کا عمیق مطالعہ کرنا ہوگا۔ تب بہت سی باتیں سمجھ میں آئیں گی اور شاید اس وقت میری طرح تم بھی یہ سمجھنے کے لائق ہو جاؤگے کہ اوٹو ڈائٹریخ نے جو کچھ لکھا، کسی دباؤ اور جبر کے ماتحت لکھا ہے لیکن کہیں غیر دانستہ طور پر اس آورد میں حقیقی آمد کا رنگ چڑھ گیا تو نہ لکھنے والے کو اور نہ لکھوانے والے کو اس کا احساس ہو سکا ہے اور اس طرح وہ

چیز اپنے اصل روپ میں نظر آگئی ہے جسے چھپانے کے لیے لاکھوں جتن کیے گئے تھے۔ اب ضرورت صرف نظر کی ہے جو سامنے گرائے ہوئے دبیز نقاب کو چاک کر کے صحیح رنگِ رُخ کو دیکھ لے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض تلخ حقیقتیں تو یوجین ڈیوڈسن سے بھی اِس دوسری کتاب "جرمنی کی زندگی اور موت" میں بے نقاب ہوگئی ہیں لیکن اس نے ہٹلر کو اور جرمنی میں دورانِ جنگ کے اربابِ اقتدار کو جس سیاہ رنگ میں پیش کیا ہے، وہ خود اس کی جانب داریت کا مضحکہ اڑاتا ہے۔"

وہ خاموش ہوگیا اور میں سوچنے لگا کہ موقع غنیمت ہے۔ وقت سے فائدہ اٹھا کر دل کی ایک خلش کو دور کر دیا جائے۔ اس ملک کی سیاحت سے بہت پہلے یہ خیال بار بار دل میں آتا تھا کہ کسی جرمن سے استفسار کروں کہ ایڈولف ہٹلر کے بارے میں اس کی اپنی بے لاگ رائے کیا ہے۔ دورانِ جنگِ عظیم اور بعد کے اثرات نے بہت سی قوموں کے افراد سے ان کی صائب رائے چھین لی تھی۔ اہلِ جرمنی سب سے زیادہ متاثر ہوئے، کیوں کہ جو زبردست تباہی اس ملک پر آئی، اس کی نظیر کہیں اور مشکل سے ملے گی اور جب اس کا ذمہ دار صرف ایک شخص کو ٹھیرایا گیا ہو تو قدرتی طور پر عقل نے عام دلائل کو قبول بھی کر لیا لیکن بسا اوقات اضطراری کیفیات کے زیرِ اثر بعض باتیں مان بھی لی جائیں تو ان کا ثبات اس اعتراف کے مانند ہوتا ہے جو غنودگی کے عالم میں کر لیا گیا ہو اور آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی اس کا احساس ہو جائے۔ معلوم کرنا یہ تھا کہ اب وفاقی جمہوریہ بن جانے کے بعد لوگوں کے تاثرات کیا ہیں۔ اس شخص کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان کو پسند کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ طبع آزمائی اس پر کی جائے۔ چناں چہ میں نے بے دھڑک سوال کیا ——"اس وقت کی فاتح اقوام نے تمھارے فیوہرر کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے، جو الزامات اس پر لگائے ہیں اور جس سیاہ رنگ میں اس کے کردار کی عکاسی کی گئی ہے، اس کے بارے میں تمھاری ذاتی رائے کیا ہے؟"

میرے اس استفسار نے اس کے احساسات کو بری طرح متاثر کیا۔ وہ گاڑی کی کھڑکی کے باہر مخالف سمت میں دوڑتی ہوئی کائنات کو اس طرح ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہ گیا، گویا اپنی گنششِ نظر سے اس حرکت میں ایک ٹھیراؤ پیدا کر دینا چاہتا تھا۔ قوتِ گویائی ایک دم سلب سی ہوگئی تھی۔ اس نے نہ تو پلک جھپکائی اور نہ کوئی لفظ زبان سے نکالا۔ البتہ سانس کی تیز آمد و شد، سینہ کا مسلسل نشیب و فراز اور ہر آن بدلتا ہوا رنگِ رُخ —— یہ سب مل جل کر اس کے تاثرات کی غمازی کر رہے تھے۔ میں نے اسے دوبارہ چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ جب خاموش نگاہوں کی زبان کو سمجھا جا سکتا

ہو تو بیان کی قوت کو شرمندۂ الفاظ بنانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

کچھ دیر میں وہ اٹھا اور دروازے کے قریب کھڑکی سے باہر سر نکال کر اس طرح دیکھنے لگا گویا اگلے اسٹیشن کے انتظار میں ہو کہ کب وہ آئے اور باہر نکل کر اس خلش سے نجات پائی جائے جو یقیناً ہم نے پیدا کر دی تھی اور جس کا مجھے افسوس تھا۔

**فری برگ**: بھائی جان محترم نے کنکھیوں سے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا مدھم لہجے میں مجھ سے کہا، "تمھارے آنے سے پہلے بھی اس نے بہت سی باتیں کیں لیکن زیادہ تر اس شہر کے بارے میں تھیں، یہاں گاڑی رکی تھی۔ شاید وہ اسی شہر کا رہنے والا ہے۔ اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ مختصر الفاظ میں اس مقام کی غائبانہ سیر اس طرح کرا دی کہ بچشم خود دیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ گاڑی سے اتر کر شہر میں جانا ہمارے لیے ممکن بھی نہیں ہے اور نہ وہاں کا قیام ہمارے پروگرام میں شامل ہے۔

فری برگ سیاہ جنگل والے علاقے کا صدر مقام اور جنوبی باوڈن کا سب سے بڑا شہر ہے۔ قابلِ دید دو چیزیں ہیں — قدیم یونی ورسٹی اور قدیم کلیسا — دونوں عمارتوں کو لڑائی کے زمانے میں نقصان پہنچا تھا لیکن بہت جلد مرمت ہو گئی اور پہلے سے زیادہ رونق آ گئی۔ آبادی سوا لاکھ کے قریب ہے لیکن بیشتر افراد ان روایات کے حامل ہیں جنھیں جرمن تمدن کا جزو کہا جا سکتا ہے۔ بعض غیر ملکی سیاح خصوصاً امریکی لوگ یہاں آتے اور کلیسا دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ ڈیرے ڈال کر نہیں رہتے، حالاں کہ فری کے معنی آزادی یا چھٹی کے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کسی زمانے میں بہت سے لوگ اپنی تعطیلات، خواہ وہ مدرسے کی ہوں یا کسی کاروبار کی، اسی جگہ گزارنے آتے تھے۔ یہاں کی پُرسکوت فضا ان کے لیے پُرسکون ثابت ہوتی تھی۔ قریب کے پہاڑوں سے جو شہر کے ایک سرے پر بالکل دیوار کی طرح کھڑے ہیں، آبادی پر نظر ڈالی جائے تو قدیم کلیسا سب سے نمایاں نظر آتا ہے، جس کے بہت سے مینار ہیں۔

وہ بارھویں صدی کے آخر میں بننا شروع ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ بنتا رہا اور تکمیل میں تین صدیاں ختم ہو گئیں۔ طرزِ تعمیر میں انفرادیت کے علاوہ اس کے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے نقاشی کے شاہکار ہیں، جو تیرھویں اور چودھویں صدی کے یادگار ہیں، بلکہ ان ہی میں سے چند، جن کا نعم البدل یا نقشِ ثانی ممکن ہی نہیں تھا، الگ کر کے آگسٹینر کے عجائب گھر میں محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ بعض دیواروں پر مصوری کے نمونے بھی شاہکار کہے جا سکتے ہیں جو اگرچہ نصرانی

روایات کے ترجمان ہیں، لیکن فن کے اعتبار سے بھی ان کی اہمیت مسلّم ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب سولھویں صدی میں مذہبی اصلاحات کا دور یورپ میں شروع ہوا اور سوئزرلینڈ کے کلیساؤں سے بہت سے قدامت پسند پادریوں کو مار بھگایا گیا تو انھوں نے یہیں آکر اس کلیسا میں پناہ لی تھی۔

یونی ورسٹی پندرھویں صدی کے وسط میں قائم ہوئی تھی لیکن اب بھی جرمنی میں اہم درس گاہوں میں اس کا شمار ہوتا ہے کیوں کہ نصابِ تعلیم میں کلاسیکی انداز کو برقرار رکھا گیا ہے۔

ایک اور قابلِ ذکر چیز مارٹن والڈسی مُلر کا مقبرہ ہے۔ آس پاس کا علاقہ اسی ہستی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ پہلا جغرافیہ دان نقشہ نویس تھا جس نے اپنے اندازے کے مطابق دنیا کا نقشہ بناتے ہوئے تاریخ میں پہلی بار ایک برِاعظم کا نام امریکا درج کیا ـــــ اس سے قبل اس سرزمین کو جو ایک نئی دریافت تھی، مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔ چناں چہ اس علاقے میں آنے والے امریکی سیاح اس مقبرے کی زیارت ضرور کرتے ہیں، کیوں کہ وہ اسے "امریکا کی جنم بھومی" کہتے ہیں۔

گاڑی کی گڑگڑاہٹ میں کبھی کبھی بھائی جان محترم کی آواز ذرا دب کر رہ جاتی تھی لیکن میں نے سب باتیں بہت دل چسپی اور غور سے سنیں اور اپنے حافظے کی لوح پر محفوظ کر لیں۔

بھائی جان محترم نے خاموش ہو کر ان کتابوں پر نظر ڈالی جو میں خرید کر لایا تھا اور ان میں سے ایک کو اٹھا کر باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے ان کے سامنے سے وہ کتابچہ اٹھا لیا جو جرمنی سے متعلق عام معلومات کے بارے میں وہاں کے سرکاری محکمۂ اطلاعات نے شائع کیا ہے۔ دورانِ سفر میں جب خیالات کا سلسلہ ٹوٹتا اور جڑتا رہتا ہے، ایسی چیزیں زیادہ مناسب رہتی ہیں۔ اس وقت ٹھوس مضامین کا مطالعہ زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کی ورق گردانی سے میں نے اپنی سابقہ معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔ چناں چہ جرمنی اور اہلِ جرمنی کے بارے میں بعض نئی باتیں مطالعہ میں آگئیں جو اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھیں۔

**جرمن اور جرمنی: وجہ تسمیہ:** جرمن کس قوم یا قوم کے افراد کا نام ہے اور جرمنی کس سرزمین کو کہتے ہیں؟ ـــــ یہ ایک چیستان ہے، ایک ایسا معمہ ہے جسے آسانی سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ کی بہت سی کتابوں میں بھی یہ چیستان ہی رہا ہے اور مورخین نے دامن بچا کر اس طرح گزر جانے کی کوشش کی ہے کہ انھیں اس ہوشیاری کی داد دینی پڑتی ہے۔

انگریزی زبان میں مشہور ناموں کی ایک فرہنگ ہے جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ ہر شخص اور مقام کی تفصیل و تشریح اس میں موجود ہے لیکن یہ دعویٰ "جرمن اور جرمنی" کی تحقیقات کے وقت باطل ہو جاتا ہے بلکہ مرتب کرنے والوں کی قابلیت پر شبہ ہونے لگتا ہے اور ان کی عقل کا ماتم کرنا پڑتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جرمن اس قوم کا نام ہے جو جرمنی میں رہتی ہے اور جرمنی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سرزمین کا نام ہے جہاں جرمن لوگ رہتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں جسے برطانوی فرمانرواؤں کی بیاض کہا جاتا ہے، لکھا ہے کہ جرمنی کے نام کی وجہ تسمیہ پر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گول علاقے والوں کی اصطلاح ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ خود جرمنوں نے اپنے ملک کو کبھی جرمنی نہیں کہا۔ پھر کیا کہا؟ —— یہاں مرتب کا قلم خاموش ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جرمن اپنے ملک کو ڈوئتش لانٹ کہتے ہیں۔ لیکن اس "بیاض" میں اس لفظ کے بارے میں صرف اتنا ہی لکھنا کافی سمجھا گیا کہ یہ جرمن زبان میں جرمنی کا نام ہے۔ اس سے زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ خود جرمنی کے محکمۂ اطلاعاتِ عامّہ نے جو کتابچہ شائع کیا ہے، اس میں بھی اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ معلوم نہیں کہ انھوں نے اسے ضروری نہیں سمجھا یا انھوں نے بھی اپنی لاعلمی کو چھپانے کے لیے ایک راہِ فرار اختیار کی ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو میں پاکستانی ہو کر پورے یقین کے ساتھ اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ کراچی سے روانہ ہونے سے قبل جو مطالعہ کیا تھا، وہ اب بھی تشنہ ہی رہا۔

مثال کے طور پر ایک بزرگ کا کہنا ہے کہ لفظ "جرمن" لفظ "شرمن" سے بنا ہے۔ "شرمن" سنسکرت زبان میں "برہمن" کو کہتے ہیں اور اس قوم کے افراد جسے تاریخ میں آریہ کہا جاتا ہے، اپنے آپ کو شرمن ہی کہتے تھے، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند اور زیادہ لائقِ تعظیم سمجھتے تھے۔ اس قوم کے کچھ افراد ترکِ وطن کر کے اس سرزمین پر جا پہنچے، جسے مختلف زمانوں میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا اور اب ایک بار پھر بھارت کہا جاتا ہے۔ اسی قوم کے کچھ افراد نے وسطِ یورپ میں سکونت اختیار کی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف پھیلتے بھی رہے۔ ان کا تعظیمی نام "شرمن" بھارت میں بدل کر "برہمن" بنا اور وسط یورپ میں "جرمن" ہو گیا۔ اس دعوے کے ثبوت میں کہا جاتا ہے کہ دونوں (جرمن اور سنسکرت) زبانوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ بہت سے الفاظ مشترک ہونے کے علاوہ ان کے صرف و نحو کے قاعدے بھی ملتے جلتے ہیں، لیکن یہ

دلیل ذرا کم زور ہے، کیونکہ دنیا کی اور بہت سی زبانوں میں بھی جہاں اس قسم کی مماثلت پائی گئی ہے ان کا رسم الخط بھی ایک دوسرے سے کچھ مشابہت ضرور رکھتا ہے۔ سنسکرت اور جرمن زبانوں میں لکھنے کا انداز بالکل جدا اگانہ ہے۔ جرمن قوم کے ایک موجد کا نام شرمن ضرور تھا جس نے لڑائی میں استعمال ہونے والے ایک خاص قسم کے ٹینک بنائے تھے، لیکن بھارت کے برہمنوں سے اس کا ناطہ جوڑنا دشوار کام ہے۔

مطالعے کے دوران میں یہ بھی پتہ چلا کہ قدیم بلجیم کے چار قبیلے مجموعی طور پر "جرمانی" کہلاتے تھے۔ وہ ترکِ وطن کرکے وسطِ یورپ میں آئے تو آپس میں گھل مل کر ایک قوم بن گئے اور جرمن کہلانے لگے اور انھی کی آماجگاہ قدرتی طور پر جرمنی کہلائی۔ ان کی زبان آئرلینڈ والوں کی زبان سے ملتی جلتی تھی۔

قیاس یہ بھی کہتا ہے کہ گیارہ سن عیسوی میں رومی شہنشاہ ٹائی بیرس کے عہد کا ایک جرنیل سیزر جرمانیکس جو شہنشاہ کے بھائی نیرو کلوڈیس ڈروسس کا بیٹا اور شہنشاہ آگسٹس کا سوتیلا بیٹا تھا، شاہی حکم کے بموجب وسطِ یورپ کی تسخیر کے لیے لشکرِ جرار لے کر چلا اور دلماطیہ اور پانونیا کو فتح کرتا دریائے رھائن سے پرے جا پہنچا۔ یہ پُرفضا مقام اسے ایسا پسند آیا کہ کچھ عرصے کے لیے وہیں کا ہو رہا اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی ہی حکومت کا اعلان کر دیا۔ بہرنوع یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ سرزمین جو اس کے زیرنگیں ہو گئی تھی، اس کے نام کی رعایت سے اہلِ روما کی زبان میں جرمنی کہلانے لگی اور پھر یورپ کی اکثر زبانوں میں اس نام سے متعارف ہو گئی۔

میری سکریٹری مسز ڈی سلوا نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ سیزر نے جب جرمنی والے علاقے کی تسخیر کی تو جرمانیکس اس کے نام کا جزو نہیں تھا بلکہ اس کامرانی پر یہ خطاب اسے دیا گیا تھا۔ اس دعوے کے ثبوت میں جس کتاب کا حوالہ انھوں نے دیا، اس کی ورق گردانی کے بعد کوئی نشان نہ مل سکا اور اس طرح انھوں نے اپنے "الفاظ واپس لے لیے"۔ سیزر کو بھلا خطاب کون دیتا۔ روم کا شہنشاہ تو ایک اور معاملے میں اس سے ناراض ہو گیا تھا اور اسی لیے اس کو روم واپس آنے کی اجازت دینے کے بجائے دوسرے علاقوں کی تسخیر کے لیے بھیجا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ ترکی کے ایک علاقے انطاکیہ میں اُسے ٹائی بیرس کے اشارے پر زہر دے کر مار ڈالا گیا۔ اس کی صرف راکھ روما میں اس کی بیوی کے پاس بھیج دی گئی۔

عرب مورخین نے اس تمام سرزمین کو جسے جرمنی کہا جاتا رہا ہے "المانیہ" لکھا ہے لیکن اس میں غلط فہمی کا رنگ جھلک دکھاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عرب فاتحین اس وسیع ملک کے صرف اس حصے تک پہنچے ہوں گے جو عہدِ قدیم سے الامنی کہلاتا ہے۔ انھوں نے ایک صوبے کو سارا ملک سمجھا اور اپنے نوشتوں میں اسی نام سے موسوم کرنا شروع کر دیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اہل جرمنی اپنی زبان میں اپنے ملک کو ڈوئش لانٹ کہتے ہیں۔ "ڈوئش" قدیم بالائی جرمن زبان کے ایک لفظ "ڈائٹ" سے مشتق ہے جس کے لفظی معنی "عوام" ہیں اور "لانٹ" وہی معنے دیتا ہے جو انگریزی زبان میں "لینڈ" کے ہوتے ہیں۔ جرمن قوم نے اپنے ملک کے لیے یہ نام بارھویں صدی عیسوی میں اختیار کیا تھا۔

**جرمنی کا علاقہ** : دوسری جنگِ عظیم کے بعد جرمنی کے حصے بخرے ہوئے تو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس ملک کی سرحدیں ہر فرماں روا کے زمانے میں اور تاریخ کے ہر عہد میں اتنی لچک دار رہی ہیں کہ ایسی مثال شاید ہی کسی اور جگہ مل سکے گی۔ کبھی یہ ملک سمٹ کر بہت ہی مختصر رہ گیا اور کبھی اتنا وسیع ہوا کہ آس پاس کے بہت سے ملک اور بعض ملکوں کے علاقے اس میں مدغم ہو گئے۔ کبھی قومی اتحاد نے اپنا رنگ جمایا تو اتنی عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی کہ یورپ کے اور علاقے اس سے پناہ مانگنے لگے اور جب تفرقہ پھیلا اور طوائف الملوکی شروع ہوئی تو یہ حال ہوا کہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تین سو فرماں رواؤں میں تقسیم ہو گیا اور ہر فرماں روا دوسرے کی جان کا دشمن بن گیا۔

ماہرینِ ملل قدیمہ کا کہنا ہے کہ چوں کہ جرمنی کا علاقہ قلبِ یورپ میں واقع ہے اور ہمیشہ سے قدرت کی نوازشوں سے بہرہ یاب رہا ہے، اس لیے زمانۂ تاریخ سے بھی بہت پہلے سے للچائی ہوئی نظریں ہر جانب سے اس پر پڑتی رہی ہیں اور ہر قبیلے اور ہر گروہ نے اسے اپنا مسکن بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ نو واردوں نے پرانے باشندوں کو بے دخل کیا اور اپنا جھنڈا گاڑ کر رہنا شروع کر دیا۔ مثلاً ولادتِ مسیح سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے کچھ خانہ بدوش شکاری اور کاشت کار جانوروں اور سبزہ زاروں کی تلاش میں روس اور پولینڈ کی جانب سے اور کچھ فرانس کی سمت سے وارد ہوئے اور الگ الگ شرقی اور غربی حصوں کو سنبھال لیا۔ پھر ڈنمارک اور اس سے بھی پرے کے کچھ سیاح اور پھر نو وارد شمالی سمندر کے راستے آئے اور کشتیوں کے لنگر کھول کر شمالی علاقے میں رہنے لگے۔ جنوب میں اٹلی سے اور تاریخ شاہد ہے کہ اہل روما ہر زمانے میں آس پاس کے ہر علاقے پر یلغار کرتے رہے ہیں۔ وہ بھلا کسی سے کیوں پیچھے رہے ہوں گے۔

پہلی صدی قبل مسیح میں مختلف قبیلوں کی نقل و حرکت نے بڑا زور پکڑا۔ خصوصاً قلتی لوگوں کو جو آرئش نسل کے تسلیم کیے جاتے ہیں، وسطی علاقوں کو چھوڑ کر مغرب کی جانب کھسک جانا پڑا، کیوں کہ طوطانی قوم کے افراد بڑی تعداد میں اندر گھس آئے تھے۔ پھر چوں کہ دریائے رھائن کے طاس کا سارا علاقہ پُر فضا اور زرخیز تھا، اس لیے ہر قبیلے نے اسے ہتھیا لینا چاہا۔ اس طرح آپس میں بہت سے قبائل ایک دوسرے سے برسرپیکار رہنے لگے۔

تیسری صدی عیسوی کے شروع میں جنوب مغربی علاقے میں رہنے والے بعض قبیلوں نے، جن کا مجموعی نام الامنی تھا اور جن کا وطن اسی نام سے مشہور ہو گیا تھا، جیسا کہ اوپر مذکور ہے، روم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور وہ ان حاکموں سے برسرپیکار ہو گئے، جنھیں رومی حکومت نے ان پر مسلط کر رکھا تھا۔ اس قسم کی چپقلشیں فرنکوں، ہنوں اور برگنڈیوں سے ہوتی رہیں۔ رفتہ رفتہ قرب و جوار کے قبیلے بھی مل گئے۔ ان سب میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، اس لیے ایک قوم کی صورت میں متحد ہونے کا احساس ان میں بیدار ہونے لگا لیکن اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے میں ایک عرصہ لگ گیا۔ ان کے منصوبے شارلیمین کے ذریعے عملی جامہ پہن سکے۔ شارلیمین صحیح معنوں میں چارلس اعظم تھا۔

**ہٹلر اعظم** : دیکھا جائے تو اس ملک کی تاریخ میں دو ہی ہستیاں ایسی گزری ہیں جن کے ناموں کے ساتھ لفظ "اعظم" زیب دیتا ہے۔ اول چارلس اعظم اور دوسرا ہٹلر اعظم۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس زمانے کے بلکہ سفرنامے کے پڑھنے والے ہر ہٹلر کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، مگر میری سچی رائے یہ ہے کہ مجھے اس سے والہانہ عشق رہا ہے۔ اس کی ہمت و عظمت کی تعریف نہ کرنا بڑی کم زوری ہے۔ وہ ایک مردِ آہن تھا، جس نے دنیا کو ہلا دیا۔ اسے بعض لوگ چاہیں تو ظالم و خونخوار تک کہہ لیں۔ ہر شخص اپنی رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے، مگر اس حقیقت کو کبھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ دنیا کی متعدد قوموں کو اس نے حصول آزادی کی راہ پر ڈال دیا اور بعض کو اس نعمت سے مالا مال کر دیا ہے۔ انگریزی قوت کو توڑ کر اس نے ہندستان کو آزاد کرایا اور سچ تو یہ ہے کہ ایشیا پر مغربیت کے قدیم اور ظالمانہ تسلط کا اسی کے دم سے خاتمہ ہو رہا ہے۔ اس کی تردید میں آپ کہیں گے کہ اس ہٹلر کی وجہ سے کس قدر تباہی عمل میں آئی۔ بربادی ہوئی۔ لاتعداد انسان مر گئے اور لاکھوں عصمتیں لٹ گئیں۔ مگر ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بات ہے۔ اول تو وہ تنہا ان سب الزامات کا ذمے دار نہیں ہے، اس ضمن میں برابر کے شریک وہ بھی ہیں جو بظاہر ثقہ سمجھے جاتے یا کہلاتے ہیں، کیوں کہ اس وقت ان کے دوبارہ ہو رہے

# شہنشاہیت کا عروج و زوال



ایڈولف ہٹلر جس نے جرمنی سے شہنشاہیت کو ختم کر کے جمہوریت کے لیے راستہ صاف کیا۔



شارلیمین جس نے چھوٹی چھوٹی المانوی ریاستوں کو ملا کر شہنشاہیت کی بنیاد رکھی۔

ہیں - پھر میں تو یہ بھی کہوں گا کہ اگر ایشیا کے کسی حصے کو اس طرح ہی آزادی مل گئی تو یہ تباہی گراں نہیں ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم تو ہٹلر کے ختم ہونے کے بہت عرصے بعد عمل میں آئی ۔ اس احساس کو ابھارنے کا کام تو اسی نے کیا تھا لیکن اس وقت کی تباہی، بربادی اور انسانیت سوزی تو اس نے نہیں پھیلائی تھی ۔ ان سب باتوں کا ذمے دار کون ٹھہرایا جا سکتا ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ ایشیا کے اور بہت سے ملک جلد آزاد ہوں گے اور آزادی کی یہ لہر تاریک براعظم افریقہ میں بھی دور تک پھیلے گی اور اس کے بیشتر ملک اپنے اوپر حکمراں قوموں سے نجات پا کر رہیں گے ۔ ان کی جد و جہد کا براہِ راست ہٹلر سے کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن پورے وثوق اور شد و مد کے ساتھ میں تو اسے اسی مردِ آہن کے انقلابی عزائم کا پرتو کہوں گا ۔

**باڈن ورٹم برگ**: ہماری گاڑی جرمنی کے جس صوبے میں جنوب سے شمال کی جانب جا رہی ہے ۔ اسے باڈن ورٹم برگ کہتے ہیں اور اس کا یہ نام ۱۹۵۲ء سے پڑا ہے۔ وفاقی جمہوریہ کے جنوب مغربی سرے پر یہ صوبہ کسی زمانے میں بجائے خود ایک زبردست مملکت تھا۔ یہاں کے شاہی خاندانوں کے فرمانرواؤں نے یورپ کی بساطِ سیاست کے ایسے ایسے پانسے پھینکے تھے، جن کے توڑ میں کوئی اچھا داؤں چلنا بہت سے دوسرے شاطر حکمرانوں کے لیے ممکن نہیں تھا۔ چناں چہ ان فرمانرواؤں نے قرب و جوار میں پھیل کر اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع تر کرتے رہنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ البتہ ان فرماں رواؤں نے محض سیاسی چالیں ہی نہیں چلیں بلکہ علم و ادب اور فنون و حکمت کو بھی نوازا اور ان کی بدولت ایسی ایسی باکمال ہستیاں اس سرزمین سے ابھریں جنھوں نے نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں پر بھی اپنی عظمت کا سکّہ بٹھایا اور اس طرح تاریخ عالم میں اپنے وطن کے لیے وہ اعلا مقام پیدا کر لیا جس کی برتری کا لوہا آج بھی مانا جاتا ہے ۔

اِس سرزمین نے بلند پایہ شاعروں، ادیبوں، مفکروں، سیاحوں، موجدوں اور ہر قسم کے فن کاروں کو جنم دیا ہے۔ کیپلر جیسے منجّم نے ستاروں سے آگے وہ جہاں تلاش کر ڈالے جو افقِ آسمان تو کیا سرحدِ ادراک سے بھی پرے تھے۔ ہیگل اور شیلنگ جیسے فلسفی یہیں پیدا ہوئے اور یونان کے فلسفیوں سے بھی دو دو قدم آگے بڑھ گئے۔ یہاں کے شاعروں میں سے شلر کا نام کس نے نہیں سُنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اوہ لینڈ، شیفل اور ہرمن ہیس جیسے شاعر بھی قابلِ ذکر ہیں ۔ موجدوں میں سے کاؤنٹ زیپےلن کا نام لے لینا کافی ہے ۔ اس زمانے میں تو خاصے بڑے بڑے

ہوائی جہاز بن گئے ہیں جن کو فضا میں اڑتی ہوئی جائداد کہا جا سکتا ہے لیکن اس نواب زادے صاحب نے جو جہاز بنایا، اس کے مقابلے میں آج کل کے کونسٹی لیشن اور وائی کاؤنٹ بھی کھلونے کہے جا سکتے ہیں۔

یہ صوبہ شہر بازل اور جھیل کونسٹنس سے شروع ہوتا اور دریائے رہائن کے ساتھ ساتھ جو خود بھی جنوب سے شمال کی سمت بہتا ہے، دریائے مین پر ختم ہوتا ہے جو شرقاً غرباً بہتا ہے۔ اور ایک قدرتی سرحد کا کام دیتا ہے۔ سرحدوں کے پار فرانس، آسٹریا اور سوئزر لینڈ ہیں کے پڑوسی ہیں۔ مشرق میں بویریا ہے اور جانب شمال دریا کے پار ایک اور صوبہ ہیس ہے اور مغرب میں بھی اگر دریائے رہائن کو پار کر لیا جائے تو ایک اور صوبہ ہے جو رہائن لینڈ پیلے ٹی ناٹے کہلاتا ہے۔

اس کا رقبہ تیرہ ہزار آٹھ سو مُربع میل ہے اور ہمارے آنے سے تقریباً ساڑھے تین سال پہلے ۳۱ مارچ ۱۹۵۲ء کو جو مردم شماری ہوئی تھی تو آبادی کا تخمینہ ۶۷ لاکھ تھا۔ گویا ہر مربع میل پر تقریباً پونے پانچ سو انسان رہتے ہیں لیکن اگر دور دور تک پہاڑوں کے غیر آباد حصّوں اور جنگلوں کو خارج کر دیا جائے تو اسے بہت ہی گنجان آباد کہا جا سکتا ہے۔

اس صوبے میں ایک اور بھی دریا ہے جو نکر کہلاتا ہے۔ وہ اسی صوبے کے پہاڑی علاقے سے جسے شوبے ننگن کہتے ہیں، نکل کر مان ھیم کے مقام پر رہائن میں مل جاتا ہے۔ اس کی لمبائی صوبے کے طول سے زیادہ یعنی دو سو بتیس میل ہے۔ کیوں کہ یہ کسی محبوب کی مستانہ چال کی نقل اتارتا اپنی کمر میں سینکڑوں بل ڈالتا، اٹھکھیلیاں کرتا چلتا ہے۔ علاوہ ازیں دریائے ڈینیوب کا کچھ حصّہ بھی اس صوبے کو سیراب کرتا ہے۔ یہاں کا سب سے زیادہ اونچا پہاڑ شوارز گراٹ ہے جس کی بلندی تین ہزار چھے سو اکسٹھ فیٹ ہے۔

رومی فاتحین ولادتِ مسیح سے پہلے اس سرزمین پر آئے اور تین صدیوں تک یہاں حکومت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ الامنی قبیلے کے لوگوں نے انھیں مار بھگایا۔ اس عہد کے بہت سے یادگار نقوش اب بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور آثارِ قدیمہ میں شامل ہیں۔ تاہم سب سے اعلیٰ دور شارلیمین کے عہد کا کہا جا سکتا ہے۔

چودھویں صدی میں اس علاقے نے ایک زبردست انگڑائی لی اور سیاسی اعتبار سے آزادی کا اعلان کر کے اپنے آپ کو باقی ملک سے علیحدہ کر لیا۔ کوئی دو صدی بعد اس علاقے نے

جمہوری رُجحانات کا اظہار اپنے دستورالعمل میں کیا، جس کی رُو سے یورپ کی تاریخ میں پہلی بار انسانی حقوق اور آزادیوں کا خیال رکھا گیا۔ پھر تیس سالہ جنگ نے جو سترھویں صدی کی یادگار لڑائی ہے، جہاں ملک کے اور حصوں کو نقصان پہنچایا، اس کا بھی بیڑا غرق کرکے رکھ دیا اور یہ ۱۸۰۶ء سے پہلے نہ پنپ سکا اور چوں کہ یہ علاقہ جنوب مغربی سرے پر واقع ہے، اس لیے دوسری جنگِ عظیم میں اس پر بھی خوب بمباری ہوئی اور بعض شہر تو بالکل کھنڈروں کی سرزمین بن کر رہ گئے۔

**باڈن باڈن**: گاڑی کی رفتار بتدریج ہلکی ہونے لگی اور ایسے جھٹکے بھی لگے جو عموماً پٹری بدلے جانے کے وقت ریل کے ڈبوں میں بیٹھنے والوں کو محسوس ہوتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کوئی اسٹیشن قریب آرہا ہے۔ چناں چہ گاڑی باڈن باڈن کے اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔

کسی طرح یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس چھوٹے سے شہر کے نام میں ایک ہی لفظ دو بار کیوں استعمال ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ شہر کی داغ بیل ڈالے جانے کے وقت یہ نام کسی ہکلے شخص نے تجویز کیا ہو۔ وہ صرف باڈن کہنا چاہتا ہوگا لیکن اپنی معذوری کے باعث جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، وہ اسے دو بار کہہ گیا اور لوگوں نے جس طرح سُنا، اختیار کر لیا۔ سخت سردی کے عالم میں بھی جب دانت سے دانت بج رہے ہوں، بعض لفظ منہ سے دو بار ادا ہو جاتے ہیں کیوں کہ کپکپاہٹ کے باعث زبان پر قابو باقی نہیں رہتا۔ اگر قارئین میں سے کوئی بزرگ (بشمول برکات احمد صاحب) ہماری اس قیاس آرائی پر اعتراض کرنا چاہتے ہوں تو معقول دلیل کے ساتھ اپنی تحقیقات کی صراحت کریں اور بتائیں کہ اس نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے!

باڈن باڈن حسین مناظر کے لیے مشہور نہیں ہے۔ دو ایک کے سوا یہاں زیادہ قابلِ دید عمارتیں بھی نہیں ہیں۔ پھر بھی اس جگہ مقامی اور غیر ملکی سیاحوں کا بڑا جمگھٹ رہتا ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اول یہ کہ وہاں گرم معدنی پانی کے قدرتی چشمے ہیں اور زیادہ تر وہی لوگ جاتے ہیں جو اس نعمت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ عام صنعتی اور کاروباری شہروں کے شور و شغب کے برعکس وہاں کی فضا میں ہر وقت ایک دل فریب قسم کی خاموشی طاری رہتی ہے۔ سوائے جوئے خانوں اور ایسی ہی دوسری تفریح گاہوں کے جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور جن میں عام طور پر ایک پہر رات گزرنے کے بعد بعض لوگوں کے خیال میں دل چسپ قیامتیں برپا ہوتی ہیں۔ اس سے قطع نظر یہاں کی خاموشی ضرب المثل ہے۔

شہر کے چاروں طرف پھیلے ہوئے گھنے جنگلوں کے بیچ بیچ میں بل کھاتے ہوئے ایسے کچے راستے بھی ہیں جن پر درختوں کی نرم چھال بچھا کر گھوڑے سواری کے لیے موزوں بنالیا گیا ہے۔ دور تک چلے جائیے، دوسرے گھوڑ سواروں کے سوا کوئی اور متنفس شاذ و نادر ہی نظر آئیگا۔ یہ راستے بشرطِ فرصت ہمارے لیے جاذبِ توجہ ہو سکتے تھے لیکن موجودہ پروگرام میں ان کے لیے گنجائش نہیں تھی۔ اگر موقع ملتا تو ہم دونوں بھائی آہستہ آہستہ گھوڑے دوڑاتے اور دونوں اطراف یہ دیکھتے جاتے کہ کتنے دوائی پودے قدرتی طور پر اگ اگ کر ضائع ہو رہے ہیں اور افسوس کرتے کہ اس نعمتِ عظیم سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔

محکمۂ صحت سے شائع ہونے والے ایک کتابچے سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں کے گرم چشموں کے پانی میں بعض جلدی امراض اور اعصابی شکایات کو دور کرنے کی صلاحیتیں موجود ہیں لیکن صرف ان کو دیکھنے کی غرض سے "شکستِ سفر" کرنا چنداں ضروری نہیں تھا کیوں کہ اس مقصد کے لیے ہماری منزلِ مقصود پہلے ہی متعین ہو چکی تھی۔

رومی عہد کے بعض حمام بھی شکستہ حالت میں موجود ہیں لیکن سنا ہے کہ ان میں اتنی تبدیلیاں کر لی گئی ہیں کہ اصل حیثیت ختم ہو کر رہ گئی ہے اور جب صورتِ حال یہ ہو تو دیکھنے سے بھی کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

عمارتوں میں سے "نیا محل" جو سولھویں صدی میں تعمیر ہونے کے باعث اب ایک حد تک پرانا ہی کہا جا سکتا ہے، کسی قدر تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس میں باڈن کے تاریخی عجائبات بھی محفوظ ہیں۔

یہاں بہنے والے ایک چھوٹے سے دریائے اوس کے کنارے ایک ٹرنک ہالے موجود ہے۔ ٹرنک جرمن زبان میں انگریزی لفظ ڈرنک کے ہم معنی ہے اور ہالے "ہال" کے لیے بولا جاتا ہے۔ یعنی پینے کا مقام لیکن اس سے مراد "مے خانہ" نہیں ہے۔ اس دنیا میں پینے کے لیے شراب ہی نہیں، پانی بھی ہوتا ہے۔ چناں چہ یہاں کے گرم معدنی چشمے کا پانی پی پی کر بعض اندرونی امراض کا علاج کیا جاتا ہے۔ ٹرنک ہالے کے عین عقب میں کور ہوس ہے۔ اسے کیور ہاؤس یا شفاخانہ سمجھنا چاہیے۔ چشمے کے پانی سے علاج کرانے والے یہاں علاج کر کے اپنے قیام کے لیے اور بھی مشورے لیتے، ان پر عمل کرتے اور عموماً تن درست ہو کر چلے جاتے ہیں۔

صرف اگست کا مہینہ اور وہ بھی اس کا آخری ہفتہ باڈن باڈن میں بہت گھما گھمی میں

گزرتا ہے۔ گھوڑ دوڑ کے علاوہ، بہت سی قسم کے بین الاقوامی مقابلے چند دن کے لیے اپنا رنگ جماتے اور بادِ نسیم کے ایک جھونکے کی طرح بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے یہ دور گزر چکا تھا۔ جولائی میں گلاب کے پھولوں کی نمائش ہوتی ہے۔ اس وقت نہ صرف اس سرزمین کے بلکہ دوسرے علاقوں کے پھول بھی یہاں آکر زینت نگاہ بنائے جاتے ہیں۔ صرف گلقند بنانے کے لیے ہی نہیں، ان پھولوں کے رنگ و بُو سے لطف اندوز ہونے کے لیے بھی ہمارا جی چاہتا ہے، لیکن یہ موقع بھی نکل چکا تھا۔

سیاہ جنگل کی مشہور شاہراہ جو سانپ کی طرح بل کھاتی جب شہروں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے، یہاں سے شروع ہوتی اور دوسری سمت سے نظر ڈالی جائے تو یہں جگہ ختم ہوتی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم میں یہاں بھی گولہ باری ہوئی لیکن زیادہ نہیں۔ کوئی ناقابل تلافی نقصان نہیں پہنچا اور جو ہُوا، اس کا ازالہ کر لیا گیا۔ اب تو کسی تباہی کی علامت تک نظر نہیں آتی۔

میں راستے کی خیالی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا تھا کہ گاڑی چل پڑی اور ہاتھ سے چھوٹ جانے والے دامنِ صبر کی طرح رشتۂ خیال بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔

**اسٹٹ گارٹ**: میں نے چلتی ریل کی کھڑکی سے باہر جانب مشرق نظر ڈالی۔ اس علاقے کے اور مقامات کی طرح گھنا جنگل سامنے تھا کبھی کھلا میدان سامنے آجاتا اور کبھی درختوں کے جھنڈ حدِ نگاہ بن جاتے۔ اگر بہت دور تک میدان صاف ہوتا اور میری آنکھیں ۳۵ میل پرے تک کا نظارہ کر سکتیں تو مجھے باڈن باڈن کے تقریباً متوازی اسٹٹ گارٹ کے آثار دکھائی دیتے جو اس وقت سارے صوبے کا صدر مقام ہے اور اس سے پہلے ۲۲ اپریل ۱۹۴۵ء تک بھی جب ملک پر اتحادیوں کا قبضہ ہوا اور اس صوبے کے دو ٹکڑے ہو کر شمالی علاقہ فرانسیسیوں کے زیرِ اقتدار آیا، یہی شہر اس شمالی حصے یعنی ورٹم برگ کا صدر مقام بنا دیا گیا تھا اور جنوبی حصے باڈن کا جو امریکیوں کی تحویل میں دیا گیا تھا ٹوبنگن صدر مقام ہو گیا۔ یہ تقسیم نظام زیادہ عرصے برقرار نہ رہ سکی۔ ۴ مئی ۱۹۵۱ء کو عوام کے مطالبے پر ملک کی مجلسِ دستور ساز کو فیصلہ کرنا پڑا کہ دونوں علاقوں میں استصواب رائے کرایا جائے۔ چناں چہ اسی سال ۹ دسمبر کو ۷۰ فی صد باشندوں نے رائے دی کہ دونوں علاقے ملا کر پھر ایک صوبہ بنا دیا جائے اور اسٹٹ گارٹ سارے صوبے کا صدر مقام رہے۔

ایک لحاظ سے ہمیں چاہیے تھا کہ صوبے کا صدر مقام ہونے کے باعث اس شہر کو بھی ہم اپنے راہ نامے میں شامل رکھتے، لیکن ایسا کرنے میں ایک قباحت تو یہ تھی کہ پھر ہمیں اس گاڑی کے بجائے جس میں اب سفر کر رہے تھے دوسری گاڑی لینی پڑتی جو بازل سے چل کر ایک اور ہی راستے سے ہو کر وہاں پہنچتی لیکن اس کے انتظار میں ہمیں بازل میں کافی وقت ضائع کرنا پڑتا اور پھر اشٹٹ گارٹ سے جو گاڑی ہائیڈل برگ کے لیے لی جاتی، اس میں بھی بڑا وقت لگتا۔ نامناسب اوقات میں ہم ہوٹلوں میں پہنچتے اور زیادہ وقت سفر ہی کی صعوبتوں کی نذر ہو جاتا۔

لیکن اس قباحت سے قطع نظر وہاں نہ جانے کے لیے ایک اور سبب نفسیاتی اعتبار سے بھی مانع تھا۔ وہ یہ کہ دوسری جنگِ عظیم میں یہ شہر سب سے زیادہ بموں کا نشانہ بنا تھا اور جو چیزیں یہاں کی قابلِ دید تھیں وہ تقریباً تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ تعمیرِ نو کے پروگرام نے بہت جلد بربادی کے نقوش ختم کر دیے تھے لیکن بعض تاریخی عمارتوں کا نعم البدل کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اکثر سیاح جو اس کی سابقہ شان و شوکت کو ایک نظر دیکھ چکے تھے، اب اس کی یاد تازہ کر کے ٹھنڈے سانس لیتے ہیں۔

لڑائی سے پہلے یہاں تقریباً ۷۳ ہزار عمارتیں تھیں۔ ان میں سے ۲۲ ہزار اس بری طرح تباہ ہوئیں کہ پرانی ہی بنیادوں پر اب تک مکرر تعمیر نہ ہو سکیں۔ ۲۰ ہزار جزوی طور پر تباہ ہوئیں۔ ۲۸ ہزار کو کچھ کم نقصان پہنچا اور باقی صرف دو ہزار عمارتیں ایسی تھیں جو دھماکوں سے بچی رہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اب بالکل ہی نئی طرز کی عمارتیں وجود میں آئی ہیں لیکن وہ انداز اور شہروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے زیادہ جاذبِ نظر تاریخی عمارتیں ہو سکتی ہیں جو اب بڑی حد تک محض آثارِ قدیمہ بن کر رہ گئی ہیں۔

اس شہر پر بمباری تاریخی عمارتوں کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ تباہ کاریوں کا سبب وہ عظیم کارخانے تھے جو جرمنی کی بیرونی تجارت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کارخانوں میں ڈھلی ہوئی یا بنی ہوئی چیزیں دنیا کے ہر حصے میں پہنچتی تھیں اور ان کی بدولت ملک کو کثیر زرِ مبادلہ مل جاتا تھا۔ یہ عظمت دشمنوں کو کسی عنوان گوارا نہ تھی۔ انھوں نے اسی ریڑھ کی ہڈی کو توڑنے کے لیے سارے شہر کو نشانہ بنایا اور کامرانی حاصل کی۔ تاہم اسی "خرابی کی صورت" اس کی مکرر "تعمیر میں مضمر" ہے۔ اس کے بغیر شاید یہاں کے کارخانوں کو وہ عروج

حاصل نہ ہونا جواب ممکن ہوا ہے۔

صدر مقام ہونے کے اعتبار سے اسٹٹ گارٹ کی آبادی بھی دوسرے شہروں سے زیادہ یعنی ساڑھے پانچ لاکھ ہے کیوں کہ صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہونے کے باعث مزدوروں سے لے کر اعلیٰ ماہرینِ فن تک اس کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں۔ مختلف قسم کے پارچہ جات کے علاوہ بجلی کے سامان، کیمروں اور عینک سازی کے نازک آلات کے لیے بھی اسے شہرت حاصل ہے۔ کوڈک کمپنی کے کیمرے، زیس آئکن کے چشمے دنیا میں ہر جگہ مل سکتے ہیں۔ تاہم یہاں کی ایک اور بھی صنعت ہے، جس نے ساری دنیا میں اپنی مقبولیت کا سکہ جما رکھا ہے۔

مرسیڈیز موٹر گاڑیوں کا نام بھلا کس نے نہیں سنا ہوگا۔ وہ بعض امریکی کاروں کی طرح جہازی سائز کی تو نہیں ہوتیں لیکن اپنی خوش نمائی اور خصوصاً مضبوطی کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا مقابلہ کسی اور کار سے نہیں ہو سکتا۔

ان گاڑیوں اور ان کے بنانے والوں کو تاریخی اہمیت حاصل ہے اور اس حقیقت کا ثبوت اسی کارخانے کے قائم کردہ آٹو موبائل میوزیم سے مل سکتا ہے، جس میں شروع سے اب تک کے ہر نمونے کی گاڑی بطور یادگار رکھی گئی ہے اور ان کی ترتیب کا اہتمام اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ کاروں اور دوسری اقسام کے موٹروں کی ترقی یافتہ صنعت کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

دنیا میں تیل سے چلنے والا سب سے پہلا انجن ۱۸۸۳ء میں جرمنی کے ایک شخص گوٹلیب ڈائملر نے ایجاد کیا اور اپنے نام سے اسے پیٹنٹ کرالیا۔ تین سال بعد ۱۸۸۶ء میں اس نے اس انجن کو پہلی بار ایک چار پہیہ گاڑی میں لگایا جو بالکل بگھی کے انداز کی تھی اور اسے کسی جانور کی مدد کے بغیر چلا کر دیکھنے والوں کو حیران کر دیا۔ عجائب گھر میں نمائش کی جانے والی اشیا میں اسی گاڑی کو پہلا نمبر حاصل ہے۔

اسی زمانے میں بلکہ اسی سال میں ذرا سے وقفے سے کارل بنز نامی ایک اور جرمن ماہر نے اپنی گاڑی بنا کر عوام کے سامنے پیش کی اور یکساں مقبولیت حاصل کی۔ چناں چہ کارل بنز کی یہ گاڑی بھی عجائب گھر میں موجود ہے۔ ان دونوں منچلے نوجوانوں نے موٹروں کی ساخت کے لیے اپنے اپنے کارخانے بھی قائم کر لیے جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت مختصر تھے۔ ڈائملر نے بد کانسٹاٹ اور کارل بنز نے مین ہیم میں ان کی بنیاد رکھی۔ رفتہ رفتہ ان دونوں میں باہمی رابطہ پیدا ہوتا چلا گیا حتی کہ ۱۹۲۶ء میں دونوں کے کارخانے مل گئے اور ڈائملر بنز اے جی کے نام سے ایک ہی

بہت بڑا کارخانہ اسٹٹ گارٹ میں قائم کرلیا گیا جواب بھی اسی جگہ قائم ہے۔"اے جی" جرمن زبان کے دو لفظوں آکٹین گیزلشافٹ کا مخفف ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی رواج کے مطابق اکثر کاروباری اداروں کے نام کے ساتھ کمپنی اور اسے مختصر کرکے "کو" لکھا جاتا ہے۔

اس فرم کی گاڑیاں شروع دن سے مرسیڈیز کہلانے لگیں۔ حالاں کہ یہ نام مشترک کارخانے کے قیام سے بیس سال پہلے دائرۂ تحریر میں آیا تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ بھی بجائے خود بہت دل چسپ ہے۔ ہوا یہ کہ آسٹریا کا ایک تاجر ایمل جیلی نِک آج سے بہت عرصے پہلے ڈائملر کارخانے کی گاڑیوں کا سب سے بڑا بیوپاری تھا۔ وہ خود سائیکل چلانے میں بڑا ماہر اور شہرت یافتہ تھا۔ اکثر سائیکلوں کی دوڑ میں حصہ لیتا تھا۔ جب موٹر گاڑیاں چلنی شروع ہوئیں تو اس نے سائیکل کے بجائے ان پر طبع آزمائی شروع کی اور موٹر چلانے کے مقابلوں میں بھی حصہ لیا لیکن ایسے موقعوں پر اس نے اپنے نام کے بجائے فرضی نام "مرسیڈیز" اختیار کیا جو دراصل اس کی سب سے بڑی بیٹی کا نام تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ڈائملر کے انجن خود میری بیٹی کی طرح قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں موٹر گاڑیوں کی دوڑ کا بین الاقوامی ہفتہ منایا گیا تو جیلی نِک نے بھی حصہ لیا۔ اسے اس مقابلے میں غیر معمولی کامیابی ہوئی جس کا حال قلم بند کرتے ہوئے فرانس کے ایک صحافی نے جیلی نِک کے فرضی نام کی رعایت سے لکھا کہ "یہ دورِ مرسیڈیز کا آغاز ہے" یہ رائے اس قدر پسند کی گئی کہ ڈائملر کے کارخانے کی ہر گاڑی مرسیڈیز کہلانے لگی۔ حتیٰ کہ مالکان نے اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر یہی نام اپنی گاڑیوں کے لیے اختیار کرلیا۔ اور جب ڈائملر اور بنز کے کارخانے مل گئے تب بھی اس کا سلسلہ جاری رہا۔ جیلی نِک کی بیٹی تو اس دنیا سے رخصت ہوگئی لیکن اس کا نام اس کارخانے کی گاڑیوں پر برقرار ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں یہ کارخانہ بھی بری طرح تباہ ہوا لیکن بہت جلد پنپ گیا اور پہلے سے زیادہ ترقی کرگیا۔ لڑائی کے بعد سے ۱۹۵۲ء کے آخر تک اس کارخانے کی تعمیرِ نو پر فرم مذکور نے ۷ کروڑ ۵۰ لاکھ جرمن مارک خرچ کیے تھے۔ دسمبر ۱۹۵۳ء تک اس کارخانے نے تقریباً دو لاکھ موٹر گاڑیاں، پچاس ہزار سے زیادہ ٹرک، سات ہزار کے قریب بسیں اور اتنے ہی ٹریکٹر بنا ڈالے۔ ان سب میں سے ۴۵ فی صد گاڑیاں برآمد کی گئیں، جن سے فرم کو ۲۵ کروڑ جرمن مارک حاصل ہوئے۔ اس کے بعد تو اس نے ہوائی جہازوں کے لیے انجن بنانے بھی شروع کردیئے ہیں۔

اِس کارخانے کی وسعت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ۴۸ ہزار مربع گز کے رقبے میں مختلف قسم کی تین ہزار مشینیں لگی ہوئی ہیں جو ہر وقت کام کرتی رہتی ہیں۔ فرم کے عملے میں تمام اقسام کے ملازمین کی تعداد ۳۵ ہزار ہے۔

ہٹلر کو مرسیڈیز کے کارخانے سے بڑی دل چسپی تھی۔ جب بھی وہ شہر میں ہیم سے گزرتا، اس کارخانے میں ضرور جاتا تھا۔ اُسے دائملر اور بنز سے غائبانہ عشق تھا۔ انھوں نے موٹر گاڑی کے اولین موجدین کی حیثیت سے جرمنی کا نام بلند کیا تھا۔ وہ ان کی عالم گیر شہرت پر فخر کرتا تھا" ہٹلر میری نظر میں" کے مصنف اوٹو ڈائٹریخ کا خیال ہے کہ ہٹلر کی اس عقیدت مندی کا سبب یہ ہے کہ اس نے میدانِ سیاست میں قدم رکھنے سے قبل اپنے لیے سب سے پہلی گاڑی اسی کارخانے سے خلافِ معمول قسطوں پر لی تھی، کیوں کہ اس کے پاس یک مشت قیمت ادا کرنے کے لیے پوری رقم نہیں تھی۔ اس لیے وہ کارخانے والوں کا رہینِ منت تھا۔ لیکن یہ قیاس آرائی غلط ہے بلکہ سراسر ایک نامعقول الزام کے مترادف ہے کیوں کہ ہٹلر نے اپنے ملک کی ہر صنعت کو نوازا اور اسے فروغ دینے میں ہر ممکن طریقے سے تعاون کیا تھا۔ وہ جرمنی میں موٹروں کے ایک دوسرے کارخانے کا بھی قدر دان تھا جو وولکس ویگن (عوامی گاڑیاں) بناتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ نسبتاً مرسیڈیز کو ترجیحی حیثیت دیتا تھا کیوں کہ ان کی عمدہ اور مضبوط ساخت دنیا بھر میں مسلّمہ ہے۔ اس کا معمول تھا کہ حکومت کے اعلیٰ افسروں سے ان کی کسی کارکردگی پر خوش ہوتا تو مرسیڈیز کا تحفہ دے کر انھیں نوازتا اور جب دوسرے ملکوں کے سربراہ اس کے ملک میں آتے تو مرسیڈیز گاڑیاں ہی انھیں بھی نذر کی جاتیں۔ سرکاری طور پر اس کی تحویل میں سیاہ رنگ کی آٹھ گاڑیاں مختلف مقامات پر رہتی تھیں تاکہ حسبِ ضرورت کام آتی رہیں۔

میں نے ریل گاڑی میں بیٹھے بیٹھے تہیّہ کر لیا کہ جرمنی کے اس کارخانے کی ایک سب سے عمدہ موٹر گاڑی براہِ راست اسٹٹ گارٹ سے درآمد کی جائے گی اور اس فیصلے کے ساتھ ہی مجھے اپنے بھانجے میاں یٰسین بُری طرح یاد آگئے جو بہت تیز لیکن احتیاط کے ساتھ موٹر چلانے میں درجۂ کمال رکھتے ہیں۔ لفظ "خرام" صرف پیدل چلنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر اس کا اطلاق موٹر چلانے پر بھی ہو سکتا اور اس کے ساتھ ہی میرے اور ان کے درمیان وہ رشتہ نہ ہوتا جو اب ہے، تو مجھے یہ شعر ان پر چسپاں کرنے میں لطف آتا ؎

خرامِ نازِ دوران کا خرام! کیا کہنا      زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

جب بھی وہ فضل حق قریشی جیسے کسی ہول دلے کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر سڑکوں پر "موٹر پولو" کھیلتے ہوئے چلتے ہیں تو شریکِ سفر کو حضرت یگانہ چنگیزی کا یہ شعر ضرور یاد آجاتا ہوگا ؎

پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی　　　دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

بشرطیکہ یہاں رفتار سے مراد موٹر کی رفتار ہو کیونکہ میاں یٰسین تیزی کے ساتھ پیدل چلنے کے بالکل عادی نہیں ہیں۔ شاید اسی لیے وہ اپنی رفتار کے خسارے کو موٹر کی تیز رفتاری سے پورا کرتے ہیں۔۔

مجھے یقین ہے کہ اگر آج جیلی رنگ زندہ ہوتا تو یٰسین موٹروں کی بین الاقوامی دوڑ میں حصہ لیتے ہوئے اسے چیلنج دے دیتے۔ "موٹر اندازی" میں ان کی اعلیٰ استعداد کا سبب یہ ہے کہ وہ کسی بھی متوقع حادثے سے قبل از وقت متاثر ہونا نہیں جانتے۔ اپنے حواس پر پوری طرح قابو پاتے اور گاڑی کے انجن سے زیادہ اپنے اعصاب پر بریک لگاتے ہیں۔

ہٹلر سیاسی اقتدار حاصل کرنے سے قبل تیز موٹر چلانے میں اپنی نظیر آپ تھا۔ ۱۹۳۳ء سے پہلے تک اس کا یہ حال تھا کہ کسی کو اپنی موٹر اس کی گاڑی سے آگے لے جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی یہ جرأت کر بیٹھتا تو اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔ وہ تمام احتیاطی تدابیر بالائے طاق رکھ کر "موٹر کے کان" اینٹھتا اور مدمقابل سے بازی لے جاتا۔ اگر وہ اتفاق سے پچھلی یا برابر کی نشست پر ہوتا تو شوفر کے گھونسا مار کر کہتا "کیا غضب ہے۔ اس چھچھورے انسان سے مات کھاؤ گے۔ فوراً رفتار تیز کرو اور اس سے آگے بڑھ جاؤ۔" اور شوفر کو فوراً حکم کی تعمیل کرنی پڑتی تھی۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد دو موٹروں کی ٹکر کا ایک خوفناک حادثہ ہوا اور اس میں جرمن پارلیمان کی چند اعلیٰ ہستیاں کام آگئیں تو ہٹلر نے نہ صرف خود تیز رفتاری سے احتراز کیا بلکہ پچیس میل فی گھنٹے کے قانون پر سختی سے عمل شروع کرا دیا۔ یہاں تک کہ ایک بار جب پولینڈ کے گورنر جنرل ڈاکٹر فرینک نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تو ہٹلر نے ذرا بھی رعایت نہیں کی اور گورنر جنرل کی موٹر بحق سرکار ضبط کرا دی۔ یہ شکست قانون کی زیادہ سے زیادہ سزا تھی۔

اسٹٹ گارٹ میں مرسیڈیز گاڑیوں کے علاوہ اور بھی کئی صنعتیں جن کا ہلکا سا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ تیزی سے فروغ پا رہی ہیں، لیکن روزمرہ کے استعمال کی چیزوں سے قطع نظر

یہ کتابوں کی اشاعت کا بھی بہت بڑا مرکز ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کتابوں کی فروخت کے اعتبار سے فرینک فرٹ زیادہ بڑا مرکز ہے اور بین الاقوامی کتابوں کی نمائش کا سالانہ میلہ بھی وہیں لگتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے برلن کو ان دونوں اعتبار سے فوقیت حاصل تھی

دوسرے اسمائے معرفہ کی طرح اس نام کی وجہ تسمیہ بھی کس قدر دل چسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہ علاقہ ورٹمبرگ کے نوابوں کے لیے گھوڑوں کی پرورش کا بہت بڑا مرکز تھا اور اس لحاظ سے "اسٹوٹن گارٹن" یعنی باغ اسپ کہلاتا تھا۔ انھی دونوں لفظوں کے اختصار سے اشٹٹ گارٹ بن گیا۔ اشٹٹ اور بھی بہت سے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے سینٹ انگریزی لفظ "اسٹڈ" کے اور گارٹن" "گارڈن" کے مترادف اور ہم معنی ہیں۔ اشٹٹ گارٹ پہلی بار ۱۲۲۹ء میں قلم بند ہونے والی بعض دستاویزات میں استعمال ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے شروع میں اس کی آبادی تقریباً بیس ہزار تھی اور اب ساڑھے پانچ لاکھ سے بڑھ گئی ہے۔

**کارلس روہے:** سیاہ جنگل کے سرسبز و شاداب نشیب و فراز میں سانپ کی طرح بل کھا کر چلنے والی ریل گاڑی کارلس روہے کے اسٹیشن پر رک گئی اور میرا سلسلۂ خیال ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ بھائی جان محترم بھی جو یوجین ڈیوڈسن کی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے، اس عالم محویت سے نکل آئے اور کھڑکی کے باہر نظر ڈال کر فرمانے لگے "یہاں سیاہ جنگل کی حد ختم ہو گئی اور اگر ہم اسی راستے سے واپس جائیں یا شمال کی طرف سے جانبِ جنوب سرگرمِ سفر ہوں تو کہنا پڑے گا کہ یہاں سے سیاہ جنگل کی حد شروع ہوتی ہے۔ اب ہماری منزلِ مقصود صرف ۳۲ میل دور رہ گئی ہے۔ کاش! یہ مسافت جلد ختم ہو جائے۔ اب تو آنکھیں بند کر کے خاموشی کے ساتھ لیٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھائی جان محترم تھک گئے تھے۔ ریل کے سفر میں چاہے پوری برتھ پر ان کا قبضہ ہو اور وہ انھی کے نام سے ریزرو ہو چکی ہو، پھر بھی دن کا وقت وہ عموماً بیٹھ کر گزارتے ہیں اور وہ اسی وجہ کے لیے بھی لیٹتے نہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ باہر کے دل چسپ مناظر سے یکسر چشم پوشی قدرت کی توہین کے مترادف ہے۔ اگر چاندنی رات ہو تب بھی وہ کچھ وقت بیرونی ماحول کا جائزہ لینے میں صرف کرتے ہیں۔ اگر انہماک پیدا کر دینے والی کوئی کتاب ہاتھ میں آجائے تو دوسری بات ہے، ورنہ زیادہ وقت وہ مطالعۂ قدرت میں گزارتے اور

اسی دوران میں ہم سفروں سے بات چیت بھی کرتے جاتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ فی الحال ان کے لیے آرام کرنے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ ہم بازل سے سوا دس بجے روانہ ہوئے تھے۔ وہاں سے ہائیڈل برگ تک کا سفر پونے چار گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ اس وقت ایک بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا ابھی ہم کو چالیس منٹ اور اسی ڈبے میں بند رہنا تھا۔ مجھے تھکن کے علاوہ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

کارلس روہے پر گاڑی چند منٹ ٹھہری اور پھر چل پڑی۔ ایک لحاظ سے اس شہر کو ہمارے آبائی وطن دہلی اور اس کے پہلو میں آباد ہونے والی نئی دہلی کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی ایک فرمانروا کی جدّتِ طبع نے ڈھائی سو سال پہلے پرانے شہر سے صرف تین میل کے فاصلے پر نیا شہر آباد کیا تھا۔ پرانے کا نام ڈورلاک تھا اور نیا شہر خود آباد کرنے والے کے نام کی رعایت سے کارلس روہے کہلانے لگا۔ البتہ دوسری جنگِ عظیم کی بم باری کے بعد تعمیرِ نو کا سلسلہ شروع ہوا تو دونوں شہر اسی طرح ایک دوسرے کے قریب آ گئے جیسے نئی اور پرانی دہلی کے ڈانڈے آپس میں مل گئے ہیں۔

کچھ کم ڈھائی سو سال پہلے ۱۷۰۵ء میں اس علاقے کی باگ ڈور ایک شخص کارل ولہلم کے ہاتھ میں تھی جو رومی حکمرانوں کی طرف سے ڈورلاک کا مارگریو یعنی گورنر تھا۔ عام روش کے مطابق وہ بھی عیش پسند اور سیر و شکار کا شوقین تھا۔ اس نے شہر سے تین میل کے فاصلے پر اپنے لیے ایک شکارگاہ تعمیر کرائی اور جب اس کی چھت پر چڑھ کر اس نے سامنے کے کھلے حصّے پر نظر ڈالی تو پہاڑیوں کے درمیان نصف دائرے کی صورت میں میدان اس طرح دکھائی دیا جیسے کسی حسینہ نے اپنی نازک سی پنکھیا پرت کھول کر رکھ دی ہو۔ معاً اسے خیال آیا کہ اگر کسی شکارگاہ کی جگہ محل اور باقی حصے میں بالکل پنکھیا کے پرتوں کی طرح قطار در قطار عمارتوں کے بلاک تعمیر کرائے جائیں اور ان کے درمیان اسی انداز کی سڑکیں ہوں تو ایک خوشنما شہر وجود میں آ سکتا ہے

خیال کو عملی جامہ پہنانا ایسے لوگوں کے لیے چنداں دشوار نہیں ہوتا۔ فوراً احکامات صادر ہوئے، بڑے بڑے نقشہ نویس سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور واقعی ایسی چیز کاغذ پر نقش ہو گئی جس کی نظیر اس زمانے میں ملنی مشکل تھی۔ شاہی محل کے ساتھ ساتھ شہر کی داغ بیل بھی پڑ گئی اور کام شروع ہو گیا مگر عمر نے وفا نہ کی اور وہ اپنے خواب کی مکمل تعبیر دیکھنے سے پہلے اس جہان سے کوچ کر گیا۔ تاہم شہر اسی کے نام کی رعایت سے کارلس روہے کہلانے لگا اور

اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ محل میں عجائب گھر قائم ہے اور باقی شہر نئی بنیادوں پر تعمیر ہو کر پرانے نقوش کی یاد دلا رہا ہے۔

قدیم طرزِ تعمیر میں بہت سی تبدیلیاں انیسویں صدی میں ہوئی تھیں جب کہ مجلسِ بلدیہ کی عمارت، یونی ورسٹی اور قومی اسمبلی کی تعمیر عمل میں آئی کیوں کہ کارلس روہے اپنے صوبے کا صدر مقام بھی تھا۔ دوسری تبدیلی دوسری جنگِ عظیم کے بعد رونما ہوئی۔ البتہ شہر کا اصل خاکہ بدستور برقرار ہے۔ اب بھی اگر کوئی پرانے محل کے بالائے بام جا کر نظر دوڑائے تو کارل ولہم کا خواب سطحِ زمین پر کروٹیں لیتا دکھائی دے گا۔

وقتِ مقررہ سے صرف ڈھائی منٹ بعد ہم ہائیڈل برگ پہنچ گئے، جسے المانوی سرزمین پر ہم نے اپنی پہلی منزل کے طور پر پسند کیا تھا۔

**ہائیڈل برگ**: باڈن ورٹم برگ صوبے میں یہ جنوب مغربی جرمنی کا ایک اہم شہر ہے، لیکن چوں کہ ایک سمت کے سوا باقی اطراف میں یہ اونچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، اس لیے دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں سے بڑی حد تک بچا رہا۔ بمباری تو اس مقام پر ہوئی لیکن زیادہ نہیں۔ شاید برطانوی اور امریکی ہوا باز اس طرف آکر اپنی جان جوکھم میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ کیوں کہ جہازوں کو گرا لینے والی توپوں کے علاوہ قدرتی باڑیں ان کے لیے خوف ناک تھیں جن سے دور رہنا ہی ان کے لیے مناسب تھا۔

یہ شہر دریائے نکر اور دریائے رہائن کے مقامِ اتصال سے صرف بارہ میل کے فاصلے پر اس طرح واقع ہے کہ پھر وہاں سے پہاڑی سلسلہ ختم ہو کر بہت جلد میدانی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی لیے ایک دو کے سوا باقی پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں ہیں اور سب سے اونچے پہاڑ کی بلندی بھی ۱۸۶۰ فٹ ہے لیکن ہر چوٹی سے دامن تک سب کی ڈھلانیں سبزے سے، خصوصاً انگور کی بیلوں سے پٹی پڑی ہیں۔ قدرت کی یہ پیداوار اس علاقے کے لیے ایک بڑی نعمت ہے۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے پر یہ علاقہ امریکیوں کے قبضے میں آیا تھا بلکہ اس ملک کی فوجوں کا مستقر بن گیا تھا۔ اس قوم کے افراد نے دوسرے ملکوں میں جا کر ظلم و ستم ڈھانے کے علاوہ ثقافتی ورثوں کو جو نقصان پہنچایا ہے، اس سے یہ شہر بھی بچ نہ سکا۔ یعنی جو کام باپ نے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر دوا کم شدت کے ساتھ کیا تھا، وہ بیٹے نے زمین پر چل پھر کر پایۂ تکمیل کو

پہنچا دیا۔

ایک شاہی محل اور ایک قدیم یونی ورسٹی کے سوا کوئی اور بہت پرانی تاریخی عمارت یہاں نہیں تھی۔ صرف سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں چند قابلِ ذکر گرجا گھر تعمیر ہوئے تھے جو برقرار رہے لیکن اخلاق کا شیرازہ بکھیر دینے سے جو تباہی پھیلی تھی اس کا زخم دس سال گزر جانے کے بعد بھی مندمل ہونے نہیں پایا ہے۔ جرمن قوم نے جو اپنی روایات کی ہمیشہ پرستار رہی ہے، اس نقصانِ عظیم کو اچھی طرح محسوس کیا اور اس کے تدارک کی تدابیر پر غور کرنا شروع کر دیا۔

اس شہر پر قدرت کی ہمیشہ سے نظرِ عنایت رہی ہے اور اسی لیے یہاں کے دل چسپ ماحول اور دل فریب فضا سے متاثر ہو کر اکثر شاعروں نے گیت گائے ہیں۔ گیٹے جیسے مفکر شاعر تک نے اس کی شان میں قصیدہ لکھا ہے۔ اس کی رائے تھی کہ "یہاں کے ماحول میں خیالات عروج پا کر خود بخود انسان کا منتہائے نظر پا لیتے ہیں۔" اور ایک فرانسیسی شاعر ایڈگر کوئنے نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ لطیف روحوں کی بستی ہے۔

بعض لوگ اسے "ایک شہرِ رومان" اور بعض "ایک شہرِ رومانیت" کہتے ہیں۔ پہلے خطاب کا سبب تو وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے اور اس کا تعلق اس کے قدرتی محلِ وقوع سے ہے جس کی ترتیب و تزئین میں پہاڑ اور میدان، دریا اور آبشار اور سب سے زیادہ سبزہ زار شریک ہیں۔ اس میں کچھ انسانی صلاحیتوں نے بھی باغیچے اور روشیں بنا کر، خوش نما عمارتیں اور پل تعمیر کر کے اپنے طور پر حصہ لیا ہے۔ چناں چہ جوزف ایخن ڈورف کے قول کے مطابق "یہ بجائے خود ایک شان دار رومان ہے۔"

اور دوسرا خطاب ان متعدد تحریکات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ادب و شعر، دین و مذہب اور تمدن و سیاست کے باب میں یہاں سے شروع ہوئی ہیں اور ساری دنیا میں نہ سہی تو کم سے کم سارے یورپ پر اپنا سکہ جماتی چلی گئی ہیں جن کی وجہ سے جرمنی آج بھی مشہور ہے۔ یہاں مقامی باشندوں ہی نے نہیں، غیر ملکی فن کاروں نے بھی آ کر اور اپنا مسکن بنا کر عروج پایا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ والس، اسکاٹ لینڈ سے ——— ٹرنر، انگلستان سے ——— گرائم برگ، فرانس سے اور ہیگی سوئزرلینڈ سے آیا تھا اور آنے سے پہلے ان میں سے کسی نے اپنے لیے کوئی مقام پیدا نہیں کیا تھا۔ انھوں نے یہاں آ کر جو خواب دیکھے وہ ایسے روح پرور نقوش کی صورت میں چھوڑ گئے جن سے ان کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ کتب خانوں اور عجائب گھروں کے در و دیوار

اور سقف و بام بطور ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں۔

یہ شہر کب سے آباد ہے؟ تاریخ کے اوراق اس باب میں خاموش ہیں، بلکہ اس ذکر کو چھیڑنا کسی نے مناسب ہی نہیں سمجھا۔ البتہ اس کے قرب و جوار میں کھدائی سے جو آثار برآمد ہوئے ہیں، ان کی بنیاد پر اسے بے حد قدیم کہا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانے میں اس کا محل وقوع یہ نہ ہو جو اب ہے بلکہ دو چار میل اِدھر یا اُدھر ہٹ کر آباد رہا ہو۔ ۱۹۰۷ء میں قریب کی ایک وادی، موئر میں کھدائی ہوئی تو ایک ایسے انسان کا جبڑا اور چند دانت برآمد ہوئے جو زمانۂ قبل تاریخ سے بہت پہلے اس دنیا میں پایا جاتا تھا اور اسی اعتبار سے اس عہد کے لوگوں کو "ہائیڈل برگ کا انسان" کہا جانے لگا۔

**محبوب سے ملاقات**: گاڑی کے رکتے ہی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بڑی چہل پہل شروع ہو گئی۔ ہائیڈل برگ ریلوے کا بہت بڑا اور اہم مرکز ہے۔ مختلف سمتوں میں یہاں سے ہر وقت آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے قدیم زمانے میں یہ تجارتی قافلوں کا بڑا گڑھ تھا۔

گاڑی سے اترنے والے لوگوں میں مقامی باشندوں کے علاوہ بہت سے غیر ملکی بھی شامل تھے۔ وہ سب اس شہر کی زیارت کے لیے نہیں اترے تھے، بلکہ ان میں سے بیشتر کو کچھ دیر آرام گاہ میں انتظار کر کے کسی دوسری گاڑی سے کسی اور سمت جانا تھا۔ اسی طرح گاڑی پر سوار ہونے والے بھی اقوام متحدہ کے اراکین کی طرح مختلف ملکوں کے باشندے تھے۔ اگرچہ بڑا اسٹیشن ہونے کے باعث گاڑی کو کافی دیر رکنا تھا اور بہت سے مسافروں کی نشستیں محفوظ تھیں، پھر بھی ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اترنے والے سے پہلے خود چڑھ جائے۔ گویا اگر عجلت نہ کی تو جگہ نہیں ملے گی یا خالی نشست پر قریب کے بیٹھنے والے پھیل کر قبضہ کر لیں گے اور یہ منھ تکتے رہ جائیں گے۔ یہ اس لیے کہ شاید وہ اِن کی اور یہ اُن کی زبان نہ سمجھ سکیں گے۔ یہ منظر اپنے ملک کے ریلوے اسٹیشن پر بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ ڈبوں میں گنجائش مسافروں کے ہجوم کی بہ نسبت بہت ہی کم ہوتی ہے اور وہ بھیڑ بکریوں کی طرح اندر گھس جانا چاہتے تھے۔

ہم باہر نکلنے کے لیے بے قرار تھے اور راستہ بُری طرح رُکا ہوا تھا۔ ہماری بے چینی کا ایک خاص سبب تھا۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے ایک بھائی محبوب الٰہی ہماری تلاش میں ایک ایک

ڈبے کو جھانکتے پلیٹ فارم پر بھاگے پھر رہے ہوں گے۔ ہماری آرزو تھی کہ جلدی سے باہر نکل کر ان کو اس خلش سے بچالیں۔ چناں چہ ہمارا یہ قیاس درست نکلا۔ اچانک اس جمِ غفیر میں ہمیں ایک چہرہ نظر آیا جو اس بچے کی مانند کھویا ہوا سا تھا جو بھیڑ میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہو۔ نہ معلوم وہ پلیٹ فارم کے کتنے چکر لگا چکے تھے اور اس وقت بھی جب ہماری نظر اُن پر پڑی، وہ حسرت و یاس کے عالم میں آگے بڑھ جانے کے قریب تھے کہ میں نے ایک دم کھڑکی سے گردن نکالکر اور پوری قوت سے چیخ کر ان کو آواز دی "مجبوب ــــــ مجبوب"

یورپ کی سرزمین پر اس قِسم کا کوئی بھی نام جس سے سننے والوں کے کان نا آشنا ہوں، ان کو چونکا دینے کے لیے کافی ہے۔ چناں چہ بہت سے لوگ جو بظاہر مضطرب و بے چین تھے، کسی قدر رک کر ہمارے ڈبے کی طرف دیکھنے لگے اور شاید ہمارے بھائی محبوب نے بھی ہماری آواز سنے بغیر محض دیکھنے والوں کی نظریں دیکھ کر ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا اور فوراً ہمیں پہچان بھی لیا۔ ہم یورپ کے اس ملک میں خالص مشرقی وضع کے لباس میں دوسروں سے بالکل الگ بلکہ نمایاں نظر آتے تھے۔

برادرِ عزیز میاں محبوب الٰہی کیمسٹری کی اعلا تعلیم اور کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کے لیے ۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء کو اللہ کا نام لے کر کراچی سے بون روانہ ہوئے تھے۔ آج دو بجے ان سے تقریباً پونے چار سال بعد ملاقات ہوئی۔ مسرت کے آنسو آخر آنکھوں کی کٹوریوں سے چھلک ہی گئے ؎

لاکھ چاہا کہ کروں ضبط، نہ روؤں لیکن
چشمۂ چشم سے آہی گئے آنسو باہر

ان آنسوؤں کو نہ معلوم کس وقت کے لیے میں نے سنبھال رکھا تھا۔ شاید یہی وقت ہو، لیکن وہاں یہ کہنے والا کوئی نہیں تھا ؎

اسے پانی سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
بیانِ دردِ دل ہے اور اشکوں کی زبانی ہے

اور برادرِ عزیز کی مسرت کا کیا حال اور خوشی کا کیا ٹھکانا تھا، وہ کبھی بے تاب ہو کر بھائی جان محترم سے چمٹتے تھے اور کبھی وفورِ جذبات میں مجھ سے لپٹ جاتے تھے۔

**اسٹیشن سے ہوٹل تک** ۔ہماری ریل گاڑی نئے ریلوے اسٹیشن پر رُکی تھی جو بہت ہی کھلی جگہ میں واقع ہے۔ پرانا اسٹیشن گنجان آبادی میں ہے اور اب زیادہ تر قریب کے مقامات تک جانے والی لوکل ٹرینوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بین الاقوامی قسم کی ریل گاڑیاں ہمیشہ نئے اسٹیشن پر آ کر رکتی ہیں۔ اس سے ریلوے کے اربابِ انتظام اور مسافروں

دونوں کو سہولت رہتی ہے۔ عمدہ قسم کی ٹیکسی لے کر بگھی تک ہر قسم کی گاڑی اسٹیشن کے باہر فوراً میسر آجاتی ہے۔ شہر کے کسی بھی حصے میں جانا ہو، وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، خواہ ریل گاڑی آدھی رات کو اسٹیشن پر پہنچے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس شہر میں بھی عمدہ قسم کے معیاری ہوٹلوں سے لے کر سرائیں اور مسافر خانے تک موجود ہیں۔ ہر شخص اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلا سکتا ہے۔

ہمارے قیام کا انتظام پہلے سے ہوٹل رٹز میں کیا جا چکا تھا۔ اس کے کئی سبب بیان کیے گئے تھے۔ اول یہ کہ وہ ایک پرانی وضع کی کئی منزلہ عمارت ہے اور فن تعمیر کے اعتبار سے واقعی قابل دید ہے۔ ۱۹۵۲ء میں اسے تعمیر کیا گیا تھا، کیوں کہ اس کا نقشہ شاہی قلعے کے اندر کی ایک عمارت کے عین مطابق بنایا گیا تھا اور چوں کہ قلعے کا وہ حصہ نواب محل کہلاتا تھا، اس لیے اس سے شہر میں مشابہت پیدا کرنے والی عمارت کو بھی وہی نام دے دیا گیا۔

اس ہوٹل کو منتخب کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کا محل وقوع بہت عمدہ ہے۔ ایک طرف شہر کا بہترین آباد علاقہ ہے جس کے مختلف حصوں میں یونی ورسٹی کی عمارت، عجائب گھر، بہت سے گرجا گھر اور ایسے ادارے بھی ہیں جنھیں ہم دیکھنا چاہتے تھے۔ قدیم شاہی قلعہ بھی تھوڑے فاصلے پر ہے، جسے اس شہر میں شہنشاہیت کی واحد بڑی یادگار کہا جا سکتا ہے۔ اس آبادی کے وسط سے مشہور لمبی لہکاری شاہراہ ہوپٹ اسٹراس شرقاً غرباً پھیلی ہوئی ہے جس نے ہائیڈل برگ کو نہ صرف ملک کے دوسرے بڑے شہروں، بلکہ براعظم کے دوسرے کئی ملکوں سے ملا رکھا ہے۔

شاہراہ کے بالکل متوازی دریائے نکر ٹھاٹھیں مارتا بہتا ہے جس کے پار جانے کے لیے ایک پرانا پل ہوٹل سے بہت ہی قریب واقع ہے۔ دریا عبور کرنے کے لیے دو اور پل جدید وضع کے ہیں لیکن کافی دور ہیں۔ دریا کے اس پار زیادہ آبادی نہیں ہے۔ البتہ سیر و تفریح کے لیے اچھے مقامات میسر آسکتے ہیں۔ ہوٹل کے جانب جنوب اونچی پہاڑی پر رصدگاہ کے علاوہ ایک بڑا اسپتال بنا ہوا ہے جو امراض قلب کے علاج کے لیے مشہور ہے۔

غرض ان سب سہولتوں اور نعمتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے لیے یہ ہوٹل پسند کیا گیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ انتخاب کرنے والے کی نظر قابل تحسین کہی جا سکتی ہے۔

اسٹیشن پر نہ ہمارا سامان چک ہوا اور نہ کاغذات دیکھے گئے۔ کسی محصول کا مطالبہ

بھی نہیں ہوا، لہٰذا بہت جلد ہم باہر نکل گئے اور ٹیکسی والے کو ہوٹل کا نام بتا کر اپنی عارضی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ برادر محبوب ہمارے ساتھ گئے۔ حالاں کہ رات کے وقت انھیں ہمارے ساتھ ٹھیرنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ کیوں کہ صرف دو آدمیوں کا کمرہ (سوئٹ) ہمارے لیے مخصوص کیا گیا تھا اور کسی تیسرے شخص کو اس میں ٹھیرا لینا خلافِ قاعدہ تھا۔ جب یہ بات میاں محبوب نے ہمیں بتائی وہ کسی قدر افسوس ہوا کہ ہم اتنے قریب ہو کر بھی ان سے الگ رہیں گے۔ تاہم اس خیال سے دل کو تسلی دی جا سکتی تھی کہ رات کے صرف ان لمحات میں جو سونے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، وہ ہم سے جدا رہیں گے، ورنہ باقی وقت میں ہمارا ان کا ساتھ رہے گا اور اس پر ہوٹل کے اربابِ حل و عقد سمیت کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے رات گزارنے کے لیے اپنے ٹھیرنے کا اہتمام ایک اور ہوٹل میں کر لیا تھا بلکہ وہیں اپنا سامان رکھ رکھا کر اسٹیشن پر ہم سے ملنے آئے تھے۔

**ہوٹل میں**: موٹر گاڑی تیزی سے چلتی رہی اور ہم کئی عمدہ عمارتوں کے قریب سے گزر گئے۔ ان میں سے سینٹ پیٹر چرچ کی عمارت کافی اثر انگیز ہے۔ اس سے تھوڑے ہی آگے چل کر ہوٹل آ گیا۔ ہوٹل واقعی شان دار ہے۔ اس کی ظاہری وضع قطع ہی نے دل پر اثر کیا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے ؎ قیاس کن ز گلستانِ من، بہارِ مرا

میں نے سوچا کہ جب ہوٹل کی ظاہری سج دھج اتنی اچھی ہے، وہ اندر سے بھی اہم خصوصیات کا حامل ہو گا اور اس میں ٹھیرنے میں لطف آئے گا۔ کمرے کا نمبر یاد نہیں رہا لیکن وہ دوسری منزل پر تھا۔ لفٹ کے ذریعے ہمیں وہاں تک پہنچایا گیا۔ ہمارے سامان کو ہوٹل کے ملازم زینے پر چڑھ کر اوپر تک لائے۔ یہ انتظام اچھا معلوم نہیں ہوا۔ ملازم بہر نوع ملازم رہے گا۔ لفٹ کے ذریعے اوپر تک پہنچنے سے نہ تو اس کی شان بڑھ سکتی ہے اور نہ اس کے ساتھ لفٹ میں کھڑے ہو جانے سے دوسروں کی شان گھٹ سکتی ہے۔ پھر یہ فرق و امتیاز کیوں؟ ایک زیادہ مناسب صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ عمارت کے بہت سے لفٹوں میں سے ایک لفٹ سامان اتارنے چڑھانے کے لیے مخصوص کر دیا جاتا۔

کمرے میں داخل ہو کر ہم نے ایک ہلکا سا جائزہ لیا۔ مسہریاں عمدہ گدیلے والی تھیں اور ان پر بستر بھی صاف ستھرے تھے۔ پردے صوفہ سیٹ سے میچ کر رہے تھے۔ دیواروں پر عمدہ فریموں میں ایسی سینریاں آویزاں تھیں کہ انھیں مسلسل دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ یہ

غنیمت ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی عورت کہیں جلوہ گر نہیں تھی ورنہ وہ جدید روش کے مطابق نیم عریاں ضرور ہوتی اور ہم دونوں بھائیوں کو فوراً ذہنی انقباض شروع ہو جاتا اور بھائی جان محترم یہ کرتے کہ فریم کو پلٹ کر تصویر کا رُخ دیوار کی طرف کر دیتے۔

کمرے میں ہر شے قرینے سے رکھی تھی اور شاید ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ میں نے ایک نظر ڈال کر اندازہ لگالیا کہ ہمیں کسی قسم کی بے آرامی نہیں ہوگی۔ ہوٹل کے ملازم نے جو ہمارے ساتھ کمرے تک آیا تھا، ہمیں ایک ہدایت نامہ تھمادیا۔ وہ ہمدرد کی دواؤں کے ساتھ پیک ہونے والے پرچہ ہائے ترکیبِ استعمال کی طرح کئی زبانوں میں چھاپا گیا تھا تاکہ ہر شخص اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق اسے پڑھ لے۔

وقت کم تھا اور کام بہت زیادہ۔ پھر سہ پہر کا عمل ہو گیا تھا۔ رات سر پر چلی آرہی تھی۔ ضرورت تھی کہ تاریکی چھانے سے پہلے کہیں گھوم پھر کر کچھ دیکھ بھال لیا جائے۔ کھانا کھانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ کیوں کہ وقت بہت غیر ہو گیا تھا۔ بھوک مر گئی تھی اور پھر اس وقت منھ جھٹلا لینے کے بعد رات کا کھانا ختم ہو جاتا۔ لہٰذا اسے بالکل گول کر دیا اور دونوں بھائی جلدی جلدی ہاتھ منھ دھو کر اور کپڑے بدل کر باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جس طرح ترکی میں برکات احمد صاحب ہمارے مشیر اور راہنما بنے رہے تھے، اسی طرح محبوب بھائی نے جرمنی میں یہ خدمت اپنے سر لی تھی۔ ہم نے کوئی گاڑی نہیں لی۔ پیدل ہی چل پڑے۔

**شاہی قلعہ**: ہوٹل سے تھوڑے فاصلے پر پرانا شاہی قلعہ ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اسے دیکھ لینے کا فیصلہ ہوا۔ یوں بھی شام کے وقت ایسی چیزوں کو دیکھنا مناسب رہتا ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری جھلملاتی کرنیں تاریخی عمارتوں کی رومانی فضا میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ دہلی میں مغلوں کے زمانے کا لال قلعہ صبح اور شام دونوں وقت کھلتا ہے۔ لیکن صبح کے وقت بہت کم زائرین نظر آتے ہیں اور شام کو ایسی چہل پہل ہوتی ہو کہ سیر کرنے والے کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی تاریخی عمارت کی چار دیواری میں گھرا ہوا ہے۔

ہائیڈل برگ کے اس شاہی محل کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس زمانے میں بنا اور کس فرماں روا نے اسے آباد کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اگرچہ اس کی داغ بیل ۱۲۲۵ء میں پڑی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تیرھویں صدی سے سترھویں صدی تک اس میں

باقاعدہ تعمیر و ترمیم کا سلسلہ جاری رہا اور یہ سلسلہ اس کے بعد بھی ختم نہیں ہوا، حتیٰ کہ کچھ اضافے انیسویں صدی کے آخر تک ہوتے رہے ہیں۔ ان سات سو سال کی مدت میں ظاہر ہے کہ ایک دو نہیں، بہت سے فرماں رواؤں نے اسے اپنی آماجگاہ بنایا ہوگا۔ البتہ ابتدائی بنیاد رکھنے والے کا سہرا ایک مختارِ کار کے سر ہے جس نے ریوپرٹ دوم کے کہنے پر یہ کام شروع کیا تھا لیکن جرمنی کا پہلا بادشاہ جس نے یہاں رہ کر سارے ملک پر حکومت کی، ریوپرٹ سوم تھا۔ وہ اگرچہ آم برگ میں پیدا ہوا لیکن اس علاقے میں سریر آرائے سلطنت رہا۔ ۱۳۹۸ء میں جب کہ اس کی عمر ۴۶ سال تھی، وہ ایک صوبے کا حکمراں اور پھر دو سال بعد سارے ملک کا بادشاہ منتخب ہوا تھا۔ وہ دس سال یعنی ۱۴۱۰ء میں مرتے دم تک حکومت کرتا رہا جو ایک لحاظ سے برائے نام تھی کیوں کہ اس نے میلان کے فرماں روا کو نیچا دکھانے کے لیے اٹلی پر یلغار کی تھی، لیکن ناکامی کا سامنا ہوا اور اس لیے ہمیشہ عوام کی ملامت کا نشانہ بنا رہا اور اسی وجہ سے زیادہ وقت قلعے کے اندر رہ کر گزارا۔

ریوپرٹ سوم کے بعد اوٹو ہنری اور فریڈرک چہارم بھی اپنی اپنی بادشاہت کے پرچم یہاں لہراتے رہے۔ ہوا یہ کہ جب بھی کوئی نیا فرماں روا تخت نشین ہوا، اس نے محل میں "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت" کے مصداق کچھ نہ کچھ اضافہ کرکے اپنی رہائش کے لیے اسے مخصوص کر لیا۔

کیوں کہ یہ شاہی قلعہ ایک پہاڑ کی کونگز سٹول نامی چوٹی پر واقع ہے جو سطح سمندر سے اٹھارہ سو فیٹ اور دریائے نکر کی سطح سے تین سو فیٹ بلند ہے، اس لیے بعض نزاکت پسند لوگ وہاں تک چھوٹی سی ریل گاڑی کے ذریعے پہنچتے ہیں لیکن ہم کہ کشمیر، شملہ اور مسوری کی کوہ پیمائی کر چکے تھے اور ایک بار شملے سے مسوری تک پہاڑی راستوں سے ہو کر گئے تھے، اتنی قلیل سی چڑھائی کو کہاں خاطر میں لاتے۔ بے تکان ایک سانس میں اوپر چلے گئے۔

یہ قلعہ پہلی اور دوسری عالم گیر لڑائیوں کی زد سے تو بچا رہا لیکن ان سے بہت پہلے، سترھویں صدی کے آخر میں، اس کا کچھ حصہ لوئی چہاردہم کے ایما پر محاصرہ کرنے والے فرانسیسی سپہ سالار نے منہدم کرا دیا تھا اور پھر ۱۷۶۴ء میں بلائے آسمانی کے طور پر بجلی گری تو اس نے رہا سہا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا لیکن جیسا کہ بعض سیاحوں اور مورخوں نے لکھا ہے، اسے کھنڈر کہنا بالکل غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۳ء تک بھی اس کی اصل شان کو بحال کرنے کے لیے متعدد بار کام یاب کوششیں ہوتی رہی ہیں، تاہم اس تعمیرِ نو سے قطع نظر اس

کے بعض حصے جو انسانی چیرہ دستیوں اور آسمانی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے اور اس طرح بعد کی ملمع سازی سے بچے رہے تھے، اب بھی اوّلین معماروں کی صناعی اور مہارتِ فن کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے بعض حصے اب سے کچھ عرصے پہلے تک سرکاری دفاتر کے طور پر بھی استعمال کیے گئے ہیں۔

قلعے کی خاص عمارتیں ایک باقاعدہ چوکور قطعۂ زمین پر تعمیر ہوئی تھیں، اور ان کے بیچوں بیچ ایک وسیع صحن ہے جسے روشوں، نہروں اور فواروں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بالکل درمیانی حوض کے چاروں کونوں پر جو سنگِ سُرخ کے چار ستون کھڑے ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شارلیمین کے محل سے لا کر جو انگل ہیم میں واقع تھا، یہاں نصب کیے گئے تھے۔ بعد کی تعمیر میں سے الزبتھ انٹور (بابِ الزبتھ) کا نام ایک صدر دروازہ کافی شاندار ہے جو جرمن شہزادے کی شریک حیات بننے والی انگریز شہزادی کے نام پر تعمیر ہوا تھا۔ شمال مشرقی گوشے میں گھنٹہ گھر کے طور پر بنا ہوا ایک ہشت پہلو مینار بھی خوبصورت اور قابلِ دید ہے۔ اس کی آخری منزل پر پرانے رواج کے مطابق لنگر والی ایک بڑی گھنٹی مقررہ اوقات پر بجائی جاتی تھی جو نہ صرف ساکنانِ محل کو بلکہ قرب و جوار میں رہنے والوں کو دن میں کئی بار آگاہ کرتی ہو گی کہ خالق تمہاری عمر کی گھڑیاں برابر کم کرتا جا رہا ہے۔

شاہ فریڈرکس کے زمانے میں جو حصہ تعمیر ہوا، وہ اب بھی فریڈرک باؤ (عمارت) کہلاتا ہے جو قلعے سے متعلق بعض پرانی اشیاء کی نمائش کے لیے قومی عجائب گھر بنا ہوا ہے۔ شاہی گرجا گھر کے بام و در بھی محفوظ ہیں جس کی دیواریں کندہ نقوش کی حامل ہیں۔

شاہی شراب خانہ جس میں داخل ہونے کا راستہ صحن کے ایک گوشہ میں رکھا گیا ہے، کچھ زیادہ قابلِ دید تو نہیں، البتہ اس کے اندر بنا ہوا شراب کا ایک بہت ہی بڑا پیالہ، جسے ایک دیو قامت ناند بھی کہا جاتا ہے، ساری دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بیس فٹ اونچے اور بالائی کنارے پر اکتیس فٹ قطر کے اس جامِ شراب کو جس میں پچاس ہزار گیلن سے زیادہ شراب بیک وقت بھری جا سکتی تھی اور جس میں سے شراب نکالنے کے لیے بیس فٹ لمبی ایک سیڑھی لگانی پڑتی تھی، کس متوالے مگر ماہر فن کوزہ گر نے بنایا ہو گا۔ وضع قطع کے اعتبار سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی کرشمہ ساز نے ایک گنبد کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ "جامِ واژگوں" کی تشبیہ تو سنی تھی، اسے "گنبدِ واژگوں" کہا جائے تو ہرگز

بے جاز ہوگا۔ یہ ۱۵۰۷ میں بن کر تیار ہوا تھا اور شاید اسی وقت سے ایک طرف کو جھکا کر رکھ گیا تھا، جیسے اسے ٹیڑھا کر کے شراب کسی چھوٹے جام میں انڈیلی جا رہی ہو۔ سب سے پہلا شاہی آبدار جس کا نام پرکیو تھا، بہت ہی پستہ قد انسان تھا۔ وہ شاہی مہمانوں کو شراب پلانے کے علاوہ خود بھی بلانوش تھا۔ ایک بار کسی درباری نے اس سے شرط لگائی کہ وہ اس پیالے کی ساری شراب ایک دفعہ میں پی جائے۔ کہتے ہیں کہ وہ شراب نوشی کی شرط جیتنے کے بجائے اپنی جان کی بازی ہار گیا۔ ممکن ہے کہ اس بیان میں کچھ مبالغہ آرائی ہو، لیکن حقیقت سے بالکل انکار نہیں ہو سکتا۔ جرمنی کے مشہور شاعر شیفل کے کلام سے اس کی سند ملتی ہے۔

فریڈرک باؤ کے عقب میں ایک کھلا مقام ہے جسے اس محل میں ایک شہ نشین کہنا چاہیئے۔ یہاں سے سارے شہر کا ایسا دلپذیر نظارہ ہو سکتا ہے جو شاید کسی اور جگہ سے ممکن نہیں۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر جب میں نے سارے شہر پر نظر ڈالی تو مجھے ترکی کا ہوٹل ہلٹن یاد آ گیا جس کی آخری منزل کی کھلی چھت سے میں نے شہر استنبول کا ایسا نظارہ کیا تھا جو تمام عمر یاد رہے گا (ملاحظہ ہو یورپ نامہ جلد اول صفحہ ۱۶۰)

وہیں سے میں نے یہ بھی دیکھا کہ ہوپٹ اسٹراس اس شہر کے بالکل بیچوں بیچ سے گزرنے والی شاہراہ ہے جس کے دونوں طرف عالیشان عمارتیں ہیں۔ اس کے متوازی ذرا جانب شمال ہٹ کر ایک اور لمبی چوڑی سڑک ہے جو دریائے نکر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دریا پر بنے ہوئے تین پل بھی ہمیں نظر آئے۔ ایک تو وہی جو ہوٹل رٹز اور خود شاہی قلعے سے بہت نزدیک ہے اور جس کے سرے پر پرانی وضع کے دو مینار بنے ہوئے ہیں۔ اس پل کو کارل تھیوڈور نے ۱۷۸۶ء میں تعمیر کیا تھا۔ دوسرا پل شہر کے تقریباً وسط میں ہے اور دریا کو پار کرنے کے بعد بھی اس کے ڈانڈے شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً بڑے راستوں سے ملے ہوئے ہیں۔ آخری پل جو ہمیں نظر آیا، وہ مغربی سمت میں حدِ نظر پر تھا۔ اس پل کو عبور کرنے کے بعد جس حصہ شہر میں پہنچا جاتا ہے، وہ کھیل کود کے میدانوں، ریڈیم کی تاثیر رکھنے والے پانی کے غسلخانوں اور باغہائے حیوانات و نباتات کا مرکز ہے۔ ہمارے کل کے پروگرام میں وہاں جانا شامل ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے کی سیر و تفریح اور نظری مشاہدے کے بعد ہم قلعے سے باہر آ گئے اور سامنے کی پہاڑی پر چل پڑے جس پر امراض قلب کا اسپتال اور ایک رصد گاہ ہے۔

وہاں جانے کے لیے بسوں کا انتظام ہے۔ چنانچہ جب ایک بس قریب سے گزری اور ہمارے ہاتھ کے اشارے پر رک بھی گئی تو ہم نے پیدل نہ چلنا ہی مناسب سمجھا۔ کیونکہ اس طرح خاص طور پر وقت بچانا ہمارا منشا تھا۔ چند آنے کے برابر قلیل سی رقم خرچ کر کے بہت جلد منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ لیکن کسی قدر مایوسی ہوئی۔

اسپتال اور رصدگاہ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا لیکن شام ہو جانے کے بعد رصدگاہ تو بند ہو چکی تھی اور چونکہ اسپتال کے ارباب اقتدار کو پہلے سے اطلاع نہیں دی گئی تھی، اس لیے کسی ایسی ذمہ دار ہستی سے ملاقات نہیں ہوئی جو ہمیں اسپتال کی باقاعدہ سیر کراتا اور وہاں کے نظام اور طریقہ علاج کے بارے میں ہماری معلومات بڑھاتا۔ تاہم نرسنگ کا عملہ جو اس وقت متعین تھا، اچھی طرح پیش آیا۔ خندہ پیشانی سے ہماری پذیرائی ہوئی اور ہماری درخواست پر (جو میاں محبوب کی زبانی ارسال خدمت کی گئی تھی) ہم کو ہر وارڈ، معائنے کے کمرے، آپریشن تھیٹر اور شعاعوں والے حصے دکھائے گئے لیکن اُن کی طرف سے نہ تو ہر بات کی پوری وضاحت ہوئی اور نہ ہم نے ایسے استفسارات کیے جن کے جواب دینے ان کے لیے دشوار ہو سکتے تھے۔ ہسپتال میں مریضوں کی تعداد خاصی تھی لیکن چہروں سے وہ سب کے سب تندرست معلوم ہوتے تھے گویا ان میں سے بیشتر ان امراض قلب میں مبتلا تھے جو سمندر کے اتار چڑھاؤ کی طرح یکایک انسان کو پریشان کرتے اور صحیح تدارک ہو جانے پر اپنی کیفیات اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اس وقت مریض بظاہر مریض معلوم نہیں ہوتا۔

اگرچہ تشریح اور وضاحت کرنے والا کوئی شخص وہاں موجود نہیں تھا، تاہم ہم نے خود جائزہ لے کر یہ اندازہ ضرور لگایا کہ یہاں بھی زیادہ تر علاج کے وہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جو جدید طب کی دنیا میں ایک مرض کو دور کر کے دس ایسے مرض پیدا کر دیتے ہیں جن کا احساس خود مریض کو بہت بعد میں اور معالج کو کبھی نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بزعم خود یہ سمجھتا ہے کہ اس نے مریض کے قلب کی ضربات میں ایک باقاعدگی پیدا کر کے بڑا کمال کیا ہے، حالانکہ اس باقاعدگی پیدا کرنے میں جو دوسرے اعضا کے افعال اور اعصاب کی کیفیات میں آہستہ آہستہ گھن لگنا شروع ہو جاتا ہے، اس کی تشخیص مشکل سے ہوتی ہے اور بعض دفعہ مرض کے ساتھ ساتھ مریض ختم ہو جاتا ہے اور اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا۔

ہم نے مریضوں کی غذا کے بارے میں استفسار کیا کیونکہ یہ ایک ایسا پہلو تھا جس کا

جواب نرسیں دے سکتی تھیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ غذا کے معاملے میں وہ اصول مدِّنظر رکھے جاتے ہیں جو آج سے ہزار سال پہلے مشرقی طب کو فروغ دینے والوں نے منضبط کیے تھے اور جنہیں اپنا کر مغربی طب کے علمبردار فخر کرتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اگر جرمنی میں کسی اور ایسے ہی ہسپتال میں جانے کا موقع ملا اور کسی ذمہ دار ہستی سے کچھ دیر کے لیے ملاقات ہوئی تو ضرور تبادلۂ خیالات کیا جائے گا۔

کچھ دیر بعد ہم ہسپتال سے باہر آئے۔ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر نظر ڈالی جہاں سورج طشتِ افق سے لے لے کر لالے کے آخری پھول بکھیر رہا تھا۔

ایک بار پھر وقت بچانے کی خاطر بس کی سواری اختیار کرنی پڑی اور ہم اپنی قیام گاہ، یونیورسٹی کی عمارت اور عجائب گھر کے پاس سے ہوتے ہوئے ایک ایسے مقام پر اتر گئے جہاں کسی زمانے میں شاہی اصطبل بنے ہوئے تھے اور اب ان کی حرف یادگار باقی رہ گئی ہے۔

سامنے دریائے نیکر ٹھاٹیں مار رہا تھا جس کی سطح پر کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بادبان اور بغیر بادبان کے نظر آرہی تھیں جن کے تیرنے کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ کسی خاص منزل کی طرف سرگرم سفر نہیں ہیں بلکہ ان میں بیٹھنے والوں کو تفریحًا دریا کی سیر کرائی جا رہی ہے۔ ساحل پر یا ساحل کے قریب نہ تو کوئی خالی کشتی نظر آئی اور نہ کوئی ایسا مستقر دکھائی دیا جہاں سے کچھ دیر بعد کشتی ملنے کی امید ہو سکتی تھی، ورنہ خیال ہمارا بھی یہی تھا کہ اپنے اعصاب کو سکون و آرام دینے کے لیے کشتی میں سیر کی جاتی۔ مجھے یاد آیا، علامہ اقبال نے جرمنی کے دورانِ قیام میں دریائے نیکر کے کنارے پہنچ کر اس کی آہستہ خرامی کے سکوت میں اپنے دل کا سکون تلاش کیا تھا۔ بانگِ درا میں ان کی نظم "ایک شام" اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ سات اشعار کی نظم درج ذیل ہے:

## ایک شام

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے — آغوش میں شب کے سو گئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے — نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے — یہ قافلہ بے درا رواں ہے

خاموش ہیں کوہ ودشت و دریا     قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

اس نظم میں علامہ اقبالؔ نے دریائے نکر کو نیکر لکھا ہے۔ غالباً یہ ضرورتِ شعری ہے بالکل اسی طرح جیسے جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے شہر مدفن کے لیے ویمر لکھا ہے حالانکہ اس کا اصل تلفظ وائمار ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان الفاظ کے صحیح تلفظ سے واقف نہیں تھے محض ضرورتِ شعری کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہوگا۔ لفظ ویمر انھوں نے مرزا غالبؔ کو خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے اس شعر میں استعمال کیا ہے ؎

آہ! تو اُجڑی ہوئی دِلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

اقبالؔ نے پُرسکون ماحول سے متاثر ہو کر دل کو ہدایت کی تھی کہ وہ غم کو آغوش میں لے کر سو جائے۔ ہمارے لیے یہ شاعرانہ انداز اختیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ ہم صرف یہ چاہتے تھے کہ کشتی لے کر دریا کی سیر کی جائے اور بس لیکن جب کوئی سبیل ممکن نہ ہوئی تو محض چہل قدمی پر اکتفا کیا اور اس چوراہے کے قریب سے مُڑ کر جہاں بسمارک کی یادگار عمارت قائم ہے، ہم دوبارہ ہوپٹ اسٹراس پر آ گئے۔

**بسمارک** بسمارک نام کی بہت سی عظیم ہستیاں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی میں گزری ہیں اور ان میں سے اکثر ایک ہی خاندان سے وابستہ تھیں لیکن وہ بسمارک جسے ایک مدبر و مفکر کی حیثیت سے شہرتِ دوام حاصل ہوئی، ایڈورڈ اوٹو بسمارک تھا جو یکم اپریل ۱۸۱۵ء کو پرشیا کے ایک شہر براندن برگ میں ٹھیک اس زمانے میں پیدا ہوا جبکہ جرمنی کے مختلف صوبوں، آس پاس کی ریاستوں اور ملکوں کو جن میں پرشیا بھی شامل ہے ملا کر ایک متحدہ وفاق بنانے کے منصوبے عمل میں آ رہے تھے۔ یہ وہ بسمارک تھا جو آگے چل کر نئی جرمن پارلیمان (رائخ) کا سب سے پہلا اور عام خطاب کے مطابق "آہنی چانسلر" کہلایا، اور جسے اس کی خدمات کے پیشِ نظر پرنس کا خطاب دیگر شاہی خاندان کے ایک رکن کے برابر مرتبہ دے دیا گیا۔

متحدہ وفاق قائم ہونے کے بعد جرمنی اور پرشیا کے باشندے آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو گئے کہ ان کے مابین کوئی فرق و امتیاز باقی نہیں رہا۔ ایوانِ حکومت سے میدانِ

سیاست تک دونوں علاقوں کے اربابِ اقتدار شانہ بہ شانہ ایک ساتھ ہر کام میں حصّہ لینے لگے۔ لہٰذا بسمارک اگرچہ خالص جرمن نہیں تھا لیکن تاریخ میں ایک جرمن نژاد کے ہم پلّہ ہی سمجھا جاتا ہے اور اب بھی جب کہ پرشیا کو جرمنی سے علیحدہ ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے، بسمارک کی مقبولیت کا ڈنکا وطنِ مالوف سے کہیں زیادہ اس غیر سرزمین پر بج رہا ہے۔ جس کی علم پرور فضا میں اس نے تعلیم پائی، بیشتر زندگی گزاری، اپنے عقائد کی تبلیغ کی اور جہاں اپنی فراست و دانائی اور نابغیت کا رنگ جما کر ۸۳ سال کی عمر میں ۲۸ جولائی ۱۸۹۸ء کو اس جہاں سے کوچ کر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جرمنی کے تقریباً ہر بڑے شہر میں جن میں ہائیڈل برگ بھی شامل ہے، اس کی یادگاریں قائم ہیں۔

اس نے اپنے وطن میں ابتدائی مطالعہ کرنے کے بعد قانون و سیاست کی اعلیٰ تعلیم کے لیے برلن کو مقرر کیا اور فارغ التحصیل ہو کر پوٹسڈم کی عدالتی دنیا میں داخل ہو گیا اس نے اپنے ذہنی افق کو وسیع کرنے کے لیے انگلستان فرانس اور یورپ کے کئی اور ملکوں کا مطالعی سفر بھی کیا لیکن اس کے رجحانات میں سب سے بڑا انقلاب اس وقت رونما ہوا جب کہ اس نے بیک وقت ہیگل، اسٹراس اور فیور باخ کی فلسفیانہ تعلیمات کا عمیق مطالعہ کیا جو آپس میں اس درجہ متضاد تھیں کہ ایک عرصے کے لیے ایک ذہنی خلجان میں مبتلا کر گئیں اور اس سے نجات اس وقت ملی جب کہ اس نے اپنی زندگی کا ایک بالکل نیا فلسفہ مرتب کر لیا

اس وقت کی عام فضا میں دہریت کو فروغ حاصل تھا۔ خود اس کی ماں بھی عیسائیت کے اصولوں کے خلاف تھی لیکن وہ خود ایک پکّا مذہبی انسان بن گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے بغیر اندرونی دلجمعی اور آسودگی اور ازلی حقیقت کی تحصیل ممکن نہیں ہو سکتی۔ دراصل بسمارک کے خیالات نے یکایک پلٹا اس لیے کھایا کہ اس کے دوست تھاڈن کی بیٹی جو ایک دوسرے دوست بلانکن برگ کی شریکِ حیات تھی اور خود اس کے دل و دماغ پر بری طرح چھائی ہوئی تھی اچانک فوت ہو گئی اور صبر و قرار کے علاوہ اس کے پرانے عقیدے بھی اپنے ساتھ لے گئی اور یہ کیفیت تیس سال کی عمر تک طاری رہی اس دوران میں اس نے اپنے مطالعہ کو وسیع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

۱۸۴۷ء میں اس نے یوحنا پٹکامر نامی ایک خاتون سے شادی کر لی اور اس کے علاوہ عملی سیاسی زندگی میں بھی قدم رکھا کیونکہ جب اسی سال برلن میں پہلی عام پارلیمانی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا تو اس نے اپنے علاقے کے نمائندے کی طرف سے جو علیل تھا، اس میں شرکت کی اور ایوان میں ایسی تقریریں کیں کہ نہ صرف ملک بلکہ اس وقت کی ساری مغربی دنیا میں اس کی فضیلت کی دھاک بیٹھ گئی اور شاہِ وقت فریڈرک ولیم چہارم تک نے اس کا قرب حاصل کر لینا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھا اور جرمن پارلیمان میں پرشیا کی نمائندگی کرنے کے لیے سرکاری طور پر نامزد کر دیا، جس کے اجلاس ان دنوں فرینکفرٹ میں ہوتے تھے بسمارک اگرچہ اصولی طور پر پارلیمانی طرزِ حکومت کے خلاف تھا لیکن اس کے سوا کوئی اور چارہ کار بھی نظر نہ آتا تھا۔ تاہم آئین پر سختی سے عمل کرنے اور اخبارات کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کے لیے اس نے بادشاہ تک کو مجبور کر دیا اور اس کا یہ اقدام اس کی مزید شہرت کا باعث ہوا۔ اسی زمانے میں اس نے اپنی قدامت پسند جماعت کی تشکیل کی جو بہت جلد سارے ملک کی واحد سب سے بڑی سیاسی جماعت تسلیم کی جانے لگی۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ شاہِ فریڈرک چہارم کی صحت بگڑنے لگی اور ۱۸۵۸ء میں وہ حکومت کی ذمہ داریاں اپنے بھائی ولیم کے سپرد کر کے خود علیحدہ ہو گیا۔

نئے فرمانروا کے خیالات مختلف تھے۔ وہ اپنے سامنے کسی اور کا ذرا بھی اقتدار گوارا نہ کر سکتا تھا چنانچہ اس نے عوام میں بسمارک کی قدر و منزلت کو پسند نہ کیا اور اسے راستے سے ہٹانے کے لیے روس کا سفیر بنا کر پیٹرزبرگ بھیج دیا۔ شروع میں بسمارک نے خود بھی اس تقرری کو اپنے لیے جلاوطنی کے مترادف سمجھا تھا لیکن بہت جلد اسے ایک نعمت تسلیم کر لیا، کیونکہ اس وقت کی صحیح عالمی سیاست یورپ و ایشیا کے اسی ملک میں اپنا گہرا رنگ جمائے ہوئے تھی اور وہاں جائے بغیر اس کی قدروں کو سمجھنا مشکل تھا۔

بسمارک کے چلے جانے کے بعد پارلیمان سے بادشاہ کا تنازعہ نازک صورت اختیار کر گیا اور ایک ایسا وقت بھی آیا کہ بادشاہ اپنے بیٹے کے حق میں تخت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہر چند وزیر جنگ نے مشورہ دیا کہ اس موقعہ پر بسمارک کام آ سکتا ہے اسے روس سے بلا لیا جائے لیکن ضدی طبیعت کے بادشاہ نے اس تجویز کو قبول نہ کیا اور ۱۸۶۲ء میں بسمارک کو روس سے فرانس بھیج دیا۔ پیرس کی سیاسی فضا بسمارک کے لیے اور بھی ساز گار ثابت ہوئی

اسے انقلاب فرانس کے اسباب و نتائج کو قریب سے سمجھنے اور نپولین سوم کی معیت میں رہنے کا موقع مل گیا۔

یہ مدّت زیادہ طویل نہیں ہوئی۔ اسی سال ستمبر میں وزیر جنگ نے بادشاہ کو راضی کر لیا اور بسمارک پارلیمان کا صدر نامزد کر دیا گیا۔

متحدہ وفاقِ جرمنی میں جو ریاستیں اور ملک شامل تھے، وہ آئین کے مطابق اندرونی معاملات میں پوری طرح خود مختار بلکہ مطلق العنان تھے حتیٰ کہ آسٹریا جیسے علاقوں کے علیحدہ بادشاہ بھی مقرر تھے۔ اور خود جرمنی کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے شہزادے کبھی کبھی دم خم دکھانے لگتے تھے چنانچہ ان سب سے ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔

بسمارک کے منصبِ صدارت قبول کرنے کے ایک سال کے بعد ڈنمارک کے بادشاہ کا اچانک انتقال ہو گیا اور اس کی موت نے چند پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے، کیونکہ اس کی کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی جو صاحبِ تاج و تخت ہوتی۔ ڈنمارک کے کچھ جلاوطن لیکن باحیثیت افراد جرمنی کے ایک علاقے میں آباد تھے۔ انھوں نے روایتی حقِ وراثت کی بنیاد پر اپنے آپ کو حکومت کا اہل اور وارث ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس طرح ڈنمارک کے ساتھ جرمنی کی ایک قسم کی چشمک شروع ہو گئی اور انجام کار اس نے لڑائی کی صورت اختیار کر لی۔

ڈنمارک کا ساتھ دینے والے بھی کچھ کمزور نہیں تھے لیکن اس موقع پر بسمارک کی حکمتِ عملی نے جرمنی کی سب ریاستوں کو متحد و مربوط رکھا حتیٰ کہ آسٹریا بھی جو ہمیشہ آنکھیں دکھاتا رہتا تھا، اس وقت ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔ ڈنمارک کو شکست ہو گئی اور جرمنی کی اس فتح نے بسمارک کے نام کو لافانی عروج دے دیا۔ اس جنگ کے نتیجے کے طور پر ڈنمارک کا کچھ علاقہ جس پر اس کا ناجائز تصرف تھا، جرمنی کے پاس آ گیا لیکن آسٹریا نے اس پر اپنا حق جتایا اور اس طرح ایک نیا دشوار مسئلہ کھڑا ہو گیا، کیونکہ آسٹریا کی دیکھا دیکھی پرشیا بھی آنکھیں دکھانے لگا تھا اور خطرہ تھا کہ ان دونوں میں جنگ نہ چھڑ جائے۔

یہاں بھی بسمارک کی حکمتِ عملی کام آئی۔ ڈنمارک سے لیے ہوئے علاقے کے دو ٹکڑے جو یقیناً جداگانہ حیثیت رکھتے تھے، آسٹریا اور پرشیا کی نذر کر دیئے گئے اور اس طرح آپس میں صلح ہو گئی۔ بادشاہ جرمنی نے اس کامیابی پر بسمارک کو نواب کا منصب عطا کر دیا۔ تاہم وہ خود پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جس قضیے پر آسٹریا اور پرشیا کے درمیان معاہدہ کرا دیا

گیا ہے، وہ طفل تسلی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اور کبھی نہ کبھی دودھ کے ابال کی طرح ایک بار پھر اپنا رنگ دکھائے گا۔

اس تمام تنازعہ میں نپولین سوم نے بھی ایک حد تک اعانت کی تھی۔ صلح ہو جانے کے بعد اس نے فرانس کے محنتانے کا حق جتایا اور مطالبہ کیا کہ دریائے رہائن کے بائیں کنارے کے کچھ علاقے میرے حوالے کر دیے جائیں۔ بسمارک کے لیے یہ صورت کسی عنوان بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔ اس طرح وفاقی حکومت کا شیرازہ بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔ اگرچہ بسمارک کا انکار فرانس سے لڑائی کا پیش خیمہ بن سکتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اگر ایسی صورت پیدا ہوئی تو وہ ایک غیر ملکی طاقت کے خلاف متحد ہونے کی جب اپیل کریگا تو جرمنی کی خود مختار ریاستیں اور علاقے جو وفاق میں شامل ہیں، ایک صف میں کھڑے ہو کر مقابلہ کریں گے اور انجام کار جیت اپنی ہوگی۔ یہ اعتماد اتنا وزنی تھا کہ اس کی حقیقت کو محسوس کر کے فرانس نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا اور آنے والی بلا وقت سے پہلے ٹل گئی۔

فرانس کی طرف سے غیر متوقع خطرے کی گھنٹی بسمارک کو خاص طور پر اور وفاق جرمنی کے باشندوں کو عام طور پر ایک لمحۂ فکر دے گئی اور سب نے تصویر کے اس دوسرے رخ پر غور کیا کہ اگر کوئی بھی حملہ کسی طرف سے ہو گیا تو ملک میں اعلیٰ مرکزی نظام کا فقدان سب کے لیے نقصان کا باعث ہوگا۔ اس اہم مسئلے پر غور کرنے کے لیے ۱۸۷۰ء میں ایک اعلیٰ کانفرنس طلب کی گئی لیکن اس کے انعقاد سے قبل فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ تاکہ اصل مقصد پورا نہ ہو سکے۔ تاہم اس کی اس غلطی ہی نے بسمارک کا دلی منشا پورا کر دیا۔ اسے اپنے اس دعوے کی دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے ذرا سے اشارے پر سب نے تائید کی کہ قومی دفاع کے لیے ایک اعلیٰ مرکزی نظام ضروری ہے۔

مجھے ذاتی طور پر ان مورخین کی رائے سے اتفاق نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ ۱۸۷۰ء میں جرمنی اور فرانس کے مابین لڑائی کی ذمہ داری صرف بسمارک کے سر ڈالی جا سکتی ہے۔ اگر حقیقتاً اس کا منشا نبرد آزمائی ہوتا تو وہ تین سال پہلے لکسمبرگ کے فسادات کے سلسلے میں اعلانِ جنگ کر دیتا۔ اس کے برعکس اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ میں حتی الامکان لڑائی کی فضا کو دور رکھنا چاہتا ہوں۔

بسمارک کے خلاف یہ دلیل بھی قابلِ غور نہیں ہو سکتی کہ اس نے زبردست جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ در اصل یہ اس کا سیاسی ادراک تھا کہ بادل کی گرج اور بجلی کی

چمک سے آنے والی بارش کا اندازہ لگا لینے والوں کی طرح اس نے بھی جملہ حالات پر نظر رکھ کر اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ لڑائی ناگزیر ہوتی جا رہی ہے اور اس صورت میں دفاعی تیاریاں لابدیقیں۔ ورنہ لڑائی سے دُور رہنے کے لیے بسمارک نے اپنا دامن اس وقت بھی بچایا تھا جبکہ اہلِ اسپین نے ملکہ ازابیلا کو معزول کرنے کے بعد اپنے ملک کا تخت وتاج ایک جرمن شہزادے کو پیش کر دینا چاہا تھا۔ بسمارک نے اس پیش کش کو محض اس لیے قبول نہیں کیا تھا کہ جرمنی اور اسپین کا یہ تعلق فرانس کو ناراض کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔

بسمارک کے تدبر سے جرمنی کی یہ فتح اقتدار پسندوں کی چشم بصیرت کھول دینے کے لائق تھی۔ بویریا اور ورٹم برگ جیسی ریاستوں نے اپنی بنیاد کو زیادہ استوار رکھنے اور اپنی حمایت کا یقین دلانے کے لیے تجویز پیش کی کہ شاہِ جرمنی سابقہ روایات کے مطابق شہنشاہِ جرمنی کہلائیں اور آئندہ کے لیے سب ریاستوں سے حلف وفاداری نئے سرے سے پھر اٹھوائیں۔

اس تجویز پر عمل کرنے سے گویا ایک وسیع تر جرمن سلطنت کی بنیاد پڑ گئی اور اسی لئے جب چند ہفتے بعد فرانس کے ساتھ شرائطِ صلح طے کرنے کے لیے ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد ہوئی تو بسمارک نے مطالبہ کیا کہ تاوانِ جنگ کے طور پر پانچ ارب فرانک ادا کرنے کے علاوہ فرانس ایلس اور لورین سے بھی دست بردار ہو جائے جنہیں اس نے خواہ مخواہ ہتھیا رکھا تھا۔ بہت کچھ ردو قدح کے بعد انجام کار ان ضلعوں پر بھی جرمنی کا دوبارہ تسلط ہو گیا۔ اس موقع پر شہنشاہ جرمنی نے بسمارک کی اعلیٰ خدمات کو خوب سراہا اور بطورِ اعزاز شاہی درجہ دے کر شہزادوں کی صف میں شامل کر لیا۔

فرانس کی شکست کے بعد جرمنی بہت سے پڑوسی ملکوں کی نگاہ میں کھٹکنے لگا تھا، جس کا احساس بسمارک کو بھی تھا، لیکن اس کی صلح پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ فوراً دوستی کا ہاتھ سب کی طرف بڑھائے اور کسی کو اپنے خلاف مواد جمع کرنے نہ دے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے روس کے ساتھ اتحاد و تعاون کی تحریک پیش کی جو باہمی مذاکرات کے بعد کامیاب ہی بسمارک نے اپنی خارجہ پالیسی کا اعلان کیا اور ملک کے لیے بنیادی دستور العمل بھی مرتب کرا دیا جو عوام کے لیے اطمینان بخش تھا۔

خارجہ پالیسی کے ساتھ ساتھ داخلی معاملات کو سدھارنے کے لیے بھی بسمارک نے موثر قدم اٹھایا۔ اس نے ملک کی تاریخ میں پہلی بار اخبارات کو پوری آزادی دینے کے علاوہ تجارت و

صنعت کے میدان میں ایسی مراعات دیں کہ حکومت کو عوام کا اعتماد ہر لحاظ سے حاصل ہو گیا۔ معاشرتی معیار کو بلند کرنے کا سوال بھی عرصۂ دراز سے بسمارک کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا، خصوصاً جب سے جرمنی نے صنعتی میدان میں تیزی سے قدم بڑھانا شروع کیا تھا اور اس طرح کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد بڑھ گئی تھی، وہ برابر محسوس کرتا رہا تھا کہ ان کے جائز حقوق کی حفاظت کی جائے۔ انسان دوستی کے نقطۂ نظر کے علاوہ یہ بھی جانتا تھا، کہ مزدور نہ صرف معاشرتی بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوتے ہیں اور اگر ان کا صحیح طور پر خیال نہ رکھا جائے تو قومی نظام کسی وقت بھی بگڑ سکتا ہے۔ اس ضمن میں اس نے جو بھی قدم اٹھایا وہ ملکی استحکام کے علاوہ خود اس کی مزید شہرت اور قدر و منزلت کا باعث ہوا۔ البتہ امرائے ملک کی نگاہ میں وہ ہمیشہ خار بن کر کھٹکتا رہا اور اس کا کوئی علاج اس کے پاس نہیں تھا اور جو علاج ممکن ہو سکتا تھا، وہ اسے گوارا نہیں تھا۔

شہنشاہ ولیم اوّل صاحب تخت و تاج ہوتے ہوئے بھی اور اکثر معاملات میں اختلاف رائے رکھنے کے باوجود بسمارک کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا تھا کیونکہ اپنے دیرینہ تجربات کی بنیاد پر اسے موصوف کی صائب رائے اور نیک نیتی کا پورا احساس تھا۔ لیکن ۱۸۸۸ء میں جب شہنشاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا ولیم دوم کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا تو بہت جلد بسمارک نے محسوس کر لیا کہ اب آپس میں مفاہمت مشکل ہے۔ کیونکہ نوجوان بادشاہ مزاج کا تیز ہونے کے علاوہ خود آرا بھی تھا اور اس کی دانست میں یہ ممکن نہیں تھا کہ فرمانروا کسی بھی معاملے میں کسی رکن سلطنت سے تبادلۂ خیالات کرے اور اکثر صورتوں میں اس کی رائے کو مقدم سمجھے۔ وہ اپنے ہر فرمان کو اٹل اور امنٹ بنانا چاہتا تھا اور یہ بسمارک کی طبیعت و فطرت کے خلاف تھا۔

نتیجہ ظاہر ہے۔ ایک سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اختلاف رائے نے نازک صورت اختیار کر لی۔ عمائدین ملک نے جو پہلے سے خار کھائے بیٹھے تھے، شہنشاہ کا ساتھ دیا اور بسمارک کی کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی اور ہر طرف سے ایسے جال بچھائے گئے کہ خود بسمارک نے کنارہ کشی کر لینی گوارا کی۔ اس نے بالکل مجبور ہو کر ۱۸۹۰ء کے شروع میں اپنا استعفیٰ پیش کیا جو شہنشاہ نے فوراً منظور کر لیا۔ اس کا دلی منشا یہی تھا تاہم عوام کو خاموش رکھنے اور غلط فہمی

میں ڈالنے کے لیے بسمارک کی دیرینہ اور پُرخلوص خدمات کو سراہا گیا اور شاہی فرمان کے ذریعہ اسے ایک ریاست کا نواب بھی بنا دیا گیا۔ لیکن یہ نقاب اتنے دبیز نہیں تھے کہ چہروں سے ظاہر ہونے والے جذبات کی پردہ پوشی کر سکتے کیونکہ اس زمانے کے عوام عہد حاضر کے عوام سے بہت مختلف تھے۔ وہ انسانیت کا خون ہوتے دیکھ کر غم و غصہ سے کھولتے لیکن علم بغاوت بلند کرنے سے قاصر تھے۔

حکومت سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی بسمارک ہیمبرگ کے قریب فریڈرکس روہے کے مقام پر بالکل پرانی وضع کے اپنے مکان میں آیا وہو گیا اور مرتے دم تک ہیں رہا لیکن اس دوران میں وہ سرکاری حکمتِ عملی پر، دوستوں کی نجی محفل میں اور اخبارات کے ذریعہ بھی برابر تنقید کرتا رہا۔ اسے حکومت کی طرف سے احتساب کا ذرا بھی خوف نہیں تھا اور اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت حکومت میں تھیں تھی۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ایوانِ حکومت سے راندۂ درگاہ ہو جانے کے باوجود عوام کے دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے۔

لیکن بادشاہ کی خباثت پھر بھی کسی نہ کسی طرح اپنی جھلک دکھاتی رہتی تھی۔ اس ضمن میں ایک واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جس پر اخبارات میں بڑی لے دے ہوئی تھی۔ ہوا یہ کہ جون ۱۸۹۲ء میں بسمارک کو اپنے لڑکے کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے ویانا جانا پڑا۔ شہنشاہ نے اسے ذلیل کرنے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور آسٹریا میں متعین جرمن سفیر کو پوشیدہ طور پر ہدایت کرا دی کہ بوڑھے کھوسٹ بسمارک کی آمد پر اس کا ذرا بھی خیر مقدم نہ کیا جائے اور سرکاری حلقوں میں اس سے یکسر بے اعتنائی برتی جائے۔ تاہم عوام کی طرف سے اس کا استقبال اس شان و شوکت سے ہوا کہ سفیر کی ظاہری بے اعتنائی کو بسمارک کے علاوہ بہت کم لوگ محسوس کر سکے۔

کچھ عرصے بعد بسمارک شدید علیل ہوا تو شہنشاہ نے نظرِ عنایت مبذول کرتے ہوئے مصالحت کر لینی چاہی لیکن بسمارک نے رسمی شکریہ کے ساتھ ہر پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب ۲۸ جولائی ۱۸۹۸ء کو ۸۳ سال کی عمر میں فوت ہوا تو اس نے سابق شہنشاہ کے ساتھ اپنی وفاداری اور موجودہ کے ساتھ ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے وصیت کی کہ میری قبر پر یہ کتبہ کندہ کرایا جائے:۔

”یہاں ایک سچا جرمن دفن ہے جو شہنشاہ ولیم اوّل کا مخلص خادم تھا۔“

اُسے اس دنیا سے کوچ کیے ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے تاہم عوام میں اس کی قدرومنزلت کی کیفیت ہنوز برقرار ہے۔ ہر بڑے شہر میں اس کی یادگاریں قائم ہیں اور اس کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

بسمارک کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ایک مینار دریائے ہکر کے شمالی ساحل سے کچھ فاصلے پر بھی قائم ہے۔ اگر موقع ملا تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔

ہوپٹ اسٹراس پر چلتے ہوئے ہم کئی گرجا گھروں کے پاس سے گزرے جو سب کے سب گوتھک طرز پر بنے ہوئے ہیں اور خاصے پرانے ہیں۔ یعنی پندرہویں اور سولہویں صدی کی یادگار ہیں، کیونکہ یہ طرزِ تعمیر اس زمانے میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔

**گوتھک طرزِ تعمیر** میں ماہرِ فنِ تعمیرات تو نہیں ہوں اور نہ اس فن کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ رومی اور بازنطینی طرزِ تعمیر سے جب لوگ کسی قدر اکتا گئے اور سادگی کے دلدادہ ہوئے تو عمارتوں اور خاص طور پر عبادت گاہوں کی تعمیر میں ایک ایسا انداز اختیار کرنا چاہا جس میں زیادہ تصنع نہ ہو لیکن اس کے جاذبِ نظر ہونے میں فرق نہ آئے۔

اس طرز کی زیادہ ترقی بارہویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی اور جس طرح بعض مصوّر اپنے نقوش میں صرف سیدھے خطوط کے ذریعہ فن کاری کے جوہر دکھاتے ہیں، اسی طرح گوتھک طرزِ تعمیر میں دیواروں کی سطح کو بالکل سپاٹ رکھنے اور ان پر نقش و نگار بنانے کے بجائے اسی اعتبار سے ابھرے ہوئے کنارے پیدا کیے جانے لگے جنہیں ایک اعتبار سے مخروطی ستون بھی کہا جا سکتا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر سمندر کی ایسی لہروں کو جو افقی کے بجائے عمودی حالت میں ابھری ہوں، سنگین اعضا کی صورت میں ڈھال کر منجمد کر دیا جائے۔ کہیں یہ ابھار اتنا مختصر ہوتا ہے کہ ماتھے پر نظر آنے والی شکنوں یا بستر پر پڑنے والی سلوٹوں سے آگے نہیں بڑھتا اور کہیں اتنا نمایاں جو کسی سلسلۂ کوہ کی چوٹیوں کو دور سے دیکھنے کے وقت محسوس ہوتا ہے۔ پھر اسی لحاظ سے دروازوں اور کھڑکیوں کی محرابیں قوسی انداز کے بجائے نوکیلی بنائی جانے لگیں۔ سوائے اٹلی کے یہ رنگ سارے یورپ پر چھا گیا اور جرمنی میں سب سے زیادہ فروغ پاتا رہا۔

تاریخ میں گوتھک طرزِ تعمیر اس فنِ تعمیر کو کہا جاتا ہے جو گوتھ قوم نے پہلے پہل چوتھی صدی عیسوی میں اختیار کیا تھا، لیکن اسے فروغ کئی سو سال بعد نصیب ہوا۔ گوتھ قوم

کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قدیم جرمن زبان بولنے والی ایک قوم دریائے ایلب اور دریائے دیچولا کے درمیان آباد تھی جو رفتہ رفتہ یورپ کی کئی پرانی ریاستوں میں پھیل گئی مغربی علاقوں میں رہنے والے وشی گوتھ اور مشرقی علاقوں میں رہنے والے اوسٹر گوتھ کہلانے لگے۔ لیکن اس قوم کے افراد کو ،،گوتھ،، کیوں کہا جاتا تھا، اس کی وجہ تسمیہ کہیں بھی واضح نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس طرز تعمیر کے لیے جو اصطلاحی لفظ ،،گوتھک،، وضع کیا گیا، وہ شاید جرمن زبان کے لفظ گوتھا سے مشتق ہے گوتھا جرمنی کے ایک علاقے تھورنگیا میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس نے شارلیمین کے عہد میں ترقی کر کے ایک بڑے شہر کی حیثیت حاصل کر لی۔ ۱۹۳۰ء میں اس کے گرد جو فصیل بنائی گئی وہ تمام شہر پناہوں سے مختلف انداز میں تھی۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پتھر کی بنی ہوئی عمودی پسلیوں کو لہروں کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔

اس ضمن میں ایک اور دلچسپ بات بھی ذہن میں آ گئی جرمنی کے قدیم نوشتوں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ گوتھا اور گوٹا جرمنی میں بہت سے دیہات کے ناموں کا جزو رہا ہے اور اب بھی ہے۔ اور برِ صغیر پاک وہند کی بعض زبانوں میں بھی گاؤں کے لیے جو گوٹھ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کہیں اصل میں ایک ہی مادے سے تو نہیں بنا ہے۔ کیونکہ یہ تو حقیقت ہے کہ جرمنی کے اصل باشندے اور قدیم ہندوستان کے آریہ ایک ہی نسل سے تھے البتہ اور ان کے رسم ورواج، زبان وبیان اور عادات واطوار تک یکساں تھے۔

اگر دن کا وقت ہوتا اور فرصت کے چند لمحات میسر آتے تو ہم کسی ایک گرجا میں جا کر قریب سے اس کا دیدار ضرور کرتے لیکن مجبوری یہاں بھی دامن گیر رہی اور ہم اس شوق کو کسی آئندہ موقع پر پورا کرنے کا فیصلہ دل میں کر کے آگے بڑھ گئے۔

اب راستے میں کہیں اور رکنا مناسب نہیں سمجھا اور قدم بڑھا کر سیدھے اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ چونکہ تاریکی تو پوری طرح غالب آ گئی تھی اور ہم نائٹ کلبوں کے شوقین نہیں تھے، اس لیے وقت اور مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ اب آرام کریں کئی گھنٹے کے سفر اور پیدل چلنے کے باعث تھک سے گئے تھے اور دوسرے روز کے لیے تازہ دم ہونا ضروری تھا۔ کچھ بھوک بھی لگ رہی تھی جو تقاضائے فطرت ہے۔

**کھانے کی میز پر** ۔ اس ہوٹل رٹز کا قاعدہ یہ ہے کہ صرف علالت کی صورت میں کھانا

علیحدہ سکونتی کمرے میں دیا جا سکتا ہے ورنہ بلا استثنٰے ہر شخص کو کمرۂ طعام میں آ کر ایک وقت میں سب کے ساتھ کھانا کھانا پڑتا ہے۔ رات کے کھانے کے لیے مقررہ وقت کافی طویل ہے، یعنی آٹھ سے دس بجے تک کبھی بھی کمرۂ طعام میں چلے جائیے، کھانا تیار ملے گا۔ چنانچہ اس قاعدے کے مطابق ہمیں بھی اپنے کمرے سے وہیں جانا پڑا۔ درمیانی حصّے میں بڑی میزوں کے علاوہ چار چار کرسیوں کے ساتھ چند چھوٹی میزیں بھی اطراف میں لگی ہوئی تھیں۔ جو لوگ بالکل تنہا جاتے، وہ درمیانی میز پر کہیں بھی بیٹھ جاتے تھے۔ ہم نے سارے ہال میں ایک نظر ڈالی اور ایک کونے میں چلے گئے جہاں عام لوگوں کی نگاہ ذرا مشکل ہی سے پہنچ سکتی تھی۔

ہمارے بیٹھتے ہی ایک ملازم نے کھانوں کی فہرست ایک چھوٹی سی کشتی میں ہمارے سامنے پیش کر دی۔ ہم نے محبوب بھائی کو اشارہ کیا کہ وہ اسے دیکھ کر انتخاب کریں اور فرمائش کر دیں۔ محبوب نے فہرست پر زیادہ توجہ دیئے بغیر ہم سے کہا۔

"سب سے پہلے آپ کو یہ بتادوں کہ یورپ کے اور ملکوں کے برعکس یہاں تقریباً ہر چیز سور کی چربی میں پکائی، تلی اور بھونی جاتی ہے۔ مکھن کا رواج بہت ہی کم ہے بلکہ نہیں کے برابر ہے۔ بعض تیل استعمال ہوتے ہیں لیکن اس ہوٹل میں ان کا امکان بھی کم ہے۔ لہٰذا ہم جیسے لوگوں کو بہت احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ میں جب سے جرمنی آیا ہوں، میں نے محض چند بار ہوٹل میں کھانا کھایا ہے اور وہ بھی ایسی چیزوں پر مشتمل جن کی تیاری میں چکنائی استعمال نہیں ہوتی۔ چربی کے علاوہ سور کا گوشت بھی اس قدر عام ہے کہ اگر آپ سموسوں کی وضع کی ایک تلی ہوئی چیز پسند کریں تو ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی بھیڑ یا بکرے کے بجائے سور ہی کے گوشت کا قیمہ بھرا ہوا ہو۔ آپ سوئزرلینڈ آسٹریا اور یوگوسلاویہ ہو آئے ہیں۔ ان ملکوں میں تو بھیڑ کا رواج عام ہے لیکن جرمنی میں سور نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اب بتائیے کہ اشیائے خوراک کا انتخاب کس زاویۂ نظر سے کیا جائے؟"

کچھ دیر کے لیے ہم دونوں بھائیوں پر خاموشی اس طرح مسلط ہوئی کہ محبوب کے سوال کا جواب دینا مشکل ہو گیا۔ آخر بھائی جان محترم نے اس طلسم سکوت کو توڑا اور کہا "بھئی! ہم سے پوچھا گیا۔ اپنے عقیدے کی روشنی اور تجربے کی بنیاد پر جو چاہو، منگا لو۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو تم جائز سمجھو گے، اسی کی فرمائش کرو گے۔"

میں نے لقمہ دیا "جرمن زبان کی بعض کہانیوں میں پڑھا ہے کہ یہاں کے لوگ

ہے کہ کڑوا ہی ہوتا ہوگا۔ تاہم جو عادی ہو جاتے ہیں، وہ کڑوی کسیلی یا میٹھی سلونی چیز کا فرق و امتیاز خاطر میں نہیں لاتے۔ انہیں تو "یک گونہ بے خودی" دن رات چاہیئے ہوتی ہے۔

درٹم برگ کے بادہ فروش بہت ہی زندہ دل معلوم ہوتے ہیں جس طرح ترکی میں بعض مٹھائیوں کے نام "عورت کی ران" یا "نافِ معشوق" رکھے گئے ہیں[1]۔ اسی طرح یہاں شرابوں کے بعض نام بڑے دلچسپ ہیں۔ مثلاً "لام لر" جس کے لفظی معنی ہوئے "ننھا میمنا" یا بھیڑ کا بچہ۔ خدا جانے یہ نام کیوں رکھا گیا ہے۔ شراب پینے والے عموماً آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور ایسی بے تکی حرکتیں کرتے ہیں جو بھیڑ کی شان کے خلاف ہوتی ہیں۔ بھیڑ تو معصوم جانور ہے۔ نہ جانے اسے اس کیچڑ میں کیوں رگیدا گیا ہے۔ میری رائے قبول کی جائے تو میں اس شراب کا نام بدل کر ایسا نام رکھوں جس کا مفہوم "مرکھنا بیل"، "لڑاکا بھینسا" یا اس سے ملتا جلتا ہو۔

ایک اور شراب "سورگن بریچر" کہلاتی ہے۔ یہ لفظ قدرے شاعرانہ ہے۔ اس کے لفظی معنے ہیں "اندوہ ربا"۔ مے کے ساتھ غالب کی غرض بھی نشاط سے وابستہ نہیں تھی لیکن اس کے باوجود "مے و نغمہ کو اندوہ ربا" کہنے والے ان کے نزدیک "اگلے وقتوں کے لوگ" تھے۔ تاہم اگر مرزا صاحب کبھی بھولے سے بھی جرمنی آجاتے تو انھیں حسرت بھرے انداز میں یہ شعر نہ کہنا پڑتا ؎

صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

کیونکہ اس وادی میں ان کی تواضع زیادہ تر فشردۂ انگور ہی سے کی جاتی اور وہ کسی دوسری شراب کو منھ لگانے کے لیے مجبور نہ ہوتے۔

یہ لیجیے۔ شراب کا محض ذکر کرتے کرتے میں نہ جانے کہاں سے کہاں بہک گیا اور اگر ملازم ہمارے "دستر خوان" کی خاص چیزیں تیار کرا کے نہ لے آتا تو نہ معلوم کتنی دیر انہی خیالات میں محو رہتا۔

سب چیزیں میز پر چن دی گئیں، تب بھی ہم دونوں بھائیوں کو ذرا تامّل رہا۔ ہم ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھ رہے تھے جس نظر سے حضرتِ آدمؑ نے جنت میں پہلی بار شجرِ ممنوعہ

---

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲۶ یورپ نامہ جلد اول

دلیے کے بہت شوقین ہوتے ہیں لیکن معلوم نہیں کہ اسے بنانے کی ترکیب کیا ہوتی ہے۔ اگر وہ قابلِ قبول ہو تو اس پر طبع آزمائی کی جائے۔ اس کے علاوہ انڈے اُبلوا کر پسی ہوئی کالی مرچیں منگالو۔ یہ نسخہ سیدھا سادا اور "بے ضرر" ہے۔ یہ رات تو کسی طرح گزر جائے۔ کل دن کے لیے کوئی مناسب اِنتظام کیا جائے گا۔ اس وقت بھوکا رہنا بھی مشکل ہے۔"

لیکن محبوب پورے چار سال سے اس ملک میں مقیم تھے۔ اس لیے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اپنے مطلب کی کون کون سی چیزیں ممکن ہو سکتی ہیں۔ انھوں نے فہرست پر نظر ڈالے بغیر ملازم کو آرڈر دیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اسے تعمیلِ حکم میں ذرا تامل ہے لیکن وہ چلا گیا۔

محبوب نے کہا "چند منٹ انتظار کرنا پڑیگا کیونکہ دو ایک چیزیں بطورِ خاص تیار کرائی ہیں۔

سب سے پہلے ملازم تین بوتلیں اور گلاس لیے ہماری میز کے قریب آیا۔ محبوب نے فوراً اشارے سے منع کرتے ہوئے کچھ کہا۔ ملازم چلا گیا اور پھر سوڈا لے آیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں ہر کھانے کے ساتھ لوگ پانی کے بجائے شراب پیتے ہیں۔ ان میں سب سے ہلکی شراب جو کی ہوتی ہے اور صرف وہ جنھیں شراب کسی وجہ سے راس نہیں آتی سوڈے پر اکتفا کرتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ محبوب ساتھ تھے ورنہ ہم بوتل کا پانی سمجھ کر شراب کا ایک گھونٹ تو لے ہی لیتے کیونکہ وہ حافظِ شیراز کے بادۂ سُرخ کے برعکس بالکل سفید تھی (بالکل روسی ووڈکا کی طرح) اور قدرتی طور پر پانی کا دھوکا اس وقت تک ہو سکتا تھا جب تک کہ اسے ہونٹوں سے لگا کر کم سے کم ایک گھونٹ نہ لے لیا جائے۔ یہاں اپنی ناتجربہ کاری ایمان کو لرزا کر رکھ دیتی۔

کھانے کے ساتھ شراب کا دستور صرف جرمنی ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ تمام مغربی دنیا میں عام ہے اور مشرقی دنیا کے مغرب زدہ ملکوں میں بھی فروغ پا گیا ہے۔ جرمنی میں منجملہ اور علاقوں کے دریائے رھائن کی وادی خصوصاً اس کا مغربی ساحل انگور کی کاشت کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے اور اسی لیے یہاں کی انگوری شراب بھی سارے یورپ میں پسند کی جاتی ہے۔ اس کا رنگ پانی کی طرح سفید ہوتا ہے۔ ذائقہ پینے والے بتا سکتے ہیں لیکن چونکہ سب کو منہ بناتے ہوئے دیکھا ہے، اس لیے قیاس کہتا ہے

کو دیکھا اور سوچا ہوگا کہ اسے چکھا جائے یا نہیں۔

ہیں لکھنؤ والوں کی طرح دل ہی دل میں بھائی جان محترم سے کہہ رہا تھا "بھائی جان پہلے آپ!"، اور شاید وہ بھی باندازِ شفقت فرما رہے تھے "نہیں، پہلے آپ"! آخر پہل خود محبوب نے کی۔

انھوں نے ایک ڈش کی طرف اشارہ کرکے اور اس میں سے اپنا حصہ لیتے ہوئے کہا "یہ مرغ کی سادی یخنی میں بین کی نمکین سویّاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس کی تیاری ہیں کوئی چکنی چیز شامل نہیں ہوتی، اس لیے بلاتردد، اسے کھایا اور پیا جا سکتا ہے۔ اور یہ لیجیے۔ اس پلیٹ میں مچھلی کے تمتلے محض سرکہ لگا کر آگ پر سوختہ کیے گئے ہیں۔ نیم برشت انڈے آپ کی فرمائش کے مطابق ہیں۔ منھ میٹھا کرنے کے لیے کسٹرڈ ہے اور یہ آپ جانتے ہیں کہ کس طرح تیار ہوتا ہے۔"

ہم نے محسوس کیا کہ جب سے ہوٹل کا ملازم ہماری میز سے شراب کی بوتلیں واپس لے کر گیا اور سوڈے کی بوتلیں لایا تھا، دور بیٹھے ہوئے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کام و دہن کی لذت پوری کرنے کے ساتھ کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھتے جاتے تھے۔

اس موقع پر اگر محبوب ہمارے ہمراہ نہ ہوتے تو خدا جانے ہم بھولے ہیں کیا کچھ کھا جاتے۔ کھانا خاصا پُرلطف رہا۔ یا تو اس لیے کہ بھوک لگ رہی تھی یا اس لیے کہ ذائقے کے اعتبار سے بالکل نئی چیزیں تھیں۔ تاہم دیکھنے والوں نے جو رائے قائم کی ہوگی، وہ علیحدہ بات ہے لیکن ہمیں اس کی پرواہ نہیں تھی۔

دوسروں کے مقابلے میں ہم سب آخر میں آئے، کچھ دیر انتظار کیا اور پھر بھی سب سے پہلے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

محبوب نے ہم سے رخصت ہو کر اپنے کمرے کی راہ لی۔

نمازِ عشاء: کھانے سے فارغ ہو کر ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو دونوں بھائیوں نے سب سے پہلے نمازِ عشاء کا فریضہ ادا کیا۔ ہمیں افسوس تھا کہ تین وقت کی نماز قضا ہو چکی تھی۔ ہمیں یہ بات کبھی گوارا نہ ہوئی کہ حالتِ سفر میں جو مراعات دی جاتی ہیں، ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اگر کوئی شخص دل سے عبادتِ الٰہی کا قائل ہو تو وہ وطن سے چالیس کوس تو کیا چالیس ہزار کوس پر بھی اس فریضہ کو ادا کر لینا چاہے گا۔ ہمیں اپنی اس سیاحت کے دوران میں نماز ادا کرتے وقت اس لحاظ سے اور بھی زیادہ لطف آتا تھا کہ ہم اس جگہ سجدہ کر رہے ہیں،

جہاں اغلباً پہلے سے کوئی نقشِ سجدہ موجود نہیں ہے۔ اس ہوٹل رٹر کے اس کمرے میں جو ہمارے لیے مخصوص ہوا تھا، ہم سے پہلے شاید ہی کسی اور مسلمان نے معبودِ حقیقی کی عبادت کی ہو۔

یورپ کی اس سرزمین پر، جو آریائی نسل کے باشندوں کا ملجا و مسکن رہی ہے، اسلام کا سکہ باقاعدہ کبھی نہیں چلا۔ اگرچہ بہت سے جرمن نژاد تبدیلیٔ مذہب کے بعد مسلمان ہوتے رہے ہیں لیکن لڑائی سے پہلے بھی ان کی تعداد بہت قلیل تھی اور اب تو نہیں کے برابر ہے۔ یہی حال یہودیوں کا ہے۔ لڑائی سے کچھ عرصے پہلے ملک کی آبادی میں ان کا تناسب چند فی صد تھا جو لڑائی شروع ہونے سے قبل برائے نام اور لڑائی کے دوران میں تقریباً ختم ہو گیا چنانچہ اب ان کی تعداد مشکل سے چند ہزار ہو گی۔

ان سب کے برعکس جرمنی میں نصرانی مذہب سے عقیدت رکھنے والوں کی اوسط ۹۰ فی صد کے لگ بھگ ہے لیکن ان میں بڑی تعداد پروٹسٹنٹس کی ہے یعنی وہ نصف سے بہت زیادہ ہے۔ اور کیتھولک کل آبادی کے ۴۳ فیصد کے برابر ہیں۔ یہ بات تعجب خیز ضرور ہے کیونکہ جرمنی اور روم میں جو سیاسی، مذہبی اور ثقافتی رشتہ قائم رہا ہے، اس کے پیشِ نظر یہاں کیتھولک عیسائیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہونی چاہیے تھی لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ پروٹسٹنٹ فرقے کی ابتدا اسی ملک سے ہوئی تھی۔ اس فرقے کے بانی مارٹن لوتھر جنہوں نے ملک میں اصلاحات کا دور شروع کیا، اسی ملک کے ایک علاقے ایزل بن کے باشندے تھے۔

**مارٹن لوتھر کی تحریکِ اصلاحات:** یہ کہنا مشکل ہے اور ہمارے لیے غیر ضروری اور نامناسب بھی ہے کہ تحریکِ اصلاحات کس درجہ مفید اور غیر مفید تھی۔ اس مسلک کو ماننے والے جو رائے چاہیں قائم کریں، ہمارے لیے دونوں فرقوں کے مابین فرق و امتیاز قائم کرنا بھی ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ نیز میں نے اس تحریک کا کبھی سرسری مطالعہ کیا تھا، اس لیے زیادہ متاثر بھی نہیں ہو سکا ہوں۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ مارٹن لوتھر پندرہویں صدی کے آخر میں (۱۴۸۳ء) پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک کان کن کے بیٹے تھے پھر بھی انہوں نے اعلیٰ تعلیم پائی جو یقیناً ان کے ذاتی ذوق و شوق کا نتیجہ تھی۔

سولہویں صدی کے شروع میں وہ فارغ التحصیل ہو کر مونک بن گئے اور چند سال

بعد ایک گرجا کے پادری کا درجہ حاصل کر لیا۔ انہیں مذہب اور فلسفہ پر بڑا عبور حاصل تھا۔ وہ بہت جلد نصرانیت کے ایک اعلا مبلغ سمجھے جانے لگے۔ وہ پیدائش اور عقیدے کے لحاظ سے کیتھولک ہی تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر پاپائے رُوم پر ان کا ایمان تھا۔ البتہ وہ پادری بننے کے چند سال بعد روم گئے، جہاں انھوں نے پاپائی نظام کا بالاستیعاب مطالعہ اور مشاہدہ کیا اور یہی وقت سے ان کی طبیعت اس مسلک سے برگشتہ ہو گئی۔

ان کی عقل نے تقصیر و عفو کے عیسائی (کیتھولک) مسلک کو ماننے سے انحراف کیا۔ اس زمانے میں پاپائے روم زیادہ دولت مند نہیں ہوتے تھے بلکہ اس وقت کے پوپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عموماً مقروض رہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے قرضہ چکانے کی خاطر معافی ناموں کی فروخت کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ لوگ پاپائے روم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے اور بخشش کے طلبگار ہوتے تھے۔ بلحاظِ نوعیت ہر گناہ کی معافی کے عوض ایک مقررہ رقم انھیں ادا کرنی پڑتی تھی اور وہ بخشش کا پروانہ حاصل کر کے خوش خوش چلے جاتے تھے۔ ان میں سے اکثر اپنی دولت کے بل پر زیادہ گناہ کرتے تھے اس امید میں کہ پھر کفارہ ادا کر کے نجات پا لیں گے۔

مارٹن لوتھر نے پوپ کے اس استحقاق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، خصوصاً اس اعتبار سے کہ اس کا معاوضہ مقرر کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس ذریعۂ آمدنی کو ناجائز قرار دیا اور کہا کہ گناہ بخشوانے کا طریقہ بجائے خود ایک گناہ کے مترادف ہے۔ نیز چند اور اصولوں کے خلاف جو ان کے نزدیک مذموم تھے، سخت احتجاج کیا۔ اسی لیے ان کو احتجاجی (پروٹسٹنٹ) کہا جانے لگا اور یہی ان کے مسلک کا نام پڑ گیا۔

انہوں نے ۹۰ مقالے شائع کیے جن میں پوپ کے اقتدار یا استحقاق کے کسی نہ کسی ایک پہلو پر اعتراض کرتے ہوئے اس کی تکذیب کی گئی ہے۔ وہ مقالے ان کے پیروؤں کے نزدیک بہت اہم اور مقدس ہیں۔ انہوں نے ان مقالات کی نقول وٹن برگ کے شاہی گرجا کے دروازے پر آویزاں کر دی تھیں۔ ان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ قدیم کلیسائی نظام میں جرم و سزا کا جو اصول شامل رکھا گیا ہے، وہ درست ہے یعنی ہر وہ گنہگار جو بریت چاہتا ہے کچھ نہ کچھ سزا بھگتے اور آئندہ کے لیے تائب ہو جائے۔ یہ نہیں کہ پوپ کو نذرانہ دیکر عفو کا پروانہ حاصل کر لے۔ پھر یہی نہیں کہ عقوبت دوزخ سے خود نجات پانے کے لیے

لوگ روپے خرچ کر دیتے تھے بلکہ وہ نذرانہ پیش کر کے اپنے عزیز و اقارب کی روحوں کو بخشوانے لگے جو گنہگار مرتے تھے اور جن کی روحیں کسی عنوان معافی مل جانے کی توقع میں اطراف میں سرگرداں رہتی تھیں۔

مارٹن لوتھر نے ناقابلِ تردید مثالوں سے یہ ثابت بھی کر دیا کہ اس قسم کے کلیسائی نظام نے بہت سے نت نئے گناہوں کے ارتکاب کے لیے راستے ہموار کر دیے ہیں مثلاً پوپ کے وہی کارندے جو گنہگاروں کو یہ ترغیب دیتے کہ جلد سے جلد فیس ادا کر کے اعترافِ جرم کر کے عفو و درگزر کا پروانہ حاصل کر لو، ایسی صورتیں بھی پیدا کراتے تھے کہ لوگ جرم و خطا سے اپنا دامن بچا نہ سکیں۔

لوتھر نے عام اخلاقی پستی کے خلاف بھی آواز بلند کی اور ثابت کیا کہ یہ اس مذموم کلیسائی نظام کا لازمی نتیجہ ہے۔ انہوں نے انجیل مقدس کو اپنے خیال کے مطابق ایک نئے رنگ میں پیش کیا۔ اس کی آیات کی جو غلط ترجمانیاں کی گئی تھیں ان کا رد پیش کیا اور لوگوں کو دعوت دی کہ وہ ذرا عقل و فہم سے کام لیں اور "مقدس معصیت" کے چکر سے باہر نکلنے کی کوشش کریں۔

یہ تبلیغ ایسی نہیں تھی جو رائیگاں جاتی۔ بہت تیزی کے ساتھ لوگ ان کے پیرو ہو گئے۔ چنانچہ اسی ہائیڈل برگ میں، جہاں اس وقت ہم دونوں بھائی مقیم ہیں! انہوں نے اپریل ۱۵۱۸ء میں ایک جمِ غفیر کے سامنے اپنا منشور تجاویز کے عنوان سے پیش کیا جسے سارے مجمع نے یک زبان ہو کر منظور کر لیا۔

کیتھولک عقیدے کے مطابق کلیسائی نظام کے تمام عہدہ داروں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، شادی کرنے اور عائلی زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مارٹن لوتھر نے اپنے عقیدے کے مطابق اس رواج کی بھی تکذیب کی۔ انہوں نے کہا کہ نفسیاتی اعتبار سے تجرد کی زندگی غیر فطری ہے، اس لیے لامحالہ ہر درجہ کے عہدہ داروں کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے وہ طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں جو کسی طرح بھی مناسب نہیں کہے جا سکتے۔ لہٰذا کیوں نہ تقاضائے فطرت کے مطابق عمل کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اسی لیے ان کے مسلک میں اسقفِ اعظم سے لے کر معمولی پادریوں تک ہر مذہبی علمبردار کو شادی کرنے کی اجازت مل گئی۔ راہبوں اور راہبات کے حلقے بھی توڑ کر ان کو عام انسانوں کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ چونکہ یہ تحریک بھی عقلِ سلیم کے لیے قابلِ قبول تھی، اس لیے ہر طرف سے اس کا خیر مقدم ہوا اور مارٹن لوتھر کے اقتدار کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا۔

اصلاحات میں اور بھی دلچسپ اور مفید نکات شامل تھے جن کو آسانی سے مان لینا ممکن

تھا۔

پوپ کے پاس لوتھر کے مقالات اور دوسری نگارشات کی نقلیں پہنچ چکی تھیں اور ہر نقل و حرکت سے ان کو باخبر رکھا جا رہا تھا۔ شروع میں انہوں نے خاموشی اختیار کر لینی چاہی لیکن جب ایک طوفانِ عظیم کی طرح نت نئی تحریکات فروغ پانے لگیں تو انھیں تشویش ہوئی اور انہوں نے ایک فرمان کے ذریعہ سے مارٹن لوتھر کو کافر و مرتد قرار دے کر حکم دیا کہ وہ سات دن کے اندر اندر حاضرِ دربار ہو کر "اعترافِ گناہ" کریں اور آئندہ "راہِ راست" پر رہنے کا وعدہ کریں تاکہ انھیں معاف کیا جا سکے۔ لوتھر نے اس فرمان کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی اور ایک حرفِ غلط کی طرح نظر انداز کر دیا۔ اس کے برعکس وہ اپنے نظریات کو پھیلانے میں برابر لگے رہے۔

جب پوپ نے اس صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے اقتدار کی شمع کو ٹمٹماتے دیکھا تو شہنشاہِ روم چارلس پنجم سے شکایت کی حالانکہ اس وقت تک ہر پوپ نے اپنے آپ کو شہنشاہ سے بلند و اعلیٰ مرتبت سمجھا اور منوایا تھا اور عوام کے دل و دماغ پر قابض ہونے کے باعث فرمانرواؤں کو اپنے سامنے جھکا لینے کے طریقے اختیار کئے تھے لیکن اس معاملے میں شہنشاہ کی اعانت چاہی اور اپنے خیال کے مطابق اس نئے فتنے کا سر کچلنے کی ترغیب دی۔ بادشاہ نے جو اس نئی تحریک کے غلبے اور اثر و نفوذ سے ناواقف نہیں تھا۔ لوتھر کو حاضرِ دربار ہونے کا حکم تو دیا اور وہ حاضرِ دربار بھی ہو گئے لیکن جب انہوں نے اپنے مسلک سے انحراف گوارا نہ کیا تو اس مطلق العنان فرمانروا نے کوئی مزید قدم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک لحاظ سے یہ اعترافِ عجز نئے مسلک کے ماننے والوں کو اپنے میدانِ عمل میں دوڑ کر آگے بڑھنے کا موقع دے گیا۔

لیکن چونکہ اس مسلک کا اپنا علیحدہ کوئی مذہب نہیں تھا اور نہ کوئی صحیفۂ آسمانی اس مجاہد پر نازل ہوا تھا، اس لیے ۱۵۴۶ء میں لوتھر کے انتقال کے بعد عقائد کے پرچار کی رفتار پر انکس لگنا شروع ہو گیا اور اتنا زیادہ فروغ نہ ہو سکا جو ان کی زندگی میں ممکن ہوا تھا پھر بھی بادِ مخالف کا کوئی جھونکا اسے معدوم تو کیا پژمردہ بھی نہ کر سکا چنانچہ اب بھی چار صدی سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد لوتھر کے لاکھوں کروڑوں پیرو دنیا میں موجود ہیں اور جرمنی میں تو انہیں اکثریت حاصل ہے۔

۰۰۰۰ ایں قصہ پار بینہ را: نماز سے فارغ ہو کر فوراً سو جانے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ بھائی جان محترم حسبِ معمول کل کا پروگرام بنانے کے لیے اطلاعاتی لٹریچر سنبھال کر بیٹھ گئے اور میں نے سوچا کہ یوجین ڈیوڈسن یا اوٹو ڈائٹریخ کی کتاب کا مطالعہ کیا جائے جو میں نے دورانِ سفر میں ہائیڈل برگ پہنچنے سے پہلے خریدی تھیں لیکن میری نظر کتابوں کے شیلف پر پڑی جو یہاں ہوٹل کے ہر کمرے میں مستقلاً رکھا جاتا ہے تاکہ مسافر اپنے ذوق کے مطابق مطالعہ کرنا چاہیں تو انہیں آسانی ہو۔ شیلف میں ایک چھوٹی سی کتاب انگریزی زبان میں بھی رکھی تھی جس میں ارضِ رھائن کے قدیم روایتی قصے شامل اوراق کئے گئے تھے۔

اس میں سب سے پہلا قصہ سیگفریڈ سے متعلق تھا (جرمن زبان میں اس کا تلفظ زیک فریٹ ہے) دوسری جنگِ عظیم کے دَوران ہی سیگفریڈ لائن کا بہت چرچا ہوا تھا۔ یہ ایک بہت ہی مضبوط اور طویل و عریض دیوار تھی جو اہلِ جرمنی نے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہٹلر نے ۱۹۳۶ء میں اپنے ملک کو مغربی سمت کے حملہ آوروں سے بچانے کے لیے فرانس کی میثر ینو لائن کے انداز پر تعمیر کی تھی اور اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ وہ بھاری ٹینکوں سے بھی نہ ٹوٹ سکے لیکن دوسری جنگِ عظیم کے دَوران میں ٹینکوں سے زیادہ ہوائی جہازوں کے حملے ہوئے، اس لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ اتنی لمبی لہکاری اور مضبوط دیوار کو منہدم کر کے ملک میں داخل ہوا جائے جبکہ داخلے کی اور بہت سی صورتیں اور راہیں ممکن تھیں۔ اس دیوار کا استحکام خود ہٹلر کے عزم و ارادے سے کچھ کم نہیں تھا۔

سیگفریڈ لائن کے چرچے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ دیوار کا نام اساطیر الاولین میں مذکور ایک اہم کردار کے نام پر رکھا گیا ہے جسے اس ملک میں ایک غیر معمولی قومی ہیرو کا درجہ حاصل تھا۔ قصے کا نام نی بے لنگن لیٹ ہے جس کے لفظی معنے ہوئے نی بے لنگز کا گیت" اصل زبان میں یہ قصہ منظوم ہے اور جرمنی کی رزمیہ شاعری میں اسے ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جرمنی کے مشہور مغنی اور نغمہ نگار ویگنر نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے اور اس کی بدولت نام پیدا کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اس کی ترتیب رُباعی کے انداز میں ہوئی ہے اور ہر دو رُباعیوں یعنی آٹھ مصرعوں کے بعد ٹیپ کا بند دو گنے وزن کے ساتھ آتا ہے جسے گانے والے بار بار دُہراتے اور سننے والے اس پر سر دُھنتے ہیں۔ نی بے لنگز شمالی جرمنی کے عہدِ قدیم کی ایک پستہ قد قوم کا نام تھا کیونکہ ان

کے سب سے پہلے فرمانروا کا نام نبی بے لنگ تھا۔

اس قصّے کی ابتدا کب ہوئی ؟ کیسے ہوئی ؟ اور کس کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے ؟۔۔۔ یہ ایسے سوال ہیں کہ اس باب میں مؤرخ کا دماغ قیاس آرائی کی دنیا سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ محققین کی رائے یہ بھی ہے کہ بہت ہی پرانے زمانے میں بعض دیوتاؤں اور دیویوں کی صنمیاتی انداز کی کہانیاں رائج تھیں جو ہر ملک کی قدیم روایات کی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں اور ہر زمانے میں کہنے اور سننے والوں کے دماغوں نے حسب پسند ان میں ردوبدل کیا اور جو سرا جس سرے سے چاہا ملا دیا۔

بعض کا خیال یہ بھی ہے کہ اس قصّے کی ابتدا جرمنی کے بجائے آئس لینڈ سے ہوئی تھی اور وہاں اس کا نام ناروے کی قدیم زبان کے مطابق وول سنگا ساگا رکھ گیا تھا۔ لیکن وول سنگا ساگا کو نی بے لنگن لیٹ کے عشر عشیر کے برابر بھی شہرت نصیب نہ ہو سکی خود آئس لینڈ کے لوگ بھی جرمنی کے مشہور قصّے سے لطف اٹھاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا اپنا قصہ ایک صنمیاتی کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا ہر کردار مافوق الفطرت حرکتیں کرتا اور خلافِ عقل شعبدے دکھاتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جرمنی کے قصّے میں اس قسم کی جھلک محض دو یا تین جگہ دکھائی دیتی ہے۔

یہ تو حقیقت ہے کہ ان دونوں قصّوں میں سے کسی ایک کو بھی محض ایک شخص کی دماغی کاوش کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا تاہم اپنی رائے یہ ہے کہ اس زنجیر کی مختلف کڑیاں تیار کرنے والے شاہنامۂ فردوسی سے ضرور متاثر تھے کیونکہ شاہنامے کے اصل قصّے کی جھلکیاں اس میں رنگ جماتی نظر آتی ہیں۔ شاہنامہ کو ایک ہزار سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے اور نبی لنگن لیٹ کی ترتیب کا زمانہ آج سے چھ ساڑھے چھ سو سال پہلے کا ہے۔ سیگفریڈ دراصل رستم کی کاربن کاپی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ تعجب ہے کہ اس لحاظ سے موازنہ کسی محقق نے نہیں کیا۔ ایک ہی قصّے میں بیک وقت جو انتہائی محبت ونفرت، حزن وملال، رشک ورقابت چاپلوسی اور فریب، بدظنی اور مایوسی، حسن کی جلوہ فرمائی اور عشق کی کرشمہ سازی رستم کی داستان میں موجود ہے، وہ ہوبہو سیگفریڈ کی زندگی میں بھی نمایاں ہے۔ رستم کے قصّے فردوسی کے ذہن کی ایجاد نہیں تھے بلکہ اس نے بھی سنی سنائی کہانیوں کا آپس میں ناطہ جوڑ کر انھیں بہترین انداز بیان کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ یہی قصّے اپنی منتشر حالت میں جرمنی کی

سرزمین پر پہنچے اور وہاں مربوط ہوکر انہوں نے نئے سلیقے میں ایک نیا روپ دھار لیا ہو۔ دونوں جگ کے قصوں میں کچھ مبالغے اور کچھ بعید از قیاس باتیں بھی شامل ہیں۔ جرمنی کی داستان میں بعض پہلو ایسے بھی ہیں جو فردوسی کے بیان میں نہیں ملتے لیکن اس پر تعجب کیوں ہو اور مغائرت کا شبہ کس لیے ظاہر کیا جائے۔ جب سرزمین کے بدلے جانے پر جانور اور پودے تک اپنا رنگ اور روپ بدل سکتے ہیں تو اس چیز کا جسے ذہن انسانی نے غیر مادی طور پر تخلیق کیا ہو، تغیر پذیر ہونا کیوں دائرۂ عقل سے باہر رہ سکتا ہے۔

وولسنگا ساگا میں قصے کا پلاٹ کچھ اس قسم کا ہے:

ایک روز تین بانکے شہسواروں نے جن کے نام اودن، لوکی اور ہونر تھے، ایک آبشار کے قریب ایک اودبلاؤ کو ایک سامن مچھلی نگلتے دیکھا۔ انہوں نے فوراً تیر کے ذریعے اسے شکار کرلیا اور اس کی کھال اتار کر چل پڑے۔ جب رات آگئی تو انہیں مجبوراً "رودمار" نامی ایک دیو کے گھر میں پناہ لینی پڑی۔ دیو نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ کھال خود اس کے لڑکے کی ہے۔ اس نے مطالبہ کیا کہ تم مجھے اتنا سونا لاکر دو جس سے میں اس کھال کو بالکل ڈھک کر زمین میں دفن کردوں۔ ان تین شہسواروں میں سے لوکی روانہ ہوا اور ندی کے کنارے پہنچ کر اندواری کو جو ایک خوفناک مچھلی بن کر ایک بہت بڑے خزانے کی حفاظت کر رہا تھا، جال میں پکڑ لیا اور مجبور کیا کہ خزانے میں رکھا ہوا سونا دے دیا جائے۔

اس سونے سے ساری کھال ڈھک گئی لیکن ایک بال پھر بھی باقی رہ گیا۔ اودمار نے اصرار کیا کہ تھوڑا سونا اور لاؤ۔ لوکی نے دوبارہ جاکر اندواری سے کہا کہ اپنی جادو والی سونے کی انگوٹھی بھی دے دو۔ اس نے انگوٹھی تو حوالے کردی لیکن ساتھ ہی بددعا کی کہ جس کے پاس میرا خزانہ رہے، وہ برباد ہو جائے۔ یہ بددعا خالی نہیں گئی۔ سب سے پہلے اودمار کو خود اس کے دو بیٹوں فافنر اور ریگن نے خزانے کے لالچ میں قتل کردیا۔ پھر فافنر نے اپنے شریکِ کار بھائی کو دھوکہ دے کر ساری دولت خود ہتھیالی اور سانپ بن کر اس کی نگرانی کرنے لگا۔ ریگن غصے میں بل کھاتا اور کسی طرح بدلہ لینے کی فکر میں رہنے لگا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے لوہار تھا اور بہت عمدہ تلواریں ڈھالنی جانتا تھا۔ چند ہی دن بعد یہ کام سیکھنے کے لیے اس کے پاس سیگرڈ کو بھیجا گیا جو سگمنڈ کا بیٹا تھا۔ سیگرڈ کے باپ کو جعلسازی سے قتل کرا کے اس کی بیوی یعنی سیگرڈ کی ماں ہیورڈس پر ڈنمارک کے بادشاہ الیف نے

قبضہ کر لیا تھا۔

فافنر کے دھوکا دینے اور خزانہ پر قبضہ کرنے کا سارا قصہ ریگن نے سیگرڈ کو بتا دیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر تم مجھے ایک عمدہ تلوار بنا دو تو میں تمہارے بھائی سے بدلے سکتا ہوں۔ ریگن کے پاس سخت فولاد نہیں تھا۔ اس نے جتنی بھی تلواریں بنائیں، وہ سیگرڈ کے ہاتھ میں آتے ہی ذرا جھکانے سے ٹوٹ گئیں۔ آخر سیگرڈ اپنی ماں کی باقیماندہ چیزوں میں سے اس تلوار کے ٹکڑے لے آیا جو اوڈن نے تحفے کے طور پر دی تھی۔ ان ٹکڑوں سے جونئی تلوار تیار ہوئی، وہ یقیناً بہت مضبوط تھی۔ چنانچہ سیگرڈ نے جا کر ایک ہی وار میں فافنر کو مار ڈالا اور اس کا دل نکال کر بھوننا شروع کر دیا مگر آگ کے شعلے سے اس کی انگلیاں جل گئیں اس نے تکلیف سے بے تاب ہو کر انگلیاں اپنے ہونٹوں میں داب لیں اور عین اس وقت محسوس کیا کہ میں پرندوں کی بولیاں سمجھنے کے لائق ہو گیا ہوں۔ یہ غیر معمولی صلاحیت اسی وقت پیدا ہوئی تھی چنانچہ اس نے ہُدہُد کو یہ کہتے سنا کہ ریگن سیگرڈ کو مار ڈالنے کی فکر میں ہے۔ لہٰذا اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود ریگن کو ہلاک کر دیا اور خزانہ لے کر اپنے وطن کی طرف چل پڑا۔

راستے میں اس نے ایک پہاڑی پر برُن ہلڈ کو لیٹے دیکھا جو جادو کے زیر اثر سو رہی تھی۔ سیگرڈ نے اس کا طلسمِ خواب توڑ دیا اور شادی کا وعدہ لے کر آگے چل پڑا تا کہ وطن پہنچ کر اسے بلائے اور باقاعدہ شادی کر لے لیکن راستے میں رھائن کے فرمانروا گیبو کے دربار میں پہنچا اور اس کے تینوں بیٹوں گنّار، ہوگنی اور گتھورم سے دوستی گانٹھ لی۔ انہوں نے چاہا کہ یہ بہادر نوجوان ہماری چھوٹی بہن گُدرن سے شادی کر لے لیکن سیگرڈ نے برُن ہلڈ سے اپنے وعدہ کا ذکر کر کے معذرت چاہی۔ اس پر رھائن کی ملکہ گرم ہلڈ نے جادو کا ایسا شربت پلایا کہ وہ اپنی منگیتر کو بھول گیا اور گدرن سے شادی رچالی۔ اس کے برعکس گنّار نے چاہا کہ برُن ہلڈ کو اپنی بیوی بنا لے کیونکہ اس کے حُسن کا چرچا سن لیا تھا۔ وہ سیگرڈ ہی کو اپنے ساتھ لے گیا جو پچھلے واقعات کو فراموش کر چکا تھا۔

جب وہ برن ہلڈ کی جائے قیام کے قریب پہنچے تو گنّار آگ کے اس چکر کو عبور نہ کر سکا۔ جو محل کو محصور کئے ہوئے تھا اور اسے عبور کئے بغیر شادی کا تصور تک محال تھا۔ آخر سیگرڈ نے جادو کے زور سے گنّار کا روپ دھار لیا اور انگوٹھی کی مدد سے محل میں پہنچ گیا اور برن ہلڈ کو اس حصار سے باہر لے آیا اور باہر آتے ہی اپنے اصل روپ میں بدل گیا۔ برن ہلڈ کی نظر

اصلی گنّار پر پڑی تو وہ سمجھی کہ مجھے لانے والا یہی شخص ہے۔ اس طرح گنّار اور برن ہلڈ کی شادی ہو گئی۔ تاہم برن ہلڈ کے دل میں یہ خیال خار بنا رہا کہ سیگرڈ نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ جادو کے شربت نے اس کا حافظہ ختم کر دیا ہے۔

ایک روز دونوں ملکہ یعنی برن ہلڈ اور گدرن حوض میں نہا رہی تھیں ان میں اس بات پر جھگڑا ہو گیا کہ کس کا خاوند زیادہ ذی وقار ہے۔ برن ہلڈ نے طعنہ دیا کہ تیرا خاوند تو میرے خاوند کا تابعدار ہے اور اس سے تنخواہ پاتا ہے۔ اس پر گدرن بولی کہ تجھے میرے بھائی نے نہیں بلکہ میرے خاوند نے بھیس بدل کر جیتا اور پھر تجھے میرے بھائی کے حوالے کر دیا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت جو انگوٹھی تجھ کو ملی تھی، وہ سیگرڈ کی تھی اور اس پر اس کا نام تک موجود ہے۔ اس انکشافِ حقیقت نے برن ہلڈ کو آپے سے باہر کر دیا اور اس نے اپنے تینوں بھائیوں سے کہا کہ اس فریب کا بدلہ سیگرڈ سے لیا جائے۔ بڑے دو بھائیوں نے مجبوری ظاہر کی کیونکہ وہ سیگرڈ کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم رکھنے کا پیمان اپنے خون سے کر چکے تھے البتہ گتھورم نے حامی بھر لی کیونکہ وہ اس لحاظ سے پابند نہیں تھا۔ لہٰذا وہ دو بار چھپ کر سیگرڈ کی خواب گاہ میں گیا تاکہ اسے قتل کر دے لیکن ناکام رہا۔ تیسری بار اسے کامیابی ہوئی اور اس نے سیگرڈ کے سینے میں خنجر بھونک دیا لیکن سیگرڈ نے بھی دم توڑنے سے پہلے اپنی تلوار نکال کر ایسا وار کیا کہ گتھورم کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ جب برن ہلڈ نے گدرن کو آہ و زاری کرتے سنا تو قہقہے لگانے لگی لیکن دل اس کا بھی رو رہا تھا کیونکہ اسے سیگرڈ سے حقیقی محبت تھی اور اسے ثابت کرنے کے لیے اس نے یہ کیا کہ جب سیگرڈ کی نعش چتا پر رکھ کر جلائی جا رہی تھی تو خود بھی اس پر گر کر شعلوں کی نذر ہو گئی۔

کچھ عرصے بعد گدرن نے برن ہلڈ کے بھائی آٹلی سے شادی کر لی۔ آٹلی کو معلوم تھا کہ وہ خزانہ جو سیگرڈ نے حاصل کیا تھا، گدرن کے بھائیوں کے پاس ہے۔ اس پر کسی ترکیب سے قبضہ کرنے کے لیے اس نے اپنی بیوی کے بھائیوں سے دوستی بڑھائی اور ایک روز دربار میں دعوت دے کر بلا لیا۔ اگرچہ بہن نے ان کو خبردار کیا مگر وہ پھر بھی آ گئے لیکن اس سے قبل وہ سارا خزانہ دریائے رہائن میں پھینک آئے تھے۔ جب آٹلی نے ان سے خزانے کے بارے میں دریافت کیا اور انہوں نے بتایا کہ وہ تو ضائع کیا جا چکا ہے تو اسے یقین نہ آیا اور آپس میں لڑائی شروع کر لی۔ ہوگی تو کام آ گیا اور گنّار کو ہاتھ باندھ کر ایک

کمرے میں لٹا دیا گیا جو زہریلے سانپوں سے بھرا ہوا تھا۔ گنتار نے اپنے پاؤں کی انگلیوں کی مدد سے رُباب بجا کر میٹھے سُروں میں اس طرح گانا شروع کیا کہ سانپ مسحور ہو گئے لیکن ایک افعی سانپ نے، جس پر موسیقی کا کوئی اثر نہ ہوا تھا، گنتار کو ڈس لیا۔ یہ صدمہ گدرن کے لیے بہت زیادہ تھا۔ اِس سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے اپنے خاوند آٹلی کو جبکہ وہ رات کو بے خبر سو رہا تھا، خنجر مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور محل کے ایک کونے میں رکھ کر جلا بھی ڈالا اور جب صبح ہوئی تو خود سمندر میں چھلانگ لگا کر موت کے آغوش میں پہنچ گئی۔

یہ سب کچھ اس بدعا کے باعث ہوا جو شروع میں اڈواری نے دی تھی۔

**نقشِ ثانی** - یہ سارا قصّہ اس قدر الجھا ہوا اور کہیں کہیں بعید از فہم ہے کہ بالکل چیستان بن کر رہ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسلوبِ بیان میں شیرینی ہو جس کا ہمیں علم نہیں، کیونکہ ہم اس غیر زبان کی نزاکتوں سے نا آشنا ہیں اور نظم کی حلاوت یوں بھی مسلّمہ ہے۔

دوسرا قصّہ یعنی نِی بے لنگن لیٹ زیادہ مقبول ہے۔ اسے باقاعدہ بیان کرنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ خوش گوار موسم کی دل فریب راتوں میں تو خاص طور پر گویوں کا کاروبار ہر جگہ چمک اٹھتا ہے۔ وہ جب بھی سڑکوں پر اس کے بند گاتے ہوئے نکلتے ہیں تو سُننے والوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ وہ دل کھول کر روپے نچھاور کرتے ہیں اور زندگی میں سینکڑوں بار سنے ہوئے گیت کو پھر سُن کر اس طرح متاثر اور محظوظ ہوتے ہیں جیسے وہ موقع پہلی بار نصیب ہوا ہے۔

میں نے بک شیلف میں رکھی ہوئی کتاب کے اسی قصّے کو سب سے پہلے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہو سکتا ہے:۔

عرصہ دراز کی بات ہے صوبہ رھائن کے شہر وورمز پر برگنڈیوں کے فرمانروا گنتھر کا تسلط تھا۔ اس کی ایک بہن بھی کرائم ہلڈ، جو اپنے حسن و جمال کے باعث نہ صرف اس مملکت میں بلکہ آس پاس کے ملکوں میں بھی مشہور تھی۔ گوشے گوشے میں اس کے پرستار موجود تھے۔ ہر شخص اسے ایک نظر سے دیکھ لینے کے لیے بیتاب نظر آتا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سیگفرئیڈ (زِیک فریٹ) نے بھی اس کی تعریف سُن لی اور آنکھ سے دیکھے بغیر اس کا دلدادہ ہو گیا۔ اس کا تعلق بھی ایک دوسرے شاہی خاندان سے تھا۔ اس کا باپ سیگمنڈ اس علاقے کا فرمانروا تھا جسے اب نیدرلینڈ کہتے ہیں۔ عشق کی بیتابیوں نے سیگفرئیڈ کو مجبور کیا اور وہ

گھوڑے پر سوار ہو کر تن تنہا ارض رھائن کی طرف چل پڑا۔ وہ خود بھی بے حد خوب صورت ہونے کے علاوہ نہایت بہادر اور جوشیلا تھا۔ کم سنی ہی کے زمانے میں اس نے کئی معرکے سر کر لیے تھے۔ جب وہ نئی راجدھانی کے قریب پہنچا تو بادشاہ اور اس کے دو بھائیوں کو پہلے سے اطلاع مل گئی۔ انہوں نے اپنے مصاحب خاص ہیگن سے جو بہت منھ چڑھا ہونے کے علاوہ اپنے کردار کے لحاظ سے بدطینت اور عیار بھی تھا، تفصیلی معلومات فراہم کرنے کے لیے کہا۔ ہیگن نے فوراً اپنے جاسوس دوڑائے اور بہت جلد سب حالات دریافت کر کے اور کچھ اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر بادشاہ سے کہا،

"حضور! یہی وہ ظالم شخص ہے جس نے نی بے لنگز کے دو فرمانرواؤں کو موت کے گھاٹ اتارا اور ان کے خزانے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے پاس ایک تلوار ہے جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ ایک جادو کا چغہ ہے جسے پہن کر وہ دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور خود سب کچھ دیکھتا رہتا ہے اسی لیے وہ غیر معمولی اور بعید از قیاس کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ اس نے ایک بار ایک اژدہے کو مار کر اس کے خون میں غسل کر لیا تھا جس کے باعث اس کے جسم میں بے پناہ قوت آگئی ہے اور تلوار بھی اسے کاٹ نہیں سکتی ہے۔ البتہ اس کے بدن پر ایک مقام ایسا ہے جہاں اژدہے سے لڑتے وقت اوپر چھائے ہوئے درخت کا ایک پتا گر کر چپک گیا تھا۔ وہ حصہ خون میں تر ہونے سے رہ گیا۔ لہٰذا اس مقام پر تیر یا خنجر اپنا کام کر سکتا ہے۔ باقی جسم پر کسی تلوار کی دھار خراش تک نہیں ڈال سکتی۔"

ہیگن نے بادشاہ کو ورغلانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی لیکن جب سیگفریڈ دربار میں پہنچ گیا تو بادشاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور اپنے کمرۂ خاص میں اسے ٹھہرانے کا انتظام کرا دیا۔ اتفاق سے انہی دنوں برگنڈیوں کی لڑائی سیکسنوں سے چھڑ گئی اور دوسری طرف سے معرکہ اتنا زبردست رہا کہ سب کے چھکے چھوٹ گئے۔ شاہ گنتھر نے اپنے مہمان سے امداد چاہی۔ اس نے اس شرط پر حمایت کی ذمہ داری لی کہ کامرانی کے بعد شہزادی کرائم ہلڈ کی شادی اس سے کر دی جائے۔ بادشاہ نے سوچا کہ بہن کا پلّہ بہر حال کسی نہ کسی کے ساتھ باندھا ہی جائے گا۔ اگر اس وعدہ پر سلطنت بچ سکتی ہے تو سودا مہنگا نہیں رہے گا۔ فوراً ہاتھ ملا کر اس نے شرط منظور کر لی۔

سیگفریڈ نے تن تنہا میدان میں قدم رکھا اور شمشیر زنی کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کی

فوج میدان چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ اب ایک بار پھر ہیگن نے شاہ گنتھر کو ورغلایا کہ اگر بہن کو ایک اجنبی سے بچانا مقصود ہو تو اس کو ایسی کسی اور مہم پر لگایا جائے جہاں کامیابی کے امکانات محال ہوں۔ گنتھر کو اپنی محبت کی مایوسی میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔

اسے آئس لینڈ کی شہزادی برن ہلڈ سے جس کی جھلک ایک بار دیکھ لی تھی، والہانہ عشق تھا لیکن مجبور تھا کیونکہ شہزادی کی شرطیں اتنی کڑی تھیں کہ ان کو پورا کرنا اس کی بساط سے باہر تھا۔ اس نے سیگفریڈ سے کہا کہ تم میرے قول کے مطابق کرائم ہلڈ سے شادی تو کر سکتے ہو لیکن اس کے شوہر نہیں بن سکتے۔ تاوقتیکہ تم برن ہلڈ کو حاصل کرنے میں پوری طرح کامیابی کے ساتھ میری اعانت اس طرح نہ کرو کہ وہ میری شریک حیات بن جائے۔ سیگفریڈ نے اس اجمال کی تفصیلات معلوم کیں اور حامی بھرلی۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ تم شہزادی کا چیلنج قبول کرنے کا اعلان کردو اور اس سرزمین کی طرف چل پڑو۔ میں بالکل سائے کی طرح لیکن سب کی نگاہوں سے اوجھل تمہارے ساتھ رہوں گا۔ ہر معرکے میں اپنے بازو کی قوت سے تم کو جتوادوں گا۔ شہزادی کی نگاہوں کے سامنے تم رہوگے اور انجام کار وہ تم سے شادی کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

چنانچہ بادشاہ نے اپنے ایلچی روانہ کئے اور خود بھی رخت سفر باندھ کر آئس لینڈ کی طرف چل پڑا۔ جب یہ شاہی قافلہ وہاں پہنچا تو خود شہزادی نے باقاعدہ خیر مقدم کیا، خوب خاطر مدارات کی اور پھر شرطیں پوری کرنے کے لیے میدان میں لے گئی۔ سب کی نگاہوں سے اوجھل سیگفریڈ ہر کام میں بادشاہ کی مدد کرتا اور اسے کامیاب کراتا رہا۔ پھر آخر میں حجلۂ عروسی والی شرط باقی رہ گئی۔ اس ملک میں اور اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ شوہر اندھیرے کمرے میں زبردستی اپنی بیوی کی کمر سے پٹکا کھولے اور ہاتھ سے انگوٹھی اتارے تب ہی اس کی جواں مردی کا قائل ہوا جاتا اور اسے بیوی کے لائق سمجھا جاتا تھا۔ اس موقع پر بھی سیگفریڈ بادشاہ کے ہمراہ حجلۂ عروسی میں پہنچ گیا کیونکہ شہزادی کی چستی و چالاکی اور جوان ہمتی کو دیکھ کر گنتھر کو اندیشہ تھا کہ میں شاید اس پر قابو نہیں پاسکوں گا اور جب واقعی وہ ناکام ہونے لگا تو سیگفریڈ نے اُسے ایک کونے میں دھکیل دیا اور خود زور آزمائی شروع کردی۔ اس کی قوت کے سامنے شہزادی کا ٹھیرنا محال تھا وہ بہت جلد بے قابو ہوگئی۔ سیگفریڈ نے اس کا پٹکا کھول کر انگوٹھی اتار لی اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے کھسک گیا اور گھبراہٹ میں شہزادی کی دونوں چیزیں ساتھ

لے گیا۔ گنتھر نے باقی رات برن ہلڈ کے ساتھ بسر کی اور دوسرے دن اسے اپنے ہمراہ لے کر ارضِ رہائن کی طرف روانہ ہو گیا۔ شاہی محل میں دو شادیوں کی تقریبات بیک وقت عمل میں آئیں۔ گنتھر برن ہلڈ کا اور سیگفریڈ کرائم ہلڈ کا شوہر بن گیا۔ سیگفریڈ نے پٹکا اور انگوٹھی جو برن ہلڈ کے کمرے سے لایا تھا، اپنی بیوی کو منھ دکھائی میں دے دیں اور سارا قصّہ بھی اسے سُنا دیا۔

کچھ عرصے بعد کرائم ہلڈ اور برن ہلڈ ایک حوض میں نہاتے وقت اس بات پر جھگڑ پڑیں کہ دونوں میں سے زیادہ فضیلت کسے حاصل ہے۔ برن ہلڈ نے دعویٰ کیا کہ میں اس سرزمین کے فرمانروا کی شریکِ حیات ہوں اور اس لیے زیادہ بلند مرتبہ رکھتی ہوں اور تم میرے شوہر کے ایک معمولی مصاحب کی بیوی ہو اس پر کرائم ہلڈ سے نہ رہا گیا۔ اس نے صاف لفظوں میں بھانڈا پھوڑ دیا کہ حجلۂ عروسی میں زور آزمائی کے وقت میرے خاوند نے تم پر قبضہ پایا تھا اور اس دعوے کے ثبوت میں اس کے پٹکے اور انگوٹھی کو پیش کر دیا۔ برن ہلڈ کو کچھ کچھ شبہ تو پہلے سے تھا اور وہ سیگفریڈ کی جوانی و رعنائی کو دیکھ کر کرائم ہلڈ سے حسد بھی کرنے لگی تھی افشائے راز پر تو بالکل ہی جل کر خاک ہو گئی۔ یہ بات برداشت بھی کیسے ہو سکتی تھی۔

وہ فوراً محل میں پہنچی اور اپنا سر اور سینہ پیٹتے ہوئے شکایت کی کہ تم نے مجھے فریب سے حاصل کیا ہے اور پھر تمہاری بہن مجھے طعنہ دیتی ہے۔ لہٰذا جب تک ان دونوں سے بدلہ نہ لے لیا جائے مجھے چین نہیں آئے گا۔ گنتھر عجیب مخمصے میں تھا کہ اس صورت میں کیا کرے۔ ایک طرف بہن کا معاملہ تھا اور دوسری طرف ایک شہ زور انسان سے واسطہ جس پر غالب آنا محال تھا۔ اب ایک بار پھر ہیگن نے اپنی عیاری سے کام لیا اور بادشاہ سے کہا کہ میں سیگفریڈ کو ٹھکانے لگانے کی صورت پیدا کر دیتا ہوں۔

دوسرے ہی دن وہ اسے شکار کھیلنے کی ترغیب دے کر جنگل میں لے گیا۔ دوپہر کو جب سب شکاری کھانا کھانے درخت کے سائے میں بیٹھے تو پتہ چلا کہ پانی ساتھ لانا بھول گئے۔ ہیگن نے سیگفریڈ سے کہا، آؤ۔ میں اور تم بھاگ کر ندی پر جائیں اور دیکھیں کہ پہلے کون پانی لاتا ہے۔ سیگفریڈ اس کے کہے میں آ گیا اور دوڑ کر ہیگن سے پہلے ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ ایک ہی لمحہ بعد ہیگن بھی اس جگہ موجود تھا۔ پھر عین اس وقت جب کہ سیگفریڈ جھک کر پانی پی رہا تھا، ہیگن نے اس کے جسم پر ٹھیک اس جگہ

خنجر سے وار کیا جو اژدہے کے خون سے تر ہونے سے رہ گئی تھی۔ سیگفریڈ کے منہ سے ایک ولدوز چیخ نکلی لیکن فوراً ہی اس نے بھی تلوار نیام سے باہر نکال لی اور ایک ہی ہاتھ میں ہیگن کے دو ٹکڑے کردیے اور کچھ دیر میں تڑپ تڑپ کر اس جہان سے رخصت ہو گیا۔

یہ طویل داستان جو سولہ بہت ہی طویل بندوں میں منظوم کی گئی ہے اسلوب بیان کے اعتبار سے بالکل طیوطانی عہد کی یادگار کہی جا سکتی ہے۔ وہ اس سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ مورخین ادب بھی اسے تیرہویں صدی سے منسوب کرتے ہیں اور بعض محققین نے تو یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ اس قصے کے سارے کردار فرضی نہیں، حقیقی ہیں، محض مصلحتاً نام بدل دیے ہیں۔ انہوں نے وہ تاریخی نام بھی درج کیے ہیں جن کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لیے ارادتاً بدلا گیا ہے۔ کچھ بھی ہو یہ ماننا پڑے گا کہ داستان اس زمانے کے اعتبار سے بہت عمدہ ہے اور انسانی فطرت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔

اسی مجموعے میں سیگفریڈ کی زندگی سے متعلق وہ واقعہ بھی ایک علیحدہ کہانی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے جو اژدھے کو قتل کرنے اور اس کے خون سے غسل کرنے کے بارے میں ہے۔ اسے بھی میں نے بالکل سرسری طور پر کہیں کہیں سے پڑھ لیا۔

**ویگنر کی طبع آزمائی** ۔ جس طرح ہمارے ملک میں پنجاب اور سندھ کی بعض عشقیہ داستانیں ہیر رانجھا، سسی پنوں یا عمر ماروی وغیرہ مشہور ہیں اور بعض غیر ملکی کہانیوں نے بھی، مثلاً لیلیٰ مجنوں، یا شیریں فرہاد نے یہاں پہنچ کر شہرت دوام حاصل کر لی اور ہر دور کے ادیبوں اور شاعروں نے ان قصوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ اسی طرح جرمنی میں نی بے لنگن داستان نے ہر عہد کے لکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی ہے۔ تاہم پچھلی صدی کے نصف آخر میں رچرڈ ویگنر نے جو اپنے گیتوں اور غنائی تمثیلوں کا موجد ہونے کے اعتبار سے بھی کچھ کم مشہور نہیں ہے اس میدان میں سب سے زیادہ نام پیدا کیا ہے۔

اس نے یہ داستان تین الگ الگ حصوں میں اس طرح منظوم کی کہ ہر حصہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ یہ طویل نظم مکالمے کی صورت میں ہے اور ہزاروں بار اسٹیج پر پیش کی جا چکی ہے۔ خود مصنف نے اس کو اپنی زندگی میں اپنی زیر نگرانی ۱۸۷۶ء میں پہلی بار پیش کیا تھا۔ اس کا تمہیدی سین رہائن گولڈ کے نام سے اسٹیج کیا جاتا ہے۔ تین حصے علی الترتیب "دی والکری"، "سیگفریڈ" اور "گوٹر دامیرنگ" کہلاتے ہیں۔ ویگنر چونکہ خود ایک مشہور مغنی اور نغمہ ساز تھا اور پھر اداکاری

کے فن سے بھی خوب واقف تھا، اس لیے اس کی منظوم تمثیل میں بلا کی جاذبیت موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج تک اوپیرا کے دلدادگان اس سے لطف اٹھاتے ہیں اور کبھی بھی کسی کی طبیعت سیر ہونے کا نام نہیں لیتی۔ ویگنر کے اور بھی منظوم ڈرامے کافی مشہور ہیں اور جرمنی کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی ان کے ترجموں نے شہرت پائی ہے۔

ویگنر نے اپنی غنائی سرگرمیاں کونگز برگ اور ریگا کے علاوہ ہائیڈل برگ سے شروع کی تھیں لیکن یہ میدان اس کی جولانیٔ فطرت کے اعتبار سے اس کے نزدیک بہت ہی تنگ تھے۔ لہٰذا وہ بہتر مواقع کی تلاش میں پیرس چلا گیا۔ وہاں اس وقت بہت سے مقامی نغمہ سازوں کا سکہ چل رہا تھا۔ اس کی دال نہ گل سکی۔ یہ ۱۸۳۹ء کی بات ہے۔ چار سال بعد اسے مجبوراً وطن واپس آجانا پڑا۔ ۱۸۴۳ء میں اس نے ایک تمثیل رائن تسی کے عنوان سے ڈریسڈن میں پیش کی جو خاصی کامیاب رہی۔ اگلے سال اس نے ایک نئی چیز تن ہوسر کو، جو کئی سال پہلے کی تصنیف شدہ تھی، بڑے آب و تاب کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیا لیکن خلافِ توقع مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

آخر اس نے اپنی تمثیلات کے فنی پہلوؤں پر چند مضامین اخبارات و رسائل میں شائع کرائے تاکہ شائقین اس کے کمالات کی پوری قدر کر سکیں۔ لیکن ان سے بھی کام نہ بنا۔ ۱۸۴۸ء میں ہنگری کے مشہور نغمہ ساز لزٹ نے تن ہوسر کو وائمار میں پیش کیا جس کے نتائج امید افزا رہے۔ اس طرح دو فن کاروں نے مل کر ایک نیا افق پیدا کر لیا۔

ویگنر کی امنگیں نئے سرے سے جوش میں آگئیں اور وہ لزٹ کے تعاون سے ملک کے مختلف حصوں میں جا کر داد حاصل کرتا رہا۔ اس خراجِ تحسین میں دونوں فن کار برابر کے شریک سمجھے جاتے تھے۔ پھر چار سال بعد، جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، نی بے لنگن کے مختلف روپ یکے بعد دیگرے عوام کے سامنے آئے اور ان سب نے دیکھنے والوں کا دل موہ لیا۔ ویگنر نے اپنا آخری غنائیہ "پارسیفال" ۱۸۸۲ء میں بے روتھ کے مقام پر پیش کیا اور اس سے اگلے سال ہی فوت ہو گیا۔

وہ ۲۲ رمئی ۱۸۱۳ء کو لائپزگ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ شروع ہی سے بڑا ذہین تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے تیرہ سال کی عمر میں اوڈیسی کی بارہ جلدیں اپنی زبان میں ترجمہ کر لی تھیں اور پہلا ڈرامہ بیس سال کی عمر میں لکھا تھا لیکن وہ اس کی زندگی میں کبھی اسٹیج نہ ہو سکا۔ اس نے

۱۸۳۶ء میں شادی کی مگر پچیس سال بعد بیوی کو طلاق دے دی جبکہ وہ کئی بچوں کا باپ تھا۔ اس طلاق کے نو سال بعد اس نے لزٹ کی بیٹی کوسیما سے شادی کر لی جس کا پہلا شوہر مر چکا تھا۔ اس وقت ویگنر کی عمر ۷۵ سال تھی۔ دوسری بیوی کے ساتھ تیرہ سال ازدواجی زندگی بسر کر کے وہ ۱۸۸۳ء میں فوت ہو گیا۔ کوسیما ۱۹۱۹ء تک زندہ رہی اور بے روتھ میں ہر سال ویگنر کی برسی پر ایک تقریب مناتی اور شوہر کی غنائی تمثیلات پیش کرتی رہی۔

نیند کے غلبے کے باعث سر بھاری ہو چلا تھا، اس لیے میں نے خواب کی نگری میں پہنچ جانے کی ٹھان لی۔ بھائی جان محترم مجھ سے کچھ دیر پہلے سو چکے تھے۔ انہوں نے میری محویت کو دیکھتے ہوئے سو جانے کی ہدایت نہیں کی تھی ورنہ وہ عام حالات میں ان باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

۱۹ ستمبر ۱۹۵۶ء ــــ بدھ

# ہائیڈل برگ میں

رات تو واقعی خوب ٹھنڈی رہی۔ خاصے دبیز دو دو گرم کمبل بھی کم معلوم ہوتے تھے۔ مگر نیند کے کیا کہنے، گویا بلا کی طرح ہم پر سوار تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ وہ سُولی پر بھی آجاتی ہے۔ سولی پر لٹکنے والے کسی شخص کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ سُولی کا رواج اب متروک ہو گیا ہے۔ البتہ کراچی میں سڑک کے کنارے پٹری پر جہاں ہر آن غیر متوقع حادثات کا ڈر رہتا ہے اور ایسے ناقص ماحول والے مقامات پر بھی جہاں تعفن کے باعث اچھے خاصے تندرست اِنسان کا دماغ خراب ہو جائے، لوگوں کو خرّاٹے لے کر اطمینان سے سوتے اور میٹھے سپنوں کے مزے لیتے دیکھا ہے۔ وہ زمانہ تو خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا جب کہ غالب کے انداز میں شانوں پر کسی کی زلفیں پریشان ہو جانے کے بعد دل و دماغ کی خوش نصیبی اور آسودگی کا تصوّر کیا جاسکتا تھا۔

قصّہ پارینہ کوئی ڈیڑھ بجے ختم کرنے کے چند لمحے بعد نیند آئی ہوگی۔ صبح کو آنکھ جو کھلی تو ساڑھے چھے بجے تھے۔ یہاں مؤذن کی چونکا دینے والی آواز کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، البتہ تعجب اس امر کا تھا کہ شاید یہاں کے مُرغ امریکی تسلّط کے زیر اثر منقار زیرِ پر ہو کر رہ گئے اور بانگ دینا بھول گئے ہیں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہوٹل کے آس پاس ایسے لوگ آباد نہ ہوں جو سالم مرغ چٹ کر لینا تو جانتے ہوں لیکن اسے پالنے کے عادی نہ ہوں۔ اسی طرح شاید وہ پرندے بھی عنقا تھے جو اپنی جگوریوں سے (لوریوں کے برعکس انسان کو جگا دینے والے گیت) آمدِ صبح کا پیغام دے دیں۔ معاً مجھے اپنے مکان کے باغیچے میں لگا ہوا بادام کا درخت یاد آگیا جس پر بسیرا لینے والی چڑیاں علی الصبح اس درجہ پابندیٔ وقت کے ساتھ اپنے چہچہے سُناتی تھیں کہ گھڑی کے گھنٹے درست کر لینے ممکن تھے۔

میں کسمسا کر اٹھا کیونکہ اب بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ نیند پوری نہیں ہوئی ہے اور سونے کا یہی وقت ہے۔ بھائی جان محترم نمازِ فجر کے لیے "وضو بنا کر" غسل خانے سے

باہر تشریف لا رہے تھے۔ میں انھیں دیکھتے ہی اس طرح اٹھ بیٹھا جیسے کمانی لگا ہوا گڈا لٹائے جانے کے بعد ایک دم اچھل کر بیٹھ جاتا ہے۔ صبح کی نماز کو قضا کرنا کسی طرح بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام نے ادائیگیٔ نماز کے لیے جو اوقات مقرر کیے ہیں، وہ معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے قطع نظر طبّی لحاظ سے بھی بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔

**خواب دوشیں:** کراچی سے ۲۲ راگست کو ہم دونوں بھائی چلے تھے۔ آج رات پہلی بار خواب دیکھا اور خواب بھی عجیب۔ میری منھ بولی بہن مسز علوی گویا ہماری گائڈ بنی ہوئی ہیں اور ہمیں پیسائی کی ایک مشین دکھا رہی ہیں اور فرما رہی ہیں کہ یہ مشین دواؤں کو نہایت باریک کر دیتی ہے۔ اور یہ دیکھئے، شیشے کے پائپ سے ہوا کے دوش پر دوا دوسرے کمرے میں جا جا کر جمع ہو رہی ہے۔ ان کا مشورہ ہے کہ ہم یہ مشین ہمدرد دواخانے کے لیے ضرور خرید لیں اور خود بک کرا کے کراچی بھیج دیں۔ مجھے ان سے یہ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ ایسی کئی مشینیں پہلے سے دواخانے میں موجود ہیں اور پیسائی کا کام انسانی طاقت کے بجائے مشینوں ہی سے لیا جاتا ہے۔ حالتِ خواب ہی میں یہ فیصلہ کر لیا کہ کراچی پہنچ کر کسی موقع پر انھیں ہمدرد لیبارٹری میں بُلا کر دکھایا جائے گا کہ یہاں بھی دواسازی کا کام کافی جدید طریقے پر ہوتا ہے۔

سعیدہ علوی کموڈور آصف علوی کی بیگم ہیں۔ آصف علوی پاکستان بحریہ میں ہیں۔ یہ میرے بھائی بننا چاہتے تھے مگر میں نے ان کو بہنوئی بنا لیا ہے۔ مجھے اس وقت یاد نہیں کہ علوی صاحب سے تعارف کس طرح ہوا۔ وہ اور میں کس طرح اتنے قریب ہو گئے۔ شروع میں کیا کیا حوادث پیش آئے مگر یہ یاد ہے کہ سعیدہ علوی مریضہ کی حیثیت سے میرے مطب میں آئیں اور کئی بار آئیں۔ مجھے ان سے دلچسپی زیادہ اس لیے ہوئی کہ ان کو تعلیم سے بہت انہماک تھا اور ایم اے کا امتحان دے رہی تھیں۔ جسمانی اعتبار سے کمزور تھیں اور نحیف و نزار۔ دوسرا ستم یہ کہ امتحانات کے دن تھے اور انھیں شدید نزلہ ہو گیا۔ چاہتی تھیں کہ یہ زور کسی طرح کم ہو جائے۔ مبادا پرچے خراب ہو جائیں (یعنی ناک کی ریزش سے نہیں بلکہ اس کے زیر اثر ذہنی اضمحلال کے باعث) میں کئی بار ان کے گھر گیا۔ شاید وہیں علوی صاحب سے باتیں ہوئی ہوں۔ شدہ شدہ میں اور علوی دوست بن گئے۔ سعیدہ علوی پہلے ہی بہن بن چکی تھیں۔

ہماری اور ان کی اکثر باتیں مشترک ہیں۔ مزاج بھی شاید ایک ہی سا ہے سعیدہ علوی نے ایک دن ٹیلی فون کیا کہ "حکیم صاحب! آج شام کھانا ہمارے ساتھ کھایئے گا۔ گو ہم نے پچیس تیس آدمی بلا رکھے ہیں اور آپ ہنگاموں سے گھبراتے ہیں لیکن یہاں آکر آپ "بور" نہیں ہوں گے۔ آپ ضرور آیئے۔ بڑی مسرت ہوگی"۔ میرے یہ دریافت کرنے پر کہ کیا تقریب ہے۔ سعیدہ علوی نے ہنس کر کہا: "آج ہم اپنی شادی کی گیارہویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ یہ ۱۸ر دسمبر ۱۹۵۵ء کی صبح نو بجے کی بات ہے۔

عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ میری شادی بھی ٹھیک اسی مہینے اور اسی تاریخ کو ہوئی جس کو ان دونوں کی ہوئی۔ صرف سن مختلف ہے۔ میں نے جب مسز علوی کو یہ بات بتائی تو وہ بہت محظوظ ہوئیں "خوب! یہ ایک نیا رشتہ ہے جب کہ میرے اور آپ کے نام میں صرف ایک ہائے ہوز کا فرق ہے"۔ انہوں نے ٹیلی فون پر ہنستے ہوئے کہا اور میں نے شام کو دعوت میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اپنی نہ تو شادی کی سالگرہ مناتا ہوں اور نہ پیدائش کی۔ رسم بری نہیں لیکن زندگی کی ایک اور گھڑی کم ہو جانے کا احساس ہوتا ہے۔

رات سعیدہ علوی خواب میں دواؤں کے سلسلے میں دکھائی دیں۔ خدا خیر کرے نہ معلوم ہماری منھ بولی بہن کس طرح ہیں۔ ان کو پیٹ کی تکلیف اکثر رہتی ہے اور زکام بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ دعا ہے کہ سب خیریت سے ہوں۔ علوی صاحب ان دنوں پاکستانی بحریہ کے جہاز لے کر تین ماہ کے لیے سمندر میں اپنے عملے کے افراد کو مشق کرانے گئے ہیں۔ اِدھر میں تین ماہ کے لیے دورے پر ہوں۔ وہ ۱۶ر اگست کو گئے اور ۱۸ر نومبر کو واپس آئیں گے۔ میں ۲۲ر اگست کو چلا اور ۱۴ر نومبر کو واپس کراچی پہنچ جاؤں گا۔

**عجائب گھر:** بھائی جان محترم نے آج کے لیے جو پروگرام رات کو سونے سے قبل مرتب کیا تھا اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم ناشتہ کرتے ہی ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ آج جراحی کا ایک اسپتال، باغ نباتات، باغ حیوانات اور صحت کے خیال سے کھلی فضا میں جو غسل کے تالاب بنائے گئے ہیں، انھیں قریب قریب ہونے کے باعث ایک ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ چونکہ ہوٹل سے فاصلہ طویل تھا، اور وقت بچانے کا خیال بھی ملحوظ رکھنا تھا، اس لیے ٹیکسی کر لینی پڑی۔ ورنہ ایسے موقعوں پر پیدل

چلنا اس اعتبار سے بھی مفید ہوتا ہے کہ راستے کی چیزیں لگے ہاتھوں اطمینان سے دیکھ لی جاتی ہیں۔ پھر بھی یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ اگر راستے میں کوئی قابل دید چیز آ گئی تو ٹیکسی رکوا کر اس کی بھی زیارت کر لی جائے گی اور چنانچہ یہی ہوا بھی۔ ہوٹل سے نکل کر ہم ہوپٹ اسٹراس پر تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ ایک عجائب گھر کی عمارت نظر آئی۔

اس کا نام پیلیے ٹی ناٹے میوزیم ہے۔ اس کو چاروں طرف سے گھیرنے والا باغیچہ ہی اتنا دیدہ زیب ہے کہ غالباً سیاح اس کے گرویدہ ہو کر رہ جاتے ہوں گے۔ اور عجائب گھر کے اندر جانے کا نام نہ لیتے ہوں گے۔ اس وقت بھی بہت سے سیلانی اِدھر اُدھر بیٹھے یا ٹہلتے نظر آئے۔ ہمارے پاس اس طرح لطف اندوز ہونے کے لیے وقت کہاں تھا لیکن ہم عجائب گھر بھی نہ دیکھ سکے کیونکہ نظام اوقات کے مطابق اسے آج شام کو پانچ بجے کھلنا تھا۔ تاہم یہ معلوم کر لیا کہ یہ عمارت ۱۷۱۲ء میں تعمیر ہوئی تھی اور شروع میں کسی شہزادے کی قیام گاہ تھی۔ زمانے نے کروٹ بدلی تو "عجائبِ زمانہ لوگ" تو وہاں سے چلے گئے اور فنونِ لطیفہ کے عجائبات نے ان کی جگہ لے لی۔

اس میں رومانوی دَور کی دستی تصاویر کا ایک عمدہ ذخیرہ موجود ہے۔ کچھ زمانۂ قبل تاریخ اور رُومی عہد کی نادر اشیاء بھی اس میں رکھی گئی ہیں جنھیں زمین کا سینہ چیر کر نکالا گیا تھا۔ ہم نے کوشش کی کہ دروازوں کے شیشوں ہی میں سے جھانک کر اندر کا ایک نظارہ کر لیں لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا کیونکہ شیشے شفّاف قسم کے نہیں تھے۔ نگاہ ان کے پار جانے سے قاصر تھی۔ نہ جانے ان نوادر کو جن کا کچھ حصہ عرصہ دراز تک زمین میں پوشیدہ رہنے کے بعد اپنے حجابات کے پردے چاک کرا چکا تھا، اس قدر زیادہ پردہ پوش رکھنے میں کیا مصلحت تھی۔ عجائب گھر کے اربابِ حل و عقد کو کم سے کم یہ سوچنا چاہیے تھا کہ بعض سیّاح سارے شہر کے لیے دو دن وقف کرتے ہوئے بھی یہاں آ سکتے ہیں۔ انھیں دیدار سے محروم رکھنا مناسب نہیں تھا۔

ہمارے بھائی محبوب نے شوفر سے اپنی اکتسابی اطالوی زبان میں گفتگو کی اور اس نے کچھ دُور لے جا کر ایک اور عمارت کے سامنے گاڑی روک دی۔ انہوں نے بتایا کہ اس کا نام "تسم ریزن" ہے (پہلے لفظ میں حرف ت کی آواز بہت ہی ہلکی بلکہ نہیں کے برابر صرف دانتوں پر زبان رکھ کر نکالی جائے۔ اس کا صحیح تلفظ ادا کرنا اور اپنے رسم الخط میں لکھنا بہت

دشوار کام ہے۔ لاطینی زبان کے اعتبار سے اس لفظ کا پہلا حرف زیڈ ہے لیکن جرمنی میں زیڈ کا تلفظ ہلکے ٹی اور ایس سے کیا جاتا ہے اور ٹی کی آواز نہ کہنے والا ادا کرتا ہے نہ سننے والے کو سنائی دیتی ہے۔ دونوں صرف محسوس کرتے ہیں (ذرا کوشش کر کے دیکھئے لیکن آپ کے قریب کوئی اور موجود نہ ہو، ورنہ آپ کے بارے میں آپ کے ملنے والوں کو اپنی رائے بدل دینی پڑے گی)

یہ عمارت بجائے خود ایک یادگار تھی۔ بہت ہی پرانی قسم کا طرزِ تعمیر اس کے نقش و نگار میں اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ یہ دراصل ۱۷۰۷ء میں شہزادہ الیکٹر کے سیر شکار کی رہائش کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ اسی لیے دوسری منزل تک دونوں طرف کے استونوں پر ان ہتھیاروں کے علاوہ جو شکار میں استعمال ہوتے ہیں، دوسرے آلاتِ حرب بھی کندہ کیے گئے تھے۔ غالباً شکار پر ساتھ جانے والا فوجی دستہ بھی اسی جگہ رہتا ہوگا۔ عمارت مٹیالے سرخ پتھر سے بنائی گئی تھی جسے امتدادِ زمانہ نے اور بھی زیادہ سیاہ کر دیا ہے۔

کچھ عرصے بعد اس کے مکینوں نے کروٹ بدلی تو اس کا اندرونی نقشہ بھی بدل گیا۔ فوجیوں اور شکاریوں کے بجائے ماہرینِ طبیعات اور کیمیا داں اس میں نظر آنے لگے چنانچہ ملک کے مشہور ماہرِ طبیعات کرشن ہوف اور کیمیا داں بن سن نے اسے عرصے تک اپنی تجربہ گاہ بنائے رکھا اور ان کی مشترک کوششوں سے سائنس کے بہت سے مسئلے حل ہوئے منجملہ اور تحقیقات کے طیفی تجزیہ کا انکشاف اسی جگہ ہوا یعنی یہ معلوم کیا گیا کہ انسان ایک روشن چیز کو بہت دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد جب آنکھیں بند کر لے تو دماغ کے پردوں پر اسی چیز کا ایک روشن عکس کچھ دیر تک اپنی جھلک کیوں دکھاتا ہے۔

لیکن عمارت کے اس مصرف کو ایک زمانہ گزر گیا۔ آجکل تو اس میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی کا وہ شعبہ قائم ہے جو علم طبقات الارض کی وساطت سے انسانی نسلوں کے حقائق کا کھوج لگاتا ہے۔ چنانچہ اس شعبے کے عجائب گھر میں دوسرے نوادر کے ساتھ ساتھ نچلے جبڑے کی وہ ہڈی بھی رکھی ہے جو پانچ لاکھ سال پہلے کے کسی انسان کی بتائی جاتی ہے۔ (دروغ بر گردنِ راوی)

اس عجائب گھر میں اور بھی بعض ایسی چیزیں مغتنم سمجھ کر رکھ لی گئی ہیں جو بظاہر محیر العقل تو نہیں کہی جا سکتیں لیکن ان کے حالات اور تحقیقات کے نتائج معلوم کر کے ضرور حیرت ہوتی ہے۔

اور عام لوگوں کے خیال میں تو وہ باتیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی اپنی عقیدت بھی اس باب میں متزلزل ہو کر رہ جاتی ہے۔

اب انسانی جبڑے کی اس ہڈی ہی کو لیجیے۔ آج ماہرین نے اس کی مدت پانچ لاکھ سال مقرر کی ہے۔ کل ایک اور ماہر، جیسا کہ اس سے پہلے بھی کئی چیزوں کے بارے میں ہوتا رہا ہے، اس کے بارے میں چار لاکھ سال پرانی ہونے کا دعویٰ کریں گے۔ گویا چند سال کی تحقیقات اس کی قدامت میں محض ایک لاکھ سال کا تفاوت پیدا کر دے گی جو سائنس دانوں کے نزدیک ایک ایسی اکائی ہے جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زیادہ عمیق النظری سے جائزہ لینے والے کوئی اور ماہر حکم لگا دیں۔ کہ یہ سرے سے کسی انسان کے جبڑے کی ہڈی ہی نہیں ہے۔ زائرین میں سے کوئی بھی ان ماہرین کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیونکہ بگاڑے جانے کے لیے ان کے پاس اس قسم کے انکشافات کے سوا ہوتا بھی کیا ہے۔

دراصل ایسے محققین ان فلسفیوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "فلسفی وہ نابینا انسان ہے جو اندھیری رات میں کسی تاریک کمرے کے اندر ایک ایسی سیاہ بلی کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے جو وہاں موجود نہیں ہوتی۔"

اس عجائب گھر میں آسمان سے ٹوٹنے والے ستاروں کے ٹکڑے بھی دلچسپ تفصیلات کے ساتھ رکھے گئے ہیں۔ یہ شے ہم نے کلکتہ کے عجائب گھر میں بھی دیکھی تھی اور تعجب ہوا تھا۔ یہ ٹکڑے ایک چھٹانک سے لے کر دس من تک کے ہیں لیکن دس من کا ٹکڑا بھی اپنی جسامت کے لحاظ سے بہت ہی مختصر معلوم ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان ٹکڑوں کی مادی ساخت ایسے اجزا سے مرکب ہوتی ہے جو کرۂ ارض پر پائی جانے والی سب سے بھاری دھات سے بھی بازی لے جا سکتی ہے۔

**گرم حمام:** ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر آگے بڑھ گئے اور کچھ دیر بعد ایک ایسے حمام کے پاس سے گزرے جس میں ریڈیم کے اثرات رکھنے والا نمکین پانی کسی گرم چشمے سے لایا جاتا ہے۔ لیکن تاریخی یا طبی اعتبار سے اس کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے بھی وہاں ٹھیرنا مناسب نہیں سمجھا۔ صرف ایک نظر میں یہ دیکھ سکے کہ بہت سے نیم برہنہ انسان (بلا تخصیص جنس) جو غالباً عمارت کے اندر غسل کر آئے تھے، باہر کے

سبزہ زار پر ہلکی دھوپ میں اینڈھ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی ان کے علاج معالجے کا جزو ہو۔ ان کی آپس کی چہلیں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ "بچارے" خاصے تندرست تھے۔

ہم دریائے نکر کے اس تیسرے پل کو جو کل شام قلعہ دیکھتے وقت پہاڑی کی چوٹی پر سے نظر آیا تھا، عبور کر کے ایسے علاقے میں پہنچ گئے جیسے شہر کے ہنگاموں سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یہاں لوگوں کی آمدورفت اور عام چہل پہل ایک دم مفقود ہو گئی۔ یہاں زندگی کے تار بہت ہی ہلکے ساز پر زمزمہ پیما تھے۔

**شفاخانہ جراحی:** سب سے پہلے ہم عمل جراحی کے ایک شفاخانے میں داخل ہوئے۔ یہاں صرف ایسے مریض ہوتے ہیں جن کے جسم کے کسی نہ کسی حصے کا آپریشن تجویز کیا گیا ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام اور اسپتالوں میں بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں صرف وہی کیس آتے ہیں جو زیادہ پیچیدہ ہوں۔ یہاں کے سرجن اندرونی چیر پھاڑ کے بھی خاص ماہر ہیں۔

ملاقات اور شفاخانے میں دورے کا وقت پہلے سے طے ہو جانے کے باعث ایک خاتون ہماری منتظر تھیں۔ ہم ذرا دیر سے پہنچے تھے کیونکہ راستے میں خاصا وقت صرف ہو گیا تھا، ہمیں اس تاخیر کا احساس تھا۔ لہٰذا میں نے اور بھائی جان محترم نے گھڑی کی طرف اشارہ کر کے محض اشاروں میں اور محبوب نے الفاظ کے ذریعہ معذرت چاہی۔ ہمیں خندہ پیشانی سے غالباً معاف کر دیا گیا۔ جو جملہ نازک لبوں سے ادا ہوا، اس کی کرختگی کو ہم دونوں بھائی اور معنی و مفہوم کو صرف محبوب سمجھ سکے تھے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ہمارے لباس اور وضع قطع کو، جو ان کے لیے بالکل ہی انوکھی چیز تھی، دیکھ کر وہ اس درجہ متاثر ہوئی تھیں کہ تاخیر کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔

میں نے انگریزی میں ان کا نام اور شفاخانے میں ان کا منصب دریافت کیا اور مجھے اطمینان ہوا کہ انھوں نے جواب انگریزی ہی میں دیا۔ اپنی رائے یہ ہے کہ اگر مترجم کے درمیانی وسیلے کے بغیر غیر ملکیوں سے براہِ راست بات چیت کی جائے تو زیادہ لطف آتا ہے اور ملاقات کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔

ان کا نام ــــــــ میں یہ تو ہرگز نہیں کہوں گا کہ ع "زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا" کیونکہ تین دفعہ سننے کے بعد بھی میں اس کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکا۔ پہلی بار کوشش کی تو تین بار ہکلانا پڑا تھا۔ میں نے ان کی آنکھوں کی رعایت سے ان کا نام مس نرگس

رکھ دیا۔ ہم نے لفظ "فرولین" کے استعمال سے سمجھ لیا تھا کہ یہ ناکتخدا یعنی مس صاحبہ ہیں۔ حرف "فرو" شادی شدہ عورت کے لیے بطور مسنز اور لفظ "ہر" مرد کے لیے بمعنی مسٹر بولا جاتا ہے۔ جیسے ہٹلر کو ہر ہٹلر کہا جاتا تھا۔ انہوں نے اس لفظ کی وضاحت چاہی اور جب میں نے مطلب بیان کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور اس طرح ایک اور قسم کے غیر مرئی پھول برآمدے میں بکھر گئے۔ اس وقت تک وہ ہمیں ساتھ لے کر ایک وارڈ دکھانے چل پڑی تھیں۔

وہ شفاخانے کی انچارج نہیں، معاون تھیں لیکن زائرین کو ہمراہ لے کر شفاخانہ دکھانا انہی کے فرائض میں داخل تھا۔ سب سے پہلے وارڈ میں متفرق امراض میں مبتلا بچے رکھے گئے تھے۔ ان کے جسم پر مختلف حصوں پر کپڑے کی پٹیاں، پلاسٹر کی پٹیاں یا پلاسٹر کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں لیکن اس صفائی اور احتیاط کے ساتھ ہر ایک کی بندش کی گئی تھی کہ کوئی بچہ چیختا چلاتا یا بسورتا تک نظر نہیں آتا تھا۔ زیادہ تعداد ایسے بچوں کی تھی جو مرض کساح میں مبتلا تھے۔ مس نرگس نے بتایا کہ یہاں آبی طریقۂ علاج بھی روا رکھا جاتا ہے۔ نیز ہڈیوں کو نرم کرنے اور صحیح شکل میں لانے کے لیے مالش بھی کی جاتی ہے۔ اور اگر یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہو تو عملِ جراحی کیا جاتا ہے۔ میں نے گرم پانی سے دھارنے اور مختلف روغنوں کی مالش کے طریقے دیکھ کر مس نرگس سے کہا کہ یہ کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ آج سے ہزار سال پہلے اسلامی ممالک میں ان کا رواج عام تھا، اور اس قسم کی شکایات جراحی کے بغیر رفع کر لی جاتی تھیں۔

اس وارڈ کے ایک بغلی کمرے میں حوض ہے جس میں معدنی چشمے کا پانی ایک پہلو میں لگے ہوئے نل کے ذریعہ ہر وقت گرتا اور دوسری طرف نکلتا رہتا ہے۔ حوض کی گہرائی زیادہ نہیں تھی اور فرش کی سطح بھی ڈھلوان تھی، اس لیے ایک طرف بعض بچے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور دوسری طرف پانی میں کھڑے ایک دوسرے پر چھینٹے مار رہے تھے۔ حوض کے چاروں طرف کے علاوہ بیچ میں بھی الگنی کی طرح ایک موٹا تار بندھا ہوا تھا جسے پکڑ کر بچے خود چلنے پھرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ البتہ جو بالکل معذور تھے، ان کی مدد کے لیے دو نرسیں موجود تھیں۔ مالش کے تیل کا معائنہ کر کے ہم نے محسوس کیا کہ روغنِ زیتون میں کچھ ایسے اجزا شامل کیے گئے ہیں جو آسانی اور تیزی کے ساتھ جلد میں پیوست ہو کر جسم میں

نفوذ کر جاتے ہیں۔ یعنی مشرقی طب اور طریقۂ علاج سے انہوں نے کافی استفادہ کیا ہے۔

اگلا وارڈ صرف عورتوں کا تھا۔ ان میں کئی عورتیں بریسٹ کینسر (چھاتی کے سرطان) میں مبتلا تھیں۔ اس مرض کا سب سے زیادہ کامیاب علاج یہ ہے کہ چھاتی کو جسم سے بالکل جدا کر دیا جائے۔ وہاں ایسے مریض کے آتے ہی یہ طریقۂ عمل میں لایا جاتا ہے۔ نسوانی امراض میں مبتلا ایسی عورتیں بھی تھیں جن کا علاج عملِ جرّاحی سے کیا جا رہا تھا لیکن ایک اچھی تعداد ان عورتوں کی تھی جن پر تقلیمِ زائدہ کا عمل ہوا تھا۔ مغربی دنیا میں اپینڈے سائٹس کی شکایات میں مبتلا ہو جانے کا احساس اتنا عام ہوا ہے کہ اگر معمولی دردِ قولنج بھی لاحق ہو تو اسی مرض کی تشخیص کر کے آنت کا وہ ٹکڑا کاٹ دیا جاتا ہے جسے قدرت کے رموز کو نہ جاننے والے سرجن زائد از ضرورت سمجھتے اور اسی لیے کاٹ کر نکال باہر کرتے ہیں۔ مردوں کے وارڈ میں بھی ایسے مریضوں کی تعداد خاصی تھی۔

میں نے مس نرگس سے کہا کہ اگر ہمارے لیے اپنی مدت قیام کو بڑھانا ذرا بھی ممکن ہوتا تو ہم اس قسم کے کسی تازہ مریض کو اپنی دواؤں سے تندرست کر کے دکھا دیتے اور اس کا پیٹ چاک کرنے اور آنت کاٹنے کی نوبت نہ آتی۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ مغربی دنیا کے افراد نے جس طرح معاشرتی زندگی میں بے حد تصنع اور بناوٹ سے کام لینا شروع کر دیا ہے اسی طرح علاج معالجے کے باب میں بھی وہ قدرتی اصولوں سے دور ہٹ گئے ہیں بلکہ نوامیس قدرت کو اپنے طابع فرمان کر لینا چاہتے ہیں۔ میرے ذہن نے ان خیالات کو جنم دیا لیکن میں ان کا اظہار ان سے نہ کر سکا۔ کہنے کو اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ میں یہ کہہ کر بھی ان کی معلومات میں اضافہ کر سکتا تھا کہ جو آلاتِ جراحی ان کے ہاں استعمال ہو رہے ہیں ان میں سے بیشتر اپنی وضع قطع کے اعتبار سے کئی صدی پہلے ایجاد ہوئے تھے اور ان کا موجد ایک مسلمان عرب زہراوی تھا۔

ہم نے اور کئی وارڈ دیکھے اور بہت سے مریضوں کا سرسری معائنہ کیا، وہاں کی نفاست اور عام نظم و نسق کا جائزہ لیا اور اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس اسپتال کو ایک معیاری حیثیت دی جا سکتی ہے۔

ہم نے مس نرگس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت چاہی۔ انہوں نے وزیٹر بک میں ہمارے پتے اور نام لکھوا لیے۔ میں نے چلتے ہوئے کہا کہ ہمدرد جب بھی کوئی بڑا اسپتال

قائم کرے گا، اُسے آپ جیسی منتظمہ کی ضرورت پڑے گی۔ وہ ہماری اس قدر شناسی سے بہت مسرور ہوئیں۔

**باغِ نباتات:** ہم ذرا آگے بڑھے تو باغِ نباتات اور باغِ حیوانات تھے۔ ہم نے صرف اوّل الذکر کو دیکھ لینے پر اکتفا کی اور اسے بھی دیکھ کر زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ ہمارا خیال تھا کہ اس میں جنیوا کے باغِ نباتات کی طرح پودوں کے نشوونما اور تحقیقات کے لیے نرسریاں ہوں گی، اور مطالعہ کے لیے کوئی نباتاتی لائبریری بھی موجود ہوگی۔ لیکن ہمیں مایوسی ہوئی۔ اس باغ کی حیثیت محض تفریحی تھی۔ خوب صورت بیلوں، جھاڑیوں، پودوں اور قدآور درختوں سے ہر گوشے کو اس طرح سجایا گیا تھا کہ وہاں گھنٹوں بیٹھے رہنے کو ہر شخص کا جی چاہتا ہوگا۔ اس باغ اور دوسرے باغات میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں بہت سے ایسے پودے وغیرہ نظر آتے ہیں جو دوسری جگہ نہیں ہوتے۔ لیکن علمی مقصد پورا نہ کر سکنے کے باعث اسے صحیح معنوں میں باغِ نباتات نہیں کہا جا سکتا۔

**تیرنے کے حوض:** کچھ آگے بڑھ کر کھلی فضا میں تیرنے کے حوض ہیں۔ انھیں بھی دُور سے ایک نظر دیکھ لینا ہم نے کافی سمجھا کیونکہ وہاں چوپاٹیوں کی قسم کا میلہ لگا ہوا تھا۔ مرد اور عورتیں تقریباً برہنہ حالت میں غسلِ آبی اور غسلِ شمسی میں مصروف تھیں۔ یہ عیش تو دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں کے کنارے بھی میسّر آسکتے ہیں۔ پھر طویل و عریض پکے حوض بنوا کر جو یہ اہتمام کیا گیا تو آخر کیوں؟ ان حوضوں کو کسی معدنی چشمے کے نمکین پانی سے نہیں بلکہ میٹھے پانی سے لبریز کیا جاتا ہے۔

**یونیورسٹی میں:** ان اُکتا دینے والے نظاروں سے بہت جلد منھ موڑ کر ہم نے ہوٹل واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ہوٹل تک پہنچنے سے پہلے تھوڑے فاصلے پر میاں محبوب نے ٹیکسی رکوائی اور ایک عظیم الشّان عمارت کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "یہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی ہے اور جرمنی کی قدیم ترین درسگاہ کی آئینہ دار ہے۔ اگر ہم اس شہر کی قدیم عمارتوں کے بارے میں سوچیں تو سب سے پہلے شاہی قلعہ جسے ہم نے کل دیکھا تھا اور پھر یونیورسٹی کی عمارت ہمارے تصورات کی دنیا میں ابھرے گی۔ جاتے وقت جب ہم یہاں سے گزرے تو صدر دروازہ بند تھا، اب کھلا ہوا ہے۔ غالباً دفتر کے لوگ موجود ہوں گے، کیونکہ تعلیمی اعتبار سے تعطیلات ہیں۔ جولائی کے آخر

میں سب مدرسے، کالج اور یونیورسٹی کی کلاسیں بند ہوجاتی ہیں اور پھر نومبر میں پڑھائی شروع ہوتی ہے۔ لگے ہاتھوں اس کا ایک چکر لگا لینا چاہیئے۔ اس کے بعد شاید اتنا موقع بھی نہ ملے،،۔

ہم نے اُن کی رائے سے اتفاق کیا اور یونیورسٹی کی عمارت میں داخل ہوگئے جو ہوپٹ اسٹراس پر گرابن گاسے کے مقام پر واقع ہے اور محض یونیورسٹی کی وجہ سے سارا علاقہ بے حد مشہور ہے۔

ایک وسیع کمرے میں صرف تین افراد دفتری کام میں مشغول تھے۔ خالی میزوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ تعلیم کے دنوں میں عملے کے زیادہ لوگ کام کرتے ہوں گے۔ انہوں نے ہماری طرف توجہ نہیں دی اور ہم نے بھی اندر گھس کر خواہ مخواہ ان کے کام میں مخل ہونا گوارا نہ کیا۔ ان کی بجائے لیکچرار یا پروفیسر موجود ہوتے تو ان سے کام کی باتیں کی جاتیں۔

ہم نے تمام برآمدوں میں گھوم پھر کر عمارت کی وسعت کا اندازہ لگا لیا۔ شیشوں میں سے تاک جھانک کر جو عجائب گھر کے دروازوں میں لگے ہوئے شیشوں کے برعکس شفاف تھے، لائبریری اور سائنسی تجربات کے کمروں کا نظارہ بھی کر لیا۔ اس اثنا میں میاں محبوب نے ہم سے کہے بغیر دفتر میں جاکر یونیورسٹی کے بارے میں کچھ مطبوعہ مواد جمع کر لیا۔ دریافت کرنے پر انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ کمروں کی چابیاں جن بزرگ کے سپرد ہیں، وہ بھی طلباء کے ساتھ چھٹی منا رہے ہیں۔ اگر وہ موجود ہوتے تو شاید لائبریری اور دوسرے کمروں کے کھولے جانے کی صورت پیدا ہو جاتی اور ہمیں مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

ہائیڈل برگ یونیورسٹی ایک لحاظ سے جرمنی میں قدیم ترین ہے کیونکہ اس کی عمارت کی بنیاد ۱۳۸۶ء میں پڑی تھی جس کا نام ریوپرٹا کیرولا تھا۔ پرانی بنیادوں پر اب نئی عمارت کھڑی ہے اور اس میں بہت کچھ اضافہ ہو چکا ہے۔

البتہ قدیم طرزِ تعمیر کو قائم رکھنے کے لیے تھوڑا سا حصہ بجنسہٖ برقرار رکھا گیا ہے تاکہ دیکھنے والوں کو اندازہ ہو سکے کہ اصل عمارت نہ گوتھک انداز میں تھی، نہ رومانیک طرز میں، بلکہ اس کا اسٹائل باروقی تھا۔ ایڈم برونگ اس زمانے میں اس کے معمار اعلیٰ تھے جن کے نام کی تختی اب تک لگی ہوئی ہے، لیکن کتبے یا کسی اور تحریر سے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ

چودھویں صدی کے آخر سے اس بیسویں صدی کے نصف اوّل تک اس یونیورسٹی میں کس قسم کی تعلیم رائج رہی اور اس کا طرز اور معیار کیا تھا۔ ممکن ہے لائبریری میں کوئی ریکارڈ اس موضوع پر مل سکے۔ البتہ عمارت کے ایک چھوٹے سے حصے کا نام "کارنسر" تھا۔ جسے طلباء کا جیل خانہ کہنا چاہیئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں طلباء کی حیثیت کیا ہوتی تھی اور اُن سے کس قسم کا برتاؤ روا رکھا جاتا ہوگا۔ اگر ان سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا تو تعلیم گاہ کے سربراہ خود ہی بیانات سن کر اور شہادتیں لے کر فیصلہ کرتے اور سزا دینے کا اختیار رکھتے تھے۔

۱۹۳۰ء میں یونیورسٹی نے نیا چولا بدلا۔ پُرانی عمارت کو جدید وضع پر بنایا سنوارا گیا اور گنجائش کئی گنا زیادہ ہو گئی۔ اس کایا پلٹ کا سہرا جیکب گلڈ شرمن کے سر ہے جو اس زمانے میں ریاست ہائے متحدہ کے سفیر کی حیثیت سے جرمنی میں متعین تھے۔ چنانچہ ان کے نام پر شہر کی ایک بڑی سڑک کا نام شرمن اسٹراس رکھا گیا جو اب بھی اسی نام سے موسوم ہوتی ہے۔ کل شام ہم اس راہ سے گزرتے وقت بسمارک کی یادگار عمارت پر پہنچے تھے۔

شروع میں شاید چند درجن طلبا اس میں زانوئے ادب تہ کرتے ہوں گے اور اب بقول میاں محبوب مختلف مضامین پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد کئی ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ نئی عمارت کے کشادہ صحن میں ایک پُرانی وضع کا مینار دیکھا جو عہد وسطیٰ کے ہائیڈل برگ کی شہر پناہ کا ایک حصہ تھا اور عام طور پر جادوگرنیوں کا مینار کہلاتا تھا۔ اسے وہاں سے لاکر یہاں کھڑا کر دیا گیا ہے اور اب طلباء کی یادگار سمجھا جاتا ہے جو لڑائی میں کام آ گئے تھے۔

**باروقی طرز تعمیر:** جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، یونیورسٹی کی قدیم عمارت باروقی طرز پر بنائی گئی تھی۔ اس فنِ تعمیر کے بارے میں اربابِ فن کی رائیں مختلف ہیں اور ان سب کو مدِ نظر رکھ کر اس طرز کا صحیح نقشہ سامنے نہیں آتا۔ مثلاً ایک خیال یہ ہے کہ اس قسم کی عمارتوں کا بے ڈول اور بے ڈھنگا ہونا ان کی خصوصیت سمجھا جاتا تھا اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ لفظ باروق ہسپانوی زبان کے ایک لفظ بروّایکو سے بنا ہے جو ایک بڑے بے قاعدہ وضع کے موتی کو کہتے ہیں لیکن اس طرز کی عمارتوں

پر نظر ڈالنے سے اس خیال کی تکذیب ہو جاتی ہے اور یہ رائے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ایسی شاندار عمارتوں کو جن کی چھتیں بہت زیادہ اونچی، جن کی محرابیں بہت زیادہ چوڑی اور جن کے دروازے بہت زیادہ وسیع ہوتے تھے اور جن میں بحیثیتِ مجموعی ایک شاہانہ تمکنت پائی جاتی تھی، ان کو باروقی انداز پر بنا ہوا کہا جاتا تھا۔ اس قسم کی عمارتوں میں کھڑکیاں بھی اور طرز کی عمارتوں کے دروازوں کے برابر ہوتی تھیں۔ ستون ہمیشہ گول اور بہت ہی پُر رعب ہوتے تھے۔ تعمیر کے بہت سے دوسرے طریقوں کی طرح اس انداز کی ابتدا بھی روم سے ہوئی لیکن کافی عرصہ بعد یورپ کے دوسرے ملکوں میں اس کو فروغ نصیب ہوا تھا۔

**عوامی تعلیم:** دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح جرمنی میں بھی تعلیم کی ابتدا روایتی انداز میں ہوئی۔ یعنی اعلا پایہ کے معلمین نے اپنی ساری عمر میں اپنے معیار کے مطابق گنتی کے چند طالب علموں کو فارغ التحصیل کیا اور اسے حاصل زندگی سمجھ لیا۔ اسی لیے تعلیم کو فروغ عام ایک زمانہ تک نصیب نہ ہو سکا۔ ہندوستان کی طرح کہ علم حاصل کرنا اور خاص طور پر مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنا صرف پنڈتوں تک محدود تھا۔ ان کے سوا کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس منزل میں قدم رکھتا۔ کیونکہ یہ "جرم" قابلِ گردن زدنی قرار دے دیا گیا تھا۔ اسی طرح جرمنی میں بھی صرف آریائی نسل کے اور وہ بھی اعلا مرتبے کے لوگ تعلیم پا سکتے تھے۔ لہٰذا وہاں بھی زمانۂ جاہلیت کی رسی کافی دراز رہی اور باقاعدہ عوامی تعلیم کا آغاز اٹھارھویں صدی سے پہلے ممکن نہ ہو سکا، اور اس صدی میں بھی تعلیمی ترقی کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

جس طرح ہمارے برصغیر میں مسلمان بچوں کی تعلیم کی ابتدا مسجد کے دالان سے اور پنڈتوں کی اولاد کا تعلیمی آغاز پاٹھ شالہ کے کھلے میدان سے ہوتا تھا، اسی طرح جرمنی میں یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح کلیسا کے ایوان یہ منزل طے کرانے کے لیے وقف ہوتے تھے۔ ان سب مقامات پر مدرسین کا مبلغ علم دینی تعلیم سے آگے بڑھنے نہیں پاتا تھا۔ کسی نے اپنی ذاتی کاوش یا ذوق و شوق کے باعث یا حصولِ منفعت کی طمع میں اور میدانوں میں گھوڑے دوڑا دیے تو ان کو محض استثنائی درجہ دیا جا سکتا تھا لہٰذا اس زمانے میں اچھے پڑھے لکھوں کی تعداد اگر ایک فی ہزار بھی کہیں محسوب ہو جائے

تولسے قابل ستائش کہا جاسکے گا۔

جرمنی میں باقاعدہ عوامی تعلیم کی ابتدا تو اٹھارھویں صدی میں ہوگئی تھی لیکن سب سے پہلی معیاری یونیورسٹی ۱۸۰۹ء سے پہلے قائم نہ ہوسکی۔ اس کی تاسیس کا سہرا شاہ فریڈرک ولہلم کے سر تھا مگر افسوس ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب سارے ملک کے ساتھ ساتھ اس کے صدر مقام برلن کے بھی ٹکڑے ہوئے تو اس یونیورسٹی والا علاقہ مشرقی برلن میں ہونے کے باعث روس کے زیر اقتدار چلا گیا اور بڑی حد تک اس کے دروازے اہل جرمنی کے لیے بند ہوگئے۔

تیزی سے فروغ تعلیم کی ابتدا ۱۹۲۰ء سے ہوئی جبکہ پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد تقاضائے وقت کے تحت حکومتِ وقت نے اسے ضروری سمجھا اور ۶ سے ۱۸ سال تک کے بچوں کے لیے بلا تخصیصِ جنس جبریہ تعلیم پانا قانون کا جزو قرار دے دیا گیا۔ اس بارہ سال کی مدت میں کم سے کم آٹھویں درجہ تک نصابی تعلیم پانا سب کے لیے لازمی قرار پایا۔

لازمی تعلیم شروع ہونے سے قبل مدرسے کنڈرگارٹن یعنی بچوں کے باغات کہلاتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ یہ نام ان اداروں کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں باغات سے بھی زیادہ سہولتیں اور اپنے گھروں سے زیادہ آسائشیں میسر آتی ہیں اور بچے ان میں داخل ہونے کے بعد وہاں سے نکلنا نہیں چاہتے۔ اگرچہ جرمنی کے انداز پر ہی کنڈرگارٹن کے نام سے کم سن بچوں کی تعلیم کے ادارے ساری دنیا میں رواج پا گئے ہیں لیکن "مالوی مدن" کی سی بات کہیں پیدا نہیں ہوسکی ہے۔

آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد پیشہ ورانہ تعلیم لازمی لیکن پیشے کا انتخاب رضاکارانہ تھا۔ چنانچہ بہت جلد ملک کے ۸۰ فیصد بچے مدرسوں میں نظر آنے لگے۔ البتہ حکومت نے تعلیم کو لازمی قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح نظام اور جملہ سہولتوں کا خاطر خواہ خیال رکھا۔ یعنی ہمارے ملک کی طرح شترِ تعلیم کو بے مہار نہیں چھوڑا گیا۔ تعلیم لازمی ہونے کے باعث جرمنی میں ابتدائی مدرسے فولکس شول یعنی عوامی مدرسے کہلاتے ہیں اور کاروبار یا ہنر سکھانے والے مدرسوں کو بیرفس فاخ شولن کہتے ہیں۔

یہ دَور ختم ہونے کے بعد طلباء کو اپنی مرضی، ذوق، ضرورت، استعداد اور استطاعت کے مطابق آگے قدم بڑھانے کا موقع ملتا ہے۔ ہائی اسکول کو جرمنی میں جمنازیم کہتے ہیں یہ وہی لفظ ہے جسے انگریزی زبان میں جمنازیم یعنی جمناسٹک یا کھیل کود کی جگہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ شروع ہی سے تعلیم اور کھیل کود کو بڑی اسلوبی کے ساتھ سمویا گیا ہے اس لیے یہ تصور آگے چل کر بھی قائم رہتا ہے اور اس کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ بالعموم کسی بھی طالب علم کو انیس سال کی عمر سے قبل ہائی اسکول کے امتحان میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ماہرین تعلیمات کا خیال ہے کہ اس سے کم عمر میں زیادہ تعلیمی بار پڑنے سے بچے کا فطری رجحان مجروح ہو سکتا ہے۔ محض مخصوص صورتوں میں جبکہ کسی ذہین و فطین طالب علم کے لیے خود اساتذہ کی سفارش ہو تو اس قاعدے سے انھیں مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کی غیر معمولی ذہانت کو زنگ نہ لگنے پائے۔

ہائی اسکول میں کم سے کم ایک غیر ملکی زبان سیکھنی بھی لازمی ہوتی ہے۔ عموماً لاطینی کو ترجیح دی جاتی ہے تاکہ اس زبان کے بیش بہا علمی و ادبی سرمائے سے خاطر خواہ استفادہ کیا جا سکے۔ اس زمانے میں کسی فنِ لطیف کی تعلیم بھی جزوِ نصاب ہوتی ہے جس کا عملی اکتساب آگے چل کر ممکن ہوتا ہے۔ کوئی سائنسی موضوع تیسرا لازمی مضمون ہوتا ہے۔ ہائی اسکول کو انجنیر کی درمیانی کڑی کے طور پر میٹ لے رہے کہتے ہیں جسے ہمارے معیار کے مطابق انٹرمیڈیٹ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کے بعد ہی یونیورسٹی کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔ ہائی اسکول کے آخری امتحان کو رائے فے پروفونگ کہتے ہیں۔ اسے پاس کرنے کے بعد شائقین کا اصل علم شروع ہوتا اور انھیں اپنے مستقبل کا صحیح راستہ معین کرنا پڑتا ہے۔

ابتدائی مدرسوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم عموماً ایک ساتھ ہوتی ہے لیکن اگر ان کی تعداد زیادہ ہو تو ہی وقت سے ان کو الگ الگ رکھا جاتا ہے۔ ہائی اسکولوں میں اور پیشہ ورانہ تعلیم کے مدرسوں میں بھی جنسی امتیاز کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی میں یہ پابندی پھر ختم کر دی جاتی ہے۔

مذہبی تعلیم کا بھی برابر خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر طلباء کی تعداد کم ہو تو سب عقیدوں کے ماننے والے ایک ساتھ مدرسے میں داخل ہوتے ہیں لیکن اپنی مذہبی تعلیم الگ پاتے ہیں البتہ بڑے شہروں میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عقائد رکھنے والوں کے مدرسے بھی

الگ ہوتے ہیں، تاہم مذہبی اختلاف اب بہت کم سبب نزاع بنتا ہے۔ شاید جنگ کی ہولناکی نے زیادہ رواداری پیدا کر دی ہے۔

ابتدائی مدرسوں میں چونکہ تعلیم لازمی ہے، اس لیے فیس اور کتابوں کی خریداری کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ حکومت نے ان دونوں ذمہ داریوں کو اپنا فرض سمجھ لیا ہے۔ اگلے درجوں میں بھی اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی طالب علم محض تعلیمی اخراجات برداشت نہ کر سکنے کے باعث اس "زیور" سے محروم رہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے مدرسوں میں بھی کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا، کیونکہ اسے قومی ترقی کی منزل میں رگِ جاں سمجھ کر نوازا جاتا ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ اس ملک میں تعلیم کو انسان کا ایک بنیادی حق مان لیا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں اعلا درجوں میں بھی نشستیں مخصوص یا محفوظ نہیں ہوتیں۔ مدرسوں میں داخلے کا مسئلہ ہمارے ملک میں اتنا شدید ہو گیا ہے کہ اسے امتحان دینے اور اس میں کامیاب ہونے سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ سرکاری میزانیہ میں تعلیم کے لیے جتنا روپیہ محسوب کیا جاتا ہے؛ جرمنی میں اس کا شمار دفاعی اخراجات کے بعد بڑی رقموں میں ہوتا ہے۔

جنگ عظیم میں جہاں اور بہت سی عمارتیں تباہ ہوئیں، تعلیمی ادارے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ تاہم امن و عافیت کی فضا قائم ہونے کے بعد سے ۲۴ ہزار نئے مدرسے تعمیر ہوتے ہیں۔ ان کے بعد بھی ۱۲ ہزار مدرسوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور ضرورت کا مسئلہ برابر بڑھتا رہا ہے کیونکہ ترکِ وطن کر کے ملک میں داخل ہونے والوں کا سلسلہ کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ لیکن غیر متوقع حالات پر قابو پانے کی وہی تدبیر اختیار کی گئی ہے جو اور ملکوں میں بھی عمل میں آ رہی ہے یعنی ہر مدرسے میں دو دو شفٹ ہوتے ہیں۔ گویا تعلیم بھی ایک صنعت بن کر رہ گئی ہے لیکن اس کے سوا چارۂ کار بھی کیا ہے۔

**تعلیم اساتذہ:** تعلیم کو لازمی قرار دینے سے پہلے حکومت نے اُستادوں کی تربیت کا مسئلہ پہلے حل کر لیا تھا۔ یعنی اس وقت استادوں کی تربیت کے خاص اصول مرتب کر لئے گئے تھے اور ان پر سختی سے عمل کیا گیا تھا، جس طرح حالاتِ جنگ میں فوجوں کے لیے جبریہ بھرتی ہوتی ہے، اسی طرح استادوں کے دستے تیار کئے گئے تھے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور برابر جاری رہنے والی ضرورت کے ماتحت جاری ہی رہے گا۔

تعلیم کے اس بنیادی مقصد کے پیش نظر کہ طلبا محض امتحان میں کامیابی ہی کو معراج

نہ سمجھیں بلکہ صحیح معنوں میں علم دوستی کا جذبہ کارفرما رہے ان کے لیے ایسے مواقع پیدا کیے جاتے ہیں کہ وہ اپنے مطالعہ کا دائرہ کتب نصاب تک محدود رکھیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ اور طلباء کے والدین کی مشترک ایجنسیں قائم ہیں جن کے ذریعہ والدین یا سرپرست ہر بچے کی تعلیمی ترقی اور افتاد طبع سے برابر باخبر ہوتے رہتے ہیں اور طلبا کو اس بات کا احساس ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کسی تعلیمی ادارے میں ارباب نظم ونسق کے خلاف طلبا کا احتجاج کبھی سننے میں نہیں آیا۔ اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ہمارے ملک میں طلبا آئے دن اساتذہ کے خلاف محاذ بناتے اور ہڑتالیں کرتے رہتے ہیں۔ استاد محض روزگار قائم رکھنے کی غرض سے سلسلۂ تدریس جاری رکھتے ہیں اور شاگرد بزعم خود استاد کو اپنا ملازم سمجھتے ہوئے اپنا سکہ جمانا چاہتے ہیں۔ یقیناً ہمارے تعلیمی معیار کی ابتری کے ذمہ دار یہی خطرناک رجحانات ہیں۔

**تعلیم بالغان:** دوسری جنگ عظیم کے تقریباً ساڑھے پانچ سال کے دوران میں جہاں زندگی کے اور مرحلے ایک منزل پر آکر رک گئے تھے، تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ نہ صرف اساتذہ بلکہ طلبا بھی فوج میں بھرتی کر لیے گئے یا فوج سے متعلق کاموں میں مصروف ہو گئے۔ اسکولوں اور کالجوں کی عمارات تک میں فوجی دفاتر کھل گئے۔ درسی کتب کے بجائے فوجی داؤ پیچ کے مینوئل پڑھائے جانے لگے۔ تعلیمی زندگی سسکتی رہ گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اس عہد کے بہت سے بالغ جو اس وقت بچے تھے، ناخواندہ رہ گئے۔ انھوں نے مجبوراً وہ کام سیکھ لئے اور ایسے پیشے اختیار کر لیے جنھیں نہ ان کا ذوقِ سلیم گوارا کر سکتا تھا اور نہ خاندان کا وقار اس تغیر کا متحمل ہو سکتا تھا لیکن یہ سب کچھ مجبوراً ہوا۔ اور کڑوی دوا کی طرح آنکھیں بند کر کے نگل لینا پڑا۔

جب معاشرتی فلاح وبہبود کے کارکنوں کو ہوش آیا اور حکومت نے سنبھالا لیا تو تعلیم بالغاں کی طرف توجہ مبذول کی گئی۔ قوم کے ان افراد کو جو مجبوراً تعلیم سے محروم رہ گئے تھے، ان کی باقی عمر میں بھی جاہل رکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

بڑی عمر کے لوگوں کے لیے ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیپ اور ٹیپ ریکارڈر، تھیٹر اور سینما، سب سے اچھے ذرائع تعلیم بن سکتے ہیں۔ چنانچہ بڑے شہروں ہی میں نہیں، قصبات اور دیہات میں بھی ضلعی کونسلوں کے تعاون سے اس مہم کو شروع کیا گیا اور مختصر سی مدت میں اسے حیرت انگیز حد تک کامیاب دکھایا۔ چونکہ ایسے لوگ اپنے کام کاج میں لگے ہوئے تھے اور ذریعۂ معاش کو

ترک کر دینا ان میں سے اکثر کے لیے ممکن نہیں تھا، اس لیے شام کے فالتو اوقات اس مہم کو سر کرنے کے لیے مخصوص کیے گئے اور اسی لیے مقبولیت نصیب ہونے کے ساتھ ساتھ اسے کامیابی بھی جلدی ہوئی۔ ان افراد کے لیے جو ادارے قائم کیے گئے وہ درسگاہوں سے زیادہ کلب کی حیثیت رکھتے تھے، جہاں کھیلوں کے ذریعہ تعلیم دی جانے لگی تاکہ بالغ لوگ اس عہد میں تعلیم کی بے نمکی سے بے مزہ نہ ہوں اور ان کے لیے تعلیم و تربیت نے اوقات بھی ایسے رکھے گئے کہ وہ روزانہ کے معاشی لمحات ختم کرنے کے بعد آسانی سے کچھ فالتو وقت اس دوررس منصوبے کے لیے وقف کر دیا کریں۔ بالغوں کی تعلیم صرف ان ناخواندہ افراد ہی کے لیے نہیں بلکہ ملک کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے ضروری تھی۔ اس کے بغیر افق نظر وسیع نہیں ہو سکتا تھا۔

ملک کے ارباب اقتدار غیر ملکی تسلط کے باوجود یہ محسوس کر چکے تھے کہ مستقبل قریب کو سدھارنے کے لیے یہ بالغ افراد ہی بنیاد بن سکتے ہیں۔ بچوں کے بڑے ہونے تک زمانہ نہ جانے کتنی اور کیسی کروٹیں لے سکتا تھا چنانچہ حکومت نے صرف شہروں ہی میں نہیں، قصبات اور دیہات تک میں تعلیم بالغاں کے مرکزوں کا جال بچھا دیا۔ اب دس گیارہ سال کی مدت میں قدرتی طور پر ان کی ضرورت پہلی شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہو رہی اور شاید بہت جلد وہ جال سکڑتے سکڑتے بالکل ختم ہو جائے۔

**پبلک لائبریریاں**: تعلیم بالغان اور دوسرے افراد کی تعلیم کو پوری طرح فروغ دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جگہ جگہ سرکاری اور نجی کتب خانے قائم کیے جائیں تاکہ ہر عمر والوں کے لیے حسب ضرورت مزید سامان دلچسپی مہیا ہوتا رہے۔ ارباب تعلیمات نے لازم و ملزوم حیثیت رکھنے والی اس ضرورت کو نظرانداز نہیں کیا۔ چنانچہ جہاں بھی تعلیم بالغان کے مرکز قائم ہوئے لائبریریاں بھی کھولی گئیں لیکن ان کے نظم و نسق کو بالکل الگ اور آزاد رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزوں کے ختم ہوتے رہنے کے باوجود لائبریریاں گھٹتی نہیں، بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس وقت سارے ملک میں صرف اس قسم کی سات ہزار لائبریریوں میں مجموعی طور پر ستر لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ ان سب کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے ان کی ایک انجمن بنا دی گئی ہے جو ایک طرف ان کی ضروریات کا خیال رکھتی اور دوسری طرف عوام میں اُن کو مقبول بنائے رکھنے کی صورت پیدا کرتی ہے۔

ان سرکاری لائبریریوں کے علاوہ بہت سی لائبریریاں گرجا گھروں سے وابستہ ہیں۔ ان کا نظام الگ ہے اور ان میں کتابوں کے موضوعات بھی مختلف ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عوام اپنی

دیرینہ روایات سے قطعی بے بہرہ نہ رہی۔ نئے زمانہ کا رنگ ان پر اثر کرے بھی تو وہ اس درجہ حاوی نہ ہو کہ وہ جرمن قوم کی نسلی برتری کو بھول جائیں۔

ہٹلر اعظم کو مطعون کیا جاتا ہے کہ اس احساس کا بیج اس نے بویا تھا لیکن شاید یہ احساس اتنا قوی اور وقیع تھا کہ ہٹلر کے ختم ہو جانے اور اس لحاظ سے بھی اس کو برا کہنے کے باوجود اس کے ہم قوم اس احساس کو غیر شعوری طور پر اپنے دل و دماغ میں جگہ دیئے ہوئے ہیں۔

مذہبی لائبریریوں کی کئی قسمیں ہیں اور ان کے نظام جداگانہ ہیں۔ مثلاً کیتھولک عقیدہ رکھنے والوں کی لائبریریوں کی تعداد تین ہزار چار سو اور پروٹسٹنٹ فرقے والوں کی سات ہزار چھ سو ہے جن کی کتابوں کی مجموعی تعداد تریسٹھ لاکھ سے زیادہ ہے۔

ہر بڑے کارخانے اور تجارتی ادارے کے لیے اپنے ملازمین کی خاطر کتب خانے قائم کرنا لازمی قرار دے دیا ہے۔ انھیں یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے اپنے دائرۂ عمل کے مطابق کتابوں کا انتخاب کریں اور اگر چاہیں تو دوسرے کسی موضوع کو قریب نہ آنے دیں۔

لائبریریاں اسپتالوں اور جیل خانوں میں بھی قائم ہیں جن کے لیے ماہرین خصوصی ایسی کتابوں کا انتخاب کرتے ہیں جو صرف ذوقِ مطالعہ کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ نفسیاتی اعتبار سے بھی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اسپتالوں کے مریض انھیں پڑھ کر ذہنی طور پر اپنے دکھ درد میں کمی محسوس کرتے ہیں۔ اور جیل خانے میں عادی مجرم بھی ان کا مطالعہ کر کے اپنی بری عادتوں کو بدل دینے کی ضرورت پر غور کرتے ہیں۔ کاش، یہ انتظام ہمارے ملک کے اسپتالوں اور جیل خانوں میں بھی رواج پا جائے۔ محض اچھوں کو زیادہ اچھا بنانا ہی کوئی اچھی بات نہیں ہے بلکہ زیادہ اچھا یہ ہے کہ بروں کو سیدھے راستے پر لگایا جائے۔ یہ ہر معاشرہ کا فرض ہے جس کا احساس بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ گشتی کتب خانوں کا بھی اس ملک میں فقدان نہیں ہے۔ یہ ان دور افتادہ علاقوں ہی میں نہیں جہاں اقامتی کتب خانے کھولے نہیں جا سکتے بلکہ بڑے شہروں میں بھی مقبول ہیں۔ ان میں زیادہ تر ایسی کتابوں کا التزام رکھا جاتا ہے جو شروع سے آخر تک مصور رہتی ہیں اور ان کے مطالعہ میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ ان کو سرسری نظر سے بھی دیکھ لینے کے بعد انسان بہت کچھ سیکھ سکتا اور اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے۔

**طبی تعلیم:** تمام جرمنی میں طبی تعلیم کے اٹھارہ مدرسے ہیں۔ اگر ملک کی کل آبادی پر اوسط پھیلائی جائے تو ہر اٹھائیس لاکھ نہتر ہزار انسانوں کے لیے ایک مدرسہ قائم ہے۔ یہ تناسب بظاہر حیرت انگیز

معلوم ہوتا ہے لیکن اگر دنیا کے دوسرے ملکوں سے مقابلہ کیا جائے تو استعجاب کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ میں تقریباً ساڑھے انیس لاکھ کی آبادی کے لیے ایک طبی مدرسے کی اوسط پھیلتی ہے۔ روس میں جرمنی سے بھی زیادہ بڑھے ہوئے اعداد و شمار ہیں یعنی اکتیس لاکھ انسانوں کے لیے ایک مدرسہ ہے لیکن سوچا جائے تو اصل چیز معیار تعلیم ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جنگ سے پہلے کا تو ذکر ہی کیا، اب بھی جرمنی میں اس کا معیار مقابلۃً اور ملکوں سے اونچا ہے۔ اس کے علاوہ ہر مدرسے میں طلبا کی تعداد بھی ملحوظ رکھنی چاہیے اور یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ کتنے طلبا ہر سال فارغ التحصیل ہوتے ہیں نیز یہ کہ اس وقت معالجین کا تناسب کیا ہے۔ مثلاً جرمنی میں ایک معالج ۷۴۵ افراد کی، روس میں ۷۸۴ کی اور امریکہ میں ۷۵۰ کی دیکھ بھال کرسکتا ہے۔ اس لحاظ سے جرمنی کا درجہ باقی دونوں ملکوں سے اونچا ہے ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ریاست ہائے متحدہ میں ڈاکٹری کی سند چار سال کا طبی نصاب ختم کرنے کے بعد مل جاتی ہے۔ جرمنی میں ساڑھے پانچ سال لگتے ہیں۔ البتہ روس میں سارا کورس چھ سال میں ختم ہوتا ہے۔

جرمنی میں طالب علم کسی بھی طبی مدرسے میں تعلیم پاکر سند لئے اسے عملی تجربہ حاصل کرنے کے لیے دو سال تک کسی سرکاری اسپتال میں لازمی طور پر کام کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ ذاتی مطب کھولنے کا اجازت نامہ اس مدت کے بعد ہی ملتا ہے۔

طبی تعلیم کے ادارے سرکاری تحویل میں ہیں۔ ہر ضلع کی حکومت اس کا نظم و نسق قائم رکھتی اور اس کا خرچ اٹھاتی ہے۔ البتہ مرکزی نظام وزارتِ تعلیمات کے سپرد ہوتا ہے۔ پڑھائی نومبر سے فروری تک اور پھر مئی سے جولائی تک ہوتی ہے۔ باقی عرصے تعطیل رہتی ہے اسطرح سال کے پانچ مہینوں میں ہر طالب علم اگر چاہے تو یونیورسٹی سے ملحق ہسپتال میں حسب استعداد کام کرکے معاوضہ پاسکتا ہے۔ اس طرح اس کی لیاقت بڑھتی ہے اور وہ تجربہ بھی حاصل کرسکتا ہے۔

طبی مدرسے میں داخلے کے لیے لاطینی زبان کا جاننا ضروری ہے، اس لیے جن طلبا کے والدین اپنی اولاد کے لیے طب کو ذریعۂ معاش بنانا چاہتے ہیں، وہ شروع ہی سے ان کو لاطینی پڑھاتے ہیں۔ تاکہ داخلہ کے وقت مایوسی نہ ہو۔ پھر بھی یہ شرط رکاوٹ نہیں بنتی اگر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ کسی طالب علم کو غیر معمولی شغف ہے اور وہ اس کے مطالعہ کے لیے مُصر ہے تو محض اس غیر زبان سے ناواقفیت کی بنا پر اسے محروم نہیں رکھا جاتا۔ ایسی صورت میں اسے ساتھ ساتھ لاطینی بھی پڑھنی پڑتی ہے۔ باقی طبی مضامین وہی ہیں جو دُنیا کے اور ایسے مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔

چونکہ نصابِ تعلیم مرکز کی طرف سے طے کیا جاتا ہے، اس لیے اگر کوئی طالب علم دورانِ تعلیم میں اپنی درسگاہ بدلنی چاہے تو بدل سکتا ہے۔

فارغ التحصیل ہونے یا آخری امتحان پاس کر لینے کے بعد ہر طالب علم کو جو دو سال عملی طور پر گزارنے پڑتے ہیں، ان میں سے چھ مہینے عام امراض کے لیے، چار مہینے جراحی کے لیے اور چار مہینے خصوصی امراض نسواں کے لیے مقرر ہوتے ہیں اور باقی دس مہینے اسے کسی ایک بیماری کے لیے وقف کرنے ہوتے ہیں جس میں طالب علم اپنے آپ کو زیادہ مشاق کرنا چاہتا ہو۔ اس کا فیصلہ وہ خود چودہ ماہ گزارنے کے بعد کرتا ہے۔

یہ کورس مکمل کرنے کے بعد ہر طالب علم کو بستالنگ کی سند متعلقہ ضلع کے محکمۂ صحت کی طرف سے ملتی ہے جس کی رو سے وہ باقاعدہ آرتست (ت ساکن یعنی معالج) کہلانے لگتا ہے۔ طبعزاد تحقیقات یا کسی خاص مشاہدے کے بعد کوئی طالب علم مقررہ تعداد الفاظ میں کوئی ایسا مقالہ لکھے جس میں واقعی کوئی اُپج ہو تو اُسے ڈکتور میڈی سنا یعنی ڈاکٹر آف میڈیسن کی ڈگری مل جاتی ہے۔

جرمنی کے سائنس دانوں اور طبیبوں کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے مثال کے طور پر آج کل طب و جراحت میں کامیابی کا بہت بڑا انحصار ایکس رے ہو گیا ہے۔ بہت سے اسرار و رموز کا انکشاف ان شعاعوں کے ذریعہ بالکل ممکن ہو گیا ہے کون نہیں جانتا کہ ان شعاعوں کو تحقیق کرنے والا ڈاکٹر رینٹجن (رینٹ جن) جرمن نژاد تھا کیونکہ اس کا وطنِ مالوف پرشیا کسی زمانہ میں عظیم تر جرمنی ہی کا ایک حصہ تھا اور وہاں کے اکثر باشندے جرمن قوم کے ہیں۔ لہٰذا طب و جراحت کے مضمون نے جو بھی ترقی اس زمانے میں کی اس کا اصل سہرا اسی جرمن ڈاکٹر کے سر ہے۔

**ایکس رے** ۔ رینٹجن رے کا نام اس لیے ایکس رے پڑ گیا کہ اس کا موجد شروع میں اس کی حقیقت و نوعیت کے بارے میں خود بڑے شش و پنج میں تھا، کیونکہ تجربہ تو کچھ اور ہو رہا تھا اور نتیجہ کچھ اور برآمد ہو گیا۔ دنیا کے بہت سے انکشافات اسی طرح محض اتفاقاً ہو گئے ہیں۔

ولہلم کونراڈ فان رینٹجن پرشیا کے شہر لینپ میں ۲۷ مارچ ۱۸۴۵ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کی شخصیت کو بین الاقوامی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ پرشیا میں پیدا ہونے کے بعد

اس لیے ابتدائی تعلیم وہیں پائی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ہالینڈ چلا گیا پھر سوئزرلینڈ جاکر مشہور زیورخ یونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ وہیں رہ کر اس نے طبیعیات اور دوسرے مادی علوم کا مطالعہ کیا۔ اس کے رجحانات سے پتہ چلتا تھا کہ سائنسی تجربات کا اسے شوق ہے اور اس کی استعداد و صلاحیت بھی اس میں موجود ہے۔ چنانچہ جرمنی کے صوبہ وورزبرگ کی یونیورسٹی کے پروفیسر کنٹ نے اسے اپنا معاون بنا لیا۔ اس کے بعد ۱۸۷۴ء میں وہ اسٹراس برگ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہو گیا۔ اب اس کا نام تعلیمی اور سائنسی میدانِ عمل میں اچھی طرح لیا جانے لگا تھا۔ اس سے اگلے سال وہ ہوہن ہیم کے زراعتی ادارے میں ریاضی طبیعیات کا پروفیسر ہو گیا۔ لیکن یہ میدان بھی شاید اس کی مرضی کے مطابق نہیں تھا دوسرے سال وہ پھر اسٹراس برگ واپس آیا اور دوبارہ وورزبرگ یونیورسٹی میں چلا گیا۔ اس دوران میں کچھ عرصے کے لیے وہ گی سن کے ادارۂ طبیعیات میں کام کرتا رہا تھا۔ البتہ وورزبرگ یونیورسٹی میں اس کی شمولیت سازگار ثابت ہوئی اور یہیں رہ کر اس نے حُسنِ اتفاق سے ایکس ریز معلوم کر لیں۔ یہ ۱۸۹۵ء کا واقعہ ہے۔

وہ دراصل برقی رو شیشے کے ایک بلب میں سے گزار رہا تھا جس میں اس حد تک خلا پیدا کر دیا گیا تھا کہ ہوا کی رمق تک موجود نہیں تھی۔ البتہ بیریم کے ذرات ادا دُار رکھے گئے تھے جو ایک دم روشن ہو کر چمکنے اور بالکل واضح طور پر دکھائی دینے لگے حالانکہ بلب کی سطح پر ایک دبیز سیاہ کاغذ لگا ہوا تھا۔ اس وقت یہ کاغذ بذاتِ خود نظر نہیں آیا یہی چیز باعثِ استعجاب ہوئی۔ اب مزید تجارب کا راستہ کھل گیا اور ہوتے ہوتے لاشعاعوں کی حقیقت سامنے آگئی۔

بعض سائنسی مورخین کی رائے ہے کہ اس نوع کی شعاعوں کا انکشاف رینٹجن سے دس سال پہلے ولیم مورگن نے کیا تھا۔ لیکن یہ انگریزوں کا دعویٰ ہے جو ہر نئی دریافت کا سہرا اپنے کسی ماہرِ علم و فن کے سر باندھنے کے عادی ہیں۔ اس لیے اُن کا دعویٰ قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔

اِس میں شک نہیں کہ رینٹجن نے صرف ایسی شعاعوں کا انکشاف کیا تھا جو بعض ٹھوس چیزوں میں سے نفوذ کر جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور اس نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ ان کے ذریعہ جسم کے اندرونی حصّوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے

تاہم ایکس رے کے ذریعہ تصاویر کھینچنے کا کام بعد میں ہوتا رہا اور اس میں رینٹجن کے ساتھ دوسرے ارباب علم بھی شامل رہے۔

۱۸۹۶ء میں اسے رمفورڈ میڈل ملا اور جب ۱۹۰۱ء میں نوبل انعامات کی تقسیم شروع ہوئی تو طبیعات کا سب سے پہلا انعام اسی کو دیا گیا۔ ۱۰ر فروری ۱۹۲۳ء کو اس کا انتقال میونک میں ہو گیا۔

ہومیوپیتھی اور ہانیمین۔ جرمنی میں صرف وہی ایک طریقہ علاج رائج نہیں ہے جو عرف عام میں ایلوپیتھی کہلاتا ہے بلکہ طب یونانی کے نام لیوا بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں اور اس باب میں تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ کئی مقامات پر باغہائے نباتات قائم ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ مختلف ملکوں کے دوائی پودے وہاں پروان چڑھائے جائیں اور ان پر تحقیقات کی جائے۔ علاوہ ازیں ایک طریقہ علاج ایسا ہے جس کی ابتدا جرمنی ہی سے ہوئی ہے میری مراد ہومیوپیتھی سے ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ علاج بالمثل کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے عامل بیماری کو دور کرنے کے لیے ایک ایسی دوا دیتے ہیں کہ جس کا استعمال کوئی تندرست آدمی کرے تو وہی مرض پیدا ہو جائے۔ اس کا بانی صرف ایک شخص ہے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ اسی لیے وہ ہومیوپیتھی کا باوا آدم کہلاتا ہے۔

۱۷۹۰ء کا ذکر ہے جرمنی کے مشہور شہر لائپ تسگ (لائپزگ) کے مضافات میں ایک شخص ڈاکٹر سیموئل ہانیمین، جو بذات خود ایک اچھا معالج تھا، نیز کیمیاگری اور زبان دانی میں شہرت رکھتا تھا، اپنے پیشے سے بیزار ہو کر صرف ترجمہ و تصنیف کی طرف مائل ہو گیا۔ ایک روز جب وہ ڈاکٹر کولن کے رسالے "خزائن الادویہ" کا ترجمہ انگریزی سے جرمن زبان میں کر رہا تھا، اس نے اصل مصنف کا یہ بیان بار بار پڑھا کہ پیرو کے جنگلات میں اُگنے والے ایک درخت کے پتے، جن سے کونین تیار ہوتی ہے، موسمی بخاروں کو دور کرنے کی صلاحیت اس لیے رکھتے ہیں کہ ان کے استعمال سے معدہ قوی ہو جاتا ہے اور اس میں مدافعت مرض کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے اسے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ذرا تامل تھا چنانچہ اپنے اوپر تجربہ کرنے اور یہ جاننے کی خاطر کہ جسم انسانی پر اس دوا کا کیا اثر ہوتا ہے ہانیمین نے دوا کی ایک

خوراک خود کھالی ۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب تھوڑی ہی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ تمام علامات ظاہر ہو رہی ہیں جو عام طور پر ملیریا کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں اس کی ایک مثال کو ناکافی سمجھتے ہوئے اس نے دوا کی ایک خوراک ایک اور تندرست آدمی کو کھلا دی ۔ کچھ دیر بعد وہ بھی بخار میں مبتلا ہو گیا اور جب اسی دوا کا سلسلہ تھوڑے وقفے کے بعد شروع کیا تو تندرست بھی ہو گیا ۔

اس طرح یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ علاج بالمثل کے اصول پر باقاعدہ عمل کیا جائے تو نتائج امید افزا برآمد ہو سکتے ہیں ۔ اسی طرح اور بہت سی دوائیوں کے تجربے ہوتے رہے اور کامیابی قدم چومتی رہی ۔ عام روش سے ہٹ کر ہانیمین کا اصول یہ تھا کہ صحیح نتائج پر پہنچنے کے لیے دواؤں کے تجربات خود انسان پر کیے جائیں ، کیونکہ ان جانوروں کا جو عموماً قربانی کے بکرے بنائے جاتے ہیں ، جسمانی نظام انسانی جسم کے نظام سے مختلف ہوتا ہے ۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ جو چیز جانور کو راس آسکتی ہو انسان کے حق میں مضر ثابت ہو یا اس کے برعکس جو چیز اس کے لیے مضر ہو ، انسان کے حق میں مفید رہے ۔ گویا انسان کے علاج کے خیال سے تجربہ کسی جانور پر کرنا اس کے نزدیک گمراہ کن ہو سکتا ہے ۔

یہ بات دل کو لگتی ہے اور تجربے سے ثابت بھی ہو گئی ہے ۔ اس زمانے کے بہت سے محققین کی سرگرمیوں نے انسان کو اچھا کرنے کی بجائے زیادہ مبتلائے آلام کر دیا ہے ، ایک دو نہیں ، سینکڑوں کتابیں حیرت انگیز ادویہ کے خلاف شائع ہوئی ہیں اور بعض رسائل نے اپنی ہر اشاعت میں ان کے خلاف محاذ بنا رکھا ہے ۔ اور یہ محاذ خواہ مخواہ نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ان کا ردِ عمل یا بعد کے اثرات اتنے برے ہوتے ہیں کہ انھیں دوا کے بجائے زہر کہا جا سکتا ہے ۔ دوا ساز ادارے خود جانتے ہیں ، ان کی حکومتیں بھی ناواقف نہیں ہوتیں لیکن ان کے بڑھتے ہوئے رواج پر پابندی نہیں لگائی جاتی ۔ ایسی ادویہ محض اشتہارات کی بنیاد پر فروغ پا جاتی ہیں ۔

ہانیمین جب ہر لحاظ سے مطمئن ہو گیا تو اُس نے اپنا نظریہ عوام کے سامنے پیش کیا اور بعض امراض کے لیے اسی اصول پر مفید دوائیں بھی تیار کر لیں ۔ بہت

جلد اسے اپنے کام میں شہرت ہونے لگی اور اس کے حوصلے بڑھتے چلے گئے صرف روایتی طریقۂ علاج کے نام لیوا اس کے مخالف ہو گئے کیونکہ قدرتی طور پر ان کے کاروبار پر برا اثر پڑنے لگا تھا۔

روایتی طریقۂ علاج کا کوئی خاص کام اس وقت تک نہیں رکھا گیا تھا۔ ہانیمین نے فرق و امتیاز قائم کرنے کے لیے اسے ایلوپیتھی کہنا شروع کیا۔ یونانی زبان میں "ایلوس" "دوسرے" کو کہتے ہیں۔ گویا اس کا تحقیق کردہ طریقۂ علاج اوّلین ہے اور باقی محض "دوسرے" کہے جا سکتے ہیں۔ یہ خطاب اس درجہ رواج پا گیا کہ آج بھی مغربی دنیا کا سب سے زیادہ رائج الوقت طریقۂ علاج اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور بہت سے ایلوپیتھ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ یہ اصطلاحی نام محض حقارت کے طور پر اور اہمیت کم کرنے کے خیال سے ایک مخالف شخص کا رکھا ہوا ہے۔ کیا اس "کھوٹے سکے" کو جاری رکھنا ان کے لیے باعثِ ننگ نہیں ہے۔

ہومیوپیتھی کے علاوہ اور جتنے بھی طریقہ ہائے علاج رائج ہیں، ان کے نسخوں میں عموماً ایک مرض کو دور کرنے کے لیے ایک وقت میں کئی کئی دوائیں درج کی جاتی ہیں لیکن ہانیمین ذاتی طور پر مرکبات کا مخالف رہا۔ اس نے صرف مفرد دوائیں استعمال کرنے پر زور دیا۔ یہ نظریہ بذاتِ خود برا نہیں ہے لیکن تین ہزار کے قریب ادویہ میں سے صرف ایک دوا کو منتخب کرنا ہر معالج کے بس کا کام نہیں ہے۔ اپنی ذاتی رائے یہی ہے کہ ہومیوپیتھی کوئی برا طریقہ علاج نہیں ہے لیکن دوا کے صحیح انتخاب میں جس مہارتِ کاملہ کی ضرورت ہے، وہ تقریباً محال ہے اور اس لیے ہر ملک میں صرف چند ماہرین معیار پر پورے اتر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی ایک بیماری کو لے لیا جائے۔ علاماتِ مرض کے پیشِ نظر اس کے لیے دو درجن سے زیادہ دوائیں استعمال کی جا سکتی ہے۔ پھر ہومیوپیتھک ادویہ میں ایک اور قابلِ غور نکتہ ان کی قوّت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں ہے کہ ایک مخصوص مریض کو کس پوٹنسی کی دوا دی جائے۔

تیسری اہم بات دوا کا ردِ عمل ہے۔ اگر صحیح دوا منتخب ہو جائے اور صحیح پوٹنسی میں دے دی جائے تو ایک بار اس کا ردِ عمل بہت ہی شدید ہوتا ہے۔ معالج کے نزدیک یہ کیفیت فالِ نیک ہوتی ہے۔ لیکن مریض گھبرا کر علاج ترک کر دیتا ہے اور کبھی کبھی سخت

نقصان اٹھاتا ہے اور کبھی ردِ عمل بذاتِ خود اتنا شدید ہوتا ہے کہ مریض کی جان پر بن جاتی ہے اور وہ بن آئی موت مر لیتا ہے۔

ہومیو پیتھی علاج کراتے وقت یہ ہدایت بھی دی جاتی ہے کہ اِس دوران میں کوئی اور دوا ہرگز استعمال نہ کی جائے اور جب علاج بدلا جائے تب بھی کم سے کم چوبیس گھنٹے کی ناغہ کی جائے تاکہ دوسری ادویہ کا اثر زائل ہو جائے۔ اسی طرح علاج کے دَوران میں بعض غذاؤں کا استعمال نہ صرف یہ کہ مرض میں اضافہ کر سکتا ہے بلکہ دوا کے اثر کو بھی زائل کر دیتا ہے۔ معالج کے ساتھ مریض کا اشتراکِ عمل بے حد ضروری ہے۔ اگر مریض پوری تفصیل کے ساتھ اپنی بیماری کا حال بے کم و کاست بیان نہیں کرتا اور کوئی بات بلا ارادہ یا جان بوجھ کر چھپاتا، نظر انداز کر دیتا یا اپنی دانست میں غیر ضروری سمجھتا ہے تو مُعالج کے لیے مناسب رائے قائم کر کے صحیح دوا تجویز کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور اسی طرح فائدے کے بجائے نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ گونگے، بہرے یا اندھے لوگوں کا علاج کسی قدر دشوار مسئلہ بن جاتا ہے۔ یہی دِقّت ان کم سِن بچّوں کے علاج میں لاحق ہوتی ہے جو اپنا حال خود بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ہومیو پیتھک کے استفسارات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کا جواب پوری صحت اور یقین کے ساتھ نہ دیا جائے تو معالج اصل راہ سے بھٹک سکتا ہے۔

اس طریقۂ علاج کے بعض نظریئے اور نِکات خاصے قابلِ غور ہیں مثلاً:

(۱) زندہ جسم میں ایک قوتِ حیات موجود ہوتی ہے۔ مرض کا لاحق ہونا گویا اس قوتِ حیات کی محض بغاوت ہے، ان خطرناک عناصر کے خلاف جو زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص نزلہ، زکام یا بخار میں مبتلا ہو جائے تو اس مرض کو نہ تو دبایا جائے اور نہ اس کا مقابلہ کیا جائے بلکہ اس کی اعانت کی جائے۔ یعنی اسے جان بوجھ کر بڑھایا جائے۔ البتّہ اگر بخار اتنی شدت اختیار کر لے کہ مریض کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہو تو اعانت روک دی جائے۔

(۲) مریض پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے اور اس کی نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اور جذباتی کیفیات کو بھی ملحوظ رکھا جائے جو بیماری پر اثر انداز ہو رہی ہوں۔

(۳) ہومیو پیتھی ادویہ قدرتی اشیا یعنی حیوانی، نباتاتی اور معدنی چیزوں سے ترکیب

پائی ہیں اور اس لیے ان کی تعداد معین نہیں کی جا سکتی۔

(۴) ہومیو پیتھ صرف مریض کی علالت ہی کو پیش نظر نہ رکھے بلکہ اس کے دوسرے افراد خاندان کی صحت کے بارے میں بھی تحقیقات کرلے اور معلوم کرے کہ پہلے کون سی دوا استعمال کی گئی ہے۔

(۵) معالج مثبت طریقہ اختیار کرے۔ بیماری میں مبتلا کرنے والے جراثیم عموماً بیماری کا سبب نہیں، نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ مریض کو جراثیم سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنے کی بجائے اس کی اندرونی قوتِ مدافعت کو بڑھا دیا جائے تاکہ نتیجہ زائل ہو جائے۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہومیو پیتھی اتنا برا طریقۂ علاج نہیں ہے جتنا کہ ایلو پیتھ بیان کرتے ہیں۔ بلکہ وہ مدعی ہیں کہ ہومیو پیتھی کی بنیاد ایلو پیتھی ہے، درآنحالیکہ یہ دعوٰی طبِ یونانی کے علمبردار کریں تو ثبوت فراہم کرنا آسان ہے جبکہ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ ایلو پیتھ حضرات کا تمام مبلغِ علم طبِ یونانی کا رہینِ منت ہے جسے اب طبِ مشرقی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ہانیمین، جس کا پورا نام سموئیل کرسچین فریڈرک ہانیمین تھا، ۱۰ اپریل ۱۷۵۵ء کو جرمنی کے صوبہ سیکسونی کے شہر میسن میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے لائپزگ اور ویانا جا کر طب و جراحت کا مطالعہ کیا اور ۱۷۸۹ء میں لائپزگ ہی میں مستقل قیام اختیار کیا۔ وہاں اس نے طبی کتابوں کے تراجم کا اہم کام شروع کیا اور پھر علاج بالمثل کا نظریہ قائم کر کے نیا طریقۂ علاج تحقیق کیا۔ ۱۷۹۶ء میں اپنے نتائج تحقیقات کتابی صورت میں شائع کر دیے۔

اس کی شہرت کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا۔ یہ چیز پرانے معالجین کو اس درجہ اکھری کہ انہوں نے باقاعدہ اس کے خلاف محاذ تیار کر لیا۔ ۱۸۲۱ء میں اس کے خلاف ایسا ہنگامہ کیا گیا کہ وہ مجبور ہو کر لائپزگ سے چلا گیا اور کوتھن کے فرمانروا کی دعوت پر اس کی ریاست میں رہنے لگا۔ دس سال بعد پھر پیرس کا رخ کیا، جہاں مرتے دم تک مطب کرتا رہا۔ اس کا انتقال ۲ جولائی ۱۸۴۳ء کو ہوا لیکن جو کام اس نے کیا تھا، اس سے حیات جاوداں سے حاصل ہو گئی۔ خود لائپزگ میں جہاں سے وہ نکالا گیا تھا اور

دو سرے کئی شہروں میں بھی اس کے مجسمے قدر دانوں نے نصب کرائے جو اب بھی موجود ہیں۔

ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے طبی شعبے کو میڈٹ سینی تشے فاکل ٹیٹ ڈیر او نی ورسی ٹیٹ کہتے ہیں۔ یہ شعبہ بھی بوجہ تعطیلات بند تھا صرف کمروں کے اندر کے بعض نظاروں سے اپنی حسرت کو "ادھورے طور" پر پورا کیا گیا۔ یہی غنیمت تھا۔ اس کے بعد ہم ہوٹل واپس آ گئے اور جو بھی مطبوعہ مواد مل سکتا تھا، ساتھ لے آئے۔

اب لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ نیچے کے ڈائننگ ہال میں بچھی ہوئی میزیں بھرتی جا رہی تھیں۔ ہم تینوں نے وہاں جانا اور ایسی چیزوں کی فرمائش کرنا جن پر بیروں کے علاوہ آس پاس کے لوگ بھی چشمِ حیرت وا کریں، گوارا نہ کیا اور ملازم کو بلا کر کہا کہ ہمارا کھانا یہیں لے آؤ۔ محبوب بھائی نے چیزوں کی تفصیل کاغذ پر لکھ دی تھی۔ ملاحظہ ہو۔ ابلے ہوئے انڈے۔ آلو کی ٹکیاں۔ مکھن لگے ہوئے توس۔ بالائی۔ امرود کی جیلی اور گرم گرم دودھ۔ یقین تو نہیں آتا تھا لیکن ان چیزوں سے خاصی آسودگی نصیب ہو گئی۔

پیٹ بھر لینے کے بعد وضو کیا، نماز پڑھی اور کچھ دیر کے لیے مطالعہ میں مصروف ہو جانا مناسب سمجھا۔ وہی پمفلٹ وغیرہ پیشِ نظر رہے جو یونیورسٹی کے دفتر سے میاں محبوب لے آئے تھے۔

**شوپنگ** ۔ شام کو چار بجے بازار جانے کی ٹھان لی تا کہ جرمنی کی سرزمین پر کچھ شوپنگ ہو جائے۔ خاص طور پر بھائی جان محترم کے لیے ایک کوٹ خریدنا مقصود تھا۔ ان کے پاس (اور میرے پاس بھی) شیروانیوں، کرتوں اور پاجاموں کے کئی کئی سیٹ موجود ہیں لیکن پچھلے چار ملکوں یعنی ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا اور سوئزرلینڈ کی سیاحت کرنے کے بعد (ملاحظہ ہو یورپ نامہ حصہ اول) ہم محسوس کر رہے ہیں کہ اپنے اصول کے مطابق اس قسم کا پہناوا مغربی دنیا کے ان علاقوں میں چل نہیں سکتا۔ کسی مغربی مصنف کا قول ہے کہ جب آپ روم جائیں تو اہلِ روم کی طرح زندگی بسر کریں۔ پھر بھی اس مشورے سے قطع نظر ہو کر اگر آپ چاہیں تو اسے ہماری کمزوری کہہ لیجیے مگر ہماری اس سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم یہ بات قطعی پسند نہیں کرتے کہ ہر مقام اور ہر جگہ پر محض اپنے لباس کی وجہ سے نمایاں ہو جائیں اور شیروانیوں کی وجہ سے مرکزِ توجہ بن کر رہ جائیں اور اس وجہ سے

ہمارے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو اور تکلیف ہو۔ اس لیے پہلے تجربے کی بنیاد پر اب یہ فیصلہ کر لینا ہی پڑا کہ حسبِ ضرورت لباس بدل لینا مناسب ہے گو اس لباس سے طبعاً نفرت ہے خصوصاً اس لیے کہ اسے پہن کر ایک قسم کی میکانکی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور حرکات وسکنات میں بناوٹ پیدا ہو جاتی ہے نیز اسے پہننے میں تاخیر اور ٹائی باندھنے وغیرہ سے سخت الجھن ہوتی ہے مگر مجبوری ہے۔

ہائیڈل برگ جرمنی کا واحد بڑا شہر ہے جسے دوسری جنگِ عظیم کی بے پناہ تباہ کاریوں سے نسبتاً زیادہ نقصان نہیں پہنچا، خصوصاً تجارتی بازار خاصے بچے رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شہر کوئی بڑا صنعتی مرکز نہیں ہے روزمرہ کے استعمال کی تقریباً ہر چیز دوسرے مقامات سے یہاں آکر بکتی ہے اور آس پاس کے علاقوں میں بھی پہنچائی جاتی ہے۔

اس شہر میں شوپنگ کے لیے سب سے اچھا علاقہ ہوپٹ اسٹراس کا ہے جس سے ہم کئی بار گزر چکے ہیں۔ اس بازار میں اور دوسرے بازاروں میں بھی خرید و فروخت کے اوقات صبح آٹھ بجے سے شروع ہوتے ہیں اور کسی وقفے کے بغیر شام کے چھ سات بجے تک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہمارے ملک کے رواج کے بالکل برعکس بڑی دوکانیں اوقاتِ کار میں ذرا سی دیر کے لیے بھی بند نہیں ہوتیں کیونکہ دوکاندار یہ نہیں چاہتے کہ کوئی گاہک بے خیالی میں بھی آکر مایوس لوٹے۔ البتہ چھوٹے دکاندار جو چھوٹے بازاروں میں کاروبار کرتے ہیں، اس اصول سے ہٹ کر ایک دو بجے کے درمیان دوکانیں بند رکھتے ہیں۔ ان کے گاہک صرف مقامی لوگ ہوتے ہیں اور وہ ان کے کاروباری اوقات سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بڑے بازاروں میں ہر علاقے کا اور انجان گاہک بھی آٹپکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات خاصی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہمدرد کے سب دواخانوں پر تمام مفردات ومرکبات صبح سے شام تک کے مقررہ اوقات پر کسی وقفے کے بغیر فروخت کی جاتی ہیں۔ میں تو نہیں کہوں گا لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ موت اور گاہک کا کوئی اعتبار نہیں کہ کب آجائے۔ اسی لیے اس کی آمد کا احترام ضروری ہے شاید کوئی من چلا اعتراض کر بیٹھے کہ پھر کیوں نہ دوکانیں چوبیس گھنٹے کھلی رکھی جائیں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ گاہک کو شروع اور آخر کے اوقات کا تو احساس ہوتا ہے لیکن درمیانی وقفے کو عموماً

بھول جاتا ہے۔

دُنیا کے بہت سے ملکوں میں شوپنگ ایک باقاعدہ فن ہے یعنی سب سے پہلے صحیح چیز کے انتخاب میں عقل لڑانے اور تجربہ کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بعد قیمت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اکثر مقامات پر دوکاندار خریدار کی حیثیت دیکھ کر قیمت بتاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں رسّہ کشی ہوتی ہے اور کبھی کبھی منہ مانگے دام مِل جاتے ہیں۔ یہ دکاندار کی قابلیت نہیں، اس کا گھاگ پن ہے کہ وہ اپنے گاہک کے بارے میں صحیح رائے قائم کرے اور مال اچھے داموں بیچے۔ اگر خریدار اتفاق سے غیر ملکی سیاح ہے تو دوکاندار سارے پینترے استعمال کرتا ہے خراب سے خراب چیز کو بہترین بتا کر عام نرخ سے کئی گنی زیادہ قیمت لے لیتا ہے۔ سیاح سب سے پہلے تو زرِ مبادلہ کی الجھنوں میں اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے، وہ دل ہی دل میں حساب لگاتا ہے کہ اس قسم کی یا اس سے ملتی جلتی چیز میرے وطن میں کتنے کی ملتی ہے اور شرحِ مبادلہ کے مطابق اس دیارِ غیر میں وہ کتنے کی ہونی چاہیئے۔ اس دوران میں دوکاندار وقت سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی چِکنی چپڑی باتیں کرتا ہے کہ خریدار سوچ بچار کی سب منزلوں کو چھوڑ کر چیز خرید لیتا اور دوکاندار کی منہ مانگی قیمت ادا کر دیتا ہے

بہت سے ملکوں میں سب دوکاندار شروع میں یہی کہتے ہیں کہ قیمتیں مقرر ہیں۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ گاہک مطمئن نہ ہونے کے باعث خالی ہاتھ جانے کی نیت کر رہا ہے تو وہ صرف اس کی خاطر اپنے اصُول توڑ کر قیمت گھٹانے پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نقصان ذرا بھی نہیں اٹھاتے۔ بعض ملک یا ملکوں کے بعض شہر اس مذموم روش سے بالکل الگ ہیں وہ ہر چیز کی قیمت گاہک کی حیثیت یا اس کی شخصیت جانے بغیر مقرر کرتے ہیں اور کسی حالت میں بھی اس میں کمی بیشی نہیں کرتے۔ جرمنی ایسے ہی ملکوں کی فہرست میں شامل ہے۔ یہاں مقامی باشندے اور سیاح دونوں قیمت کی مناسبت پر غور کیے بغیر خریداری کر سکتے ہیں۔ مقررہ نرخ میں ایک دمڑی کا فرق نہیں ہو سکتا۔ چاہے گاہک ہزاروں کا مال خریدنا چاہتا ہو۔

جرمنی میں عہدِ حاضر کی اس روش کے برعکس ایک لطیفہ کسی انگریزی رسالے

میں پڑھا تھا جو اس وقت یاد آ گیا۔ وہ یا تو کسی انگریز کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے یا کسی پُرانے زمانے کی یادگار ہے۔ بیکن ہے خوب!

ایک عورت نے جو سودا خریدتے وقت دام چکانے میں اپنے آپ کو ماہر سمجھتی تھی ایک جرمن قصّاب کی دوکان پر جا کر پوچھا۔ "گردن کا گوشت کس بھاؤ بیچتے ہو؟"

دوکاندار بولا "چار روپے سیر"

عورت نے اعتراض کیا "اور برابر والا تو ساڑھے تین روپے سیر کہتا ہے"

"پھر اس سے کیوں نہیں خرید لیتیں؟" دوکان دار نے پوچھا۔

عورت بولی "مگر مشکل یہ ہے کہ اس وقت اس کے پاس گوشت موجود نہیں ہے۔"

قصّاب نے گردن گھما کر کہا "اچھا یہ بات ہے۔ سنو بڑی بی! جب میرے پاس گوشت ختم ہو جائے گا تو میں ایک روپے سیر بیچوں گا۔ تم اس وقت آ کر لے جانا۔"

یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ صنعتی مرکز سے جس قدر دُور ہٹتے جائیں حمل و نقل کے مصارف کے باعث قیمت میں فرق پڑتا جائے گا۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی شہر کے دو مختلف مقامات پر ایک ہی قسم اور ساخت کی چیز کے دو مختلف دام ہوں گویا "قسامِ ازل" نے کسی چیز کا جو بھاؤ مقرر کیا ہے، اسے تبدیل کرنا کسی بندے کی مجال نہیں ہے۔

ایک یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگر کوئی چیز خواہ کتنی ہی قیمتی ہو، ناکارہ خراب یا ناقابلِ استعمال ہو گئی ہے تو وہ کسی چال سے گاہک کے سر چپکی نہیں جاتی بلکہ اس کا اظہار صاف طور پر کر دیا جاتا ہے اور اس اعتبار سے اس کی قیمت کم کر دی جاتی ہے۔ بلکہ ناکارہ چیزوں کی دوکانیں علیحدہ ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ملک میں جوتے جن میں کوئی نقص ہو یا جن کو بنے ہوئے زیادہ مدت گزر گئی ہو، ایک علیحدہ دکان پر رکھ کر فروخت کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان سب باتوں کو مدِّ نظر رکھ کر خریداری کا فیصلہ کر لیا۔

میاں محبوب کو ساتھ لے کر ہم دونوں بھائی پیدل بازار کی طرف چل پڑے۔ بھائی

جانِ محترم کے پاس دو سوٹ مکمل ہیں اور ایک پتلون زائد ہے۔ اس پتلون کا جوڑ ملانے کے لیے ہمیں ایک کوٹ خریدنا تھا۔ اگرچہ ہائیڈل برگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ریڈی میڈ کپڑوں کی خریداری کے لیے موزوں شہر نہیں ہے۔ وہاں سے صرف کیمرے، دوربینیں گھڑیاں، کھلونے اور نادر اشیا خریدی جائیں، لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ تیار لباس کے باب میں اس شہر کو کیوں نظر انداز کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

کپڑوں کا سب سے پہلا اسٹور جو ہمارے سامنے آیا، بہت ہی نفیس تھا۔ ہر قسم کے، ہر وضع کے، ہر سائز کے، ہر عمر والوں کے اور ہر جنس کے تیار لباس اس کے شوکیسوں میں موجود تھے۔ خوب صورت زندہ موڈل لڑکیاں، لڑکے، بچے، بوڑھے اور بعض مجسّمے مختلف ملبوسات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ زندہ لڑکیاں اس درجہ ساکت وصامت تھیں کہ ان پر مجسّمے کا دھوکا ہوتا تھا اور مجسّمے ایسی اعلا فن کاری کے نمونے تھے کہ بالکل ذی حیات معلوم ہوتے تھے۔ گمان ہوتا تھا کہ ان سے بات چیت کی جائے تو کہیں وہ بول نہ پڑیں۔

اس بات سے خوشی ہوئی کہ سامان دکھانے والی وہ خاتون انگریزی زبان جانتی تھی۔ معلوم ہوا کہ جرمنی کے ہر شہر اور شہر کے ہر بڑے اسٹور میں عملے کا ہر فرد ایک سے زیادہ زبانیں جانتا ہے تاکہ غیر ملکیوں کو ان کے ہاں خریداری میں دقّت نہ ہو۔ گاہک کی آسانی کا اس درجہ لحاظ قابلِ ستائش ہے، در اصل اس میں دوکانداری کا اصول بھی مضمر ہے۔ میں نے کسی قدر چھیڑنے کے انداز میں میاں محبوب سے کہا کہ یہاں ہم تمہارے محتاج نہیں ہیں۔ براہِ راست گفتگو کر کے دل پسند سامان خرید سکتے ہیں۔

ذرا آگے تھوڑے فاصلے پر گارمنٹس کی ایک اور بڑی دوکان نظر آئی۔ اس میں غالباً کوئی زندہ موڈل نہیں تھا لیکن ہر ایک پر زندہ کا شبہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اس میں موڈل بے حرکت استادہ نہیں تھے بلکہ کلوں کے ذریعہ ان کو متحرک دکھایا گیا تھا تاکہ اصل کا دھوکہ ہو۔ ہم تفریحاً اس دوکان میں بھی داخل ہوئے اور چکّر لگا کر چلے آئے۔ کسی سیل مین یا سیل گرل نے ہمیں نہیں ٹوکا۔ ہمارے ملک میں ایسا ہو تو دوکاندار یا اس کے کارندے عموماً آوازے کستے ہیں "کیوں۔ صرف سیر کرنے آئے تھے۔ جیب میں پیسے نہیں ہیں کیا؟ — غلطی سے چلے آئے، چلو معاف کیا" وغیرہ۔

شوکیسوں میں روشنی اس غضب کی دیتے ہیں کہ دن کا گمان ہونے لگتا ہے اور جہاں جتنی روشنی دینا چاہتے ہیں، کنٹرول کر لیتے ہیں۔ شوکیسوں میں جاذبیت ایسی کہ چلتے چلتے آدمی بلا ارادہ رک جائے۔ اس اعتبار سے ہم نے رائے قائم کی کہ دوکانیں سجانے اور سنوارنے کا انداز ہائیڈل برگ میں بھی سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ دوکانیں خواہ تنگ ہوں مگر شوکیس ایسے بڑے کہ حیرت ہوتی ہے۔ شیشے ایسے طویل و عریض اور شفاف کہ اپنے ہاں دیکھنے میں نہیں آئے۔ قد آدم کا استعارہ بھی ان کے سامنے پستہ قد ہو کر رہ جاتا ہے۔

آگے چلے۔ ایک اور دوکان میں گئے جسے میکانیکی آلات کا اسٹور کہا جا سکتا ہے۔ صرف جرمن ساخت کے لیکن وضع وضع کے کیمرے تپائیوں پر لگا کر رکھے گئے تھے، موڈل لڑکیاں دوربینیں آنکھوں پر لگائے کسی نہ معلوم دنیا میں ان دیکھی چیزوں کو دیکھ لینے کی کوشش کر رہی تھیں یا جیسے کھوئی ہوئی زندگی کی کسی کو تلاش ہو۔ چابی والے کھلونے، جن میں سے بعض اتنے بڑے تھے کہ بچوں کے لیے ان کو اٹھانا ہی مشکل تھا، اپنی دلچسپ نقل و حرکت یا دلپذیر تانوں سے گاہکوں کی پذیرائی کر رہے تھے ہم داخل ہوئے تو سیلولائڈ کے ایک بہت ہی بڑے گڈے نے اپنی ٹوپی اتار کر جرمن زبان میں ہمیں خوش آمدید کہا۔ میاں محبوب نے الفاظ دہرا کر ہم سے دہروایا "اِخ فروئے مِش سِی تسو سیہن" لفظی ترجمہ یہ ہوا کہ "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔ اس پاکیزہ انداز سے دل موہ لینا کب مشکل ہے۔

کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی لیکن ہم نے ایک دُوربین خریدنے کا ارادہ کیا البتہ جب قیمتیں سنیں تو اسراف سے تعبیر کرتے ہوئے اسے ترک کر دیا۔ کوئی بھی دوربین ہمارے ملک کے پانچ سو روپے سے کم نہیں تھی۔ قیمت کا زیادہ انحصار اس بات پر تھا کہ وہ اصل چیز کو کتنے گنا بڑا کر کے یا کس قدر نزدیک کر کے دکھاتی ہے۔ بعض دوربینیں سیدھی سادی ہوتی ہیں اور ہر موقع پر کام آسکتی ہیں لیکن بعض اپنے خصوصی استعمال کی وجہ سے اہم سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً شکار کھیلنے کے وقت جنگل بیابان میں جو دُوربین کام آئے گی، اسے اوپیرا دیکھتے وقت استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح گھوڑدوڑ، کشتیوں کی دوڑ یا کرکٹ وغیرہ جیسے کھیل دیکھتے وقت مختلف اقسام کی دوربینوں کی سفارش کی جاتی ہے۔ اس کے

علاوہ دن اور رات کے مختلف لمحات فرق وامتیاز پیدا کرتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ باریکیاں بھی الجھن کا باعث بن سکتی تھیں۔ لہٰذا ہم نے طے کیا کہ دوربین فی الحال نہ خریدی جائے۔ ہم نے سیل مین کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آئے۔ ان کے علاوہ بھی کئی اسٹور دیکھے لیکن کوئی چیز خریدی نہیں۔

بھوک محسوس ہونے لگی تھی لیکن اس سے زیادہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ کھانے کا مسئلہ پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ انڈے اور مچھلی کھاتے کھاتے طبیعت اکتا گئی ہے اور آلو نگلتے نگلتے طبیعت بیزار ہے۔ طبیعت مال مسالہ مانگتی ہے۔ یعنی نمک مرچ کی عادی ہے اور یہاں آلو ابال کر اور مچھلی تل کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ کوئی ساگ یا سبز ترکاری ہو مگر اس میں متوازن نمک مرچ ہو تو وہ اس بے مزہ کھانے سے بھلا ہے۔

راستے میں متوسط درجے کے ایک ہوٹل میں چلے گئے، اس خیال سے کہ شاید یہاں کوئی ڈھنگ کی ایسی چیز مل جائے جو اپنے عقیدے اور ذوق کے مطابق ہو مگر وہاں بھی مایوسی ہوئی۔ چنانچہ منجملہ دو اور چیزوں کے چاول وغیرہ کا کوئی مرکب کھایا۔ عجیب چیز تھی۔ شاید یہ یہاں کی حلیم ہو یا نمکین کھیر اسے کہا جائے۔

**جرمن فلم** ۔ کچھ وقت فالتو تھا، اس لیے فیصلہ کیا کہ آج کوئی فلم دیکھ ڈالا جائے۔ میں فلم دیکھنے سے عموماً گھبراتا ہوں تاوقتیکہ کسی فلم کو دیکھنا کسی خاص اعتبار سے ناگزیر نہ ہو جائے۔ بات یہ ہے کہ وسیع ہال ہونے کے باوجود کثرتِ اژدھام کے باعث جو گھٹن اُس کے اندر ہوتی ہے، وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی لیکن مجھے معلوم ہوا تھا کہ ان ممالک میں اندر کی ہوا باہر نکالنے اور تازہ ہوا داخل کرنے کا صحیح انتظام ہوتا ہے، اس لیے آج فلم دیکھنے کے لیے میں آمادہ ہو ہی گیا۔ چنانچہ ہم تینوں ایک سینما گھر کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ تاکہ شوکیسوں میں لگی ہوئی تصویریں دیکھ کر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ کچھ ہماری آنکھوں نے جائزہ لیا اور کچھ میاں محبوب نے سمجھایا۔ اس طرح اندازہ ہوا کہ اِس سینما میں کوئی انگریزی فلم چل رہا ہے جس کے مکالمے جرمن زبان میں "ڈب" کرکے اسے جرمنا لیا گیا ہے۔ تقریباً ایسا ہی ایک فلم موضوع کے اعتبار سے ہم زیورخ میں دیکھ چکے تھے۔ وہ بھی ایک ڈاکٹر سے متعلق تھا۔ اور اس میں بھی ڈاکٹر صاحب کو بڑے مذموم انداز میں پیش کیا گیا تھا بلکہ ان کو مسخرہ بنا دیا گیا تھا۔ یعنی انھیں زنانہ لباس پہنا کر ناچ

پنچوایا تھا۔ اسے دیکھ کر اصولاً ہمیں تکلیف ہوئی تھی۔

میڈیکل پروفیشن کے ساتھ یہ مذاق طبیعت کو ناگوار گزر سکتا ہے اور یقیناً ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ اگر اس کی نمائش ہمارے ملک میں ہو تو سختی کے ساتھ احتجاج کرنے والوں میں ہمارا نام سر فہرست ہوگا۔ اگرچہ حکیموں کو ڈاکٹروں سے کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن دونوں پیشے آپس میں خالہ زاد بھائی ہونے کے باعث ان میں ایک قریبی تعلق ضرور پایا جاتا ہے اس لیے قدرتی طور پر ایک کی توہین کا احساس دوسرے کو ہو سکتا ہے۔

جذباتی اعتبار سے ایک قسم کا تنفر پیدا ہو جانے کے علاوہ پہلا شو بھی ختم نہیں ہوا تھا اور دوسرا شو شروع ہونے تک کوئی مشغلہ ایسا نہیں تھا جس میں منہمک ہو کر ہم درمیانی وقت آسانی سے گزار دیتے۔ اس لیے مناسب یہی سمجھا کہ فلم دیکھنے کا ارادہ ترک کر دیا جائے۔ اگر اس فلم میں طبی پیشے کا احترام کرنے والوں کی دل شکنی شامل حال نہ ہوتی تو شاید ہم کچھ دیر کسی ریستوران میں بیٹھ کر مشروبات سے دل بہلاتے اور پھر وقت آنے پر دوسرا شو دیکھ لیتے۔

جرمنی میں فلمی صنعت کو کبھی بہت ہی عروج حاصل تھا لیکن دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ایسا گھن لگا کہ اس کا روشن مستقبل اب تک سامنے نہیں آسکا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۵ء سے پہلے ملک کے سب سے زیادہ شاندار اسٹوڈیو، جنھیں جدید ترین سامان سے آراستہ کہا جا سکے، برلن کے اس علاقے میں تھے جن پر اب روسیوں کا قبضہ ہے۔ دوسری عمارتوں کے ساتھ وہ بھی بمباری میں تباہ و برباد ہو گئے اور جب تعمیرِ نو کا سلسلہ شروع ہوا تو ان پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ مشرقی جرمنی کے اربابِ حل و عقد کو ملک کے ثقافتی ورثوں کو ذرا بنا سنوار کر دوبارہ زندہ کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر ہو بھی تو مغربی جرمنی والوں کو اس سے کیا فائدہ پہنچ سکے گا۔

مغربی جرمنی کے اصحابِ اقتدار نے اس صنعت پر اپنی نظرِ عنایت ضرور ڈالی، لیکن پہلے جیسا معیار اور عروج ممکن نہ ہو سکا۔ لڑائی کے زمانے میں حکومت نے اس کو قومی ملکیت بنا کر اپنی تحویل میں لے لیا تھا تاکہ جہاں تبلیغ و اشاعت کے دوسرے

ذرائع سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، اسے بھی ایک عمدہ آلۂ کار بنا لیا جائے۔ اداکاروں اور کہانی وغیرہ لکھنے والوں کا ذوق و شوق اور صلاحیت اسی وقت بڑی حد تک سلب ہو گئی تھی جو لڑائی کے بعد دوبارہ پروان نہ چڑھ سکی۔ بہت سے اعلا اداکار، مصنف اور شاعر یا تو ترکِ وطن کر گئے تھے یا دوسرا پیشہ اختیار کر لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ جرمنی کو بہت سے فلم دوسرے ملکوں سے منگا کر اپنے عوام کے لیے سامانِ تفریح پیدا کرنا پڑتا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ کے سب فلم انگریزی زبان میں تیار ہوتے ہیں۔ جرمنی میں ان کے مکالمے بدل کر جرمن زبان میں "ڈب" کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک تو صحیح معیاری کیفیت پیدا ہونے نہیں پاتی اور دوسرے معاشرے اور ماحول کا فرق ان کو عوام میں زیادہ مقبول ہونے نہیں دیتا۔ شاذونادر کوئی برطانوی یا امریکی فلم انگریزی مکالموں کے ساتھ بھی دکھایا جاتا ہے لیکن وہ چند دن سے زیادہ نہیں چلتا۔

ان تمام باتوں کے باوجود یورپ کے اور ملکوں سے مقابلہ کیا جائے تو جرمنی اس منزل میں زیادہ پیچھے بھی نظر نہیں آتا۔ اس وقت تقسیم شدہ ملک کے صرف مغربی حصے میں سات ہزار سے زیادہ سنیما گھر ہیں اور اوسط پھیلائی جائے تو ہر باشندہ سال میں بیس فلم ضرور دیکھتا ہے۔ صرف مغربی برلن میں تو یہ اوسط ستائیس فلم فی کس فی سال پہنچتی ہے۔ اب مغربی برلن کے علاوہ ہیمبرگ، ویزباڈن، گوٹنگن اور میونک اس صنعت کے مرکز بن گئے ہیں اور گیسل گاشٹیگ کو جہاں یورپ کے سب سے بڑے اسٹوڈیو قائم ہو گئے ہیں، بجا طور پر بالکل ہالی ووڈ کی طرح فلموں کا شہر کہا جانے لگا ہے۔ حالانکہ ترقی کی راہ میں بعض اہم رکاوٹیں موجود ہیں۔ مثلاً ملک کا نصف حصہ جس کے باشندوں کی مادری زبان جرمن ہے، روسیوں کے زیرِ اقتدار ہے اور قانوناً ادھر کا کوئی فلم اُدھر نہیں جا سکتا۔ پھر یورپ کے اور ملکوں میں جہاں لڑائی سے پہلے جرمن زبان خوب بولی اور سمجھی جاتی تھی، سیاسی مصلحت کے باعث بتدریج متروک ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس اخراجات بدستور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہر یک رنگی فلم پر دس لاکھ پاکستانی روپے سے زیادہ اور ہر رنگین فلم پر سولہ تا بائیس لاکھ روپے لاگت آتی ہے۔

محض ملک کے عوام کا ذوقِ فلم بینی ہے جس نے اس صنعت کو پروان چڑھایا ہے۔ لیکن اس میں ایک قباحت یہ ہے کہ تقریباً سب ہی فلم ہلکے پھلکے تفریحی

ہوتے ہیں۔ زندگی کے المناک پہلوؤں کو شاذونادر ہی پردۂ سیمیں پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے مسائل بھی اپنا رنگ نہیں جما سکتے۔ ایسی کوشش جب بھی کی گئی، ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ گیا۔

ہمارے مُلک میں بھی فلم ساز ادارے عوام کے ذوق سے ذرا بھی الگ ہٹنے نہیں پاتے۔ بھلا اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسے تامل ہوگا کہ فلم تبلیغ و اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ ہے لیکن ہر صنعت اپنا علیحدہ نقطۂ نظر رکھتی ہے اور جس راہ چلنے سے نفع نہ ہو تو صنعت کار اسے بدل دینا ہی چاہتا ہے۔ حکومت نے غیر ملکی فلموں کے ساتھ بھی نرم پالیسی روا رکھی ہے۔ چنانچہ پچھلے سال سارے ملک میں تقریباً ساڑھے پانچ سو فلم تمام سینما گھروں میں دکھائے گئے۔ ان میں سے ساڑھے چار سو کے قریب غیر ملکی تھے تاہم عوام کا جذبۂ قومی اتنا بلند ہے کہ غیر ملکی فلم ایک ہفتے سے زیادہ نہیں چلتا اور مقامی فلم بعض سینما گھروں میں چھ چھ مہینے کھنچ جاتے ہیں۔ اگر یہ والہانہ عقیدت نہ ہوتی تو قومی فلمی صنعت کبھی کا دم توڑ چکی ہوتی۔

دوسرے فلموں کی طرح یہاں بھی فلمی صنعت نجی سرمائے سے چلتی ہے اور سرکاری دخل اندازی سے محفوظ ہے لیکن زیادہ اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ فلموں پر احتساب کا ادارہ بھی غیر سرکاری ہے بلکہ حکومت کی طرف سے یہ اختیار اسے حاصل ہے کہ اگر وہ اچھی طرح جانچ پڑتال کرنے کے بعد کسی فلم کے بارے میں سفارش کر دے تو اس پر تفریحی ٹیکس کی مقررہ شرح میں کمی کر دی جاتی ہے۔ اس کی سفارش پر ہر سال وفاقی حکومت جرمن فلموں پر انعامات تقسیم کرتی ہے تاکہ اداکاروں اور مکالمہ نویسوں کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ صنعت کاروں کی ہمت افزائی ہو اور وہ اس راہ میں قدم بڑھاتے ہی رہیں۔ انعام کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ اسے پانے والے اپنی علیحدہ صنعت قائم کرنے کے منصوبے بنانے لگتے ہیں۔

تفریحی فلموں کے علاوہ ثقافتی اور دستاویزی فلم خاصی تعداد میں بنتے ہیں۔ حکومت ان کے فروغ کے لیے بھی مالی امداد دیتی ہے۔ ایسے فلموں کی سالانہ اوسط چار سو تک ہے۔ ہر سال ایسے فلموں کی نمائش کا ایک "ہفتہ" منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر ان فلموں پر بھی انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔ انعام کا فیصلہ رائے عامہ پر چھوڑتے ہے

لیکن رقم سرکاری خزانے سے ادا کی جاتی ہے۔

شوکیسوں میں لگی ہوئی تصویریں دیکھ لینے اور یہ فیصلہ کر لینے کے بعد کہ یہ فلم اصولی طور پر نہیں دیکھا جائے گا، ہم نے ہوٹل کی راہ لی اور میاں محبوب کو ایک ایسے مقام پر رخصت کر دیا جہاں سے ان کا ہوٹل نزدیک پڑتا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر ہم دونوں بھائیوں نے نماز عشا ادا کی اور نیند آنے سے پہلے حسب معمول مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔

لورے لائی۔ آج بھی جو کیفیت طاری تھی، اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں دماغ پر بار ڈالنے کے بجائے کسی ہلکی پھلکی سی چیز کا مطالعہ کروں۔ چنانچہ کل رات کی طرح کہانیوں کی کتاب پھر اٹھالی اور ورق گردانی شروع کر دی۔ اچانک نظر ایک کہانی کے عنوان پر پڑی۔ لکھا تھا "لورے لائی"۔ معاً اپنے بلوچستان کا ایک شہر یاد آگیا جو لورالائی کہلاتا ہے۔ دونوں ناموں میں تلفظ کا ذرا سا فرق ہے جرمنی میں لورے لائی دریائے رہائن کے کنارے سنٹ گوار کے قریب ایک بہت بڑی چٹان کا نام ہے جس کا کچھ حصہ پانی میں گھسا ہوا ہے اور متلاطم لہروں کے نشیب و فراز کے ساتھ اس کے سرے کہیں کہیں ابھرتے نظر آتے ہیں۔ چٹان کی وجہ سے آس پاس کی آبادی بھی اسی نام سے مشہور ہو گئی ہے۔ بلوچستان والا لورالائی بھی پہاڑی علاقے میں ہے اور سنگلاخ وادیوں پر مشتمل ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی پونے پانچ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس لورالائی کا کوئی قصہ مشہور نہیں ہے۔ اس کے برعکس جرمنی والے لورے لائی کے ساتھ پوری ایک داستان وابستہ ہے جسے موضوع بنا کر بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی نگارشات کے جوہر دکھائے ہیں۔

جرمن زبان میں "لورے" لفظ "لر" سے مشتق ہے جو غنغنی آواز کے لیے استعمال ہوتا ہے اور "لائی" چٹان کو کہتے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس مقام پر ایک نوجوان دوشیزہ جو محبت کی ماری تھی، پانی میں چھلانگ لگا کر مر گئی تھی۔ اُس وقت سے آج تک یہاں سے گزرنے والے ملاحوں کو ایک لطیف ہیولا چٹان کی چوٹی پر نظر آتا ہے اور ہلکی مگر دلدوز سی چیخیں سنائی دیتی ہیں جو اتنی سحر انگیز ہوتی ہیں کہ سننے والا اپنے حواس پر قابو نہیں پا سکتا اور کشتی کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود فنا

ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ مقام سینکڑوں ہزاروں جانوں کی بھینٹ لے چکا ہے۔ دلخراش چیخوں کی آواز کسی طرح سلب نہیں ہوتی بلکہ چاندنی راتوں میں زیادہ تیز ہو جاتی ہے، اور اس وقت زیادہ لوگ اس سحر کا شکار ہوتے ہیں۔

اِس قصّے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بلنٹز کے مقام پر جہاں دریائے رہائن انگور کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے پُر پیچ راستوں سے ہو کر گزرتا ہے، ایک عظیم چٹان واقع ہے جس نے جرمنی کی ایک عوامی کہانی کو جنم دیا ہے۔ قریب سے گزرنے والے ملاح نظر اٹھا کر اس چٹان کو دیکھتے اور مبہوت رہ جاتے ہیں، خصوصاً جب چاندنی رات ہو، بہار کا موسم ہو اور دونوں وقت مل رہے ہوں۔ اس کی سحر انگیزی غضب ڈھاتی ہے۔

عرصہ دراز کی بات ہے۔ ایک بار جب رات کی ملکہ اپنا تاریک لباس پہن کر مٹیالی پہاڑیوں سے نیچے اتر رہی تھی اور اس کا تنہا خاموش ساتھی، زرد چہرے والا چاند اس کے ہمراہ تھا اور اس کے پرتو سے دریا کے نیلگوں سبز پانی پر نقرئی کرنوں کا ایک جال سا بچھ گیا تھا، ایک عورت کی نرم و نازک آواز پہاڑی کے عقب سے سنائی دی اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سماوی حسن رکھنے والی ایک ہستی چوٹی پر نظر آئی۔ اس کے سنہرے بال لطیف شانوں پر کسی ملکہ کے زرکار نقاب کی طرح لہرا رہے تھے اور اس کا سارا جسم جو کسی قماشِ بلور کو تراش کر بنایا گیا تھا، ایک سحابِ نور کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔

جس ارضی ہستی نے سب سے پہلے اس سماوی مخلوق کا نظارہ کیا، وہ ایک نوجوان ملاح تھا جو اتفاقاً چٹان کے قریب سے اپنا سفینہ لیے جا رہا تھا۔ بس جس طرح یونان میں منچلے جوان حُسن کی دیوی کے گیت سن کر آپے سے باہر ہو جاتے تھے، یہ شخص بھی اپنے حواس کھو بیٹھا۔ سب سے پہلے "لطیف نسیان" کی کیفیت اس پر طاری ہوئی، اس کی آنکھوں میں بلکہ اس کی رُوح کی گہرائیوں تک میں چکاچوند سی پیدا ہو گئی۔ وہ چٹانوں کے سروں اور دریا کی موجوں کے اُبھرتے ہوئے پہلوؤں میں فرق و امتیاز پیدا نہ کر سکا۔ حسین ساحرہ نے جو ایک جل پری کے روپ میں جلوہ افروز تھی، اسے قریب تر گھسیٹ لیا اور وقت سے پہلے قبر میں پہنچا دیا جو لہروں کی گہرائی میں اپنا منہ

کھولے منتظر تھی۔

رہائن کی دھاڑتی ہوئی موجوں نے اپنے شور بے ہنگام میں ان چیخوں کو سلب کرلیا جو مظلوم نوجوان کے سینے سے انتہائی کرب کے عالم میں بلند ہوئی تھیں۔ اس کے بعد نہ کشتی نظر آئی اور نہ کشتی چلانے والا دکھائی دیا۔ ماتم کرنے والی موجیں اپنا سر ظالم چٹان پر پٹکتی رہ گئیں۔

اس کے بعد سے برابر ہر رات کو یہ کھیل اسی انداز میں کھیلا جاتا ہے۔ ہر من چلا نوجوان اس حُسنِ سماوی میں جذب ہو جانے کی خواہش کرتا ہے لیکن رسائی اس کے سائے تک بھی ممکن نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ نورِ سحر کی اولین شعاع نمودار ہونے سے پہلے یہ چُپ سوانگ ایک المیہ بن جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ پیلے ٹی نالٹے کے نواب کا بیٹا بہت ہی خودسر لیکن جانباز جنگجو نوجوان تھا۔ اس نے اس حسن سماوی اس سحر انگیز ہستی کا ذکر سنا اور بغیر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اسے قریب سے ایک نظر دیکھ لینے کی تمنا اسے تڑپانے لگی۔ اس نے شکار کا بہانہ کر کے ایوانِ شاہی سے رخصت حاصل کرلی۔ وہ ایک بوڑھے ملاح کو ساتھ لے کر اس کی کشتی میں رہائن کی لہروں پر چل پڑا اور جب سفینہ اس مہیب چٹان کے قریب پہنچا تو دن کا اُجالا رات کی تاریکی سے گلے مل کر اپنا رنگ بدل رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی آخری شعاعیں اونچی پہاڑیوں کے عقبی دامن سے اپنا چہرہ تک ڈھانک چکی تھیں۔ رات کی دیوی خاموشی کے ساتھ آگے بڑھی چلی آرہی تھی۔ ستارۂ شام — جلادِ فلک — نیلگوں افق پر جھلملانے لگا تھا۔ نوجوان من چلے عاشق کے لیے اس کا جلوہ خطرے سے آگاہی کے لیے کافی تھا، لیکن اس کی بیتاب نگاہیں آسمان کی لانہایت وسعتوں میں گم ہو جانے کی بجائے ارضی چٹان کے صرف ایک حصے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ فضا میں سناٹے کی آواز ایک جلوہ برقِ فنا بن کر پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک نواب زادے کے پہلو میں بیٹھے ہوئے بوڑھے ملاح نے بے تحاشا چیخ کر طلسم سکوت کو توڑ دیا، "وہ رہی لورے لائی۔ وہ حسین ساحرہ جس نے جادو جگا جگا کر سینکڑوں نوجوانوں کو تباہ کر دیا ہے — تم نے دیکھا اسے؟"

اور جواب میں نواب زادے نے غیر ارادی طور پر خیال کو الفاظ کا جامہ پہنائے

بغیر جو کچھ کہا، اسے ایک ابہام بلیغ سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ اس نے بیمار آنکھوں سے جن میں سات صحراؤں کی ویرانیاں جھلک دکھانے لگی تھیں، اپنے معبودِ خیال کا نظارہ کیا اور ماحول کی مناسبت سے محسوس کیا کہ ایک بسیط سیاہ چوکھٹے کے اندر نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک متحرک تصویر جڑ دی گئی ہے۔

وہ ذی حیات لعبتِ بلوریں اپنے ریشمی بالوں میں شانہ کر رہی اور اپنے ماحول سے یکسر بے اعتنائی کا خاموش اظہار کر رہی تھی۔ سیاہ بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلنے والے ماہتاب کی طرح اس کا چہرہ بھی فضائے تاریک میں نور و ظلمت کا رنگِ تضاد پیش کر رہا تھا اور پھر اچانک گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کھل جانے والے لبِ لعلیں میں خفیف سی جنبش ہوئی اور ایک لطیف نغمۂ سحر انگیز، اداس فضا میں گونج اٹھا۔ بالکل اس طرح جیسے خاموش موسم گرما کی کسی ملگجی شام میں بلبلِ ناشاد طلسمِ سکوت توڑ کر نغمہ نواز ہو جائے۔

بلندی سے بستی کی طرف اس نے ایک حقارت آمیز نظر ڈالی جو دیکھنے والے کی پریشان روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی اور اس صبر و قرار کو بھی اپنے ساتھ لے گئی جو مضمحل ہو کر کسی گوشے میں باقی رہ گیا تھا۔ نواب زادہ کا جسدِ ناتواں اس ڈالی کی طرح کپکپانے لگا جو اس پر بیٹھے ہوئے پرندے کے اڑ جانے سے کچھ دیر لرزتی رہ جاتی ہے۔ اس کی حسرت نصیب نگاہیں اس مخلوقِ سماوی پر جم کر رہ گئیں جس کے پیکرِ ضیا بار کے ہر نقشِ ماورا پر ایک افسانۂ محبت ثبت تھا۔

چٹانیں، ندی کے دھارے، پُر سکوت رات کے سناٹے۔۔۔ سب پگھل کر ایک شفاف دھوئیں کی صورت میں تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ لہروں کے رحم و کرم پر کشتی آہستہ آہستہ خود بخود آگے بڑھتی رہی کیونکہ نواب زادے کی کیفیات اس منزل پر پہنچ گئی تھیں کہ ع

"گم تھے جو اس خمسہ، ہر مُو تھا چشمِ بینا"

نتیجہ ظاہر ہے کشتی ایک چٹان سے ٹکرائی اور پاش پاش ہو گئی۔ کسی بیتاب عاشق کی حسرتِ ناکام کی طرح اور اس میں سوار دونوں ہستیاں لہروں کے بھیانک آغوش میں پہنچ کر غرقِ آب ہو گئیں۔ چٹانوں کے دل سے ایک جانکاہ آواز بلند ہوئی، موجوں نے سرد آہیں بھریں جو حرماں نصیب عاشق کے جسدِ خاکی پر سے

تڑپتی ہوئی گزر گئیں۔ ساری کائنات یک لخت لرز گئی۔ بجلی نے چمک کر بادلوں کے نقاب چاک کر دیے۔ ان کے مجروح سینوں سے گرج دار صدائے دلخراش نکلی۔ جیسے دور، بہت دُور، افق کے ساتھ ساتھ پھیلنے والے پہاڑوں کی چوٹیوں نے سن لیا اور وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ اِسی صدائے دلخراش نے ایک نغمۂ دلسوز بن کر لورے لائی کے غمناک گیت کی لے اختیار کر لی۔

پیلیٹی ناٹے کے نواب کو جب اپنے لختِ جگر کی داستانِ عشق اور اس کے حسرتناک انجام کا علم ہوا تو آتشِ انتقام اس کی رگ رگ سے بھڑک اٹھی۔ اس نے حکم دیا کہ جوان مردوں کا ایک دستہ اس حسین ساحرہ کی تسخیر کے لیے بھیجا جائے۔ وہ ناکام رہے تو دوسرا بھیجا جائے اور یہ سلسلہ قائم رہے تا وقتیکہ اس قتالۂ عالم کو پابجولاں ہمارے حضور میں پیش نہ کر دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوتی رہی اور ناکامیوں کا سامنا بھی ہوتا رہا۔ اسی لیے تکمیل کی نوبت نہ آنے پائی۔ نواب اس غم میں گھل گھل کر تمام ہو گیا کہ کسی طرح جوان بیٹے کی موت کا انتقام لے کر پراگندہ رُوح کو قدرے سکون پہنچا دے۔ اس کی تشنہ کامی دوسروں پر ذمہ داری عائد کر گئی۔ موسمِ گرما کی چاندنی راتوں میں اب جب کہ دریائے رہائن کے دھارے اپنے شباب پر ہوتے ہیں، منچلے نوجوان سفینوں میں بیٹھ کر جان لیوا چٹانوں کے قریب جاتے اور حسرتِ دید سینے میں لے کر سپردِ امواج ہو جاتے ہیں۔

کہانی ختم ہوئی تو مجھے ہیرو اور لیاندر کی وہ داستانِ عشق یاد آ گئی جو درّۂ دانیال کی سرزمین سے متعلق ہے اور جس کا ذکر ترکی کی سیاحت کرتے وقت میں نے یورپ نامہ کی جلد اوّل میں کیا ہے (صفحہ ۳۴۱ تا ۳۴۳) کیف و رنگ دونوں کے جداگانہ ہیں لیکن حُسن کی جلوہ فرمائیاں اور عشق کی ناکامیاں ان دونوں میں مشترک ہیں۔

یہ غور کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ لورے لائی کسی حقیقی وجود کی حامل تھی یا تخیل کی بلند پروازی نے اسے تخلیق کیا تھا۔ سوچنا صرف یہ تھا کہ اس ہوشربا کہانی سے جو نیند اڑ گئی ہے، اسے کس طرح منا کر واپس لایا جائے۔ نہ جانے کب تک غیر ارادی طور پر کروٹیں بدلیں اور کب آنکھ لگ گئی۔ یعنی مجھے نیند آ گئی اور غنیمت یہ ہے کہ عالمِ خواب میں اس پیکرِ نور و ضیا کے عشوۂ سحر آگیں نے اپنا کوئی پرتو مجھ پر نہیں ڈالا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۵۶ء ۔ جمعرات

# ہائیڈل برگ ۔ ڈارمسٹارٹ ۔ فرنیکفرٹ

رات کو کافی دیر میں سونے کے باوجود گہری نیند نہ آسکی اور نہ خواب کے لمحات زیادہ طویل رہے۔ معمول سے پہلے آنکھ کھل گئی اور خاصا وقت بے چینی کے عالم میں گزر گیا۔ بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہ آسکی۔ معدے میں خرابی سے لے کر دماغی پریشانی تک نیند نہ آنے کے بہت سے سبب ہو سکتے ہیں۔ الحمد للہ کہ معدہ اپنا ہمیشہ سے راہ راست پر رہا ہے۔ آج کل کے طلبا کی فطرت کے برعکس اس نے کبھی بنیادی اصولوں کے خلاف بغاوت نہیں کی۔ اب رہا دماغ! سو خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی ہر پریشانی سے دور رہا ہے اور اسے پریشان ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے جبکہ میں بھائی جان محترم کا ہم سفر ہوں۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ میرے لیے کتنا بڑا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ ان کی رفاقت مجھے ماضی، حال اور مستقبل کے اندیشہ ہائے دراز سے خالی الذہن رکھتی ہے۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ میری نیند کا سلسلہ وقت سے پہلے ٹوٹ گیا۔

ممکن ہے، کسی کو یہ گمان گزرے کہ داستان لورلائی کی رومانی کیفیات شکستِ طلسم کے ساتھ میری نیند اچاٹ کر گئیں۔ لیکن یہ قیاس کرنا بھی غلط ہے حسن و عشق کے کوچہ و بازار میں اپنا گزر کبھی نہیں ہوا۔ اپنی زندگی اس منزل سے نا آشنا رہی ہے۔ ایسی صورت میں سبب بیداری شاید اس کے سوا کچھ نہیں کہ سلسلۂ سفر کی اگلی کڑی نے جذبۂ شوق کی رفتار کو اتنا تیز کر دیا کہ میرے ذہن نے میرے جسم سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہا۔

اور ع      اس کش مکش میں ٹوٹ گیا رشتہ "خواب" کا

دوسری جنگِ عظیم کے اسباب۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ہٹلر کی سرزمین پر رات کی تنہائی میں خاموش لمحات گزارتے وقت اس عظیم ہستی کا خیال نہ آتا جسے آج دنیا کے سیاستداں ایمان نگل کر برا بھلا کہہ رہے ہیں اور دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کا واحد ذمہ دار صرف اسی کو قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ ٹھنڈے دل سے سوچا جائے

تو ذمہ داریوں کا زیادہ حصہ دوسروں پر عائد ہوتا ہے۔ ہٹلر نے اپنے ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے جو قدم اٹھایا، اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا۔ ورنہ ایک وقت آتا کہ سرزمین سکڑتے سکڑتے بالکل معدوم ہو جاتی اور اغیار کا منشا پورا ہو جاتا، جو چاہتے تھے کہ کرۂ ارض کے نقشہ پر جرمنی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور جس طرح بابل و نینوا اور سدوم و عمورہ کا محض ذکر تاریخ کے صفحات میں کہیں کہیں ملتا ہے، جرمنی کا تذکرہ بھی چند اوراقِ پارینہ کی حد سے آگے بڑھنے نہ پائے۔

یہ نکتہ اتنا باریک ہے کہ حقائق جنگ کا محدّب شیشہ آنکھ پر لگائے بغیر اس کا نظر آنا مشکل ہے۔ یعنی دوسری جنگِ عظیم کے اسباب معلوم نہ ہوں تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک ان اسباب کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ جنگِ عظیم اوّل کے بعد جو مختلف معاہدے اور اقرار نامے عمل میں آئے، ان کا مطالعہ گہری نظر سے کر لیا جائے کیونکہ اصل راز کی بات انہی پردوں میں پنہاں ملے گی۔ اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ دوسری جنگِ عظیم پہلی جنگِ عظیم کے مابعد تاثرات کا لازمی نتیجہ تھی۔ اگر پہلی لڑائی کے بعد اربابِ اقتدار غاصبانہ چال بازیوں سے کام نہ لیتے تو دوسری لڑائی کبھی شروع نہ ہوتی اور زمانے کے حالات اس وقت کچھ اور ہی ہوتے۔

ہاں، ان معاہدوں اور اقرار ناموں پر نظر ڈالنے سے پہلے ان چودہ نکات کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے جو ریاست ہائے متحدہ امریکا کے صدر ولسن نے صلحنامہ کا مسودہ مرتب کرانے سے قبل جنوری ۱۹۱۸ء میں پیش کیے تھے اور جو خواہ مخواہ مسودہ کی بنیادیں بن گئے۔

چودہ نکات ولسن۔ پہلی عالمگیر لڑائی کو جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی تھی ختم کرتے ہوئے ریاست ہائے متحدہ امریکا کے صدر ولسن نے جو شرائط امن اپنی پارلیمان کو خطاب کرتے ہوئے ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو پیش کی تھیں، اپنے منشا و مفہوم کے اعتبار سے مختصراً ان الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہیں:

(۱) قیامِ امن کی خاطر باہمی معاہدے جب بھی عمل میں آئیں، علی الاعلان ہوں۔ کوئی بین الاقوامی سمجھوتہ چوری چھپے نہ کیا جائے۔

(۲) سمندروں کی آمد و رفت کی آزادی سب ملکوں کو یکساں حاصل ہو۔

(۳) جہاں تک ممکن ہو، تمام اقتصادی رکاوٹوں کو دُور کر دیا جائے۔

(۴) معقول صورت میں اس امر کی ضمانتیں لی اور دی جائیں کہ ہر ملک میں سرکاری طور پر جنگی تیاریاں گھٹاتے گھٹاتے اس حد تک لے آئی جائیں گی جو صرف قومی حفاظت کے لیے ضروری ہوں۔

(۵) نو آبادیات کے تمام مطالبات میں غیر جانبدارانہ صورت میں کتر بیونت کی جائے۔

(۶) تمام روسی علاقے کا تخلیہ عمل میں آئے۔ روس پوری آزادی کے ساتھ اپنی سیاسی ترقی کے بارے میں انقطاعی فیصلہ کرے۔

(۷) بلجیئم کو غیر ملکی اثرات سے پاک کر کے بحال کیا جائے۔

(۸) فرانس کے مقبوضہ علاقے کا تخلیہ اور بحالی عمل میں آئے۔ ال سیس لورین کا علاقہ فرانس کو واپس مل جائے۔

(۹) اطالوی سرحدوں کی نشان دہی نئے سرے سے ہو اور ایسا کرتے وقت پڑوسی ملکوں کی سرحدوں کو واضح طور پر تسلیم کیا جائے۔

(۱۰) آسٹریا ہنگری کے باشندوں کو انتہائی آزادی کے ساتھ موقع دیا جائے کہ وہ خود ارادیت کا فیصلہ اپنی مرضی سے کریں۔

(۱۱) رومانیہ، سربیا اور مونٹی نیگرو کا تخلیہ عمل میں آئے۔ سربیا کو سمندر کے کنارے تک رسائی کا موقع دیا جائے۔ بلقان ریاستوں کے آپس کے تعلقات کا تصفیہ دوستانہ فضا میں جاں نثاری اور قوم پروری کے ان احساسات کے تحت کیا جائے جنھیں تاریخی اعتبار سے قبول کر لیا گیا ہو۔ اور بین الاقوامی ضمانت اس کے لیے فراہم کی جائے۔

(۱۲) ترکی کے غیر ترکی حصوں کو خود مختاری دی جائے۔ انھیں درہ دانیال سے ہو کر سمندر تک آزادانہ پہنچنے کا راستہ دیا جائے۔

(۱۳) پولینڈ کی ایک آزاد حکومت قائم کی جائے اور اسے آزادی کے ساتھ محفوظ صورت میں سمندر تک رسائی پانے کا موقع دیا جائے۔ نیز ایک بین الاقوامی معاہدے کے تحت اس بات کی ضمانت دی جائے۔

(۱۴) تمام قوموں کی ایک عام انجمن بنائی جائے جس میں جملہ بڑی اور چھوٹی حکومتوں کو یکساں اختیارات اور مساوی حقوق حاصل ہوں گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے

تو پتہ چلے گا کہ ان میں سے بہت سے نکات کچھ ردّوبدل کے ساتھ آئندہ قائم ہونیوالی مجلسِ اقوام کے ضابطۂ قانون میں شامل کر لئے گئے۔ کچھ کے الفاظ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوئے کیونکہ وہ محض برسبیلِ تذکرہ تھے، لیکن بحیثیت مجموعی ان سب کی غرض وغایت اس کے سوا کچھ نہیں تھی کہ نام نہاد اتحادی قوموں کے ہاتھ زیادہ مضبوط ہو جائیں اور وہ ملک جو ان کو اس وقت تک آنکھیں دکھلاتے رہے تھے، بے دست و پا ہو جائیں۔ نام کسی کا نہیں لیا گیا۔ لیکن سب سے زیادہ جرمنی اور کچھ ترکی کو نشانہ بنایا گیا۔ بندربانٹ کے اصول پر ان کے حصے دوسروں میں تقسیم کر دینے کی تجاویز پیش کی گئیں۔

"زبردست کا ٹھینگا سر پر"، کے مصداق یہ نکات چونکہ ایک بڑے ملک کے سربراہ نے پیش کئے تھے، اس لیے اپنی لپیٹ میں لے کر بہت سے سیاسی مسائل کا حل حسبِ منشا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اسی سال ماہِ نومبر میں جب معاہدۂ امن ہوا تو انکی روشنی راہ دکھانے کے لیے ضروری سمجھی گئی۔ بڑے پیمانے پر بندربانٹ کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے معاہدۂ ورسائی عمل میں آیا تو ان سے استفادہ کیا گیا اور جب ۱۹۲۰ء میں مجلس اقوام قائم ہوئی تب بھی ان کو نظرانداز نہ کیا گیا۔

معاہدۂ برلیسٹ لٹوفسک۔ ان چودہ نکات کے حربے سے جو ملک سب سے زیادہ متاثر ہو سکتے تھے۔ خصوصاً جرمنی۔ انھوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر آپس میں ایک پوشیدہ معاہدہ کر لینا مناسب سمجھا۔ یہ معاہدہ تاریخ میں معاہدۂ برلیسٹ لٹوفسک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک طرف روس تھا اور دوسری طرف جرمنی، آسٹریا، بلغاریہ اور ترکی تھے۔ ۳ر مارچ ۱۹۱۸ء کو یعنی چودہ نکات پیش کئے جانے کے ایک ماہ تئیس دن بعد یہ معاہدہ برلیسٹ لٹوفسک کے مقام پر عمل میں آیا جو مغربی یوکرین کا ایک علاقہ ہے۔ روس چونکہ اشتراکی انقلاب کے بحران میں مبتلا تھا، اس لیے ہر قیمت پر معاہدۂ امن چاہتا تھا۔ شرائط جرمنی نے منضبط کیں۔

روس نے جرمنی اور آسٹریلیا کے حق میں روسی پولینڈ، لیتھوآنیا، لٹویا، اسٹونیا اور بحیرۂ بالٹک کے بعض جزیروں پر اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جانا قبول کر لیا۔ علاوہ ازیں اس نے یوکرین کی آزادی کو تسلیم کیا۔ جہاں جرمنی نے ایک قومی حکومت قائم کرانے میں دست تعاون بڑھا رکھا تھا۔ اس نے فن لینڈ اور جورجیا کی آزادی

بھی مان لی۔ جہاں جرمنی کے فوجی دستے صف آرا تھے۔ اس نے تاوانِ جنگ کے طور پر چھے ارب طلائی مارک جرمنی کو ادا کرنے کی حامی بھی بھر لی۔ اس طرح اسے اپنے ۳۴ فیصد باشندوں، ۵۴ فیصد صنعت و حرفت اور ۹۰ فیصد کوئلے کی کانوں سے ہاتھ دھو لینے پڑے۔ اس کی رسائی بحیرۂ اسود تک منقطع ہو گئی اور عملی طور پر بحیرۂ بالٹک تک پہنچنا بھی مشکل ہو گیا۔ اس معاہدہ کو فتح مند جرمنی کے لیے ایک مثالی نمونہ کہا جاتا ہے اور جب انقلاباتِ زمانہ کے زیرِ اثر بساطِ سیاست پر مہروں کا رُخ بدل گیا، جرمنی نے جیتی ہوئی بازی ہار دی اور اسے مجبوراً معاہدۂ ورسائی پر دستخط کرنے پڑے تو بطور حوالہ معاہدۂ برلیسٹ لٹوفسک کا طعنہ دیا گیا۔

**معاہدۂ بخارسٹ** ۔ اس معاہدہ کے ۲ ماہ اور چار دن بعد، ۷ مئی ۱۹۱۸ء کو ایک اور معاہدہ عمل میں آیا جس کے فریقین میں ایک طرف جرمنی، آسٹریا، ترکی اور بلغاریہ اور دوسری طرف صرف رومانیہ تھا۔ رومانیہ پر جو اس وقت اتحادیوں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا، دباؤ ڈالنے کے لیے جرمنی نے اس معاہدے کے بموجب بہت کڑی شرائط عائد کی تھیں۔ مثلاً رومانیہ اپنی کوئی فوج نہیں رکھے گا۔ فریقِ اوّل کے ملک اس کی حفاظت کا انتظام کریں گے۔ وہ اتنی مدت تک جس کا تصفیہ بعد میں ہوگا، جرمنی اور آسٹریا کے زیرِ تسلط رہے گا۔ وہ کارپیتھیا کا وہ حصہ جو اس سے ملا ہوا ہے ہنگری کے سپرد کر دے گا۔ وہ دوبروجہ کے علاقے سے دست بردار ہو جائے گا جسے دو حصوں میں تقسیم کر کے جنوبی حصہ بلغاریہ کی اور شمالی حصہ مشترکہ طور پر جرمنی اور آسٹریا کی تحویل میں رکھا جائے گا۔ مؤخر الذکر حصے میں بندرگاہ کونسٹانزا شامل ہوگی۔ رومانیہ چند سال تک ایک مقررہ نرخ پر جرمنی اور آسٹریا کو اشیائے خوراک فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوگا اور اپنے تیل کے میدان ننانوے سال کے پٹے پر جرمنی کے حوالے کر دے گا۔

یہ شرطیں کسی طرح بھی قابلِ عمل نہیں کہی جا سکتیں کیونکہ اس طرح رومانیہ کی حیثیت بالکل ختم ہو جانے کے مترادف تھی لیکن یہ سب کچھ اتحادیوں کو زک پہنچانے کے لیے کیا گیا جو رومانیہ پر کچھ اسی انداز میں غلبہ پائے ہوئے تھے اور اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ رومانیہ اس معاہدے کے لیے مجبور تھا کیونکہ فریقِ اوّل کے بعض ملکوں کی سرحدیں اس سے ملی ہوئی تھیں اور اتحادیوں نے ذاتی مفاد کی خاطر اسے اس درجہ

مجبور کر رکھا تھا کہ وہ اپنا دفاع کرنے کے لائق بھی نہیں تھا۔ یہ معاہدہ اغیار کو چراغ پا کرنے کے لائق تھا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہے کیونکہ وہ بھی اپنی طاقتیں مجتمع کر کے علیحدہ منصوبے گانٹھ رہے تھے۔

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو اقرارنامۂ صلح عمل میں آیا تو مغربی طاقتوں کے مطالبے پر یہ دونوں معاہدے کالعدم قرار دے دئیے گئے اور ان کے بجائے معاہدۂ ورسائی کی توثیق ہوئی۔

معاہدۂ ورسائی۔ اگرچہ اقرارنامۂ صلح نومبر ۱۹۱۸ء میں عمل میں آگیا تھا لیکن امن کا صحیح معاہدہ، جس کی رو سے پہلی عالمگیر لڑائی ختم سمجھی گئی، اگلے سال ۲۸ر جون کو پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ وہی تاریخ میں معاہدۂ ورسائی کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے فریقین میں تمام اتحادی ملک اور ان کے ساتھی ایک طرف اور غریب جرمنی تنِ تنہا دوسری طرف تھا۔ اس معاہدہ کا پہلا حصّہ مجلسِ اقوام قائم کرنے کے لیے مخصوص تھا اور دوسرے حصّے میں جو شرائط درج کی گئیں، ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:۔

جرمنی آل سیس لورین کا علاقہ فرانس کے، یوپن مالمیڈی کا علاقہ بلجیم کے، پوزین اور کوریڈور کے علاقے پولینڈ، میمل لیتھوآنیا کے، شمالی شلیس وگ (استصواب رائے کے بعد) ڈنمارک کے، مشرقی بالائی سلیشیا (استصواب رائے کے بعد) پولینڈ کے اور ہل چن چیکوسلواکیہ کے سپرد کر دیگا۔ وہ ڈانسنگ کے علاقے پر اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائے گا۔ آسٹریا کے ساتھ اتحاد سے احتراز کرے گا۔ صرف ایک لاکھ بری فوج اور برائے نام بحری فوج رکھے گا۔ کوئی فوجی ہوائی جہاز، تحت البحر کشتی، بھاری توپ خانہ یا ٹینک نہیں بنائے گا۔ سامان حرب بنانے والے کارخانے بند کر دیگا بلکہ انھیں تباہ کر دے گا۔ رہائن لینڈ کے علاقے پر اتحادیوں کا قبضہ پندرہ سال تک قائم رہے گا۔ سار کے علاقے کو بین الاقوامی حیثیت دی جائے گی اور ۱۹۳۵ء میں ایک استصواب رائے کے ذریعہ اس کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ سرزمین جرمنی پر بہنے والے دریا بین الاقوامی ہوں گے۔ جرمنی کی نوآبادیات کو مجلسِ اقوام کے زیرِ انتداب اتحادیوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ جرمنی اپنے واحد مجرم جنگ ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے تاوانِ جنگ ادا کرے گا۔ رقم کا تعین بعد میں ہوگا۔ ان کے علاوہ کچھ اور شرطیں بھی تھیں جنھیں زیادہ اہم نہیں کہا جا سکتا۔

"تقسیم قبور" کرنے والوں نے بعد میں تاوانِ جنگ کی رقم ایک کھرب بتیس ارب طلائی مارک مقرر کی اور کچھ عرصے بعد خود ہی تسلیم کیا کہ اس کی ادائیگی ناممکن ہے اور جب ۱۹۲۳ء میں جرمنی کا مالیاتی نظام درہم و برہم ہو گیا تو ڈاوس منصوبے کے تحت ۱۹۲۴ء میں ایک نئی اسکیم مرتب کی گئی جس کے مطابق کل رقم کا تعین کیے بغیر جرمنی سے کہا گیا کہ وہ دو ارب مارک ہر سال ادا کرتا رہے۔ یہ رقم بھی بہت زیادہ سمجھی گئی اور ۱۹۲۹ء میں ینگ منصوبے کے تحت طے پایا کہ جرمنی مجموعی طور پر سینتیس ارب مارک ۵۹ سالانہ قسطوں میں ادا کرے۔ پہلی قسط کی رقم ساٹھ کروڑ مارک ہو جو بڑھتے بڑھتے ایک ارب بیس کروڑ مارک تک جائے اور پھر کم ہونے لگے۔

جرمنی نے شاید دو سال تک احکامات کی پابندی کی اور ۱۹۱۳ء میں ادائیگی سے صاف انکار کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں لوزان کے مقام پر اتحادیوں نے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کر کے تاوانِ جنگ کے سوال کو خود ہی ختم کر دیا۔ مختلف اسکیموں کے ماتحت جرمنی نے جو رقوم ادا کیں، ان کا میزان سترہ ارب مارک ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اتحادیوں نے ۱۹۳۰ء میں خود ہی رھائن لینڈ سے اپنا بستر بوریا اٹھا لیا اور جب ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو اس نے معاہدہ کو کلیتہً کالعدم قرار دیا۔

اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو یہ معاہدہ ہرگز اس لائق نہیں تھا کہ دنیا میں زیادہ دیر امن قائم رکھنے کا ضامن بن سکتا۔ نام نہاد صلح پسندوں نے ایسی کند چھری سے جرمنی کو ذبح کرنا چاہا تھا کہ وہ پوری اذیت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ جرمنی بالکل بے قصور نہیں تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں دوسرے بھی کون سے معصوم تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اگر سنار کے سو دنوں کے بعد لوہار کو ایک دن ملنا لازمی ہے تو دوسری جنگِ عظیم کی صورت میں جرمنی کے لیے سر اٹھانا یقینی تھا۔ تاہم اس منزل پر پہنچنے سے پہلے جو معاہدے ہوئے اور ان ہی میں سے ایک کے ماتحت مجلسِ اقوام قائم ہوئی، ان کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ کیونکہ غیر جانبدار ہو کر سوچا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ان بندھنوں کا ٹوٹنا اور نتیجے کے طور پر دوسری جنگِ عظیم کا برپا ہونا ناگزیر تھا۔

مجلسِ اقوام۔ یہ ایک بین الاقوامی مجلس تھی جسے علامہ اقبال نے صحیح معنوں میں ایسے چوروں کی جماعت قرار دیا تھا جو "تقسیم قبور" کے لیے آپس میں مل بیٹھے تھے۔ اس کا قیام

۱۹۲۰ء میں ایک ایسے ضابطے کے تحت عمل میں آیا جس میں ۲۶ دفعات شامل تھیں اور جس کے حصّۂ اوّل میں معاہدۂ ورسائی اور بظاہر امن قائم رکھنے والے دوسرے معاہدے شامل تھے۔ اگرچہ اس کا قیام ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر ولسن کے چودہ نکات میں سے آخری نکتے کے پیشِ نظر ممکن ہوا تھا لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ امریکی کانگریس نے معاہدۂ ورسائی کی توثیق کرنے اور مجلسِ اقوام میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

مجلس کے ضابطۂ قانون نے اس میں شریک ہونے والے ممبر ملکوں کو آپس میں پابند کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی آزادی کا احترام کریں گے اور علاقائی سالمیت کی خاطر جارحانہ حملے کے خلاف مل کر مقابلہ کریں گے۔ وہ کسی بھی تنازعہ کا فیصلہ طاقت کے ذریعہ نہیں کریں گے بلکہ مجلس میں یا اس کی طرف سے مقرر کئے ہوئے ثالثوں کے سامنے پیش کریں گے۔ اگر مجلس یا ثالث چھے ماہ کے اندر اندر کوئی سمجھوتہ آپس میں کرانے سے قاصر رہ جائیں تو مزید تین ماہ گزرنے کے بعد متنازعہ ملک اعلانِ جنگ کر سکیں گے۔ ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جارحانہ کارروائی کرنے والے ملک کے خلاف اقتصادی ناکہ بندی کی جائے گی۔ بتدریج لام شکنی ہوگی اور اس وقت باہمی دفاع کے خیال سے کچھ اور معاہدے عمل میں آئیں گے۔

اس مجلس میں ۵۴ ملک شامل ہوئے جن میں سے برطانیہ، روس اور فرانس بنیادی ممبر اور اس کی کونسل کے مستقل رکن قرار دیے گئے۔ منجملہ اور باتوں کے ایک یہی شرط امریکہ کے لیے قابلِ اعتراض تھی اور اس طرح اس کی عدم شرکت لائقِ استعجاب نہیں تھی۔ امریکہ کی کنارہ کشی نے روزِ اوّل سے مدبرینِ سیاست کو محسوس کرا دیا تھا کہ یورپی طاقتوں کا یہ گٹھ جوڑ زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہ سکے گا اور یوں بھی عملی طور پر اس کی طاقت نہیں کے برابر تھی، کیونکہ کسی کے ملک پر اتنا دباؤ ڈالنا کہ وہ تعمیلِ حکم کے لیے مجبور ہو جائے اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں تھا۔ مجلس کے اراکین اس بات پر آمادہ نہیں ہوئے کہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی ذرا سا حصّہ بھی اس کے حوالے کر دیں گے۔ ہر ایک اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے قدرتی طور پر اپنی پالیسی میں آزاد اور خود مختار رہنا چاہتا تھا۔

۱۹۲۵ء میں جرمنی مجلسِ اقوام میں شامل ہوا تو حالات سدھرنے کے آثار نظر آئے لیکن ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے برسرِ اقتدار آنے پر جب اس نے علیحدگی اختیار کی تو تشویش کی صورت

پیدا ہو گئی کیونکہ جرمن قوم پرست اسے اتحادیوں کی منڈلی کہتے تھے۔ مجلس نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر یورپ کے بعض معمولی تنازعات طے کرا دئے لیکن جب ۱۹۳۲ء میں جاپان نے چین کے خلاف منچوریا میں جارحانہ کارروائی کی تو اس کے اراکین خاموش تماش بین بنے رہے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ جاپان کی اس کارروائی پر لعنت کا ووٹ منظور کر دیا جس کے باعث جاپان نے بھی اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور تین سال بعد جب اٹلی نے ایبے سینیا پر چڑھائی کر دی اور مجلس اس سے اپنے تعلقات منقطع کرنے اور اس کے خلاف اقتصادی ناکہ بندی کرنے کے سوا کوئی اور قدم نہ اٹھا سکی تو اس کی ساکھ بالکل ہی جاتی رہی۔ اٹلی بھی علیحدہ ہو گیا اور اسے ایبے سینیا فتح کرنے کے لیے کوئی نہ روک سکا۔

یہ کاری ضربات اراکین مجلس کی کمر توڑ دینے کے لیے کافی تھیں۔ باقی ملکوں نے بھی مجلس پر کسی قسم کا تکیہ کرنے کے بجائے اپنی دیرینہ پالیسیوں کو مد نظر رکھنا اور جلدی جلدی دوسرے معاہدے کر کے الگ الگ بلاک بنانا مناسب سمجھا۔ کیونکہ خطرے کی گھنٹی بجنی شروع ہو گئی تھی۔ مجلس کے دم توڑنے سے قبل جو معاہدے عمل میں آئے، ان میں سے ایک معاہدہ لوکارنو خاصی اہمیت رکھتا ہے۔

**معاہدہ لوکارنو۔** یہ معاہدہ ۱۶ ر نومبر ۱۹۲۵ء کو فرانس، برطانیہ، جرمنی، اٹلی اور بلجیم کے مابین ہوا، جرمنی، فرانس اور بلجیم نے اپنی اپنی موجودہ درمیانی سرحدوں کو قائم رکھنے اور ایک دوسرے کے خلاف طاقت استعمال نہ کرنے کی ذمہ داری لی۔ جرمنی نے رھائن لینڈ میں لام بندی کی ضرورت کو تسلیم کر لیا۔ برطانیہ اور اٹلی نے معاہدے پر کاربند رہنے کی ضمانت دی اور ہنگامہ برپا ہونے کی صورت میں باہمی امداد و اعانت کی حامی بھر لی۔ یہ معاہدہ بھی ہٹلر کے چانسلر بننے کے بعد ۱۹۳۶ء میں جبکہ اس نے رھائن لینڈ پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا، ختم ہو گیا۔ البتہ برطانیہ نے فرانس سے جو وعدے کئے تھے اور برطانیہ اور فرانس نے مشترکہ طور پر بلجیم سے وعدے کئے تھے، ان کی تجدید علیحدہ علیحدہ خصوصی معاہدوں کے ذریعہ کر لی گئی۔

**تخفیفِ اسلحہ کانفرنس۔** امن و امان قائم رکھنے یا آپس میں ایک دوسرے کی اعانت کرنے کے اعتبار سے جو معاہدے ہوئے، ان کے ساتھ ساتھ ایک کانفرنس بھی عمل میں آئی جو قابلِ ذکر ہے۔ یہ تخفیفِ اسلحہ کرانے کی غرض سے ۲ ر فروری ۱۹۳۲ء کو جنیوا میں منعقد ہوئی۔ معاہدۂ ورسائی کے حصۂ پنجم کی تمہید میں جرمنی سے ہتھیار چھین لینے کی ضرورت پر

زور دیا گیا تھا اور بر سبیل تذکرہ یہ بھی لکھا تھا کہ اگر عام طور پر تخفیف اسلحہ ہو جائے تو آئندہ لڑائی کے امکانات ذرا دُور ہٹ جائیں گے۔ مجلس اقوام کے ضابطۂ قانونی کی دفعہ ۸ میں بھی درج ہے کہ مجلس کے اراکین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ملک میں فوجی تیاریاں گھٹا کر اس حد تک لے آئی جائیں جو قومی دفاع کے اعتبار سے اس کے لیے ضروری ہو۔

معاہدۂ لوکارنو مکمل ہو جانے کے بعد جس میں اس اصول پر دوبارہ زور دیا گیا تھا مجلس اقوام کی کونسل نے ۱۲ دسمبر ۱۹۲۵ء کو فیصلہ کیا کہ تخفیف اسلحہ کانفرنس منعقد کرنے کے لیے ایک تیاری کمیشن قائم کیا جائے۔ کمیشن کا پہلا اجلاس چند ماہ بعد عمل میں آیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور پھر تقریباً پانچ سال بعد دسمبر ۱۹۳۰ء میں ضابطۂ قانون کا مسودہ تیار ہوا جس پر نظر ڈالی جائے تو صحیح تخفیف اسلحہ کا منشا اس سے پورا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اس میں ایسی ضروری باتوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا جن کے بغیر اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی تھی۔ اور سب سے قابلِ ذکر بات جرمنی کے بارے میں یہ تھی کہ وہاں معاہدۂ امن کے بموجب کوئی فوج یا فوجی سامان تیار کرنے کی اجازت نہ دی جائے جرمنی نے سب سے اختلاف کرتے ہوئے مساوات کا مطالبہ کیا۔ اس کی بات کسی نے نہ سنی۔

اس کے بعد بھی اس سلسلے کی کئی کانفرنسیں ہوتی رہیں لیکن بے سود۔ ہر ملک اپنے موقف پر اڑا رہا۔ اسی دوران میں برطانیہ کے وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ نے ۹۶ دفعات پر مشتمل ایک ضابطۂ قانون کا مسودہ پیش کیا جس کا منشا یہ تھا کہ آٹھ سال کی مدت میں بتدریج تخفیفِ اسلحہ عمل میں آئے۔ سوائے جرمنی کے سب ملکوں نے اسے قبول کر لیا، کیونکہ اس میں بھی جرمنی کے ساتھ حق تلفی ہوئی تھی۔ جرمنی کا نمائندہ بطور احتجاج کانفرنس کے اجلاس سے چلا گیا۔ کانفرنس ناکام ہو گئی اور غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

**اشتراکیت کے خلاف۔** ہٹلر کے برسر اقتدار آنے کے بعد یورپ کی سیاسی فضا یکسر بدل گئی۔ ہر ملک کو اپنے قومی دفاع کا احساس بری طرح ستانے لگا۔ سیاسی مذاکرات کے راستوں سے ہٹ کر چوری چھپے عہد و پیمان ہونے لگے اور کچھ معاہدے منظر عام پر آ گئے۔ خود جرمنی کو بہت سے خطرات کا احساس تھا، خصوصاً روسی اشتراکیت کے غلبے سے وہ اپنے آپ کو بچا لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ جرمنی اور جاپان کے درمیان ایک معاہدہ اشتراکیت

پسندوں کی بین الاقوامی تنظیم کے خلاف ۲۵ر نومبر ۱۹۳۶ء کو عمل میں آیا۔ تقریباً ایک سال بعد اٹلی اس میں شامل ہو گیا۔ معاہدے کا مقصد یہ تھا کہ اس تنظیم کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں جو بھی کارروائی دستخط کرنے والے کسی ملک میں یا اس کے آس پاس ظہور میں آئے، اس کی اطلاع فوراً دوسرے فریق کو کر دی جائے تاکہ سب اس کے فروغ سے باخبر رہیں۔

پہلی جنگِ عظیم نے دنیا کے ہر حصے میں اقتصادی نظام کو تباہ کر دیا تھا اور یہ صورت حالات اشتراکیت کے غلبے کے لیے سازگار ثابت ہو سکتی تھی۔ معاہدہ میں یہ بھی درج تھا کہ اطلاعات فراہم کرنے کے علاوہ معاہدے کے اراکین اس وباء سے بچنے کی تدابیر معلوم کرنے کے لیے آپس میں صلاح و مشورے کر سکتے ہیں اور پھر ان مشوروں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک دوسرے سے مدد لے سکتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں مانچو کو معاہدے میں شامل ہو گیا۔ فروری ۱۹۳۹ میں ہنگری نے اور جنرل فرانکو کی فتح کے بعد اسی سال اپریل میں اسپین نے شرکت کی۔

جہاں تک معاہدے کے متن کا تعلق ہے، وہ یقیناً اشتراکی تنظیم کے خلاف ایک حربہ تھا۔ لیکن درحقیقت اس کا منشا یہ تھا کہ دوسری مغربی طاقتوں خصوصاً برطانیہ کی چیرہ دستیوں سے باخبر رہا جائے۔ اس معاہدہ کی مدت یوں تو نومبر ۱۹۴۱ء تک کے لیے تھی لیکن ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر لڑائی چھڑ گئی تو سب عہد و پیمان رکھے رہ گئے۔

**اقرار نامۂ میونک** ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد نام نہاد اتحادیوں نے جرمنی کا جو حلیہ بگاڑا، اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ مستقبل قریب میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق ہو جائے گا۔ امن کے خود ساختہ علمبرداروں نے اس کے جسمِ ناتواں سے اس طرح بوٹیاں نوچیں تھیں اور کہیں کہیں سے ہڈیاں تک ہڑپ کر لی تھیں کہ اس کے پنپنے کا امکان بعید از قیاس تھا۔ "بسترِ مرگ پر بیمار" کی جو پھبتی اربابِ فرنگ نے ترکی پر کسی تھی بعینہٖ جرمنی پر عائد ہوتی تھی۔ لیکن جس طرح اس کو ایک مسیحا اتاترک کے پیکر میں مل گیا تھا جرمنی نے بھی ہٹلر کے روپ میں ایک ہستی کو پا لیا جو اپنی قوم کو بیچ منجدھار سے صحیح و سلامت محفوظ ساحل تک لے جانے کا دم خم رکھتی تھی۔ ہٹلر ایک طوفان کی طرح آیا اور ایک سیلاب کی طرح ہر چیز

بڑھتا گیا۔ اس لپیٹ میں آجانے سے ان طاقتوں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا جو اس وقت تک جرمنی کی قسمت کو اپنے بائیں ہاتھ میں تھامے رہنے کی دعویدار تھیں۔ لہٰذا اس خوف سے کہ جرمنی جذبۂ انتقام کے ماتحت کوئی تباہ کن قدم نہ اٹھائے، برطانیہ اور فرانس کے شاطروں نے دوستی کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا اور اٹلی کو بھی اس میں شریک کر لینے کا خیال ظاہر کیا۔

ہٹلر نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ بساطِ سیاست پر حریفوں کی گوٹ بُری طرح پھنس گئی ہے اور اپنے ہر حال میں پوبارہ ہیں۔ لہٰذا اس نے پیش کش پر اپنی بھی رضامندی تو ظاہر کی لیکن یہ شان دکھائی کہ میونک میں آکر معاہدہ کرو۔ چنانچہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو یعنی اگلی جنگ عظیم شروع ہونے سے محض ایک سال پہلے جرمنی، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کی رو سے سوڈیٹن لینڈ کا وہ علاقہ جو جرمنی سے چھین کر چیکوسلواکیہ کو عطا کر دیا گیا تھا، اسے واپس مل گیا۔ جرمنی نے اس کی واپسی کا دعویٰ اسی سال اگست میں کیا تھا اور چیکوسلواکیہ پر چڑھائی کرنے کی دھمکی کے ساتھ اپنی فوجیں اس کی سرحد پر لا کھڑی کی تھیں۔

برطانیہ کے وزیر اعظم چیمبرلین فوراً اپنی چھتری سنبھال کر ہٹلر کی قیام گاہ پہ پہنچے اور اسے لڑائی سے باز رکھنے کی تلقین کرنے لگے۔ ہر دلیل کے سامنے اس کا یہی اصرار تھا کہ جرمنی کا علاقہ مجھے واپس مل جائے۔ یہ ہٹ دھرمی نہیں تھی بالکل جائز مطالبہ تھا۔ اقرار نامۂ میونک نے اسے ممکن کر دکھایا۔ برطانیہ اور فرانس نے مل کر چیکوسلواکیہ سے سفارش کی کہ امن قائم رکھنے کی خاطر یہ بات مان لی جائے۔ اس وقت بھی اس علاقے میں پچاس فیصد جرمن آباد تھے، جن کی طرف سے بغاوت کا خطرہ بھی ہر وقت دامن گیر رہتا تھا۔ در اصل جرمنی تنگ آکر جنگ کی دھمکیاں دینے لگا تھا اور چونکہ اس کے تیور چڑھے ہوئے تھے، اس لیے اغیار کی نگاہیں جھکتی ہی چلی گئیں۔ چیمبرلین نے بزعمِ خود سمجھا تھا کہ یہ ایک لقمہ پھینک کر حریف کا منہ بند کر دیا جائے گا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ فریقِ ثانی انگلی پکڑ کر پہونچا پکڑ لینے کے منصوبے گانٹھ رہا ہے۔ چنانچہ ہٹلر کے مطالبات بڑھتے گئے اور اتحادی کچھ پس و پیش کے ساتھ تمام منتھیا ہوا مالِ غنیمت لوٹاتے رہے، لیکن جب ہٹلر نے تلافیٔ نقصان کے طور پر کچھ ایسے علاقے بھی جھپٹ لیے جو جرمنی کے نقشے میں کبھی شامل نہیں تھے تو برطانیہ اور فرانس کو طرزِ عمل بدل

لینا پڑا۔ بریک لگنے لگی دیر تھی کہ دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔

اِن تمام معاہدوں اور خصوصاً معاہدۂ ورسائی کی شرائط کی روشنی میں ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو ماننا پڑے گا کہ جو زیادتی جرمنی کے ساتھ امن کے دیوتاؤں نے کی تھی اُس کا تقاضا یہی تھا کہ کم سے کم ایک بار اس دنیا سے فضائے امن کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہٹلر دوسری جنگِ عظیم میں ہار گیا اور فنا ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ اصل شکست فتح پانے والوں کی ہوئی۔ ان کی مملکت میں کبھی نہ ڈوبنے والا سورج اب بتدریج غروب ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ سیاسی نشیب و فراز کے ماتحت کبھی ایسا بھی دن آجائے جبکہ دنیا کو روشنی دکھانے کے مدعیان خود تاریکی میں منہ چھپا کر رہ جائیں۔ اِس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دوسری جنگِ عظیم ان کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔

**دوسری جنگِ عظیم**۔ یہ لڑائی تو درحقیقت ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی تھی لیکن اِس کا اندیشہ بہت پہلے لاحق ہو چکا تھا۔ اِس لیے اِتحادی خصوصاً برطانوی مدبرین سراسیمہ تھے اور چاہتے تھے کہ اسے ہر قیمت پر روک دیں۔ وہ اس کوشش میں اس سطح تک اتر آئے جہاں کھڑے ہو کر بات کرنا ان کے لیے کسرِ شان تھا۔ لیکن ایک طرف ان کے جاسوسی کے اداروں نے یقین دلایا تھا کہ جرمنی کی عسکری طاقت بے پناہ ہو گئی ہے اگر اس کا عملی مظاہرہ ہوا تو جان چھڑانی محال ہو جائے گی۔

دوسری طرف انھیں اپنی تہی دامانی کا پورا احساس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے پرانے چھل بٹوں یعنی ظاہری پیاماتِ امن سے اس بازی کو جیت لیں جس میں ترپ کے بیشتر پتے فریقِ مخالف کے ہاتھ میں تھے۔ ان کا یہ داؤں کئی بار کامیاب ہو چکا تھا لیکن اس دفعہ وار خالی گیا۔

اس وقت برطانیہ میں قلمدانِ وزارتِ عظمیٰ چیمبرلین کے پاس تھا جو لڑائی چھڑنے کے سات آٹھ ماہ بعد ونسٹن چرچل کی تحویل میں چلا گیا۔ ان کے دائیں بائیں بازو جنرل ڈیول اور فیلڈ مارشل منٹگمری تھے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کشتی کھینے والے صدر روزویلٹ اور جنرل آئزن ہاور تھے۔ روس کی باگ ڈور مارشل اسٹالن نے سنبھال رکھی تھی۔ فرانس میں جنرل ڈی گال اور چین میں جنرل لیموچیانگ کائی شیک کو اقتدار حاصل تھا۔ میدانِ کارزار کے دوسرے محاذ پر نظر ڈالی جائے تو جرمنی میں

ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی اور بعد ازاں جاپان میں جنرل ٹوجو خم ٹھونک کر باقی دنیا کو نبرد آزمائی کی دعوت دے رہے تھے۔

جرمنی کو شروع میں جو غیر متوقع کامرانی نصیب ہوئی، مغربی سیاستدانوں کے نزدیک اس کے دو سبب تھے۔ اول یہ کہ جرمنی نے بے قیاس سامانِ حرب پوشیدہ طور پر تیار کر لیا تھا جس کے صحیح اعداد و شمار اتحادیوں کو ان کی جاسوسانہ سرگرمیوں کے باوجود معلوم نہ ہو سکے تھے۔ دوسرے یہ کہ جرمنی کی طاقت کا غلط اندازہ لگانے والوں نے اپنی اس غلط فہمی کی بُنیاد پر یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ چیلنج محض ایک دھمکی ہے اور لڑائی کا بازار کبھی گرم نہیں ہوگا۔ لیکن ہماری اپنی یہ رائے بھی کچھ کم وزنی نہیں کہی جا سکتی کہ برطانیہ کا خود اپنی طاقت کے بارے میں غلط اندازہ، فرانس کی عشرت پسندانہ بے حسی، امریکہ کی روایتی بزدلی اور چین کی داخلی پریشانی جرمنی کو قدرتی طور پر بالادستی حاصل کرنے کا موقع دے گئی اور اگر ہٹلر اس لڑائی کا "زائچہ" کھینچنے میں ذرا سی چوک نہ کر جاتا تو اس وقت اس کا ستارہ غروب ہونے کے بجائے پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہوتا۔

چونکہ لڑائی لڑنے کے لیے کچھ داخلی امداد اور کچھ خارجی سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ داخلی امداد اسے پوری طرح ملتی رہی لیکن خارجی سہارے کمزور ثابت ہوئے۔ بلند منصوبوں کا سارا محل ریت پر بنی ہوئی عمارت کی طرح ڈھ گیا۔

لڑائی کے دَوران میں میکانیکی آلاتِ حرب نے جو حیرت انگیز ترقیاں کیں، انہوں نے جنگ کی رفتار کو اتنا تیز کر دیا کہ لڑائی کے نقشے نئے سرے سے بنتے رہے اور آج کے بڑے سے بڑے مدبّر کے لیے کل کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کرنا محال ہو گیا۔ کیونکہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا جانے لگا تھا کہ اس جنگ کے اسلوب بدلے ہوئے ہونے کی وجہ سے اصل لڑائی میدان کارزار کی بجائے دماغ کے پردوں میں لڑی جا رہی ہے۔ جیت اس فریق کے لیے ممکن تھی جو زیادہ شاطرانہ چالیں چل سکتا تھا اور ان کے ماتحت اپنے سامانِ حرب کو استعمال کرنے کے لائق تھا۔ سامان کی محض کمی اور بیشی فیصلہ کن نہیں ہو سکتی تھی۔

مثال کے طور پر تنہا جرمنی کے پاس اتنا سامانِ حرب نہیں تھا جتنا کہ اتحادیوں کے پاس مجموعی اعتبار سے تھا۔ پھر بھی اس کی یلغار ہر بار اتنی شدید ہوئی کہ یکساں طور پر کمزور اور طاقتور ملکوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس کی چال یہ تھی کہ جس طرف بھی حملہ کیا

پوری قوت کے ساتھ کیا۔ اس کے ہوائی جہاز ٹڈی دَل کی مانند پرواز کرتے اور جس طرح صحرائی ٹڈیاں قلیل مدت میں ہر قسم کی روئیدگی کو ختم کر کے خزاں کی سی کیفیت طاری کر دیتی ہیں، اسی طرح اس کا جہازی بیڑا جس طرف بھی رُخ کرتا، یکسر تباہی کا رنگ جم جاتا اور متاثرہ علاقے ہتھیار ڈال دینے کے سوا چارۂ کار نہ پاتے تھے۔

سقوطِ پولینڈ اس قدر جلد ممکن ہوا کہ انسانی تصور بھی اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ پھر آس پاس کے ملک یکے بعد دیگرے اس طرح مطیع ہوتے گئے جیسے ان کی کوئی حیثیت کبھی تھی ہی نہیں۔ پیرس پر پہلے بم کا گرنا تھا کہ حکومتِ فرانس نے اپنی طرف سے تسلیم و رضا کا اعلان کر دیا۔ رائے عامہ نے حکومتِ وقت کو مجبور کر دیا کہ لڑائی کے شعلے بھڑکا کر عشرت کدوں کو تباہ و برباد کرنے سے بہتر یہ ہے کہ غیر مشروط طور پر ہار مان لی جائے۔ فرانس میں اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے میں جرمنی کو جتنی دیر لگی، اس سے کہیں زیادہ وقت کسی بھی ملک کو بھیڑوں کے خلاف جنگ میں کامیاب ہونے کے لیے لگ سکتا تھا۔

فرانس کے بعد ناروے، ڈنمارک اور ہالینڈ کا نمبر تھا۔ ناروے کو شکست ہوتے ہی برطانیہ پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔ اربابِ حل و عقد نے سوچا کہ چیمبرلین سے زیادہ کوئی گھاگ وزیرِ اعظم چاہیے۔ چنانچہ ونسٹن چرچل کی سرکردگی میں مخلوط حکومت بنائی گئی اور اس نے آلاتِ حرب سے زیادہ دماغی ہتھیاروں سے کام لینا شروع کیا۔ اس نے اس شاطر کی چال چلی جو مات کا نقشہ ذہن میں بٹھا کر اپنے دو ایک مہرے جان بوجھ کر اس طرح پٹوا دیتا ہے کہ فریقِ مخالف کو بزعمِ خود اپنی بالادستی اور دوسرے کی کوتاہ دماغی کا مغالطہ ہو جاتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جیسے رسہ کشی کے مقابلے میں کھنچائی سے پہلے ذرا سی ڈھیل دے کر جمے جمائے پاؤں اکھاڑ دیئے جاتے ہیں۔ برطانیہ نے خود اپنی سرزمین پر بھی جرمن حملوں کا منہ توڑ جواب شروع ہی نہیں دیا۔ اس نے خود بھی حملے کئے لیکن زیادہ تر دفاعی پالیسی اختیار کی تاکہ دشمن کے ترکش میں جتنے بھی تیر ہوں، وہ آہستہ آہستہ نکل جائیں اور ہوا بھی یہی۔ جرمنی کی طاقت بتدریج گھٹتی چلی گئی۔

لڑائی کے میدان میں اٹلی کا داخلہ بھی جرمنی کے لیے پشت پناہ ثابت نہ ہوا، کیونکہ اس کی توجہ یورپ سے کہیں زیادہ افریقہ کی طرف مبذول تھی۔ بیشتر اطالوی فوجیں جو ایبے سینیا کی تسخیر کے لیے سیاہ برِ اعظم میں داخل ہوئی تھیں، وہیں روک لیا

پر قبضہ کرنے کے منصوبے گانٹھ رہی تھیں۔ یورپ میں اس کے حملے شمال مغربی یونان تک محدود رہے۔ اس منزل پر جرمنی سے پہلے ہی بڑی غلطی ہوئی۔ وہ یونان میں اٹلی کو نمٹنے دیتا۔ اپنے ساتھی کی حمایت میں اس نے بھی اپنی فوجیں یونان پر چڑھائیں اس طرح اس کا محاذ جنگ اتنا طویل ہو گیا کہ اس پر قابو پانا ممکن نہیں تھا۔

اس دوران میں برطانوی شاطروں نے یہ چال چلی کہ انھوں نے' روس کے ساتھ دلی مخاصمت ہونے کے باوجود اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ دشمن کا دشمن دوست بن سکتا ہے' اپنا دستِ تعاون روس کی طرف بڑھا دیا جو جرمنی کی بے پناہ کامرانیوں سے سراسیمہ ضرور تھا اور اپنی سراسیمگی کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ برطانیہ نے سوچی سمجھی چال کے تحت اس اعانت کو زیادہ پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ جرمنی جو اپنی کامیابیوں کے نشہ میں بہکا ہوا سا تھا، اس چال کو پوری طرح سے سمجھ نہ سکا اور صرف اس اصول کے تحت کہ جو پہلے مارے' میری کہلائے' اس نے جون ۱۹۴۱ء میں خود روس پر چڑھائی کر دی اور اس موقع پر موسم کی سختیوں کا ذرا بھی لحاظ نہیں رکھا۔ تاریخ کا یہ ورق اس کے ذہن سے نکل گیا کہ اس سرزمین کی سردی وسطی یورپ کے رہنے والوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہے، جس کے باعث نپولین کو بھی بے نیل و مرام وہاں سے مراجعت کرنی پڑی تھی۔ روس نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ کر دشمن کو پوری طرح نرغے میں لے لیا اور اس اثنا میں شدید سردی کا موسم آگیا۔ قدرت کا یہ غیر مرئی ہتھیار اصل آلاتِ حرب سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ جرمنی کی یہ دوسری بڑی غلطی تھی جس کا خمیازہ اسے پوری طرح بھگتنا پڑا۔

جرمنی، اٹلی اور جاپان میں جو معاہدہ اشتراکیت کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہوا تھا اور جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اب تک دستاویزات کے پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ جرمنی اور اٹلی پہلے سے لڑائی کے میدان میں اترے ہوئے تھے۔ لہٰذا تیسرے مہرے کو حرکت میں آنے کے لیے اشارہ کیا گیا۔ جاپان بھی پہلے سے گومگو کے عالم میں تھا، کیونکہ مشرقِ بعید میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے تیور بگڑ چلے تھے۔ اس کے لیے بھی اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا کہ بحرالکاہل کے علاقہ میں امریکہ کے بحری اڈے کو زک پہنچانے کے لیے پرل ہاربر پر حملہ کر دے۔ اس اقدام کے ساتھ ہی لڑائی کی نوعیت صحیح

معنوں میں عالمگیر اور زیادہ بین الاقوامی ہوگئی۔ کرۂ ارض کا ہر حصّہ آگ اور خون کی ہولی کھیلنے میں شریک ہوگیا۔ اس علاقے میں جاپان نے بھی وہ رنگ دکھایا جو سرزمینِ یورپ پر جرمنی دکھا رہا تھا۔ جس طرح جرمنی اپنی حدود کو نہیں پہچانتا تھا، اسی طرح جاپان کی جولانگاہ بھی لامحدود ہوتی چلی گئی اور جرمنی کی طرح جاپان کو بھی اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

ادھر اٹلی کی طاقت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں تھی۔ وہ ایبے سینیا کے تقریباً نہتے لوگوں پر قابو پاسکتا تھا، لیکن جب انگریزوں نے صقلیہ پر قبضہ کیا تو اس کے ہوش اُڑ گئے اور اڑتیس دن کی قلیل مدّت میں اس نے ہار مان لی۔ انگریزوں نے اس موقع پر یہ چال چلی کہ اٹلی کو خود زیادہ پریشان نہیں کیا بلکہ اسے مجبور کرکے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کرادیا۔ یہ بالکل انہونی سی بات تھی۔ ساری دُنیا ششدر و حیران رہ گئی۔

یہ ذہنی اذیت جرمنی کے لیے نئی مصیبت ثابت ہوئی۔ جن پتوں پر تکیہ تھا، وہی ہوا دینے لگے تھے۔ وہ مفتوحہ علاقوں میں نظم ونسق قائم رکھنے کے لائق نہیں رہا اور جب انہوں نے سر اٹھانا شروع کیا تو ان کی سرکوبی کے لیے کوئی حربہ اس کے پاس نہیں تھا۔ لہٰذا ۷ رمئی کو یورپ کی لڑائی جرمنی کی شکست کی صورت میں ختم ہوگئی۔

اُسی سال ۶ راگست کو امریکہ نے ہیروشیما پر ایٹم بم گراکر ساری دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ بم دراصل جرمنی نے بنائے تھے اور وہ انھیں صرف اس وقت استعمال کرنا چاہتا تھا جب اپنے بچاؤ کی کوئی دوسری صوت نظر نہ آتی ہو لیکن یہ موقع اسے نہ مل سکا اور برطانیہ نے یہ بم ہتھیا کر امریکہ کے حوالے کردیے۔ حقیقت کچھ بھی ہو "مدعیانِ ذی وقار"، تو یہی کہیں گے کہ پیسہ جس کی گرہ میں ہو وہی مالدار کہلاتا ہے۔ چوتھے دن امریکہ نے دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پردے مارا۔

ہیروشیما میں دوسری قسم کی تباہ کاریوں کے علاوہ مرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار بتائی جاتی ہے۔ ناگاساکی میں بھی موت کے گھاٹ اترنے والوں کا اندازہ اتنا ہی لگایا گیا ہے۔ دونوں مقامات کے وہ مظلوم الگ ہیں جو بموں کے مضر صحت اثرات کے تحت بعد میں سسک سسک کر ختم ہوگئے یا معذور وناکارہ بن گئے۔ شہنشاہ جاپان کے لیے بھی، جو سورج دیوی کی اولاد میں شمار ہوتا تھا، اس کے سوا چارہ کار نہیں تھا کہ غیر مشروط طور پر اپنی شکست کا اعلان کردے۔ اس طرح ۱۴ راگست کو، جو دو سال بعد قیام پاکستان کی

بھی تاریخ ہے، کرۂ ارض کے دونوں حصّوں میں دوسری جنگِ عظیم کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا ردِّ عمل اب تک بعض مقامات پر جاری ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑائی کے سب سے بڑے ہیرو یعنی ہٹلر کی شخصیت اور اس کی سرگرمیوں پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تاکہ یہ باب تشنۂ حالات نہ رہے۔ یہ کام اس سے پہلے ہی ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سلسلہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ اس کی کڑیاں کہیں سے بھی جوڑی جا سکتی ہیں۔

**ہٹلر اور اُس کی سرگرمیاں۔** ہٹلر کی عظیم شخصیت کے بارے میں اپنے مختصر خیالات کا اظہار پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔ جرمنی کا یہ ڈکٹیٹر جس نے نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا، ۲۰ راپریل ۱۸۸۹ء کو یعنی فلمی دنیا کے سب سے بڑے مزاحیہ اداکار چارلی چیپلن سے صرف چار روز پہلے، آسٹریا کے ایک چھوٹے سے علاقے براؤناؤ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ کسٹم کے محکمے کا ایک افسر تھا۔ اس وقت آسٹریا جرمنی کے زیرِ تسلط تھا بلکہ اس کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اپنے وطنِ مالوف میں تعلیم سے فارغ ہو کر ہٹلر نے جرمنی کے ان علاقوں کا رخ کیا جو براؤناؤ سے زیادہ جاذبِ نظر تھے۔ چونکہ وہ کم سنی ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گیا تھا، اس لیے روزی کمانے کا بار خود اسی پر آ پڑا۔ یہ غلط ہے کہ اس کا اصل نام شکل گروبر تھا اور بعد میں اس نے تبدیل کر کے ہٹلر رکھا۔ درحقیقت اس کے باپ ہی نے اپنا خاندانی نام تبدیل کیا تھا۔ یہ الزام بھی مغربی ستاستدانوں کی افتادِ دماغی کا کرشمہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے ناجائز تعلقات کا نتیجہ تھا۔ زندگی میں اس پر یہ الزام لگانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی اور مرنے کے بعد تو شیر کو بھی بزدل کہہ دینا آسان سی بات ہے۔

اس نے ویانا کی آرٹس اکیڈیمی میں باقاعدہ فنونِ لطیفہ کی تعلیم پائی اور مصوّری کی سند حاصل کر لی۔ اس لیے شروع میں اس نے رنگین پوسٹ کارڈوں کے ڈیزائن بنا بنا کر روزی حاصل کی۔ لیکن زندگی کے اس ابتدائی دور میں بھی اسے سیاست سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ کبھی کبھی برسرِ اقتدار ہیبس برگ خاندان کے خلاف آواز بلند کرتا اور تمام جرمن باشندوں کے اتحاد کی حمایت کرتا تھا۔

۱۹۱۱ء میں وہ اپنی تصاویر فروخت کرنے کے لیے میونک چلا گیا لیکن یہ محض ایک بہانہ تھا۔ وہ در اصل وہاں پہنچ کر ملک کی سیاسی فضا سے بخوبی واقف ہونا چاہتا تھا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو اُس نے جرمن فوج میں شامل ہو جانا مناسب سمجھا۔ تاہم اثر و رسوخ میسر نہ آنے کے باعث وہ مغربی محاذ پر لڑائی ختم ہونے تک محض لانس کورپورل بن سکا۔ لڑائی کے بعد اسے خفیہ فوج میں ایک عہدہ مِل گیا جو حکومت وقت کے خلاف سازش کرنے والوں کی نگرانی کے لیے قائم تھی۔ لیکن یہ کون جانتا تھا کہ وہ بذاتِ خود دارباب حکومت اور خصوصاً شاہی خاندان سے نفرت کرتا تھا، اس لیے کسی "مجرم" کو گرفتار کرانے کی بجائے وہ خود جرمن لیبر پارٹی کا رکن بن گیا۔

اس جماعت میں ہٹلر کی شرکت کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ ایک کارخانے کا مزدور ڈریکسر اس جماعت کا بانی تھا۔ اس کے خفیہ جلسے میونک کی ایک سرائے کے تہ خانے میں ہوا کرتے تھے۔ جماعت کی سرگرمیوں کا کھوج لگانے اور اس کی قوت کا اندازہ کرنے کے لیے ہٹلر کو نامزد کیا گیا۔ وہ اپنی شخصیت کو پوشیدہ رکھتے ہوئے ایک جلسے میں شریک ہوا۔ صرف چھے افراد جلسے میں حصہ لے رہے تھے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں سیکرٹری نے پچھلے جلسے کی مختصر کارروائی پڑھ کر سنائی اور اس پہلو پر غور کیا گیا کہ جماعت کے اراکین کی تعداد بڑھانے کے لیے کوئی موثر قدم اٹھایا جائے۔ اس نشست میں ہٹلر کو جماعت کے اغراض و مقاصد کا کچھ علم نہ ہو سکا لیکن اس نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ اگر ان چھے افراد کو صحیح قیادت نصیب ہو جائے تو یہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ مختلف پہلوؤں پر غور کرتا اپنے گھر چلا گیا۔

دوسرے روز اسے جماعت کی طرف سے ایک خط ملا جس میں اس کی رکنیت کو قبول کیے جانے کی اطلاع دی گئی تھی۔ وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گیا کہ اس جماعت کے اراکین سے سرکاری طور پر باز پرس شروع کرائی جائے یا خود اس کا رکن بن جائے۔ بہر نوع اس نے خاموشی اختیار کر لی کہ مصلحت اسی میں تھی۔ جماعت میں اس کا نمبر ساتواں تھا۔ اس نے دو چار اور جلسوں میں شریک ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو لوگ اس قدر گرویدہ ہوئے کہ اسے اپنا لیڈر مان لیا۔ لیڈر کے مشورے رنگ لائے اور پوشیدہ طور پر جماعت کے اراکین کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ ہٹلر نے اس کا نام بدل کر نیشنل سوشلسٹ جرمن

لیبر پارٹی رکھا۔ یہی نام جرمن الفاظ کے اختصار کے ساتھ ساری دنیا میں ناتسی پارٹی کے نام سے (جسے عام طور پر نازی پارٹی کہا جاتا ہے، حالانکہ لاطینی زبان کا حرف "زیڈ" جرمن زبان میں ٹی اور ایس کی آواز دیتا ہے) مشہور ہو گیا۔ یہ فیصلہ پہلے ہی کر لیا گیا تھا کہ ہٹلر ہر حال میں پس پردہ رہے گا اور اراکین کو اس کی پوری اعانت حاصل ہو گی۔

ایک سال بعد ۱۹۲۰ء میں اس جماعت نے ہٹلر کے صلاح و مشورے سے ایک پچیس نکاتی پروگرام بنایا جو مختصراً حسب ذیل ہے:

(۱) تمام جرمن نژاد افراد کا اتحاد خواہ وہ کسی سرزمین پر آباد ہوں۔

(۲) معاہدۂ ورسائی کی تنسیخ۔

(۳) مزید اشیائے خوراک پیدا کرنے اور فالتو اشخاص کی آباد کاری کے لیے فاضل اراضی کا حصول۔

(۴) صرف جرمن نسل کے لوگوں کو افراد قوم سمجھا جائے۔ یہودی اس زمرے میں نہ لائے جائیں۔

(۵) جو لوگ قوم کے رکن نہ ہوں، وہ غیر ملکی تصور کیے جائیں۔

(۶) سرکاری ملازمتوں کے لیے کسی جماعت کے افراد کو ترجیح نہ دی جائے۔ صرف ذاتی لیاقت و استعداد کی بنیاد پر قبضہ کیا جائے۔

(۷) حکومت عوام کی خوش حالی کو فروغ دینے کے لیے زیادہ توجہ دے۔

(۸) غیر ملکیوں کو حتی الامکان جرمنی سے نکالا جائے اور غیر جرمنوں کے داخلے کو روکا جائے۔

(۹) تمام باشندوں کو حقوق و فرائض میں مساوی درجہ دیا جائے۔

(۱۰) ہر شخص مفادِ عامہ کے لیے اپنی خدمات پیش کرے۔

(۱۱) اس ذریعۂ آمدنی کو منسوخ کیا جائے جو محنت کے بغیر حاصل ہوتی ہو۔

۱۲- دورانِ جنگ میں جو نفع اندوزی ہوئی ہے، اسے ضبط کیا جائے۔
۱۳- تمام اوقاف اور مشترک نوعیت کے کاروبار قومی نظام کے تحت لائے جائیں۔
۱۴- تھوک تجارت کے منافعوں کو ختم کیا جائے۔
۱۵- ضعیف العمری کی پنشن اور معاشرتی بیمے کا طریقہ رائج کیا جائے۔
۱۶- چھوٹی صنعتوں اور کاروبار کی حفاظت کی جائے اور سرکاری اسٹور بند کئے جائیں۔
۱۷- ارضی اصلاحات نافذ کی جائیں۔
۱۸- قوم کے خلاف ارتکابِ جرم کرنے والوں، نفع اندوزوں اور غاصبوں کا قلع قمع کیا جائے۔
۱۹- رومی آئین کالعدم کر کے خالص جرمن آئین نافذ کیا جائے۔
۲۰- قومی مفاد پورا کرنے والے نظامِ تعلیم کو رواج دیا جائے۔
۲۱- افرادِ قوم کی جسمانی حالت اور صحت کو بہتر بنایا جائے۔
۲۲- جبریہ فوجی تربیت کا قانون منظور کیا جائے۔
۲۳- اخبارات کی خبروں پر احتساب کیا جائے۔
۲۴- ملک میں تمام مذاہب کو اس حد تک آزادی دی جائے کہ قوم کے مفاد پر اس کا برا اثر نہ پڑے۔
۲۵- جرمنی کی مرکزی طاقت کو زیادہ مستحکم کیا جائے۔

ان نکات پر نظر ڈالنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ پروگرام ناقابل قبول یا ناممکن العمل ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ جرمن قومیت کے نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیا جائے ورنہ بعض نکات پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ افرادِ قوم میں صرف جرمن نسل کے لوگوں کو شامل کرتے ہوئے یہودیوں کو اس زمرے میں نہیں لایا گیا۔ یہ امتیاز مذہبی بنیاد پر نہیں بلکہ معاشرتی اعتبار سے برتا گیا تھا۔ جرمنی میں (اور جائزہ لیا جائے تو دوسرے ملکوں میں بھی) یہودیوں کا جو کردار رہا ہے، اس کے پیش نظر علیحدگی کی یہ پالیسی مناسب و موزوں تھی۔ اس جماعت کے پروگرام سے قطع نظر جب یہ نکتہ ملک میں ہٹلر کے برسرِ اقتدار آجانے کے بعد سرکاری پالیسی کا جزو بنایا گیا تو نام نہاد اتحادیوں

نے یہودیوں کے ساتھ اپنی ہمدردی جتانے کے لیے، اس پر خوب حملے کئے۔

۱۹۲۳ء میں نازی جماعت نے، جو تین سال کے عرصے میں اپنی سرگرمیٔ عمل کو تہ خانے سے نکال کر منظرِ عام پر لے آئی تھی، فوجی انقلاب کے لیے پہلا قدم اٹھایا تو اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ ہٹلر اور جماعت کے دوسرے سرکردہ افراد کو جن لوگوں پر پورا بھروسہ تھا، وہ نہ صرف کنی بچا گئے بلکہ باقاعدہ مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ ان میں میونخ میں مقیم فوجی دستوں کے سالار بھی شامل تھے۔ قدرتی طور پر گرفتاریاں لازمی تھیں۔ منجملہ دیگر اراکین کے ہٹلر کو پانچ سال کے لیے بویریا کے قلعۂ لینڈز برگ میں نظربند کر دیا گیا۔ یہ تنہائی اس کے لیے نعمت ثابت ہوئی اور اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "مائین کامف" (میری جدوجہد) کا پہلا حصہ قلم بند کر لیا۔ شاید ساری کتاب وہیں پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی لیکن نظربندی کی مدت آٹھ ماہ سے آگے نہ بڑھی اور قوم پرست حکام کی سفارش پر اس کو رہائی مل گئی۔ کتاب کا دوسرا حصہ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۷ء کے درمیان لکھ لیا گیا۔

جرمن قوم کی برتری کا نظریہ پیش کرنے میں ہٹلر کا دستِ راست ایک روسی نژاد شخص روزنبرگ تھا جو ۱۸۹۴ء میں روس کے ایک علاقے ریوال میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد حکومت سے اختلافات کی بنا پر ترکِ وطن کر کے جرمنی آیا اور وہیں متوطن ہو گیا۔ اس نے "حکایات بیسویں صدی" کے نام سے جو کتاب لکھی، وہ نازی جماعت کے نظریات کی ایک جامع دستاویز سمجھی جاتی ہے۔ اس میں انقلابِ فرانس کو جو ۱۷۸۹ء میں برپا ہوا تھا، جدید تاریخ کا سب سے زیادہ مذموم باب کہا گیا ہے۔ وہ ذاتی طور پر روسی اشتراکیت کا مخالف تھا اور چونکہ روسی اشتراکیت کی عمارت اس کے نزدیک فرانسیسی انقلاب کی بنیاد پر کھڑی کی گئی تھی، اس لیے وہ لائق تنسیخ تھی۔ ہٹلر کی طرح وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ گدھے گھوڑے میں امتیاز کئے بغیر مساوات کا اصول عمل میں لایا جائے۔ اس کے خیال میں پست اقوام کے افراد کو حکومت کے کاروبار میں حصہ لینے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اسے بھی یہودیوں سے زبردست بیر تھا اور یہ مخالفت مذہب کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ من حیث القوم ان کا کردار لائق نفرین تسلیم کیا گیا تھا۔

رُوسی اشتراکیت سے اختلاف کا سبب بھی یہی تھا کہ مارکسی نظریات میں یہودی سرمایہ داروں کے لیے پناہ کی گنجائش موجود ہے۔ ان نظریات میں نسلوں کا فرق کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ ہر چیز کو محض اقتصادیات کی عینک لگا کر دیکھا جاتا ہے۔ جرمن قوم آریائی نسل کے خمیر سے وجود میں آئی ہے۔ ہٹلر اور روزنبرگ اس خمیر میں کسی اور قوم کی آمیزش گوارا نہیں کرتے تھے۔ مغربی دنیا کے نام نہاد اتحادی فرق و امتیاز کے اس نظریے پر چراغ پا ہیں۔ لیکن علیحدگی کی جو پالیسی جنوبی افریقہ میں اختیار کی گئی ہے، اس پر خاموش ہیں۔ اس ضمن میں ان کی رگِ نقد و نظر پھڑکتی دکھائی نہیں دیتی۔

اس کے علاوہ ہٹلر کا یہ کردار لائقِ تحسین ہے کہ اس نے اپنے نظریے کا اظہار واضح طور پر علی الاعلان کر دیا۔ کوئی بات لگی لپٹی نہیں رکھی۔ کم سے کم مغربی اتحادیوں کی طرح اس نے ریاکاری سے کام نہیں لیا کہ ایک طرف عرب کے مسلمانوں کو تھپکا جا رہا ہے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، تمھارے حامی و مددگار ہیں اور دوسری طرف چوری چھپے اسرائیل کے یہودیوں کو اکسا کر مسلمانوں کے خلاف نہ صرف آمادہ کیا جا رہا ہے بلکہ ان کو عملی طور پر اس طرح امداد دی جا رہی ہے کہ وہ ان کے بنائے ہوئے منصوبوں میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ہٹلر نے دشمن کو ہمیشہ دشمن ہی کہا۔ اپنی دوستی کا ٹھپہ لگا کر کسی مغالطے میں مبتلا نہیں کیا۔ اس کی صاف گوئی، نیک نیتی، خلوص اور جذبۂ حب الوطنی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۳۰ء کے عام انتخابات میں اس کی جماعت کو رائخ اشٹاگ کی ایک سو چھ نشستیں مل گئیں۔ اگرچہ یہ تعداد حکومت بنانے کے لیے کافی نہیں تھی تاہم اس میں آئندہ ترقی کے امکانات پنہاں تھے۔

جرمنی کا آہنی صدر فیلڈ مارشل ہنڈنبرگ قوم میں اپنی انتہائی مقبولیت کے باوجود ہٹلر سے بڑا خائف تھا۔ وہ ہٹلر کے عروج میں اپنی پسپائی کا رنگ محسوس کرتا تھا۔ اس نے انتہائی کوشش کی کہ ہٹلر اس منزل سے آگے نہ بڑھے اور اس سلسلے میں وہ بعض ایسی باتیں بھی کر گزرا جو قومی مفاد کی خاطر ہرگز مناسب نہیں تھیں۔ مثلاً نظریۂ اشتراکیت کا سخت مخالف ہونے کے باوجود کہا جاتا ہے کہ اس نے رُوس سے ساز باز بھی کی تاکہ نازی جماعت کو زک پہنچانے کے لیے کوئی موثر حربہ اختیار کیا جا سکے لیکن مقبولیت، جس کی تعمیر ٹھوس بنیادوں پر ہو، بادِ مخالف کے جھونکوں کے باوجود

پروان چڑھتی ہے اور اس کا چراغ محض پھونکوں سے نہیں بجھتا۔

۳۰ر جنوری ۱۹۳۳ء کے انتخابات میں ہٹلر نے اتنی نشستیں حاصل کر لیں کہ وہ قوم پرستوں کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کے قابل ہو گیا اور ان جاگیرداروں اور صنعت کاروں کو جو اثر و رسوخ اور دوسرے ہتھکنڈے استعمال کر کے انتخابات میں اکثریت حاصل کرتے تھے، ان کی اقلیت کے باعث حزبِ مخالف میں جگہ دی۔ اس طرح وہ اپنی قوت کے بل پر جرمنی کا چانسلر بن گیا۔ گویا اس کے خوابوں کی پہلی تعبیر نکل آئی۔ جرمنی کے عوام نے جشنِ مسرت منایا اور ان کے برعکس یورپ کے دوسرے ملکوں میں صفِ ماتم بچھ گئی کیونکہ ہٹلر کے تیکھے پن سے کون واقف نہیں تھا۔ وہ اس کی کامرانی میں اپنی ہزیمت کی جھلک دیکھنے لگے تھے وہ کسی طرح اس کو عوام کی نظروں سے گرانے کی تدابیر پر سوچ بچار کرتے رہے۔

انتخابات کے صرف اٹھائیس دن بعد ۲۷ر فروری ۱۹۳۳ء کو جرمنی کے پارلیمنٹ ہاؤس میں زبردست آگ لگ گئی جس کے باعث عمارت کا بیشتر حصہ ضروری کاغذات اور دستاویزات سمیت جل کر خاک ہو گیا۔ مخالفین نے موقع کو غنیمت جانا اور یہ افواہیں پھیلائیں کہ آگ لگانے کا منصوبہ خود ہٹلر کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے تاکہ الزام دوسروں پر رکھ کر خود سرخروئی حاصل کرے اور آئندہ اس کی جماعت کو بھاری اکثریت حاصل ہو سکے۔ ان کے اس بے بنیاد الزام پر "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" والی بات صادق آتی ہے۔ اس آتشزدگی سے آئندہ کے انتخابات کا سلسلہ کس طرح مل سکتا تھا، جبکہ عین موقع پر جو لوگ گرفتار ہوئے، وہ تسلیم شدہ اشتراکی تھے اور ان کی ملک دشمنی کے راز پہلے ہی منکشف ہو چکے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے جرم کا اعتراف بھی کر لیا اور عدالت کے لیے ان کو سزا دینے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔

مخالفین کے پاس اپنے دعوے کی دلیل یہ تھی کہ یہ سب کچھ ہرمن گوئرنگ کے ایما و اشارے سے ہوا ہے جو رائخ اسٹاگ کا صدر تھا۔ اسی غرض سے اس نے ایک پوشیدہ سرنگ اپنی اقامت گاہ سے پارلیمنٹ ہاؤس تک بنوا رکھی تھی لیکن اس کمزور دلیل کے ساتھ اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کہ اس تباہی کے ذریعہ نازی جماعت اپنا کون سا مفاد پورا کرنا چاہتی تھی جبکہ وہ برسرِ اقتدار آ چکی تھی محض کاغذات

کو جلا دینے سے آئندہ انتخابات پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا جبکہ ہر بار رائے دہندگان کی فہرستیں نئے سرے سے تیار ہوتی ہیں۔

احتسابی جماعتیں۔ اس قسم کی سازشوں سے ہٹلر نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ بتیس دانتوں میں گھری ہوئی زبان کی طرح ہر طرف سے بچ بچا کر منزل مقصود کی طرف چلنا ہے۔ راستے کی رکاوٹوں سے باخبر رہنے، انھیں دُور کرنے اور ان پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ خفیہ پولیس کا ایک عمدہ محکمہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ ہنریک ہملر کی سرکردگی میں گیسٹاپو کا وجود عمل میں آیا۔ یہ لفظ جرمن زبان کے تین لفظوں گیہیمے اسٹاٹس پولتسی کا مخفف ہے جن کا لفظی ترجمہ "جرمنی کی خفیہ سیاسی پولیس" کیا جا سکتا ہے۔ اس کا کام یہ تھا کہ ملک دشمن عناصر کا سُراغ لگا کر فوراً حکومت کو مطلع کر دیا جائے تاکہ بروقت مناسب کارروائی ہو سکے۔ اس کے عملے کے افراد ملک کے ہر حصے میں متعین کر دیئے گئے۔

اس کے علاوہ اور جماعتوں کو بحال کیا گیا جو نازی پارٹی نے اپنی حفاظت اور دوسرے مقاصد کے لیے اپنے برسر اقتدار آنے سے بھی پہلے سے قائم کر رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک جماعت عرفِ عام میں "ایس اے" اور دوسری "ایس ایس" کہلاتی تھی۔

ایس اے دراصل اشٹروم آبٹیلنگ کا مخفف ہے جس کے معنے ہیں "طوفانی دستہ"۔ یہ ۱۹۲۲ء میں قائم ہوا تھا اور اس کا کام یہ تھا کہ جب بھی نازی جماعت کی مخالفت عملی طور پر ہو، اس طوفانی دستے کے افراد مخالفین پر طوفان بن کر چھا جائیں اور ان کا مقصد پورا نہ ہونے دیں۔ ۱۹۳۳ء کے بعد اس دستے نے ایک قسم کی سرکاری نوعیت حاصل کر لی اور اس کا مقصد یہ بھی ہو گیا کہ وہ جرمن نوجوانوں کو فوجی تربیت دے۔ نیز ضرورت ہو تو تمام نظم و نسق کے فرائض انجام دینے لگے۔ لیکن اس دستے میں کچھ عنصر ایسے لوگوں کا موجود تھا جو اشتراکی رجحانات کے حامل تھے اور چاہتے تھے کہ اس جماعت کو آلۂ کار بنا کر اپنے موقف کی تبلیغ کریں۔ دوسری طرف فولاد کے صنعت کار جن کے کارخانوں کی نئے سرے سے تنظیم سرکاری روپے سے کی گئی تھی اور وہ اس طرح عروج پا کر آنکھیں دکھانے لگے تھے، ہٹلر پر زور ڈالنے لگے

کہ نیم فوجی دستوں کو ختم کر کے باقاعدہ لام بندی اور استحکامِ شہنشاہیت کی پالیسیاں اختیار کی جائیں۔

۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو جرمنی کے فولادی کارخانوں کے بادشاہ ڈاکٹر کرپس کے مکان پر ایک کانفرنس ہوئی جس میں حکومت کے طرزِ عمل پر اعتراضات کیے گئے اور اس سے مقابلہ کرنے کا لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ تائید کرنے والوں میں ایس اے کا سربراہ کپتان رُوہم بھی شامل تھا۔ ہٹلر کو اس شخص پر بڑا اعتماد تھا۔ اس کے علاوہ دستے کے اور رکن بھی شریک تھے۔ ہٹلر کو اپنی خفیہ پولیس کے ذریعہ اس سازش کا پتہ چل گیا چنانچہ جلسہ ختم ہونے سے پہلے چھاپہ مارا گیا۔ باقاعدہ لڑائی ہوئی۔ بہت سے لوگ اس ہنگامے میں مارے گئے۔ باقی گرفتار کر لیے گئے۔ اسی تاریخ سے اس طوفانی دستے کو ختم بھی کر دیا گیا۔ گویا اس کا انجام بجائے خود ایک طوفان کی صورت میں ہوا۔

دوسری جماعت کا نام ایس ایس تھا جو شٹز اشٹیفل کو مخفف کر کے بنایا گیا تھا۔ یہ بھی ایک حفاظتی دستہ اور ایک لحاظ سے ایس۔ اے کی ایک شاخ تھا۔ اسے ۱۹۲۸ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ صرف اعلا طبقے کے قابلِ اعتماد افراد اس میں شامل کیے جاتے تھے۔ ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو جب ایس اے کا خاتمہ ہو گیا تو اس حفاظتی دستے کی اہمیت نازی پارٹی کے نظام میں بڑھ گئی۔ اس کو زیادہ وسیع کر کے اس کے افراد کی تعداد تین لاکھ کر دی گئی۔ ان میں سے بیشتر رضاکارانہ خدمات انجام دیتے اور فالتو وقت میں اپنا کاروبار کرتے تھے۔ چونکہ اس دستے کے لوگ سیاہ وردی پہنتے تھے، اس لیے عرفِ عام میں ان کو "سیاہ پوش"، کہا جاتا تھا۔

ان میں شامل ہونے والوں کے لیے حکم تھا کہ وہ صرف جرمن نژاد اعلا طبقے کی عورتوں سے شادی کریں تاکہ نسلی امتیاز کا رنگ ان میں نکھرا رہے۔ اسی دستے کے چند زیادہ معتبر افراد سے ہٹلر کے باڈی گارڈ کی تشکیل ہوئی تھی۔ اس دستے کا سربراہ بھی ہنریک ہملر تھا۔ اس طرح گیسٹاپو کے ذریعہ باغیوں کا سُراغ لگایا جاتا اور ایس ایس کے ذریعہ ان کی سرکوبی کرائی جاتی تھی۔ یہ دستہ نازی جرمنی کے آخری وقت تک قائم رہا۔

نازی پارٹی نے جو مذکورہ بالا پچیس نکاتی پروگرام بنایا تھا، اس میں یہودیوں سے

الگ رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس پارٹی کا یہودیوں کے ساتھ عام طور پر جو برتاؤ رہا اس پر سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

**یہودیوں سے نفرت کا سبب** ۔ ضرورت سے زیادہ پروپیگنڈا ہونے کے باعث یہ خیال دنیا کے بیشتر افراد کے دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ ہٹلر کو اپنے خاص فطری رجحانات کے باعث یہودیوں سے للہی بغض تھا اور ان کے خلاف اس کا جذبۂ نفرت اس درجہ بڑھ گیا تھا کہ وہ ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ جونہی اسے موقع ملا اس نے سوچی سمجھی اسکیموں کے ماتحت اس قوم کے افراد کا قتل عام شروع کرا دیا اور اس طرح قلیل مدت میں حضرت موسیٰؑ کے ماننے والے لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہٹلر کی شہرۂ آفاق تصنیف "میری جدوجہد" میں سے متعدد عبارتیں نقل کی جاتی ہیں، جن سے واقعی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہٹلر کو یہودیوں سے سخت نفرت تھی اور وہ کسی عنوان ان کو اپنے ملک میں زندہ سلامت دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہٹلر دنیا کا پہلا انسان یا کم سے کم جرمن قوم کا پہلا فرد تھا جس نے قوم یہود کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا تھا یا اس کے برعکس یہ قوم ہی اپنے بداطوار کی وجہ سے ہر زمانے میں لائقِ نفرین ٹھیرائی گئی ہے؟

تاریخ کے صفحات پر تحقیقی نظر ڈالی جائے تو اس سوال کا بھرپور جواب آسانی سے مل سکتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہر عہد کے مفکرین نے ان کی انسانیت سوز حرکتوں کے پیش نظر اچھی طرح سوچ سمجھ کر ان کے بارے میں جو بری رائے قائم کی ہے، اس کا تقاضہ یہی ہے کہ ان کو بنی نوع انسان کے زمرے سے بالکل خارج کر دیا جائے۔ جیسے بدگوشت کو مجبوراً جسم سے کاٹ کر اس لیے پھینک دیا جاتا ہے کہ اس کا زہر دوسرے اعضاء کو مسموم نہ کرے۔

ہٹلر کی پیدائش سے ایک سو سال سے بھی زیادہ عرصے پہلے مشہور اطالوی فلسفی یوہان گوٹلیب فکٹے نے، جو ۱۷۶۲ء میں پیدا ہو کر ۱۸۱۴ء میں فوت ہوا تھا، اور جو برلن یونیورسٹی کا پروفیسر اور اولین ریکٹر تھا، اپنے ایک مقالے میں بالکل واضح طور پر یہ الفاظ شامل کئے:۔

"یورپ کے تقریباً تمام ملکوں میں بری طرح چھائی ہوئی ایک ایسی طاقت، لیکن مضرت رساں قوم آباد ہے جو دوسروں سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی ہے اور کسی نہ کسی طرح موقع نکال کر دوسروں پر غالب آجاتی اور پھر دل کھول کر ان پر ظلم و تشدّد روا رکھتی ہے۔ میرا مطلب قوم یہود سے ہے۔ میں ہرگز یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اس قوم نے کسی ذاتی صلاحیت و استعداد کی بنا پر اپنا رعب قائم کیا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ وہ ظلم و ستم ہے جسے بعض صلح پسند قومیں محض مصلحتاً برداشت کرتے ہوئے خاموش رہنا گوارا کر لیتی ہیں تاکہ نقص امن کے امکانات زیادہ فروغ نہ پاسکیں۔ اِس قوم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کا حقیر سے حقیر فرد بھی اپنے آپ کو دوسروں سے افضل و بہتر سمجھتے ہوئے اپنا شجرۂ نسب زمانۂ قبل تاریخ کی کسی برگزیدہ ہستی سے ملا لینے کی کوشش کرتا ہے اور کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اس سعی و کاوش میں اپنے آپ کو کامیاب کر دکھاتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ قوم ہے جس کے بزرگوں کو ان کی نالائقیوں اور ستم رانیوں کی وجہ سے خارج الملک اور راندۂ درگاہ کیا گیا تھا اور اسی لیے آج ان کی اولاد کرۂ ارض کے ہر حصے میں لاوطنی کی زندگی بسر کر رہی ہے اور بے غیرتی کا یہ عالم ہے کہ اسے اپنی محرومی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اس کے افراد شریفانہ جذبات سے یکسر خالی الذہن ہو کر ذلیل سے ذلیل پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اکثر ملکوں میں ان کو عام معاشرے سے دُور اور بالکل بے تعلق رکھا جاتا ہے۔ اور انھیں اپنی اس نسلی علیحدگی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ صرف وہ جنھیں ان کی اصل ذہنیت کا علم نہیں ہے، انسانی حقوق کی بنیاد پر ان کے لیے وہ مراعات چاہتے ہیں جن کے وہ حقیقتاً مستحق نہیں ہیں۔"

ہٹلر کی پیدائش سے تقریباً اسّی سال پہلے ایک سیاسی مصنّف اور شاعر ارنسٹ موریٹز آرنڈٹ نے جو گریفس والڈ اور بون یونیورسٹیوں میں تاریخ کا پروفیسر تھا، ایک بیان میں کہا:۔

"یہودی ہونے کے اعتبار سے یہودی اس دنیا میں اور کم سے کم میرے ملک میں ہرگز رہنے کے لائق نہیں ہیں اور اس لیے میں نہیں چاہتا کہ سرزمین جرمنی پر ان کی نشوونما کا سلسلہ جاری رہے۔ محنت و مشقت کے کام سے گھبرانا اور سہل انگاری کو اپنے لیے طرۂ امتیاز بنانا ان کی فطرت میں داخل ہے۔ وہ پیشانی کا پسینہ بہا کر روٹی کمانا نہیں جانتے۔ اخلاقی اعتبار سے ان کی عادتیں مجرمانہ ہیں۔ وہ کھٹمل، پسّو اور طفیلی کیڑوں کی طرح دوسروں کا خون چوستے رہتے ہیں اور اس ذلیل حرکت پر فخر کرتے ہیں۔"

ہٹلر کی پیدائش سے چالیس سال پہلے ایک اور فلسفی اور لانگن یونیورسٹی کے لیکچرار لڈوگ فیوئرباخ نے لکھا تھا:

"روزِ اول سے آج تک یہودیوں نے اپنے کردار کی ایک خصوصیت کو برقرار رکھا ہے اور وہ یہ کہ ان کا اصولِ حیات، ان کا ایمان اور عقیدہ خود غرضی پر مبنی ہے اور وہ اس خود غرضی کو ایک لامذہبی رنگ دے کر اس پر کاربند ہیں۔"

۱۸۵۳ء میں ایک سیاستداں مستشرق پال آنٹن ڈالیگارڈ نے جو گوٹنگن یونیورسٹی میں السنۂ شرقیہ کا پروفیسر تھا، ایک بیان میں کہا:۔

"دریائے وسچولا اور دریائے ڈینیوب کے درمیان جو وسیع علاقہ ہے اور جس سے ہمیں غیر معمولی لگاؤ ہے، بیس لاکھ یہودی آباد ہیں جو جرمن نسل میں شامل ہونے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اپنی قوم پر یہ ستم کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک یہودی ہمارے درمیان رہیں گے، ہم نہ تو صحیح یورپین بن سکیں گے اور نہ صحیح عیسائی۔ بلکہ وہ بھی نہیں ہو سکتے جو ہونا چاہتے ہیں۔"

۱۹۱۴ء میں ہائنرک کلاس نے جو ڈینیل فرائی مان کے قلمی نام سے مضامین لکھتا تھا، اپنے ایک مقالے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے:۔

"یہودیوں کو بری یا بحری فوج (اس وقت فضائی فوج کا وجود

نہیں تھا) خدمات انجام دینے کی اجازت نہ دی جائے۔ وہ نہ کسی کو ووٹ دیں اور نہ کسی انتخاب میں انھیں ووٹ دیا جائے۔ قانون سے متعلق پیشوں سے ان کو دُور رکھا جائے۔ وہ مدرسوں میں تعلیم نہ دیں۔ وہ تھیٹر نہ چلائیں۔ وہ اخبارات جن کے عملے میں یا لکھنے والوں میں یہودی شامل ہوں، اس امر کا اظہار صفحۂ اوّل پر کردیں۔ دوسرے اخبارات کے لیے یہودیوں کو خریدار تک نہ بنایا جائے۔ کسی بنک کی سربراہی کسی یہودی کے سپرد نہ کی جائے۔ تاوقتیکہ وہ ان کے ذاتی بنک نہ ہوں۔ ان کے بنکوں میں جرمن نسل کے باشندے اپنی رقمیں جمع نہ کریں۔ کسی یہودی کو غیر منقولہ جائداد خریدنے کا موقع نہ دیا جائے، نہ اس کے پاس جائداد رہن رکھی جائے۔ وجہ ان سب باتوں کی صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ اس قوم کے افراد حد درجہ متعفّن اور ناقابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔"

ان بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہٹلر سے بہت پہلے بھی اعلا مفکرّین یہودیوں کے مخالف رہے اور ہمیشہ ان سے علیحدہ رہنے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ جرمنی کے علاوہ انگلستان، فرانس اور اٹلی وغیرہ میں بھی یہودیوں سے برابر نفرت کی گئی ہے۔ البتہ ان ملکوں میں بعض سیاسی مقاصد کی بنا پر اب یہودیوں سے منافرت میں کمی ہوگئی ہے۔ روس میں بھی الحاد کا رنگ جمنے سے قبل یہودیوں پر ظلم ڈھائے گئے اور ان کو اچھوت سے زیادہ برا سمجھا گیا ہے۔

اس نفرت اور علیحدگی والی پالیسی کے دو سبب ہیں: ایک مذہبی دوسرا معاشرتی۔ مذہبی اس اعتبار سے کہ دنیا کا ہر عیسائی یہودیوں کو اس جرم کا مرتکب سمجھتا ہے کہ انہی کی قوم کے افراد نے حضرت عیسیٰؑ کو سُولی پر لٹکایا تھا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے اور اس کی تکذیب نہیں کی جاسکتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ انیس صدی پہلے کے کسی جرم کا سزاوار اس قوم کے موجودہ افراد کو قرار دینا کس حد تک جائز ہے۔ ان کے خلاف فیصلہ کرنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ اگر قدرت بلاوجہ موذی امراض کو ماں باپ سے اولاد میں بلکہ نسلاً بعد نسل منتقل کرسکتی ہے جب کہ اولاد قصوروار نہیں ہوتی تو حضرت عیسیٰ مصلوب

کرنے والی قوم کے افراد بھی رہتی دنیا تک اس جرم کے سزاوار ٹھیرائے جا سکتے ہیں۔

معاشرتی پہلو یہ ہے کہ جب یونانیوں اور پھر رومیوں کے زبردست حملوں سے تنگ آ کر بے شمار یہودی ارضِ فلسطین سے فرار ہو کر قرب و جوار کے ملکوں، خصوصاً یورپی علاقوں میں آباد ہونے لگے تو ہر جگہ ان پر کڑی پابندیاں بھی عائد کی گئیں۔ سب سے بڑی پابندی یہ تھی کہ وہ کوئی غیر منقولہ جائداد نہیں خرید سکتے اور نہ بڑی تجارتوں میں حصّہ لے سکتے تھے۔ ایسی صورت میں یہودیوں کے لیے اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ ملازمت کریں، معمولی کاروبار میں حصّہ لیں یا اپنا روپیہ سود پر چلائیں۔ آخری مشغلہ سب سے زیادہ آسان اور نفع بخش تھا۔ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اپنے گزارے کے لیے اچھّی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس مذموم پیشے نے ان میں کاہلی اور محنت و مشقّت سے دُور رہنے کی بُری عادتیں پیدا کر دیں۔ ضرورت مند اُن سے روپیہ قرض لیتے اور سُود ادا کرتے لیکن اس کے ساتھ ہی نفرت بھی کرتے تھے۔

عام طور پر ان کو طفیلی کیڑوں کا خطاب دیا جاتا تھا۔ سود کی شرح اور دوسری شرائط اتنی سخت ہوتی تھیں کہ حساب بیباق نہ کر سکنے والی بعض مجبور ہستیاں اُن سے بچنے کے لیے خودکشی تک کر لیتی تھیں۔ بعض ملکوں نے یہودیوں کے اس لین دین پر قانون کی صورت میں پابندیاں عائد کیں لیکن ہمارے مُلک کے بعض پٹھانوں کی طرح ان کا کاروبار چلتا ہی رہا۔ ملکی قوانین کے علاوہ اکثر مذاہب میں بھی سود کے کاروبار کو ناجائز قرار دیا گیا ہے لہٰذا ان سے دُور رہنے کی تلقین کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔

یہودیوں نے جرمنی میں رہ کر جرمنی کی قومی تحریک کو بھی زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ جرمن عوام اشتراکیت کے خلاف تھے اور یہودی اس مسلک کا پرچار کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ کارل مارکس، جو اشتراکی نظام کا قائد تھا، کٹّر یہودی تھا اور یہودی ہمیشہ اس کی عزّت کرتے رہے ہیں۔ ہٹلر کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے بھی اس قوم کے افراد کا رویّہ ملک میں جذبۂ قوم پرستی کے منافی تھا، اس لیے جرمن ان سے تعلقات برقرار رکھنے کے باوجود نفرت بھی کرتے تھے۔ لہٰذا یہودیوں کے خلاف ہٹلر کا غصّہ انوکھا نہیں تھا۔ ہٹلر کو اچھّی طرح معلوم تھا کہ پہلی جنگِ عظیم کے

دوران میں یہودی ہی اس ملک کی تمام خبریں رُوس، برطانیہ اور فرانس کو پہنچاتے تھے کیونکہ ان کے ادارے خبروں کے نظام پر حاوی تھے۔ خود ملک میں یہودیوں کے اخبارات قومی تحریکات کا مذاق اڑاتے اور قائدین کے خلاف زہرافشانی کرتے تھے۔ لہٰذا ان پر ہر لحاظ سے احتساب کرنے اور انجام کار ان کو ملک سے نکالنے کا فیصلہ صادر کرنے کا جواز ناقابل تردید کہا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر ہٹلر کو یہودیوں سے جو للّہی بغض ہو گیا تھا، اس پر طنزیہ انداز میں بعض لطیفے بھی گھڑے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک لطیفہ سنیئے جسے خود یہودی بہت مزے لے کر سناتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہٹلر نے ایک روز پامسٹ (ماہر فراست الید) کو اپنا ہاتھ دکھاتے ہوئے پوچھا "بتاؤ، میں کس روز اس دنیا سے رخصت ہوں گا؟" پامسٹ نے جواب دیا "یہودیوں کے تعطیل والے دن" ہٹلر اس بات پر بہت متعجب ہوا اور اس نے پوچھا "اس قدر وثوق کے ساتھ اس دعوے کا ثبوت تمہارے پاس کیا ہے؟" پامسٹ نے فوراً جواب دیا "تم خواہ کسی روز مرو، یہودی اس روز کی خوشی میں تعطیل ضرور منایا کریں گے"!

رات کی تاریکی ختم ہو کر صبح کاذب کے اجالے میں بدلنی شروع ہوئی تھی، میں انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا تاکہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر اس معبودِ حقیقی کے سامنے جھک جاؤں جسے باشندگانِ عالم کی بہت بڑی اکثریت کسی نہ کسی نام سے خالقِ ارض و سما سمجھتی اور اس اعتبار سے اس کی پرستش یا پوجا کرتی ہے۔ بھائی جان محترم پہلے ہی تیار ہو چکے تھے لیکن وہ میرے منتظر رہے تاکہ دونوں بھائی مل کر نماز باجماعت پڑھیں۔

پہلے سے طے شدہ راہ نامے کے مطابق ہماری اگلی منزل ڈارمسٹاٹ تھی جو صوبہ ہیسے کا ایک صنعتی شہر ہے۔ ہمیں اس شہر میں صرف چند گھنٹے ٹھہرنا، بطور خاص امی مرک کی دواساز فیکٹری کو دیکھنا اور آگے بڑھ جانا تھا۔

ہیسے۔ پہلے تو نہیں لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی بندر بانٹ اور کاٹ چھانٹ ہو جانے پر وفاقی جمہوریہ جرمنی کے نقشے پر نظر ڈالی جائے تو یہ صوبہ بالکل دل کی طرح ملک کے وسط میں نظر آئے گا اور وضع قطع کے اعتبار سے بھی اس کا پھیلاؤ دل سے مشابہہ

ہے لیکن اس کے سوا کوئی ایسی جاذبیت اس میں نہیں پائی جاتی کہ اسے صحیح معنوں میں قلبِ جرمنی کہا جا سکے۔ البتہ تاریخی اعتبار سے اس حصّے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

نام کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ بہت ہی پُرانے زمانے میں فرینک قوم کے ایک قبیلے "ہیسی" کے افراد یہاں آکر آباد ہوئے تھے، حالانکہ اس سے بھی بہت پہلے یعنی پہلی صدی عیسوی میں یہاں جو قبائلی رہتے تھے، وہ حتّی کے نام سے مشہور تھے۔ تاہم رومی نوشتوں میں اس علاقے کا ذکر صرف ہیسے کے نام سے ہوا ہے اُس لیے ہیسی قبیلے کو زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں ہیسی قبیلے کے افراد نے سب سے پہلے عیسائی مذہب قبول کیا اور اس طرح اس کی اہمیت بڑھ گئی۔

۹۳۶ء میں اوتو سریر آرائے سلطنت ہوا تو یہاں کے باشندوں نے فوراً اس کی شہنشاہیت تسلیم کر لی۔ بارہویں اور تیرہویں صدی میں وہ تھورنگیا کا جزو بنا رہا اور جب تیرہویں صدی کے آخر میں ہیسے کے فرمانروا ہنری کو زمرۂ شہزادگان میں شامل کر لیا گیا تو اس کی حیثیت پھر بلند ہو گئی۔ تاہم اس کے بعد کی تین صدیوں میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی۔ سولھویں صدی کے شروع میں جب کہ یہاں کی حکومت فلپ کے سپرد تھی، اس نے تعلیمی اور معاشرتی زندگی کو بڑا عروج دیا، خصوصاً اس کے عہد کی ماربرگ یونیورسٹی قابلِ ذکر ہے جس نے بہت سی نامور ہستیاں پیدا کی ہیں۔

فلپ کے انتقال کے بعد یہ علاقہ اس کے چار بیٹوں میں تقسیم ہو گیا اور چار حصّے الگ الگ جاگیروں کی صورت میں ہیسے کیسل، ہیسے دارمسٹاٹ، ہیسے ماربرگ اور ہیسے رہین فلس کہلانے لگے۔ کچھ عرصے بعد دو بھائیوں کا سلسلۂ نسل ختم ہو گیا۔ لہٰذا ان کے حصص پر باقی دو بھائیوں میں تنازعہ شروع ہو گیا جو سی سالہ جنگ کے دوران میں زیادہ نازک صورت اختیار کر گیا اور اس وقت تک طے نہ ہوا جب تک کہ ساری املاک دو مساوی حصّوں میں تقسیم نہ ہو گئی۔ انقلابِ فرانس کے دوران میں بھی یہاں کی سیاست اور نظم ونسق پر برا اثر پڑا اور ایک ہرجائی کی طرح یہ علاقہ

کبھی کسی کے اور کبھی کسی کے قبضے میں جاتا رہا۔ یہ کیفیت خود جرمنی کے قومی انقلاب تک قائم رہی۔

بصورتِ موجودہ اس صوبے کا رقبہ آٹھ ہزار مربع میل سے زیادہ ہے اور اس کی مجموعی آبادی پچپن لاکھ سے کچھ کم ہے۔ اس صوبے کے بعض صنعتی علاقے بہت ہی گنجان آباد ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوتے ہی اس صوبے پر بھی سخت بمباری ہوئی تھی جس کی وجہ سے اٹھارہ فیصدی مکانات بالکل مسمار ہوتے اور لاتعداد انسان موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ سات لاکھ کے قریب باشندوں نے ترکِ وطن کیا۔ پہلے اس صوبے کا صدر مقام ڈارمشٹاٹ تھا لیکن اب ویسباڈن ہے، جس کی آبادی سوا دو لاکھ کے قریب ہے۔ صدر مقام نہ ہونے کے باوجود ڈارمشٹاٹ اپنی صنعتوں، خصوصاً دوائی کارخانوں کی وجہ سے مشہور ہے، جن میں سے ای مرک کی فیکٹری دیکھنے کا شوق ہمیں اس شہر میں لیے جا رہا تھا۔

ہمیں پروگرام کے مطابق ریل کے ذریعہ سفر کرنا تھا کیونکہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ یوں بھی ہم چاہتے تھے کہ ریل کے ڈبوں میں عوام کے ساتھ مل کر بیٹھیں اور ان کے خیالات و تاثرات کا جائزہ لیں۔ کسی علاقے کے حالاتِ حاضرہ کو سمجھنے کے لیے یہ طریقہ مناسب و موزوں ثابت ہوتا ہے۔ جرمنی کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہمیں اس کا تجربہ بھی ہو گیا تھا۔

ہم نے ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد احتیاطاً ریلوے اسٹیشن کے دفتر معلومات سے ریل گاڑی کی روانگی کا صحیح وقت معلوم کر لیا۔ شیڈیول کے مطابق اسے ساڑھے آٹھ بجے چھوٹنا تھا۔ محبوب الٰہی کے لیے بھی ہائیڈل برگ سے ہمارے ہمراہ جانا طے ہو گیا تھا۔ اس لیے گاڑی میں تین نشستیں ہمارے لیے ہوٹل والوں نے محفوظ کرا دی تھیں۔ ٹکٹ ہمارے قبضے میں آ چکے تھے۔

میں نے درمیانی وقفے کو خالی اینڈ کر گذارنے کی بجائے مناسب سمجھا کہ کچھ مطالعہ ہی کر لیا جائے۔ آخر رات میں آنکھ کھل جانے کے بعد ہٹلر کی جن سرگرمیوں کا جائزہ لیا تھا، ان کے ضمن میں چند پہلو تشنہ رہ گئے تھے۔ یعنی ہٹلر کے ساتھیوں کا حال ذرا تفصیل سے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب تک بھائی جان محترم احبابِ وطن

کے نام خطوط لکھنے کا سلسلہ ختم کریں، میں اس زنجیر کی ترک شدہ کڑیوں کو جمع کر کے آپس میں جوڑ لوں۔

**گوئرنگ۔** قومی اشتراکی یعنی نازی جماعت میں ہٹلر کے بعد فیلڈ مارشل ہرمن ولہلم گوئرنگ کو دوسرا اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا۔ وہ بویریا کے شہر روزن ہائم میں ۱۲ر جنوری ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ جنوب مغربی جرمن افریقہ کا گورنر تھا۔ پہلی عالمگیر جنگ میں وہ جرمنی کی فضائی فوج میں شامل ہوا اور اس نے مشہور فضائی بیڑے رکتوفن کی قیادت کی۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو فوج میں اسے کپتان کا درجہ حاصل تھا۔

پھر وہ سویڈن جا کر وہاں شہری پرواز کے محکمے میں ملازم ہو گیا۔ وہیں رہتے ہوئے اس نے سویڈن کی ایک لڑکی کارن فوک سے شادی کر لی۔ اس کے بعد وہ جرمنی میں ہوائی جہازوں کے انجن بنانے والے کارخانے میں شامل ہو گیا۔

نومبر ۱۹۲۳ء میں اس نے میونخ کے ہنگاموں میں حصہ لیا اور فرار ہو کر اٹلی چلا گیا جہاں سے ۱۹۲۷ء میں واپس آ گیا۔ اس وقت اس نے ہٹلر کے ساتھ مل کر نازی جماعت کے طوفانی دستوں کی نئے سرے سے تنظیم کی اور اگلے سال جرمن پارلیمان کے لیے منتخب ہو گیا۔ ۱۹۳۲ء میں اس کی صدارت کی ذمہ داری اسے سونپ دی گئی۔

۱۹۳۳ء میں جب ہٹلر کو عروج حاصل ہوا تو اسے پرشیا کا وزیر اعظم اور وزیر امور داخلہ مقرر کر دیا گیا۔ پرشیا اس وقت جرمنی کا ایک اہم حصہ تھا۔ گوئرنگ کی ذاتی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر یہ منصب اسے تفویض کیا گیا تھا۔ اس نے وہاں کی پولیس اور اندرونی نظم و نسق کے ہر محکمے میں نازی خیالات کے افراد بھرتی کرنے شروع کر دیئے۔

۱۹۳۵ء میں اس نے دوسری شادی کر لی۔ پہلی بیوی کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہو چکا تھا۔ دوسری بیوی کا نام ایمی سونے مین تھا جو ایک مشہور فلم ایکٹریس تھی۔

کچھ عرصے بعد اسے جنرل کا عہدہ دے کر وزیر فضائیہ بنا دیا گیا۔ اس حیثیت سے اس نے جرمنی کا ایک ایسا خفیہ فضائی دستہ منظم کیا جس کا علم ہٹلر اور چند

قریبی عہدیداروں کے سوا کسی کو نہ ہو سکا۔ پھر اس نے اقتصادیات کے میدان میں قدم رکھا اور چہار سالہ منصوبے کا سربراہ مقرر ہو گیا۔ خام مال کی فراہمی کا جہاں تک تعلق تھا، اس نے جرمنی کی حیثیت اتنی مستحکم کر دی کہ کوئی بھی شے درآمد کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ڈاکٹر شافٹ جو ماہرِ اقتصادیات سمجھا جاتا تھا اس کے سامنے جم نہ سکا۔

فروری ۱۹۳۹ء میں اسے فیلڈ مارشل کا درجہ مل گیا۔ اتحادیوں کا کہنا ہے کہ اس موقع پر اس نے یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے یا ملک بدر کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس وقت تک یہودیوں کے خلاف کوئی باقاعدہ تحریک شروع نہیں ہوئی تھی۔ فیلڈ مارشل کا درجہ حاصل کرنے کے بعد وہ جرمنی کی فضائی فوج کا کمانڈر انچیف ہو گیا۔ جرمنی کی فضائی فوج جو لُفٹ وافے کہلاتی تھی، اتنی قوی تھی۔ کہ دنیا کے بہت سے ملک اس کے محض تصور سے کانپتے تھے۔

اپنی نجی زندگی میں وہ شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ رہنے کا عادی تھا۔ اس کی قیام گاہ جسے پہلی بیوی کے نام پر کارِن ہوس کہا جاتا تھا، دیکھنے دکھانے کے لائق تھی لیکن جب جرمنوں کی قسمت کا پانسہ پلٹا تو دوسرے سربراہوں کی طرح اسے بھی مصائب کا شکار ہونا پڑا۔

مئی ۱۹۴۵ء میں اس نے شکست کو یقینی جان کر برچٹس گاڈن میں پناہ لی۔ لیکن امریکی دستوں نے جنھیں لڑائی کے میدان میں بالادستی حاصل ہو گئی تھی اسے گرفتار کر لیا۔ نیورمبرگ کے مقام پر ایک نام نہاد بین الاقوامی فوجی جرگے کے سامنے اسے پیش کیا گیا۔ ان ججوں نے جن کے پاس انصاف کے سوا سب کچھ تھا، اس پر لگائے ہوئے تمام الزامات کا مجرم قرار دیا۔ اور پھانسی کی سزا کا فیصلہ کیا۔ لیکن تختہ دار پر چڑھنے سے چند گھنٹے قبل اس نے خودکشی کر لی۔ وہ بہادر تھا اور ایک بہادر کی موت مر گیا۔ اغیار جو سولی پر تڑپتے ہوئے گوئرنگ کی تصاویر اخبارات میں چھپوا کر دل کا غبار نکالنا چاہتے تھے، اس حسرت میں ہاتھ ملتے رہ گئے۔ انتہائی نگرانی کے باوجود وہ اپنے منصوبہ خودکشی میں کس طرح کامیاب ہوا؟ یہ ایک ایسا راز ہے، جسے اتحادیوں کے بڑے بڑے سراغرساں آج تک معلوم نہ کر سکے۔ گمان غالب یہ ہے

خود اس کی درخواست پر اس کی بیوی نے کوئی بہت ہی مہلک زہر کسی طرح چھپا کر اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ دشمن بھی اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ جرمنی میں ہٹلر کے بعد اگر کوئی مردِ آہن تھا تو وہ گوئرنگ تھا۔

گوئبلز۔ اگرچہ گوئبلز جرمنی کا وزیر تشہیر و اشاعت و نشریات تھا لیکن طاقت و اقتدار کے اعتبار سے اسے ملک بھر میں ہٹلر اور گوئرنگ کے بعد تیسرا اہم درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ملک میں نازی جماعت کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے اور ملک سے باہر جرمنی کی عظمت کی دھاک بٹھانے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ تمام اخبارات، ادارہ ہائے مطبوعات، ریڈیو، تھیٹر، سینما حتیٰ کہ موسیقی ہال بھی اس کے تابع فرمان تھے۔ کسی قسم کی تبلیغ و اشاعت یا تشہیر اس کی مرضی، اشارے یا اجازت کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ اس اعتبار سے اس پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے اظہارِ خیال کی آزادی سلب کر کے انسان کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا کا وہ کون سا ملک ہے جہاں ثقافت کے ان تمام شعبوں پر سرکاری احتساب نہیں ہوتا۔ بظاہر ہر منزل میں حق آزادی ملا ہوا ہے لیکن جوں ہی یہ محسوس ہوا کہ سرکاری مفاد خطرے میں ہے، احتساب کی کڑیاں سخت ہونے لگ گئیں۔ حالات جنگ میں تو یوں بھی ہر بے قاعدگی، ناانصافی اور حق تلفی رُوا ہے اور یہ بدعت ان ملکوں کے لیے خاص طور پر طرۂ امتیاز ہے جو جرمنی کے اربابِ اقتدار پر ہر زاویے سے نکتہ چینی کرتے ہیں اور یہ جرأت بھی انھیں اس لیے ہوتی ہے کہ اب انھیں منہ توڑ جواب دینے والا کوئی نہیں رہا ہے۔

ڈاکٹر جوزف پال گوئبلز جرمن کے صوبہ رہائن لینڈ میں ایک چھوٹے سے شہر میں ۲۹ راکتوبر ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ مدرس اور دادا کاشتکار تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اس نے ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کر کے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ اسے ہر قسم کے مطالعہ اور تصنیف و تالیف سے خاصی دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ بہت جلد کئی کتابوں کا مصنف بن گیا۔ "برلن میں میری جدوجہد" اس کی بڑی مشہور کتاب ہے۔

کہتے ہیں کہ اس کی زندگی پر اس کی شریکِ حیات، ماگدا کا بہت ہی خوشگوار اثر پڑا تھا۔ خانگی معاملات میں پُرخلوص رہنے کے علاوہ اس نے گوئبلز میں نئی امنگیں پیدا

کیس اور اسی لیے اس نے صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست کے میدان میں بھی قدم بڑھالیا۔ ماگدا پیدائشی اعتبار سے عیسائی خاتون تھی لیکن ایک یہودی گھرانے میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ تاہم جب جرمنی نے یہودیوں کے خلاف مہم شروع کی تو اس نے مفادِ ملت کے خیال سے اپنے شوہر پر کسی قسم کا اثر نہیں ڈالا۔ وہ ایک اچھی مغنیہ بھی تھی۔ کبھی کبھی ہٹلر تک اس کے گانے سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کے ہاں چلا آتا تھا۔ وہ اپنے گیتوں کے جادو سے گوئبلز کی ہر پریشانی دور کر دیتی تھی اور دورانِ جنگ میں تو اس کا یہ اعجاز بہت زیادہ کار فرما رہا۔

۱۹۲۲ء میں ہٹلر نے ایک جلسے میں تقریر کی جس میں گوئبلز ایک صحافی کی حیثیت سے موجود تھا۔ وہ ہٹلر کی تقریر سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اسی وقت سے اس کا پیرو ہو گیا۔ جب ہٹلر نے نازی جماعت کی نئے سرے سے تشکیل کی تو گوئبلز پبلسٹی سکرٹری کی حیثیت سے اس کا شریک کار بن گیا۔

۱۹۲۶ء میں ہٹلر نے گوئبلز کو برلن بھیج دیا تاکہ شمالی جرمنی میں اپنی جماعت کا رنگ جما سکے۔ جنوبی جرمنی کے لیے ہٹلر خود کافی تھا۔ ۱۹۲۷ء میں اس نے برلن سے ایک روزنامہ "انگریف" نکالنا شروع کیا جس کے نام کا لفظی ترجمہ "حملہ" کیا جا سکتا ہے۔ اخبار کے اغراض و مقاصد اس نام سے ظاہر ہیں۔ اسی اخبار کا اثر تھا کہ بہت جلد میونک کے بعد برلن بھی نازی جماعت کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

ہٹلر کے چانسلر بننے کے بعد اس نے اخبار کی ادارت دوسروں کے سپرد کر کے وزیر تشہیر و نشر و اشاعت کا منصب سنبھال لیا اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری جنگِ عظیم میں جہاں تک الفاظ کی لڑائی کا تعلق ہے، گوئبلز نے حیرت انگیز خدمات انجام دیں۔ مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے۔ لڑائی کے زمانے میں جرمنی سے خبریں ہر روز شام کے ساڑھے سات بجے نشر ہوتی تھیں اور حکومت برطانیہ اس نشریے کی لہروں کو سلب کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ پھر بھی وہ پروگرام برصغیر کے طول و عرض میں ہر جگہ آسانی سے اور بالکل صاف سن لیا جاتا تھا اور سڑکوں پر چلتے ہوئے لوگ ذوق و شوق کے ساتھ کسی پنواڑی کی دوکان یا ہوٹل کے سامنے رک جاتے تھے تاکہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

وہ ایک اعلیٰ مصنف ہونے کے علاوہ اچھا مقرر بھی تھا۔ خبروں کے بلیٹن کے علاوہ جب بھی اس کی تقریر جرمن ریڈیو سے نشر ہوتی، اتحادیوں کی دنیا میں ایک تہلکہ مچ جاتا تھا۔ تیزاب میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح اس کے الفاظ کا حربہ ہمیشہ کاری رہتا تھا۔ گویا دنیا میں اعصابی جنگ کا وہی بانی تھا۔ اس کا قول "مکھن کی بجائے ہتھیار" اس درجہ عام ہوا کہ زبانِ خلق اس کی تشہیر کے لیے واقعی نقارہ بن گئی۔ عوام کی طرف سے اسے "ورائش لیٹر" یعنی قائد ملت کا خطاب دیا گیا تھا۔ جبکہ ہٹلر جرمنی کا قائدِ اعظم تھا۔ افسوس ہے کہ فوجی اعتبار سے لڑائی کا رنگ پھیکا پڑ جانے اور آخر میں بالکل بدرنگ ہو جانے کے بعد گوئبلز کا انجام بھی قدرتی طور پر افسوسناک رہا۔

کہا جاتا ہے کہ گوئرنگ کی طرح اس نے بھی عزتِ نفس کو بچا لینا چاہا لیکن اس اقدام کا معقول ثبوت موجود نہیں ہے۔ گوئرنگ کی نعش تو جیل کی کوٹھری سے مل گئی تھی لیکن گوئبلز کا جنازہ نہ کہیں اٹھا اور نہ کہیں مزار بنایا گیا۔ اس طرح وہ بھی رسوائی سے بچ گیا۔ شاید موقع پا کر اپنے آپ کو غرقِ دریا کر دیا ہو گا۔ اس کی خودکشی کی اطلاع روسی اخبارات نے چھاپی تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ گوئبلز کے اسسٹنٹ ہنس فرٹشے نے جسے روسیوں نے قید کر لیا تھا، یہ اطلاع ان کو دی تھی۔

ہر ہیس۔ گوئرنگ اور گوئبلز کے بعد سب سے زیادہ اہم شخصیت رڈولف ہیس کی ہے اور ایک لحاظ سے اسے گوئبلز پر سبقت دی جا سکتی ہے کیونکہ نازی جماعت میں ہٹلر کو قائد اور ہیس کو نائب قائد سمجھا جاتا تھا اور یہ بھی مسلمہ امر تھا کہ ہٹلر کی جانشینی کا سوال پیدا ہوتا تو گوئرنگ اور ہیس کے درمیان قرعہ اندازی کی جاتی۔ گوئبلز کو یہ شرف حاصل نہ ہوتا۔

رڈولف ہیس جرمن ماں باپ کا بیٹا تھا لیکن اس کی پیدائش مصر کے شہر اسکندریہ میں ۲۶ جون ۱۸۹۴ء کو ہوئی تھی۔ ماں باپ کے اسکندریہ جانے کا سبب معلوم نہیں ہو سکا لیکن وہاں اس کا محض بچپن ہی گذرا۔ اس کی تعلیم جرمنی میں ہوئی۔ اس کا استاد کارل ہوشوفر اس کی صلاحیتوں کا بڑا مداح تھا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ نازی جماعت کا رکن بن گیا اور جب ہٹلر کو ۱۹۲۳ء میں گرفتار کر کے حکومت نے نظر بند کیا تو ہیس نے اسے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "میری

جدوجہد" قلمبند کرانے میں بڑی مدد دی۔ ہٹلر کے چانسلر بننے کے بعد اسے پرائیویٹ سیکرٹری کا عہدہ دیا گیا۔ اس اعتبار سے اس کے اختیارات اتنے وسیع تھے کہ حکومت کا بڑے سے بڑا افسر بھی اس سے اجازت لیے بغیر ہٹلر کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے ہٹلر سے والہانہ عقیدت تھی اور ہٹلر بھی جانتا تھا کہ یہ میرا معتمد ہی نہیں میرا خصوصی محافظ بھی ہے۔

اس کی زندگی کا آخری واقعہ ارباب حل و عقد کے لیے ایک چیستاں بن کر رہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۰ مئی ۱۹۴۱ء کو جرمنی سے پرواز کر کے انگلینڈ کی بجائے اسکاٹ لینڈ جا پہنچا۔ مبینہ طور پر اس کی تحویل میں ہٹلر کی طرف سے تجاویز صلح کا مسودہ تھا جسے وہ برطانیہ کی حکومت کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں یہ واقعہ ایک سانحہ بن کر رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ اسے فوراً گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا اور جب لڑائی ختم ہو گئی اور نورمبرگ میں بین الاقوامی فوجی جرگے نے بیٹھ کر اسیران جنگ کے خلاف فیصلے شروع کئے تو اس کا نام دوبارہ اخبارات میں آیا۔ اس نام نہاد عدالت انصاف نے اسے عمر قید کی سزا دیدی۔ لیکن یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حکومت برطانیہ نے ۱۹۴۱ء میں نہ تو ان تجاویز کو شائع کیا اور نہ ان پر اپنی رائے ظاہر کی۔ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں نہ صرف برطانیہ بلکہ تمام اتحادی ملک جنگ کے حالات سے سراسیمہ تھے۔ یہ زمانہ ہٹلر کے محاربات کے فروغ کا تھا۔ عقل سلیم کہتی ہے کہ اس وقت ہٹلر کی طرف سے تجاویز صلح کا پیش ہونا کیا معنی رکھتا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو اتحادیوں کو ان پر توجہ دینے سے کیوں عار تھا۔ غالباً یہ سیاسی پروپیگنڈے کا ایک کرشمہ ہے اور جیسا کہ جرمنی کے سرکاری اعلان میں کہا گیا تھا کہ ہیس نے اختلاف رائے ہو جانے کی بنا پر راہ فرار اختیار کی ہے، قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ برطانیہ کے حکمرانوں نے ہمیشہ وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے قومی وقار تک کا لحاظ نہیں رکھا ہے اور اس کے برعکس تجاویز صلح پیش کرنا ہٹلر کے کردار کے بالکل منافی تھا۔ نورمبرگ کی عدالت نے ہیس کو عمر قید کی سزا دی۔ اب وہ کس جیل میں ہے؟ زندہ ہے یا مر گیا ہے؟ اس کا علم کسی کو نہیں ہے۔

**فان ربن ٹروپ** ۔ جرمنی نے بعض ایسی ہستیاں بھی پیدا کی ہیں جو اپنی عمر کے

ابتدائی نصف حصے میں سیاست سے بالکل خالی الذہن رہیں لیکن جب میدان سیاست میں آئیں تو ایک دم نام پیدا کرلیا۔ انھی میں سے ایک ہستی یوآخم فان ربن ٹروپ کی ہے۔ وہ ۳۰ر اپریل ۱۸۹۳ء کو جرمنی کے شہر ریسیل میں پیدا ہوا اور چونکہ اس کا باپ فوج میں کرنل تھا، اس لیے فارغ التحصیل ہونے کے بعد باپ کے مشورے پر اسے بھی فوج میں داخل ہوجانا پڑا لیکن میدانِ کارزار اس وقت اسے پسند نہ آیا اور وہ بہت جلد اس سے کنارہ کش ہوکر کاروبار میں لگ گیا۔

اس نے مختلف شراب خانوں میں ایجنٹ کی حیثیت سے کام کیا اور پھر کولون میں اس کا تعلق ہینکل کی فرم سے ہوگیا جو شامپین کی تجارت میں ملک کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس نے پوری تن دہی سے کام کرکے خوب روپیہ کمایا اور اس طرح یہ روزگار اسے مالی اعتبار ہی سے راس نہیں آیا بلکہ اس کی نجی زندگی پر بھی خوش گوار اثر پڑا۔ فرم کے مالک کی لڑکی اینا ہینکل اس کی طرف اس درجہ راغب ہوئی کہ انجام کار دونوں کی شادی ہوگئی۔ ربن ٹروپ خود بھی صاحبِ ثروت تھا کیونکہ اسے اپنی ایک چچی کے مرجانے پر بڑی دولت ورثے میں مل گئی تھی۔ بیوی نے رفتہ رفتہ اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ روپیہ کمانے کی انھیں فکر نہیں تھی۔ وہ ملک میں نام و نمود چاہتے تھے۔ اور اس مقصد کے لیے میدانِ سیاست زیادہ موزوں تھا۔

۱۹۳۲ء میں وہ نازی جماعت میں شریک ہوگیا اور اس کا ایک سرگرم عملی رکن بن کر اس قدر جلد ترقی کی کہ ہٹلر ملک کا چانسلر بننے کے بعد عموماً امورِ خارجہ میں اس سے صلاح و مشورے کرنے لگا۔ حتیٰ کہ اس وقت کے وزیر خارجہ بیرن فان نیوراتھ کے دفترِ خارجہ کے علاوہ ہٹلر کو ایک اور ضمنی دفتر قائم کرنا پڑا تاکہ ربن ٹروپ کو اس کا انچارج مقرر کیا جاسکے۔ اس نے نہایت دلیری اور بے باکی کے ساتھ جرمنی کی خارجہ پالیسی مرتب کی اور جب اس کا اعلان ہوا تو ملک بھر میں اس کی تعریف اور ملک سے باہر سخت نکتہ چینی ہوئی۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک وہ برطانیہ میں جرمنی کا سفیر رہا۔ وہاں اس نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ جب بھی کسی سرکاری تقریب میں شریک ہوتا یا شاہی دربار میں

جاتا تو نازسی جرمنوں کے انداز میں پورا ہاتھ پھیلا کر سلام کرتا تھا۔ اس کے معاشرتی برتاؤ کے بعض اور پہلو بھی عوام کے لیے انوکھے تھے جو ناپسند کیے جانے لگے۔ جب مخالفت زیادہ ہوئی تو اسے واپس جرمنی بلا لیا گیا اور وزیر خارجہ قسطنطین فان نیورا تھ کو دوسری جگہ منتقل کر کے یہ منصب اسے تفویض کر دیا گیا۔ مکمل وزیر خارجہ کی حیثیت سے اس نے زیادہ رنگ دکھائے۔ کہا جاتا ہے کہ ہٹلر نے اپنے ملک کی سرحدیں وسیع کرنے کے لیے جو پروگرام بنایا تھا، وہ زیادہ تر اسی کے مشورے سے تھا اور کچھ عرصہ بعد جرمنی نے مجلس اقوام سے جو علیحدگی اختیار کی، اس میں بھی اسی کی حکمتِ عملی دخل انداز تھی۔ آسٹریلیا اور چیکوسلواکیہ میں ہنگامے برپا کرانے کے بعد معاہدۂ میونک طے کرانے اور پھر چیکوسلواکیہ کو جرمنی میں شامل کرانے میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔

اسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی اور وہ انھیں بزدل بھی سمجھتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ وہ اپنی قوت اور بہادری سے نہیں اپنی سازشوں سے ترقی کرتے ہیں۔ اور یہ وطیرہ صحیح شجاعت کے منافی ہے۔ دوسری عالمگیر لڑائی شروع کرنے سے پہلے اس نے ہٹلر کو یقین دلایا تھا کہ انگریز بہت جلد میدانِ جنگ میں قدم نہیں رکھیں گے۔ جب جرمنی نے جاپان اور اٹلی سے اور بعد ازاں روس سے معاہدے کیے، تو حکومتِ جرمنی کی طرف سے اسی نے دستاویزات پر دستخط کیے تھے۔ ان کے مسودات مرتب کرانے میں بھی اس کی رائے شامل تھی۔

لڑائی کا رنگ بگڑ جانے کے بعد اسے گرفتار کر لیا گیا اور نورمبرگ کی عدالت میں دوسروں کے ساتھ اس پر بھی مقدمہ چلایا گیا۔ اس کی قسمت کا آخری فیصلہ کرنے کے بعد نام نہاد اتحادیوں نے ۱۶ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو اسے پھانسی دے دی۔

**فان پاپین** ۔ صحیح معنوں میں جرمنی کا ایک ماہر فن مفکر سیاستداں، جسے ہٹلر کے ہمعصروں میں ہمیشہ ایک بزرگ کی حیثیت حاصل رہی، فرانز فان پاپین تھا جسے عوام اور خواص دونوں میں یکساں طور پر درجۂ قبول حاصل تھا۔ وہ جرمنی کے شہر ورل میں ۲۹ر اکتوبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوا اور اعلیٰ تعلیم پا کر بہت جلد میدانِ سیاست میں آ گیا۔ ملک کے مفاد کی خاطر اسے جاسوسی کرنے سے بھی عار نہیں تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران یعنی ۱۹۱۵ء میں اسے فوجی اتاشی بنا کر ریاستہائے متحدہ امریکا بھیجا گیا تو وہاں اس کی بعض پوشیدہ کارروائیاں منظرِ عام پر آگئیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایک روز اس کی غیر موجودگی میں خفیہ پولیس کے ایک دستے نے اس کی قیام گاہ پر چھاپہ مار کر کچھ دستاویزات اپنے قبضے میں کر لیں جن سے ریاست ہائے متحدہ امریکا کی حکومت کو پتہ چلا کہ خود امریکی باشندے ذاتی مفاد کی خاطر جرمنی کے لیے جاسوسی کر رہے ہیں اور انھیں فان پاپین کی سرپرستی حاصل ہے۔ حکومت نے فوراً اسے ملک سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اس پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ لم بکا میں گولہ بارود بنانے والے کارخانے کو بم سے اڑا دینے کی سازش اسی کے ایما سے عمل میں آئی تھی۔ امریکا سے جرمنی جاتے وقت بیچ سمندر میں انگریزوں نے سفارتی مراعات کو بالکل بالائے طاق رکھ کر اس کے سامان کی تلاشی لی اور کچھ مسودات ضبط کر لیے جو امریکا کی خفیہ پولیس کی دست برد سے بچ گئے تھے۔ ان سے بھی بہت سے راز منکشف ہو گئے۔

وہ اپنے وطن پہنچا تو جرمن فوج کا ایک دستہ ترکی کی مدد کے لیے وہاں جا رہا تھا، اسے بھی ایک بڑا عہدہ دے کر وہاں بھیج دیا گیا۔ لیکن جب انگریزوں نے یروشلم پر قبضہ کیا تو پاپین کی اس مقام پر موجودگی ان کے لیے ایک معمہ بن گئی۔ وہ اپنا سامان وہیں چھوڑ کر بھاگ نکلا اور جرمنی پہنچ گیا۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی تو اس نے فوجی زندگی ترک کر کے سیاسی لیڈر بن جانا پسند کیا۔ اس نے سار کے علاقے میں رہائش اختیار کی اور وہیں شادی بھی کر لی لیکن حکومت اس سے کام لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ اسے پرشیا کی کابینہ کا صدر بنا کر وہاں بھیج دیا گیا۔ جرمنی کو اس علاقہ پر اقتدار تو حاصل تھا لیکن اس اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ایک قوی انسان کی ضرورت تھی جو سیاسی ڈپلومیسی کے داؤ پیچ جانتا ہو۔ پاپین نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۲ء تک یہ فرض انجام دیا۔

۱۹۳۲ء میں جرمنی کے صدر ہنڈنبرگ نے اسے واپس بلا کر جرمن وزارت بنانے کی دعوت دی کیونکہ برونگ کو سفارتی عہدہ دے کر ملک سے باہر بھیجا جا رہا تھا۔ پاپین خود ایک پختہ کار سیاست داں ہونے کے باوجود ہٹلر سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔

وہ اس کے جوش وخروش کو سراہتا اور اس اعتبار سے اسے ملک کے لیے ایک نعمت سمجھتا تھا۔ چنانچہ پاپین ہی وہ شخص ہے جس نے ہنڈنبرگ پر بے پناہ زور ڈال کر مجبور کیا کہ وہ ہٹلر کو چانسلر شپ کا منصب تفویض کرے اور خود چانسلر سے نائب چانسلر بن جانا گوارا کیا۔

۱۹۳۴ء میں پاپین کو آسٹریا کا سفیر بنا دیا گیا تاکہ وہاں وہ نازی تحریک کو کامیاب بنائے۔ چند سال بعد اسی عہدے پر اسے ترکی بھیجا گیا جہاں وہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں بھی متعین رہا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد اس کی بھی گرفتاری عمل میں آئی لیکن فوجی جرگہ اسے سزا نہ دے سکا۔ البتہ اتحادیوں کے ایما واشارے پر خود جرمن عدالتِ عالیہ نے اسے جارحانہ کارروائیوں کی پاداش میں آٹھ سال کی سزا دی جو ۱۹۴۹ء میں معاف کر دی گئی۔ اس کے بعد سیاست میں اس کے لیے گنجائش تھی ہی نہیں چنانچہ وہ خاموش زندگی بسر کرتے ہوئے قدرتی موت مر گیا۔

**ہملر**۔ جرمنی کی سب سے اعلیٰ خفیہ پولیس (گیسٹاپو) اور حفاظتی دستے (ایس ایس) کا بیک وقت سربراہ ہونے کے اعتبار سے ہنریک ہملر کو ملک کی اندرونی سیاست اور اس کے تحفظ میں بڑا دخل تھا اور ان مقاصد کی تکمیل کے لیے وسیع اختیارات حاصل تھے اس لیے عوام قدرتی طور پر اس کے نام سے تھراتے تھے۔

وہ فطرتاً ظالم وجابر نہیں تھا لیکن جب بھی اسے پتہ چل جاتا کہ فلاں شخص یا فلاں جماعت ہٹلر، حکومت یا قوم کے خلاف ہے اور کسی سازشی کارروائی میں مبتلا ہے تو پھر اس کی گرفت سے بچ نکلنا محال ہو جاتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ ذرا بھی رو رعایت نہیں کرتا تھا۔ دیکھا جائے تو یہی اس کا فرضِ منصبی تھا اور اگر وہ اس کی ادائیگی میں پوری تن دہی دکھاتا تو کس جرم کا ارتکاب کرتا تھا۔ اتحادی اسے وحشی اور درندے کے خطابات دینے میں حق بجانب نہیں تھے، کیونکہ اس میں اگر کوئی درندگی یا وحشت تھی تو یہ تھی کہ وہ دشمنانِ ملک کے منصوبوں کا کھوج پہلے سے لگا کر افشا کرتا اور اپنی احتسابی کارروائی سے انھیں سخت سزا دیتا تھا۔ بھلا وہ کون سا ملک ہے جو اس قسم کے اقدامات اختیار نہ کرنے کا دعویدار ہو۔

ہملر ۷ر اکتوبر ۱۹۰۰ء کو میونک میں پیدا ہوا تھا۔ ۲۳ سال کی عمر میں اس نے نازی جماعت میں شرکت کی اور ہٹلر سے والہانہ عقیدت رکھنے کے باعث اس کے جاں نثاروں میں شامل ہوگیا۔ اس نے ۱۹۲۸ء میں حفاظتی دستے کی سب سے پہلے تنظیم کی اور دوسرے ہی سال پورے اختیارات کے ساتھ اس کا افسر اعلیٰ بن گیا۔ چار سال بعد اسے بویریا کی پولیس کا سربراہ بنا کر میونک بھیجا گیا تاکہ اس علاقے میں اپنی احتسابی کارروائی سے سب کے تختے ڈھیلے کردے۔ اس سے اگلے سال خفیہ پولیس کے محکمے کی نئی تنظیم عمل میں آئی تو اسے بلاکر سارا نظم ونسق اس کو سونپ دیا گیا۔

جون ۱۹۳۲ء میں ہٹلر نے اس کو سارے ملک کے محکمۂ پولیس کا واحد انچارج بنادیا اور اُسے سیاہ وسفید کرنے کے پورے اختیارات دے دیئے۔ یعنی اس مرتبہ کو پاکر وہ عوام میں ہٹلر ثانی کہلانے لگا۔ اِس حالت میں اس کے بہت سے مخالفین بھی پیدا ہوگئے، لیکن اس کے اعلیٰ نظام کے سامنے کوئی سازش کامیاب نہ ہوسکی۔ لڑائی شروع ہوئی تو اسے اور بھی وسیع اختیارات مِل گئے۔

۱۹۴۳ء میں ہٹلر نے اسے کابینہ میں شامل کرکے وزیر داخلہ مقرر کردیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ فوجی محاربات میں ہٹلر کا رنگ کچھ پھیکا پڑنے لگا تھا اور ملک ہی میں اس کے مخالفین پیدا ہوگئے تھے۔ کچھ بیرونی عناصر بھی اپنی سازشوں میں کامیاب ہونے لگے تھے چنانچہ فوج کے چند دستوں نے غیر ملکی تعاون سے فوجی انقلاب کا منصوبہ گانٹھا جس کے تحت ہٹلر کو موت کے گھاٹ اتارنے کی اسکیم شامل تھی۔ یہ راز بھی وقت سے پہلے فاش ہوگیا۔ ہملر نے ذرا بھی نرمی برتنے بغیر سب سازشیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

۱۹۴۵ء میں جبکہ جرمنوں کی قسمت واقعی پلٹا کھانے لگی تھی، اس نے دشمن کو مغالطے میں ڈالنے اور گمراہ کرنے والی من گھڑت خبریں جرمن ریڈیو سے نشر کرنی شروع کیں لیکن یہ ڈھرا زیادہ عرصے چل نہ سکا۔ اسی سال ماہ مئی میں اتحادیوں نے جرمنی کو شکست دیدی تو ہملر کے لیے خودکشی کے سوا چارۂ کار نہ رہا۔ اس نے ۲۴ر مئی کو اپنا گلا خود ہی گھونٹ کر رشتۂ حیات توڑ لیا۔

ہنڈنبرگ ۔ جرمنی کی ان اولوالعزم اور عظیم شخصیتوں میں سے جنھیں جنگِ عظیم اوّل کے دوران میں زبردست اقتدار اور اس کے بعد بھی بلند مرتبہ حاصل رہا، فیلڈ مارشل پال فان ہنڈنبرگ کا نام سرِفہرست ہے۔ ہٹلر کے عروج میں آنے سے پہلے جو قدر و منزلت اس کی ہوتی تھی، وہ کسی اور ہستی کو نصیب نہیں ہو سکی۔ اس کے سیاسی تدبّر کا لوہا دشمنوں تک نے مانا ہے۔ ہٹلر بھی کبھی کبھی اس کی رائے سے اختلاف کرنے کے باوجود اس کے سامنے سر جھکانے کے لیے مجبور تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو عوام کبھی بھی اُسے درجۂ قبول نہ دیتے اور ہٹلر، "فیوہرر" کبھی نہ بن سکتا۔

ہنڈنبرگ، جس کا پورا نام ایک سانس میں لینا بہت ہی مشکل ہے، جرمنی کے ایک شہر پوزین میں جو پولینڈ میں اس علاقے کے مدغم ہو جانے کے بعد پوزنان کہلانے لگا ہے، ۲ / اکتوبر ۱۸۴۷ء کو پیدا ہوا تھا۔ جس طرح حضرت غالب کو اپنے بارے میں "پیشۂ آبا سپہگری" ہونے پر ناز تھا، اسی طرح ہنڈنبرگ بھی اس حقیقت پر فخر کرتا تھا کہ اس کے آبا و اجداد ہمیشہ میدانِ کارزار میں شجاعت کے جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کے سپاہیوں کا سلسلۂ نسب تیرھویں صدی عیسوی تک پہنچا کر دم لیتا تھا۔ چنانچہ خاندانی روایات کو برقرار رکھنے کی خاطر وہ کم سنی میں جبکہ اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی، سلیشیا کے کیڈٹ اسکول میں داخل ہو گیا اور پھر برلن آ کر چیف کیڈٹ اکیڈمی میں داخل ہو گیا۔

۱۸۶۶ء میں دانستک محاذِ جنگ بنا تو وہ پیدل دستوں میں سیکنڈ لفٹننٹ کا درجہ پا کر میدان میں اتر آیا۔ کونگ گراٹس کے مقام پر اگرچہ وہ بُری طرح زخمی ہو گیا تھا، لیکن جو بہادری اس نے اس موقع پر دکھائی، اس کے صلے میں اسے "سُرخ عقاب" والا تمغہ مل گیا اور جب فرانس اور جرمنی کے مابین لڑائی میں اس نے کامیابی کے ساتھ مورچے سنبھالے تو اسے "آہنی صلیب" کا تمغہ دیا گیا جو بہت ہی زیادہ قابلِ فخر ہوتا ہے۔

اگلے چالیس سال میں وہ ترقی کرتے کرتے جنرل کے عہدے پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں اور اس کے بعد بھی اسے کئی لڑائیوں میں شریک ہونا پڑا اور ہمیشہ کامران رہا۔ لیکن اس لحاظ سے دل شکستگی کی کیفیت اس پر ہمیشہ طاری رہی

کہ قیصرِ جرمنی محض صاحبِ اقتدار ہونے کے باعث ہر مُعاملے میں مداخلت کرتا تھا اور اکثر اس کی دخل اندازی نامعقول ہوتی تھی۔ کئی بار شہنشاہ سے اس بنیاد پر اس کی بدمزگی بھی ہوئی لیکن ہمیشہ اسے خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جانا پڑا۔ کیونکہ وہ حکومت کے خلاف، خواہ وہ کیسی بھی ہو، محاذ قائم کرنا قومی سالمیت کے اعتبار سے برا سمجھتا تھا۔ خم ٹھونک کر مقابلے پر آنے کی بجائے وہ راستے سے الگ ہٹ جانے کے اصول کو پسند کرتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جبکہ فضائے عالم بظاہر پُرسکون تھی اور لڑائی کا خدشہ دامنگیر نہیں تھا، اس نے فوج سے کنارہ کش ہو جانے کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔ اس اقدام کا برا ردِ عمل عوام پر ہوا جو ہنڈنبرگ کے پرستار اور قیصر کے زبردستی طرفدار تھے۔

ہنڈنبرگ نے اپنے عہدے سے سبکدوش ہوتے وقت الوداعی پیغام میں کہا ”میرا اس منصب سے ہٹ جانا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ میرے ماتحتوں کو میدان خالی پاکر آگے بڑھنے اور اپنی بہادری کے صحیح جوہر دکھانے کا موقع مل جائے۔“ اس نے یہ بھی کہا ”لڑائی کے امکانات فی الحال بہت بعید ہیں اور اس لیے کوئی ایسا خطرہ لاحق نہیں ہے جسے دُور کرنے کے لیے میری موجودگی ضروری ہو۔“ لیکن یہ رائے صرف تین سال کے لیے صائب رہی۔

یکم اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی تو ہنڈنبرگ کی ضعیف رگوں میں حفاظتِ وطن کا جذبہ جوان ہو کر رنگ دکھانے لگا۔ دوسرے ہی دن اس نے قیصر جرمنی کے پاس درخواست بھیجی کہ مجھے کسی بھی اعتبار سے خدمتِ وطن انجام دینے کا موقع دیا جائے۔ شہنشاہ نے شروع میں کسی قدر بے اعتنائی برتی اور جواب تک دینا گوارا نہ کیا لیکن جب پرشیا کے مشرقی محاذ پر رنگِ افواج بگڑنے لگا تو اچانک ۲۲ اگست کو شہنشاہ نے اسے تار بھیجا کہ کمر ہمت کس کر میدانِ جنگ میں جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب کسی کے دل میں مادرِ وطن کی محبت کا جذبہ بے قیاس ہوتا ہے تو بہت سی باتیں نظر انداز کر دینی پڑتی ہیں۔

ہنڈنبرگ نے نہ صرف اس دعوت کو قبول کر لیا بلکہ ایک شخص کی ماتحتی میں جو خود اس کا ماتحت رہ چکا تھا، کام کرنے پر ذرا بھی احتجاج نہ کیا۔ اس کی تقرری کی خبر ملتے

ہی اغیار کے کیمپوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ یہ شیر دل انسان ایک دن پھر اپنے "کچھار" سے باہر نکل آئے گا۔ ہنڈنبرگ نے وہ مورچے لگائے کہ دشمن کی پیش قدمی ایک دم رک گئی اور سپاہیوں کو گھات میں رکھ کر وہ حملے کرائے کہ مخالفین کے قدم اکھڑ گئے۔

اس دوران میں مغربی محاذ پر لڑائی کا رنگ زور پکڑ گیا تھا۔ ہنڈنبرگ کو فوراً وہاں بھیجا گیا لیکن یہ بہت بعد از وقت تھا۔ اس اثنا میں دشمن نے اپنے پنجے خوب جما لیے تھے۔ ایسی صورت میں بری طرح شکست تو نہیں ہوئی لیکن کامرانی کا سہرا بھی سر پر نہ بندھ سکا۔ ایک طرف روسیوں سے نبرد آزمائی تھی اور دوسری طرف فرانسیسیوں اور انگریزوں سے جان چھڑانی مشکل ہو رہی تھی کہ گیدڑ بھبکی کے طور پر آسٹریا اور ہنگری نے بھی اعلانِ جنگ کیا اور میدان میں فوجیں اتار دیں۔

اس نازک صورتِ حالات میں اربابِ اقتدار نے ہنڈنبرگ کو فیلڈ مارشل کا درجہ دے کر چیف آف اسٹاف کا عہدہ تفویض کر دیا تاکہ وہ پورے اختیارات کے ساتھ اپنی قابلیت کے جوہر دکھا سکے۔ اسی اثنا میں روس میں شہنشاہیت کے خلاف بغاوت اپنے عروج پر پہنچ گئی اور سیاسی تغیرات کے ساتھ ساتھ میدانِ جنگ کے نقشے بھی بدلنے شروع ہو گئے۔ اس لڑائی میں کامران صحیح معنوں میں کسی کو نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ جیتنے والے بھی اتنے شدید نقصانات اٹھا چکے تھے کہ وہ ایک قسم کی شکست کے مترادف تھے اور جو ہار رہے تھے، ان کے لیے تو ٹھکانا ہی کہاں تھا۔ غرض یہ ہے کہ سب ہی سسک رہے تھے۔ کوئی زیادہ، کوئی کم۔ ایسے موقعوں پر عافیت کا درس دینے اور امن پسندی کا نعرہ لگانے والے بہت سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ التوائے جنگ کے ساتھ ساتھ معاہدۂ صلح کے منصوبے مرتب کئے جانے لگے۔ چونکہ لڑائی چوطرفہ تھی، محاذِ جنگ بہت سے تھے، اس لیے فریقین کی تعداد بھی زیادہ رہی۔

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو صبح کے گیارہ بجے صلح کا اعلان ہوا تو ہتھیاروں کی لڑائی تو بے شک رک گئی لیکن ذہنی جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اگرچہ اتحادیوں نے قیصر جرمنی ولیم دوم کو جنگِ عظیم کا ذمہ دار ٹھیرا کر مجرم قرار دیا تھا، پھر بھی وہ معاہدہ ورسائی پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ بات ہنڈنبرگ کو بہت ہی اکھری۔ اس کا کہنا

تھا کہ اگر اس قدر گر کر معاہدہ کرنا تھا تو اس سے بہتر یہ تھا کہ جنگ دوبارہ شروع کردی جاتی اور ملک کا ایک ایک فرد محاذ پر لے جا کر قربان کر دیا جاتا تاکہ قومی وقار کو اس اعتبار سے ٹھیس نہ لگتی کہ جرمن قوم میں شکست کے بعد عزت نفس بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے یہاں تک کہا کہ اس لڑائی میں شہنشاہ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر کسی کو مجرم قرار دینا ہے تو فوجی عملے سے باز پرس کی جائے اور میں اس سلسلے میں اپنا نام سرفہرست لکھوانے کے لیے تیار ہوں لیکن قیصر جرمنی نے اس پیش کش پر ذرا بھی توجہ نہ دی۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اگر ہنڈنبرگ کو موردِ الزام ٹھیرایا تو جرمن باشندے جو اس شکست کے بعد بھی اپنے سپہ سالار کے پرستار ہیں، ایک دم بپھر جائیں گے اور دامن سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

ذہنی اعتبار سے ہنڈنبرگ پر اتنا برا اثر پڑا کہ وہ ایک بار پھر سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر ہنوفر چلا گیا تاکہ وہاں گوشۂ گمنامی میں پُرسکون زندگی بسر کر سکے۔ وہاں رہ کر اس نے اپنی سرگزشتِ حیات بھی لکھنی شروع کر دی جس میں ایک جگہ اس نے خیال ظاہر کیا ہے کہ جرمنی کو عالمگیر لڑائی میں شکست نہیں ہوئی بلکہ وہ سازشوں اور دغابازیوں کا شکار ہو گیا اور یہ بڑی حد تک حقیقت بھی ہے کیونکہ خود شہنشاہ اور شہنشاہیت پسند طبقہ فوجی معاملات میں ایسے اڑنگے لگاتا رہتا تھا کہ بارہا فوج کے لیے محاذ پر پوری تن دہی سے لڑنا محال ہو ہو گیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ اپنے اقتدار کو غلط طریقے سے قائم رکھنے کے لیے فوج کے ایک افسر کو دوسرے کے خلاف اکساتا رہتا تھا تاکہ ان میں ہمیشہ ان بن رہے اور ایسا نہ ہو کہ وہ متحد ہو کر حکومت کا تختہ الٹ دیں۔

فروری ۱۹۲۵ء میں جب صدر جرمنی ڈاکٹر ایبرٹ کا انتقال ہو گیا تو قوم پرستوں کی نظریں بے محابا ہنڈنبرگ کی طرف اٹھیں اور وہ کسی نہ کسی طرح اسے گوشۂ گمنامی میں سے باہر لے آئے۔ قاعدے کے مطابق آزادانہ انتخاب عمل میں آیا اور ہنڈنبرگ کو بھاری اکثریت کے ساتھ صدر بنا لیا گیا۔ اس کے مقابلے پر ولیم مارکس تھا جس کی نامزدگی کیتھولکوں، لبرلوں اور سوشلسٹوں نے مشترکہ طور پر کی تھی اور اسے صرف نیشنلسٹوں کا سہارا حاصل تھا۔ اس طرح اس کی تاریخِ حیات کا تیسرا باب لکھا جانے لگا۔

۱۹۳۰ء میں اس نے کیتھولک فرقے کے لیڈر ہائنرک برونِنگ کو جسے وہ اس کی ذاتی صلاحیتوں کے باعث بہت پسند کرتا تھا، چانسلر مقرر کر دیا۔ برونِنگ ماہرِ اقتصادیات بھی تھا۔ اس وقت ملک کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی اور اس پر قابو پانا مشکل نظر آ رہا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہنڈنبرگ نے اس حلف نامے کا لحاظ نہیں رکھا جسے صدارت کا عہدہ سنبھالتے وقت اٹھانا پڑتا ہے۔ اس نے دستور العمل کی دفعہ ۴۸ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برونِنگ کو ضرورت سے زیادہ اختیارات سونپ دیئے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی نیک نیتی پر کسی کو شک نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ مُلک کا بے لوث خیر خواہ ہے۔

۱۹۳۲ء میں قومی اسمبلی نے کثرتِ رائے کے ساتھ برونِنگ کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ قانون کے مطابق صدر کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ چانسلر کا باقاعدہ اِنتخاب نہ کرائے اور خود نامزد کر دے لیکن اسے برطرف کرنے کا اختیار اسمبلی کو بھی حاصل تھا۔ ایسی صورت میں ہنڈنبرگ نے فرانز فان پاپین کو چانسلر بنا دیا، جو زیادہ عرصہ اس منصب پر نہ رہ سکا۔ بہت جلد جنرل فان شلیخر نے اس کی جگہ لے لی۔ ہنڈنبرگ کتنا ہی مخلص اور بے لوث سہی لیکن چانسلروں کی نامزدگیوں کے بارے میں لوگ آہستہ آہستہ اس کی طرف سے بدظن ہوتے چلے گئے۔ اس ضمن میں فریقِ ثانی کا پروپیگنڈا بھی کام کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں ہنڈنبرگ کے لیے اس کے سوا چارۂ کار نہ رہا کہ ۱۹۳۳ء کے شروع میں عام انتخابات کرا دے۔

اس وقت تک ہٹلر کی نازی پارٹی ملک بھر میں اپنا رنگ جما چکی تھی، لہٰذا ہٹلر کو انتخاب میں کامیابی ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے روزِ اوّل سے ہنڈنبرگ کا احترام کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی لیکن اس کا کیا علاج کہ ہنڈنبرگ اسے پسند نہیں کرتا تھا تاہم یہ اس کی ذاتی رائے تھی اور جہاں تک عہدے کے وقار کا تعلق تھا، اس نے نہ تو ہٹلر کو کبھی حقیر جانا اور نہ کبھی اس سے بے اعتنائی برتی بلکہ اس کی چانسلر شپ کا لحاظ رکھتے ہوئے ہمیشہ اس سے تعاون کیا۔ بڑے آدمی کی شان یہی ہے کہ وہ ذاتی عقیدے کو قومی مفاد پر حاوی نہ ہونے دے۔

۲؍اگست ۱۹۳۴ء کو ہنڈنبرگ کا انتقال ہوگیا۔ وہ پہلی جنگِ عظیم کے جرمنی کا سب سے بڑا ہیرو تھا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک انگریز سوانح نگار نے اسے "چوبی ٹیٹان"، کا خطاب دے کر اس کی عظیم شخصیت کی بہترین ترجمانی کی ہے (صنمیاتی کہانیوں میں ٹیٹان سورج دیوتا کا نام ہے۔ خدا جانے یہ تشبیہ کس رعایت سے دی گئی تھی)۔

ہنڈنبرگ جہاز۔ اس شیر دل جرنیل کا ذکر کرتے ہوئے ہنڈنبرگ جہاز یاد آگیا، جو اس کے نام سے منسوب کیا گیا تھا اور زیپے لین جہازوں کے سلسلے کی سب سے زیادہ مضبوط کڑی سمجھا جاتا تھا لیکن جس طرح بعض ہونہار بچے اوائل عمری میں ماں باپ کو داغِ مفارقت دے جاتے ہیں، یہ جہاز بھی پہلی بار پَر تولنے کے بعد شکستہ بازو ہی نہیں، بالکل ختم ہوگیا۔

جرمنی کے ایک مشہور رئیس زیپے لین نے ۱۹۰۰ء میں گیس سے چلنے والے ہوائی جہازوں کی ایک خاص قسم کا سلسلہ شروع کیا تھا سب سے پہلا جہاز چار سو بیس فیٹ لمبا اور اس کے مخروطی گول ڈھانچ کا نصف قطر اڑتیس فیٹ تھا اس میں سولہ گھوڑوں کی طاقت کے دو انجن لگائے گئے تھے جو صرف اس کا نظام قائم رکھنے کے لیے تھے۔ ورنہ پرواز کے لیے اس میں بھری ہوئی گیس اپنا کام کرتی تھی۔ اس کے اندر کل چار لاکھ مکعب فیٹ کی گنجائش تھی۔ بیشتر حصہ ہائیڈروجن گیس سے بھرا گیا تھا۔ اس کی رفتار صرف بیس میل فی گھنٹہ تھی۔ رفتہ رفتہ اس قسم کے جہازوں نے ترقی شروع کی۔

فان زیپے لین نے تیسرا جہاز ۱۹۰۶ء میں بنا کر قیصرِ جرمنی کے نام سے منسوب کیا اور باقاعدہ اس کی سرپرستی حاصل کرلی۔ اس طرح اس کے حوصلے بڑھے۔ اپنے اثاثے کے علاوہ شاہی خزانے سے بھی مالی امداد ملی حتیٰ کہ ۱۹۳۷ء میں اس سلسلے کا ایک سو انتیس واں جہاز ہنڈنبرگ کے نام سے منسوب کیا گیا۔ حالانکہ اسے فوت ہوئے تین سال گزر چکے تھے لیکن قوم کے لیے اس کی خدمات کا یہ بھی ایک طریقہ اعتراف تھا۔

ہنڈنبرگ جہاز کی لمبائی آٹھ سو فیٹ سے زیادہ تھی۔ اس میں دس لاکھ مکعب فیٹ ہائیڈروجن گیس بھری گئی تھی۔ زیپے لین کے دوسرے جہازوں کی طرح اس کا

ڈھانچ بھی ایلومینیم، ریشم، اور سن وغیرہ جیسی ہلکی چیزوں سے تیار کیا گیا تھا۔ اس پر بے پناہ لاگت آئی تھی۔ اس کی رفتار بھی دوسرے جہازوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ ایک وقت میں ڈھائی سو آدمی اس میں سفر کرتے تھے جرمنی کو اور خاص طور پر ہٹلر کو اس کی ساخت پر بڑا فخر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے بنانے میں تین سو آدمیوں نے مسلسل پانچ سال تک کام کیا تھا۔ اس کی پہلی پرواز جرمنی سے امریکہ تک ہوئی اور جب واپسی کا سفر شروع ہوا تو چند گز کی مسافت طے کرنے کے بعد ہی اس میں آگ لگ گئی۔ ہائیڈروجن تیزی سے بھڑک اٹھنے والی گیس ہے۔ وہ جہاز جو پانچ سال میں بن کر مکمل ہوا تھا، صرف پانچ منٹ کی مختصر سی مدت میں جل کر خاک ہو گیا۔ ایک بھی مسافر زندہ نہ بچا۔ کئی کروڑ روپے کا سرمایہ ذرا سی دیر میں غارت ہو گیا۔

ہر شخص نے اس وقت محسوس کر لیا تھا کہ یہ زبردست سازش کا نتیجہ ہے۔ ہٹلر نے جب اس حادثے کی خبر سنی تو سر پکڑ کر رہ گیا۔ لیکن جذبات پر قابو پانا جانتا تھا۔ اس نے زیپےلین کمپنی کے اربابِ حل و عقد کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اس حادثے سے بد دل ہو کر ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔ اب سیاست صنعت پر بھی غالب آنے لگی ہے۔ آئندہ اس سے بھی بہتر چیز بنانے کی کوشش کی جائے جو دشمنوں کو محوِ حیرت کر دے۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ اگر ہائیڈروجن کی بجائے ہیلیم گیس جہاز کے ذخیرے میں بھری جاتی تو حادثہ اتنا تباہ کن نہ ہوتا کیونکہ یہ گیس آگ نہیں پکڑتی۔ لیکن بعد میں سوجھانے والی یہ سب باتیں بے معنی ہیں۔ سانپ کے گزر جانے کے بعد لکیر کو سبھی پیٹ سکتے ہیں، جہاز گیس کے بھڑک اٹھنے سے نہ جل سکے تو اور طرح بھی تباہ کیا جا سکتا ہے۔

بھائی جان محترم (ایسے بھائی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوں گے) میرے انہماک کو دیکھ کر میری مصروفیات میں کبھی بھی مخل نہیں ہوتے اور عموماً وہ کام بھی خود کر گزرتے ہیں جو مجھے کرنے ہوتے ہیں۔ میں اپنے مطالعے اور استغراق و محویت کے عالم سے فارغ ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ ہوٹل کا حساب بیباق کر چکے ہیں۔ رختِ سفر بندھ کر تیار رکھا ہے اور میرے لیے ادائیگیٔ فرض کا صرف یہ حصہ باقی رہ گیا کہ شیروانی پہن کر ان کے ساتھ چل پڑوں۔

**چھاپے کی مشینیں۔** ہوٹل والوں نے سواری کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہم فوراً نیچے اتر کر

موٹر میں بیٹھ گئے اور اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔ حسرت سے ہر چیز پر نظر ڈالتے جا رہے تھے کیونکہ بہت سے مقامات کو بھرپور نظر سے دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا اور دوبارہ آنے کا بظاہر کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ بھائی جان محترم اور میاں محبوب پچھلی نشستوں پر تھے اور میں آگے شوفر کے قریب بیٹھا تھا۔ میں عموماً موٹر میں اگلی نشست پسند کرتا ہوں، نہ صرف دورانِ سفر میں بلکہ وطن میں بھی۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ پچھلی نشست پر ضرور کوئی ساتھ بیٹھتا ہے اور بعض دفعہ بلاوجہ بھی بات چیت کرنی پڑتی ہے لیکن اگر پچھلی نشست والے زیرِ لب بات چیت کی بجائے "اونچے سُروں میں گفتگو کرنے لگیں تو "سرودِ خانۂ ہمسایہ" کو جائز سمجھنے کی طرح اس گفتگو کو بھی سننا اور بسا اوقات اس میں حصّہ لینا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔

میاں محبوب ہائیڈل برگ میں تیار ہونے والی چھاپے کی مشینوں کا ذکر کر رہے تھے اور بھائی جان محترم بہت دل چسپی سے سُن رہے تھے، لہٰذا اس طرف سے کان بند کر لینا میرے لیے بھی ممکن نہ ہو سکا۔ محبوب طباعت کے فنی پہلوؤں سے زیادہ واقف نہیں ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی کے دورانِ قیام میں انھوں نے ہائیڈل برگ پرنٹنگ مشینوں کے کارخانے کا خوب جائزہ لیا تھا۔ بلکہ ایک بار تو میں ان سے پوچھ بیٹھا کہ آپ اس ادارے کے شعبۂ فروخت سے تو تعلق نہیں رکھتے اور اگر یہ صحیح ہے تو یہ بتائیے، آپ کو کمیشن کتنی ملتی ہے۔ جرمن زبان میں اس کارخانے کا نام شنیل پریسن فابرک اے جی ہے۔

ہمدرد نے کراچی اور دہلی میں اپنے اپنے پریس قائم کر رکھے ہیں لیکن دونوں مقامات پر ان کو جان بوجھ کر چھوٹے پیمانے پر چلایا گیا ہے۔ بعض ادویات کے لیبل، ڈبّے یا پرچہ ہائے ترکیب استعمال اپنے پریس میں چھپوائے جاتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ہائیڈل برگ کے دورانِ قیام میں چھاپے کی مشینوں والے کارخانے کو دیکھنا گوارا نہ کیا۔ تاہم اس کمی کو میاں محبوب کی بیان کردہ تفصیلات نے پورا کر دیا۔

پرنٹنگ مشینیں بنانے والا یہ کارخانہ یوں تو ۱۸۵۰ء میں قائم کیا گیا تھا لیکن دیکھا جائے تو موجودہ کارخانے سے اس کا کوئی مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس وقت خود چھاپے کے فن نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی۔ گوٹن برگ کے عہد کی طرح اس وقت

بھی ہر مشین کو ہاتھ سے چلایا جاتا تھا۔ اب تو برقی رو سے مشینوں کو حرکت میں لانے کے علاوہ وہ کام بھی مشینوں ہی سے لیا جانے لگا ہے جو آج سے کچھ عرصے پہلے انسان کے ہاتھ انجام دیتے تھے مثلاً کاغذ ڈالنا اور چھپ جانے کے بعد مشین سے اس کو اٹھا کر الگ رکھ دینا۔ خودکار مشینوں نے کام میں سہولت پیدا کر دی ہے لیکن ہر منزل میں بہت سے انسان بے روزگار ہو گئے ہیں۔ غریب انسانوں کی روزی مشینوں کے سپرد کر دینے کے معنے یہ ہیں کہ کارخانے والوں کی آمدنی بڑھنے لگی ہے۔ گویا اس زمانے کے ترقیاتی دور نے غریب کا ذریعۂ معاش اس سے چھین کر اسے زیادہ غریب اور انسانی کام مشین کے سپرد کر کے امیر مالکِ مشین کو اور زیادہ امیر بنانا شروع کر دیا ہے۔ یہ حقیقت ہر قسم کی میکانیکی ترقی پر صادق آتی ہے، صرف چھاپے کی مشینوں ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

تقریباً نصف صدی بعد پرنٹنگ مشینوں کے اس کارخانے کو ایک کارپوریشن کی صورت دیدی گئی اور جب یہ صدی شروع ہوئی تو مشینوں کی وضع قطع، قد و قامت اور نوعیت کے اعتبار سے اُن کی ۳۰ قسمیں ہو گئیں۔ خودکار مشین سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں بنی تھی جس نے چھپائی کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ انجان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں تھی کہ مشین کا ایک حصّہ کاغذ کے ریم میں سے ایک شیٹ خود اٹھا کر کس طرح آگے بڑھا دیتا ہے لیکن آج یہ طریقہ اتنا عام ہے کہ اگر کسی مشین میں یہ صلاحیت نہ ہو تو اسے دقیانوسی سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کی مشینیں اگرچہ اور کارخانے بھی بنانے لگے ہیں لیکن اوّلیت کے ساتھ ساتھ اکملیت کا سہرا اب بھی ہائیڈل برگ آٹو میٹک پلاٹن کو حاصل ہے۔ اس کورپوریشن میں کام کرنے والے یوں تو بہت سے ماہرین نے اعلا خدمات انجام دی ہیں لیکن سب سے زیادہ اپچ کا مظاہرہ گلیخے نامی ایک ماہر خصوصی نے کیا جسے اب بھی خراجِ تحسین ادا کیا جاتا ہے۔

خاص طور پر پچھلے دس سال میں اس کورپوریشن کی پرنٹنگ مشینوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس وقت دنیا کے ستر ملکوں میں اس کے ایجنٹ کام کر رہے ہیں اور مشینوں کی تیاری کا یہ عالم ہے کہ پہلے سے بنے ہوئے سب پرزوں وغیرہ کو ملا کر ایک مشین صرف بیس منٹ میں کام کے لائق بنائی جا سکتی ہے۔ اندازہ ہے کہ اس وقت ساری دنیا میں پچاس ہزار ہائیڈل برگ مشینیں چل رہی ہیں۔

اس کورپوریشن کے موجودہ ڈائرکٹر ہوبرٹ ایچ اے اسٹرن برگ ہیں جو ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور اب ساٹھ سال کے پیٹے میں آنے کے باوجود خوب مستعد اور چست و چالاک ہیں۔ شروع میں انھوں نے برلن کے ایک جمہوریت نواز اخبار کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اور پھر ۱۹۲۶ء میں کورپوریشن میں ڈائرکٹر ہو گئے۔ جہاں تیس سال سے مسلسل کام کر رہے ہیں۔ خودکار مشینوں کی طرح شاید ان کے اعضا بھی فولادی ہیں جن کو انحطاط تو کیا شاید اضمحلال کا سامنا بھی کبھی نہیں ہوتا۔

**اشاعت کا فن** ۔ فنِ اشاعت ایجاد کرنے کے بہت سے دعویدار ہیں لیکن بھاری اکثریت کی رائے کے مطابق گوٹن برگ کو اس باب میں اوّلین مقام دیا جاتا ہے۔ یہ شخص جرمنی کے شہر مینیز میں ۱۴۰۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا۔ اس کا اصلی نام باپ کے نام پر گنس فلیش تھا لیکن اس نے اپنی ماں سے انتہائی عقیدت رکھنے کے باعث اس کا نام گوٹن برگ اختیار کیا اور اصل نام کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔ ۱۴۲۰ء میں اس کا باپ سیاسی سازشوں میں حصہ لینے کے باعث جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ باپ کی فطرت کا کچھ جز و بیٹے کو ورثے میں مل گیا تھا۔ لیکن دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اس نے سوچا کہ کسی بھی سازش میں حصہ لیتے ہوئے اپنے ہاتھ کی تحریر نہ دی جائے جو ثبوتِ جرم پیش کرنے میں معاون بن جاتی ہے۔ اسی احساس نے ترقی پاکر اسے لکڑی کے چھوٹے ٹکڑوں سے حروف کے سانچے بنانے کی راہ دکھائی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب تو ہو گیا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ ذرا سی عبارت بہت دیر میں چھاپی جاتی اور کاغذ پر زیادہ جگہ گھیرتی تھی۔

تاہم بتدریج اس کی اختراعی صلاحیت اپنا کام کرتی رہی۔ لکڑی کے مہرے سیسے کے حروف میں بدلے تاکہ جلدی نہ گھسیں نہ ٹوٹیں اور ہر حرف کا نقش الگ الگ جمانے کی بجائے یہ تدبیر نکالی کہ حروف کو باقاعدہ جملوں کی صورت میں مربوط کر کے پورے صفحے پر ایک ساتھ چربہ اٹھایا جانے لگا۔ نقال دُنیا میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں چنانچہ اس کام کی بھی نقالی ہونے لگی۔ گوٹن برگ نے اپنی اوّلیت کا لوہا منوانے اور حقِ ایجاد کو اپنے لیے مخصوص رکھنے کی خاطر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور ۱۲ دسمبر ۱۴۳۹ء کو فیصلہ اس کے حق میں ہو گیا۔ اس طرح فنِ اشاعت کی ایجاد کا سہرا اس کے سر بندھ گیا جسے آج بھی غیر متنازعہ فیہ کہا جا سکتا ہے۔ مقدمہ کا فیصلہ ہو جانے کے بعد اس نے اس

فن کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا، سیاسی سرگرمیوں کو ترک کر دیا اور اپنے ساہوکار دوست یوہان فسٹ کی شراکت میں ایک کارخانہ ۱۴۵۰ء میں قائم کر لیا جسے دنیا کا پہلا باقاعدہ پرنٹنگ پریس کہا جا سکتا ہے۔

ریل میں۔ میاں محبوب کی باتیں اس درجہ قابلِ توجہ تھیں کہ راستے کی بہت سی چیزیں نظر انداز ہوتی چلی گئیں۔ یوں بھی ہم اس راہ سے کئی بار گزر چکے تھے۔ اس لیے کسی قسم کا افسوس ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔

موٹر اسٹیشن کے قریب پہنچے تو فوراً ہی دو قلیوں نے قریب آ کر ہمارا رختِ سفر سنبھال لیا۔ یورپ کے کئی ملکوں میں ریلوے اسٹیشنوں پر قلی کمیاب بلکہ بعض جگہ نایاب ہوتے ہیں لیکن ہائیڈل برگ کے اسٹیشن پر ان کی افراط تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مسافر کم اور قلی زیادہ تھے۔ شاید اسی لیے ہمارا سامان دو قلیوں نے اٹھا لیا۔ اس "افراط الرجال" کا سبب شاید وہاں کا افلاس ہو۔ جہاں تک اقتصادی ترقی کی رفتار کا تعلق ہے، جرمنی نے دوسری جنگِ عظیم میں تباہ ہونے والے اور ملکوں کی بہ نسبت بہت جلد اپنی حالت سُدھار لی ہے۔ لیکن پھر بھی تباہی جتنی شدید تھی، بحالی اسی اعتبار سے نہیں ہوئی۔ اس لیے کہیں کہیں بیروزگاری اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔

ریل میں ہمارے لیے نشستیں پہلے سے محفوظ ہو چکی تھیں۔ سفری ادارے نے ٹکٹ اور ریزرویشن کارڈ بھائی جان محترم کے حوالے کر دئے تھے۔ ایک قلی زیادہ سمجھدار تھا۔ اس نے ہمارا کارڈ دیکھا اور سیدھا ریل کے ڈبے میں لے جا کر بٹھا دیا۔

ہمارے داخل ہونے سے پہلے ایک بوڑھی عورت ڈبے میں موجود تھی جس نے نظریں جھکا کر عینک کے شیشوں کے اوپر سے اور پھر عینک کو بالکل اتار کر ہمیں اس طرح گھور کر دیکھا کہ میں ایک لمحے کے لیے لرز کر رہ گیا۔ اس عورت کی عمر اتنی زیادہ تھی کہ اسے دُنیا کے کسی حصے میں لے جا کر چھوڑ دیا جائے تو سب علاقے کے باشندے ماں باپ سے بیٹا بیٹی تک سب یک زبان ہو کر اسے نانی اماں یا دادی جان کہنے لگیں گے۔ وہ جگت نانی یا دادی بن کر رہ جائے گی۔ میں سمجھ گیا کہ جس طرح ہمارا لباس ہر جگہ جاذبِ نظر بنتا جا رہا ہے، یہاں بھی اس ضعیفہ کو محوِ حیرت کر دینے کے لیے کافی ہے۔ چند ہی لمحے میں ایک نوجوان سی لڑکی اندر آئی اور اپنی نانی اماں یا دادی جان کے

قریب جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے بھی پلٹ پلٹ کر کئی بار ہمیں دیکھا جیسے ہم کسی اور دُنیا سے کرۂ ارض پر اتر آئے ہوں۔ وہ اپنی دادی جان یا نانی اماں کے لیے سینڈوچ خرید لائی تھی۔ اس نے تھرموس میں سے ایک پیالے میں چائے یا کافی انڈیلی اور ایک ایسی زبان میں بولی جسے اس کی نانی اماں یا دادی جان کے علاوہ میاں محبوب بھی سمجھ سکتے تھے۔

گاڑی وقتِ مقررہ پر یعنی ۸ بج کر ۳۴ منٹ پر چل پڑی تو ڈبے میں ہم پانچ ہی مسافر موجود تھے۔ ایک طرف ہم تین بھائی تھے اور دوسری طرف ایک اجتماعِ ضدین یعنی ایک ضرورت سے زیادہ ضعیف خاتون اور ایک ضرورت سے زیادہ نوجوان لڑکی۔ لیکن ہمیں ایک کی ضعیفی یا دوسری کی جوانی سے کیا سروکار تھا۔ اس سیاحت کے دوران میں بہت سے محاورے ہمارے لیے بالکل الٹے ہو گئے تھے۔ یعنی آم کھانے کے لیے نہیں صرف پیڑ گننے کے لیے وطن سے باہر آئے تھے۔ حقائق اور اعداد و شمار جمع کرنا اور پھر گھر پہنچ کر ان کی روشنی میں اپنے منصوبوں کو مکمل کرنا ہمارا کام تھا۔ اس اجتماعِ ضدین میں عمروں کے تفاوت کے علاوہ ایک اور رنگِ امتیاز بھی اپنا نقش جمائے ہوئے تھا۔ ضعیف خاتون اپنی وضع قطع اور سج دھج کے باعث بالکل "اگلے وقت" کے لوگوں میں شمار ہونے کے لائق تھی اور نوجوان لڑکی یکسر عہدِ جدید کی علمبردار تھی تاہم میں نے محسوس کیا کہ نئی وضع کے اسکرٹ میں ملبوس ہونے کے باوجود یہ جوان لڑکی یورپ کے دوسرے ملکوں کی ہم عمر لڑکیوں سے خاصی مختلف یعنی ایک حد تک شرمیلی تھی جنھیں ہم اپنی سیاحت کے دوران میں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

اس کی نانی اماں یا دادی جان نے چند سینڈوچ کھا کر اور چائے یا کافی کی ایک پیالی پی کر اپنے ڈھیلے کرتے کی آستین سے ہونٹ پونچھے اور اپنے پوپلے منھ سے میاں محبوب کو مخاطب کر لیا اور انھوں نے بھی امریکیوں کے انداز میں "یاہ" کہہ دیا جس کا مطلب "ہاں" ہوتا ہے۔ روزمرہ میں یہ لفظ اتنا عام ہو گیا ہے کہ انگریز، امریکی، جرمن، فرانسیسی، اور شاید اطالوی اور یونانی بھی اسے لب و لہجہ کے ذرا سے فرق کے ساتھ بے تکان بولتے اور ایک ہی مفہوم ادا کرتے ہیں۔

میں نے اپنی زبان میں ایک دم میاں محبوب سے کہا کہ تم ان بڑی بی سے انگریزی میں بات چیت کی کوشش کرو۔ شاید وہ جانتی ہوں تاکہ ہم بھی سمجھ سکیں، ورنہ میں ان سے باتیں تو ضرور کروں گا اور تم کو ہمہ وقت مترجم بنائے رکھوں گا۔ میرا یہ نسخہ کامیاب رہا۔ نوجوان لڑکی کی نانی اماں (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کی دادی جان نہیں تھیں) ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتی تھیں۔ بات چیت کے لیے معمولی استعداد سے بھی کام چل جاتا ہے بلکہ میں اسی قسم کی صلاحیت کو پسند کرتا ہوں۔ اس صورت میں زباں دانی کے جوہر دکھانے کے لیے تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لیا جاتا۔ دل کی سچی بات زبان پر آجاتی ہے۔

جرمنی کی معاشرتی زندگی میں، خصوصاً عورتوں کے رہن سہن کے طریقوں میں جو زبردست تبدیلی دوسری جنگِ عظیم کے بعد رونما ہوئی ہے، اس سے اگلے وقتوں کی نام لیوا یہ بڑی بی بہت ہی ناراض معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ہر لفظ پر خوب زور دینے کے ساتھ ساتھ تیوری چڑھا کر باتیں کرتی رہیں۔ ان کی ہر کڑوی کسیلی بات پر ان کی نواسی جسے بظاہر نئے زمانے کی ہوا خوب لگ چکی تھی، ہر بار زیرِ لب مسکراتی اور کبھی کبھی منہ پھیر لیتی تھی تاکہ یہ پتہ نہ چل سکے کہ نانی اماں کی تلخ باتوں کا اس پر کیا ردِعمل ہو رہا ہے۔ معاشرے کے جدید تقاضوں نے اسے زبردستی اپنے ماحول میں کھینچ لیا تھا اور اس نے اپنی وضع قطع بدل رکھی تھی لیکن قدیم روایتی نقوش جو شاید نانی اماں ہی سے اس کو ورثے میں ملے تھے ابھی ہر لحاظ سے مدھم پڑنے نہیں پائے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا۔ قدرتی طور پر ہر بات کا جو اس کے مزاج کے خلاف تھی، ردِعمل ضرور ہوتا لیکن وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے احساسات کو چھپانے کی کوشش کرتی اور اس میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ بڑی بی بھی جو زمانہ کے سرد و گرم سے خوب آشنا تھیں اور اپنی نواسی کے نئے رجحانات سے بھی ناواقف نہیں تھیں، ہر جلی کٹی بات کہہ کر اس کی طرف ضرور دیکھتی تھیں تاکہ معلوم کر سکیں کہ ضعیفی جواں سال طبیعت پر کس قسم کا تاثر پیدا کر رہی ہے۔ بڑی بی کی خفگی حق بجانب تھی۔ انھوں نے وہ زمانہ دیکھا تھا اور خود اسی زمانے کے ماحول میں پروان چڑھی تھیں جبکہ جرمن خواتین کی اکثریت گھریلو زندگی بسر کرنا اور اپنی فطری صلاحیت و استعداد سے اپنے گھر کو نمونۂ جنت بنانا اپنا فرضِ اوّلین سمجھتی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت جرمن عورتیں خود سپاہی بننے کے

خواب نہیں دیکھتی تھیں بلکہ ایسے بچے جنتی اور ان کی اس طرح پرورش کرتی تھیں کہ وہ بڑے ہو کر سپاہی بن سکیں۔ وہ اس لحاظ سے برہم تھیں کہ اب عورتوں کی اکثریت نے مردوں کے دوش بدوش ہو کر ہر کام میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ اس زمانے کی طرز زندگی عورتوں نے پہلے بھی اختیار کر رکھی تھی، لیکن اس وقت ان کی تعداد نظر انداز کیے جانے کے لائق تھی۔ صرف بڑے شہروں میں ان کی کرشمہ سازیاں اپنا رنگ جماتی تھیں اور اب، انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ یہ وبا قصبات اور دیہات میں بھی پھیل چکی تھی۔ ان کے نزدیک جرمنی میں عائلی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور اس کے مربوط ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔

میں نے پوچھا "کیا آپ اس تغیر کے لیے ہٹلر کو مورد الزام ٹھیراتی ہیں؟"

انھوں نے بڑی تیزی سے کہا "ہرگز نہیں" پھر انھوں نے کہا، "اس میں شک نہیں کہ ہٹلر نے برسر اقتدار آتے ہی ملک کی آبادی کو جو پہلی جنگ عظیم میں خاصی کم ہو گئی تھی، دوبارہ بڑھانے کی خاطر پیدائش اطفال پر ماں باپ کو بعض ٹیکسوں کی ادائیگی سے مستثنیٰ کرنے اور نومولود بچوں کو صحیح نشو و نما کے لیے وظائف دینے کا منصوبہ باقاعدہ پارلیمان سے منظور کرایا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی حرام کے بچے ان مراعات سے محروم رکھے گئے تھے۔ گویا جرمنی نے رُوس کی یہ روش اختیار نہیں کی تھی کہ وظیفہ لینے کی خاطر بچے پیدا کرو، خواہ شادی سے پہلے، خواہ شادی کے بعد۔ ہٹلر نے ہر شادی کے اندراج کو اسی لیے قانون کے دائرے میں رکھا تھا کہ نوجوان لڑکیاں بے راہ روی اختیار نہ کر لیں۔ لیکن اب تو یورپ کے اور ملکوں کی طرح جرمنی نے بھی بے غیرتی کا لباس پہن کر برہنگی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ ارباب اقتدار کو اس قلب ماہیت پر فخر و ناز ہے۔ میرا بس چلے تو ان سب کو لے جا کر دریائے رہائن میں ڈبو دوں!"

**عورت کی حیثیت۔** بڑی بی کی خفگی ایک حد تک بجا و درست تھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک جرمنی میں بھی عورتوں کو اپنے معاشرے میں زیادہ بلند مقام حاصل نہیں تھا۔ پردے کی رسم رائج نہ ہونے کے باوجود وہ زیادہ تر گھر کی چار دیواری میں رہنا اور گھر کی فضا کو ہر لحاظ سے خوش گوار بنانا پسند کرتی تھیں۔ موجودہ صدی شروع ہونے کے بعد یورپ کے بعض ملکوں اور خاص طور پر امریکہ کی عورتوں کے حالات کا مطالعہ کر کے انھیں

بھی مرد کے دوش بدوش چلنے کا شوق چرآیا اور وہ گھر کی چار دیواری سے باہر نکل آئیں۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اپنے مطالبات پیش کر کے تعلیم نسواں کی ضرورت پر بھی زور دیا اور جب اعلیٰ تعلیم پانے کے موقعے ملے تو قدرتی طور پر زندگی میں نئے موڑ پیدا ہونے لگے۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۸ء میں ان کو انتخابات کے موقعوں پر ووٹ دینے اور خود انتخاب لڑنے کا حق دے دیا گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اگلے ہی سال تاریخ میں پہلی بار عورتیں پارلیمان میں اراکین کی حیثیت سے نظر آنے لگیں۔ انھوں نے سیاسی جماعتوں کی مجالس عاملہ میں بھی ذمہ دار عہدے سنبھالنے شروع کر دیئے۔ اثر و رسوخ بڑھنے کے ساتھ ساتھ انھیں سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ پھر ہٹلر کے عہد میں انھوں نے ایک نہیں چند قدم آگے بڑھا لیے۔ وہ ایسی سخت خدمات انجام دینے لگیں جو کہ صرف مردوں کو جنسِ قوی ہونے کے اعتبار سے زیب دیتی تھیں۔ دیہات کی عورتیں کھیتوں میں تو پہلے بھی اپنے مردوں کا ساتھ دینے کے لیے مجبور تھیں، لیکن صنعت و حرفت کے کارخانے ان سے خالی نظر آتے تھے۔ اب وہاں بھی ان کا قبضہ جمنے لگا اور کوئی تخصیص باقی نہیں رہی۔ یعنی مثال کے طور پر اگر کپڑے کا کارخانہ ہے تو کرگھے پر کھڑے ہو کر صرف ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑنا ہی ان کا کام نہیں ہے، بلکہ وہ جانفشانی کے کام کرنے سے گریز نہیں کرتیں۔ شہروں میں وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے موٹر گاڑیاں ہی نہیں چلاتیں بلکہ بسوں میں کنڈکٹری اور ڈرائیوری کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ دیہات میں جایئے تو بڑے بڑے ٹریکٹر اور بلڈوزر ان کے ہاتھ کے نیچے نظر آئیں گے۔

اس روش میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے اور یہ راہ اختیار کرنے کے لیے انھیں حالات نے مجبور کر رکھا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کس درجہ ہولناک تھی اور یورپ کی سرزمین پر جرمنی کو جس تباہ کاری کا سامنا کرنا پڑا، اس سے کون واقف نہیں ہے۔ لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ان میں اکثریت مردوں کی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج لڑائی کو ختم ہوئے گیارہ سال گزرنے کے باوجود ملک کی آبادی میں عورتوں کا تناسب ترپن فی صد ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو

اکثریت والی جنس سارے معاشرے میں فریقِ ثانی کو الگ تھلگ چھوڑ کر کس طرح پنپ سکتی تھی۔ جب گاڑی میں پہیے چھوٹے بڑے ہوں تو ان کی گردشوں کی تعداد مختلف ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ تقریباً یکساں ہوں تو چکروں کی تعداد برابر رہے گی۔ ایک پہیے کو دوسرے کا ساتھ دینا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا دوسرا چارہ کار نہیں تھا۔

عورتوں کے الگ رہنے سے اقتصادی زندگی کا سارا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور اس کے بکھرتے ہی غربت، بیماری اور جہالت کا مذموم چکر چل پڑتا ہے جسے بہت ہی مشکل سے روکا جا سکتا ہے۔ انسان مفلس و نادار ہو تو صحت جواب دے بیٹھتی ہے صحت قائم نہ رہے تو روزگار پر اثر پڑتا ہے، آمدنی گھٹتی ہے۔ رُوپیہ پاس نہ ہو تو صحت کے ساتھ ساتھ تعلیم پانے کے مواقع بھی میسّر نہیں آ سکتے اور جب جہالت کا دور دورہ ہو تو غربت و افلاس کا رنگ جمنا لازمی ہے۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے اور اس مذموم چکر کو توڑنا آسان نہیں رہتا۔

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اقتصادی زندگی کے شیرازے کو مربوط رکھنے کی خاطر جرمنی کو اخلاقی قدروں سے بھی ہاتھ دھو لینا پڑا ہے لیکن اگر معاشرتی کارکن ذرا توجہ دیں۔ اور یقیناً اِس منزل میں ہر سعی و کاوش سے کام کیا جا رہا ہے —— تو اخلاقی قدروں کو اپنی دیرینہ روایات کے مُطابق بدل لینا ممکن ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اخلاقی قدریں قومی حیثیت رکھتی ہیں اور اقتصادی نظام کے ضمن میں بین الاقوامی دائرے میں رہنے کے لیے انسان مجبور ہوتا ہے اور یہ مجبوری ایسی ہے کہ برابر بڑھتی رہتی ہے۔ اس پر احتساب مشکل ہو جاتا ہے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اخلاق کو معیشت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ لیکن زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جبکہ اِنسان کم درجے کی بُرائی گوارا کر لیتا ہے۔

اس وقت ملک کی آبادی پانچ کروڑ اٹھارہ لاکھ کے قریب ہے! ان میں عورتوں کی تعداد تقریباً دو کروڑ چھہتر لاکھ یعنی ۵۳ فیصد ہے اور ان میں سے ایک کروڑ گیارہ لاکھ شادی شدہ ہیں۔ باقی کنواری یا بیوہ ہیں۔ ان کے برعکس سینتالیس فی صدی یعنی دو کروڑ تینتالیس لاکھ مردوں میں سے سبھی برسرِ روزگار نہیں ہیں۔ ان میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو لڑائی میں معذور ہو گئے اور کسی روزگار کے لائق نہیں رہے۔

اور اگر درخت اور پودے طفیلی کیڑوں کے سامنے پنپ نہیں سکتے تو انسان عضوِ معطل کو ساتھ رکھ کر کس طرح زندہ بچ سکتا ہے۔

جرمنی نے دوسری جنگِ عظیم میں شدید تباہی کے بعد اپنی حالت کو جس قدر جلد سنبھالا ہے، اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ کچھ مقابلہ جاپانیوں سے ہو سکتا ہے لیکن وہاں اخلاقی قدروں کا بیڑا جس بُری طرح غرق ہوا ہے، اس کے سامنے جرمنی مستحقِ مبارکباد ہے۔ دونوں ممالک اقتصادی بحالی کے ساتھ ساتھ تزکیۂ اخلاق کے لیے بھی کوشاں ہیں۔ جرمنی میں اس کوشش کی رفتار ہر لحاظ سے تیز تر ہے۔

مردوں اور عورتوں کی تعداد میں تفاوت کے ساتھ ساتھ ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے اور وہ پناہ گزینوں سے متعلق ہے۔ دوسرے ملکوں خصوصاً مشرقی جرمنی سے ترکِ وطن کر کے یا زبردستی نکالے جانے کے بعد جو لوگ مغربی جرمنی میں داخل ہوئے ان میں مردوں اور عورتوں کا تناسب ایک اور دو کے برابر تھا۔ اور ان عورتوں میں سے پینتالیس فی صد مجرد اور پندرہ فی صد بیوہ یا مطلقہ تھیں۔ باقی میں سے پندرہ فی صد عورتیں ایسی تھیں جو اپنے وطن میں برسرِ روزگار تھیں۔ بالفاظِ دیگر جب آس پاس کے ملکوں نے جرمن قوم کے افراد کو دیس نکالے کی سزا دینی شروع کی تو بیشتر کارآمد مردوں اور جوان قوی عورتوں کو روک کر باقی سب کو سرحد کے پار دھکیل دیا۔ لہٰذا اس صورتِ حالات کے ماتحت بھی ضروری تھا کہ عارضی طور پر اپنی روایات کو ترک کر کے عاملینِ معیشت میں عورت کو کم سے کم مساوی درجہ دیا جائے تاکہ شکستہ کشتی بالکل ڈوب جانے کی بجائے بہت سے ہچکولے کھا کر ہی کسی نہ کسی طرح ساحل تک پہنچ جاتے۔

بڑی بی کو صرف اپنی قومی روایات کا پاس تھا اور یہ احساس یقیناً بُرا نہیں تھا۔ حال کے ساز پر مستقبل کا نغمہ چھیڑنا ان کی بساط سے باہر تھا۔

ہائیڈل برگ سے ڈارمسٹاٹ تک ریل کا سفر صرف ۴۵ منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ گاڑی جو آٹھ بج کر ۳۴ منٹ پر چلی تھی، اپنے نظامِ اوقات سے صرف ایک منٹ تاخیر کے ساتھ ۹ بج کر ۲۰ منٹ پر ڈارمسٹاٹ پہنچ گئی۔ میں نے اشارے سے بڑی بی کو سلام کر کے اجازت چاہی۔ انھوں نے بہت سی دعائیں دیں اور خدا حافظ کہا۔

ڈارمسٹاٹ میں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا راہ نامہ جو بہت پہلے تیار کیا گیا تھا، کسی بھول

یا کتر بیونت کے بغیر عمل میں آرہا تھا۔ اس میں جو ارتباط و باقاعدگی پائی جاتی ہے' اس کے لیے بھائی جان محترم کا سلیقۂ کار لائق تحسین ہے۔ وہ اس میں ذرا بھی لچک پیدا ہونے نہیں دیتے۔ بہت معمولی سی تبدیلی صرف اس حد تک گوارا کر لیتے ہیں جس سے اصل لائحہ عمل میں ذرا بھی رخنہ پیدا نہ ہو۔

ڈارمسٹاٹ کے اسٹیشن پر پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ ہوٹل رٹز سے روانہ ہونے سے قبل جبکہ میں اپنے مطالعہ میں مصروف تھا اور وہ ہوٹل کا حساب چکتا کرنے کے لیے اس کے دفتر میں گئے تھے، تو ایک ٹرنک کال ڈارمسٹاٹ میں ای مرک کے دفتر میں کر دی تھی اور احتیاطاً انھیں مطلع کر دیا تھا کہ ہم لوگ فلاں وقت اسٹیشن پہنچ رہے ہیں اپنے پہنچنے کی باقاعدہ اطلاع اور کمپنی دیکھنے کے لیے اشتیاق کا اظہار کراچی اور دہلی سے کیا جا چکا تھا لیکن چونکہ اس شہر میں ہمارا قیام برائے نام تھا، اس لیے بھائی جان محترم نے ٹیلی فون پر یاددہانی کر دی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کمپنی کی موٹر ہمیں لینے کے لیے اسٹیشن پر آگئی۔ اخلاقاً کمپنی کے منتظم اعلیٰ نے ہم سب کو دوپہر کے کھانے کے لیے مدعو کر لیا تھا۔ اس لحاظ سے بھی ہم ایک بڑی پریشانی سے بچ گئے۔ کیونکہ ہمارے لیے اس شہر میں پھرنا گھومنا یا کسی حصے کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ ہم زیادہ سے زیادہ وقت ای مرک کے کارخانے کی زیارت میں صرف کرنا چاہتے تھے جس کے وجود نے ڈارمسٹاٹ کو جرمنی کے نقشے میں نمایاں کر رکھا ہے۔

ڈارمسٹاٹ۔ پلیٹ فارم پر گاڑی کے رکتے ہی حسب معمول ایک چہل پہل شروع ہو گئی۔ کچھ لوگ اترنے اور کچھ چڑھنے لگے۔ جانے والوں کو عزیز و اقارب الوداع کہنے ساتھ آئے تھے اور آنے والوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے بھی بہت سے احباب اور واقف کار موجود تھے۔ اس جم غفیر میں بھائی جان محترم کی متلاشی نگاہیں صاف ستھری وردی پہنے ہوئے ایک شخص پر پڑیں جس کے کوٹ پر ای مرک کے علامتی نشان کا بلا بھی ٹنکا ہوا تھا۔ میاں محبوب نے اسے اشارے سے بلایا اور جرمن زبان میں سمجھا دیا کہ ہم ہی وہ تین اشخاص ہیں جن کو مرک کارخانے میں جانا ہے۔ چنانچہ اس کی ہدایت پر قلی ہمارا سامان اٹھا کر اس کے اور ہمارے ساتھ چل پڑے۔

اسٹیشن کے باہر ایک جھمجھاتی ہوئی اوپیل کار کھڑی تھی، جس میں سارا سامان

لادا گیا اور ہم بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گاڑی چل پڑی تو ہم نے آپس میں بات چیت کرنے کی بجائے شہر پر ایک سرسری نظر ڈال لینی مناسب سمجھی۔

ڈارمسٹاٹ، جو اوڈن والڈ نامی پہاڑ کے دامن میں دریائے رہائن کے ساحل تک پھیلا ہوا ہے، کوئی بہت پرانا شہر نہیں کہا جاسکتا۔ تاریخ میں اس کا ذکر پہلی بار گیارھویں صدی کے ایک نوشتے میں آیا ہے اور چودھویں صدی تک اس کی حیثیت ایک گاؤں سے زیادہ نہیں تھی۔ البتہ اس وقت خانوادہ کاٹزینن بوگن کے نوابوں نے اپنے آرام و سکون کے لیے وہاں ایک مختصر سا محل بنوایا تھا تاکہ کبھی کبھی سیر و تفریح کے لیے اس میں عارضی قیام کر لیا کریں۔

۱۴۷۹ء میں اس خاندان کا سلسلہ اولادِ نرینہ نہ ہونے کے باعث منقطع ہو گیا تو آخری نوابزادی کا رشتہ ہیسے خاندان کے ایک فرمانروا سے کر دیا اور شہر لڑکی کے جہیز میں دے دیا گیا۔ البتہ اس کی حیثیت فلپ باہمت کے انتقال کے بعد ۱۵۶۷ء میں کچھ رنگ لائی کیونکہ اس کا بیٹا جارج سریر آرائے سلطنت ہوا اور اس نے ڈارمسٹاٹ کو اپنے قیام کے لیے پسند کر لیا۔ اسے اس شہر کی فضا ایسی بھائی کہ اس نے اپنے خاندان کا نام ہی بدل کر ہیسے ڈارمسٹاٹ کر لیا۔ اسے اور زیادہ عروج لوئی دھم کے عہد میں (۱۷۹۰ء تا ۱۸۳۰ء) حاصل ہوا۔ اس نے پرانے شہر کے ساتھ نئے شہر کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ اب بھی اس شہر کے دونوں نئے اور پرانے حصے ایک دوسرے سے بالکل نمایاں نظر آتے ہیں۔ پرانے شہر میں تو اپنی دِلّی جیسی تنگ و گلیاں بھی ہیں جن کو چھوڑ کر چلا جانا حضرت ذوق نے گوارا نہ کیا تھا۔ البتہ نیا شہر وسیع بازاروں اور اونچی عمارتوں پر مشتمل ہے۔

شہر کے صدر بازار میں قدیم پارلیمان ہاؤس، ایک پرانا محل اور ڈاک خانہ ہے ایک عجائب گھر بھی ہے جس میں منجملہ اور نوادر کے مصر کے آثارِ قدیمہ سے نکلی ہوئی بعض نایاب چیزیں جمع ہیں۔ ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں چھ لاکھ کے قریب کتابیں اور چار ہزار قلمی نسخے موجود ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کے جہازوں نے اس شہر پر خوب بمباری کی تھی۔ اس تباہ کاری کے نشانات اب بھی نظر آتے ہیں۔ شہر کے مشرقی حصے میں دو عمارتیں — ایلس اسپتال اور ایک روسی گرجا گھر جاذبِ نظر بن جاتی ہیں جن کو روس کے شہنشاہ نکولس دوم نے ۱۸۹۸ء میں اپنی جرمن بیوی کی یاد میں تعمیر کرایا تھا جو اسی علاقے کی

رہنے والی تھی۔

**صوبہ ہیسے** ۔ ڈارمسٹاٹ میں قدم رکھتے ہی گویا ہم باڈن ورٹم برگ سے نکل کر صوبہ ہیسے میں داخل ہو گئے۔ یہ وفاقی جمہوریہ جرمنی کے تقریباً وسط میں اس طرح واقع ہے جیسے انسان کے جسم میں دل ہوتا ہے لیکن بلحاظ اہمیت اسے قلب جرمنی نہیں کہا جا سکتا۔ جانب شرق اس کی سرحد مشرقی جرمنی سے ملی ہوئی ہے۔ اس کا رقبہ آٹھ ہزار ایک سو پچاس میل کے قریب ہے اور موجودہ آبادی چوالیس لاکھ اڑسٹھ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے نو آبادی کا تناسب تقریباً پانچ سو چوالیس اشخاص فی میل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض صنعتی شہروں مثلاً فرینکفرٹ، ہاناؤ، اوفن باخ اور کاسل میں آبادی بہت زیادہ گنجان ہے اور باقی علاقوں میں خاصی چھدری ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں اس صوبے پر بمباری ہوئی تو اٹھارہ فی صد آباد حصّہ تباہ و برباد ہو گیا اور مرنے والوں کے علاوہ تقریباً سات لاکھ انسان ترک وطن کر گئے، جن کی بڑی تعداد بعد میں واپس تو آ گئی لیکن جو افراط و تفریط اس دوران میں پھیلی اس نے سارے نظام پر برا اثر ڈالا۔ صوبے کا صدر مقام اس وقت ویز باڈن ہے جس کی آبادی سوا دو لاکھ کے قریب ہے۔ ہموار میدانوں کے ساتھ ساتھ صوبہ کا ایک بڑا حصّہ اونچے پہاڑوں کی صورت میں ہے جن کی بلندی ایک ہزار آٹھ سو ستاون فٹ سے لے کر دو ہزار سات سو اکسٹھ فٹ تک ہے۔ صرف ایک چوٹی جو واسر کوپے کہلاتی ہے، تین ہزار ایک سو گیارہ فٹ بلند ہے۔

اس صوبے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سب سے زیادہ دریا بہتے ہیں۔ دریائے رہائن، مین، لاھن، نکر، وبسر، فلڈا اور ویرا وغیرہ نے مل کر سارے علاقے کو سرسبز و شاداب بنا رکھا ہے۔ ان دریاؤں کے علاوہ گرم پانی کے چشمے بھی ہیں جن سے صحت و تندرستی کے باب میں پوری طرح استفادہ کیا جاتا ہے۔ ان کی بڑی تعداد فرینکفرٹ کے آس پاس ہے۔

اس صوبے کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ اس کے قدیم ترین باشندے چٹی قبیلے کے افراد تھے۔ رومی مورخ ٹیسی ٹس نے اپنی تاریخ جرمانیہ میں ان کا جو حال تحریر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پہلی صدی عیسوی سے پہلے وہاں موجود تھے۔ اس

وقت ان کی حکومت کا صدر مقام مائیم تھا جسے اہلِ روما نے ۱۵ء میں جلا کر خاک کر دیا۔ اس کے بعد فرینک قوم کے ایک اور قبیلے "وہیسی" نے اس علاقے کو اپنا مسکن بنالیا۔ اور اسی کے نام پر صوبہ آج تک "وہیسے" کہلاتا ہے۔ رُومی سلطنت کے زوال کے بعد یہاں کے باشندوں نے سنٹ بونی فیس کی کوششوں سے عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ بلکہ مینز نصرانیت کی تبلیغ کا مرکز بن گیا۔ ۹۳۶ء میں اوٹو تخت نشین ہوا تو سارا صوبہ اس کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ لیکن ۱۱۳۷ء میں تھور نگیا خاندان نے اس پر اپنا سکہ جمادیا۔ اور ایک سو دس سال تک اپنے تابعِ فرمان رکھا۔ اس صوبے کی تاریخ میں تقریباً تین سو سال کا زمانہ بالکل ناقابلِ ذکر کہا جاسکتا ہے۔ فلپ نے سولھویں صدی میں اسے نئی شان بخشی کیونکہ تعلیم کو عام فروغ دینے کی خاطر اس نے ماربرگ میں ایک یونیورسٹی قائم کی جہاں دینی تعلیم کے علاوہ معاشرتی علوم پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ فلپ کے اِنتقال کے بعد یہ علاقہ اس کے چار بیٹوں میں تقسیم ہوگیا۔ ان میں سے دو لڑکے تو اپنی نسل آگے بڑھانے سے پہلے ہی فوت ہوگئے، اور ان کے دو حصّے بھی باقی دو بھائیوں کے قبضے میں آگئے۔ ۱۸۶۶ء میں اس کا کچھ حصّہ پرشیا نے اپنے اندر شامل کرلیا تھا جو بعد میں واپس مل گیا۔ دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد جب اتحادیوں نے آپس میں جرمنی کے حصّے بخرے کیے تو اس صوبے کے بھی دو ٹکڑے ہوگئے اور ان پر الگ الگ فرانسیسیوں اور امریکیوں کا تسلّط ہوگیا تھا۔

غیر ملکی تسلّط ختم ہونے کے بعد جرمنی کے اور علاقوں کی طرح اس صوبے نے بھی بڑی تیزی سے ترقی کی، خصوصاً دواسازی کے دو کارخانے جو اس کے لیے باعث صد افتخار ہیں، پوری طرح بحال ہوگئے۔ انھی میں سے ایک ای مرک کا کارخانہ ہے جسے دیکھنے کا عزم ہمیں اس طرف لیے جارہا ہے۔

**ای۔مرک۔** ڈارمسٹاٹ میں ای۔مرک (اے۔جی) نام سے دواسازی کا ایک کارخانہ سترھویں صدی عیسوی سے قائم ہے۔ اس کا ابتدائی نام اینگل اپوتھیک تھا جس کی بنیاد ۱۶۵۴ء میں رکھی گئی تھی۔ چودہ سال بعد اس کارخانے کو پورے ساز و سامان کے ساتھ مرک خاندان نے خرید لیا۔ اس وقت دواسازی کا جو معیار تھا، اس سے اس دواخانے کی نوعیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ بہت عرصے تک وہ عام روش کے مطابق

چلتا رہا اور کوئی ایسی قابلِ ذکر بات ظہور میں نہیں آئی جو اسے ساری دُنیا میں نہیں تو کم سے کم یورپ ہی میں مقبول بنا دیتی۔ البتہ ای مرک خاندان ہی کے ایک رکن ہنریک ایمانوئیل مرک نے جو ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوا تھا اور جرمنی میں اور جرمنی کے باہر جا کر طب اور دُواسازی کی اعلیٰ استعداد حاصل کر چکا تھا، اس طرف توجہ دی۔ ۱۸۱۶ء میں جبکہ اس کی عمر صرف بائیس سال تھی، اس نے نئے عزم و ارادے کے ساتھ دُواسازی کے فن کو ترقی دینے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تجربہ گاہوں کے بغیر حصُولِ مقصد ناممکن ہے اور چونکہ اس دَور کے کیمیا داں ہر قسم کی روئیدگی کے قلویاتی تجرباِت پر دماغ سوزی کر رہے تھے، اس لیے ایچ۔ ای مرک نے بھی اسی دائرے میں رہ کر اپنے کام کی ابتدا کی اور حقیقت یہ ہے کہ اسے اس قدر کامیابی ہوئی کہ ہمعصروں نے اس کی ذہانت کا اعتراف کر لیا۔ ۱۸۲۷ء میں اس نے تجرباِت کے نتائج کو سامنے رکھ کر ایک کتابچہ لکھا جس میں ہر جڑی بوٹی کی ماہیت وخاصیت کے ساتھ ساتھ اس کے کیمیائی اجزا کا تفصیل کے ساتھ ذکر تھا۔

دیکھا جائے تو یہ کوئی نئی کاوش نہیں تھی۔ عرب واندلس کے مُسلمان کیمیا داں اس سے بہت پہلے اس پہلو پر دماغ سوزی اور خامہ فرسائی کر چکے تھے اور جس طرح علمائے یورپ علم کے دوسرے شعبوں میں مسلمان سائنس دانوں کی نگارشات و افکار سے استفادہ کر رہے تھے، اس میدان میں بھی فائدہ اٹھانے سے انھوں نے گریز نہ کیا ہوگا۔ اس حقیقت کا اعتراف کیا جائے یا نہ کیا جائے، نقاد اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ جرمنی کی سرزمین پر اس کام کو باقاعدہ سائنسی انداز میں شروع کرنے کا فخر ای مرک کو حاصل ہوا۔ اس کی تجربہ گاہیں نہ صرف جرمنی یا یورپ بلکہ ساری دنیا میں مشہور ہو گئیں اور اپنے تجرباِت کی بنا پر جو دوائیں اس کے کارخانے نے تیار کیں، ان کی مانگ ساری دنیا میں بڑھتی چلی گئی۔

اسی زمانے میں ایچ۔ ای۔ مرک کے ایک گہرے دوست جسٹس فان لائے برگ نے ایک مقالے میں اس موضوع پر روشنی ڈالی اور لکھا:-

"ڈارمسٹاٹ کے ایک دُواساز مسٹر مرک نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ صرف نباتات کے جوہروں کی بنیاد پر ہر قسم کی دُوائیں تیار کریں گے۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے

ہیں کہ یہ لائق انسان بہترین قسم کی دوائیں فراہم کرے گا جو بنی نوع انسان کے لیے مفید ثابت ہوں گی"۔

موٹر گاڑی شہر کے چوڑے چکلے اور بعض سکڑے راستوں سے گزر کر تقریباً نصف گھنٹے میں مرک کارخانے کے صدر دروازے پر پہنچ گئی جہاں ہمارا استقبال بہت شاندار طریقہ پر کیا گیا۔ سب سے پہلے معانقہ اپوتھی کر لیوپولڈ لرش سے ہوا۔ گویا عطار ہونا ان کے نام کا جزو تھا۔ اس کے برعکس آج کل ہمارے ملک میں بعض مغرب زدہ لوگ پیشہ عطاری کو معیوب سمجھنے لگے ہیں۔ اور اگر کسی دواساز کو عطار کہہ دیا جائے تو وہ برا مانتا ہے۔

لرش صاحب ہم کو سب سے پہلے دفتر استقبالیہ میں لے گئے، جہاں ایک رجسٹر میں ہم تینوں کے نام اور پتے درج کر لیے گئے۔ بھائی جان محترم نے دہلی کا، میں نے کراچی کا اور میاں محبوب نے بون کا پتہ لکھا۔ دفتر استقبالیہ کے وسیع ہال میں ایک بہت بڑی رنگین نیم تنہ تصویر اس اولوالعزم ہستی کی آویزاں ہے جو اس کارخانے کا بانی تھا۔

دفتر استقبالیہ کے بالکل قریب ہم سب ایک لفٹ میں سوار ہوئے اور چار منزلیں طے کرنے کے بعد پانچویں منزل کی کھلی چھت پر پہنچ گئے۔ ہمیں وہاں لے جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم ایک اونچی سطح سے کارخانے کی سب عمارتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں اور اس کی وسعت کا اندازہ کر لیں۔ میں نے لرش صاحب سے کہا کہ آپ کو اس مقام پر زیادہ طاقت ور شیشوں کی دوربینیں رکھنی چاہئیں تاکہ زائرین ان کے ذریعہ ہر چیز کا قریب کی نظر سے مشاہدہ کر سکیں۔ کیونکہ بعض عمارتیں اس چھت سے اتنی دور ہیں کہ ان کا صحیح نقشہ دائرۂ نگاہ میں نہیں آتا۔ انھوں نے اس مشورے کو پسند کیا اور آئندہ اسے عملی جامہ پہنانے کے امکان پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔

کارخانے کی ابتدا یہ تھی کہ اسے ایک مختصر سی عمارت میں کھولا گیا تھا اور اب یہ عالم ہے کہ ساڑھے پانچ لاکھ مربع گز سے زیادہ رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور تمام شعبوں سے متعلق عمارتوں کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔ شروع میں کام کرنے والوں کا شمار ایک ہاتھ کی پوروں پر ممکن تھا اور اب تمام ملازمین کی تعداد تقریباً چھے ہزار ہے۔ فیکٹری کے موجودہ سربراہ ڈاکٹر کارل مرک ہیں۔ بہت سے ماہرین طبیعات و حیاتیات، کیمیا دانوں اور دواسازوں کے علاوہ اعلیٰ قسم کے تربیت یافتہ کارکن اس ادارے سے وابستہ ہیں

جن میں سے بیشتر کو فیکٹری ہی میں کام سکھا کر اس لائق بنایا گیا ہے کہ وہ حسبِ ضرورت خدمات انجام دے سکیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ منتظمین اور عملے کے درمیان تعلقات بہت خوش گوار ہیں۔ کبھی بھی کسی بات پر اختلافِ رائے کی نوبت نہیں آتی۔

لفٹ کے ذریعہ نیچے اترنے کے بعد لرش صاحب ہم کو ایک ایسی عمارت میں لے گئے جو اُن کے بیان کے مطابق فیکٹری کی قدیم ترین عمارت تھی اور جو کام اب سے سو سال پہلے اس میں شروع کیا گیا تھا، وہی آج بھی ہو رہا تھا۔ اس سو سال کی مدت میں عمارت یک منزلہ سے سہ منزلہ ہو گئی تھی اور دوا سازی کے آلات و سامان کو جدید وضع پر لے آیا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ پچھلی صدی کے نصفِ اوّل میں جب مرک کارخانے نے اپنی یہ پہلی ذاتی عمارت تعمیر کی تو صرف اسی قدر مختصر تھی لیکن کام کی مقدار کے اعتبار سے اسے حقیر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دوسری چیزوں سے قطع نظر صرف افیون کے مرکبات اس قدر زیادہ تیار ہوئے کہ ۱۸۳۲ء اور ۱۸۴۲ء کے درمیان اس کا خرچ ڈیڑھ سو پونڈ سے بڑھ کر سولہ سو پونڈ سالانہ ہو گیا۔ دواؤں کا پوری طرح خالص ہونا ان کی مقبولیت کا باعث تھا۔ اپنی ادویہ کے بارے میں خود مرک نے ایک دفعہ اپنے ایک مستقل گاہک کو تحریر کیا:

"میں اپنی دواؤں کے خالص ہونے کا پوری طرح ضامن ہوں اور اگر کبھی یہ ثابت ہو جائے کہ میرے کارخانے کی کسی مفرد یا مرکب دوا سے محض اس کی ناقص تیاری کی وجہ سے کسی شخص کو نقصان پہنچ گیا ہے تو میں ہر ممکن تاوان ادا کرنے کے لیے تیار رہوں گا۔"

آج بھی اس کارخانے کی ہر دوا کے لیبل پر ای مرک کے دستخط ثبت ہوتے ہیں جو اس کے خالص ہونے کی ضمانت دیتے ہیں۔

اس عمارت میں اس وقت بھی صرف افیون کے مرکبات تیار کیے جاتے ہیں جنھیں بعد میں دوسری دواؤں کا جزو بنایا جاتا ہے۔ مسٹر لرش نے اعتراف کیا کہ پچھلی صدی کے آخر تک جو دوائیں اس کارخانے میں تیار ہوتی تھیں، ان کا انداز بالکل دقیانوسی تھا خصوصاً آج کل کی پیداوار کے مقابلے میں انھیں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس وقت تجربات بڑے بھونڈے طریقے پر کیے جاتے تھے اور صحیح آلات غیر دریافت ہونے کے باعث ان کا معیار بلند کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔

انھوں نے بتایا کہ حیاتین ا، ب، ج، د وغیرہ کی دریافت کے بعد سے ہمارے کارخانے کی ادویہ میں ایک نیا موڑ پیدا ہوا ہے اور قابلِ ذکر ترقی اس صدی کے ابتدائی تیس سال میں رونما ہوئی ہے۔

وہ ہم کو مفردات کے حصّے میں لے گئے جو کئی شعبوں پر مشتمل ہے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں وہ سب کچھ موجود ہے جس پر مشرقی طب کی بنیاد قائم ہے۔ جڑی بوٹیوں والے حصّے میں تمام دوائی پودوں کی جڑوں، چھالوں، خشک شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں کو ذخیرہ کرنے کا الگ الگ باقاعدہ انتظام ہے۔ جب کسی چیز کی ضرورت کسی شعبہ دواسازی میں ہوتی تو وہاں اس کی مانگ آتی اور فوراً اس کی تعمیل کردی جاتی ہے۔ اسی طرح معدنی اشیاء کا ایک حصّہ ہے اور ایک علیٰحدہ حصّے میں جانوروں سے تعلق رکھنے والی چیزیں جمع کی گئی ہیں۔ کم مقدار والی اشیاء تو بے شک کینوس کے تھیلوں اور ٹین کے کنستروں میں رکھی گئی ہیں لیکن جن کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ ان کو ذخیرہ کرنے کے لیے سیمنٹ کی ڈھکی ہوئی ہودیاں بنا کر رکھنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

مرکّبات کے حصّے کی تفصیل لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ فیکٹری اس قدر اقسام میں دوائیں تیار کرتی ہے کہ اگر اس کے اربابِ حل وعقد سے ان کی صحیح تعداد کے بارے میں سوال کیا جائے تو وہ ایک دم جواب دینے میں کسی قدر تامل کریں گے۔ کیونکہ یہ مسئلہ سب سے پہلے غور طلب ہوگا کہ ایک ہی چیز کے جو مختلف النوع مرکبات تیار ہوتے ہیں ان کو ایک دوا کہا جائے یا ایک سے زیادہ۔ نسخے میں دوائی اجزا کے ذرا سے ردّوبدل یا اوزان کی معمولی کمی بیشی سے مرکّب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اگر بنیادی اعتبار سے دیکھا جائے تو مرکب کی دواؤں کی تعداد ایک سو سے زیادہ نہیں ہو سکتی لیکن مختلف آمیزشوں کے ساتھ ان کا شمار کئی سو تک پہنچ جائے گا۔

ہم نے دیکھا کہ ہر شعبے میں کام بالکل اسی انداز پر ہو رہا ہے جس طرح یونانی ادویہ کے اعلیٰ دواخانوں میں ہوتا ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ ہر چیز کا جوہر کم سے کم مقدار میں نکالا جاتا ہے۔ اسی لیے جب کئی جوہروں سے مل کر نسخے کے مطابق دوا تیار ہوجاتی ہے تو ہر خوراک کی مقدار مختصر سی معلوم ہوتی ہے۔ اسے چھوٹی سی گولی، ٹکیہ یا کیپسول کی صورت میں منتقل کر لیا جاتا ہے اور اگر رقیق صورت میں ہو تب بھی مقدار زیادہ نہیں

ہوتی۔

جدید دوا سازی کے اسی اصول کو ہمدرد نے بھی مدِ نظر رکھا ہے اور اسی لحاظ سے بیشتر ادویہ ہماری فیکٹریوں میں تیار ہوتی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ہم نے بعض چیزوں کو رقیق صورت میں رکھا ہے اور انھوں نے سفوف بنالیا ہے' اور ان کی بعض ایسی رقیق چیزیں ہیں جو ہمارے ہاں سفوف یا ٹکیوں کی صورت میں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ہاں طاقت بخشنے والی ایک دوا کیپسول میں بھری جارہی تھی۔ ڈبے پر چھپے ہوئے اس کے اجزاء پر نظر ڈالی تو ان میں اور ہمارے شربت اکسیر خاص کے اجزاء میں بڑی یکسانیت پائی گئی۔ ان کے ہاں گندھک کا جوہر بھی اس میں شامل ہے جو ہمارے شربت میں نہیں ہے اور اس کے بجائے دوسرے زیادہ موثر اجزاء شامل ہیں۔

میں نے اس موازنے کا ذکر ڈاکٹر رش سے کیا تو انھوں نے اس رائے کی تردید نہیں کی بلکہ اعتراف کیا کہ مرک فیکٹری کے تمام محققین اور تجزیہ کاروں کے لیے ہدایت ہے کہ وہ ہر منزل میں دوا سازی کی پچھلی پانچ ہزار سال کی تاریخ کو مدِ نظر رکھا کریں۔

ان کا کام چونکہ بہت بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا ہے' اس لیے ہر قسم کی کئی کئی مشینیں ہر شعبے میں نصب ہیں۔ مثلاً ادویہ کو پیسنے والی دو درجن چکیاں ہیں جو بجلی سے چلتی ہیں اور آن واحد میں سخت سے سخت چیز کو سرمے کی طرح باریک کرکے رکھ دیتی ہیں۔ گولیاں اور ٹکیاں بنانے والی مشینوں کی تعداد ان سے بھی زیادہ ہے۔ ان سب مشینوں کی دیکھ بھال رکھنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ خودکار مشینوں کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ انسانی محنت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

فیکٹری میں صفائی ستھرائی کا بے حد خیال رکھا جاتا ہے۔ کسی چیز پر گرد یا کسی مقام پر کوئی مکھی وغیرہ نظر نہیں آئی۔ ہمدرد کو بھی اس بات پر فخر ہے۔ البتہ مرک فیکٹری دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ نفاست پسند ہوتی ہیں اور اسی وقت ہم دونوں بھائیوں نے تہیہ کیا کہ کم سے کم پیکنگ کی خدمات پر آئندہ مردوں کے بجائے عورتوں کو مامور کیا جائے۔ عورت جس طرح اپنی پتلی اور لمبی انگلیوں کے باعث ایک عمدہ ٹائپسٹ بن سکتی ہے' اسی طرح وہ اپنی اس جسمانی خصوصیت کے اعتبار سے پیکنگ

کا کام بہتر سلیقے کے ساتھ انجام دے سکتی ہے[1]۔ مرک فیکٹری میں تحقیق و تدوین کے کام میں بھی بہت سی عورتیں مصروف ہیں۔ یہ بات ہمارا ملک ذرا دیر میں پیدا کریگا۔ عورتوں میں تعلیم اور پھر سائنسی تعلیم کا فقدان ہمیں اس راہ پر چلنے سے کچھ عرصے تک محروم رکھے گا۔

میاں محبوب کو جرمنی بھیجنے کا اصل مقصد یہی ہے کہ وہ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر ہمدرد کے شعبۂ تحقیقات میں مفید ثابت ہوں اور اپنی بچیاں، سعدیہ، ثریا اور مسرت، اگر سائنس خصوصاً علم طب کی طرف راغب ہوئیں تو ان کو بھی اسی راہ پر لگا کر ہمدرد کے لیے مفید بنایا جائے گا۔

ہم نے اس کارخانے میں دواسازی کے علاوہ تحقیقات اور بعد کی آزمائش کے شعبے بڑی دل چسپی کے ساتھ دیکھے اور ان سے مفید تاثرات حاصل کیے۔ ہمیں بہت جلد اپنے ہاں ان شعبوں کو زیادہ وسیع کرنا ہے۔

فیکٹری کے اس حصے کو ہم نے ذرا سرسری نظر سے دیکھا جہاں صنعتوں میں کام آنے والے مرکبات تیار کیے جاتے ہیں۔ ان میں چمڑا رنگنے والے مسالوں سے لے کر السی اور زنارپین کے تیل تک سینکڑوں چیزیں شامل ہیں۔ ہمیں ان سے براہ راست کوئی دل چسپی نہیں تھی، اس لیے زیادہ توجّہ نہیں دی گئی۔ اسی طرح محافظِ نباتات ادویہ اور کیڑے مار سفوف بنانے والا حصّہ ہماری توجّہ کا ذرا کم مرکز بنا۔ تاہم وہاں سے گزرتے وقت میں نے ڈاکٹر لرش سے یہ سوال کیا کہ آپ ایسی کیڑے مار دوا بنانے کے کس حد تک حق میں ہیں جو کیڑوں کو تو کم مقدار میں فنا کرے اور انسانی صحت کو زیادہ گھن لگا دے۔ وہ میرے اس طنزیہ جملے کا مطلب سمجھ گئے۔ میرا اشارہ "ڈی ڈی ٹی" کی طرف تھا۔ اس دریافت پر مغربی دنیا کو بڑا ناز ہے کہ کیڑے خصوصاً مچھروں کو مارنے کے لیے یہ سفوف تیر بہدف کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اب یہ تسلیم بھی کیا جانے لگا ہے کہ ملیریا پھیلانے والے مچھروں میں اس سفوف

---

[1] یورپ سے واپس آنے کے بعد ایک سال کے اندر اندر ہم اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گئے۔ پیکنگ کے کام کی ذمّہ داری مردوں کی بجائے اب عورتوں کو تفویض کر دی گئی ہے۔

کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا ہوگئی ہے اور اسی لیے اس کے اجزا میں ردو بدل کر کے اب نت نئے ناموں سے دوسرے مرکبات رائج کیے جا رہے ہیں۔ کچھ عرصے بعد وہ بھی بے اثر ہو کر رہ جائیں گے اور پھر نئی دریافتیں بازار میں آئیں گی۔ ڈی ڈی ٹی ایجاد کرنے والے دبے لفظوں میں یہ بھی اعتراف کرنے لگے ہیں کہ اس سے انسانی صحت کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ بہت سے بے گناہ اس کے اثر سے ہلاک ہو گئے ہیں۔ تاہم مرک فیکٹری میں جو کیڑے مار سفوف تیار ہوتے ہیں، وہ ڈی ڈی ٹی سے مختلف ہیں۔ لیکن شاید ان کا دائرۂ فروخت محدود ہے، کیوں کہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، اس ضمن کا کوئی مرکب اب تک برصغیر پاک و ہند میں استعمال کے لیے درآمد نہیں کیا گیا ہے۔

دوا سازی کے علاوہ دواؤں کو پیک کرنے اور نستعلیق طریقے پر بازار میں بھیجنے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، وہ سب اسی کارخانے کی حدود میں تیار کی جاتی ہیں۔ وہیں اس کا اپنا چھاپہ خانہ بھی ہے۔

ایک بجے تک ہم نے فیکٹری کے وہ تمام حصے دیکھ لیے جو ہماری معلومات اور ذوقِ تجسس کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھے۔ ایک بجتے ہی سائرن کی آواز سنائی دی جس کے ساتھ ہی فیکٹری میں ہر کام معطل ہو کر رہ گیا۔ تمام ملازمین کو ہدایت ہے کہ وہ لنچ کا وقت شروع ہوتے ہی کام چھوڑ دیں اور آسودگیٔ شکم کے لیے کینٹین میں چلے جائیں۔ مسٹر لرش نے ہم سے بھی کہا کہ اب لنچ کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہو گا۔ بڑے افسروں کے لیے ایک علیحدہ کمرۂ طعام ہے۔ وہیں ہمارے لیے بھی انتظام کیا گیا تھا۔ مسٹر لرش اور ان کی سکریٹری نے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔

کھانے کی میز پر بیٹھنے سے قبل ہمیں کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں تھی کیوں کہ بھائی جان محترم نے ظہرانے کی دعوت قبول کرتے وقت بلا تکلف اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ سچے مسلمان اپنے عقائد کے لحاظ سے کھانے کی کن کن چیزوں سے احتراز کرتے ہیں۔ چنانچہ انھیں یقین دلا دیا گیا تھا کہ کوئی شے مرضی کے خلاف نہیں ہو گی اور یہی ہوا۔

سب سے پہلے ایک بڑی قاب میں ابلے ہوئے چاول آئے جسے مچھلی اور آلو کی بھجیا کے ساتھ کھایا گیا۔ اس کھانے کا نام "دیکے ورک" ہے۔ ہمارے بنگالیوں کی طرح

اس صوبے کے باشندے چاول بہت پسند کرتے ہیں۔ ہمارے لیے بھی یہ آئٹم بُرا نہیں رہا۔ دوسرے دور میں "اسپائس براٹن" نام کی ایک چیز لائی گئی۔ میں اسے گوشت کا اچار کہوں تو اس کا ذائقہ آسانی سے واضح ہو سکتا ہے۔ اسے غالباً سیاہ مرچ سے کسی قدر چٹپٹا بنایا گیا تھا۔ تیسری چیز ہمارے لیے غیر مانوس تو نہیں لیکن ذرا نئی ضرور تھی۔ اسے مرغِ مسلم کی طرح خرگوشِ مسلم کہا جا سکتا ہے۔ جرمنی میں اس کا نام "ہیس اِم ٹوف" ہے۔ یہ آگ پر بھنا ہوا تھا لیکن اس کے پھیکے پن نے زیادہ مزا نہیں دیا۔ پھر ایک میٹھی چیز آئی۔ اسے بھی زبردستی نگلا گیا۔ اس کا نام "ہمل اُنڈ ارض" ہے (میں نے آخری لفظ جان کر حرف ض سے لکھا ہے کیونکہ جرمن زبان میں اس کے جو معنی ہیں، اس کا تقاضا یہی ہے) اس کھانے کے نام کا لفظی ترجمہ "آسمان اور زمین" ہوا۔ خدا جانے کیوں؟ میں نے چپکے سے میاں محبوب سے پوچھا، کیا اس کو کھا کر چودہ طبق روشن ہو جائیں گے؟ اسے آسانی سے آلو اور سیب کا بھرتہ کہا جا سکتا ہے اسے ایک نہایت سیاہ قوام سے میٹھا کیا گیا تھا جس میں پیاز کی خفیف سی بو پائی جاتی تھی۔ شراب کی کوئی قسم کھانے کے ساتھ پیش نہیں کی گئی حالانکہ وہاں اس کا دستور عام ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی انھوں نے ہمارے ذوق اور عقیدے کا کس درجہ لحاظ رکھا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے کچھ دیر بعد ہم نے ڈاکٹر لرش سے چند منٹ علیحدگی کی اجازت مانگی اور ہم چپکے سے کھسک کر ملحقہ باغیچے میں چلے گئے۔ جہاں گھاس میں پانی دینے کا نل لگا ہوا تھا۔ اسے کھول کر ہم نے فوراً وضو کیا اور بھائی جان محترم کی قیادت میں نمازِ ظہر ادا کی۔ شاید اس دوران میں ہمیں لرش صاحب نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ جب ہم کمرے میں واپس پہنچے تو انھوں نے بتایا کہ فیکٹری کے ملازمین میں تقریباً پندرہ جرمن نژاد مسلمان موجود ہیں اور انھوں نے دوپہر کے وقت نماز ادا کرنے کے لیے ایک جگہ مقرر کر رکھی ہے۔ اگر ہمیں یہ بات پہلے سے کسی طرح معلوم ہو جاتی تو ان کے ساتھ اجتماع کا موقع نکالا جاتا۔ بھائی جان محترم امامت کرتے یا ان میں سے کوئی بزرگ یہ خدمت انجام دیتے۔ بہر نوع اس سرزمین پر اس طرح فرض کی ادائیگی ہمیشہ یاد رکھنے کے لائق ہوتی۔ پھر بھی مسٹر لرش ہماری اس عقیدت مندی

سے بڑے متاثر ہوئے اور انھوں نے اپنے اس احساس کا اعتراف کر لیا۔

اس کے بعد کچھ دیر نشست رہی۔ اس دوران میں ہم نے ہمدرد کے بارے میں انھیں چند حقائق اور اعداد و شمار سے باخبر کیا اور وعدہ کیا کہ ہم وطن پہنچ کر اپنی بعض مصنوعات نمونے کے طور پر روانہ کریں گے۔

ہماری اگلی منزل فرینکفرٹ تھی۔ انھوں نے نہایت خلوص کے ساتھ ہمیں مشورہ دیا کہ آپ ریل سے سفر کرنے کی بجائے موٹر کار سے جائیں۔ بہتر میل کا فاصلہ چند منٹ میں طے ہو جائے گا۔ اس کے مقابلے میں ریل زیادہ سہولتیں نہیں پہنچائے گی۔ اس مشورے کے ساتھ ہی انھوں نے اپنی کار پیش کی اور کہا کہ میرا ڈرائیور آپ کو فرینکفرٹ میں ہوٹل تک پہنچا کر واپس آجائے گا۔ راستے میں کسی قسم کی زحمت نہیں ہوگی۔ یہ مشورہ اتنا صائب اور پُرخلوص تھا کہ اسے شکریے کے ساتھ قبول کر لینا ہی پڑا۔ ہم نے رخصت ہوتے وقت بھی ان کی نوازشوں کا شکریہ ادا کیا اور اعتراف کیا کہ مرک فیکٹری کے دیکھنے سے ہماری معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

**اوٹوبان پر**۔ نہایت شاندار قسم کی جھجھاتی ہوئی مرسیڈیز کار میں ہم بیٹھ کر فیکٹری سے روانہ ہوئے۔ شہر سے متعلق سڑک کو جلد ہی طے کر کے ہم شاہراہ پر آگئے جسے جرمنی میں اوٹوبان کہا جاتا ہے اور یہ سارے ملک میں رگِ جان کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اس پر ہٹلر کو بڑا ناز تھا۔ وہ باشندگانِ ملک سے فخریہ کہتا تھا کہ میں نے تم کو ریل کے بغیر سفر کرنے کے لیے اوٹوبان کا تحفہ دیا ہے۔ اس کا فخر بے جا نہیں تھا۔ یورپ کا کوئی ملک اس شان کی سڑک آج بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ایشیا میں سڑک اعظم کو جو اہمیت کبھی حاصل تھی اس سے کہیں زیادہ اہم اوٹوبان کو کہا جا سکتا ہے۔ ہٹلر نے اس کی تعمیر ایک طویل المدت پروگرام کے تحت کرائی تھی۔ اس سے نہ صرف اقتصادی اور مدنی مقاصد حل ہو سکتے ہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی اس کی مقصدیت سے انکار نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسری جنگِ عظیم میں اس سڑک کے بخیے مختلف مقامات سے اُدھڑ گئے اور اطمینان کے ساتھ اس پر گاڑی چلانا مشکل ہو گیا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد تعمیرِ نو کے منصوبے مرتب ہوئے تو ان میں اس سڑک کی مرمت کو ترجیحی حیثیت دی گئی۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ اب لوگ اس کی تشکیل و تخلیق کا سہرا ہٹلر کی بجائے دوسروں کے

سہرا باندھتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بہر نوع جرمنی پر ابھی نام نہاد اتحادیوں کو اقتدار حاصل ہے اور "استاد ازل" کے خیال کے مطابق بہت سی باتیں دہرائی جاتی ہیں۔ اہلِ مغرب کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ اختراعات و تخلیقات کے اصل مالکوں کو فراموش کرنے اور کرا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ برِ صغیر پاک و ہند میں سڑک اعظم کی تعمیر کو مسلمان فرماں رواؤں کی سعی و کاوش اور دور اندیشی کا اعجاز کہا جا سکتا ہے لیکن انگریزوں نے اس کی محض مرمت کر کے اور نام بدل کر اپنی تخلیق قرار دے دیا۔

جرمنی میں لاکھوں انسان ایسے موجود ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ اوٹوبان ہٹلر نے تعمیر کرائی تھی لیکن دو نسلیں گزرنے کے بعد اس حقیقت کو باور کرنے والا کوئی نہیں ملے گا۔ جاننے والے مر چکیں گے اور نئی پود کو جان بوجھ کر اصلیت سے بے خبر رکھا جائے گا۔

یہ عظیم سڑک نہایت وسیع ہے اور اتنی ہموار ہے کہ دودھ کا گلاس ہاتھ میں لے کر گاڑی میں بیٹھ جاؤ، ایک قطرہ بھی چھلک کر نہیں گرے گا۔ ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ گاڑی میں نہیں کسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ البتہ دونوں اطراف نظر کو دھوکہ دیتے ہوئے تیزی کے ساتھ دوسری سمت میں بھاگنے والے درخت حقیقت کی نقاب کشائی کر رہے تھے۔ دونوں طرف درخت ہی نہیں، دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت بھی تھے جن میں موسم کے اعتبار سے کاشت ہو رہی تھی۔ ہمیں کئی مقامات پر نہروں کے پلوں سے گزرنا پڑا۔ آبپاشی کا نظام بھی دوسری جنگِ عظیم میں تباہ ہو گیا تھا لیکن بہت جلد اسے سدھار لیا گیا۔ اسی لیے جرمنی کو اشیائے خوراک دوسرے ملکوں سے مانگنے کی جو ضرورت لاحق ہے، وہ بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے۔

زراعت۔ دوسری جنگِ عظیم یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح خود جرمنی کے لیے بھی، جس نے اس کا آغاز کیا تھا، حد درجہ اور ہر لحاظ سے تباہ کن ثابت ہوئی۔ نہ صرف لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اترے، ثقافتی ورثے خاک میں ملے، تہذیب و شائستگی کے نشانات مٹے بلکہ کھیتوں اور باغوں کی پیداوار بھی، جس پر زندگی کا دارومدار ہے، نیست و نابود ہو گئی۔ اب کرۂ ارض پر وہ دور تو ختم ہو چکا تھا جبکہ انسان ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر قدرت کی خود رو نعمتوں سے کام و دہن کی لذت اور آسودگیٔ شکم

حاصل کر لیتا تھا۔ اب تو "خود کنواں کھودنا اور خود پانی نکالنا" کے مصداق پیٹ بھرنے کے لیے ہر چیز خود بخود بونی اور کاٹنی پڑتی ہے۔ اور جو بوتا ہے، وہی کاٹتا ہے۔ سوائے اس کے کہ حالات ساتھ نہ دیں اور عین وقت پر پرائے مال پر کوئی "یا حسین" کہہ کر قبضہ کر لے تو تیار کھیتیاں دوسروں کی ملکیت بن جاتی ہیں۔ لیکن جرمنی میں لڑائی اتنے عرصے رہی تھی کہ ایک دم کسی غیر کا قبضہ ہونے کا سوال نہیں رہا بلکہ جنگ کی بادِ سموم سے ہرے بھرے کھیت خود ہی خشک ہو گئے اور کچھ نیستی اس لیے ظہور میں آئی کہ کھیتوں میں کام کرنے والے نہیں رہے اور جب خالی مکان کو دیوزاد اپنا مسکن بنا لیتے ہوں تو کاشتکاروں کی عدم موجودگی میں شاداب کھیتوں میں کم سے کم خاک تو ضرور اڑنی چاہیے۔

جرمنی معدنیات کے اعتبار سے بڑا مالدار ملک ہے۔ خاص طور پر کوئلہ اور لوہا تو بے قیاس مقدار میں نکلتا ہے لیکن یہاں کی زمین دھاتوں کے علاوہ سبزہ بھی اگلتی ہے شاید ہی کوئی ضروری اناج، پھل یا ترکاری ایسی ہو جو یہاں نہ اگتی ہو۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے یہاں کی پیداوار باشندگانِ ملک کی اہم ضروریات کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔ صرف وہ چیزیں باہر سے منگائی جاتی تھیں جنھیں انسان "منہ کا مزا بدلنے کے لیے" خریدا کرتا ہے۔ لڑائی کے بعد یہ نوبت آئی کہ یہاں کے رہنے والے شریفانہ بھیک حاصل کرنے کے لیے مجبور ہو گئے یعنی اقتصادی امداد ان ہی "ہمدرد" ملکوں سے ملنے لگی جو اس کی تباہی کے درپے تھے۔

دورانِ جنگ میں ہزاروں لاکھوں کاشتکاروں کو ضرورتاً اور مصلحتاً لڑنے والی فوج میں یا فوجوں کے لیے کام کرنے والے محکموں میں بھرتی ہو جانا پڑا۔ اس طرح تقریباً سبھی جوان خون اور آگ کے شعلوں کی نذر ہو گئے۔ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں بچے بوڑھے اور بیمار یا معذور جو بچ رہے، ان کے لیے کھیتوں کو جوتنا، بیج بونا اور فصل کاٹنا دوبھر تھا کیونکہ اوپر سے بم گرتے رہے اور نیچے سے آگ کی لپٹیں ہر چیز کو جلا کر راکھ کرتی رہیں۔ اور جب لڑائی رکی تو دوسرا ستم یہ ہوا کہ ملک کی تقسیم چار حصّوں میں ہو گئی۔ ان میں سے تین حصّے تو کچھ عرصے بعد آپس میں مل گئے لیکن ایک مشرقی حصہ گائے کے گردے کی طرح سخت ہو کر سب سے الگ تھلگ رہا۔ اور یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ سب سے زیادہ سرسبز و شاداب علاقہ اسی حصے میں چلا گیا۔ باقی ان تین حصّوں

کی زمینیں جو مل کر وفاقی جمہوریہ بن گئے تھے، بنجر تو نہیں کہی جا سکتیں لیکن اُن کی اوسط پیداوار یقیناً کم تھی۔ اور بحیثیت مجموعی جتنا بھی غلّہ وغیرہ یہاں کی زمین اگل سکتی تھی، وہ تمام باشندوں کے لیے قطعی طور پر ناکافی تھا۔

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ایک طرف سرسبز و شاداب علاقہ قبضۂ اغیار میں چلا گیا اور دوسری طرف یہ کہ اس علاقے کے بیکار اور بے یار و مددگار لوگوں کو ترکِ وطن کرنے کی حد تک مجبور کر کے بھیڑ بکریوں کی طرح مغربی حصّے کی طرف دھکیل دیا گیا۔ دنیا کے ہر حصّے میں یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ پناہ گزیں بے سروسامانی کے عالم میں آئے۔ اور عرصے تک بے سروسامانی کے عالم میں دوسروں پر بوجھ بن کر رہے۔ وفاقی جمہوریۂ جرمنی اس کلیئے سے مستثنےٰ نہیں تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کھانے والوں کی تعداد بڑھ گئی اور اشیائے خوراک کی مقدار گھٹ گئی۔ دستِ طلب دوسروں کے سامنے دراز نہ ہوتا تو گذارا کیونکر ہوتا۔

لڑائی سے پہلے ۵۵ فی صد اناج، ۵۷ فی صد سے زیادہ ترکاریاں اور پھل اور ۶۷ فی صد کے قریب شکر بنانے والا چقندر مشرقی حصہ میں ہوتا تھا اور وہاں کے فاضل حصّے سے مغربی علاقے کی پڑت پوری ہوتی تھی۔ لہذا لڑائی ختم ہونے کے بعد ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء میں عوام کو صرف اتنی خوراک مل سکی جو سات سو سے آٹھ سو تک حرارے فی کس پیدا کر سکتی تھی جبکہ صحیح معیارِ زندگی قائم رکھنے کے لیے کم سے کم دو ہزار حرارے درکار ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء کے موسم گرما تک یہی کیفیت رہی۔ اس دشوار صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے فلاح و بہبود کے اداروں نے ہر قسم کی کوشش کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان تین سال میں مدارس کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ بچّوں کو روزانہ کھانا کھلانا پڑا۔ لاکھوں انسانوں کے لیے رعایتی نرخ پر راشن کی تنظیم عمل میں آئی۔ صرف ایک سال میں پونے دو لاکھ ٹن کے قریب اشیائے خوراک غیر ملکوں سے لے کر تقسیم کرنی پڑیں۔ اس طرح ہر مہینے حکومت کو تقریباً ڈیڑھ کروڑ ڈالر کا بار اٹھانا پڑا جسے اور بہت سے اخراجات کے مقابلے میں عشر عشیر ہی کہا جا سکتا ہے۔

جملہ نامساعد حالات کے باوجود اہل جرمنی کا قومی کردار ملیا میٹ نہیں ہوا تھا۔ اس میں ابھرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ جدید تقاضوں کے ماتحت حکومت نے

کھیتوں میں زیادہ سے زیادہ مشینی آلات سے کام لینا شروع کیا ۔ یہ طریقۂ کاشت لڑائی سے پہلے رواج پا گیا تھا لیکن اب اس پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی تاکہ دنوں کا کام منٹوں میں ہو اور ہر قطعۂ زمین پرانی اوسط سے کہیں زیادہ مقدار میں اناج پیدا کرے ۔ اس مقصد کے لیے مصنوعی کھاد کے استعمال کا خاص لحاظ رکھا جانے لگا ۔ اس کے ساتھ ہی نئی زمینوں پر طبع آزمائی بھی ہوئی ۔ اچھوتے قطعات سہاگنوں کی طرح بارآور ہونے لگے ۔

اس کے بغیر چارۂ کار نہیں تھا ۔ لڑائی سے پہلے کوئی انیس لاکھ کنبے کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے اور پچھلے سال کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اب ان کی تعداد پچیس لاکھ سے کم ہے ۔ کام کرنے والے کم ہوں اور کھانے والے زیادہ تو قدرتی طور پر نئے وسائل ڈھونڈھنے اور نئے طریقے اختیار کرنے ہی پڑتے ہیں ۔

**مویشی بانی** ۔ صرف برصغیر پاک و ہند ہی کے لیے کوئی تخصیص نہیں ہے ، دنیا کے کسی حصے میں جا کر دیکھا جائے تو زراعت اور مویشی بانی میں جو چولی دامن کا ساتھ تسلیم کیا جاتا ہے ، اس کا ثبوت جرمنی میں بھی مل جائے گا ۔ یہاں کا بھی ہر کاشتکار اپنی دیرینہ روایات کو قائم رکھنے کی خاطر مویشی اور پرندے ضرور پالتا ہے ۔

تیزی سے دوڑتی ہوئی کار کے شفاف شیشوں میں سے اس حقیقت کی جھلک واضح طور پر نظر آ رہی تھی ۔ لڑائی کے دنوں میں ان بے زبانوں کو بھی جانی نقصان پہنچا تھا اور پہنچنا چاہیے تھا ۔ ان کی بڑی تعداد اسی تباہی کے کام آ گئی تھی جس کا سامنا خود انسان کو بھی کرنا پڑا تھا جب انسان کی اپنی جان خطرے میں ہو تو حیوانات کا خیال کس طرح رکھا جا سکتا ہے ۔ بھیڑ ، بکریاں ، گائے اور سؤر سب قدرت کے رحم و کرم پر جیتے رہے اور وہ جن پر سے قدرت کی نظرِ عنایت ذرا ہٹی ، مر کھپ کر ختم ہو گئے ۔ لڑائی کے بعد ہر چیز نے سنبھالا لیا تو ان کی نسلیں بھی پروان چڑھنے لگیں ۔ ان کی پرورش کا بدستور خیال رکھا جانے لگا ۔ سؤر کا گوشت جرمنی میں سب سے زیادہ مرغوب غذا ہے ، اس لیے ان کی تعداد شاید بھیڑ بکریوں اور گایوں سے بھی زیادہ ہے ۔ ہمیں یہاں اس جانور کے حلال و حرام ہونے سے بحث نہیں ۔ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس ملک میں اس کی مقبولیت کو دیکھ کر ایک بار بکری کے گوشت پر شبہ ہونے لگا تھا

کہ کہیں اس کے ریشوں کے اندر سے سوٗر کا گوشت نہ نکل آئے۔ بالکل اسی طرح جیسے روسی کو چھیلا جائے تو اندر سے منگول نکل آتا ہے۔

فرینکفرٹ کے بالکل قریب پہنچ کر ہم اوٹوبان سے ناطہ توڑ کر قلب شہر میں جانے والی سڑک پر روانہ ہوئے تو سب سے پہلے سوٗروں کے ایک بہت بڑے ریوڑ کا سامنا ہوا۔ وہ سینکڑوں کی تعداد میں سڑک عبور کر کے اس راستے پر جا رہے تھے جو مرگ والوں کے ڈرائیور کی اطلاع کے مطابق کمیلے کی طرف جاتا ہے۔ وہاں تمام جانور شام کے وقت کاٹے جاتے اور دھو دھلا کر ٹکڑے بنا کر صبح کے لیے تیار کر لیے جاتے ہیں۔ روزانہ کٹنے والی اس بڑی تعداد کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا تھا کہ ان کی پیداوار ملک میں کتنی ہو گی۔ ایک تخمینے کے مطابق گایوں اور بھیڑ بکریوں کی مجموعی تعداد ۱۹۳۸ء میں ایک کروڑ اکیس لاکھ سے زیادہ تھی اور اب ایک کروڑ آٹھ لاکھ ہے لیکن تنہا سوٗروں کی تعداد اس وقت ایک کروڑ بارہ لاکھ تھی اور اب ایک کروڑ تیس لاکھ ہے۔

**وزیر زراعت۔** زراعت اور مویشی بانی کے محکمے ایک ہی وزارت میں شامل ہیں اور قلمدان وزارت ڈاکٹر ہائنرک لوبکے کے سپرد ہے جو علاج معالجے کے ڈاکٹر نہیں بلکہ اقتصادیات ارضی اصلاحات اور ماہیت زمین کی تحقیقات کرنے کے ماہر ہیں اور انھی علوم میں ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم نے ان کے مطالعہ میں رخنہ ڈال دیا تھا۔ انھیں کالج کو خیرباد کہہ کر یکم اگست ۱۹۱۴ء سے باقاعدہ میدان کارزار میں چلا جانا پڑا تھا۔ جہاں انھوں نے بھی بہادری کے خوب جوہر دکھائے اور جرات آزمائی کا سب سے بڑا خطاب بھی حاصل کیا۔ لیکن قوم و ملت کی اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لیے جو خدمات انھوں نے بعد میں انجام دیں، وہ زیادہ قابل تحسین قرار پائیں۔ ۱۹۲۳ء سے انھوں نے پوری تن دہی کے ساتھ اپنے ذوق کے مطابق زراعتی فروغ کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ اشیائے خوراک کی پیداوار میں ترقی کے ساتھ ساتھ انھیں کسانوں کی فلاح و بہبود کا بھی بڑا خیال رہتا تھا۔ انھی کی کوششوں سے کاشتکاروں کی انجمنوں نے متحد ہو کر ۱۹۲۶ء میں ایک وفاق کی صورت اختیار کی اور حکومت سے مراعات حاصل کیں۔ انھی کی کوششوں سے حکومت کو اصلاحات

اراضی کا ایک ادارہ "ہیورن لانٹ" قائم کرنا پڑا۔ ان کی سعی و کاوش ہمیشہ صلح پسند رہی اور انھوں نے کبھی بھی حکومت کے خلاف باغیانہ سرکشی نہیں کی لیکن حکومت کوئی ایسی بات نہیں چاہتی تھی جس سے عوام بیدار ہو کر اپنے حقوق کے مطالبات پیش کرنے لگیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے ڈاکٹر لوبکے کئی جرموں کے مرتکب ٹھہرائے گئے اور ۱۹۳۳ء میں حکومت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ تمام سیاسی عہدے ترک کر دیں اور خاموش ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں۔ ایک سال بعد ان کی گرفتاری بھی عمل میں آ گئی۔ انھیں بیس ماہ جیل میں رہنا پڑا۔

۱۹۳۷ء سے دوسری عالمگیر لڑائی شروع ہونے تک ان کی زندگی کا چکر ایک نئے محور کے گرد چلا جس کا تعلق صنعتی کارخانوں کی تعمیر اور ان کی ترقی تھا جرمنی کی شکست کے بعد جب ملک کے حصے بخرے ہوئے اور ویسٹ فالیا جہاں کے وہ باشندے تھے، برطانیہ کے زیر نگیں آیا تو وہ صوبائی اسمبلی میں ایک رکن کی حیثیت سے شامل کر لئے گئے گویا سیاسی زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا۔

جنوری ۱۹۴۷ء سے ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء تک وہ صوبائی حکومت میں وزیر زراعت رہے، پھر استعفے دے کر انھوں نے بون میں کسانوں کو قرضے دینے والی امدادِ باہمی کی انجمن کا ایڈووکیٹ جنرل ہونا قبول کر لیا۔ ستمبر ۱۹۵۳ء میں وہ ریس ڈینسلاکن کے حلقۂ انتخاب سے کھڑے ہوئے اور جرمن وفاق کی دوسری پارلیمان کے رکن ہو گئے۔ مرکز میں آجانے سے ان کی اہمیت زیادہ ہو گئی اور وفاقی چانسلر ڈاکٹر ایڈناور نے ان کی کابینہ میں خوراک، زراعت، جنگلات اور مویشی بانی کا قلمدان وزارت دے دیا۔ اس منصب پر وہ اس وقت بھی فائز ہیں۔

وہ ۱۴ر اکتوبر ۱۸۹۴ء کو ویسٹ فالیا کے ایک شہر آرنس برگ میں پیدا ہوئے تھے، اور ابتدائی تعلیم وطن مالوف ہی میں پائی تھی لیکن اعلیٰ سندیں حاصل کرنے کے لیے انھیں بون، برلن اور منسٹر جانا پڑا تھا۔ ٹھیک ہے، حصول علم وفن کی لگن انسان کو ہر جگہ لے جا سکتی ہے۔

فرینکفرٹ میں۔ ہم ای مرک فیکٹری سے چل کر عام محاورے کے مطابق محض پلک جھپکاتے ہیں فرینکفرٹ میں داخل ہو گئے۔ کیونکہ اعلیٰ قسم کی صاف ہموار سڑک پر عمدہ تیز رفتار

کار نے سترہ میل کا فاصلہ صرف چوتھائی گھنٹے میں طے کر لیا اور قندیل کے اندر گزرنے والے ہیولوں کی طرح بہت سے دل چسپ اور معلومات افزا مناظر ہماری نگاہوں کے سامنے سے جھلک دکھاتے چلے گئے۔

دنیا کے نقشے پر نظر ڈالی جائے یا حوالہ جات والی کتابوں کی ورق گردانی کی جائے تو فرینکفرٹ نام کے چار شہر تلفظ اور ہجّوں کے ذرا سے فرق کے ساتھ نظر آئیں گے۔ دو فرینکفورٹ توریاستہائے متحدہ میں ہیں۔ ان میں سے ایک اس ملک کی ریاست انڈیانا میں ہے اور اپنی صنعتوں، خصوصاً نکل کی مصنوعات کے لیے مشہور ہے۔ دوسرا فرینکفورٹ اسی ملک کی ایک اور ریاست کنٹکی کا صدر مقام ہے جسے فرینک نامی کسی تارک وطن نے یہاں پہنچ کر آباد کیا تھا۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو ہمیں بھی اپنے پاک ملک میں، خصوصاً کراچی میں جہاں سب سے زیادہ پناہ گزیں رہتے ہیں، نئی بستیوں کو صرف ان مہاجرین کے ناموں سے یا کم سے کم ان کے کاروبار کی نسبت سے موسوم کرنا چاہیے جو سب سے پہلے اس جگہ آباد ہوں اور وزیروں یا بڑے لوگوں کے ناموں پر بستیوں کے نام رکھنے کی جو روش ہے اُسے ترک کر دینا چاہیے۔ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو کراچی میں ناظم آباد کا نام ہمدرد آباد ہو جائے گا کیونکہ اس سرزمین پر ہمدرد فیکٹری کی بنیاد اس وقت پڑی تھی جبکہ دوسرے موجودہ مکین وہاں کی ویرانی سے دور بھاگتے تھے۔

باقی دو فرینکفرٹ جرمنی میں ہیں۔ ایک دریائے مائن کے کنارے واقع ہے اور دوسرا دریائے اوڈر کے کنارے اور اسی اعتبار سے دونوں موسوم کئے جاتے ہیں۔ یعنی ایک "فرینکفرٹ اون مائن" اور دوسرا "فرینکفرٹ اون اوڈر" کہلاتا ہے۔ ہمارے راہ نامے میں صرف اوّل الذکر شہر شامل ہے جہاں ہم اس وقت پہنچ گئے ہیں۔ موخر الذکر پرشیا کے صوبے برانڈبرگ میں برلن سے صرف پچاس میل جانب جنوب مشرق واقع ہے۔ پرشیا نہ صرف یہ کہ کبھی سیاسی اعتبار سے جرمنی کا حصہ رہا ہے بلکہ اب بھی نسلی، لسانی، ثقافتی اور معاشرتی لحاظ سے اسے جرمنی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سیاستداں خربوزے کی پھانکوں کی طرح جب چاہیں، ملکوں کے حصے بخرے کر دیں لیکن جو ذہنی رشتے ایک بار قائم ہو جاتے ہیں، وہ مشکل سے ٹوٹتے ہیں۔

ہماری منزلِ مقصود یعنی فرینکفرٹ اون مائن اس قدر مشہور ہے کہ اگر صرف فرینکفرٹ کہا جائے تو اسی شہر سے مراد ہوتی ہے اور سننے والے فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ یہ شہر تاریخی اعتبار سے بہت پرانا ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اہلِ روما نے اس شہر کی داغ بیل پہلی صدی عیسوی میں ڈالی تھی لیکن یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ یہ علاقہ رومیوں کی آمد سے دو ہزار سال پہلے بھی آباد تھا۔ یعنی پتھر کا زمانہ جب اپنے اختتام پر تھا تو اس مقام پر خاصے مہذب لوگ آباد تھے۔ جرمن زبان میں اس عہد کو بینڈ کرامیکر یعنی روغنی برتنوں پر فیتے کے انداز میں نقش و نگار بنانے والوں کا زمانہ کہتے ہیں۔ کیونکہ جب اس شہر کے مشرقی حصے میں دریا کے کنارے ایک چوپائی تعمیر کرنے کے لیے کھدائی ہوئی تو ایک پرانی تہذیب کے آثار برآمد ہوئے منجملہ اور چیزوں کے ایسے برتن بھی نکلے جن پر بیل بوٹے مدوّر فیتے کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ اس وقت اس بستی کا نام کیا تھا؟ یہ بتانا مشکل ہے۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ بھی اس منزل میں ہار مان چکے ہیں۔

بہرنوع اس دور کے بہت عرصے بعد رومیوں نے اسے اپنا مسکن بنایا۔ رومیوں کو قلطی قوم کے لوگوں نے مار بھگایا اور جب فرینک اس طرف بڑھے تو خود قلطیوں کو بھی راہِ فرار اختیار کرنی پڑ گئی اور اس طرح چھٹی صدی عیسوی کے بالکل شروع میں اسے فرینکفرٹ قوم کا قلعہ (فرینک فورٹ) کہا جانے لگا۔ جرمن زبان میں اس کا تلفظ فرینکفرٹ ہے۔ تاریخی نوشتوں میں باقاعدہ اس کا ذکر اس نام سے پہلی بار ۷۹۳ء میں ملتا ہے۔ اس علاقے کے فرمانروا شارلیمین کے شاہی سوانح نگار رائینہارڈ نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے اس سال کا موسم سرما فرینکو فورڈ میں گزارا۔ شارلیمین کے عہد کی کئی اور دستاویزات میں بھی فرینکفرٹ کا ذکر ملتا ہے۔

اسے ایک بڑا تجارتی مرکز ہونے کا فخر اسی زمانے میں حاصل نہیں ہوا بلکہ آج سے ہزار سال پہلے بھی اسے اس اعتبار سے شہرت حاصل تھی۔ ۱۰۷۴ء کی ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں سوداگروں سے ان کے سامان پر چنگی وصول کرنے کا محکمہ حکومت کی طرف سے قائم تھا۔ یہ اہتمام اسی وقت کیا جاتا تھا جبکہ اربابِ حل و عقد کو اس بات کا یقین ہو کہ وصول ہونے والی چنگی کی رقم انتظامی عملے کے اخراجات سے بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔

یہ مقام سرکاری جلسوں کے لیے بھی مشہور رہا ہے۔ ۱۱۴۷ء میں پہلی بار یہاں ایک جرمن بادشاہ کا انتخاب قاعدے کے مطابق عمل میں آیا۔ یہ بادشاہ کونراڈ سوم کا بیٹا ہنری تھا۔ لیکن چونکہ بیٹا اپنے باپ سے پہلے ہی فوت ہوگیا، اس لیے صحیح معنوں میں پہلا منتخب شدہ بادشاہ فریڈرک اوّل (بار باروسہ) کو کہا جاسکتا ہے جو انتخاب کے بعد ۱۱۵۲ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا تھا۔

فرینکفرٹ کا سالانہ صنعتی میلہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ دُنیا کے ہر حصّے کی مصنوعات یہاں کے میلے میں ہر سال پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن اس کی ابتدا بھی آج سے آٹھ سو سال پہلے ہوئی تھی۔ اس ضمن میں سب سے پہلا حوالہ ۱۲۴۰ء کا ملتا ہے۔ اسی تیرھویں صدی کے شروع میں بلدیہ کے آئین نے مستقل صورت اختیار کی اور اس پر عمل درآمد ہونے لگا۔ آئین کے مطابق مجلس کے چودہ اراکین مقرر ہونے لگے۔ بلدیہ کا افسر اعلیٰ جو بلحاظ عہدہ "شُل تھیس"، کہلاتا تھا، رفتہ رفتہ شہر میں مختلف فریقین کے تنازعات طے کرانے میں بھی حصّہ لینے لگا۔ اس لحاظ سے ایک نئی مجلسِ صلاح کارراٹ مانّن کے نام سے قائم ہوئی۔ اس میں بھی چودہ اراکین شامل کئے گئے۔ ان دونوں اعتبار سے فرینکفرٹ کو جرمنی کے باقی تمام شہروں پر فوقیت حاصل ہے۔

جرمنی میں جب اصلاحات کا دور شروع ہوا تو فرینکفرٹ نے فراخدلی کے ساتھ پروٹسٹنٹوں کا ساتھ دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ملک کے فرمانروا چارلس پنجم اور مینز کے آرچ بشپ نے اہلِ شہر پر سختیاں برتنی شروع کردیں لیکن یہ صورت زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔

سترھویں صدی کے شروع میں ایک اور ہنگامہ خیز صورت شہر کی اندرونی تاریخ میں رونما ہوئی۔ چند یہودی کنبوں نے جو کافی عرصے سے برسرِ اقتدار تھے اور ہر سیاہ و سفید کے مالک بنے بیٹھے تھے، عوام پر ضرورت سے زیادہ ظلم ڈھانا شروع کردیا جو عوام کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ انھوں نے اپنے حقوق جتانے کے لیے ۱۶۱۲ء میں سر اٹھایا اور ان کی باغیانہ سرکشی کو ایک راہنما مل گیا جس کا نام وِنسنٹس فٹ ملخ تھا۔ اس میں جرأت اور بے باکی تھی لیکن اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ اِدھر یہودی اربابِ اقتدار نے براہِ راست

اعانت چاہی۔ انھیں بے دریغ اختیارات مل گئے۔ ۱۶۱۶ء میں فٹ ملخ، اس کے سب ساتھیوں اور افرادِ خاندان کو گرفتار کر کے دار پر چڑھا دیا گیا۔ ایک اچھی تحریک کا بُرا انجام ہوا لیکن سلگتی ہوئی چنگاریاں کسی آئندہ موقع پر لو دینے کے لیے وقتی طور پر دم بخود ہو گئیں۔

برسرِ اقتدار یہودیوں کے پاس روپیہ بے قیاس تھا۔ وہ بھاری شرحِ سود پر عوام کو قرضے دے کر خوب ان کا خون چوستے اور زیادہ مالدار ہوتے جا رہے تھے۔ اتفاقاً ایک سب سے زیادہ متمول شخص روتھ شائلڈ کو جو اگرچہ خود بھی یہودی تھا، اس مذموم صورتِ حالات کا بری طرح احساس ہوا اور اس نے بہت ہی کثیر رقم سے بنک کاری کا پہلا باقاعدہ نظام ۱۷۹۸ء میں قائم کیا جس کی شاخیں شہر کے مختلف حصوں کے علاوہ مضافات میں بھی پھیلا دیں اور رفتہ رفتہ سارے ملک میں ان کا جال بچھتا چلا گیا۔ اس نے تجارتی، صنعتی اور زراعتی مقاصد کے لیے قرضوں کی شرحِ سود برائے نام رکھی اور اس طرح عوام کا خون بری طرح چوسے جانے سے رک گیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے شروع تک فرینکفرٹ کو کامل خود مختاری حاصل تھی۔ لیکن ۱۸۱۵ء میں جب دریائے رہائن کے کنارے آباد شہریوں کا وفاق عمل میں آیا اور فرینکفرٹ ہی کو مجلسِ دستور ساز کا مرکز قرار دیا گیا تو دوسرے باشندوں نے سخت اعتراضات کیے اور یہ جذبہ آہستہ آہستہ فروغ پاتا رہا۔ حتیٰ کہ جب ۱۸۴۸ء میں اس علاقے میں عام انقلاب شروع ہوا تو سیاسی تحریکات زور پکڑ گئیں۔ فرینکفرٹ کے کوچہ و بازار میں قتلِ عام ہونے لگا۔ پرشیا نے وقت سے فائدہ اٹھا کر اپنے فوجی دستے وہاں بھیج دیے اور اسے باقاعدہ اپنی حکومت کا ایک جزو بنا لیا۔ کچھ عرصے بعد بسمارک کی کوششوں سے جرمنی کا اتحاد نئے سرے سے عمل میں آیا۔

اس قسم کے تمام سیاسی نشیب و فراز اور مختلف النوع تحریکات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فرینکفرٹ نے جرمنی کی تاریخ میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ ثقافتی اعتبار سے بھی اس شہر کو کم اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً چھپائی کی مشین ایجاد کرنے کے ضمن میں یوہانیز گوٹن برگ کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ وہ اگرچہ شہر مینز میں پیدا ہوا تھا لیکن ۱۴۵۰ء

میں جب اس نے پہلا چھاپہ خانہ کھولا تو اس مقصد کے لیے فرینکفرٹ کو پسند کیا۔ اور اس کے بعد سگمنڈ فیر آبنٹ نے بھی جو ہائیڈل برگ کا باشندہ تھا، ۱۵۳۰ء میں فرینکفرٹ ہی میں اپنا پریس قائم کر کے اس شہر کو سارے یورپ میں چھپائی کا سب سے اہم مرکز بنا دیا۔ اسی شخص نے ۱۵۴۸ء میں پہلا اخبار جاری کر کے ملک میں صحافت کی بنیاد رکھی، اور مطبوعات کا ایک سالانہ میلہ شروع کیا جسے چار صدیاں گزرنے کے بعد اب بھی یورپ بھر کے اشاعتی حلقوں میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔

جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے ۱۷۴۹ء میں اسی شہر میں پیدا ہوا تھا۔ شوپن ہار نے اپنی زندگی کے آخری تیس سال جن میں اس کا فلسفہ پختگی کی منزل تک پہنچا، اسی جگہ گزارے۔ اسی شہر کی ایک یونیورسٹی میں تحقیقات کرتے ہوئے پال اہرلخ نے ۱۹۰۷ء میں حیرت انگیز دوا سال ورسن ایجاد کی جس نے آتشک کے مرض کو قابلِ علاج بنا دیا۔ ۱۹۴۴ء میں جس ایٹمی سائنس داں اوٹو ہان نے طبیعات میں نوبل انعام حاصل کیا، وہ فرینکفرٹ ہی کا باشندہ تھا۔ اس نوع کے علوم کی دنیا سے ہٹ کر موسیقی اور نغمہ سازی کے میدان میں بھی اس شہر کے باشندے اپنے ہمعصروں سے کچھ پیچھے نہیں رہے۔

ہوٹل میں۔ ای مرک کمپنی کے ڈرائیور نے جو ڈارمسٹاٹ کے علاوہ فرینکفرٹ کے بھی گوشے گوشے سے واقف معلوم ہوتا تھا، موٹر گاڑی اس ہوٹل کے عین سامنے لے جا کر روک دی جس میں قیام کے لیے ہمارا انتظام پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ ہوٹل سیوائے جو شہر کے ایک بارونق بازار ویزن ہمبوٹن اسٹراسے میں واقع ہے، یہاں کے اعلیٰ ہوٹلوں کی صف میں دوسرا درجہ رکھتا ہے۔ اولیت کا سہرا فرینکفرٹر ہوف کو حاصل ہے جس میں تین سو بیس مسافروں کے بیک وقت ٹھیرنے کی گنجائش ہے اور اس لحاظ سے سب سے بڑا ہوٹل بھی ہے لیکن اس میں کمرے محفوظ کرانے کے لیے بہت عرصے پہلے درخواست کرنی پڑتی ہے اور اخراجات بھی کسی قدر زیادہ ہیں۔

علاوہ ازیں یہاں لہو و لعب بھی اتنے زیادہ نہیں ہیں جو فرینکفرٹر ہوف میں ممکن ہیں۔ چونکہ ہماری طبیعتوں کا رجحان ان باتوں سے میل نہیں کھاتا، اس لیے بھی ہم ان سے دور ہی رہنا چاہتے ہیں۔ مجبوب مہاں کے بارے میں معلوم نہیں کہ جرمنی میں رہتے ہوئے اپنی

عادتیں بدستور رکھی ہیں یا ان میں کچھ فرق آگیا ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ نمک کی کان میں جا کر ہر چیز نمک بن جاتی ہے تو شاید ان پر بھی کچھ رنگ یہاں کا چڑھ گیا ہو۔ اگرچہ اس کی توقع کم ہے۔ ان کے بارے میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں لیکن انھیں پڑھنے نہیں دوں گا۔

ہوٹل کے مستعد ملازمین نے ہمارا سامان گاڑی سے اتارا اور اوپر کی منزل میں پہنچا دیا میں نے چاہا کہ امی مرک کمپنی کے ڈرائیور کو ٹپ کے طور پر کچھ دے دوں مگر اس نے کوئی رقم قبول نہیں کی اور یہ کہکر انکار کر دیا کہ آپ تو غیر ملکی ہیں، اس ملک میں ہمارے مہمان ہیں۔ آپ سے ہم کیوں لیں۔ اگر کبھی آپ کے ملک میں آنا ہو جائے تو آپ کی نظر عنایت چاہیں گے۔ میں اس بات سے بے حد متاثر ہوا۔ اگر میرے لیے ممکن ہوتا اور وہ بھی راضی ہو جاتا تو میں اسے کراچی ضرور لے آتا۔ ایسے با اصول ڈرائیور مشکل سے ملتے ہیں۔

بھائی جان محترم ہوٹل کے دفتر میں ضروری لکھا پڑھی کے لیے رک گئے۔ میں اور محبوب میاں اوپر چلے گئے تاکہ کمرے میں سامان اپنے سامنے قرینے سے رکھوالیں۔ بھائی جان واپس آئے تو معلوم ہوا کہ محبوب کو بھی قیام کی اجازت مل گئی ہے۔

شام ہو گئی تھی اور ہم بہت تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ آج نہا دھو کر باقی وقت ہوٹل ہی میں گزارا جائے اور فرینکفرٹ کا پروگرام جو دراصل کل سے شروع ہونا ہے، کل ہی عمل میں لایا جائے۔ لیکن بھائی جان محترم نہ مانے۔ انھوں نے فرمایا۔ ہم موٹر سے آنے کے باعث غیر متوقع طور پر یہاں ذرا دیر پہلے پہنچ گئے ہیں۔ اس وقت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ہمارے لیے اپنے راہ نامے میں اس حد تک تبدیلی کر لینا جائز ہے کہ جس کا آئندہ پروگرام پر ذرا بھی اثر نہ پڑے۔ لہٰذا ہم نے باری باری غسل کیا، فریضۂ نماز ادا کیا، اور میاں محبوب نے جنھیں چائے کی زبردست ہڑک اٹھ رہی تھی، چائے منگا کر پی۔ ہم دونوں نے صرف دودھ پیا۔ ساتھ میں کچھ نہیں کھایا۔ امی مرک کمپنی میں کھایا ہوا کھانا پوری طرح ہضم نہیں ہوا تھا اور معدے پر خواہ مخواہ بار ڈالنا کسی طرح بھی مناسب نہیں سمجھا۔ چائے اور دودھ پی کر ہم لوگ بازار میں نکل گئے۔

**شہر کی سیر۔** شہر کے اندر اور شہر کے مضافات میں آنے جانے کے لیے بہت سی ٹرام کاریں اور بسیں چلتی ہیں اور ان میں کراچی کی ٹریموے یا بسوں کی طرح بھیڑ نہیں ہوتی۔

لیکن ہم نے پیدل چلنا ہی گوارا کیا۔ شہر میں دو قسم کی ٹیکسیاں بھی چلتی ہیں۔ ایک قسم معمولی کہلاتی ہے۔ یہ ٹیکسیاں عوام میں مقبول ہیں۔ ان کی اجارہ داری ایک کمپنی "اوٹو آن ٹرف زنٹرلے" کو دے دی گئی ہے۔ یہ شہر میں عام طور پر خالی مشکل سے ملتی ہیں کیونکہ ان کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ البتہ شہر کے کسی بھی علاقے سے ۳۰۰۳۱ نمبر پر ٹیلی فون کیا جائے، چند منٹ میں ٹیکسی دیے ہوئے پتے پر پہنچ جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ۳۰۰۳۱ کمپنی کے صدر دفتر کا فون نمبر ہے۔ وہ فرمائش وصول ہوتے ہی اپنے کسی اسٹیشن پر جو دیے ہوئے پتے کے نزدیک ترین ہو، ہدایت دیتے ہیں اور ٹیکسی فوراً روانہ کر دی جاتی ہے۔ اس قسم کی ٹیکسیاں مختلف رنگوں اور مختلف سائزوں میں نظر آتی ہیں۔ لیکن دوسری قسم کی ٹیکسیوں کو صرف سرخ و سفید روغنوں سے رنگا جاتا ہے۔ وہ ایکسپورٹ ٹیکسیز کہلاتی ہیں۔ اس لیے ان پر موٹے حروف میں "ای ٹی" لکھا ہوتا ہے۔ انھیں بھی نمبر ۶۰۱۲۱ پر ٹیلی فون کرنے سے بلایا جا سکتا ہے لیکن یہ عوام میں مقبول نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ جرمن مارک کی بجائے صرف امریکی ڈالر اور سنٹ قبول کرتی ہیں۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ ان کے دلدادگان کمپنی مذکور سے کوپنوں کی کتاب لے لیتے ہیں اور کرائے کی بجائے ایک کوپن بھر کر دے دیتے ہیں۔ ہر کوپن پر کرائے کی رقم بھر دی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں امریکیوں کا، ان کے چلے جانے کے بعد بھی کس درجہ اثر باقی ہے، بالکل ہمارے برصغیر پاک و ہند کی طرح کہ انگریزوں سے نجات پا کر بھی ان کے چھوڑے ہوئے نقوش جن میں سے بیشتر مذموم بھی ہیں، نو سال گذر جانے کے بعد ہم پر مسلط ہیں اور نہ جانے کب تک مسلط رہیں گے خیر! اپنی رائے یہ ہے کہ کسی بھی نئے شہر میں پہنچ کر پیدل چلنے میں جو مزا ہے وہ گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے گزر جانے میں حاصل نہیں ہوتا۔ اجنبی کو دیکھ کر راستے کی خاک کے ذرّے تک پکار اٹھتے ہیں ع

اک نظر ادھر بھی ذرا دیکھ بھال کے

انھیں مایوس کرنا ہو تو لیے شک گاڑیوں میں بیٹھ کر ان سے دامن بچا لیا جائے۔

شام کا وقت تھا۔ راستے کے دونوں طرف پٹریوں پر بے پناہ بھیڑ تھی صحیح معنوں میں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور سڑکوں پر تو یہ حال تھا کہ تیز رفتار گاڑیوں کی قطاریں رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ سڑک عبور کرنے کے لیے لوگ مقررہ مقامات پر جمع ہوتے

اور ٹریفک کے سپاہی کے اشارے پر قدم اٹھاتے تھے اگر ذرا بھی جلد بازی یا غلطی ہو تو حادثہ یقینی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک چوراہے پر یہی ہوا۔ ایک شخص بہت سا بوجھ کندھے پر اٹھائے ہوئے انتظار کی گھڑیاں نہ جھیل سکا اور بیتیا یا نہ اندازہ میں سڑک پر آگیا۔ سب سے پہلے گاڑی نے اسے کچلا، اس گاڑی کو پیچھے آنے والی گاڑی نے بری طرح رگید ا تیسری نے اسے دھکیلا اور چوتھی نے بریک لگا کر اس طرح روکا کہ باقی بھی رکتی چلی گئیں۔
لیکن ہم نے ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ پٹریوں پر چلنے والے ذرا نہیں رکے۔ ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر اپنی راہ چلتے رہے۔ ہمارے ملک میں کوئی حادثہ ہوتا ہے تو پیدل چلنے والے دوڑ کر اسے ایک تماشہ بنا لیتے ہیں اور اس طرح کبھی کبھی ایک اور نیا حادثہ رونما ہو جاتا ہے۔ پھر پولیس کو تحقیقات کرنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ ہم چونکہ اس شہر میں نئے تھے، اس لیے مشاہدے کی غرض سے ذرا دیر رک گئے۔ ہم نے دیکھا کہ گشت کرنے والے ایک سپاہی نے فوراً زخمی شخص کو کھینچ کر پٹری کے قریب کر دیا اور رکی ہوئی گاڑیوں کو آگے چل پڑنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی منٹ میں ایک ایمبولنس کار وہاں آکر رکی اور زخمی کو اٹھا کر اسپتال لے گئی۔ معلوم ہوا کہ دور کھڑے ایک پہرے کے سپاہی نے اس حادثہ کو دیکھ کر فوراً اپنی جیب سے ایک اوٹومیٹک ٹیلی فون نکالا اور اسپتال کے شعبۂ حادثات کے ایمرجنسی وارڈ کو مطلع کر دیا، جہاں سے ایمبولنس کار بھیج دی گئی۔

ہم آگے بڑھے تو سڑک کے کنارے ایک کھلے مقام پر ریچھ کا تماشا ہو رہا تھا۔ ایک بڑا مجمع لگا ہوا تھا اور راہ چلتے ذرا ٹھیر کر لطف اٹھا رہے تھے۔ ریچھ والے کے ہاتھ میں کوئی ڈگڈگی نہیں تھی۔ البتہ وہ سر سے پاؤں تک مسخرا (کلاؤن) بنا ہوا تھا۔ اس کا نقلی چہرہ بڑا بھیانک تھا اور جسم پر ایسا لباس تھا جس میں ریچھ کے ناخون پیوست نہیں ہو سکتے تھے۔ ریچھ سے اس کی لڑائی بالکل اسی طرح ہو رہی تھی جیسے اسپین وغیرہ میں کھلاڑی لوگ سانڈوں اور بھینسوں سے لڑتے ہیں۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ریچھ صرف اپنے مالک کے نقلی چہرے سے بے حد ناراض ہے اور اسی لیے قریب کھڑے ہوئے تماش بینوں کا نوٹس تک نہیں لیتا۔ حالانکہ ان میں سے بھی بہت سے بچے خوب چیخ چلا رہے، تالیاں بجا رہے اور اچھل اچھل کر اسے گھونسے

دکھا رہے تھے ہیں نے میاں محبوب کے کان میں چپکے سے کہا، "فوراً یہاں سے آگے بڑھو۔ یہ ریچھ بڑا دیدہ ور ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے لیے تمہارا غیر مانوس چہرا اشتعال کا باعث بن جائے اور وہ اپنے مالک کو چھوڑ کر تم سے الجھ پڑے۔ ہم سب کے لباس تو خاص طور پر اس کے لیے بالکل نئے تھے۔

یہ شہر دو حصّوں میں تقسیم کیا جاتا اور الگ الگ اس کے حصّوں کو نیا اور پُرانا کہا جاتا ہے۔ لیکن نئی دہلی اور پرانی دہلی کی طرح ہمیں کوئی واضح فرق نظر نہیں آیا اور دیکھا جائے تو تاریخی اعتبار سے بھی یہ تفریق اب فرسودہ کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس حصّے کی بنیاد بھی، جو نیا کہلاتا ہے، ۱۳۳۳ء میں گویا چھ سو سال سے زیادہ عرصے پہلے پڑی تھی، اور اس لیے اس کی بعض عمارتیں اتنی خستہ حال تھیں کہ ان کے سامنے کھڑے ہو کر نئے شہر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پُرانا حصّۂ شہر بہر حال پرانا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس میں بھی بعض عظیم الشان عمارتیں دوسری جنگِ عظیم کے بعد تعمیر ہو کر اس کے پرانے نام کو نیا رنگ دے رہی تھیں۔

آلٹ اشٹاٹ یعنی پرانا شہر دریائے مائن کے شمالی ساحل پر، جو اس سرزمین پر شرقاً غرباً بہتا ہے، چند پرانے پلوں کے درمیان آباد ہے جس کے آڑے ترچھے بازار اور تنگ گلیاں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ شہری منصوبہ بندی کا خیال رکھے بغیر ان کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ یہ بات نئے حصّۂ شہر میں بھی پائی جاتی تھی لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد تعمیر نو ہوئی تو اس نقص کو دور کرنے کے لیے بہت کچھ خیال رکھا گیا ہے۔ دونوں پُرانے اور نئے حصّوں میں گرجا گھر خاص طور پر نمایاں ہیں اور وہ اپنی وضع قطع اور طرزِ تعمیر کے ذریعہ اپنے عہد کا انکشاف خود "زبانِ سنگ" سے کرتے ہیں بعض گرجا گھر رومی دورِ حکومت کی یادگار ہیں جن میں زیادہ تر گوتھک انداز پایا جاتا ہے۔

پرانے علاقے کے وسطی حصّے میں دریا سے تھوڑے فاصلے پر، ہمارے ہوٹل سے کچھ دُور، ایک مقام سال ہوف کہلاتا ہے۔ یہاں کسی زمانے میں صرف ایک عمارت تھی لیکن اب عمارتوں کا ایک مجموعہ ہے، تعمیر، مکرر تعمیر، انہدام اور اضافوں کے بعد اس کی وضع قطع کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اور یہ سب کچھ ۱۱۵۰ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان سات سو سال کی مدّت میں ہوا ہے۔ اس دوران میں اس نے شہر کی تاریخ میں کئی

کردار ادا کیے ہیں۔ اس کی بنیاد تو یہاں کے ایک فرمانروا فریڈرک بار باروسہ نے اپنے محل کی صورت میں رکھی تھی لیکن اب مختلف حصوں میں تقسیم ہو کر عوام کی بستی بن گئی ہے۔ اس وقت کا صرف ایک گرجا رہائشی عمارتوں کے درمیان باقی رہ گیا ہے۔

سال ہوف کے قریب ہی تیرھویں صدی کا ایک اور گرجا جو کہلاتا ہے (کرش ذنکو لائی چرچ) کہلاتا ہے، ایک عجیب یادگار ہے خصوصاً اس کا ایک مینار جو یقیناً تین قسطوں میں تعمیر ہوا ہوگا، تین مختلف ماؤں کی اولاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی سب سے نیچے کی منزل رومانیائی طرز کی حامل ہے۔ درمیانی حصہ گوتھک انداز میں بنا ہے اور سب سے اوپر کا کھنڈ انیسویں صدی کے طرزِ تعمیر کا مظہر ہے۔

اس گرجا کے بالکل سامنے سڑک کے پار ایک چوک ہے جو قیصر جرمنی کے عہد تک رومر برگ کہلاتا تھا، لیکن اب اس کے بڑے حصے میں عمارتیں بن جانے سے رومر ہوس (ہاؤس) کہلانے لگا ہے۔ چونکہ فرینکفرٹ ہمیشہ اس علاقے کے فرمانرواؤں کی تاجپوشی کا مرکز رہتا تھا، اس لیے عوام اس جگہ جشنِ تاجپوشی منایا کرتے تھے۔ قدیم زمانے میں یہ دستور تھا کہ کوئی بیل اس جگہ ذبح کر کے ان کا گوشت بھونا جاتا اور چوک کے درمیان لگے ہوئے فوارے سے پانی کی بجائے شراب نکلتی اور ان دونوں چیزوں سے عوام کی ضیافت کی جاتی تھی۔ یہ رسم باندازِ دگر اب بھی جاری ہے یعنی بعض اہم تقریبات پر گوشت بھون کر شراب کے ساتھ عوام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ حسنِ اتفاق ہے کہ اس علاقے میں بمباری ہوئی تو آس پاس کی بہت سی عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ لیکن فوارہ بالکل صحیح سلامت رہ گیا۔

تھوڑے فاصلے پر مجلسِ بلدیہ کی عمارت ہے جس کا گوتھک طرزِ تعمیر اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ یہ بھی کئی سو سال پہلے کی یادگار ہے اور اس وقت اس کا مقصد کچھ اور تھا۔

ٹاؤن ہال پر سرسری نظر ڈال کر ہم آگے بڑھے تو پرانے علاقے کی حد ختم کر کے گویا ہم نے نئے علاقے میں قدم رکھا۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ رُوس مارکیٹ کہلاتی ہے جو کسی زمانے میں گھوڑوں کی تجارت کے لیے مشہور تھی۔ اسی کے ایک حصے میں مجرموں کو پھانسی دی جاتی تھی۔ جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر اور ڈرامہ نگار گوئٹے نے فاؤسٹ میں جو کردار مارگریٹ (جرمن زبان میں مارگریٹن) کے نام سے پیش کیا ہے، وہ ایک لحاظ سے

تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل عورت کا پورا نام مارگریٹا برانٹ تھا جو بچوں کو عاداً قتل کرنے کے الزام میں اسی جگہ تختۂ دار پر چڑھائی گئی تھی۔ اس عورت کو پھانسی دیئے جانے کے واقعہ نے گوئٹے کو بے حد متاثر کیا تھا۔ انھی تاثرات کا ایک نقش ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے۔

پیدل چلتے چلتے اب ہم اس قدر تھک گئے تھے کہ آگے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ بھوک بھی خوب لگ رہی تھی۔ پھر یہ احساس تھا کہ ہم جس ہوٹل میں ٹھیرے ہیں، وہ بہت شاندار ہونے کے باعث یقیناً مہنگا ہے۔ کھانے کا نرخ بھی بالاتر ہوگا۔ اس لیے سوچا کہ کسی ریسٹوران میں بیٹھ کر کیوں نہ کچھ کھا لیا جائے لہٰذا ہم ایک کیفے میں گھس گئے جس کا نام بہت ہی ثقیل تھا اور ہم نے قیاس کر لیا تھا کہ اس کا کھانا اتنا ثقیل نہیں ہوگا لیکن جب میاں محبوب نے مینو کارڈ پر نظر ڈالی تو بتایا کہ بیشتر چیزیں ہمارے مطلب کی نہیں ہیں۔ یعنی ہم مذہبی اعتبار سے انھیں کھا نہیں سکتے۔ لہٰذا ہم نے بیرے کو بلا کر جو فرمائش کی، وہ اس کے لیے انوکھی ضرور تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ ہم کچھ کھانے آئے ہیں یا محض تفریح کرنے۔ تین گلاس دودھ، چھ عدد انڈے ابلے ہوئے۔ ایک بڑی ڈبل روٹی کے توس۔ امرود کی جیلی، نمک اور کالی مرچیں پسی ہوئی۔ گویا صبح کا ناشتہ ہم رات کو کر رہے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ ہم نے تین سیب بھی منگائے جو ہوٹل کے منتظم کو شاید کہیں اور سے اسی وقت منگانے پڑے کیونکہ وہ سب سے آخر میں علیحدہ پیش کیے گئے تھے۔ دیکھا جائے تو یہ سب چیزیں معمولی تھیں لیکن بل ہولناک تھا۔ یعنی مجموعی طور پر ہمیں سولہ فرانک یا اٹھارہ روپے ادا کرنے پڑے۔ بالفاظ دگر چھے رُپے فی کس ہوتے۔ یہ اوسط تو ہوئی حساب کے مطابق لیکن میں نے ایک انڈا بھائی جان محترم کے حصے میں سے اور میاں محبوب کے حصے کا سالم سیب فالتو کھایا۔

اب واپس پیدل چلنا دشوار تھا۔ بری طرح تھک گئے تھے اور رات ہو چکی تھی۔ راستہ بھول جانے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا ریستوران ہی کے پتے پر ٹیکسی منگائی گئی اور ڈرائیور کو اپنے ہوٹل کا اس طرح پتہ دیا جیسے ہم سب راستے جانتے ہیں اور وہ ناواقف ہے۔

ہم تینوں بھائیوں کو ہوٹل میں ڈیڑھ کمرہ ملا تھا۔ یعنی ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک ڈبل اور ایک سنگل لیکن ہم نے میاں محبوب سے کہا کہ تم اپنے کمرے کو خالی رکھو اور بستر ہمارے ساتھ ہی بچھا لو۔ میں نے مذاق سے کہا کہ میں تم سے جرمن

زبان میں باتیں کروں گا۔ وہ بستر تو لے آئے لیکن جب ہم سب نماز سے فارغ ہو کر اپنے اپنے بستر پر آ گئے تو وہ حضرت چند منٹ میں خراٹے لینے لگے۔ بھائی جان محترم نے دہلی اور کراچی کے احباب اور اپنے عملے کے بعض افراد کو ضروری خطوط لکھنے شروع کر دیئے۔ لہٰذا میں نے حسبِ معمول مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ بڑی ہستیاں جو فرینکفرٹ کے ساتھ تاریخی اعتبار سے وابستہ ہیں اور جن میں سے بعض کا محض حوالہ اوپر آیا ہے، وقت کے اعتبار سے بہترین موضوعِ مطالعہ بن سکتی تھیں۔ لہٰذا انھی کو پیشِ نظر رکھا گیا۔

گوئٹے۔ جس طرح اردو ادب و شعر کی دُنیا میں الہ آباد کا ذکر آتے ہی حضرت اکبر الہ آبادی یاد آجاتے ہیں، اسی طرح فرینکفرٹ کا ذکر ہو تو ناممکن ہے کہ گوئٹے کا تصور ذہن میں نہ آئے۔ چنانچہ اردو اسلوبِ بیان کے مطابق اگر گوئٹے کو "گوئٹے فرینکفرٹی" کہا جائے تو غیر مناسب نہیں ہوگا، لیکن چونکہ گوئٹے کے نام کا کوئی اور شاعر یورپ کی سرزمین نے پیدا نہیں کیا، اس لیے یہ نسبت غیر ضروری سی معلوم ہوتی ہے۔

گوئٹے کی ادبی اور نجی زندگی کو سمجھنے کے لیے اس کی خود نوشت سوانح عمری سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ دوسرے مورخین ادب نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے۔ آج سے کچھ عرصے پہلے میں نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ پڑھا اور خوب لطف اٹھایا تھا۔ حسنِ اتفاق سے ہوٹل کے کمرے میں ایک کتاب شیلف پر نظر آئی جس میں فرینکفرٹ کی چند مشہور ہستیوں کا ذکر مختصر انداز میں کیا گیا ہے۔ گوئٹے کا حال درحقیقت اس کی سوانح عمری "سچائی اور حسن" ہی کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے جو اس نے ۱۸۳۰ء میں یعنی وفات سے دو سال پہلے مکمل کی تھی۔ اس کے مطالعے سے نہ صرف اس شاعر کے حالاتِ زندگی کا بلکہ اس کی فطرت اور افتادِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔

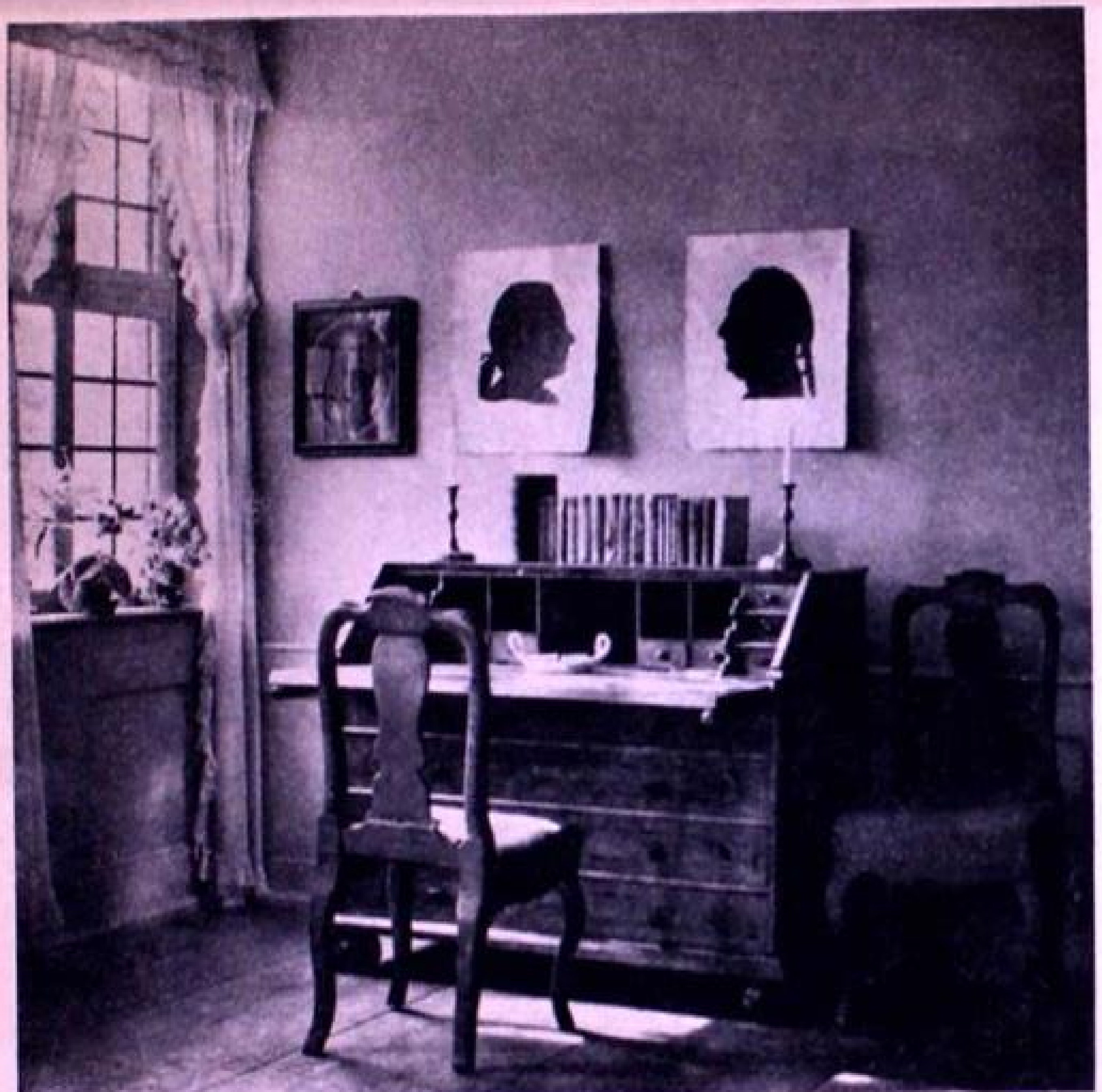
اپنی پیدائش کے بارے میں جو باب لکھا ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"۲۸ اگست ۱۷۴۹ء کو ٹھیک نصف النہار کے وقت جبکہ گھنٹے نے بڑی تیزی کے ساتھ بارہ بجائے، میں فرینکفرٹ ام ماین کے ایک مکان کے اندر عالمِ وجود میں آیا۔ میری جنم پتری سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت ستاروں کا نقشہ سازگار تھا۔ سورج برجِ حمل میں تھا اور باقی دن کے لیے غائب رہا۔ زہرہ اور مشتری اسے

نظرِ التفات سے دیکھ رہے تھے۔ عطارد بھی عتاب نازل کرنے سے اجتناب کر رہا تھا جب کہ زحل اور مریخ میری طرف سے خالی الذہن ہو کر بے تعلقی کا اظہار کر رہے تھے۔ البتہ چاند جو بدر کامل بن جانے کے باعث اپنے حسن کا پرتو بڑی شدت سے ڈال رہا تھا، میری راہ میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگا۔ وہ سرے سے میری پیدائش ہی کا مخالف تھا اور چاہتا تھا کہ میں کسی طرح عالم وجود میں نہ آؤں۔ اسی کی رخنہ اندازیوں نے میری ولادت میں تاخیر کی اور میری ماں کو اس صعوبت سے نجات اس وقت تک نہ ملی جب تک کہ چاند کا سایہ سر سے نہ ڈھل گیا۔ ستارہ شناسوں کی رائے ہے کہ ستاروں کی یہ روش بحیثیتِ مجموعی میرے لیے بھاگوان تھی اور اگر ان کا التفات شاملِ حال نہ ہوتا تو پیدائش کے بعد میری بقا ممکن نہیں تھی لیکن قابلہ نے اپنے اناڑی پن سے میری رُوح کو فنا کر دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ بلکہ یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ میں نے اس دنیا میں مر کر قدم رکھا اور بڑی کوششوں کے بعد تاریکی سے اجالے میں داخل ہوا۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ پیدائش کے وقت گوئٹے کی زندگی کا چراغ ٹمٹمانے لگا تھا جسے بمشکل بچایا جا سکا۔ تاہم یہ اندازِ بیان صاف لفظوں میں کہہ رہا ہے کہ ان کو قلمبند کرنے والا کن صفات کا حامل تھا۔ یہ الفاظ اس شخص کی آئندہ زندگی کے ترجمان ہیں جس نے مادری زبان کے عُلاوہ لاطینی، عبرانی، فرانسیسی، انگریزی اور اطالوی زبانوں پر عبور حاصل کیا، نیز تاریخ و جغرافیہ، نجوم و ریاضی، علم نباتات و حیوانات، طب و کیمیا، دینیات، مصوری اور موسیقی جیسے علوم و فنون میں بھی پوری دسترس پائی اور ان سب علوم و فنون پر کم و بیش اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اگر وہ اتنی زبانوں اور اتنے علوم و فنون سے واقف نہ ہوتا تو اس کی تحریر میں ایسی پختگی و پُرکاری، ہمہ گیری اور وزن کبھی محسوس نہ ہوتا۔ بعض نقّادوں نے اسے شیکسپیئر کے بعد یورپ کا سب سے بڑا شاعر و ادیب تسلیم کیا ہے۔ لیکن میری رائے میں اسے شیکسپیئر پر فوقیت حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کی تعداد زیادہ ہے لیکن گوئٹے کی تحریریں مختلف النوع اور ہمہ گیر ہیں، ان کا مقابلہ شیکسپیئر سے بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

مر مر کر وجود میں آنے والا یہ بچہ جب عہد طفولیت میں داخل ہوا تو اس کی فطرت نے



گوئٹے کے مکان میں مطالعہ کا کمرہ



معصومانہ انداز میں اپنا رنگ دکھانا شروع کیا، جسے دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ معنی خیز بھی کہا جا سکتا ہے۔ فرینکفرٹ کے ایک علاقے گروس ہرش گرابن میں اس کے ماں باپ جس دو منزلہ مکان میں رہتے تھے، وہ بالکل سڑک کے قریب تھا اور دوسری منزل پر سامنے کے وسیع ہال کا جنگلا اتنا نیچا تھا کہ چھوٹے بچوں کو عموماً وہاں آنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی مبادا کہ وہ گر کر پریشانی کی صورت پیدا کردیں۔ لیکن ایک روز گوئٹے کسی طرح سب کی آنکھ بچا کر وہاں آ گیا کیونکہ وہ اپنی چینی کی گڑیا ان ہم عمر بچوں کو دکھانی چاہتا تھا جو سامنے رہتے تھے اور اس وقت باہر نکل کر سڑک پر کھیل رہے تھے۔ چینی کی گڑیا دوسرے کھلونوں کے ساتھ اس کی ماں نے دو روز پہلے ہی خریدی تھی۔

گوئٹے نے جنگلے کے ایک سرے پر پاؤں رکھ کر ذرا اچک کر گڑیا دکھائی، گردن لٹکا کر کسی قدر غرور و نخوت کا اظہار کیا اور پھر جوش میں آکر اسے سڑک پر پھینک دیا۔ سب بچوں نے تالیاں بجائیں اور طنز کے طور پر اس کی عقلمندی کی داد دی لیکن ننھا گوئٹے اس خراجِ تحسین سے نہیں بلکہ اس عجیب و غریب آواز سے بے حد متاثر ہوا جو چینی کی گڑیا کے ٹوٹنے اور سڑک پر اس کی کرچیوں کے بکھرنے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ نغمۂ مسلسل رباب کے تاروں کی جھنکار سے کس قدر ہم آہنگ تھی۔ وہ اس تجربے سے اتنا خوش ہوا کہ یکے بعد دیگرے دوسرے کھلونے بھی پھینکنے شروع کر دیئے۔ وہ ٹوٹتے رہے اور آئندہ بننے والا شاعر برابر لطف اٹھاتا رہا۔ جب کھلونے ختم ہو گئے تو اس نے دوسری چیزوں پر ہاتھ صاف کیا جن کی آوازِ شکست زیادہ لطیف نہیں تھی۔ ادھر اس کا اپنا شوق بڑھ رہا تھا اور ادھر ساتھیوں کا مطالبہ تھا کہ کچھ اور پھینکو۔ لہٰذا وہ بھاگا بھاگا باورچی خانہ میں گیا اور ٹوکری میں چائے کے کچھ برتن بھر لایا۔ پیالیوں اور پرچوں نے بھی ٹوٹ ٹوٹ کر وہی آواز پیدا کی جو گوئٹے کے لیے ایک کیفِ نغمہ سے کم نہیں تھی۔ اگر اس وقت اتفاقاً اس کی ماں کو پتہ نہ لگ جاتا تو نہ جانے اور کتنے برتن وغیرہ نذرِ تجربہ ہو جاتے۔

بچپن ہی کا ایک مشاہدہ اس کی ایک آئندہ تحریر پر پوری طرح اثر انداز ہوا۔ جب وہ دس سال کا تھا اس کی دادی زندگی کے اسی سال پورے کر چکی تھی۔ اپنے پوتے اور پوتی سے بڑا انس تھا اور انھیں خوش کرنے کے لیے بڑے دن پر

اس نے کٹھ پتلیوں کے ناچ کا اہتمام کیا۔ اس کی دادی خود بھی اپنی وضع قطع کے اعتبار سے ایک قد آدم اور جیتی جاگتی کٹھ پتلی سے کم نہیں تھی چنانچہ مشاہدات و تاثرات اس کے ذہن میں محفوظ رہے جنھیں قلمبند کرنے کا موقع اس وقت ملا جبکہ اس نے تقریباً چالیس سال بعد اپنا ایک ناول ''ولہلم میسٹر'' لکھنا شروع کیا۔ اس میں ایسے فن کاروں کے کردار پیش کیے گئے ہیں جو راہ چلتے اپنے ہنر کا کمال اور کرتب دکھاتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار ایک نوجوان ہے جو تھیٹر میں اداکاری اور تماشا گری کو اپنا مستقل پیشہ بنانے کے لیے بیتاب تھا۔ وہ کافی عرصے اس کوچے میں سرگرداں رہتا اور مختلف لوگوں کے ساتھ مل کر نت نئے تجربات حاصل کرتا ہے لیکن اس کا اصل منشا کسی طرح پورا نہیں ہوتا۔

گوئٹے کا باپ —— یوحان کاسپر گوئٹے —— کافی متمول اور صاحب عزت شخص تھا اور اسے شاہی ایوان حکومت میں مشیر خاص ہونے کا اعزاز حاصل تھا، لیکن باپ کے جاہ و ثروت نے نہیں، ماں کی ذہانت اور طبعی رجحانات نے اس کی فطرت پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کی ماں اس کے باپ سے بالکل مختلف المزاج تھی شاید اس لیے کہ وہ بلحاظ عمر اپنے شوہر سے تقریباً اکیس سال چھوٹی تھی۔ اس کے کردار میں یکسر تضاد پایا جاتا تھا۔ وہ قاعدے قانون اصول و ضابطے کا بڑا لحاظ رکھتا تھا۔ وہ ان سب کو ٹھکرا کر ہر پابندی سے آزاد رہنا چاہتی تھی۔ وہ نہایت خشک مزاج تھا اور یہ بذلہ سنج تھی۔ وہ بے حد ضدی تھا اور یہ یکسر روادار تھی۔ وہ بہت زیادہ محتاط تھا اور وہ بالکل لاپروا تھی۔ گویا آگ اور پانی کا ساتھ تھا لیکن اللہ کی دین کو کون روک سکتا تھا۔ گوئٹے کی پیدائش کے سولہ ماہ بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی جس نے بھائی کی زندگی کو ہمیشہ متاثر کیے رکھا۔ دونوں نے کردار کے گہرے نقوش ماں سے حاصل کیے تھے۔ باقی دو بچے پیدا ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد مر گئے۔

باپ دیندار آدمی تھا۔ اس نے بیٹے کی تعلیم کا آغاز مذہبی درسیات سے کیا لیکن گوئٹے اس راہ پر زیادہ دور نہ چل سکا۔ وہ مذہب کے اصولوں پر شروع دن سے تبصرے کرنے لگا اور جب لزبن کے بے پناہ زلزلے نے سارے یورپ کو ورطۂ استعجاب میں غرق کیا تو گوئٹے بھی یہ سوچنے کے لیے مجبور تھا کہ منصف مزاج خدا اتنی شدید تباہی کس طرح

نازل کر سکتا ہے جس نے گنہگاروں اور بے گناہوں کو یکساں طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا یا ہمیشہ کے لیے مجبور و معذور کر دیا۔ اس کے پریشان دماغ نے سوچا، آخر انسان کے لیے کیونکر یہ لازم آتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ جبر و قہر روا رکھنے والی ایک خود ساختہ مقتدر ہستی کے تابع فرمان رہے۔ اِس طرح وہ ایک عرصے تک ذہنی اور عملی طور پر لا مذہب رہا اور انھی احساسات کا نتیجہ تھا کہ وہ فاؤسٹ جیسا ڈرامہ لکھنے کے لیے تیار ہو گیا جس میں نیکی اور بدی کی کشمکش پوری شدت کے ساتھ نظر آتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی تصویر کے اس دوسرے رخ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جب قرآن پاک کا ایک لاطینی ترجمہ اس کے سامنے آیا اور اس نے اسلامی روایات کا مطالعہ بھی کیا تو ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسی اثر پذیری کا کرشمہ "دیوانِ مشرق و مغرب" کے رنگ میں نمودار ہوا جس کے جواب میں علامہ اقبال کو "پیامِ مشرق" مرتب کرنا پڑا تھا۔ اپنی اس تصنیف کے سلسلے میں گوئٹے نے ایرانی شاعری اور خصوصاً دیوانِ حافظ کے ترجموں کا ضرور مطالعہ کیا تھا، جن کی جھلک اس کی تحریر میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اِس کے ذریعہ اس نے مشرق کے ساتھ اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مشرق و مغرب کے درمیانی تفاوت کا اعتراف بھی کیا ہے، دیکھا جائے تو گوئٹے نے رڈیارڈ کپلنگ سے بہت پہلے یہ خیال ظاہر کر دیا تھا کہ مشرق و مغرب الگ الگ ہیں اور وہ الگ الگ ہی رہیں گے۔ کپلنگ نے الفاظ بدل کر کہا کہ وہ کبھی مل نہیں سکیں گے۔ اِسی طرح ڈارون کا نظریۂ ارتقاء دراصل گوئٹے کا رہینِ منت تھا۔ کیونکہ ابتدائی خیال پیش کرنے کا فخر اسے حاصل تھا۔ تاہم دوسروں کے خیالات و نظریات کو اپنانے کے لیے کپلنگ اور ڈارون کا بلحاظ قوم انگریز ہونا ہی کافی ہے۔ "دیوان مشرق و مغرب"، کی اس نظم کا ترجمہ جو کپلنگ کے نظریئے کا نقشِ اول ہے، حسبِ ذیل ہے:۔

مغرب بھی بالکل مشرق کی طرح،
عمدہ لطیف چیزیں پیش کر سکتا ہے،
اوہامِ خیالی کو ترک کر کے ظاہر داری سے احتراز کرو،
ایک ساتھ مل بیٹھ کر کھاؤ پیو،

جو اپنے آپ کو پہچان لے اور دوسروں کو بھی،
اِس حقیقت کو بھی سمجھ لینے کا اہل ہے؛
کہ مشرق و مغرب ہمیشہ سے
ایک دوسرے سے الگ ہیں اور رہیں گے۔

گوئٹے نے اپنی خود نوشت سوانح عمری کا نام "سچائی اور حسن" شاید اس لیے رکھا کہ وہ ساری عمر پرستارِ حسن رہا اور اس پرستاری میں ہمیشہ صداقت سے کام لیا۔ ریاکاری بالکل نہیں برتی۔ اس نے ایک بار نہیں، کئی بار محبت کی۔ نوابوں کی بیویوں سے لے کر گھر کی ملازمہ تک سب کو چاہا۔ کبھی ناکامی کا سامنا ہوا اور کبھی کامرانی کا۔ لیکن کوئی بھی رشتہ آخر وقت تک نہ رہ سکا۔ گویا اس نے یونان و روما کے دیوتاؤں کی طرح محبت کی جس کا تعلق صرف نفس سے ہوتا ہے اور چونکہ ہر خواہش کی تسکین اصل جذبے کو فنا کر دیتی ہے" اس لیے اس کی بھی ہر محبت ہمیشہ وقتی رہی لیکن اس کے لاشعور میں ہر جنسی تعلق ایک نقش چھوڑ گیا۔ اگر یہ کیفیات اپنا رنگ نہ جماتیں تو گوئٹے صرف ادب و شعر کی دنیا میں اتنا بڑا ادیب و شاعر کبھی نہ بنتا۔

دراصل جنسی جذبات سے مغلوب ہونا اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا اور وہ بھی کچھ تو اپنے ماحول سے، کچھ افتادِ طبع سے اور کچھ بے جوڑ شادی کے باعث مجبور تھی۔ یاد رہے کہ جب گوئٹے کی عمر صرف گیارہ سال اور اس کی بہن نو سال کی تھی، فرانسیسیوں نے جنگ کر کے فرینکفرٹ پر قبضہ کر لیا اور ان کی ہائی کمان نے فیصلہ کیا کہ علاقے کا ہر متمول گھرانا ایک فرانسیسی افسر کو اپنے ہاں ٹھہرانے اور بالکل رکنِ خاندان کی طرح زندگی بسر کرنے کا موقع دے۔ دنیا میں جہاں بھی یہ صورت پیدا ہوئی جنسی تعلقات کو بالائے طاق نہیں رکھا گیا۔ اس حکم نامے کے بعد فرانس کا طرزِ معاشرت فرینکفرٹ کے ہر جرمن گھرانے میں اپنا رنگ جمانے لگا اور وہ سب کچھ ہوا جسے مذہب اور اخلاق تو کبھی گوارا نہیں کر سکتے لیکن سیاست کھلا اجازت نامہ دے سکتی ہے۔ گوئٹے کا باپ شرم اور ندامت سے دن رات کمرے میں بند رہنے لگا۔ وہ اپنے گھرانے کی عزت و ناموس کو برباد ہوتا اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گوئٹے کی ماں فرانسیسی افسروں کے "اچھے برتاؤ" کی ہمیشہ معترف رہی اور جب یہ دور ختم ہوا تو شاید اسے ایک نعمت کے چھن جانے

کا افسوس ہوا۔ اس غیر فطری ماحول نے گوئٹے کو، جو سارے نقشے کھلی آنکھ سے دیکھتا تھا، وقت سے پہلے جوان کردیا اور حسن پرستی اس کا بھی شعار بن گئی۔

سولہ سال کی عمر میں وہ فرینکفرٹ سے لائپزگ پہنچا تو ایک وسیع تر ماحول میں زندگی کی رعنائیاں اس کی منتظر تھیں۔ وہ ایک سرائے کی لڑکی اینا کیتھرینا سکونکوف کو دل دے بیٹھا لیکن شادی کا خیال دونوں طرف سے بعید از قیاس اور عملی اعتبار سے ناممکن تھا۔ لہٰذا محبت کی پینگیں بڑھیں اور تسکین پاکر رک گئیں۔ البتہ اولادِ معنوی کے طور پر چند زوردار عشقیہ غزلیں لکھ دی گئیں جن میں اس حسینہ کو "اینے تی" کے نام سے متعارف کیا گیا ہے۔

اکیس سال کی عمر میں جبکہ وہ اسٹراس برگ میں قانون کی تعلیم پا رہا تھا، اسے انیس سال کی ایک حسین لڑکی فریڈریکے بریون سے ملاقات کا موقع ملا۔ اور اس پر بھی ایک دم ہزار جان سے عاشق ہوگیا۔ لڑکی نے بڑے رکھ رکھاؤ سے کام لیا اور گوئٹے کی رندمشربی اپنا جادو نہ چلا سکی۔ بعض مورخین کی رائے ہے کہ فریڈریکے نے گوئٹے کی طرف ایک خاص مقصد سے التفات روا رکھا تھا۔ وہ اپنے ایک اور عاشق کے صحیح جذبۂ محبت کو رقابت کی ہوا دے کر ابھارنا چاہتی تھی اور مقصد براری کے بعد گوئٹے سے کنارہ کش ہوگئی۔ اصلیت کچھ بھی ہو۔ یہ وارداتِ قلب جس کا نتیجہ شکستِ پندار تھا، گوئٹے کو بے حد مایوس و غمگین کر گئی جس کا اظہار اس کی بلند پایہ تصنیف "ورتھر کی داستانِ غم" کی صورت میں ہوا۔ اگرچہ گوئٹے اپنے "فاؤسٹ" کی وجہ سے مشہور ہے لیکن ورتھر کا درجہ بھی المانوی ادب میں کچھ کم نہیں ہے۔ نپولین نے سات بار اس کا مطالعہ کیا اور پوری طرح اس کی لطافت سے سیر نہیں ہو سکا۔

گوئٹے کے دل کے معاملات کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ وہ روسو کی طرح رسم و رواج کی قیود سے ہمیشہ آزاد رہا۔ اس نے بھی اس فرانسیسی مفکر شاعر کی طرح ایک لڑکی کرسٹی این کے ساتھ شادی کے بغیر زندگی کے اٹھارہ سال گزار دیے اور ذرا بھی محسوس نہیں کیا کہ یہ معاشرتی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔ البتہ اس ہم جلیسی کے نتیجے کے طور پر دو سال بعد ایک لڑکا پیدا ہوا تو دونوں نے چاہا کہ شادی رچالی جائے لیکن پھر اس "فرسودہ خیالی" کو ترک کردیا گیا اور اسی طرح اٹھارہ سال گزارنے

کے بعد شادی کرلی جو زیادہ عرصے راس نہ آئی اور علیحدگی اختیار کرلی گئی۔ بہت عرصہ بعد گھر کی ملازمہ سے جو شادی کی، وہ بھی طویل مدت تک جنسی رشتہ قائم رہنے کے بعد کی گئی تھی۔

۱۸۲۲ء میں جب کہ گوئٹے کی عمر ستّر سال سے بھی تجاوز کر گئی تھی، اس نے شاید آخری بار ایک لڑکی اُل ریخا سے والہانہ محبت کی جو اتنی کم سن تھی کہ اگر گوئٹے کو دادا جان کہتی تو غیر مناسب نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس نے شادی کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس مایوسی کا نتیجہ بھی ایک مجموعۂ غزلیات کی صورت میں برآمد ہوا جن میں زندگی کے اسرار و رموز زیادہ گہرائی کے ساتھ منکشف کئے گئے ہیں۔

گوئٹے کی زندگی کا ایک قابلِ ذکر دور وہ ہے جبکہ وہ وائمار کے فرمانروا آگسٹ کی دعوت پر وہاں پہنچا اور ایک طویل مدت کے لیے وہیں کا ہو رہا۔ اس نے دربار میں اعلا اقتدار حاصل کیا اور زندگی بھر کے لیے ڈیوک کا جگری دوست بن گیا۔ اس نے اپنے تعلقات سے فائدہ اٹھا کر نواب کو ترغیب دی کہ فوج بالکل ختم کر دی جائے اور اس کا خرچ اٹھانے کے لیے جو ٹیکس عوام پر لگائے گئے ہیں، معاف کر دیئے جائیں۔ اس طرح عوام کا دل مٹھی میں لے کر انھیں زیادہ وفادار بنایا جا سکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ خود ہی فوج میں شامل ہو کر صفیں تیار کرلیں گے۔ اس مقصد کے لیے اس نے فوجی تربیت سب کے لیے لازمی قرار دینے پر زور دیا۔ ڈیوک نے دونوں باتیں مان لیں اور اس کے ساتھ گوئٹے بھی عوام میں مقبول ہو گیا بلکہ اس کی زیادہ قدر کی جانے لگی۔ اس نے ریاست میں صنعت و تجارت کو ترقی دینے میں بھی حصّہ لیا جو عوام کی مزید خوش حالی کا باعث ہوا۔ اس نے وائمار کو علماء و فضلا کا مرکز بھی بنا دیا جس نے ایک نئی دل چسپ فضا پیدا کر دی اور جب متحدہ جرمنی نے نپولین کو شکست دیدی اور ملک میں ایک نیا آئین نافذ کرنے کا سوال پیدا ہوا تو گوئٹے کی اعانت سے وائمار نے پیش قدمی کی اور سب صوبوں سے بازی لے گیا۔

گوئٹے کی ان سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مصروفیات کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اپنی پرانی روش کو ترک کر چکا تھا اور اس کے نفس کی خواہشات امتدادِ زمانہ کے باعث سرد پڑ گئی تھیں۔ ایسا ہونا اس کی دِل پھینک طبیعت کے تقاضوں کے خلاف

چنانچہ اپنی فطرت کی پکار سے مجبور ہو کر اس نے ریاست کے ایک اعلیٰ عہدیدار کی بیوی فراؤفان اشٹائن سے عشق لڑانا شروع کردیا۔ یہ عورت صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے بے مثل تھی۔ اور چونکہ عمر میں گوئٹے سے کچھ بڑی بھی تھی، اس لیے وقار و متانت کے ساتھ ایک بزرگانہ انداز کا برتاؤ کرتی رہی۔ لیکن چونکہ وہ شاعر کے کمالات اور ادبی محاسن کی معترف تھی، اس لیے کبھی کبھی زچ ہو کر رہ جاتی تھی۔ ان کی افلاطونی محبت خاصی مدت تک چلتی رہی۔ وہ ایک بے غرض انہماک اور خود فراموش محویت کے ساتھ والہانہ عشق کرنے کی قائل تھی اور اس کے برعکس گوئٹے رُوحانی ارتباط کے علاوہ جسمانی وصل بھی چاہتا تھا۔ عورت کی کوشش یہی تھی کہ لطیف حیلہ بازیوں سے اپنی پاکدامنی کو برقرار رکھے لیکن گوئٹے نے ایسی حرکتیں شروع کیں کہ اس نے بے عزتی کے خوف سے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے اور گوئٹے کی مُراد بر آئی۔ عورت نے خاوند سے علیحدگی اختیار کرلی۔ لیکن بعض دشواریوں کے باعث گوئٹے سے رشتہ ازدواج بھی قائم نہ کرسکی۔ تاہم دونوں کے تعلقات عورت کے مرتے دم تک استوار رہے۔

جب اشٹائن اپنی پاکدامنی کو برقرار نہ رکھ سکی تو میں گوئٹے کے دامن خیال کو کس طرح تھامے رہتا۔ ان دونوں پر جنسی خواہشات حاوی آگئیں اور میں نیند کے غلبے سے مجبور ہوگیا۔ اور استاد مرحوم کے شعر کو ذرا سے ردو بدل کے ساتھ پڑھتا ہوا محو خواب ہوگیا ؎

بہت شوق سے ہو رہا تھا مطالعہ
ہمیں سو گئے داستاں پڑھتے پڑھتے

۲۱ر ستمبر ۱۹۵۶ء ـــــ جمعہ

# فرینکفرٹ میں

آج کی تاریخ میں ہم نے یہاں کے ایک عظیم الشان کارخانہ دواسازی کو اپنے پروگرام میں سب سے زیادہ اہمیت دی تھی جو دنیا بھر میں ہوئکسٹ کے نام سے مشہور ہے۔ دراصل ہوئکسٹ نام کا کارخانہ قائم ہونے سے بہت پہلے وہ بستی جہاں وہ اس وقت قائم ہے، اسی نام سے موسوم کی جاتی تھی۔ جب کارخانے نے اسی نام کو اختیار کرلیا؛ تو وہ اتنا مشہور ہوا کہ علاقے کے نام نے ثانوی حیثیت حاصل کرلی۔ گویا اب بستی کا کارخانے سے یا کارخانے کا بستی سے الگ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ علاقے میں رہنے والوں کی بہت بڑی اکثریت اس کارخانے سے وابستہ ہے۔

ہوئکسٹ ـ یہ بستی فرینکفرٹ کے مغربی علاقے میں آخری سرے پر دریائے مائن کے کنارے واقع ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں وہ انتظامی اعتبار سے ضلع مائنس کے تحت تھی لیکن جب فرینکفرٹ نے ترقی کی تو اس نے ہوئکسٹ کو اپنے دائرۂ عمل میں لے لیا۔ عہدِ وسطیٰ کی بہت سی عمارتوں کے آثار دوسری جنگِ عظیم کی بمباری کے باوجود اب تک برقرار ہیں لیکن تاریخ سے یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ اس بستی کی داغ بیل کس نے کس عہد میں ڈالی تھی۔ اٹھارہویں صدی میں یہ علاقہ روغنی مٹی کے برتنوں کی صنعت کے باعث اتنا ہی مشہور تھا جتنا کہ آج ہوئکسٹ کی دواؤں کے باعث مشہور ہے۔

ہم نے اپنے پروگرام کی دوسری شقوں کی طرح ان کارخانوں کو دیکھنے کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ لیکن اس ضمن میں ذرا سی غلط فہمی خواہ مخواہ پیدا ہوگئی تھی۔ ہم نے کراچی روانہ ہونے سے قبل دیگر ملکوں کے سفارت خانوں کی طرح جرمنی کے سفارت خانے کو بھی لکھ دیا تھا کہ ہم فرینکفرٹ میں اپنے خصوصی ذوق و مشاغل اور رجحانات کے اعتبار سے منجملہ اور مقامات کے ہوئکسٹ کارخانے کا شعبۂ دواسازی بھی دیکھنا چاہتے

ہیں۔ برادرِ عزیز میاں محبوب الٰہی نے بھی اس ضمن میں خط و کتابت کرتے وقت یہی اطلاع اس کے منتظمین کو دی تھی۔ لیکن جناب برکات احمد نے جن کا مفصل ذکر ہم یورپ نامے کے حصّہ اوّل میں ترکی کی سیاحت کے دوران کر چکے ہیں، ہم سے دریافت کیے بغیر اپنے طور پر انقرہ سے لکھ کر بھیجا کہ ہمارا دورہ محض شوقین لوگوں کی طرح ہے۔ ہمیں بطورِ خاص کسی شعبے سے دلچسپی نہیں ہے۔ گویا کارخانے کو دیکھنا محض برائے دیکھنا ہے۔ چونکہ بڑے کارخانوں کے افسرانِ تعلقاتِ عامّہ آنے والوں کے رجحانات کو بڑی اہمیت دیتے اور اسی اعتبار سے پروگرام مرتب کرتے ہیں، اس لیے وہ عجیب کشمکش میں تھے کہ ہمیں کیا سمجھ کر اپنا کارخانہ دکھائیں۔ یہ پریشانی اس وقت دور ہوئی کہ جب میاں محبوب نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ہوٹل سے روانہ ہونے سے پہلے انھیں ٹیلی فون کر کے اس بات کی تصدیق کر لینی چاہی کہ انھوں نے آج کا دن ہمارے لیے مخصوص کر رکھا ہے یا نہیں۔ ان کی دور اندیشی کام آئی اور اس بات کی وضاحت ہو گئی کہ ہم دواسازی کے فن سے واقف ہونے کے باعث ان کا صرف یہی ایک شعبہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس کارخانے کی بے پناہ وسعت اور اس کی مختلف النوع صنعتوں کا پہلے سے علم تھا اور ہم جانتے تھے کہ اگر سارا کارخانہ سرسری طور پر بھی دیکھا تو کئی دن لگ جائیں گے۔ اور ہمارے پروگرام میں اس کے لیے چند گھنٹے سے زیادہ وقت ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کارخانے کے ابتدائی دور پر نظر ڈالی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس کا آغاز کیونکر ہوا اور زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ یہ کس طرح کروٹیں بدلتا رہا۔ ۱۸۴۲ء میں بالکل اسی طرح جیسے ۱۹۰۶ء میں ہمدرد دواخانے کی ابتدا فکر بلیغ رکھنے والی ایک ہستی کے ذریعہ ممکن ہوئی تھی، یہ کارخانہ صرف ایک شخص نے نفتول کیمی کے نام سے فرینکفرٹ کے ایک اور علاقے میں قائم کیا تھا۔ چودہ سال بعد ۱۸۵۶ء میں یعنی آج سے پورے سو سال پہلے ایک اور کارخانہ کیمی شے فابرگ گریشیم کے نام سے قائم ہوا۔ یہ دونوں کارخانے الگ الگ بعض رنگ و روغن تیار کرتے تھے۔ دواسازی سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

سات سال بعد ۱۸۶۳ء میں ان دونوں کے مالکان نے مل کر ہوئکسٹ کے مقام پر ایک بڑا کارخانہ میسٹر لیوسی اس اینڈ برونِنگ کے نام سے قائم کیا جو عرفِ عام میں الفاظ

کے ابتدائی حروف کی رعایت سے مختصراً "ایم ایل بی" کہلانے لگا۔ اس مشترک ادارے نے رنگ و روغن بنانے کے علاوہ دوا سازی کا کام بھی شروع کردیا۔

مزید سترہ سال گزرنے کے بعد اس نے فاربِ ورکس ہوئکسٹ کا نام اختیار کر لیا۔ محاورے کے صحیح اطلاق کے مطابق اسے دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہی۔ یعنی ۱۸۸۰ء میں اس کے کل ملازمین کی تعداد دو ہزار سے کم تھی۔ پہلی اور دوسری عالمگیر لڑائیوں میں اسے کافی نقصان پہنچتا رہا۔ اس کے باوجود دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے چار سال بعد اس کے عملے کی تعداد ساڑھے نو ہزار ہوگئی اور اب بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اپنے ملک کا جہاں تک تعلق ہے، ہم کسی بھی کارخانے میں اس قدر ملازمین کا تصور تک نہیں کر سکتے۔

اس کارخانے سے متعلق ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۱۶ء میں اس نے لیورکیوزن میں قائم شدہ اپنے جیسے ایک اور مشہور کارخانے یعنی بائر کمپنی سے ایک معاہدۂ الحاق کیا۔ اس الحاق کی نوعیت کچھ ایسی ہی تھی جیسا کہ آج کل کی سیاسی دنیا میں عام طور پر ہوتا رہتا ہے یعنی دو ملک ایک دوسرے کا ساتھ دینے اور ایک دوسرے کے مفاد کا خیال رکھنے کا وعدہ کر لیتے ہیں۔ درآنحالیکہ وہ اپنے اندرونی اور بیرونی معاملات میں بالکل آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں۔ ہوئکسٹ اور بائر کا الحاق صرف اس معاہدے کی حد تک تھا کہ وہ اپنی اپنی تحقیقاتی سرگرمیوں اور کامیابیوں سے ایک دوسرے کو مطلع کرتے رہیں گے لیکن ایک کارخانے کی مصنوعات کی نقل دوسرا کارخانہ ہرگز نہیں کرے گا۔ البتہ باہمی فیصلے کے مطابق وہ بعض مرکبات کو جنھیں عالمگیر حیثیت حاصل ہوگئی ہو ایک مشترک نام سے بازار میں پیش کر سکیں گے۔ یہ اشتراک شاید صنعتی اور تجارتی اعتبار سے مفید تھا کہ ۱۹۲۵ء میں آٹھ اور چھوٹے چھوٹے اداروں نے اس میں شامل ہوجانے کی خواہش ظاہر کی اور انھیں شامل کر لیا گیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب اس علاقے پر امریکنوں کا عمل دخل ہوا تو انھیں یہ حکمتِ عملی پسند نہ آئی اور انھوں نے اشتراک کو توڑ کر سب ادارے الگ الگ کردئے چنانچہ اس وقت کے بعد سے بعض ایک ہی قسم کی دوائیاں ہوئکسٹ اور بائر دو مختلف ناموں سے پیش کر رہے ہیں اور لوگ انھیں مختلف چیزیں سمجھ کر خریدتے ہیں حالانکہ وہ ترکیب و تاثیر کے اعتبار سے بالکل یکساں ہوتی ہیں۔ اس طرح دونوں کارخانے الگ الگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، مگر عوام خسارے میں رہتے ہیں۔

ہوٹل سے ہومبکسٹ تک کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد جب ہم کارخانے کے صدر دروازے پر پہنچے تو ایک افسر تعلقاتِ عامہ ڈاکٹر لیبو نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں اپنے دفتر میں لے گئے جہاں مختلف شعبوں کے کام سے متعلق تصاویر دیواروں پر سلیقے کے ساتھ بڑے بڑے شوکیسوں میں لگی ہوئی تھیں اور کچھ البموں کی صورت میں جمع کی گئی تھیں۔ انھوں نے کارخانے سے متعلق چند کتابچے ہمیں پیش کیے جو ہم نے شکریے کے ساتھ لے لیے، حالانکہ ان میں سے بعض جرمن زبان میں تھے۔ لیکن میاں محبوب کی موجودگی میں ان کو قبول کر لینا بالکل مناسب سمجھا۔

ڈاکٹر لیبو نے کارخانے کی وسعت کا ایک اجمالی خاکہ ہمارے سامنے کھینچتے ہوئے اور ایک نقشے کے ذریعہ اپنے بیان کو واضح کرتے ہوئے ہم سے دریافت کیا کہ آپ کو کس چیز سے بطور خاص دل چسپی ہے اور اسے دیکھنے کے لیے کتنا وقت دے سکتے ہیں؟ ہمیں معلوم تھا کہ یہ ادارہ بہت سی ادویہ کے علاوہ پلاسٹک کی چادریں، پلاسٹک کی مصنوعات، رنگ و روغن، ڈھلائی کی صنعت میں کام آنے والے مسالے، مصنوعی ریشے، مصنوعی کھاد، کیڑے مار سفوف اور مختلف قسم کے آلات وغیرہ بناتا ہے لیکن ہم کو نہ تو ان سب چیزوں سے دل چسپی تھی اور نہ ان کو ایک نظر تک دیکھنے کے لیے وقت تھا۔ اس لیے ہم نے پنسلین کے علاوہ کسی اور دواسازی کا ایک شعبہ، پیکنگ کا محکمہ، قرص سازی اور قرصوں پر شکر چڑھانے والا اور شعبۂ انتظامیہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور صاف کہہ دیا کہ ہم یہاں زیادہ سے زیادہ ڈھائی گھنٹے صرف کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ وقت دینا ممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر لیبو نے ہنس کر کہا: "تو پھر آپ کو صرف ہوا کے جھونکے کی مانند میرے ساتھ مسلسل چلنا ہوگا۔ ذرا ٹھیر کر کسی چیز کو گہری نظر سے دیکھنے کی مہلت نہیں مل سکے گی۔ کیونکہ اتنا کم وقت تو صرف نگاہ ڈالنے کے لیے ہی کافی ہو سکتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جب ہم سب سے پہلے ان کے شعبۂ انتظامیہ میں گئے، کیونکہ وہ کمرۂ استقبالیہ کے بالکل قریب تھا، تو ایسا معلوم ہوا کہ ہم کسی عظیم الشان ہوٹل کے لاؤنج میں پہنچ گئے ہیں۔ وہاں کا فرنیچر اور در و دیوار کی آرائش اتنی اعلیٰ تھی کہ اس پر کسی محل کے حصے کا گمان بھی ہو سکتا تھا۔ ان کے شعبۂ انتظامیہ کی یہ نئی چودہ منزلہ عمارت ۱۹۶۳ء میں مکمل ہوئی تھی۔ بالکل امریکی طرز پر ہے اور عہد جدید کے آسائشی نظام کے مطابق اس میں کئی لفٹ بھی ہیں۔

ڈاکٹر لیو ہمیں ایک لفٹ کے ذریعہ سب سے اوپر کی منزل پر لے گئے۔ معلوم ہوا کہ تمام آنے والوں کے لیے ابتدائی منزل یہی ہوتی ہے تاکہ کارخانے کی جملہ عمارتوں اور ان سب کی عظیم وسعت پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔ چودہ منزل کی یہ عمارت سب سے زیادہ اونچی ہے۔ اس لیے زینے کی پہلی سیڑھی اسی کو بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر لیو نے ہمیں بتایا کہ ۱۹۵۵ء میں کارخانے کی جملہ مصنوعات کی قیمت فروخت ایک ارب اٹھائیس کروڑ دس لاکھ اطالوی مارک کے برابر تھی، اور ایک تخمینے کے مطابق اس سال اشیائے فروخت کی کل قیمت بقدر بیس کروڑ مارک اس رقم سے بڑھ جائے گی۔ گویا ایک ارب اڑتالیس کروڑ اطالوی مارک سے زیادہ کا سامان فروخت ہوگا۔ اور اگر پانچ سال پہلے کے اعداد و شمار سے مقابلہ کیا جائے تو اس سال کی مجموعی رقم کو دوگنا کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ پچھلے سال اور اس سال جو نئی عمارتیں بنی ہیں اور انھیں جس ساز و سامان اور کل پرزوں سے آراستہ کیا گیا ہے، ان سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کا ابھی موقع نہیں ملا ہے۔ جب یہ کلیں اپنا رنگ جمائیں گی تو فروخت کے اعداد و شمار بے حد بڑھ جائیں گے۔

اس موقع پر انھوں نے اپنے کارخانے کی تجارتی سرگرمیوں کا ایک عجیب گر ہمیں سکھایا۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۲۵ء میں کارخانے میں جتنے ملازم کام کر رہے تھے، ان کے اعتبار سے سرمائے کی رقم پچیس ہزار پانچ سو مارک فی کس معین کی گئی تھی۔ اس سال کے شروع میں ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہ صرف سرمائے کی مجموعی رقم میں اضافہ کیا گیا بلکہ اس کی اوسط بھی بڑھا دی گئی یعنی اب سرمائے کا تناسب بتیس ہزار پانچ سو مارک فی ملازم ہے۔ انھوں نے ہمیں مطلع کیا کہ اس غیر معمولی اضافے میں ملازمین کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ ان کے حقوق کا برابر خیال رکھا جاتا ہے۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جرمنی میں پچھلے پانچ سال کے دوران میں تمام صنعتی اشیاء کی قیمت فروخت میں اضافہ ہوا، سوائے کیمیائی صنعتوں کے جن کے نرخنامے بدستور رہے بلکہ بعض اشیاء کی قیمتیں گھٹا دی گئیں تاکہ عوام کو فائدہ پہنچ سکے۔ قیمتیں بڑھانے کے بجائے کیمیائی صنعتوں کے اداروں نے اپنی پیداوار بڑھائے رہنے کی کوشش کی۔ اس طرح ہر لحاظ سے عوام کو فائدہ پہنچا اور کارخانوں کے مالکان بھی خسارے میں نہیں رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ہوئیکسٹ کے مالکوں میں امریکی حصہ دار کافی تعداد میں شامل ہیں۔

اس کے بعد ڈاکٹر لیو ہم کو شعبۂ تحقیقات میں لے گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے کسی بھی شعبے کو دیکھنے سے پہلے اس شعبے کے عہد ماضی کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ہماری ترقی کی رفتار کا پوری طرح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس شعبے میں انھوں نے ہم کو صرف دوائی تحقیقات کے چند حصے دکھلانے پر اکتفا کیا۔ ورنہ تحقیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دوسری کیمیائی صنعتوں کے ضمن میں بھی یہ کارخانہ نت نئے طریقوں سے چھان بین کر رہا ہے۔

انھوں نے فخریہ کہا کہ دنیا کے بہت سے مشہور اور نوبل انعام پانے والے سائنس داں ہمارے کارخانے کی تجربہ گاہوں سے وابستہ رہے ہیں اور یہیں رہ کر انھوں نے اپنی دماغی کاوشوں اور کارخانے کے اربابِ اقتدار کے تعاون سے ایسی ادویہ معلوم کیں جنھیں شہرتِ دوام حاصل ہو گئی ہے۔ انھوں نے مثال کے طور پر پروفیسر رابرٹ کوخ، پروفیسر ایمل فان بے رنگ اور پروفیسر پال اہرلخ کے نام لیے جن پر کارخانہ فخر کرتا ہے اور جو خود بھی اس کارخانے سے اپنی وابستگی کو باعثِ صد افتخار سمجھتے تھے۔ ان تینوں اولوالعزم ہستیوں کے نام سے کارخانے نے الگ الگ تین تحقیقاتی لیبارٹریز قائم کر رکھی ہیں، جہاں ان کی ایجاد کردہ ادویہ کا ہر تیاری کے بعد پیک کیے جانے سے پہلے تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ معیار کے مطابق ہیں یا نہیں اور اگر کوئی کسر باقی رہ گئی ہو تو اس کا ازالہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ان کی ادویہ پر مزید تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے۔

پنسلین کا کارخانہ دیکھتے وقت ڈاکٹر لیو نے ہمیں بتایا کہ دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد جب جرمنی پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے ہوئکسٹ کو پنسلین بنانے کی ممانعت کر دی تھی لیکن یہ حکم ۱۹۵۰ء کے آخر میں واپس لے لیا گیا اور یہ دوا دوبارہ بڑی تیزی سے تیار ہونے لگی۔ امریکیوں نے اپنے مفاد کی خاطر اسے بنانے کی اجازت دے دی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس نام نہاد جمہوریہ جرمنی کو واقعی اپنے خارجی اور داخلی معاملات میں آزادی حاصل ہے؟ حکومت کے اختیارات کا تو ذکر ہی کیا، جب ایک صنعتی ادارہ اپنے ملک کے خام مال سے اپنی ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوئی مخصوص چیز تیار نہیں کر سکتا تو کیا اس کی مجبوری و بے کسی افسوسناک نہیں کہی جا سکتی؟ پنسلین کو ایجاد کرنے کا سہرا کسی جرمن دوا ساز کے سر نہیں ہے لیکن چونکہ اس کی اجارہ داری ختم ہو گئی ہے، اس لیے وہ دنیا کے ہر حصہ

میں تیار کی جا سکتی ہے۔ اسے بنانے کی ترکیب صیغۂ راز میں نہیں رہی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ پنسلین دنیا کی ان چند دواؤں میں سے ایک ہے جو سب سے زیادہ مقدار میں تیار ہوتی ہیں اور اسی لحاظ سے اس کا غلط اور ناجائز استعمال بہت عام ہو گیا ہے اور نقصان بھی پہنچا رہا ہے۔ خود اس کے موجد جان فلیمنگ نے اپنی وفات سے کچھ عرصے قبل بڑی حسرت سے کہا تھا کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ لوگ میری اس دوا کو خواہ مخواہ اور بے ضرورت استعمال کر کے فائدے کے بجائے نقصان اٹھائیں گے تو میں کبھی بھی اسے عوام کے سامنے پیش نہ کرتا اور اس کی تحقیق کا راز ہمیشہ سربستہ رکھتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ درود شریف کی طرح پنسلین سے بھی ہر مرض کا علاج کیا جانے لگا ہے۔ درود شریف کی افادیت میں تو شبہ نہیں لیکن پنسلین کے زیادہ کارآمد نہ ہونے کا اعتراف اب عام طور پر ہونے لگا ہے بعض لوگ تو غذا کی طرح پنسلین کو روزانہ کسی نہ کسی صورت میں استعمال کرنا ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ ایسی صورت میں دوا کی تاثیر الٹی نہ ہو جائے تو کیا ہو۔

قرص سازی اور قرصوں پر شکر چڑھانے کے حصے الگ الگ ہیں لیکن ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ہم نے اب تک دوائی ٹکیاں بنانے کی ایسی مشینیں دیکھی تھیں جو ایک، دو اور چار تک ٹکیاں ایک وقت میں تیار کر دیتی ہیں لیکن یہاں زیادہ تر ایسی مشینیں کام کر رہی تھیں جو چین کی طرح مسلسل ٹکیاں بناتی ہیں اور ان کی رفتار بھی تیز ہے۔ پھر ایک دو نہیں درجنوں مشینیں ایک ساتھ کام کر رہی تھیں۔ جن دواؤں کی مقبولیت بہت زیادہ ہے، ان کے قرص کئی کئی مشینوں پر بنائے جا رہے تھے تاکہ مانگ اور رسد کا توازن برابر قائم رکھا جا سکے۔

اسی طرح قرصوں پر شکر چڑھانے کا کام بھی بڑی تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ شکر میں مختلف رنگ ملا کر قرصوں کو دیدہ زیب بنانے کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جاذبیت کے علاوہ رنگوں سے ان کے درمیان فرق و امتیاز پیدا کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ تیز رفتار مشینوں کی مدد سے سیروں کی مقدار میں ٹکیاں نیا رنگ روپ اختیار کر رہی تھیں۔

بیکنگ کے شعبے میں بھی بہت سا کام خودکار مشینوں کے ذریعہ ہو رہا تھا اور جو کام لوہے کی کلوں کے بجائے گوشت پوست کے انسان کر رہے تھے، ان کی پھرتی بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں تھی۔ ہر شخص اپنی ذمہ داری کا احساس دل میں لیے ہوئے میکانیکی صلاحیت و استعداد کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اسی لیے ان کی باقاعدہ نگرانی کے لیے زیادہ افسر مقرر نہیں تھے۔

اگر کارکنوں میں خلوصِ قلب کے ساتھ کام کرنے کی لگن موجود ہو تو مالکان ضرور ان کا خیال رکھتے ہیں۔ اس قسم کی ہم آہنگی فریقین کے لیے سودمند ثابت ہوتی ہے۔ اس شعبے میں بھرتی اور جابکدستی کے علاوہ صفائی ستھرائی اور صحتی اصولوں کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں بھی دواسازی والے حصے کی طرح تمام کارکن اپنے اپنے چہرے پر نصف نقاب باندھ کر کام کرتے ہیں تاکہ سانس کی آلودگی کسی شے پر اثر انداز نہ ہو سکے اور دوسری طرف بعض دوائیں انسان کے سانس کو متاثر نہ کریں۔ یہ احتیاطی تدابیر صرف عمدہ دواخانوں ہی میں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ عام دواساز ادارے ان کی کب پروا کرتے ہیں۔

ہوئکسٹ میں ہر ہفتے کے دو دن یعنی ہفتے اور اتوار کی بالکل چھٹی رہتی ہے گویا صرف پانچ دن سرگاڑی اور پاؤں پہیہ بن کر کام کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح لوہے کی کلوں کے ساتھ ساتھ انسانی مشینوں کو بھی پوری طرح آرام کرنے کا موقع مل جاتا ہے لیکن یہ پانچ دن بڑے کسالے کے ہوتے ہیں۔ ہر ہفتے کے ان پانچ دنوں میں مجموعی طور پر پینتالیس گھنٹے یعنی نو گھنٹے روزانہ کام لیا جاتا ہے۔ ہر روز دوپہر کو کھانے کے لیے ایک گھنٹے کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس طرح کارخانے میں روزانہ دس گھنٹے کی حاضری ہوتی ہے۔ صبح آٹھ بجے سے شام کے چھے بجے تک گاڑی میں جتے ہوئے گھوڑے کی طرح مصروفِ کار رہنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر اڑتالیس گھنٹے تک جسمانی آرام اور سکون حاصل نہ کیا جائے تو انسانی مشین یقیناً خوش اسلوبی کے ساتھ کام انجام نہیں دے سکتی اور ہو سکتا ہے کہ انسانی مشین بھی جواب دے جائے۔ میں نے سوچا کہ ہمارے ملک کے حالات میں یہ طریقہ نہ جانے کس حد تک قابلِ عمل ہو سکتا ہے۔ میں نے تہیہ کیا کہ وطن واپس جا کر اپنے حالات کا جائزہ لوں گا اور دیکھوں گا کہ اگر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو وہ کس حد تک طرفین کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

تقریباً ڈھائی گھنٹے میں ہمارا مشاہداتی دورہ ختم ہوا۔ اگرچہ ڈاکٹر ریو کا فرضِ منصبی یہی تھا کہ وہ ہر زائر کو تسلی بخش انداز میں کارخانے کی سیر کرائیں لیکن انھوں نے یہ معلوم کر کے کہ میں اور بھائی جان محترم دو مختلف ملکوں میں ایک ہی قسم کے دو طبی اداروں کے سربراہ ہیں، زیادہ خلوص اور دلچسپی کا اظہار کیا اور اسی لیے ہم نے رہینِ منت ہو کر ان کا دلی شکریہ ادا کیا۔

مرک کمپنی والوں کی طرح وہ بھی چاہتے تھے کہ ہم دوپہر کا کھانا بلا تکلف ان کے ساتھ کھائیں لیکن ہم نے مناسب نہیں سمجھا۔ آج جمعہ کی وجہ سے ہم چاہتے تھے کہ کہیں نماز باجماعت

ممکن ہو تو لطف آجائے۔

ٹیکسی تو پہلے ہی رخصت کی جاچکی تھی، جس میں ہم آئے تھے۔ لہٰذا ہم نے ڈاکٹر لیو سے درخواست کی کہ وہ ہماری واپسی کے لیے دوسری ٹیکسی منگوا دیں مگر انھوں نے کارخانے کی ایک شاندار گاڑی پیش کی اور فراخ دلی کے ساتھ کہا کہ ہم جب تک چاہیں اسے اپنی تحویل میں رکھ سکتے ہیں۔ پھر بھی ہم نے اس رعایت سے زیادہ فائدہ اٹھانا نہیں چاہا اور شہر کے ایک گنجان آباد علاقے میں جاکر اسے واپس کر دیا۔

جرمنی میں مسجدیں تو کئی ہیں اور سُنا ہے کہ ایک دو بڑی شاندار ہیں لیکن اس علاقے میں جہاں ہم گاڑی سے اُترے، کوئی مسجد قرب و جوار میں نہ مل سکی۔ اس لیے ہمیں ایک پارک میں جاکر خود ہی نماز پڑھ لینی پڑی۔

ڈاکٹر لیو نے اپنے کارخانے کی تحقیقاتی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا کہ بہت سے محققین خصوصاً ڈاکٹر رابرٹ کوخ، پروفیسر بے رنگ اور پروفیسر اہرلخ ان کے ادارے سے وابستہ رہے تھے اور وہیں رہتے ہوئے انھوں نے اپنی تحقیقات اور تخلیقات پر نوبل انعامات پائے تھے لیکن اگر سوانح حیات اور حوالہ جات کی کتابوں پر نظر ڈالی جائے تو اِس دعوے کا ثبوت کہیں نہیں مل سکے گا۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ڈاکٹر لیو نے غلط بیانی کی لیکن یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس قدر اہم پہلو کو سوانح نگاروں نے کیوں نظرانداز کر دیا۔ اگر اس حقیقت کا اظہار صرف اس لیے مناسب نہیں سمجھا گیا کہ اس طرح ایک دواساز ادارے کی تبلیغ و اشاعت ہوتی ہے تو یہ انتہائی تنگ نظری ہے اور اگر یہ سہواً رہ گیا تو تعجب ہوتا ہے کہ سب ہی تذکرہ نگاروں سے ایک ہی بھول کیوں ہوئی۔ صرف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بے رنگ کے ساتھ ہوکسٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ محققین ہوکسٹ سے متعلق رہے ہوں یا نہ رہے ہوں، بہر نوع جرمنی کے سلسلے میں ان کا ذکر خیر اور خصوصاً ہوکسٹ کارخانہ دیکھنے کے بعد ضروری ہے۔

**رابرٹ کوخ** - جرمن کا یہ مشہور ماہر جراثیم ریاست ہانوفر کے ایک علاقے کلوستھال میں ار دسمبر ۱۸۴۳ء کو پیدا ہوا تھا۔ اپنے وطن میں ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اس نے طب کا مطالعہ گوٹنگن یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد شروع کیا۔ وہاں

رہتے ہوئے وہ ڈاکٹر حکیب ہینلے کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوا جس نے ۱۸۴۰ء میں چھوت کا یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ کوخ نے ۲۳ سال کی عمر میں ڈاکٹر آف میڈیسن کی سند حاصل کرلی۔ کچھ عرصے بعد ہیمبرگ کے جنرل اسپتال سے وابستہ رہ کر ۱۸۶۹ء میں پوزین میں مطب قائم کیا۔ دوسرے ہی سال فرانس اور پرشیا کے درمیان لڑائی چھڑ گئی تو اس نے فوج کے لیے اپنی طبی خدمات پیش کردیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ پھر پیشہ ور طبیب بن گیا اگرچہ اس کے پاس مریض خاصی تعداد میں آتے تھے۔ پھر بھی اس نے تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۸۷۶ء میں ان خوردبینی کیڑوں کا کھوج لگایا جن سے بھیڑوں میں تلی کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ یہ گویا جراثیم شناسی کی پہلی منزل میں قدم تھا۔ اس کامیابی نے تحقیقاتی افق کو بہت زیادہ وسیع کردیا۔

چار سال بعد حکومت نے اسے حفظِ صحت کے شاہی ادارے کا ڈائرکٹر بنا دیا تاکہ وہ طبابت کا پیشہ ترک کرکے اپنا تمام وقت تحقیقات میں صرف کرنے لگے۔ یہ صورت کار شخصی اور قومی دونوں اعتبار سے مفید ثابت ہوئی اور کوخ نے انجام کار دق کے جراثیم کا پتہ چلا لیا۔ اس نے اس حقیقت کا انکشاف برلن فزیولوجیکل سوسائیٹی کے سامنے ۲۴ مارچ ۱۸۸۲ء کو کیا۔ دوسرے ہی سال حکومت نے ایشیائی ہیضے کی تحقیقات کے لیے ایک سرکاری وفد مصر اور ہندوستان بھیجا اور کوخ کو اس کا سربراہ مقرر کردیا۔ وہاں بھی اسے اپنی جستجو میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور اس نے ساری دنیا کو یقین دلایا کہ بہت سی بیماریاں کھلی آنکھ سے نظر نہ آنے والے جراثیم سے لاحق ہوتی ہیں۔

۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۱ء تک وہ برلن یونیورسٹی میں ہائجین کا پروفیسر رہا اور اپنے نظریات کی برابر تشہیر کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی امنگیں برابر بڑھتی رہیں اور وہ بہت سی بیماریوں کے جراثیم کا گہرا مطالعہ کرتا رہا۔

۱۸۹۱ء میں اسے امراضِ متعدی کے ادارے کا افسرِ اعلیٰ مقرر کردیا گیا۔ ۱۹۰۱ء میں اس نے لندن میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس کے موقع پر یہ ثابت کیا کہ انسان اور جانوروں کی دِق دسل یکساں نہیں ہوتی۔ ۱۹۰۳ء میں اسے دوبارہ جنوبی افریقہ کے دورے پر جانا پڑا تاکہ وہاں مویشیوں کو لاحق ہونے والی بعض بیماریوں کی تشخیص کرسکے۔ اس طرح اس کی شہرت کو اور چار چاند لگ گئے۔

اس کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۰۵ء کا نوبل انعام اسی کو عطا کیا گیا۔ اس انتہائی عروج کے باوجود تحقیقات کا جو مادہ قدرت نے اس کے لیے ودیعت کیا تھا وہ سرد نہیں پڑا۔ اس نے اگلے ڈیڑھ سال میں مشرقی افریقہ جا کر مرض نوم کا پتہ چلایا اور ثابت کیا کہ وہاں پائی جانے والی ایک مکھی کے کاٹنے سے، جو تسے تسے کہلاتی ہے، ہر وقت اونگھتے رہنے کی بیماری انسان کو لاحق ہو جاتی ہے۔ اس نے ان جراثیم کا بھی کھوج لگایا جو مکھی کے ذریعہ انسان کے خون میں سرایت کر جاتے ہیں۔ کام کے ضرورت سے زیادہ انہماک نے اس کو مرض قلب میں مبتلا کر دیا اور اسی موذی بیماری کے باعث وہ ۲۸ مئی ۱۹۱۰ء کو اچانک اس جہاں سے رخصت ہو گیا۔

**ایمل بے رنگ:** مغربی پرشیا کے ایک چھوٹے سے علاقے ہوس ڈورف میں یہ شخص ۱۵ مارچ ۱۸۵۴ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس نے برلن میں طبی تعلیم پائی اور جرمنی کی آرمی میڈیکل کور میں داخل ہو گیا۔ ۱۸۸۸ء تک وہ فوجی میڈیکل کالج میں لیکچرار رہا اور اگلے سال ڈاکٹر کوخ کے ادارہ تحفظ صحت میں اس کا معاون بلکہ دست راست بن گیا۔ اور جب ۱۸۹۱ء میں کوخ کی تقرری امراض متعدی کے ادارے میں ہوئی تو بے رنگ اس کے ساتھ منسلک رہا۔ اسی دوران میں ایک اور جاپانی محقق کے ساتھ مل کر اس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ اگر مرض کزاز میں مبتلا کسی جانور کے خون کا سیرم (خونناب) لے کر پچکاری کے ذریعہ کسی دوسرے تندرست جانور کے جسم میں داخل کر دیا جائے تو اسے مرض کزاز سے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ کچھ عرصے بعد اس نظریے کو انسان پر بھی آزمایا گیا اور خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اس وقت بے رنگ نے اپنی تحریروں میں پہلی بار اینٹی ٹوکسن کی اصطلاح استعمال کی۔ یعنی ایسے زہر کا اثار جو کسی جرثومے کے ذریعہ انسان کے خون میں پہنچ کر تشنجی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

اسی سلسلے میں اور اسی نظریے کے تحت اس نے مرض خناق کو دور کرنے کے لیے ڈفتھیریا اینٹی ٹوکسن سیرم معلوم کر لیا جو ۱۸۹۲ء سے دنیا بھر کے بازاروں میں مختلف صورتوں میں مختلف ناموں سے فروخت ہو رہا ہے اور اس مرض کے استیصال کے لیے مجرب سمجھا جاتا ہے۔ اسی تحقیق پر پیرس کے ادارہ طب نے اسے پچیس ہزار فرینک کا انعام بھی دیا اور پھر پچاس ہزار فرینک کا انعام ادارہ فرانس کی طرف سے ملا۔

اس دوا کی شہرت اتنی عام ہوئی کہ ۱۹۰۱ء میں نوبل انعام دینے والے بھی اسے

نظر انداز نہ کر سکے۔ ہوئکسٹ کارخانے نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بے رنگ کے لیے ایک بہت بڑی لیبارٹری اپنے کارخانے میں قائم کردی تاکہ اینٹی ٹوکسن سیرم بڑے پیمانے پر تیار کیا جا سکے۔ یہ کارِ عظیم مالی اعتبار سے بھی دونوں کے لیے مفید ثابت ہوا۔

اسی کارخانے میں رہتے ہوئے اس نے گایوں کو تپ دق سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک ویکسین تیار کی جو کارگر ثابت ہوئی اور اب بھی استعمال کی جاتی ہے۔ نمونیہ میں مبتلا ہو جانے سے ۱۳؍مارچ ۱۹۱۷ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنے موضوع سے متعلق کئی مطبوعات بھی چھوڑی ہیں۔

**پال اہرلخ:** سلیشیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں اسٹر ہیلن میں بے رنگ کی تاریخ پیدائش سے صرف ایک روز پہلے ۱۴؍مارچ ۱۸۵۴ء کو پال اہرلخ پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم وطنِ مالوف میں پانے کے بعد وہ برسلاؤ کے جمنازیم میں داخل ہو گیا۔ وہاں اپنے فطری رجحانات کے باعث اس نے طب کی طرف خاص توجہ دی اور پھر اسٹراس برگ جا کر طب کی باقاعدہ تعلیم پانے لگا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ برلن میں فرے رخ کے مطب میں چیف اسسٹنٹ کی حیثیت سے مقرر ہو گیا۔

۱۸۸۶ء میں اس نے محسوس کیا کہ میں دق وسل میں مبتلا ہوں کیونکہ ان دنوں وہ اسی مرض کے استیصال کے لیے تحقیقاتی کاموں میں منہمک تھا۔ چنانچہ اس نے ان مشاغل کو ترک کر کے ڈیڑھ سال تک اپنا وقت سیر و سیاحت میں گزارا اور بیماری کا اندیشہ اس کے دل و دماغ سے دور ہو گیا۔ پھر برلن واپس آ کر امراض متعدی کے اسی ادارے سے وابستہ ہو گیا جہاں رابرٹ کوخ اور ایمل بے رنگ کچھ عرصے بعد آکر محققین کی صف میں شامل ہو گئے۔

۱۸۹۶ء میں سیرم بنانے کا ایک ادارہ اشٹگ لٹز میں قائم ہوا تو اہرلخ اس کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ کیونکہ اس نے بعض ایسے سیرم معلوم کر لیے تھے جن کے انجکشن دے کر مویشیوں کی بعض بیماریاں دور کی جا سکتی ہیں۔ اسی دوران میں اس کی توجہ امراضِ جنسی کی طرف مبذول ہوئی جن کا کوئی مجرب طریقۂ علاج اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ لہٰذا وہ فرینکفرٹ جا کر تجرباتی علاج کے سرکاری ادارے میں شامل ہو گیا۔ یہاں رہ کر اس نے انسانی خون کی ماہیت اور جملہ کیفیات کا عمیق جائزہ لیا اور ۱۹۱۰ء میں سنکھیا کا ایک مرکب ایجاد کر لیا جو سوزاک اور آتشک جیسے موذی امراض کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ یہ مرکب سل ورسن یا "۶۰۶" کے

نام سے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ اِس دوا کا نام ۶۰۶ اس لیے قرار پایا کیونکہ اس سے قبل ۶۰۵ مرکبات اِن بیماریوں کے استیصال کے لیے ناکام ثابت ہوچکے تھے۔ اس نے ان امراض سے محفوظ رہنے کے لیے بھی انجکشن تیار کیے۔ انہی تحقیقاتی کاوشوں پر اسے ۱۹۰۸ء میں طب کا نوبل انعام دیا گیا جس میں ڈاکٹر میچنیکوف بھی شامل تھا۔ روس میں اس کی تحقیقات بھی اسی منزل میں کامیاب ہوچکی تھیں۔

ہوئکسٹ سے وابستہ رہنے اور نوبل انعامات پانے والے ان چار سائنس دانوں کے سلسلۂ اذکار میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کی اس نامور ہستی کا ذکر بھی کردیا جائے جس کی دریافت نے دنیائے طب میں تہلکہ مچا دیا اور اپنے بعد کی طبی تحقیقات پر بے پناہ اثر ڈالا ہے۔ میرا مطلب رونتجن سے ہے۔

**رونتجن**۔ ۱۸۹۵ء شروع ہوا تو دُنیا بھر کے ماہرینِ طبیعیات اس بات پر متفق الرائے تھے کہ مستقبل قریب میں کوئی بہت ہی زیادہ اہم نوعیت کی تحقیق عمل میں نہیں آئے گی۔ شاید انھیں معلوم نہیں تھا کہ پروفیسر رونتجن نام کا ایک لائق انسان خاموشی کے ساتھ تن تنہا جرمنی کی ایک سیدھی سادی تجربہ گاہ میں کاغذ کے ٹکڑے پر بعض فلزی نمکیات کی تہ چڑھا کر اور اسے ناشپاتی کی وضع کے شیشے کے ایک بلب میں ڈال کر، جس کے اندر سے ہوا کلیتہً خارج کردی گئی تھی، کچھ ایسے اثرات معلوم کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا جن کی صحیح نوعیت کا خود اسے بھی علم نہیں تھا۔ اس تجربے کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اسے وہ بھی ایک دم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اور وہ کیا دوسرے ماہرین بھی طبیعیات کے مسلّمہ اصولوں سے انحراف کرنے والے کسی نظریے کو مشکل سے مان سکتے تھے۔ سچ بات یہ ہے کہ دُنیا کے اور بہت سے محققین کی طرح رونتجن کے سر بھی ایک ایسی دریافت کا سہرا بندھ گیا جس کی لڑیاں اس کے ارادے کے بغیر گندھ گئی تھیں اور اسے جو فخر حاصل ہوا وہ رہتی دنیا یادگار رہے گا۔

ولہلم کونراڈ رونتجن ۲۷ مارچ ۱۸۴۵ء کو جرمنی کے صوبہ رہائن لینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبے لےنپ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ کپڑے کے ایک متمول سوداگر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی عمر صرف تین سال تھی کہ اس کے وطن مالوف میں کچھ انقلاب انگیز ہنگامے رونما ہوئے جن کے باعث اس کا خاندان نقلِ سکونت کرکے ہالینڈ پہنچ گیا اور وہاں کے ایک شہر میں پوری طرح سکونت پذیر بھی ہوگیا۔ یہیں رہتے ہوئے اس کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ چونکہ وہ اسکول

کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگا تھا اس لیے اس کی صحت کی اچھی طرح دیکھ بھال نہ ہو سکی اور ایک دفعہ جو وہ آشوبِ چشم کے عارضے میں مبتلا ہوا تو ایک آنکھ کی بصارت ہی بالکل جاتی رہی۔

۱۸۶۲ء میں وہ فنیات کے ایک اسکول میں داخل ہو گیا کیونکہ وہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تاجر بننا نہیں چاہتا تھا۔ شروع سے اس کا فطری رجحان کچھ میکانیکی کاموں کی طرف تھا۔ لیکن اس اسکول میں داخل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس کے ایک ساتھی نے تختۂ سیاہ پر ایک استاد کی مضحکہ خیز تصویر بنا دی جو دوسروں کے علاوہ خود استاد نے بھی دیکھ لی۔ اسے اس حقیقت کا علم تھا لیکن استادوں کے انتہائی اصرار کے باوجود اس نے اپنے ساتھی کا نام بتلانے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا اسے اس حکم عدولی اور اخفائے راز کی پاداش میں اسکول سے نکال دیا گیا۔ اسے یہ بے عزتی اور تعلیم و تربیت سے محرومی گوارا تھی لیکن اپنے دوست کو مصیبت میں پھنسانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے باپ نے یونیورسٹی کے اعلیٰ افسروں سے رسائی حاصل کر کے اپنے لڑکے کو دوبارہ داخل کرانا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ یہ اجازت مل گئی کہ اگر ایک پرائیویٹ طالب علم کی طرح چاہے تو امتحان میں شریک ہو سکتا ہے۔

اس طرح پرائیویٹ امتحان پاس کر کے وہ زیورخ کے پولی ٹکنیکل اسکول میں چلا گیا۔ یہاں نیلگوں پانی کی جھیلوں اور سبزہ پوش پہاڑوں نے اس کا دل موہ لیا۔ اور وہ مطالعہ کتب کی بجائے مشاہدۂ قدرت میں زیادہ وقت گزارنے لگا۔ اتوار کی چھٹی میں وہ اسکول کی چار دیواری کو چھوڑ کر قریب کی ایک سرائے میں قیام کرتا اور رات وہیں گزار کر واپس آتا تھا۔ بہت جلد وہ سرائے کے مالک کی لڑکی اینا برتھا کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق وہ ۱۹ر جنوری ۱۸۷۲ء کو ایک دوسرے کے شریکِ حیات بن گئے۔

جب رونٹجن کی عمر ۲۴ سال تھی تو اس کی ملاقات اوگسٹ کنٹ سے ہوئی جو اس وقت ایک مشہور ماہر طبیعات تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ بچہ فنیاتی کاموں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا بلکہ اس کی طبیعت سائنسی تجربات کی طرف زیادہ راغب ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی تجربہ گاہ میں رونٹجن کو اپنا معاون بنا لیا۔ نئے ماحول میں

اس کی اُبھرتی ہوئی امنگیں تیزی سے پروان چڑھنے لگیں اور جب کنٹ کا تقرر اسٹراس برگ یونیورسٹی میں ہوا تو وہ رونٹجن کو اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں رہ کر اس نوجوان نے گیسوں کی حرارت کا تناسب معلوم کیا۔ اس نے بلور میں حرارت کے نفوذ ہونے کی پیمائش کی اور عملی تجربات سے پتہ چلا کہ پانی کے بخارات میں گرمی کی شعاعیں کتنی تیزی سے جذب ہوتی ہیں۔ وہ اپنے استعمال کے آلات خود تیار کرتا اور اس کام میں اتنا ماہر ہوگیا تھا کہ نازک ترین آلات کی ساخت میں بال برابر بھی فرق نہیں آتا تھا۔

اس لحاظ سے اسے اتنی شہرت ہوئی کہ ۱۸۷۹ء میں اسے ہیسین یونیورسٹی میں پروفیسری کا عہدہ مل گیا۔ اس منصب کے لیے سفارش کرنے والوں میں خان ہولٹس بھی شامل تھا۔ جس نے آنکھوں کے باریک پردوں کی جانچ پڑتال کرنے والا آلہ ایجاد کیا تھا۔ ۴۳ سال کی عمر میں وہ ورزبرگ یونیورسٹی میں طبیعات کا پروفیسر اور طبیعاتی ادارے کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا اور یہی وہ مقام تھا جہاں پچاس سال کی عمر میں اس نے محض حُسنِ اتفاق سے لاشعاعوں کا راز معلوم کرلیا۔

اس تحقیق کے بارے میں بہت سی حکایات گھڑی گئی ہیں لیکن خود اس کا بیان بالکل مصدقہ کہا جاسکتا ہے۔ اس نے ایک اخبار کے نامہ نگار سے بات چیت کرتے ہوئے کہا: ”میں کروکس کی ایک نلکی پر جو سیاہ رنگ کے ایک گتے سے ڈھکی ہوئی تھی، تجربہ کررہا تھا۔ اس وقت کاغذ کا ایک ٹکڑا جو بیریم پلیٹینو سائنائڈ میں ڈبوکر خشک کیا گیا تھا، قریب کی بنچ پر رکھا تھا۔ میں نلکی میں سے جس کے اندر اور قسم کے معدنی اجزاء موجود تھے، برقی لہر دوڑا رہا تھا۔ عین اس وقت مجھے کاغذ کے پار سیاہ رنگ کی ایک عجیب وغریب لہر نظر آئی۔ اسے محض ایک کیفیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیونکہ سیاہ گتے میں اچھی طرح لپٹی ہوئی نلکی میں سے کوئی روشنی باہر نہیں آسکتی تھی۔ میں فوراً کوئی رائے قائم نہیں کرسکا۔ بلکہ اصلیت معلوم کرنے کی جستجو میں لگ گیا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ کیفیت نلکی کے اندر سے ظہور میں آئی تھی۔ میں نے آزمائش کا سلسلہ جاری رکھا۔ چند منٹ بعد شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ وہ ایک ایسی عجیب کیفیت تھی کہ اسے ایک غیرمرئی روشنی کہا جاسکتا تھا کیونکہ آنکھ اسے دیکھ نہیں سکتی صرف محسوس کرسکتی تھی وہ نہ تو روشنی تھی اور نہ برقی لہر۔ اسے کسی چیز سے مشابہ کہنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کی اپنی انفرادیت تھی، سب سے جداگانہ۔

اس اتفاقیہ دریافت کی تاریخ تو ۸ر نومبر ۱۸۹۵ء تھی لیکن رونتجن نے اس کا باقاعدہ اعلان وُرزبرگ میں طبیعاتی طب کی انجمن کے سامنے ۲۳ر جنوری ۱۸۹۶ء کو کیا۔ اس موقع پر چار ہزار الفاظ پر مشتمل جو مقالہ اس نے پڑھا، وہ تاریخ طبیعات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ رونتجن نے ماہرین کے سامنے اپنے تجربے کو دُہراتے ہوئے ثابت کیا کہ وہ عجیب کیفیت ایک موٹی کتاب سے لے کر کئی سنٹی میٹر دبیز ربڑ کی چادر کے پار پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس نے اندھیرے کمرے میں نلکی کے سامنے اپنا ہاتھ رکھ کر حاضرین کو دکھایا کہ ہاتھ کے خفیف تاریک سائے کے ساتھ ساتھ اندر کی ہڈیاں بھی اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔ اس نے وثوق کے ساتھ کہا کہ اگر فوٹو اُتارنے کی ایک خشک پلیٹ سامنے لائی جائے تو ہڈیوں کا ایک غبار آلود سا عکس اس پر نقش ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ مظاہرہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب اور بظاہر بعید از قیاس تھا، اس لیے بعض لوگ اسے جادو ٹونے اور نظر بندی سے تعبیر کرنے لگے۔

اخبارات نے دوسرے روز خوب حاشیہ آرائی کی اور بعض نے بیباکی کے ساتھ لکھ دیا کہ رونتجن نے سائنس دالوں کی ایک جماعت کو شعبدہ بازی سے بے وقوف بنا دیا۔ سلسلہ اس منزل تک پہنچ کر نہیں رکا۔ موقع سے فائدہ اٹھانے والے بعض لوگوں نے خود اس قسم کی شعبدہ بازی شروع کر دی۔ ان میں سے ایک نے تو ایک روح کی تصویر تک کھینچ کر دکھا دی لیکن سائنس کے اصولوں کے سامنے ہاتھ کی یہ صفائی چند دن میں ماند پڑ گئی اور صرف اصلیت کا نقش اپنا رنگ جماتا باقی رہ گیا۔ چونکہ رونتجن شروع میں خود بھی اس کیفیت کی اصل حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں تھا، اس لیے سائنس کے بعض اور پیمانوں کی طرح اسے ایکس ریز کا نام دیا جو اتنا مشہور ہوا کہ عرف عام میں آج تک اسی طرح موسوم کیا جاتا ہے۔

رونتجن کی زندگی ہی میں ان شعاعوں کے استعمال کی مخالفت بھی ہوئی۔ ایک انگریزی فرم نے ایکس ریز سے محفوظ رہنے کے لیے ایک خاص قسم کا زیر جامہ بنا کر بیچنا شروع کر دیا جس کے بارے میں کہا گیا کہ خاص طور پر عورتیں اسے پہن کر ان غیر مرئی شعاعوں سے، جو بالکل نادانستگی کے عالم میں حملہ کر سکتی ہیں، اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ اس کے خلاف فراحیہ نظمیں لکھی گئیں اور کارٹون بھی بنائے گئے۔ اسی زمانے کے مشہور سائنس داں تھامس ایڈیسن کو کسی نے لکھ کر بھیجا کہ اگر آپ نے بھی ایکس ریز تیار کر لی ہوں تو ہمیں ایک پونڈ کا پیکٹ بھیج دیں۔ ایک شخص نے اعلان کیا کہ جب میں نے ایکس ریز کے ذریعہ ایک ہڈی کا سایہ اپنے

پیٹ بھرے کتے کے دماغ پر ڈالا تو اسے ایک دم بھوک لگنے لگی۔

رونتجن کے بتائے ہوئے اصولوں پر دُنیا کے اور بھی سائنس داں تجربے کرنے لگے اور اس دریافت کو مزید ترقی نصیب ہونے لگی۔ آج اس ایجاد کا استعمال اتنا عام ہو گیا ہے کہ اکثریت اس کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنا بھی نہیں چاہتی۔ اِس میں شک نہیں کہ اس ایجاد نے تشخیصِ امراض کی نئی راہیں کھول دی ہیں لیکن اس کے زیادہ استعمال سے جو نقصان پہنچا ہے اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ شعاعیں جسم کے اندر چھپے ہوئے سرطان کا پتہ لگاتی ہیں اور تندرست جسم پر کبھی کبھی ان کا ردِّ عمل سرطان پیدا بھی کر دیتا ہے۔ جسم کے اندر نفوذ ہونے والی کیفیت ہڈی کی ساخت کو واضح کرتی ہے اور زیادہ استعمال سے اتنا کمزور بھی بنا دیتی ہے کہ خفیف سی ضرب سے اسے چکنا چور کیا جا سکتا ہے۔ عورتوں کے شکم کا بار بار معائنہ کرنے سے پیڑو کے قریب کی ہڈیوں کے جوڑ اس طرح آپس میں پیوست ہو جاتے ہیں کہ بچے کی ولادت کے وقت ان کا کھلنا بسا اوقات محال ہو جاتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ اعلا ماہرین کے مشورے پر بھی اس کا استعمال کچھ نہ کچھ نقصان پیدا کرتا ہے۔

ایکس ریز کی تحقیقات کے بعد رونتجن ایک بار پھر بلور کی ماہیت معلوم کرنے کے لیے اپنے دیرینہ تجربات میں مصروف ہو گیا۔

۱۹۰۰ء میں وہ حکومت بویریا کی استدعا پر اس صوبے میں گیا اور میونک یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ میں شامل ہو گیا۔ اس نے یونیورسٹی کے ادارۂ طبیعات کو بھی نئے سرے سے منظم کیا۔ ۱۹۰۱ء میں جب نوبل انعامات کی تقسیم شروع ہوئی تو طبیعات کا پہلا انعام اسی کو ملا لیکن اس نے انعام کی ساری رقم ورزبرگ یونیورسٹی کو دے دی۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ۱۰ر فروری ۱۹۲۳ء کو اس کا انتقال مرض سرطان سے ہوا جس کی تشخیص کے لیے اس کی دریافت کردہ شعاعیں' کسی شک وشبہ کے بغیر یقین کی صورت پیدا کر دیتی ہیں۔

**نوبل انعام پانے والے** جرمنی کے جتنے باشندوں کو نوبل انعامات ملے ہیں' ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن ہر ملک کے انعام پانے والوں کے صحیح اعداد و شمار بتانا شاید نوبل انعام کمیٹی کے بھی بس کا کام نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بہت سے جرمن نژاد پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد دوسرے ملکوں میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ جرمنی کے علاوہ وہ ملک بھی ان

پر اپنا حق جتاتے ہیں اور اسی اعتبار سے ہر ملک حصولِ افتخار کے لیے اپنے نوبل انعامات پانے والوں کی فہرست علیحدہ تیار کرتا ہے۔ اگر ان سب پر بیک وقت نظر ڈالی جائے تو بہت سے نام ایک سے زیادہ فہرستوں میں نظر آئیں گے۔ اسی مغالطے کی بنا پر ہم نے یورپ نامہ کی پہلی جلد میں آسٹریا کی سیاحت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہاں کے باشندوں نے سب سے زیادہ انعامات حاصل کیے ہیں لیکن جرمنی آکر عقدہ کھلا کہ یہ فخر درصل اس ملک کو حاصل ہے۔ غلط فہمی کی صورت اس لیے پیدا ہوگئی کہ آسٹریا اور جرمنی کے باشندوں میں اس وقت کوئی مغائرت باقی نہیں رہی تھی جبکہ یہ دونوں ملک ایک ہی نظام کے تحت تھے۔ جب نظم ونسق بدلا تو دونوں ملکوں نے مایۂ ناز ہستیوں کو اپنا بتانا شروع کر دیا۔ اور جن کے بارے میں بظاہر کوئی قابلِ فخر بات باقی نہ رہی، ان سے دستبردار ہونے کا اعلان کیا گیا۔ مثال کے طور پر کون نہیں جانتا کہ شہرۂ آفاق نازی لیڈر ایڈولف ہٹلر آسٹریا میں پیدا ہوا تھا لیکن اس کی بیشتر عمر جرمنی میں گزری۔ اس اعتبار سے اسے جرمن ہی کہا جا سکتا ہے لیکن اہل جرمنی اب اسے آسٹریائی کہتے ہیں۔ اور اب آسٹریا کے لوگ اسے جرمنی سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس آئنسٹائن کو لیجئے جس کے جرمن نژاد ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن چونکہ اس کی آخری عمر کا بیشتر حصہ امریکہ میں گزرا ہے، اس لیے امریکی اربابِ اقتدار اسے اپنی نامور ہستیوں کی فہرست میں درج کرتے ہیں۔

حساب لگایا جائے تو اس بیسویں صدی کے پہلے نصف حصے میں یعنی ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۰ء تک جو انعامات تقسیم ہوئے ان کی تعداد ۲۵۳ تھی۔ ان میں سے صرف جرمنی نے پینتالیس انعامات حاصل کیے۔ اس کا نمبر اس اعتبار سے پہلا ہے۔ اس کے بعد علی الترتیب ریاست ہائے متحدہ (۴۱) برطانیہ اور آئرلینڈ (۳۹) اور فرانس (۲۸) فہرست میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ جرمنی نے کیمسٹری میں، برطانیہ اور آئرلینڈ نے طبیعات میں، ریاست ہائے متحدہ نے طب میں اور فرانس نے ادبیات میں سب سے زیادہ انعامات حاصل کیے۔ امن کے سب سے زیادہ انعامات بھی امریکیوں ہی کو ملے اور اس لحاظ سے نوبل انعام کمیٹی کے فیصلے قابلِ غور کہے جا سکتے ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں اور بعد کے زمانوں میں اس ملک کے باشندوں نے جو ظلم وستم ڈھائے ہیں وہ اب پردۂ راز سے باہر آچکے ہیں۔ دنیا اچھی طرح جان گئی ہے کہ یہ امن کے علمبردار کس درجہ امن کش ہیں۔

اِس تمام عرصے میں جاپان نے صرف ایک انعام طبیعات میں حاصل کیا اور چلی کو بھی ایک ہی انعام ادبیات میں ملا۔ پرتگال نے ایک انعام طب کے باب میں پایا۔ انعامات کی تقسیم میں سیاست بہت زیادہ رنگ جماتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ الفریڈ نوبل نے جس جذبے کے تحت انعامات تقسیم کرنے کی وصیت کی تھی اور اپنی بیشتر املاک اس مقصد کے لیے وقف کی تھی، وہ فوت ہو رہا ہے، اس موضوع پر ہر ملک میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہت سے اعتراضات معقول اور حق بجانب ہیں، اپنی جگہ ناقابلِ تردید ہیں۔ اسی لیے بعض خوددار ہستیوں نے نوبل انعامات کے ضمن میں اپنے نام بھیجے جانے سے منع کر دیا اور ایسے ادارے کے سامنے اپنی ذلت گوارا نہیں کی جس کی تحویل میں روپیہ تو ہے لیکن انصاف نہیں ہے۔

آئنسٹائن کا نام چونکہ بر سبیلِ تذکرہ آ گیا ہے، اس لیے لگے ہاتھوں اس کا تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

**آئنسٹائن** ۔ یہودی النسل البرٹ آئنسٹائن جرمنی میں صوبہ ورٹم برگ کے شہر اُلم میں ۱۴ر مارچ ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کا بچپن میونک میں گزرا کیونکہ وہاں اس کے باپ نے ایک چھوٹا سا برقیاتی کیمیادی کارخانہ قائم کر رکھا تھا۔ اس کی عمر پندرہ سال تھی جبکہ اس کا خاندان نقلِ سکونت کر کے اٹلی چلا گیا۔ اس کی ماں موسیقی کی دلدادہ اور خود بھی ایک ماہر فنِ مغنیہ تھی۔ لہٰذا آئنسٹائن کو ماں اور باپ دونوں سے دو مختلف النوع خصوصیات اور صلاحیتیں ورثے میں ملیں۔ دنیا میں بہت ہی کم ایسے سائنس داں گزرے ہیں جن کو کسی فنِ لطیف سے گہرا شغف رہا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ آئنسٹائن نے گانے بجانے میں کوئی بڑا نام پیدا نہیں کیا تاہم فنونِ لطیفہ سے اس کی والہانہ عقیدت ہی اس بات کی دلیل تھی کہ سائنس داں صرف خشک مزاج ہی نہیں ہوتے۔ وہ کبھی کبھی اپنی تجربہ گاہوں کو چھوڑ کر انسانوں کی محفل میں بھی آ جاتے ہیں۔

اس کے افرادِ خاندان اٹلی میں آباد ہو گئے اور وہ خود سوئٹزرلینڈ کے ایک اعلیٰ اسکول میں داخل ہو کر بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگا جہاں اسے زیادہ آزادی ملی لیکن تعلیم کی طرف سے اس کی توجہ کبھی نہیں ہٹی۔ غالباً اس کو اپنے والد سے زیادہ رقم نہیں ملی تھی، اس لیے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اسے اتالیق بن کر روپیہ کمانا بھی پڑتا تھا۔ اس نے عام روش کے مطابق لاطینی اور یونانی زبانوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس کے برعکس ریاضی سے خاص لگاؤ

پیدا کر لیا۔ الجبرے میں اس کا چچا بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس نے اپنے بھتیجے کو اپنے نقشِ قدم پر چلانا شروع کیا۔ جیومیٹری کی شکلیں اسے بہت پسند تھیں۔ سائنسی تحریریں پڑھ پڑھ کر اس مضمون سے دلچسپی پیدا کر لی۔

۱۹۰۱ء میں فارغ التحصیل ہو کر اس نے برن کے پیٹنٹ آفس میں ایک معمولی اہلکار کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ تاہم حالات کی مجبوری نے اسے مزید تعلیم حاصل کرنے سے باز نہیں رکھا۔ اسی سال اس نے سوئزرلینڈ میں حقِ وطنیت بھی حاصل کر لیا تھا۔ وہ اس دوران میں سائنسی مقالے بھی لکھتا رہا جو اربابِ علم میں بہت مقبول ہوئے۔

۱۹۰۵ء میں اس نے نظریۂ اضافیت کے ابتدائی اصول پیش کیے۔ اس کی شہرت کا زیادہ دار و مدار اسی نظریے پر ہے یا یوں کہیے کہ عوام میں اس اعتبار سے اسے درجۂ قبولیت حاصل ہے حالانکہ اس کی قابلیت کے اور بہت سے پہلو بھی درخشاں ہیں۔

۱۹۰۹ء میں برن یونیورسٹی میں اس کے بعد زیورخ کی یونیورسٹی میں اسے ملازمت مل گئی اور وہ کلرک سے پروفیسر بن گیا۔ اسی دوران میں اس نے پی ایچ ڈی کی اعلیٰ سند حاصل کر لی تھی۔ ایک سال بعد جرمن یونیورسٹی نے جو اس وقت کے نظم و نسق کے لحاظ سے پراگ یونیورسٹی کا ایک جز تھی، اسے نظریاتی طبیعات کا عہدہ پیش کیا۔ اس نے یہ منصب قبول تو کر لیا لیکن بہت جلد زیورخ واپس چلا گیا جہاں اس کے لیے آگے بڑھنے کے امکانات زیادہ تھے۔ اس کے علاوہ اس کی نئی نویلی بیوی کا منشا یہی تھا کہ پراگ کے مقابلے میں زیورخ کو ترجیح دے جس خاتون سے اس نے شادی رچائی، وہ برن کے زمانۂ طالب علمی میں اس کی ہم جماعت تھی۔

۱۹۱۳ء میں برلن میں قیصر ولیم طبیعاتی ادارہ قائم ہوا تو اس کا پہلا ڈائرکٹر بنانے کے لیے نظرِ انتخاب اس پر پڑی۔ تاہم اس کا مرتبہ برلن یونیورسٹی کے پروفیسر کے برابر رہا۔ وہ سائنسی علوم کی رواِئل پروشین اکیڈمی کا رکن بھی منتخب کر لیا گیا اور اس طرح اسے اتنا وظیفہ ملنے لگا کہ وہ عام فرائض کی ذمہ داریوں سے الگ ہو کر صرف تحقیقاتی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس نے بیوی کو طلاق دے دی کیونکہ طبیعتوں کا اختلاف شرکتِ حیات میں مانع تھا۔ اس کی بیوی دونوں بچوں کو ساتھ لے کر سوئزرلینڈ چلی گئی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں آئنسٹائن نے اپنی ایک چچازاد بہن سے شادی کر لی۔

لڑائی ختم ہونے کے بعد جب لوگوں نے دوبارہ سنجیدگی کے ساتھ سنجیدہ موضوعات پر غور کرنا شروع کیا تو اس کا نظریۂ اضافیت زیادہ مقبول ہوا اور وہ دُنیا کی بہترین اعلیٰ دماغ ہستیوں میں شمار ہونے لگا۔

۱۹۲۱ء میں ایک طرف غیر معمولی سائنس داں ہونے کے اعتبار سے اس کی دُھاک بیٹھنے کا یہ عالم تھا کہ ایمسٹرڈم، کوپن ہیگن، جنیوا، مانچسٹر، روسٹوک اور پرنسٹن کی یونیورسٹیوں نے اسے اعزازی سندیں عطا کیں اور دوسری طرف سیاسیات میں دخل دینے کے لیے اس نے قدم بڑھایا اور مشہور صیہونی لیڈر ویزمان کے دعوت نامے کو قبول کرتے ہوئے ریاست ہائے متحدہ کا دورہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا تاکہ امریکا کے متمول یہودیوں کو اس منصوبے کی حمایت پر آمادہ کیا جائے کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن قرار دے دیا جائے اور اسی سلسلے میں وہاں عبرانی یونیورسٹی کی بنیاد بھی رکھ دی جائے۔ ریاست ہائے متحدہ میں چند ماہ گزارنے کے بعد وہ انگلستان ہوتا ہوا جون ۱۹۲۱ء میں واپس آ گیا۔

اگلے سال جبکہ وہ مشرقِ بعید کا دورہ کر رہا تھا، اسے اطلاع ملی کہ نظریۂ اضافیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے طبیعیات کا نوبل انعام دیا جائے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ صیہونی تحریک میں شامل نہ ہوتا تو یہ انعام اسے نہیں مل سکتا تھا۔

۱۹۲۵ء میں اس نے جنوبی امریکا کا چکر لگایا اور چند سال بعد اسے کیلی فورنیا کے ادارۂ فنیات کی طرف سے گشتی پروفیسر مقرر کر دیا گیا تاکہ وہ مختلف یونیورسٹیوں میں گھوم پھر کر اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔

۱۹۳۳ء میں وہ یورپ واپس آیا تو جرمنی کے حالات بہت بدل چکے تھے اور اس کے لیے مناسب نہیں تھا کہ وہ اس ملک میں داخل ہو۔ چنانچہ اس نے بیوی سمیت اوسٹنڈ میں سکونت اختیار کر لی اور کچھ عرصہ بعد پھر ریاست ہائے متحدہ چلا گیا۔ اس ملک میں مسلسل قیام کے باعث ۱۹۴۰ء میں اسے وہاں کا حقِ شہریت مل گیا۔

ایک نظریاتی ماہرِ طبیعیات ہونے کے اعتبار سے آئنسٹائن کو ایک غیر معمولی درجہ قبول حاصل ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ عرصۂ دراز تک اس کے نظریے کو پوری طرح سمجھنے والے معدودے چند انسان رہے اور اب بھی بعض ماہرین کے لیے اس کی وضاحت مشکل ہی ہے۔ اس کا اصل نظریہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن نظریے

سے متعلق چند باتیں لطائف کے انداز میں بیان کی جاتی ہیں اور وہ بھی چیستان ہوکر رہ گئی ہیں۔ مثلاً سوال کیا جاتا ہے کہ اگر ایک گلہری درخت پر بیٹھی ہو اور کوئی شخص اس درخت کا چکر لگائے جبکہ گلہری بھی ساتھ ساتھ گھوم کر اس شخص کو دیکھتی رہے تو کیا آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شخص مذکور نے درخت اور گلہری دونوں کے گرد چکر لگا لیا ہے؟ اسی طرح یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہم چلتی ہوئی ریل گاڑی میں بیٹھ کر گیند اچھالیں تو وہ واپس ہمارے ہاتھ میں کیوں آجاتی ہے۔ دراں حالیکہ گیند کے فضا میں رہنے کے دوران میں گاڑی کچھ نہ کچھ آگے بڑھ چکی ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ عمل گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی کے باہر کیا جائے اور بالفرض ہوا کا دباؤ اس پر اثر انداز نہ ہو تب بھی وہ گیند واپس ہاتھ میں نہیں آئیگی بلکہ گاڑی سے پیچھے رہ جائے گی۔ یہی سوال اس وقت ذہن میں آتا ہے جبکہ گاڑی کے اندر پروانے روشنی پر مسلسل نثار ہوتے رہتے ہیں اور گاڑی کے آگے بڑھتے رہنے کے باوجود مخالف سمت میں گاڑی کی دیوار سے نہیں ٹکراتے۔ اسی قسم کی اور بہت سی باتیں ہیں جن کے جواب اچھے پڑھے لکھے بھی نہیں دے سکتے۔

آئنسٹائن کے ترکِ وطن کرنے اور ریاستہائے متحدہ میں مقیم ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے بعض اربابِ نظر نازی نظام اور خصوصاً اس تحریک کے بانی ایڈولف ہٹلر کو مطعون کرتے ہیں کہ ایک شہرۂ آفاق سائنس داں کی قدر اس کے وطنِ مالوف میں نہ ہو سکی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی مشہور سائنس داں کسی رائج الوقت قانون کی پابندی نہ کرتے ہوئے ارتکاب جرم کرے تو کیا اسے جرم کی سزا محض اس لیے نہیں دی جائیگی کہ وہ ایک مشہور سائنس داں ہے۔ نازی اصول اچھے تھے یا بُرے؟ یہ ایک علیحدہ موضوعِ بحث ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جب تک وہ نافذ ہیں ان کی پابندی ضروری ہے اور ان سے انحراف کرنے والا مستوجب سزا ہے۔ یوں بھی ہٹلر نے اس کے خلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں کی، بلکہ خود آئنسٹائن کے مجرم ضمیر نے اسے وطن سے دور لے جاکر آباد کر دیا۔ اس کے لیے چارۂ کار بھی کیا تھا۔ اربابِ نظر کہتے ہیں کہ اگر وہ سیاست میں نہ آتا تو بحیثیت سائنس داں اس کا درجہ اور بھی زیادہ بلند ہوتا اور شاید اس کا دماغ ایسے مزید نظریات تخلیق کر دیتا جو اس وقت حاشیۂ خیال میں بھی نہیں کہے جاسکتے۔

دگراز سر گرفتم ... جملہ نہیں، جملہ ہائے معترضہ کے طور پر بہت سے خیالات دماغ کے اندر گھوم کے رہ گئے اور ہیں انھیں لکھتا ہی چلا گیا۔ کہنے کی بات یہ تھی کہ ہم نماز سے فارغ ہو کر پارک کے باہر آئے تو بڑے چوک میں ایک ریستوران نظر آیا۔ سخت بھوک لگ رہی تھی۔ فوراً اس میں گھس گئے۔ مینو کارڈ دیکھ کر اشیائے خوراک کا انتخاب میاں محبوب نے کیا۔ جرمنی میں یہ اختیارات ہم نے ان کو تفویض کر دیے تھے۔ منجملہ اور چیزوں کے بھائی جان محترم نے اپنے لیے چار کیلوں اور کچھ دہی کی فرمائش بھی کی۔ صرف ان دو چیزوں کا بل ساڑھے پانچ مارک تھا۔ یعنی ایک کیلے کی قیمت انھوں نے ایک رُپے کے قریب لگائی تھی۔ دہی کا نرخ بھی بہت زیادہ تھا۔ اس حساب سے سارے بل کے میزان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گویا یہ ریستوراں بھی ہماری توقع کے خلاف مہنگا ثابت ہوا۔

کھانے کے بعد سوال تھا کہ پینے کے لیے کیا چیز منگائی جائے۔ "سادا پانی" ہمارا سیدھا سا جواب تھا۔ یہ جواب ہوٹل والے کو ایسا ناگوار گزرا کہ وہ اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ یعنی اس کو اگر گالی دی جاتی، جو ہم سے ممکن نہیں تھی، تب بھی شاید وہ اتنا کبیدہ خاطر نہ ہوتا۔ اس نے جرمن زبان میں کیا کچھ کہا، ہمیں معلوم نہیں۔ محبوب سمجھیں یا خود اس کا خدا سمجھے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ اس نے کہا تھا کہ پانی بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔ جرمنی میں صرف جانور پیتے ہیں۔ آدابِ طعام کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ریڈ وائن پیے یا کم سے کم بیئر۔ مجھے یقین ہے کہ اُس نے بل میں پانی کی قیمت لگائی اور وہ بیئر کی قیمت سے کم نہیں ہوگی۔ اسے یہ شکایت تھی کہ ہم نے شراب نہیں پی اور ہمارا شکوہ یہ تھا کہ نہ تو ہمارا پیٹ بھرا اور نہ لذتِ کام و دہن حاصل ہوئی۔

اس ایک ریستوران کا کیا ذکر، سارے جرمنی میں پانی کا مسئلہ پیچیدہ تر کہا جا سکتا ہے۔ میاں محبوب نے بتایا کہ اس ملک میں قدرتی طور پر اتنے مختلف اقسام کے نمک پانی میں حل ہوتے ہیں کہ اسے اچھی طرح اُبالے بغیر پیا نہیں جا سکتا۔ میں نے سوال کیا کہ آخر یہاں کے لوگ کیا کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ بیئر پیتے ہیں۔ خالص پانی صرف نہانے اور کپڑے دھونے یا پکانے کے کام آتا ہے۔ البتہ بازار میں منرل واٹر بھی ملتا ہے لیمن اور سوڈے وغیرہ سے مجھے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ ان کے زیادہ استعمال سے آنتوں کو جو نقصان پہنچتا ہے، اسے سلو پوائزننگ کے زمرے میں لایا جا سکتا ہے۔ پھر سوچنے کی بات ہے کہ یہاں ۲۴ اونس کی بوتل ایک رُپیہ بارہ آنے میں ملتی ہے۔ ایک بوتل میں سے بمشکل تین گلاس نکلتے

ہیں۔ میں روزانہ دس بارہ گلاس پینے کا عادی ہوں۔ اب بتائیے کہ اگر نو دس آنے کا ایک گلاس پیا جائے تو گزارا کیونکر ہوگا۔ بجٹ میں اس شق کے لیے اتنی گنجائش کیسے رکھی جاسکتی تھی۔ یہ بات ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ انسان پانی کی مہنگائی سے مجبور ہوکر بیئر پیتا ہے۔ خدا ہمیں اس مجبوری سے بچائے تو اچھا ہے۔ ریستوران میں ہر شخص کے سامنے جھاگ بھرے گلاس لاکر رکھے جارہے تھے اور بڑے چھوٹے، مرد اور عورت سب غٹ غٹ پی رہے تھے۔ بیئر بہر نوع شراب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں کیفیت سُکر کم ہوتی ہے۔ کیونکہ الکحل کا تناسب کم ہوتا ہے لیکن جب اس کا استعمال بے تحاشہ ہوگا اور اسے پانی کی جگہ پیا جائے گا تو مجموعی طور پر اس حصّے کی کل مقدار وہسکی اور جن میں شامل ہونے والے الکحل کی طاقت سے زیادہ ہوجائے گی۔ پھر اس کے علاوہ دوسری قسم کی تیز شرابیں اپنے موقع و محل سے استعمال ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر مغربی دنیا کے باشندوں میں قلب و دماغ کے وہ عارضے عام ہوجائیں جو عہد حاضر کی تہذیب نے پیدا کیے ہیں، تو کسی کو تعجب کیوں ہو۔

**کتابوں کی نمائش۔** ستمبر کا مہینہ فرینکفرٹ میں کتابوں کی نمائش کے لیے مشہور ہے۔ یہ نمائش سال میں ایک بار ہوتی ہے۔ دُنیا کے مختلف ملکوں میں منعقد ہونے والے صنعتی میلوں کی طرح اس نمائش میں بھی بہت سے غیر ملک حصّہ لیتے ہیں اور دیکھا جائے تو جرمنی نے کتابوں کی اشاعت کو ایک خاص صنعت بنا دیا ہے اور اسے تقریباً اتنی ہی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی غیر ملکی تجارت میں کتابوں کو بھی ایک بڑا مقام دیا گیا ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، اور ہسپانوی زبانوں کی طرح جرمن بھی ایک ایسی زبان ہے جو اپنے وطن سے باہر خوب بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے جرمن کتابوں کی مارکیٹ دوسرے ملکوں میں بڑھی ہوئی ہے اور ان کی فروخت سے قومی آمدنی میں خاصہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہم نے پہلے سے فیصلہ کر رکھا تھا کہ کتابوں کی یہ نمائش ضرور دیکھی جائے گی۔ چنانچہ کھانے سے فارغ ہوکر ہم سیدھے اس عظیم الشان عمارت پر پہنچ گئے جس میں نمائش ہو رہی تھی۔

دوسری عالمگیر لڑائی شروع ہونے تک جرمنی میں لیپزگ کتابوں کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز تھا لیکن لڑائی ختم ہونے کے بعد ملک کے حصّے بکھرے ہوئے تو یہ شہر اپنے

جغرافیائی محلِ وقوع کے اعتبار سے مشرقی جرمنی کا حصّہ رہا جس پر روسیوں کو اب بھی اقتدار حاصل ہے۔ تاہم حوصلہ مند جرمن قوم نے فوراً ایک نئی راہِ عمل اختیار کرلی۔ انھوں نے لیپزگ کے بجائے فرینکفرٹ کو کتابوں کی اشاعت کا نیا مرکز بنالیا اور سنا ہے کہ یہ اپنے پیش رو سے ہر لحاظ سے بازی لے گیا ہے۔ یوں بھی لیپزگ کی روایتی شان اس لحاظ سے ختم ہوگئی ہے کہ اب وہاں سے مختلف موضوعات پر کتابوں کی بجائے صرف ایسی کتابیں شائع ہوتی ہیں جن کا مقصد محض اشتراکی نظام کا پرچار ہوتا ہے، ادبی، تاریخی یا فنّی موضوعات کی کتابیں، اگر کسی ناشر نے شائع کیں تو اس کا کاروبار نفع بخش ثابت نہیں ہوا کیونکہ نہ صرف یہ کہ حکومت ایسی کوششوں میں ہمت افزائی سے پہلو تہی کرتی ہے بلکہ راستے میں روڑے اٹکا کر ان کو ناکام بنا دینا چاہتی ہے۔

لڑائی ختم ہوتے ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ فرینکفرٹ میں شروع ہوگیا تھا۔ ان گیارہ سال کی مدّت میں جو ترقی اس نے کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس ترقی کی قابلِ ذکر جھلک ہمیں کتابوں کی نمائش میں نظر آئی۔ عظیم الشان عمارت کے بارہ ہال باعتبارِ موضوعات و نوعیت کتابوں سے سجائے گئے تھے اور نمائش کے علاوہ ان کی فروخت کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ ہم نے کتابوں پر ان کی "زیارت" کرنے کی حد تک ہی نظر ڈالی کیونکہ بیشتر کتابیں جرمن زبان میں تھیں اور ان میں وہ کتابیں بھی شامل تھیں جو دوسرے ملکوں میں چھپی تھیں۔ ہم نے ایسی کتابوں کے حُسنِ اشاعت سے لطف اٹھایا۔ بعض کتابوں کا گیٹ اپ اتنا عمدہ تھا کہ میرے خیال میں ان کی مثال کہیں اور ملنی مشکل ہے۔ انھیں ہر صاحبِ ذوق اپنی نشست گاہ یا کمرۂ مطالعہ کی زینت بنانی چاہتا ہوگا۔ بہت سی کتابیں مصوّر تھیں۔ بیشتر کی جلدیں اتنی اعلیٰ تھیں کہ انھیں چھونے کا خیال کرتے ہی اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں ہاتھوں کا لمس ان کی آب و تاب کو ختم نہ کردے۔ گرد پوش کے علاوہ بعض کتابیں نفیس قسم کے جیکٹوں میں رکھی گئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر میرا ارادہ ہوا کہ اگر میں نے کبھی ہمدرد پبلشنگ ہاؤس قائم کیا تو ہر کتاب عمدہ جیکٹ میں پیش کروں گا تاکہ اشاعتی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ اپنے ملک میں ہو جائے۔ (یہ ارادہ عملی جامہ پہن چکا ہے۔ ہمدرد اکیڈمی کے زیرِ اہتمام پانچ کتابیں اب تک چھپ چکی ہیں جن میں زیرِ ترتیب کتاب یعنی "یورپ نامہ" کی پہلی جلد بھی شامل ہے)

غیر ملکی زبانوں کی مطبوعات کے حصے میں چینی، جاپانی اور کوریائی تک کی نمائندگی حاصل تھی، مگر افسوس ہوا کہ ہمارے ملک کی لاوارث زبان — اُردو — کی مطبوعات کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ جرمنی کی موجودہ حکمراں جماعت کو ہمارے ملک سے جو دلچسپی ہے، اس کے اعتبار سے گمان غالب یہ ہے کہ اردو مطبوعات کی نمائش کے لیے ضرور کوشش کی گئی ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ ہمارے سفارت خانے ہی نے کوئی دلچسپی نہ لی ہو۔ جب اپنے وطن میں اس زبان کی بے قدری ہو رہی ہے تو کسی دوسرے ملک میں اسے اعزاز بخشنے کا خیال کیسے آسکتا ہے۔

سب سے زیادہ زور ایسی مطبوعات پر دیا گیا تھا جو بچوں کے لیے مناسب وموزوں ہو سکتی ہیں۔ جرمنی میں اس وقت چالیس فی صد باشندے دس سال سے کم عمر کے ہیں۔ گویا وہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد کی پیداوار ہیں۔ قومی ترقی کا آئندہ بار چونکہ اس نئی پود کو اٹھانا ہے، اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کے پیشِ نظر ایسی کتابوں کی اشاعت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے جو ان کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔ بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی خاطر جرمن قوم کی عظمتِ رفتہ کو نئے روپ میں پیش کرنے کی اس طرح کوشش کی گئی ہے کہ بچوں کو یہ محسوس نہ ہونے پائے کہ ان کے باپ دادا کو شکست وہزیمت کے ساتھ زوال وانحطاط کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ بچوں کے لیے شائع ہونے والی کتابوں کی قیمت بہت ہی کم رکھی گئی تھی لیکن کم قیمت کے باوجود ان کی زیبائش میں کوئی فرق نہیں تھا۔ بعض کتابیں اس درجہ دیدہ زیب تھیں کہ انھیں بے اختیار خرید لینے کو جی چاہتا تھا۔

معاً مجھے اپنی بیٹی سعدیہ کا خیال آیا اور کہانیوں کی ایک کتاب خرید لی۔ جرمن زبان میں برادرز گرم کی کہانیاں اتنی مشہور ہیں کہ شاید ہی کوئی جرمن بچہ ایسا ہو جس نے خود ان کا مطالعہ نہ کیا ہو یا دوسروں کی زبان سے انھیں نہ سنا ہو۔ انگریزی میں ان حقیقی بھائیوں کی کہانیوں کی متعدد ترجمے ہوئے ہیں اور ہمدرد لائبریری میں ان کے نسخے موجود ہیں لیکن نمائش میں ایک خوب صورت مصوّر ایڈیشن نے مجھے اس درجہ مسحور کیا کہ ایک جلد خریدے بغیر نہ رہ سکا۔ یقیناً یہ تحفے کے طور پر پیش کرنے کے لائق تھی۔ کتاب کا سائز اتنا چھوٹا تھا کہ اگر سوٹ کیس میں تِل دھرنے کی بھی جگہ نہ ہونے کے باعث اس کے لیے گنجائش نہ نکلتی تو اسے بٹوے میں آسانی سے رکھ لیا جاتا۔ یہ بھی اس ایڈیشن کی بڑی خوبی کہی جا سکتی ہے۔

یونانی طب و جراحت کے موضوع پر جو بے شمار کتابیں جرمن زبان میں شائع ہوئی ہیں ان میں سے بعض کے انگریزی ترجمے میں نے اور بھائی جان محترم نے بڑی دلچسپی سے دیکھے لیکن ناشرین کے پتے نوٹ کرنے کے بعد کتابوں کو واپس رکھ دیا گیا۔ اپنی پسند کی ہر چیز کو خرید کر ساتھ لیے رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا اور انھیں خرید کر بھیج دینے کے لیے بجٹ میں گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس لیے بعض اشیاء پر حسرت و یاس کی نظر ڈالنے کے سوا چارۂ کار نہیں تھا۔

اِس ملک میں کتابوں کی اشاعت کا یہ عالم ہے کہ صرف پچھلے سال میں سولہ ہزار نئے نام شاملِ فہرست ہوئے ہیں اور کتابوں کی برآمدی تجارت سے جو زرِ مبادلہ قومی خزانے میں شامل ہوا وہ پانچ کروڑ جرمن مارک کے برابر ہے۔ جرمنی میں شائع ہونے والی سولہ ہزار کتابوں کے مقابلے میں بھارت نے سترہ ہزار، برطانیہ نے انیس ہزار، جاپان نے چوبیس ہزار اور سوویت یونین نے انتیس ہزار نئی کتابیں شائع کیں۔ گویا اس اعتبار سے فہرست میں جرمن کا نمبر پانچواں ہے لیکن سوچا جائے تو یہ تناسب صحیح نہیں ہے۔ بھارت میں بولی جانے والی زبانیں بہت زیادہ ہیں اور بعض کتابیں ملک کے اندر ہی کئی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو گئی ہیں۔ یہی حال روس کا ہے۔ اس کی تمام ریاستوں کی زبانیں الگ الگ ہیں اور جب کوئی چیز ایک زبان میں چھپتی ہے تو دوسری ریاستی زبانوں میں بھی اُن کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔ اِس اعتبار سے ان کی مطبوعات کی زیادہ تعداد قابلِ غور ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں برطانیہ کی زبان یعنی انگریزی بھی اپنے ملک کے باہر بہت سے دوسرے ملکوں میں بولی جاتی ہے بلکہ بعض دیگر مقامات کے باشندوں کے لیے مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لیے اگر اس زبان میں کتابوں کی اشاعت کو فروغ حاصل ہے تو کون سے تعجب کی بات ہے، البتہ جاپان کی صورت مختلف ہے۔ اگر یہ نکتے ذہن میں رکھے جائیں تو فہرست میں جرمنی کا نام دوسرے نمبر پر آ جائے گا۔

جرمنی میں اس وقت اشاعت کے دو ہزار سے زیادہ مرکز قائم ہیں۔ ان میں سے چالیس فی صد صرف مغربی برلن، میونک، اسٹٹ گارٹ، ہیمبرگ اور فرینکفرٹ میں ہیں۔ اچھے کتب فروشوں کی تعداد چار ہزار کے لگ بھگ ہے جو ملک کے نو سو سے زیادہ علاقوں میں کتابوں کی تجارت کرتے ہیں۔ ان کی تنظیم بہت اعلا ہے۔ وہ تجارتِ کتب کی ایک انجمن کے رکن ہیں جس کا صدر فرینکفرٹ میں گوئٹے ہاؤس کے قریب واقع

ہے۔ اسی انجمن کے زیر اہتمام ہر سال کتابوں کی نمائش عمل میں آتی ہے۔

یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ دنیا بھر کے ایک ہزار چھ سو کے قریب ناشرین کتب نے اس نمائش میں حصہ لیا، جن میں سے ایک ہزار غیر ملکی ادارے ہیں۔ نمائش کی جانے والی کتابوں کے نام ستر ہزار سے زیادہ ہیں۔ انھی میں سے بعض فروخت کے لیے رکھی گئی ہیں۔

یہ نمائش اس مہینے کے آخر تک جاری رہے گی۔ نمائش کی مجلس انتظامیہ کے فیصلۂ انتخاب کے بموجب آخری دن چار انعامات تقسیم کیے جائیں گے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم امن کا انعام ہوتا ہے جو ایسے مصنف کو ملتا ہے جس نے اپنی تحریر میں امن پسندی کے خیالات و عقائد کی ترویج بہترین پیرائے میں کی ہو۔ انعام پانے والوں کے لیے جرمن نژاد ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ پچھلے دس سال میں کئی انعامات باہر کے مصنفین کو ملے ہیں۔ کوئی دو سال ہوئے، امن کا انعام جرمنی کے صدر نے حاصل کیا تھا۔

کتابوں کی اشاعت کا بڑا مرکز ہونے کے باعث ایک فائدہ اس شہر کو یہ پہنچا ہے کہ یہاں کی پبلک لائبریری میں کتابوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو گئی ہے۔ بہت سے ملک نمائش ختم ہونے کے بعد اپنی کتابیں واپس لے جانے کی بجائے لائبریری کو دے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں خصوصاً شہر کراچی میں کسی اچھی لائبریری کا نہ ہونا افسوسناک امر ہے۔ اگر کوئی علمی، ادبی انجمن جرمنی کی طرح کتابوں کی نمائش کا اہتمام کرنے لگے تو نتائج بہت خوش گوار ہو سکتے ہیں۔

**گوئٹے کا مکان** ۔ کتابوں کی نمائش والی عمارت کے قریب ہی گوئٹے کا وہ مکان واقع ہے جہاں وہ پیدا ہوا تھا، جہاں اس نے اپنی ابتدائی زندگی کا ایک دور گزارا تھا اور جسے اس کی وفات کے بہت عرصے بعد قومی یادگار بنا دیا گیا۔ ہم نے سوچا کہ فرینکفرٹ میں ہمارا قیام مختصر ہے۔ شاید پھر اس طرف آنا ممکن نہ ہو۔ موقع کو غنیمت جان کر یہ یادگار بھی دیکھ لی جائے تو اچھا ہے۔

جرمنی کے ہر بڑے شہر میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد نئی تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا تو ماہرینِ فن نے عمارتوں کے نئے نئے ڈیزائن تیار کیے اور بہت سے شہروں کو جو لڑائی کے دوران میں بالکل تباہ ہو گئے تھے، جدید وضع پر بنانا سنوارنا شروع کر دیا چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۵ء کے بعد سے جرمنی کے فنِ تعمیرات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا

ہے۔ بہت سی پرانی عمارتوں نے نئے چولے بدلے ہیں اور بعض بالکل نئی بنیادوں پر تعمیر ہوئی ہیں لیکن گوئٹے کا مکان چونکہ ایک قدیم یادگار عمارت تھی، اس لیے قدرتی طور پر اسے کوئی نئی وضع دینے کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ آس پاس کی عمارتوں کی طرح اس مکان کا بھی بیشتر حصہ دوسری جنگِ عظیم میں مسمار ہو گیا تھا لیکن اس کی تصویروں اور نقشوں کی مدد سے اس کی پرانی وضع قطع اور شان کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی مکرر تعمیر عمل میں آئی۔ حتیٰ کہ بہت سا مسالہ تعمیر بھی مثلاً لوہے کے کٹہرے، چھت میں لگی ہوئی لکڑی کی کڑیاں اور اندر جانے کا صدر دروازہ بجنسہٖ استعمال کیا گیا ہے۔ گویا اس کے سابقہ نقشے سے اس حد تک مماثلت پیدا کی گئی ہے کہ اگر آج گوئٹے زندہ ہو کر آ جائے تو وہ یہ باور نہیں کر سکے گا کہ میرا یہ مکان کبھی بم کے گولوں سے بری طرح مسمار ہوا تھا۔ جرمنوں کا یہ کردار کہ وہ اپنی روایات کے کس درجے پرستار ہوتے ہیں، اس مکان پر سرسری نظر ڈالتے ہی مان لینا پڑتا ہے۔

گوئٹے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اس کا مکان اس زمانے کی روش کے مطابق تعمیر ہوا تھا۔ اس کی زیارت کرتے وقت ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اُس زمانے کا سامانِ آرائش بھی ایسا ہوتا تھا جو اس ترقی یافتہ زمانے میں معمولی بلکہ کسی حد تک مضحکہ خیز کہا جا سکتا ہے، خصوصاً فرنیچر کو دقیانوسی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ڈیڑھ سو سال پہلے کی عینک لگا کر اسے دیکھا جائے تو یہ رائے قائم نہیں ہو سکے گی۔ یادگار قائم کرنے والوں کا یہ التزام لائقِ ستائش ہے کہ انھوں نے گوئٹے کے استعمال کی سب چیزیں، اس کی نگارشات کے بہت سے مسودے، مختلف اوقات میں بنی ہوئی اس کی تصویریں، اس کے ذوق کی ترجمانی کرنے والی کتابیں اور تصویریں جنھیں وہ اپنے کمرۂ مطالعہ میں اور اپنی خواب گاہ میں رکھتا تھا، اچھی طرح محفوظ کر دی تھیں۔ پھر وہ دُور اندیش لوگ بھی قابلِ تعریف ہیں جنھوں نے لڑائی کی تباہ کاریوں کا اندازہ لگا کر اس زیارت گاہ کا سارا سامان برا وقت آنے سے پہلے دوسرے زیادہ محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں سے لڑائی ختم ہونے اور عمارت دوبارہ تعمیر ہو جانے کے بعد واپس لا کر اس طرح سجا دیا گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ بڑی قوموں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ جب ملتیں اپنی بزرگ ہستیوں کے احترام کا جذبہ ترک کر دیں تو وہ خود بھی فنا ہو جاتی ہیں اور اگر کوئی حادثہ رونما ہو تو اس کے بعد پنپ نہیں سکتیں۔ دوسری عالمگیر لڑائی میں جرمنی کو جو زبردست دھکا لگا اُس

کی شدت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد بہت جلد اس کا سنبھل کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جانا اِس حقیقت کا ثبوت ہے کہ جرمن قوم واقعی ایک بڑی قوم ہے۔

گوئٹے ہاؤس میں خالقِ فاؤسٹ کے استعمال کی چیزیں دیکھ کر صرف اسی ہستی سے اپنی عقیدت کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اٹھارھویں صدی کے وسط اور انیسویں صدی کے شروع کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا ایک روشن مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس مطالعی اعتبار سے بھی یہ یادگار اور اس کا سارا سامان ان آثارِ قدیمہ کی صف میں آسکتا ہے جن کی پیشانی پر حروف و الفاظ کی بندشوں سے بے نیاز پوری قوم کی تاریخ ثبت ہوتی ہے۔

ہم نے گوئٹے کے مکان میں سقف و بام و در کا ایک ایک حصہ اور گوشہ اور وہاں رکھی ہوئی ہر چیز کو جس عقیدت اور عمیق النظری کے ساتھ دیکھا، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے تاثرات کو مختصراً سطور بالا میں قلمبند کرنے کے بعد قارئین کو اس کی جھلک ذرا تفصیل کے ساتھ اس طرح دکھائیں گویا وہ ہمارے دوش بدوش چل کر خود اس کی زیارت کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں مکان کے تاریخی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا۔

۱۷۳۳ء میں گوئٹے کی دادی کورنیلیا گوئٹے نے جو ایک مالک سرائے فریڈرک گیورک گوئٹے کی بیوہ تھی، اپنے اور اپنے بیٹے یوحان کاسپر کے لیے گوتھک وضع کے دو مکان خریدے جو گروسر ہرش گرابن میں واقع تھے اور ۱۵۹۰ء میں تعمیر ہوئے تھے۔ ان میں سے بڑے مکان میں یوحان وولف گانگ گوئٹے ۲۸ راگست ۱۷۴۹ء کو پیدا ہوا۔ وہ ابھی پانچ سال کا تھا کہ اس کے باپ نے دونوں مکانوں کو ملا کر ایک کر لیا۔ اس وقت تعمیر کے اعتبار سے جو تبدیلیاں ہوئیں گوئٹے نے ان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ وہیں اس کا بچپن اور عہد جوانی بھی گزرا۔ ۱۷۹۵ء میں وہ وائمار میں قیام پذیر ہو گیا اور اس کے بھی بیس سال بعد مکان فروخت کر دیا گیا لیکن ۱۸۶۳ء میں ایک ادبی انجمن نے اسے خرید کر قوم کے نام وقف کر دیا تاکہ وہ گوئٹے کے پرستاروں کے لیے زیارت گاہ بن جائے۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۴ء کی بمباری نے اسے بالکل مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا۔ اس کے ساتھ شہر فرینکفرٹ کا وہ پرانا حصہ بھی برباد ہو گیا جہاں گوئٹے نے اپنی جوانی کھوئی تھی۔ تاہم لڑائی ختم ہونے کے بعد جہاں اور تعمیری کام عمل میں آئے، گوئٹے کا مکان بھی پرانی طرز پر تعمیر کیا گیا، یہاں تک کہ منزلِ زیریں تو ہو بہو مطابق اصل ہے۔ اس کی تعمیر میں ساحلِ ماین

کے قریب سے نکالے ہوئے سنگِ سُرخ کی بہت سی سلیں اگرچہ شکستہ ہوگئی تھیں، پھر بھی انھیں کام میں لے آیا گیا۔ کھڑکیوں میں لگی ہوئی بعض جالیاں بھی پُرانی ہیں حتیٰ کہ ڈیوڑھی میں لگے ہوئے ایک لیمپ کی چمنی پر گوئٹے کے والد کے دستخط موجود ہیں۔ لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ مکرر تعمیر کے وقت پرانی وضع قطع کو برقرار رکھا گیا۔ گویا اب اس کی حالت وہی ہے جو گوئٹے کے عہد طفولیت میں تھی۔ اس وقت چونکہ کھڑکیوں میں پردے لٹکانے کا رواج نہیں تھا بلکہ ایک طرف سے دوسری طرف کھینچ جانے والے کپڑے لگائے جاتے تھے، لہٰذا اب بھی کھڑکیاں اس ایک ضروری جدید سامانِ آرائش سے محروم ہیں۔

منزلِ زیریں کی ایک کھڑکی کے قریب رکھی ہوئی میز پر آپ کو لیس ٹنکی ہوئی ایک گدّی نظر آئے گی جسے گوئٹے کی ماں اپنی گود میں رکھ کر سینے پرونے کا کام کرتی تھی۔ اونچی پشت والی ایک بھاری بھرکم کرسی بھی ملے گی جو اس کی دادی کو جہیز میں ملی تھی۔ اسی کمرے کے سامانِ آرائش میں ایک ولندیزی آئینہ بھی ہے جو سترھویں صدی میں تیار ہوا تھا۔ اسی صدی کا ایک چولھا ہے جس کا پیندا ڈھلے ہوئے لوہے کی بھاری چادر کا ہے۔ اس پر کسی تقریب شادی کا ایک منظر نقش ہے، اور ایک عبارت کندہ ہے جو بمشکل سے پڑھی جاتی ہے آتش داں کے قریب دیوار کے ٹائلوں پر ساڑھے چھ فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ بمباری کے دوران میں اس کے سات ٹکڑے ہو گئے تھے اور رنگت بھی دھوئیں کے باعث بدل گئی تھی۔ اس میں عمدہ پالش کی ہوئی لکڑی کی ایک گول میز بھی ہے جو اٹھارھویں صدی کے شروع میں بنائی گئی تھی۔ نیچے کے وسیع ہال میں ایک گھنٹہ لٹک رہا ہے جس پر "ٱندریاس گوئٹے،، کے دستخط ہیں۔ یہ گوئٹے کے والد کا چچا زاد بھائی اور فرینکفرٹ کا ایک مشہور گھڑی ساز تھا۔

باورچی خانے میں جا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کسی باقاعدہ رہائشی مکان کا حصہ ہے کیونکہ میز پر، ایک چھوٹی سی الماری میں اور مچان پر سبھی قسم کے برتن موجود ہیں اور کیک بنانے کا ایک سانچہ بھی رکھا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس باورچی خانے میں استعمال ہونے والا چولھا اور وہ ہودی بھی جس میں برتن دھوئے جاتے تھے، لڑائی کی تباہ کاریوں سے بالکل بچی رہی۔ ان دونوں چیزوں کو ملبے کے نیچے سے کافی تلاش کے بعد نکالا گیا تھا۔ پانی کے نل کا آہنی دستہ بھی، جس پر پھول بنے ہوئے تھے، اسی ملبے میں سے برآمد ہوا

تھا۔ نیچے تہ خانے میں ایک کنواں تھا جس کے اندر سے اب بھی پینے کا صاف پانی نکالا جا سکتا ہے۔ تہ خانے کے دروازے کی محراب پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس پر گوئٹے کے باپ نے بطور یادگار اپنے بیٹے کے نام کے حروف (جے، ڈبلیو، جی) اور ۱۷۵۵ء کندہ کر دیا تھا۔

منزل زیریں سے پہلی منزل پر جانے کا زینہ اپنی سیڑھیوں سمیت بالکل ابتدائی حالت کا ہے۔ اس کا آہنی کٹہرا عمارت منہدم ہونے پر تڑ مڑ کر بل کھا گیا تھا۔ ملبے کے نیچے سے اسے بھی نکال کر سیدھا کر لیا گیا۔ زینے کی چند سیڑھیاں ختم ہونے کے بعد جب اس کی چڑھائی میں موڑ پیدا ہوتا ہے تو سامنے کی دیوار پر دو تصویریں نظر آتی ہیں جنھیں گوئٹے کا باپ ۱۷۴۰ء میں یعنی گوئٹے کی پیدائش سے قبل اٹلی کی سیاحت کے وقت خرید کر لایا تھا۔ ان میں سے ایک تصویر میں پاپائے روم کو شہر سان اینجلو میں داخل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

پہلی منزل کے چند کمرے مہمانوں کے لیے استعمال ہوتے تھے اور ایک بار ۱۷۷۹ء ایرڈیوک کارل آگسٹ نے بھی ان میں قیام کیا تھا۔ ایک درمیانی کمرے کا نام گوئٹے کے خاندان والوں نے "پیکنگ" رکھا تھا۔ اس نام کی رعایت سے اس کی دیواریں چینی طرز پر پھولدار کاغذ سے منڈھی گئی تھیں۔ یہ طرزِ آرائش ہنوز برقرار ہے۔ اسی کمرے کا اور بھی سامان آرائش یعنی بازو والی کرسیاں دیوار پر لگا ہوا قدِ آدم شیشہ اور بعض تصاویر پرانی ہیں۔ چھت پر جو بیل بوٹے اس وقت بنے ہوئے تھے، دوبارہ تیار کر لیے گئے ہیں۔ دیواروں پر تصویریں لٹکانے کے لیے کیلیں جتنے فاصلے پر ٹھونکی گئی تھیں، اس کا خیال اب بھی رکھا گیا ہے تاکہ ہر چیز ہر لحاظ سے مطابق اصل نظر آئے۔ دروازوں اور کھڑکیوں میں کنڈے، چھپکے اور دستے اسی وضع کے بنا کر لگائے گئے ہیں جو سترھویں صدی میں مقبولِ عام تھے۔

پہلی منزل کے ایک شمالی کمرے میں جو غالباً خاندان کی بزرگ ہستیوں کے لیے استعمال ہوتا ہوگا، گوئٹے کے آباواجداد کی تصویریں آویزاں ہیں۔ جنوبی کمرے میں گوئٹے کے چند دوستوں کی تصویریں لگی ہوئی ہیں جہاں وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر دل بہلاتا اور تبادلۂ خیالات کرتا تھا۔ موسیقی والے کمرے میں پرانے زمانے کے ساز رکھے ہیں جن میں سے بعض اب استعمال بھی نہیں ہو سکتے۔ مثلاً وہ پیانو ہے جس پر اس کی ماں اطالوی زبان کے استاد گیوونازی کے ساتھ مل کر نغمے الاپتی تھی۔ یہاں ایک رباب کے نیچے لگی ہوئی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ گوئٹے کا باپ اس کے تاروں کو درست کرنے میں گانے سے بھی

زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔ اسی جگہ گوئٹے کی بہن موسیقی کی تربیت حاصل کرتی اور اسے اپنے لیے ایک مصیبت سمجھتی تھی کیونکہ اسے فطرتاً موسیقی سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ خود گوئٹے نے بھی اسی کمرے میں کئی ساز بجانے سیکھے تھے۔ پیانو پر جو تصویر فریم میں رکھی ہے، وہ مشہور مصور ہیکرٹ نے بنائی تھی۔ اسی سے گوئٹے نے فنِ مصوری سیکھا تھا۔ اس کمرے میں سب سے زیادہ تصویریں آویزاں ہیں جن میں ڈارمشٹاٹ کے ایک درباری مصور سید کاٹز کا شاہکار بھی شامل ہے۔ اسے گوئٹے کی شاعری اور گوئٹے کو اس کی مصوری بے حد پسند تھی۔ یہاں خاندان کے افراد کا ایک گروپ فوٹو لگا ہوا ہے جو ۱۷۶۲ء میں تیار کیا گیا تھا۔ اس وقت گوئٹے کی عمر ۱۳ اور اس کی بہن کورنیلیا کی عمر ۱۲ سال تھی۔ اس تصویر کے پس منظر میں ایک شکستہ حال عمارت اور چراگاہ ہے جس میں بھیڑیں چر رہی ہیں۔ پس منظر کے بالائی حصے میں خاندان کے ان بچوں کو جو کم سنی میں فوت ہو گئے تھے، فرشتوں کی طرح فضا میں اڑتا دکھایا گیا ہے۔

دوسری منزل پر لائبریری اور پکچر گیلری کے علاوہ گوئٹے کی ایک محبوبہ کے رہنے کے کمرے تھے اور لائبریری میں پرانی کتابوں کے علاوہ، جن کا مطالعہ گوئٹے نے کیا تھا جو اسے پسند تھیں، ایک الماری نئی کتابوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ گوئٹے کی داستانِ حیات اور اس کی نگارشات سے متعلق کتابیں ہیں۔ اس مختصر سی لائبریری میں صرف ادبی کتابیں ہی شامل نہیں ہیں بلکہ بعض سرکاری دستاویزات کی نقلیں بھی ہیں۔ مثلاً وہ قانونی فیصلے جو شہر فرینکفرٹ میں ۱۵۳۴ء سے ۱۷۷۹ء تک عدالتوں میں ہوئے، کتابی صورت میں جمع ہیں۔ گوئٹے کی دادی کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک قلمی کتاب میں بعض کھانے پکانے کے نسخے اور ترکیبیں درج ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بڑی بی کو لذتِ کام و دہن حاصل کرنے کا کتنا شوق تھا۔ لائبریری میں ایک دل چسپ کتاب "فریب کاریوں کا لغت" مطبوعہ ۱۷۶۱ء ہے جسے گوئٹے کے باپ نے ایک کرایہ دار پر مقدمہ چلاتے وقت عدالت میں بطور حوالہ پیش کرنے کے لیے خریدا تھا۔ اس میں تقریباً سبھی پیشوں سے متعلق پانچ ہزار سے زیادہ فریبوں اور جعلسازیوں کا ذکر ہے۔ ہر شق کے بعد مشورہ دیا گیا ہے کہ اس فریب کو کس طرح باطل کیا جائے۔ یہاں وہ سب کتابیں بھی موجود ہیں جن کے بارے میں خود گوئٹے نے اعتراف کیا ہے کہ ان کے مطالعہ سے میری معلومات میں اضافہ اور میرے خیالات

میں رفعت پیدا ہوتی ہے۔ انھی کو پڑھ کر میں نے زندگی کی حقیقت اور اس کے پیچیدہ راز معلوم کر لیے ہیں۔

تصاویر والے کمرے میں جرمن اور اطالوی مصوروں کے شاہکار دیواروں پر سلیقے سے سجائے گئے ہیں۔ ان سب کے چوکٹے سیاہ لکڑی کے ہیں اور ان پر گلٹ کے منقش حاشیے چڑھائے ہوئے ہیں۔ ایک تصویر جس میں سنٹ لیونہارڈ کے گرجا گھر کا اندرونی منظر دکھایا گیا ہے مورگنسٹرن کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے۔ گوئٹے نے اپنی خودنوشتہ سوانح عمری میں اسے ر خاندانی مصور لکھا ہے کیونکہ باپ، بیٹے اور بیٹی نے بیک وقت اس سے یہ فن لطیف سیکھنا شروع کیا تھا۔ مورگنسٹرن کی تصویر کے دائیں جانب ایک اور مصور جسٹس ہنکر کی بنائی ہوئی اپنی شبیہ آویزاں ہے۔ ادھیڑ عمر کا یہ مصور ایزل کے سامنے کھڑا اپنے شاہکار کو دیکھ رہا ہے۔ اس کے منہ میں ولندیزی انداز کا پائپ لگا ہوا ہے اور سامنے چھوٹی سی میز پر جام شراب رکھا ہے۔ مخالف سمت کی دیوار پر گھنٹے کے نیچے سیکاٹز اور اس کی بیوی کی تیار کردہ اپنی تصویر لگی ہے۔ یہ مصور گوئٹے کے باپ کا گہرا دوست تھا۔ اور گوئٹے کے ساتھ پدرانہ شفقت سے پیش آتا تھا۔ اس کمرے کی چھوٹی بڑی سب تصویروں کی تعداد چھیالیس ہے۔ مذہبی روایات کی ترجمانی صرف ٹراؤٹمین کی تصاویر میں پائی جاتی ہے۔ یہ علاقہ سار کا رہنے والا اور رومن کیتھولک عقیدے کا حامل تھا۔ بعض تصاویر کے ساتھ وہ قیمتیں بھی درج ہیں جن کے عوض گوئٹے یا اس کے باپ نے انھیں خریدا تھا۔

وہ کمرہ جس میں گوئٹے کی پیدائش عمل میں آئی تھی، بہت ہی سیدھا سادا ہے اور جب ۲۶ مارچ ۱۸۳۲ء کو اس کا انتقال ہوا تو نعش بھی آخری دیدار سے قبل کچھ دیر تک اسی جگہ رکھی گئی تھی۔ یہاں کاپی کا ایک صفحہ شیشے کے کیس میں بہت اہتمام سے رکھا گیا ہے۔ یہ اس وقت کا ہے جب کہ آٹھ سال کی عمر میں گوئٹے نے لاطینی زبان لکھنے کی مشق شروع کی تھی۔ دو کھڑکیوں کے درمیانی حصہ دیوار پر ایک اعلان کا تراشہ خوب صورت فریم میں لٹک رہا ہے۔ ۲ ستمبر ۱۷۴۹ء کو منگل کے دن گوئٹے کی رسم بپتسمہ ادا ہوئی تھی اور اس کا اعلان فرینکفرٹ سے شائع ہونے والے اخبار ”ویکلی نیوز“ میں ہوا تھا۔ اسی جگہ اس جرمن شاعر کی مشق سخن کا اولین نمونہ بھی محفوظ ہے جو لاطینی الفاظ میں ہے۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سال تھی۔ اس نے یہ نظم اپنے ایک دوست کے البم میں اس کی سالگرہ کے موقع پر لکھی

تھی جس کا صفحہ پھاڑ کر مقتنیات میں شامل کر لیا گیا۔

برابر کا ایک چھوٹا سا کمرہ گوئٹے کی بہن کورنیلیا کے لیے مخصوص تھا، جہاں اس سے متعلق یا اس کی پسند کی چیزیں رکھی ہیں۔ مثلاً اس کی شادی کے معاہدے کا مسودہ بھی اس کی یادگار اشیا میں شامل ہے جس پر دلہن کی حیثیت سے خود اس کے اور اس کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کے دستخط دائیں طرف اور اس کے دولہا اور اس کے رشتہ داروں کے دستخط بائیں طرف ثبت ہیں، اور دستخطوں کے ساتھ سب کے ناموں کی مہریں بھی لگی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور دستاویز ہے جس پر کورنیلیا کے مرنے کی تاریخ (۸ رمئی ۱۷۷۷ء کو بعمر ۲۶ سال ۸ ماہ) تجہیز و تکفین کی تفصیل اور قبرستان کا نام درج ہے۔

تیسری منزل پر سب سے زیادہ قابلِ دید دو صندوق ہیں۔ ایک اخروٹ کی لکڑی کا اور دوسرا شاہ بلوط کی لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک سونے چاندی کے زیورات، جواہرات، نقدی اور اہم دستاویزات محفوظ رکھنے کے کام آتا تھا اور دوسرے میں آگ بجھانے کا ضروری سامان بھرا رہتا تھا۔ ان صندوقوں کے ڈھکنے نہیں ہیں۔ نہ ان کو اوپر سے کھولا جا سکتا ہے بلکہ دائیں بائیں کھلنے والی درازیں ان میں لگی ہوئی ہیں۔ ان میں دونوں طرف دستے بھی جڑے گئے ہیں، تاکہ پکڑ کر آسانی سے اٹھا لیا جائے۔ ایک دم دیکھنے سے کسی بھی دراز کا نشان نظر نہیں آتا۔ یعنی کوئی انجان دیکھے تو اس کی سمجھ ہی میں نہ آئے کہ انھیں کیونکر کھولا جا سکتا ہے۔

اسی تیسری منزل پر ایک علیحدہ کمرہ گوئٹے کا ذاتی کمرہ کہلاتا تھا۔ یہاں اس کی بالکل نجی زندگی سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی نمائش کی گئی ہے جن میں اس کی تصانیف کے مسودے، پرائیویٹ خطوط اور تصاویر شامل ہیں۔ ایک تصویر میں گوئٹے کی المناک موت کا منظر ہے جو ایک طالب علم نے تیار کر کے اپنے البم میں رکھ لیا تھا اور بعد میں اس "عجائب گھر" کو مل گیا۔ ایک مصدقہ بیان کے مطابق گوئٹے کے لکھنے کی میز بہت ہی پرانی اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اس کی دادی یعنی مالک سرائے کی بیوہ کورنیلیا گوئٹے نے خریدی تھی۔ ۱۷۵۴ء میں اس کے انتقال کے بعد وہ گوئٹے کے والد کو ملی اور آخر میں خود گوئٹے کی تحویل میں آ گئی۔ میز کے قریب ہی کٹھ پتلیوں کی تماشہ گاہ

ہے جس کا کچھ حصّہ باقی رہ گیا ہے۔ گوئٹے نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ یہ میری دادی نے اپنی زندگی کے آخری سال میں میری سالگرہ کے موقع پر بنواکر مجھے تحفۃً دیا تھا۔ اس کا ذکر گوئٹے کی ایک اور تصنیف "ولہلم میسٹر" میں بھی آیا ہے۔ اسے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ بوڑھے لنگڑے بت تراش مرکس نے پتلیوں کے ہاتھ پاؤں اور چہرے تیار کیے تھے۔ گوئٹے کے باپ کی ایک نوٹ بک سے، جس میں اہم باتیں درج کی جاتی تھیں، پتہ چلتا ہے کہ اس تھیٹر پر چار فلورن خرچ ہوئے تھے۔ اسی کمرے میں بعض تصویریں بھی آویزاں ہیں جو گوئٹے کو بہت پسند تھیں۔ مثلاً ایک مذہبی انداز کی تصویر میں رات کی تاریکی کا منظر بہت ہی دلفریب ہے جس میں دو نورانی شعاعیں اپنا رنگ جما رہی ہیں۔ ایک نور موم بتی سے پیدا ہو رہا ہے جیسے ایک حسین لڑکی حضرت مریمؑ کے روپ میں لیے کھڑی ہے۔ دوسرے نور کا منبع نامعلوم ہے۔ وہ سماوی نور کے انداز میں پھیل رہا ہے۔

یہاں گوئٹے کے ایک ناول "نوجوان ورتھر کی داستانِ غم" کی ترجمانی کرنے والے بعض مناظر بھی عمدہ رنگوں میں موجود ہیں۔ ایک اور تصویر میں شاہ جوزف دوم کی تقریب تاجپوشی کا منظر پیش کیا گیا ہے جس کا نقشہ بڑی تفصیل کے ساتھ گوئٹے نے اپنی سوانح حیات کے پانچویں باب میں کھینچا ہے۔

تین کمرے جو غالباً گھر کے ملازمین کے لیے مخصوص ہوں گے، عجائب گھر بن گئے ہیں۔ انھی میں سے ایک میں فاوسٹ کی روایتی کہانی کا تدریجی ارتقاء دکھایا گیا ہے۔ سب سے پہلے ۱۵۲۰ء میں فاوسٹ ایک حقیقی انسان کے روپ میں نظر آتا ہے۔ پھر وہ ایک فرضی کردار کا روپ دھار لیتا ہے۔ نثر میں لکھی جانے والی بہت سی کہانیوں کے بعد مارلو کے ڈرامے کے مناظر آتے ہیں اور آخر میں گوئٹے کا شاہکار اپنا سکّہ جماتا ہے جس کے بارہ رنگین مرقعے موجود ہیں۔ انھیں مشہور مصور ریٹزش نے ۱۸۱۶ء میں تیار کیا تھا۔ ایک منظر میں دکھایا گیا ہے کہ انیسویں صدی میں فاوسٹ کس طرح اسٹیج پر لایا گیا۔ چند تصویریں ایسی بھی ہیں جو گوئٹے کی لڑکی نے بنائی تھیں اور باپ نے انھیں بہت پسند کیا تھا۔

گوئٹے کی زندگی ہی میں یہ مکان ادیبوں اور شاعروں کے اجتماع کا مرکز بن گیا تھا۔ فرینکفرٹ کے تو تقریباً سبھی معروف ادیب وہاں جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔

مکان کے باغیچے میں لیموں کا ایک درخت ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خود

گوئٹے نے اپنی ایک سالگرہ کے موقع پر ۱۸۲۵ء میں لگایا تھا۔ باغیچے کا فوارہ بھی اسی زمانے کا ہے۔

**فقیر۔** اس یادگار عمارت سے باہر نکل کر اپنے ہوٹل جانے کے لیے ہم کسی چلتی پھرتی ٹیکسی کے انتظار میں سڑک پر خراماں خراماں چل رہے تھے کہ ایک لمبا تڑنگا مگر نحیف الجثہ شخص جس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں اور جو سیاہ پتلون اور سفید قمیص میں ملبوس تھا، ہمارے قریب آیا اور ہاتھ پھیلا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ ہم اس کا منشا تو فوراً سمجھ گئے کیونکہ اپنے ملک میں بھی ایسے لوگوں سے واسطہ پڑنا کبھی تعجب خیز نہیں ہوتا جہاں سرکاری احکامات اور ہدایات کے باوجود بھیک مانگنے کے رواج کا انسداد بظاہر ممکن نظر نہیں آتا لیکن یورپ کے ایک ملک اور وہ بھی شارلیمین سے قیصر ولیم تک اور ہٹلر سے امریکی ایجنٹوں تک بہت سے حکمرانوں کے ملک جرمنی میں ایک فقیر کو دیکھ کر ہمیں تعجب ضرور ہوا۔ قدرتی طور پر جرمنی کے عروج و زوال اور پھر سنبھالا لینے کے متضاد مناظر ہلکی سی جھلک دکھاتے ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ فقیر نے زبان سے کوئی لفظ ادا نہیں کیا۔ وہ کہتا بھی کیا جب کہ اس کی صورت سوال بنی ہوئی تھی اور اگر کہتا تو ہم کیا سمجھتے سوائے میاں محبوب کے جو جرمنی میں رہتے رہتے وہاں دی جانے والی گالیوں سے لے کر دعاؤں تک جن میں فقیروں کی صدائیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں، سب کچھ سیکھ گئے ہیں۔

میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ اس شخص کی کچھ مدد کی جائے یا نہیں۔ اپنے وطن میں سڑک پر پیدل چلنے کا بہت کم موقع ملتا ہے اور اسی لیے فقیروں سے زیادہ مڈبھیڑ نہیں ہوتی لیکن اگر گھر، مطب یا دواخانے میں آتے جاتے عین دروازے کے قریب کوئی بھک منگا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے تو میں اس کے چہرے مہرے اور حلیے پر نظر ڈال کر یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ شخص امداد کا مستحق ہے یا نہیں۔ اگر ہر شخص اپنے دل میں اس پہلو پر غور کر لیا کرے اور آنکھیں بند کر کے بھیک دینا ترک کر دے تو گداگری کا پیشہ برائے نام رہ جائے اور شاید بعض زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کی طرح حکومت باقی ماندہ حقیقی معذور لوگوں کی دست گیری کر کے معاشرے کی اس زندہ لاش کے ناسور کو ہمیشہ کے لیے دور بھی کر دے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اگر ہر "مانگنے والے" کو "نئی دنیا" نہیں تو بھیک ضرور مل جاتی ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ جرمن نژاد فقیر امداد کا مستحق نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے میاں

محبوب سے کہا کہ اس کا حال پوچھ کر معلوم کیجیے کہ اس پر کیا آفت آپڑی ہے کہ یہ ہٹلر کی سرزمین پر کھڑے ہو کر بھیک مانگ رہا ہے۔ کیا امریکا کے نام نہاد "امداد رسانوں" نے اس کے لیے روزگار، وسیلۂ معاش یا وثیقے کا اہتمام نہیں کیا ہے؟ کیا اخباروں میں جو یہ خبریں شائع ہوتی رہی ہیں کہ شمالی امریکہ کے اُن داتاؤں نے جرمنی کی اقتصادی حالت بحال کر دی ہے اور اب وہاں کوئی مفلوک الحال ہستی باقی نہیں ہے، بہت سے اور دعووں کی طرح محض باطل اور بے بنیاد ہیں۔

میاں محبوب نے جرمن زبان میں چند سوالات اس شخص سے کیے تو اس کا چہرا حزن و ملال کا مظہر بن گیا۔ اس نے پتلون کی جیب میں سے چند کاغذات نکال کر دکھائے جن کے مطالعہ سے برادرِ عزیز نے معلوم کیا کہ وہ شخص برابر ملازمت کے لیے درخواستیں دیتا رہا ہے اور کوئی روزگار اسے اب تک نہیں مل سکا ہے۔ اس نے حال ہی میں شائع ہونے والے کسی اخبار کا ایک تراشہ بھی دکھایا جس میں ملک کے اندر پھیلی ہوئی بے روزگاری کا نقشہ کھینچ کر سرکاری اعداد و شمار درج کیے گئے تھے اور ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ زبردست بحالیاتی کارگزاریوں کے باوجود وہاں ہزاروں افراد معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ حکومت نے بے روزگار لوگوں کو یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح گزارہ الاؤنس دینے کا تہیہ کر لیا ہے اور اس ضمن میں ایک مسودۂ قانون پارلیمان میں عنقریب پیش ہونے والا ہے۔

لیکن فی الحال بے روزگاری کا مسئلہ پریشان کن ضرور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے لیکن چونکہ ان میں اکثریت تارکانِ وطن کی ہے یعنی اُن لوگوں کی ہے جو مشرقی جرمنی میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر مغربی جرمنی میں آگئے ہیں، اس لیے عوام کی زیادہ ہمدردی ان کے ساتھ نہیں ہے۔ ایک ہی قوم اور ایک ہی نسل کے افراد ہونے کے باوجود موجودہ زمانے کی سیاست نے ان کے مابین اس قدر مغائرت پیدا کر دی ہے کہ مشرقی سرحد کے پرے سے آنے والوں کو عام طور پر غیر سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ جرمنی میں اطالوی، سوئٹسانی اور آسٹریائی خاصی تعداد میں اور کچھ یونانی بھی موجود ہیں۔ علاوہ ازیں حکومت کی باگ ڈور مقامی باشندوں کو تھما دینے کے بعد بہت سے امریکن بھی قیام پذیر ہیں لیکن ان سے کوئی بے اعتنائی نہیں برتی جاتی۔ سوویت بلاک سے جو لوگ اس حصۂ جرمنی میں داخل ہوئے ہیں، ان کو زیادہ تر سرحد کے قریب ہی بسایا گیا ہے۔ اگرچہ ہزار میل سے زیادہ لمبی

اس سرحد کو کانٹے دار تار لگا کر اچھی طرح بند کر دیا گیا ہے لیکن اِدھر یا اُدھر رہنے والوں کی زندگی کبھی محفوظ نہیں کہی جا سکتی۔ اس کے علاوہ صنعتی کارخانے، تجارتی ادارے اور زراعتی فارم وغیرہ بھی سرحد سے دور ہیں جہاں حکومت کی اعانت کے بغیر بھی روزگار ملنے کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس لیے تارکانِ وطن جب بھی موقع ملتا ہے، اپنی عارضی قیام گاہوں کو چھوڑ کر ملک کے بڑے شہروں میں چلے آتے ہیں۔ اسی چیز نے بے روزگاری کی وبا پھیلا دی ہے۔

ہمارے سامنے کھڑا ہوا نادار شخص برلن کا باشندہ تھا اور لڑائی سے قبل گھڑیوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کا بھائی سائنس داں تھا۔ برلن کی تباہی کے وقت خاندان کے سب افراد تتر بتر ہو گئے۔ اس کی دو جوان لڑکیاں تھیں، ایک خوب صورت بیوی بھی تھی۔ ان لڑکیوں اور بیوی کا کیا حشر ہوا۔ اسے معلوم نہیں تھا بھائی زندہ ہے یا مر گیا یا اغوا کر کے کسی مغربی ملک میں اس کی سائنسی استعداد سے استفادہ کرنے کے لیے پہنچا دیا گیا، یہ بھی خبر نہیں تھی۔ خاندان کا نام لیوا بظاہر وہ تنہا باقی رہ گیا تھا اور وہ بھی معذور تھا۔ بمباری کے زمانے میں اس کی ایک آنکھ بالکل بیکار ہو گئی۔ چہرے پر اس کا ڈھیلا باقی مگر بے نور تھا۔ دوسری آنکھ کی بصارت جواب دے چلی تھی۔ غذا کی کمی اور خرابی نے اسے نحیف و لاغر ہی نہیں کئی بیماریوں میں مبتلا کر رکھا تھا میں نے اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیات کا اندازہ لگایا اور مجھے اس پر ترس آ گیا۔ لیکن اس سرزمین پر اس شخص سے بھی زیادہ میرے لیے وہ شہر ایک دیارِ غیر تھا۔ میں اس کی مدد اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا کہ چند سکّے اپنی جیب سے نکال کر چپکے سے اس کی مٹھی میں رکھ دوں۔ چنانچہ یہی کیا اور فوراً ہم تینوں بھائی وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ چند قدم چل کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ شخص اسی طرح خاموش کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ خیالات کی دنیا میں خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

اگر سڑک پر سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو میاں محبوب ایک دم نہ روک لیتے تو میں ہوٹل تک پیدل جانے کو ترجیح دیتا۔ ہوٹل پہنچ کر خیال آیا کہ ابھی شام کے کھانے کا مسئلہ حل کرنا باقی ہے۔ ہم نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس شاندار ہوٹل میں صرف قیام کریں گے اور بچت کی خاطر شہر کے کسی ریستوران میں کھانا کھا لیا کریں گے۔ پہلا تجربہ خلافِ توقع

رہا تھا۔ اچھا کھانا نہیں ملا اور بل کی خاصی رقم اُدا کرنی پڑ گئی۔ اس لیے ارادہ کیا کہ آج رات کا کھانا اسی ہوٹل میں کھایا جائے۔ لیکن میں نے اصرار کیا کہ ہم مشترک کمرۂ طعام میں، جہاں کھانے کے ساتھ ساتھ شراب پینے کی ترغیب دی جاتی ہے اور اگر یہ عمل نہ کیا جائے تو ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے، ہرگز نہیں جائیں گے، بلکہ کھانا اپنے ہی کمرے میں منگایا جائے گا۔ بھائی جان محترم نے تائید کی اور میاں محبوب کے سپرد یہ کام کر دیا گیا۔

جب وہ فرمائشات درج کرا کے واپس آئے تو انھوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ کوئی بھی چیز یا اس کی تیاری ہمارے عقیدے اور مسلک کے منافی نہیں ہوگی۔ خود مینیجر نے ان کو باورچی خانے میں لے جا کر ایک مسلمان باورچی سے ملوایا جس نے حلفیہ بیان دیا کہ مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے عقیدے کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے، چنانچہ ہوٹل کا بیرا کھانا لایا تو میں تلی ہوئی مچھلی اور بھنا ہوا مرغ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے کہا کہ جس طرح دروغ گردنِ راوی پر رکھ دیا جاتا ہے، ان چیزوں کے حلال و حرام کی ذمہ داری میاں محبوب پر عائد ہوگی۔ لہٰذا سب نے کھانا کھایا اور خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ بل کی رقم تو آخر میں ادا کرنی تھی لیکن میں نے محض معلومات کی خاطر بیرے سے دریافت کیا تو یہ سن کر حیران رہ گیا کہ وہ آٹھ یا نو جرمن فرانک سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اور اس پر ایک فرانک ٹپ کا ادا کرنا ہوگا جو ہر بڑے ہوٹل کا قاعدہ ہے۔ میں نے ازراہِ تفنن میاں محبوب سے کہا کہ تم اچھے گائڈ نہیں ہو، تمھیں ہوٹلوں کے نرخنامے بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ خیر اپنا فیصلہ یہ ہے کہ کل بھی ناشتہ اور کھانا اسی جگہ ہوگا۔

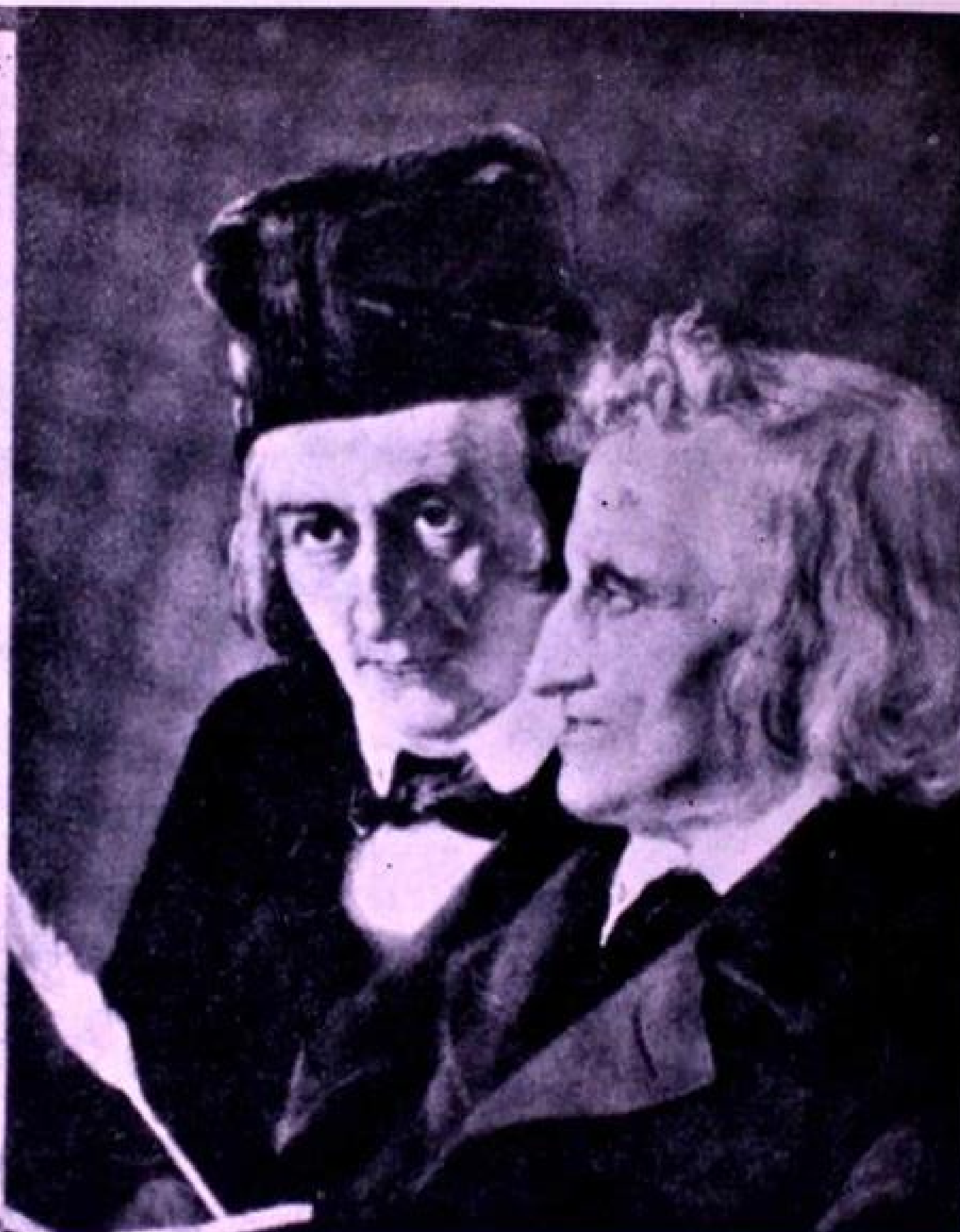
سونے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ آرام کرسی پر دراز ہو کر اس کتاب میں سے کوئی کہانی پڑھی جائے جو سعدیہ بیٹی کے لیے خریدی تھی۔ کتاب کی زیبائش اور مصنفین کے ناموں کی جاذبیت نے اس کے مطالعہ کی ترغیب دی تھی۔ دو حقیقی بھائیوں کا مل کر کوئی مقالہ یا کہانی لکھنا شاید ادب میں اپنی قسم کی ایک ہی مثال ہے۔ دو دوستوں یا واقف کاروں کا اشتراک تو کئی زبانوں میں ملے گا۔ خود ہماری زبانِ اردو میں نورالہٰی محمد عمر کی مثال دی جا سکتی ہے لیکن یہ آپس میں سگے بھائی نہیں تھے۔ ان کے برعکس برادرز گرم ایک ہی والدین سے تھے۔

برادرز گرم۔ تقریباً ایک سال کے وقفے سے پیدا ہوئے اور پانچ سال کے وقفے سے

فوت ہونے والے یہ دو بھائی اپنی تعلیم اور خیالات، رجحانات اور مشاغلِ حیات کے اعتبار سے ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ انھوں نے اپنی نگارشات ایک ہی مشترک نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس میدان میں اتنی شہرت حاصل کی کہ انھیں ادبی جوڑواں بھائی کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں بھائی صوبہ ہیسے کے ایک شہر ہاناؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ بڑے کا نام جیکب لُڈوِگ کارل گرم اور چھوٹے کا ولہلم کارل گرم تھا۔ بڑا ۴ر جنوری ۱۷۸۵ء کو اور چھوٹا ۲۴ر فروری ۱۷۸۶ء کو پیدا ہوا گویا ان کی عمر میں صرف ایک سال ایک ماہ اور بیس دن کا فرق تھا۔ لیکن چھوٹا پہلے یعنی ۱۶ر دسمبر ۱۸۵۹ء کو اور بڑا بعد میں یعنی ۲۰ر ستمبر ۱۸۶۳ء کو فوت ہوا۔ جرمن زبان میں ان کی تحریریں مشترک رہیں لیکن نوشتۂ تقدیر میں ان کی عمریں یکساں نہ رہ سکیں۔ عمروں کا تعین قسمت کے ساتھ ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

دونوں نے زبان دانی اور فلسفۂ قانون میں اعلا تعلیم پانے کو پسند کیا۔ فارغ التحصیل ہو کر کچھ عرصے الگ الگ رہے اور پھر ایک ساتھ شہر کاسل میں سرکاری کتب خانے کے مہتمم اور نائب مہتمم ہو گئے۔ اس کے بعد گوٹنگن یونیورسٹی میں ایک ساتھ پروفیسر رہے۔ اسی دوران میں انھیں کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن ۱۸۳۳ء میں جب ہانوفر کے بادشاہ نے دستورالعمل کو کالعدم کر کے پورے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تو بڑے بھائی نے اس اقدام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ایک مقالہ اخبار میں لکھ دیا۔ اس "جرم" کی پاداش میں اسے یونیورسٹی سے نکال باہر کیا گیا۔ دوسرے نے خود ہی استعفیٰ دے دیا۔ اب کہانیوں کے علاوہ انھوں نے دوسرے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا اور ۱۸۵۲ء میں جرمن زبان کا ایک جامع لغت مرتب کر دیا، جس پر اربابِ علم کی طرف سے اب تک خراجِ تحسین ادا کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کتبِ نصاب بھی مرتب کیں جو عرصۂ دراز تک تعلیمی اداروں کے لیے رائج رہیں۔ انھوں نے صرف و نحو کے قاعدوں کو بہتر بنا کر اپنی علیحدہ گریمر مرتب کی، جس نے جرمن زبان کو ٹھوس بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ اس سے قبل اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی لسانی غلطیوں کا ارتکاب کرتے تھے کیونکہ گریمر کی کوئی سی دو کتابیں اصول و قواعد معین کرنے کے لحاظ سے یکساں نہیں تھی۔ برادرزِ گرم کی گریمر ہمیشہ کے لیے سند بن گئی۔



(دائیں طرف) جیکب گرم اور ولہم گرم - (بائیں طرف) "برادرز گرم" کی کہانیوں کے ایک مجموعے کا سرورق

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ برادرز گرم کی کہانیاں جرمنی میں اور جرمنی کے باہر دوسرے ملکوں میں جتنی مشہور ہوئی ہیں کسی اور تصنیف کو وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکا۔ دنیا کی شاید ہی کوئی زبان ایسی ہو جس میں ان کے ترجمے نہ ہوئے ہوں۔ کئی کہانیوں کے ترجمے اردو زبان میں میری نظر سے گزر چکے ہیں اور ایک کہانی تو ہمدردِ صحت میں بھی شائع ہوئی ہے۔

**پی وِٹ** ۔ تھوڑی دیر ورق گردانی کے بعد میں نے برادرز گرم کی ایک کہانی کا مطالعہ شروع کر دیا، جو اس سے قبل نظر سے نہیں گزری تھی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :۔

ایک غریب لیکن سمجھ دار دیہاتی جس کا نام پی وٹ تھا، اپنی بیوی کے ساتھ اس گاؤں میں جہاں وہ پیدا ہوا تھا، خاموش پُرسکون زندگی گزار رہا تھا، ایک روز جب کہ وہ اپنے بیلوں کی جوڑی لیے کھیت میں ہل چلا رہا تھا، اچانک اسے ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو۔ مڑ کر جو دیکھا تو وہاں کوئی بھی انسان نہیں تھا، البتہ درخت پر ایک پرندہ بیٹھا "پی وٹ پی وٹ" کے ہوکے لگا رہا تھا۔ اتفاق سے اس پرندے کو بھی لوگ پی وٹ کے نام سے پکارتے ہیں اور طوطے کے "میاں مٹھو" کہنے کی طرح وہ بھی اپنے نام کی مالا جپتا ہے۔ لیکن دیہاتی سمجھا کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ لہٰذا غصّے میں آکر اُس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور پرندے کو مار ڈالنا چاہا لیکن پرندہ پھُر سے اڑ گیا۔ اُس کا بال تک ٹیڑھا نہیں ہوا۔ البتہ پتھر درخت کے نیچے کھڑے ہوئے ایک بیل پر گرا، اس کا سر پھٹ گیا اور وہ کچھ دیر میں تڑپ تڑپ کے مر گیا۔

پی وٹ نے اپنے دل میں سوچا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ جوڑی کا ایک بیل باقی رہ گیا تھا، ایک مرا پڑا تھا۔ بہت زیادہ سوچے بغیر اس نے دوسرے کو بھی مار ڈالا۔ پھر دونوں بیلوں کی کھالیں اتاریں اور انھیں بیچنے کے لیے قریب کے قصبے میں چلا گیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہاں ایک شخص چمڑے کی خرید و فروخت کرتا ہے۔

اس نے چرم فروش کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب وہ نہ کھلا تو اس نے جھری میں سے جھانکا۔ اس نے دیکھا کہ چمڑے کے سوداگر کی بیوی اپنے ایک دوست کو جلدی جلدی ایک پرانے صندوق میں چھپا رہی ہے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔ غالباً اسے خلافِ توقع اپنے خاوند کے آنے کا اندیشہ ہو گیا تھا اور وہ راز فاش ہو جانے سے ڈر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ سوداگر کی بیوی نے قریب آکر پوچھا "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

پی وٹ بولا "میں دو کھالیں فروخت کرنی چاہتا ہوں"۔

پھر یہ سُن لینے کے بعد بھی کہ چرم فروش گھر پر موجود نہیں ہے، اس نے اصرار کیا کہ میں اس کا انتظار کروں گا۔ اور جب سوداگر کی بیوی نے خود کھالوں کا سودا کر لینا چاہا تو اس نے کہا کہ میں ان کے عوض سامنے رکھا ہوا پرانا صندوق قبول کر لوں گا۔ کیونکہ مجھے ایک صندوق کی سخت ضرورت ہے۔ سوداگر کی بیوی بھلا یہ سودا کس طرح مان سکتی تھی۔ اس کے دل کا چور تو اس میں چھپا بیٹھا تھا۔

بات چیت ہو رہی تھی کہ اتنے میں سوداگر بھی بازار سے واپس آ گیا۔ اس نے ساری کتھا سن کر دل میں خیال کیا کہ یہ شخص بھی کتنا بے وقوف ہے، دو کھالوں کے بدلے میں ایک پرانا بیکار صندوق مانگ رہا ہے۔ اس نے بیوی کو الگ لے جا کر ڈانٹا کہ تو موقع سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتی۔ اس نے دیہاتی کی بات مان لی اور سودا طے ہو گیا۔ بیوی کی ضد پوری نہ ہوئی اور وہ یہ سوچ کر حیران رہ گئی کہ اب نہ جانے کیا ہو گا۔

پی وٹ نے پرانا صندوق اپنے ٹھیلے پر لادا اور چل پڑا۔ وہ تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ صندوق میں بند ہو جانے والے آدمی نے گڑگڑا کر خوشامد شروع کی کہ مجھے صندوق سے باہر نکال دیا جائے۔ لیکن پی وٹ اس وقت تک رضامند نہ ہوا جب تک کہ سوداگر کی بیوی کے بدنصیب عاشق نے اپنی جیب میں سے ایک ہزار روپے نکال کر صندوق کی جھری میں سے باہر نہ ڈال دیے۔ پی وٹ نے رقم سنبھال کر رکھ لی اور اپنے گاؤں کے قریب پہنچ کر جہاں اس کے جاننے والے ایک آواز پر آ سکتے تھے، صندوق کا ڈھکنا کھول دیا۔

اس رقم سے اس نے ایک عمدہ مکان بنوایا، سامانِ آرائش خریدا اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سب نے کہا پی وٹ ضرور ایسی جگہ گیا ہے جہاں سونے چاندی کی بارش ہوتی ہے اور وہ بہت سا مال سمیٹ لایا ہے جسے استعمال کر رہا ہے۔ وہ اسے پکڑ کر قاضی کے سامنے لے گئے تاکہ وہ ایک دم امیر ہو جانے کا حساب سمجھائے اور ثابت کرے کہ اس نے حلال کی کمائی سے مکان بنوایا ہے۔ پی وٹ نے قاضی کے سوال پر جواب دیا کہ میں نے دونوں بیل مار کر ان کی کھالیں قصبے کے چرم فروش کے ہاتھ ایک ہزار روپے میں فروخت کی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ آج کل کچے چمڑے کے دام بہت بڑھ رہے ہیں۔

جب لوگوں نے یہ بات سنی تو ان کے دل میں بھی حرص کی آگ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے سوچا کہ ہم بھی یہ نسخہ کیوں نہ استعمال کریں۔ چنانچہ ان سب نے اپنے اپنے بیل مار ڈالے اور کھالیں لے کر قصبے میں پہنچ گئے۔ قاضی جی سب سے آگے تھے۔ جب چرم فروش نے کھالیں بیچنے والوں کی بھیڑ دیکھی تو وہ ہنسا اور اس نے کہا کہ میں نے دو کھالوں کے عوض پی وٹ کو ایک پرانا صندوق دیا تھا۔ بھلا ایک ہزار روپے میں کوئی دو کھالیں خرید سکتا ہے۔ لوگ یہ سن کر غم و غصے سے کھول اُٹھے۔ انھیں پی وٹ کی دروغ بیانی پر بہت تاؤ آیا اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ ہم اس چالباز سے ضرور بدلہ لیں گے۔ جب وہ کھیت میں کام کر رہا ہوگا تو اسے مار ڈالیں گے۔

جب پی وٹ کی بیوی کو معلوم ہوا کہ لوگ اس کے خاوند کے دشمن ہو گئے ہیں تو اس نے کہا، آخر تم نے کوئی ایسی ترکیب کیوں نہ بتائی جس پر وہ عمل نہ کر سکتے اور خواہ مخواہ تمھارے دشمن نہ ہوتے۔ بات بڑھتی گئی اور دونوں میاں بیوی میں تکرار ہو گئی۔ آخر پی وٹ نے کہا کہ بس تم کو اس شرط پر معاف کر سکتا ہوں کہ کل صبح تم اپنے کپڑے اتار کر اور میرا لباس پہن کر کھیتوں میں جا کر پانی دینا۔ میری طبیعت کسی قدر خراب ہے۔ بیوی کو پوری بات معلوم نہیں تھی لہٰذا خاوند کو منانے کی خاطر شرط ماننے پر تیار ہو گئی۔ دوسرے روز وہ علی الصبح بھیس بدل کر گھر سے چلی گئی۔ لوگ تاک میں لگے ہوئے تھے۔ وہ عورت کو مرد کے لباس میں پہچان نہ سکے اور اسے پی وٹ سمجھ کر حملہ کر بیٹھے۔ ہر شخص نے ایک ایک پتھر مارا۔ غریب عورت لہولہان ہو کر چیخی چلائی اور آخر کار مر گئی۔ لوگ وہاں سے پہلے ہی بھاگ چکے تھے۔

جب پی وٹ دن بھر انتظار کرنے کے بعد بیوی کی تلاش میں کھیت پر گیا تو اسے مردہ پایا۔ وہ سمجھ گیا کہ بندر کی بلا طویلے کے سر جا پڑی ہے۔ اسے افسوس ہوا، لیکن اب کیا کر سکتا تھا۔ تاہم اس نے سوچا کہ اس مردہ نعش سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ اسے دوسرا زنانہ لباس پہنا کر بڑی سڑک کے کنارے ایک بنچ پر اس کے بازو کے سہارے اس طرح بٹھا دیا جیسے وہ تھک کر کچھ دیر ستانے کے لیے بیٹھ گئی ہو۔ اس نے بیوی کے قریب ایک ٹوکری میں پھل بھی رکھ دیئے گویا اسے پھل بیچنے والی بنا دیا۔

کچھ دیر بعد ایک رئیس کی گاڑی اس سڑک سے گزری۔ اسے پھلوں کی تلاش تھی۔ اس نے پھل والی کو دیکھ کر گاڑی رکوائی اور اپنے ایک ملازم کو پھل خریدنے کے لیے بھیج دیا۔ ملازم

نے قریب جاکر قیمت پوچھی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر دریافت کیا اور جواب نہیں ملا۔ تین دفعہ کے بعد ملازم کو غصّہ آگیا۔ اس نے آگے بڑھ کر عورت کے ایک گھونسہ مار دیا۔ وہ لڑھک کر بنچ سے نیچے گر گئی اور بالکل بے حس و حرکت رہی۔ اتنے میں پی وِٹ درختوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا اور چیخنے چلّانے لگا کہ ظالموں نے میری بیوی کو مار ڈالا۔ میں قاضی کے سامنے دعویٰ دائر کروں گا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے رئیس نے خاموشی کے ساتھ معاملے کو رفع دفع کر دینا چاہا۔ وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ اپنا گھوڑا گاڑی اس کے سپرد کر دے۔

پی وِٹ فوراً گاڑی میں بیٹھ کر گھوڑا ہنکاتا ہوا گاؤں پہنچا تو لوگ اسے اس شان سے آتا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم اسے مار چکے ہیں۔ پی وِٹ نے ایک بار پھر انھیں چکمہ دینا چاہا لیکن وہ ہوشیار ہو گئے تھے۔ فریب میں نہ آئے اور اس سے انتقام لینے کی خاطر انھوں نے اسے ایک پیپے میں بند کیا اور لڑھکاتے ہوئے دریا کی طرف لے گئے۔ ان کا فیصلہ تھا کہ اسے پانی میں بہا دیا جائے اور وہ کہیں دور سمندر تک چلا جائے لیکن ساحلِ دریا سے ذرا وَرے وہ ایک قہوہ خانہ دیکھ کر رک گئے۔ انھوں نے سوچا کہ یہاں سے ایک ایک پیالہ پی کر آگے جائیں۔ انھوں نے پیپہ دوکان کے باہر درخت کے نیچے ہی رہنے دیا کیونکہ وہ بند تھا اور اندر سے کھل نہیں سکتا تھا۔

تھوڑا سا سکون پاکر پی وِٹ نے رہائی پانے کی تدابیر پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے عین اس وقت اسے "ممیں ممیں" کی آوازیں سنائی دیں اور وہ سمجھ گیا کہ بھیڑوں کا گلّہ قریب سے گذر رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔ اس کی آواز سن کر گڈریہ قریب آیا۔ اس نے پیپے کو تھپ تھپا کر پوچھا "تم کون ہو اور اس میں کیوں بند ہو؟"

پی وِٹ بولا، "بھائی! ڈھکنا باہر سے کھولو تو میں اصل ماجرا بیان کروں"۔ گڈریے نے ڈھکنا کھول دیا۔ تب پی وِٹ بولا کہ میرے گاؤں کے لوگ مجھے اپنا چودھری بنانا چاہتے ہیں اور یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے اس پیپے میں مجھے بند کر دیا ہے کہ جب تک میں حامی نہیں بھر لوں گا، وہ مجھے آزاد نہیں کریں گے۔

گڈریئے نے حیران ہو کر کہا، "تو پھر تم انکار کیوں کرتے ہو۔ فوراً قبول کر لو۔ چودھری بننا کون سی بری بات ہے۔"

پی وِٹ نے کہا، "بات یہ ہے کہ چودھری پر بہت سی ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور یہ میرے

بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن اگر تم چاہو تو میری بجائے گاؤں کے چودھری بن جاؤ۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ تم اپنے کپڑے مجھے دے دو اور میرا لباس پہن کر پیپے میں بند ہو جاؤ۔ گاؤں کے لوگ جو اس وقت قہوہ خانے میں محو ہیں، پیپے کو لڑھکا کر قاضی کے پاس لے جائیں گے اور اپنا منشا بیان کریں گے۔ قاضی ان کے متفقہ فیصلے کو مان کر تمھیں چودھری بنا دے گا اور جب ایک فیصلہ ہو جائے گا تو اسے کوئی بدل نہیں سکے گا۔

گڈریے کو یہ تجویز ایسی پسند آئی کہ اس نے فوراً اپنے کپڑے اتار کر پی وٹ کے کپڑے پہن لیے اور پیپے میں جا بیٹھا۔ پی وٹ نے ڈھکنا بند کر دیا اور بھیڑوں کو ہنکاتا ہوا اپنے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کے لوگ قہوے سے فارغ ہو کر باہر نکلے اور پیپے کو لڑھکا کر لے گئے اور آخر کار اسے دریا میں پھینک کر واپس چلے آئے لیکن جب گاؤں میں پہنچے تو پی وٹ کو بھیڑوں کے ایک گلے کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انھوں نے پوچھا کہ آخر یہ راز کیا ہے۔ تم ہمیشہ بچ جاتے ہو اور ہم بے وقوف بن کر رہ جاتے ہیں۔ بتاؤ تو سہی، اس دفعہ تمھاری نجات کیسے ہوئی؟۔

پی وٹ نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ دریا کی تہہ میں ایک خوب صورت پری کا محل ہے۔ جب تم نے پیپہ پانی میں پھینک دیا تو میں پری کے محل میں پہنچ گیا۔ وہ ڈھکنا کھول کر اور مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے عرصۂ دراز سے کسی آدم زاد کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ کچھ دیر اس کے گیت سننے کے بعد میں نے واپسی کی اجازت مانگی جو اس نے اس شرط پر دے دی کہ میں اپنی بجائے کسی اور آدم زاد کو دریا کی تہ میں بھیج دوں گا۔ اس نے چلتے وقت بھیڑوں کا یہ گلّہ بھی دے دیا۔ ایسے بہت سے گلّے پری کے محل میں موجود ہیں اور وہ ہر انسان کو جو وہاں تک جائے، ایک گلّہ دے دینا چاہتی ہے۔

یہ سنتے ہی گاؤں کے جتنے شرارت پسند لوگ تھے، ایک ایک پیپے میں بند ہو گئے اور باقی لوگ ان پیپوں کو لڑھکا کر دریا کے کنارے لے گئے اور پانی میں پھینک کر چلے آئے لیکن کچھ دیر میں تو کیا، صبح تک بلکہ دوسرے روز شام تک ان میں سے کوئی بھی بھیڑوں کا گلّہ لے کر نہیں پلٹا۔ پی وٹ کے لیے اب میدان خالی تھا۔ وہ گاؤں کے باقی ماندہ سادہ لوح باشندوں پر حکم چلانے لگا اور ان کا چودھری بن بیٹھا۔

بظاہر یہ کہانی بچّوں کے لیے ہے اور کسی قدر مزاحیہ ہے لیکن بڑوں کے لیے بھی اس میں

سنجیدہ مفید باتیں چھپی ہوئی ہیں۔ مکر اور فریب کبھی پوشیدہ نہیں رہتا۔ لالچ کرنا اور کسی کا بُرا چاہنا بُرے نتائج برآمد کرتا ہے۔ خود سوچے سمجھے بغیر کسی دوسرے کے مشورے پر عمل کرنا عموماً سود مند نہیں ہوتا۔ ہمّت ہارنے کی بجائے ہر مسئلے کو حل کرنے کی فکر میں لگے رہنا انجام کار تحصیلِ مقصد میں مدد دیتا ہے۔

کتاب میں شاید اور بھی کہانیاں اچھی ہوں گی لیکن میں نے ایک سے زیادہ کہانی پڑھنے کی اس وقت ہمّت نہیں کی۔ نیند بُری طرح ستا رہی تھی۔ تھکن نے بھی اعضا شکنی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ لہٰذا اس کے فوراً بعد سو جانے کا تہیہ کر لیا۔ بھائی جان محترم حسبِ معمول خطوط لکھنے میں مصروف تھے اور میاں محبوب مجھ سے قبل سو کر خرّاٹے لے رہے تھے۔ عموماً مجھے ایسے شخص کے قریب لیٹ کر ہرگز نیند نہیں آتی جسے خرّاٹے بھرنے کی عادت ہو لیکن یہاں خلافِ معمول مجھے نیند آ گئی۔ البتہ خواب کی حالت میں میاں محبوب کے خرّاٹے اس گڈریے کی بھیڑوں کی "بھیں بھیں" میں تبدیل ہو کر مجھے رات بھر سُنائی دیتے رہے، جو خود اپنی مرضی سے پی وِٹ کی بجائے پیپے میں بند ہو کر دریا کی لہروں کی نذر ہو گیا تھا اور کم سے کم اپنی اس جُون میں گاؤں کا چودھری نہیں بن سکا تھا۔

# فرینکفرٹ میں مزید ایک دن

طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں ابھی ایک دن اور فرینکفرٹ میں قیام کرتے ہوئے اس کے قرب وجوار میں گزارنا ہے۔ اس سے پہلے ہم گرم پانی کے چشموں کی اہمیت وافادیت پر ایک عام نظر ڈالتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ جرمنی کے لوگ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے ہاں قدرت کی یہ دین بہت افراط سے پائی جاتی ہے۔ لیکن بڑی تعداد پہاڑوں کے دامن میں یا ان کی کھوؤں میں ایسے مقامات پر واقع ہے جہاں تک رسائی آسانی سے ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے شروع میں صرف ان سے فائدہ اٹھایا گیا جن تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں تھی لیکن اب جبکہ ستاروں کی گزرگاہیں ناپتے ناپتے ان پر "قدم رنجہ فرمانے" کے منصوبے عملی جامہ پہن رہے ہیں، پہاڑوں میں چھپے ہوئے چشمے کیونکر بعید از رسائی رہ سکتے تھے! چنانچہ اب سرزمین جرمنی کا شاید ہی کوئی چشمہ ایسا ہو جسے انسانی تصرف سے باہر کہا جا سکے۔

خاص فرینکفرٹ میں تو نہیں، اس سے دس دس بارہ بارہ میل کے فاصلے پر ایسے چشموں کی کمی نہیں ہے اور چونکہ وہ انسانی بستیوں کے قریب ہیں، اس لیے ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ہمارا آج کا لائحہ عمل ایسے ہی چشموں تک پہنچ کر قدرتی طور پر دوائی اجزا ملے ہوئے پانیوں کی نوعیت وماہیت کو سمجھنا اور وہاں کے طریقۂ علاج کا مشاہدہ کرنا ہے۔ بھائی جان محترم نے فیصلہ کیا کہ بہت جلد ناشتے سے فارغ ہو کر اور کچھ پھل ساتھ لے کر بادسوڈن، بادھومبرگ اور اگر وقت ملے تو باد نوہیم چلا جائے۔ یہ تینوں ایک سمت میں ہیں اور زیادہ دور بھی نہیں ہیں۔ انھیں اچھی طرح دیکھ کر شام تک لوٹ آنا ممکن تھا۔ ان مقامات کے راستے میں اور بہت سے چشمے بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ

بھی کیا کہ واپسی اس طرح ہو کہ نمازِ عصر ہوٹل میں آکر پڑھلی جائے۔

رات کے کھانے کی طرح ہم نے ناشتہ بھی اپنے کمرے ہی میں منگوالیا۔ اب یہاں کی تلی ہوئی یا پکی ہوئی کوئی چیز کھانے میں ہمیں کسی قسم کا تامل نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ ہمارا وہم گزشتہ رات دِل سے نکل چکا تھا۔ چنانچہ انڈوں کے آملیٹ کی فرمائش کر دی گئی۔ بھائی جان محترم نے جَو کا دلیہ اور میں نے امرود کی جیلی کے لیے بھی کہا تاکہ وہ توسوں پر لگا کر کھالی جائے۔ دودھ کے بارے میں آرڈر دیا کہ وہ چائے کی ضرورت کے علاوہ کثیر مقدار میں ہونا چاہیئے تاکہ ہم دلیے میں کافی مقدار میں ڈالنے کے بعد اگر چاہیں تو ایک ایک پیالی ویسے بھی پی لیں۔ چائے صرف میاں محبوب کے لیے منگائی گئی۔ ان کی چائے خوری عادت دیرینہ کی حد تک بڑھ گئی ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے ہوٹل کے جنرل منیجر کو ٹیلی فون پر مطلع کر دیا کہ ہم تقریباً تمام دن باہر رہیں گے اور شام کو ذرا دیر میں لوٹیں گے لیکن دوسرے روز علی الصبح فرینکفرٹ سے چلے جائیں گے۔ اس لیے ہمارا بل رات ہی کو تیار کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہماری روانگی کے لیے ٹیکسی وغیرہ کا انتظام کیا جائے تاکہ ریلوے اسٹیشن تک پہنچنے میں دقت نہ ہو۔ ہمارے ایک روز کے تجربے نے ہمیں بتا دیا تھا کہ یورپ کے اور ملکوں اور شہروں کی طرح یہاں بھی عملی صبح ذرا دیر میں ہوتی ہے کیونکہ نصف رات تک بلکہ اس کے بھی کچھ عرصے بعد تک خوش فعلیوں میں مبتلا رہنے کے بعد ہوٹل میں علی الصبح اٹھنے کا نام لینا "ارتکاب جرم" کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور ملازمین سے بھی کسی قسم کی خدمت کی توقع نہیں کی جاسکتی، تاوقتیکہ اس قسم کی ہدایت پہلے سے نہ دے دی جائے۔ اس صورت میں ہوٹلوں کے منتظمین بطور خاص مسافروں کی سہولت کا خیال رکھتے ہیں۔

آٹھ بجے کے قریب ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے۔ اس وقت تک دن خاصا چڑھ گیا تھا۔ دیر کی وجہ یہ تھی کہ ایک غیر ملکی تار بھائی جان محترم کے نام دہلی سے آگیا تھا اور اس کا جواب بذریعہ تار ہی دینا ضروری تھا۔ ٹیلی فون پر تار گھر سے رابطہ قائم کرنے اور تار کا مضمون لکھوانے میں دیر ہو گئی۔ کیونکہ ہوٹلوں میں قیام کرنے والوں کے تار اسی وقت آگے روانہ کئے جاتے ہیں جبکہ ہوٹل کے منتظمین رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لیں اور صورت یہ تھی کہ منیجر صاحب اپنے کمرے میں موجود نہیں تھے۔

ہوٹل سے باہر نکلے تو بہت جلد ایک ٹیکسی نظر آگئی۔ اسے بلا کر اپنا پروگرام سمجھایا اور اجرت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بھاری رقم طلب کی۔ لیکن میاں محبوب ہمارے ساتھ تھے جو کئی سال جرمنی میں رہ کر یہاں کی سب باتوں سے واقف ہو گئے تھے۔ انھوں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کرایہ نامہ کی فہرست مانگی جو ذرا سی حجت کے بعد اس نے دکھا دی۔ محبوب نے کہا، بس یہ ٹھیک ہے، تمھیں اسی کے مطابق معاوضہ ملے گا۔ ٹیکسی ڈرائیور کھسک جانا چاہتا تھا لیکن ہمارے بھائی صاحب نے دھمکی دی کہ تمھاری رپورٹ ابھی کر دی جائے گی۔ اس طرح وہ زچ ہو کر ہمیں لے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ تاہم میں نے اردو میں میاں محبوب سے کہہ دیا کہ اگر یہ سیدھا سیدھا رہا تو ہم کرایہ نامے کے علاوہ اسے کچھ انعام دے دیں گے۔ چاہو تو اسے ابھی سے کہہ دو لیکن انھوں نے مناسب نہیں سمجھا اور ہم خاموش ہو گئے۔ ٹیکسی میں میٹر لگا ہوا تھا۔ مسافت کے علاوہ کہیں ٹھہرنے کی مدت بھی اس میں قاعدے کے مطابق محسوب ہوتی رہتی ہے۔ دوکس ویگن ساخت کی گاڑی تقریباً نئی حالت میں تھی۔

ہم سوا آٹھ بجے روانہ ہو کر صرف سترہ منٹ میں بادسوڈن پہنچ گئے! اسے اور بادہومبرگ کو بھی فرینکفرٹ کی مضافاتی بستیاں کہا جا سکتا ہے۔ پہلی منزل صرف سات میل اور دوسری مزید پانچ میل یعنی کل بارہ میل دور ہے، راستہ بہت ہی پُر فضا تھا۔ ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ تم اطمینان کے ساتھ گاڑی ذرا آہستہ چلاؤ تاکہ ہم ماحول کا لطف اٹھا سکیں۔ غنیمت ہے کہ اس نے ہماری بات مان لی۔ ورنہ کرایہ کی گاڑیوں کی صورت میں ایسے حکم کی تعمیل ذرا مشکل سے ہوتی ہے کیونکہ ٹیکسی والے کو خسارہ رہتا ہے۔

**بادسوڈن:** چونکہ سوڈن کے نام کے دو قصبے اس ملک میں موجود ہیں، اس لیے دونوں فرینکفرٹوں کی طرح جنھیں قریب کے دریاؤں سے مناسبت دے کر تخصیص پیدا کی گئی ہے، اسے بھی سوڈن ٹونس کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ کوہ ٹونس کے دامن میں واقع ہے۔ دوسرا بادسوڈن الین ڈورف کہلاتا ہے اور زیادہ جانب شمال شہر کاسل کے متوازی اور اس سے زیادہ قریب واقع ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور یقیناً بارہا اس جگہ آ چکا تھا، اس لیے وہ ہم کو سیدھا اسپا یعنی صحت گاہ کے صدر دفتر کے سامنے لے گیا۔ جب ہم گاڑی سے اتر کر دفتر کی طرف چلے تو نگہبان نے ہمیں ذرا معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ

ہمارا لباس اس کی نگاہ میں سوالیہ نشان بن گیا ہو۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں دیکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ ہم کس مرض میں مبتلا ہیں۔ نیز یہ کہ مریض ہم میں سے کون ہے اور دیکھ بھال کرنے والا کون۔ لیکن ہم اس کی طرف توجہ دیے بغیر دفتر کی جانب بڑھ گئے۔

کمرۂ استقبالیہ کے سامنے لگے ہوئے ایک تختۂ سیاہ پر سفید روغن سے انگریزی سمیت کئی زبانوں میں لکھا تھا کہ یہاں نزلہ وزکام، دمہ اور امراضِ قلب کا علاج کیا جاتا ہے۔ قریب پہنچنے پر ایک افسر رابطہ نے ہمارا استقبال کیا جن کا نام ڈاکٹر ایمے لنگ تھا۔ چوکیدار کی طرح انھوں نے بھی ہمیں معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ تاہم ان کی یہ مستفسرانہ کیفیت ہم نے بہت جلد دور کر دی۔ الگ الگ اپنا تعارف کراتے ہوئے ہم نے بتایا کہ ہم خود مریض نہیں ہیں بلکہ اپنے طریقِ علاج کے مطابق مریضوں کو شفایاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہاں جانے کا مقصد بیان کیا اور دل میں کہا کہ گرم پانی کے چند چشمے ہمارے ملک میں موجود ہیں جن سے سائنسی انداز میں فائدہ اٹھانے کی توفیق ابھی کسی کو نصیب نہیں ہے۔ یہاں کے نظامِ عمل اور طریقِ کار کا مطالعہ کر لینے کے بعد شاید ہم اپنے ملک میں کوئی منصوبہ بنا سکیں یا کوئی منصوبہ بنانے کے لیے حکومت پر زور دے سکیں۔ انھوں نے ہماری بات سن کر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

ڈاکٹر ایمے لنگ دفتری عملے کے انچارج تھے اور دفتر کے بعد علاج معالجے میں خود بھی حصہ لیتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ اس صحت گاہ پر جو کافی رقبے میں پھیلی ہوئی ہے، پورے وقت کے لیے سات معالج مامور ہیں۔ چند جزوی اوقات میں کام کرتے ہیں جن کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کالجوں کے طلبا اور طالبات چھٹیوں میں یہاں آکر خود تربیت پاتی اور مریضوں کا خیال رکھتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقے میں ٹھنڈے اور گرم دونوں قسم کے کئی چشمے موجود ہیں بعض آپس میں تقریباً یکساں اور بعض ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے پانیوں میں سوڈیم، کیلسیم کلورائڈ، سلفر، الکلی، ہائیڈرو کاربونیٹ اسی ڈولس کے اجزا ملے ہوتے ہیں۔ ہر چشمے کے معدنی اجزا کی قسم اور مقدار کا تعین ہو چکا ہے۔

بعض کا پانی صرف پینے کے کام آتا ہے، بعض کا صرف نہانے کے لیے اور بعض کا دونوں مقاصد کے لیے کارآمد ہے۔ نلوں کے ذریعہ سبھی چشموں کی سوت سے پانی صحت گاہ تک پہنچایا گیا ہے اور ہر قسم کو ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا ہے۔ کسی پانی کا ذخیرہ نہیں کیا جاتا بلکہ قدرتی حالت میں استعمال کیا جاتا ہے تاکہ اصل کیفیات برقرار رہیں۔

امراض کی نوعیت کے اعتبار سے وارڈوں کی تقسیم کی گئی ہے۔ سب سے پہلا وارڈ نزلے اور زکام کے مریضوں کا تھا۔ پہلے تو ہمیں کسی قدر تعجب ہوا کہ زکام کے مریض بھی اتنی دُور چل کر صحت گاہ میں قیام کے لیے آتے ہیں لیکن ہمیں بتایا گیا کہ عموماً جن کا زکام دیرینہ ہو کر پیچیدگیاں اختیار کر لیتا ہے، وہ یہاں آنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ وہ الگ الگ گرمی اور سردی کے باعث نزلہ لاحق ہونے کے قائل ہیں اور اسی اعتبار سے ٹھنڈے یا گرم پانی سے علاج کی سفارش کرتے ہیں۔ ایسے مریضوں کو زیادہ دیر پانی میں اتر کر غسل کی ہدایت نہیں کی جاتی۔ بلکہ ان کا علاج یہ ہے کہ وہ پانی چلّو میں لے کر ناک میں چڑھائیں، حتیٰ کہ وہ حلق سے ہو کر منھ میں آ جائے اور وہ کلی کر دیں۔ اس عمل کے بعد چند گھونٹ پینے بھی پڑتے ہیں۔ تیز گرم پانی کے برتن کو ناک کے قریب کر کے لمبے سانس بھی لیے جاتے ہیں تاکہ بھاپ حلق تک پہنچ کر اپنا اثر دکھائے۔ معالج کی سفارش کے بموجب یہ عمل دن میں کئی کئی بار دہرائے جاتے ہیں۔ غذا میں دو تین روز پرہیز کرایا جاتا ہے، پھر کوئی پابندی عائد نہیں رہتی۔ ایسے مریض ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہرتے۔ اگر وہ زیادہ دن ٹھہرنا بھی چاہیں تو منتظم عملہ انھیں اجازت نہیں دیتا۔ ملک بھر میں ایسی بہت سی صحت گاہوں کے باوجود کہیں بھی کوئی پلنگ چند گھنٹے سے زیادہ خالی نہیں رہتا اور ہر جگہ کی انتظاریہ فہرست میں سینکڑوں نام ہمیشہ درج رہتے ہیں۔

زکامی حالت ہو یا دمے کی شکایت یا تنفس سے متعلق کوئی بیماری، سوڈیم کلورائڈ (عام نمک طعام) القلی یا گندھک کی آمیزش والے پانی ایسے مریضوں کے لیے مفید رہتے ہیں۔ وارڈ کی کھڑکیوں کے دروازے دن بھر اور کبھی کبھی موسم کے اعتبار سے رات بھر بھی کھلے رہتے ہیں تاکہ تازہ ہوا اندر داخل ہو سکے۔ زیادہ سردی ہو یا پہاڑوں کی طرف سے زیادہ کہر آنے لگے تو کھڑکیاں بند کرا دی جاتی ہیں۔ حنجرے یا حلقوم میں کوئی شکایت ہو تو زیادہ احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اور معدنی پانی سے غرارے

کرانے کا عمل دن میں متعدد بار کیا جاتا ہے۔ اگر زیادہ بگڑے ہوئے زکام سے پھیپھڑوں کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہو تو صحت گاہ میں مدتِ قیام زیادہ طویل کر دی جاتی ہے اور علاج معالجے میں خصوصی توجّہ دی جاتی ہے۔ ایسے مریضوں کو علیحدہ وارڈ میں رکھا جاتا ہے۔ ان کے لیے روزانہ گرم پانی سے غسل بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح پانی میں ملا ہوا کیلیسم جلد کے ذریعہ جسم میں جذب ہو کر پھیپھڑوں کو تقویت دیتا ہے۔ اگر معاملہ آگے بڑھ جائے تو مریض کو فوراً کسی ایسی صحت گاہ میں منتقل کر دیا جاتا ہے جہاں دوسرے چشموں کے پانی اس کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکیں۔

سانس کی خرابی والے مریضوں سے خاص قسم کی ورزشیں بھی کرائی جاتی ہیں اور ورزش کے فوراً بعد گرم پانی کے حوض میں انھیں اتار دیا جاتا ہے۔ عموماً دمے کی کیفیت تین دن بعد کم ہونے لگتی ہے اور زیادہ سے زیادہ دس دن میں مریض اچھا ہو جاتا ہے۔

امراضِ قلب میں سے صرف اختلاجی کیفیت والے مریض یہاں رکھے جاتے ہیں۔ شکایت زیادہ بڑھ گئی ہو اور عارضے نے دورے کی صورت اختیار کر لی ہو تو انھیں یہاں داخل بھی نہیں کیا جاتا بلکہ سفارشی چٹھی دے کر دوسری جگہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک صحت گاہ کی سفارشی چٹھی دکھانے والے کو دوسری صحت گاہ میں داخلے کے لیے ترجیحی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس قسم کے مریض ایک اور وارڈ میں دیکھے گئے۔ لیکن ہمارا خیال تھا اور ڈاکٹر ایمے لنگ نے ہماری تائید کی کہ جن لوگوں کو دل کا مریض سمجھ لیا جاتا ہے، ان میں سے بیشتر کسی وہم میں یا ذہنی عارضے میں مبتلا ہوتے ہیں۔ چنانچہ چشموں کا پانی استعمال کرانے کے ساتھ ساتھ ان کے نفسیاتی علاج کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کے لیے بہت کم پابندیاں ہیں۔ عموماً معمولی شکایت والے مریض تو ہفتے عشرے سے زیادہ نہیں ٹھیرتے۔

دوسری صحت گاہوں کی طرح یہاں بھی مریضوں کا داخلہ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے لیکن ۱۵ اپریل سے ۳۰ ستمبر تک داخلے کی سب سے زیادہ درخواستیں وصول ہوتی ہیں۔ گنجائش کے اعتبار سے ایک ہزار چھپّن مریض بیک وقت اس صحت گاہ میں رہ سکتے ہیں لیکن اگر اشد ضرورت ہو تو برآمدوں وغیرہ میں فالتو پلنگ بچھا لیے جاتے

ہیں۔ اتنے مریضوں کے مقابلے میں دیکھا جائے تو بستی کی ساری آبادی، جو سات ہزار سے کچھ زیادہ ہے، کم ہی جا سکتی ہے۔ مارچ سے اکتوبر تک یہاں کھیل کود، تماشے اور دیگر تفریحات کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ گانے بجانے کی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ یہاں ڈاکٹروں کی فیس اور علاج معالجے کے اخراجات کے علاوہ ہر مریض کو ۳۰ مارک سرکاری ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد ہم نے ڈاکٹر موصوف کا شکریہ ادا کیا اور ان سے رخصت کی اجازت چاہی۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم سارا دن وہیں گزار دیں اور یہ ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی انھوں نے قہوہ کی ایک ایک پیالی پینے کے لیے ہمیں مجبور کر ہی دیا۔ میں نے پوچھا :

"ڈاکٹر صاحب! قہوہ بنانے میں کس چشمے کا پانی استعمال کیا گیا ہے؟"

وہ ہنس پڑے اور کہا، "عام استعمال کا پانی جو مقطر ہوتا ہے، دوسرے نلوں کے ذریعہ سرکاری طور پر ہر جگہ پہنچایا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کے نمک یا دوسرے معدنی اجزا کی آمیزش نہیں ہوتی۔"

**باد ہومبرگ** : دس بجے کے قریب ہم دوسری صحت گاہ میں پہنچ گئے جو ہومبرگ میں واقع ہے۔ یہ ہمبرگ سے مختلف مقام ہے۔ یہاں ڈاکٹر مڈلے ایور نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ یہ ڈاکٹر ایمے لنگ سے زیادہ معمر ہیں۔ ہم نے اپنا تعارف کراتے ہوئے ارادتاً ان سے یہ نہیں کہا کہ ہم خود بھی معالج اور مشرقی طریقۂ علاج کے علمبردار ہیں۔ یہ احتیاط اس لیے برتی گئی کہ سوڈن ٹونس میں بہت سی باتوں کی وضاحت ڈاکٹر ایمے لنگ نے یہ سوچ کر نہیں کی کہ ہم پہلے سے جانتے ہوں گے۔ ان کا خیال صحیح تھا لیکن اگر ان کے نظریات بھی ہمیں معلوم ہو جاتے تو اس میں کیا مضائقہ تھا۔

ہومبرگ سوڈن سے کچھ زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ یہاں چشموں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ لیکن ان کے پانیوں میں بھی سوڈیم کلورائڈ کے اجزا نسبتاً زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے معدے، آنتوں، جگر اور پتے کی خرابیاں یہاں جلد ہی دور ہو جاتی ہیں۔ استحالہ کی خرابی لاحق ہو، یعنی معدے میں غذا پہنچ کر پوری طرح جزو بدن نہ بن سکتی ہو تو اسے بھی رفع ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔

ڈاکٹر ایور نے ہمیں بتایا کہ یہاں مریض کو داخل کرنے سے پہلے دو تین دن معائنے اور مشاہدے میں رکھا جاتا ہے۔ اس کے بول و براز کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ ایکس رے کی تصاویر تیار کی جاتی ہیں اور جب کوئی انقطاعی رائے قائم ہو جاتی ہے تب داخلہ عمل میں آتا ہے۔ بہت سے مریضوں کو ہم یہاں سے یہ کہہ کر چلتا کر دیتے ہیں کہ تم کسی شفا خانے میں جا کر داخلہ لے لو۔ اصل بات یہ ہے کہ معدنی چشموں کا پانی عموماً ان حالتوں میں زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے کہ جب مرض کی نوعیت مزمن صورت اختیار نہ کر چکی ہو یا مرض پیچیدہ ہو کر اس منزل پر نہ لے گیا ہو جہاں عملِ جراحی لازمی ہو جاتا ہے۔

انھوں نے کسی قدر مسکرا کر کہا کہ جس طرح کسی بہت بڑے گنہگار کے پاپ کو سات سمندروں کا پانی بھی دھو کر صاف نہیں کر سکتا، اسی طرح معدے اور آنتوں کے بعض امراض کو تمام چشموں کے پانیوں کا مرکب بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر ان کے اعضا میں اپنے قدرتی افعال سے انحراف کی کوئی صورت پیدا ہو گئی ہو، معمولی خراش ہو، یا ناسور کی ابتدائی منزل بھی ہو تو پانی پی کر یا اس میں نہا کر کوئی تدارک کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ناسور نے بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر لی ہو، معدے میں رسولی ہو، معدے یا آنتوں میں سرطان ہو تو صرف معدنی پانی سے ان کا استیصال ممکن بھی ہو سکتا ہو گا تو ممکن نہیں سمجھا جائے گا۔ کیونکہ علاج کی رفتار مرض بڑھنے کی رفتار سے سست تر ہو گی جس کا نتیجہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ پھوڑا ہو یا رسولی یا موذی سرطان، جراح کا نشتر ہی ان کا موثر علاج ہے۔ علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اگر پتّے کے راستے میں شدید سوزش یا ورم کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے یا وبائی صورت میں ورمِ جگر کی شکایت لاحق ہے تو ایسے پانیوں کا غسل، ان کی مالش یا کسی اور طرح ان کا استعمال برعکس نتائج برآمد کرے گا۔ اگر معالج کی تشخیص نے کسی بھی قسم کا آپریشن تجویز کر دیا ہے تو ہم مریض کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنے ہاں رکھنے سے اجتناب کریں گے۔

ہم سب سے پہلے جس وارڈ میں گئے، وہ زنانہ وارڈ تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس صحت گاہ میں زنانہ وارڈ زیادہ ہیں۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا جرمنی

میں عورتوں کو پیٹ کی بیماریاں زیادہ لاحق ہوتی ہیں۔ میرے استفسار پر ڈاکٹر موصوف نے ہماری توجہ اس حقیقت کی طرف بھی مبذول کرائی کہ ان میں زیادہ تعداد بوڑھی یا ادھیڑ عمر والی عورتوں کی ہے اور پھر انھوں نے کسی قدر ٹھنڈا سانس لے کر کہا کہ یہ دوسری جنگِ عظیم کا انعام ہے جو تبرکاً باقی رہ گیا ہے۔ یہ وہ عورتیں ہیں جنھوں نے لڑائی کے زمانے میں خوراک نہ ملنے پر وہ چیزیں بھی کھالیں جن کو قبول کرنے میں معدے اور آنتوں کو تامل ہوتا ہے اور اگر وہ زبردستی ان کے سر منڈھ دی جائیں تو وہ روٹھ کر اصل فعل سے انحراف شروع کر دیتی ہیں۔ مرد زیادہ تر محاذِ جنگ پر تھے۔ وہ بڑی تعداد میں نشانۂ اجل بھی ہو گئے اور جو بچ گئے وہ ایسے تھے کہ ہتھیار ڈالے جانے تک انھیں کم سے کم عمدہ قسم کا راشن ضرور میسر آجاتا تھا۔ عورتیں محاذِ جنگ سے دور ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے رہ گئی تھیں۔ اسی لیے آج جرمنی کی آبادی میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے اور عمر رسیدگی کے ساتھ وہ پیٹ وغیرہ سے متعلق عارضوں میں گھری ہوئی ہیں۔

ایک وارڈ میں ایسے بھی مریض دیکھے گئے جو کسی نہ کسی قسم کے قبض میں مبتلا تھے۔ ان کی تعداد بھی خاصی زیادہ تھی۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ کچھ عرصے سے پاکستان میں اور شاید ہندوستان میں بھی قبض کے مریضوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ وطن میں رہتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی ایک بڑی وجہ وہ امریکی گیہوں ہے جس میں نظامِ ہضم کو قدرتی طور پر درست رکھنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ امریکا میں اس قسم کا گیہوں مویشیوں اور دوسرے جانوروں کو کھلایا جاتا ہے۔ جانوروں کے معدے اپنی قدرتی صلاحیتوں کی بنا پر اس کو ہضم کر لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ انسان کو اس سلسلے میں غیر معمولی کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ یہی نقص قبض کی شکایت پیدا کر دیتا ہے۔ میرے اندازے کی تصدیق ڈاکٹر ایور نے کر دی۔ انھوں نے کہا: "ہم معالجین نے تو سرکاری محکمۂ صحت کو صاف لفظوں میں لکھ بھیجا ہے کہ اگر قومی صحت کو درست رکھنا منظور ہے تو امریکی گیہوں کی درآمد بند کر دی جائے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ انسان وہ چارہ کھانے لگے جو گائے بھینسوں اور گھوڑوں کے لیے اگایا جاتا ہے۔ اس سے کم از معدے کا نظام تو درست رہ سکتا ہے۔"

شاید قدرت کو معلوم تھا کہ کبھی جرمنی پر جنگ ایک بلائے ناگہانی بن کر نازل

ہوگی، خیر خواہ بن کر امریکی ان پر مسلط ہو گئے اور پھر باشندگانِ ملک امریکی گیہوں کھا کر قبض کے مرض میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اسی لیے اس نے پہلے سے ہر مقام پر گرم پانی کا ایک نہ ایک چشمہ ایسا رکھا ہے جس میں میگنیشیم سلفیٹ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ اگر اس کے پانی کو زیادہ دیر ابال کر ایک گھونٹ پی لیا جائے تو جلاب کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور اصلی حالت میں استعمال کیا جائے تو بتدریج قبض رفع ہو جاتا ہے۔ اس پانی میں مریضوں کو زیادہ تر گلے تک ڈبو کر کچھ دیر بٹھایا جاتا ہے تاکہ معدنی اجزاءِ جسم میں جذب ہو کر معدے پر اچھا اثر ڈالیں۔ پینے کا سلسلہ چند دن کے بعد بالکل بند کر دیا جاتا ہے۔ ورنہ معدے کی کیفیت انھی لوگوں کی مانند ہو جاتی ہے جو ضرورت سے زیادہ ملین دوائیں استعمال کر کے اس درجہ عادی ہو جاتے ہیں کہ پھر ان کے بغیر رفعِ حاجت ممکن نہیں ہوتی۔

ہمیں بتایا گیا کہ یہاں ایک وارڈ میں جو پانی آتا ہے، وہ برابر کے وارڈ میں فراہم ہونے والے پانی سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی اعتبار سے ہر وارڈ کے ملحقہ حوض بھی برابر والے وارڈ کے ملحقہ حوض سے مختلف کہے جا سکتے ہیں۔ پھر جس طرح عطار طبیب کے تجویز کردہ نسخے کے مطابق دوا کا مرکب تیار کرتا ہے، اسی طرح بعض وارڈوں میں مرکب پانی بھی استعمال کرائے جاتے ہیں۔ یعنی دو یا دو سے زیادہ چشموں کے پانی ملا کر پلانے یا اس میں نہلانے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ یہ کام صحت گاہ کے معالج کی مرضی اور سفارش کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ چند ایسے مریض بھی دیکھنے میں آئے جو ورمِ جگر یا التہابِ قولون کے مرض میں مبتلا تھے اور معدنی چشموں کے پانی سے ان کا کامیاب علاج ہو رہا تھا۔

وارڈوں کا سلسلہ ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر ابورہم کو اپنی چند لیبارٹریاں دکھانے لے گئے۔ ایک تجربہ گاہ میں تقریباً ہر روز ہر چشمے کے پانی کا تجزیہ ہوتا رہتا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس میں معدنی اجزا بدستور موجود ہیں یا ان کی مقدار میں وقت گزرنے کے ساتھ کمی بیشی تو نہیں ہو رہی ہے۔ اگرچہ روزانہ نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے یعنی پتہ چلتا ہے کہ قدرت کا دوا ساز معدنی اجزا صحیح ناپ تول اور تناسب کے ساتھ ہر پانی میں ملائے جا رہا ہے۔ پھر بھی تجزیہ کا عمل روزانہ دُہرایا جاتا ہے اور کام

کرنے والوں کی طبیعت اس یک آہنگی سے اکتانے نہیں پاتی۔ کم سے کم اس طرح یہ اطمینان رہتا ہے کہ مریضوں کو ہر روز صحیح چیز مل رہی ہے۔ دو لیبارٹریاں بول و براز، تھوک، بلغم اور خون کے تجزیوں کے لیے مخصوص تھیں۔ اگر روزانہ نہیں تو تیسرے چوتھے روز ہر مریض کی ان چیزوں کا تجزیہ لازمی ہوتا ہے" تاکہ بدلتی ہوئی کیفیت کا صحیح اندازہ ہوتا رہے۔

بھائی جان محترم نے حسنِ انتظام کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر موصوف سے کہا کہ اگر مریضوں کو وارڈ میں داخل کرانے سے پہلے ان تجربہ گاہوں کی زیارت کرادی جایا کرے تو نفسیاتی اعتبار سے اچھا اثر پڑے اور وہ مرض کے استیصال میں ممد و معاون ثابت ہو۔ موصوف نے تائید کی لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ یہ طریقہ فوراً نہیں تین چار دن کے بعد اختیار کرتے ہیں اور وہ بھی ذرا رمزیہ انداز میں۔ یعنی مریض کا بول و براز، بلغم یا خون وارڈ میں نہیں لیا جاتا۔ بلکہ خود اسے لیبارٹری میں بھیج دیا جاتا ہے اور دوسرے دن کہا جاتا ہے کہ جا کر اپنی رپورٹ لے آؤ اور اس وقت اسے موقع دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے طور پر تجزیہ کے نظام اور طریق کار کو دیکھ بھال لے۔ میں اس لحاظ سے بھی ان کے اندازِ فکر کا قائل ہو گیا۔

ہمیں بتایا گیا کہ اِس صحت گاہ میں معالجین اور غسل کے ماہرین کی تعداد تریپن ہے اور سب کے سب پورے وقت کام کرتے ہیں۔ مریضوں کے علاج کے لیے مجموعی طور پر ایک ہزار چار سو بیس پلنگوں کی گنجائش ہے اور نو عدد مختلف چشموں کا پانی الگ الگ نلوں کے ذریعہ اس میں لایا جاتا ہے۔ سارے سال مریضوں کی آمد جاری ہے قطع نظر ۱۵ر جون سے ۳۱ر اگست تک سب سے زیادہ درخواستیں داخلے کے لیے وصول ہوتی ہیں۔ چار ہفتے تک کے قیام کا معاوضہ تقریباً پانچ سو اٹھانوے مارک ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھتیس مارک سرکاری ٹیکس کے طور پر وصول کیے جاتے ہیں۔

چونکہ ہم نے ارادتاً ڈاکٹر الیور پر اپنے معالج ہونے کی حقیقت منکشف نہیں کی تھی، اس لیے وہ تجربہ گاہ میں لٹکے ہوئے بعض نقشے اور تصاویر دکھا کر ہمیں معدے اور آنتوں کے افعال اور ہضم کا نظام سمجھانے لگے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح

آگ کو اچھی طرح جلتا رکھنے کے لیے کوئلہ مناسب مقدار میں اور ٹھیک وقت پر ڈالا جاتا ہے اسی طرح بدن کی آگ قائم رکھنے کے لیے غذا بھی مناسب مقدار میں اور موزوں اوقات پر کھانی چاہیئے۔ ایک دم زیادہ کھا لینے سے انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور غذا ضائع ہوتی ہے۔ جلدی جلدی اور بے وقت کھاتے رہنے سے بدن کی بھٹی خراب ہو جاتی ہے اور ہاضمے کی مشین بگڑ جاتی ہے۔ زیادہ دیر بھوکا رہنا بدن کی آگ کو دھیما اور ہاضمے کی مشین کو سُست کر دیتا ہے۔ کھاتے وقت دانتوں سے غذا کا لقمہ خوب چبا کر نگلنا چاہیئے تاکہ وہ منھ کے لعاب میں اچھی طرح گھل مل کر باریک، نرم اور لیس دار ہو جائے اور اس کا ذائقہ محسوس ہو۔ لعاب میں ایک خاص خمیر ٹایالین بھی ہوتا ہے۔ اس کے اثر سے غذا کے نشاستہ دار اجزا، ایک قسم کی شکر میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور پھر یہ شکر پانی کے ساتھ گھل کر خون میں آسانی سے جذب ہو جاتی ہے۔

ایک اور چارٹ دکھاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مختلف غذائی اجزا کو ہضم و جذب کرنے کے لیے قدرت نے ہمارے بدن میں ایک تیس فیٹ لمبی نالی رکھی ہے جو منھ سے شروع ہو کر مبرز تک جاتی ہے۔ اس کے راستے میں ہضم کرنے والے دوسرے اعضا، مثلاً تھوک کی گلٹیاں، جگر، لبلبہ وغیرہ اپنی نالیوں کے ساتھ وصل ہیں جن کی مدد سے غذا کے مختلف اجزا گھلتے، ہضم ہوتے اور خون میں جذب ہو کر جزوِ بدن ہوتے رہتے ہیں۔ جب غذا معدے میں پہنچتی ہے تو ایک قسم کا رس اس میں شامل ہونے لگتا ہے۔ معدے کی دیواریں غذا کو خوب بلوتی ہیں جس سے غذا نرم اور پتلی ہو کر بواب کے راستے بارہ انگشت والی آنت میں پہنچ جاتی ہے اور پھر واپس نہیں آسکتی۔ معدے میں غذا کو کم و بیش تین گھنٹے لگتے ہیں لیکن مدت کا انحصار غذا کی نوعیت پر بھی ہے۔ معدے میں ٹپکنے والا رس کسی قدر نمکین اور ترش ہوتا ہے۔ اس میں تیزابی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ غذا کو گھلاتا اور نرم کر دیتا ہے۔ اس کی کمی بیشی ہاضمے کی خرابی کا باعث ہوتی ہے۔ اسی رس کا ایک خمیر پیپ سین کہلاتا ہے۔ یہ ہاضمے کے مدارج کی آخری کڑی ہے۔ اسی طرح دو اور خمیر ہوتے ہیں جن کی تفصیل زیادہ طویل ہے۔ ان خمیروں کا یہ اثر ہوتا ہے کہ شکری اجزا اور نشاستے والے اجزا الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ شکری اجزا تو خون میں مل کر اسی میں جذب ہو جاتے ہیں اور نشاستے دار اجزا پوری طرح

جزوبدن بننے کے لیے لبلبے اور آنتوں کی مزید رطوبتوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس کی تیزابی کیفیت معدے کے اندر نشوونما پانے والے جراثیم کو مارتی رہتی ہے۔ اگر اس کیفیت میں کمی ہو جائے تو جراثیم بڑھنے اور خوب فروغ پانے لگتے ہیں اور مختلف قسم کی بیماریوں کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اسی تیزاب کے اثر سے غذا کے لوہے والے اجزا خون میں شامل ہو کر سرخ دانوں کو تقویت دیتے اور ان کی تعداد بڑھاتے ہیں۔

ان کا لیکچر تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ میں نے ہنس کر ان سے کہا کہ آپ کی باتیں معدے کے رس اور اس کے خمیروں سے زیادہ ہاضم ہیں۔ ہم نے جو غذا ناشتے کے وقت کھائی تھی، وہ کبھی کی ہضم ہو کر جزوبدن بن چکی ہے اور معدے کی بھٹی مزید آگ مانگتی ہے۔ میں نے مزاح کے طور پر یہ بات کہہ تو دی لیکن فوراً خیال آیا کہ وہ اس کا مطلب کچھ اور نہ سمجھیں اور چنانچہ یہی ہوا۔ وہ جلدی جلدی ہمیں باقی وارڈوں کی سیر کراتے ہوئے اپنے دفتر میں لے گئے اور پھر کھانا کھانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ لنچ کا وقت ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ یہ لیجے کمرۂ طعام تک چلتے چلتے گزر جائیں گے۔ ہم نے معذرت چاہی اور یہاں تک کہہ دیا کہ ہم دوپہر کا کھانا کھانے کے بالکل بھی عادی نہیں ہیں۔ مگر وہ نہ مانے اور زبردستی ہمیں اپنے ساتھ لے گئے۔ تاہم اتنی رعایت کی کہ اشیائے خوراک کا انتخاب اور اس کی مقدار کا فیصلہ ہم پر چھوڑ دیا۔ لہٰذا ہم نے ابلی ہوئی ترکاریوں اور ایسی چیزوں پر اکتفا کیا جن میں ہمارے عقیدے کی روشنی میں کسی ناجائز شے کی آمیزش کا امکان نہیں ہو سکتا۔ پھل دیکھ کر ہمیں یاد آیا کہ صبح کو بھائی جان محترم نے تجویز پیش کی تھی کہ پھل ساتھ لے لیے جائیں گے لیکن جب روانہ ہوئے تو سب ہی بھول گئے۔ لیکن ہمارے نام کی مہر تو ان پھلوں پر لگی ہوئی تھی جو ڈاکٹر اوبر کے ریفریجریٹر سے نکل کر آئے تھے، اپنے وعدے کے مطابق انھوں نے کسی ایسی چیز کو کھانے کے لیے زور نہیں دیا جسے چھونے کے بھی ہم روادار نہیں تھے۔ چونکہ انھیں ہر قوم اور ہر ملت و مذہب کے افراد سے واسطہ رہتا ہے، اس لیے وہ غالباً سمجھ گئے کہ ہم لنچ کا وقت ہو جانے کے باوجود کھانے سے کیوں ہچکچا رہے تھے۔

جب ہم ان کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے اور ان سے رخصت ہو کر باہر آئے تو ہم نے دیکھا کہ ٹیکسی ڈرائیور بھی کھانا کھانے میں مصروف ہے اور یہ معلوم کر کے

تعجب ہوا کہ اسے کھانا ڈاکٹر موصوف کے حکم سے بھیجا گیا تھا۔ گویا انھیں ڈرائیور کے کھانے کے لیے بھی پابندیٔ وقت کا لحاظ رکھنا پڑا تھا۔

**باد نوہیم**: تیسری صحت گاہ دوسری سے تقریباً سولہ میل اور آگے ہے لیکن ان اداروں کے ساتھ اتنی دل چسپی پیدا ہوچکی تھی کہ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے اور یوں بھی جب ہمیں معلوم تھا کہ وہاں کے چشموں کی نوعیت پہلے دو مقامات کے چشموں سے مختلف ہے، ہمارے لیے وہاں جانا زیادہ مناسب تھا۔ لہٰذا ہم فرینکفرٹ سے اور زیادہ جانب شمال روانہ ہوگئے۔ لمبی لہکاری سڑک اتنی عمدہ تھی کہ اس پر مسلسل گاڑی چلاتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ ہم کوئی تین چار میل گئے ہوں گے کہ سڑک سے قلیل فاصلے پر جانب مشرق ایک چشمے کی دھار دکھائی دی جس کا پانی نکل کر ہلکے شور کے ساتھ یوں ہی بیکار جا رہا تھا۔ ہمیں کسی قدر تعجب ہوا کہ قدرت کی اس نعمت کو نظر انداز کر کے کیوں اس سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

ہم نے ڈرائیور سے گاڑی روک لینے کے لیے کہا۔ اس نے ہمارا منشا سمجھ کر کہا کہ آپ چاہیں تو اس کا پانی پی بھی سکتے ہیں کیونکہ یہ ان چشموں کی طرح نہیں ہے جس سے علاج معالجہ ہوتا ہے اور اس کا پانی سرد بھی بہت ہے۔ ہم نے چشمے کے قریب پہنچ کر تھوڑا پانی چلو میں بھرا تو کپکپی سی آگئی۔ بلاشبہ وہ برف سے ٹھنڈا کیا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ہم سب نے جھک کر اوک سے تھوڑا تھوڑا پانی پیا۔ وہ بالکل سادہ میٹھا پانی تھا۔ اس میں کوئی آمیزش معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ہم حیران تھے کہ آخر طبقاتِ زمین کا اثر اس چشمے کی سوت پر کیوں نہیں پڑا۔ آخر یہ بھی سالہا سال سے بہہ رہا ہے۔ اس کا اصل مرکز کافی گہرائی میں ہوگا۔ وہاں سرد کو گرم سے اور میٹھے کو نمکین کھاری سے بچانے کا التزام قدرت نے کیونکر کیا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اس چشمے کا پانی آگے جا کر کھیتوں کے کام آجاتا ہے اور ایک جگہ گاؤں والوں نے اسے تالاب میں جمع کرنے کا انتظام کر لیا ہے اور اس طرح وہ ان کے دوسرے مقاصد بھی پورے کر دیتا ہے۔

ہم نے کچھ دیر ٹہل گھوم کر قرب و جوار کے ماحول پر نظر ڈالی۔ کس قدر پر فضا مقام تھا لہراتی ہوئی سیاہ سڑک کے علاوہ ہر جگہ سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ مسلسل خاموشی طاری

تھی۔ البتہ کبھی کبھی فضا میں سے اڑ کر گزر جانے والے کسی پرندے کی چہکار اس سکوت کو عارضی طور پر توڑ ڈالتی تھی۔ جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن وقت کے تقاضے نے مجبور کیا اور ہم گاڑی میں بیٹھ کر آگے چل پڑے۔ جب ہم بادنوہیم پہنچے تو کوئی ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ کسی اطلاع کے بغیر اور اس درجہ بے وقت آنے کا احساس ایک دم ہوا لیکن کر بھی کیا سکتے تھے۔

دفتر استقبالیہ میں پہنچے تو پہلی دو صحت گاہوں کے برعکس وہاں کوئی افسر رابطہ موجود نہیں تھے۔ بات بالکل واضح تھی کہ وہ اپنے فرائض انجام دے کر جا چکے تھے۔ کمرے کے ایک گوشے میں درمیانی اسکرین سے ذرا ہٹ کر ایک لڑکی تنہا بیٹھی ہوئی ٹائپ کی مشین سے اپنا دل بہلا رہی تھی۔ یہ رائے اس لیے قائم کی گئی کہ اس کی انگلیاں مشین کے کلیدی تختے (کی بورڈ) پر اپنی تیز رفتاری کے جوہر نہیں دکھا رہی تھیں۔ غالباً اس کے پاس کام کم تھا اور وقت زیادہ، اس لیے اس کی مصروفیت میں جوش و خروش کے بجائے لطافت و نزاکت پائی جاتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اس کے افسر کمرے میں موجود نہیں تھے۔ اور جس طرح بلی کے چلے جانے کے بعد چوہے مزے کرتے ہیں، وہ بھی وقت سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ مجھے ہمدرد فیکٹری کے بعض غیر ذمہ دار کارکن یاد آ گئے، جو کبھی کبھی اپنے انچارج کی غیر موجودگی میں خواہ مخواہ وقت گنوا کر اپنے فرائض کی ادائیگی سے انحراف کرتے ہیں۔

ہماری آہٹ پا کر وہ فوراً مڑی اور اٹھ کر ہماری طرف چلی آئی۔ جرمن انداز میں نہیں بلکہ بین الاقوامی طریقے پر ہمارا استقبال کیا اور گونگے بہرے انسان کی طرح ہمارے سامنے کھڑی رہ گئی۔ ہم نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ پہلی دو صحت گاہوں سے افسرانِ رابطہ کے برعکس یہ لڑکی انگریزی زبان نہیں جانتی۔ میاں محبوب نے حقیقتِ حال کو فوراً سمجھ کر اپنی جرمن زباں دانی کا کمال دکھانا شروع کیا اور کچھ دیر بعد ہم سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ افسر رابطہ تو موجود نہیں ہیں۔ البتہ یہ لڑکی صحت گاہ کے وارڈ وغیرہ دکھانے کے لیے تیار ہے کیونکہ ان کی غیر موجودگی میں ایسے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔ اگر بھائی جان محترم قریب نہ ہوتے تو میں ان سے یہ ضرور پوچھتا کہ تمھاری باتیں صرف اسی حد تک ہوئی ہیں جن کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ دو منٹ کی مسلسل گفتگو

کا مطلب صرف تین جملوں میں کیسے ادا کیا جا سکتا تھا۔

بہر نوع ہم نے اس کی خدمات کو بخوشی قبول کیا اور اس کے ہمراہ چل پڑے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہاں نہ تو صحیح لطف آئے گا اور نہ معلومات میں زیادہ اضافہ ہوگا۔ آخر میاں محبوب کہاں تک مترجم کے فرائض انجام دیں گے۔ حالانکہ اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنے اور ایک ایک بات کو پوری طرح سمجھنے کی ضرورت تھی کیونکہ یہ صحت گاہ بادہومبرگ سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ اس میں چونسٹھ معالجین اور دوسرے فنی اور انتظامی عملے کے افراد کام کرتے ہیں اور بیک وقت ساڑھے چار ہزار مریضوں کو زیرِ علاج رکھنے کی گنجائش ہے۔ اس میں لیبارٹریوں کی تعداد بھی زیادہ ہے کیونکہ امراضِ قلب، دورانِ خون کی خرابی، وجع المفاصل، عرق النسا اور بہت سے اعصابی عارضوں کا علاج ہوتا ہے۔

یہاں استعمال ہونے والے ایک چشمے کے پانی میں تابکار اجزا کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے جسے دل کی بیماریوں کو دور کرنے کے لیے ایک نعمت کہا جا سکتا ہے ایک اور چشمے کے پانی میں بعض کیفیات کا اثر پایا جاتا ہے جو اعصاب کی حالت درست کرنے کے لیے کارآمد ہے۔ یہاں "ولیم جی کرخوف" کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم ہے جس میں طلبا اور طالبات کو داخل کر کے باقاعدہ تعلیم و تربیت بھی دی جاتی ہے۔ چار ہفتے تک کے علاج کے لیے تقریباً آٹھ سو جرمن مارک معاوضے کے اور چالیس مارک سرکاری ٹیکس کے طور پر وصول کیے جاتے ہیں۔

یہ باتیں ہمیں میاں محبوب کے وسیلے سے معلوم ہوتی رہیں اور ہم خاموشی کے ساتھ وارڈوں میں پڑے ہوئے مریضوں کو دیکھ کر گزرتے رہے۔ افسرِ رابطہ کی عدم موجودگی سے جو ملال ہوا، وہ یقیناً یاد رہے گا اور اس کی تلافی نہیں ہو سکے گی، کیونکہ اب پروگرام میں مزید قیام کی گنجائش نہیں ہے اور دوبارہ اس طرف آنے کا امکان نظر نہیں آتا۔ کاش ہم اس صحت گاہ کے اربابِ حل و عقد کو پہلے سے اطلاع کر دیتے اور ان سے مناسب وقت لے کر یہاں آتے۔ اس صحت گاہ میں بہت سی باتیں دریافت طلب ہو سکتی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ اس زمانے میں دل کی شکایات دنیا بھر کے ہر حصے میں انسان کو بری طرح پریشان کر رہی ہیں جیسا کہ حضرت جگر مرادآبادی

نے اپنے خاص شاعرانہ انداز میں کہا ہے ؎

تجلّی سے کہہ دو، ذرا ہاتھ روکے
بہت عام اب دِل کی بیماریاں ہیں

شاعر اور ادیب کہتے ہیں کہ تمام جذبات اور احساسات کا مرکز دل ہے اور خصوصاً محبوب کی تصویر تو نہاں خانۂ دل ہی میں محفوظ رہتی ہے لیکن تشریح بدن کرنے والے ماہرین کا تردیدی بیان یہ ہے کہ دِل خون کو گردش دینے والی مشین کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انسانی جسم کا یہ سب سے زیادہ محنتی عضو پیدائش کے وقت سے مرتے دم تک برابر سکڑتا اور پھیلتا رہتا ہے اور اس کے سکڑنے اور پھیلنے ہی پر خون کے دوران کا انحصار ہے۔ نامساعد حالات کے تحت اس کے وظائف میں فرق آجاتا ہے تو طبیعت ناساز ہو جاتی ہے اور یہ ناسازئ طبع کبھی ذرا طول کھینچ کر اور کبھی یکلخت سببِ موت بن جاتی ہے۔ اس زمانے میں رہن سہن کے جو مذموم طریقے رائج ہیں، جو ناقص غذا عام طور پر میسر آتی ہے اور جن ذہنی پریشانیوں سے واسطہ پڑتا ہے، وہ الگ الگ اور مل جل کر سوہانِ روح بنتی ہیں جسے عوارضِ قلب کا پیش خیمہ کہنا چاہیئے۔

لیکن قاعدے کی بات ہے کہ جس چیز کا چرچا زیادہ ہو، اس کے بارے میں نت نئی روایات گھڑلی جاتی ہیں۔ دِل کی دنیا بھی اس قاعدۂ کلیہ سے الگ نہیں ہے۔ اور دیکھا جائے تو غلط عقائد کی یہی بنیاد کامیابی کے ساتھ علاج کرنے کے لیے معالج کے طریقِ کار میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ ایک تو خواہ مخواہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دِل کی کوئی بھی شکایت —— حتیٰ کہ دھڑکن تک —— لاحق ہو تو وہ ضرور جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی انسان کی تدریجی موت واقع ہو جاتی ہے مریض اور بسا اوقات تیمار دار بھی ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ بیمار کا حال پوچھنے والے اور بھی ستم ڈھاتے ہیں۔ وہ دل کے دوسرے مریضوں کی کیفیت اور ان کے مرنے کا حال سنا کر اپنے قابلِ رحم رفیق کو ذہنی اعتبار سے ادھ موا اور پھر جسمانی لحاظ سے یکسر مُردہ بنا دیتے ہیں بقول شاعر ؎

دردِ دل اور جان لیوا پُرسشیں
ایک بیماری کی سو بیماریاں

بعض موذی بیماریوں کی طرح دل کی شکایات کو بھی بعض لوگوں نے جدی سمجھ لیا ہے کہ وہ نسلاً بعد نسلٍ ورثے میں ملتی رہتی ہیں۔ چنانچہ دل کے عارضے میں مرنے والے کی اولاد بلا وجہ اس وہم میں مبتلا ہو جاتی اور جی چھوڑ بیٹھتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دل کا مرض محض ایک جذباتی مسئلہ ہے اور بعض کا خیال ہے کہ وہ یکسر جسمانی عارضہ ہے، جذبات سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت دونوں نظریات کے بین بین ہے۔ تاہم ان کے مابین کوئی خطِ اتصال قائم نہیں کیا جا سکتا جس سے معلوم ہو سکے کہ کہاں تک جذبات اثر انداز ہیں اور کہاں سے جسم مبتلائے درد ہوا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ دل و دماغ ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں اور ان کے ردِ عمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس ضمن میں صحیح معالج وہی ہے جو اصلاحِ جسم کے ساتھ تزکیۂ قلب کا بھی لحاظ رکھتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ دردِ دل کی بیماری موجودہ ہیجان انگیز تہذیب کا تحفہ ہے اور یہ نظریہ اس بنیاد پر قائم کیا گیا ہے کہ دیہات کے سیدھے سادے معاشرتی طبقوں میں اس بیماری کا حملہ برائے نام ہوتا ہے اور مشینی دور سے گزرنے والی شہری زندگی کا دامن اس سے بچا نہیں رہتا لیکن اعداد و شمار سے اس کی تکذیب ہوتی ہے۔ اسی ذیل میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عیش پسندانہ زندگی اور دل کی بیماری میں چولی دامن کا سا تعلق ہے۔ حالانکہ اس کا ثبوت مشکل سے فراہم ہو سکتا ہے۔ عیش پسند لوگوں کے حادثاتِ زندگی کا بہت جلد چرچا ہو جاتا ہے اور سادگی پسند افراد کے حالات روشنی میں نہیں آتے۔ ورنہ یہاں بھی اعداد و شمار کے حقائق تذبذب میں ڈال دیں گے۔ محض عیش پسندی عارضۂ قلب کا باعث نہیں بنتی۔ البتہ اس کے لوازم — ضرورت سے زیادہ خورد و نوش کی عادت، سگریٹ نوشی، بادہ خواری، مرغن غذا، دماغ پر زیادہ کام کا بار، لہو و لعب میں منہمک رہنے کے باعث شب بیداری اور صبح کو دیر تک سوتے رہنے کا معمول — ضرور قابلِ غور کہے جا سکتے ہیں۔

شاعروں نے دل کو بہت ہی نازک عضو قرار دیا ہے، حالانکہ جسم میں سب سے زیادہ مشقت کا کام یہی کرتا ہے۔ یہ عضو جس کا اپنا وزن چار چھٹانک کے قریب ہوتا ہے، مسلسل خون کو رگوں میں اور رگوں میں سے واپس دل میں لانے میں شب و روز مصروف

رہتا ہے۔ انسان کی اوسط عمر پچاس سال سمجھ لی جائے تو اس حساب سے وہ اس مدت میں تقریباً بارہ ہزار ٹن وزن کا خون رگوں میں ادہر سے ادہر پھینک دیتا ہے۔ کوئی اور عضو اس قدر تواتر کے ساتھ کام بھی نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ سوچنے سمجھنے والا دماغ بھی انسان کے ساتھ ساتھ سو جاتا ہے۔ معدے میں غذا پہنچنے سے پہلے یا اس کے ہضم ہو جانے کے بعد اس کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ اس کا مددگار یعنی جگر بھی ذرا آرام کرنے لگتا ہے۔ لیکن دل برابر مصروفِ عمل رہتا ہے۔

جب سے سرجری نے ترقی کی ہے اور جسم کے اندر پائے جانے والے زخموں کا حال معلوم ہوا ہے، اناڑی جراحوں نے حکم لگا دیا ہے کہ دل میں کسی زخم کا ہو جانا موت کی علامت ہے۔ حالانکہ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ قاتل کی چھری یا بندوق کی گولی اس کے پار ہو گئی اور وہ فدویانہ انداز میں بدستور حرکت کرتا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے لیکن اکثر صورتوں میں جسم کا قدرتی فعل معمولی خراشوں اور بعض دفعہ بڑے گھاؤ کا خود ہی اندمال بھی کر لیتا ہے۔ ایک یہ غلط فہمی بہت عام ہو گئی ہے کہ دل کا مریض اچانک موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہ کیفیت بھی چند ہی صورتوں میں رونما ہوتی ہے۔ ورنہ دق کے مریض کی طرح دل کا بیمار بھی عموماً رفتہ رفتہ ختم ہوتا ہے۔ دل کے بہت سے عارضے مزمن ہو جاتے ہیں۔

دماغ کی رگوں میں خون کا انجماد جس درجہ اچانک موت کا باعث ہوتا ہے، دل کی کوئی شکایت اس کی نظیر نہیں بنتی۔ محنت و مشقت کے بعض کاموں کو بھی شکایاتِ قلب کا سبب قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ضرورت سے زیادہ جسمانی حرکت دل کی ضربات کو تیز کرتی ہے لیکن صرف ایک بار سا محسوس ہوتا ہے۔ اس کے اعصاب کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ البتہ، اگر دل میں واقعی کوئی نقص ہو تو زیادہ جسمانی حرکت اس کے لیے مضر اور بعض صورتوں میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ دل کے مریضوں کو عموماً یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو دن رات بستر پر پڑے رہیں اور ذرا بھی نقل و حرکت نہ کریں۔ جب بیماری کئی مدارج طے کر جائے اور قابو سے باہر ہو جائے تو اس ہدایت پر عمل کرنا مناسب ہے۔ ورنہ دل کے بیماروں کے لیے عام نقل و حرکت مضر نہیں کہی جا سکتی۔ ضرباتِ قلب بے قاعدہ ہوں تو عام طور پر اس کی

وجہ دل کی بیماری ہی کہی جا سکتی ہے۔ حالانکہ ضربات کا بے قاعدہ ہو جانا کئی باتوں پر منحصر ہے جن میں معدے کی خرابی بھی شامل ہے۔ سینے کے اس مقام پر جس کے نیچے دل کی جگہ معین ہے، درد کی کسک ہو تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ درد دل میں اٹھ رہا ہے حالانکہ آنتوں کے راستے میں کبھی ہوا بھر جانے سے یا پٹھوں کے اکڑ جانے سے یہ کیفیت نمودار ہوتی ہے۔ یکایک بے ہوش ہو جانے کو بھی دل کی ایک بیماری سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ دماغ میں خون یا اوکسیجن کافی مقدار میں نہ پہنچے تو بے ہوشی لازمی ہے۔ حیرت انگیز یا غیر متوقع خبروں کا تاثر بھی یہی نتیجہ برآمد کرتا ہے۔

دل کے مستند معالجین اس قسم کی باتوں پر دل ہی دل میں ہنستے لیکن ان کو نظرانداز کئے بغیر مریض کا علاج کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ دل کے معالج کے لیے ماہر نفسیات ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باد نوہیم کے چونسٹھ معالجین میں سے تقریباً نصف انسانی نفسیات کے ماہر ہونے کی سندیں بھی رکھتے ہیں اور چونکہ اس صحت گاہ سے متعلق چشموں کے پانی میں کاربن گیس کی کافی مقدار ملی ہوتی ہے، اس لئے دل کے عام امراض اور دوران خون کی بے قاعدگیوں کا علاج آسانی سے ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ پانی کی قدرتی کیفیات جلد کے ذریعہ جذب ہو کر جسم کی سب سے زیادہ حیرت انگیز مشین پر مفید اثر ڈالیں۔ پانی کی حرارت اور نمکین اجزا کی تاثیر سست شریانوں کی رفتار کو قابو میں لا کر قلب کی ضربات میں باقاعدگی پیدا کر دیتی ہے، جسے علاج کی منزل میں سب سے اہم قدم کہا جا سکتا ہے۔ گویا دل کی کھیتی میں کھال کی کاریزوں کے ذریعہ آبپاشی کی جاتی ہے۔ ابلتے ہوئے پانی کی گرم گرم بھاپ بھی جس میں قیمتی معدنی اجزا زیادہ لطیف حالت میں پائے جاتے ہیں، سانس کے ذریعہ پھیپھڑوں میں پہنچائی جاتی ہے اور پھیپھڑے ان اجزا کے اثرات کو دل تک منتقل کر دیتے ہیں۔ اور دل اپنے طور پر دوران خون کو متاثر کر دیتا ہے۔ اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ایسے مریضوں کو اس پانی میں غسل کرنے یا اسے پینے سے باز رکھا جاتا ہے۔

یہاں زیادہ دیر ٹھیرنا غیر ضروری تھا کیونکہ اپنے مطلب کی باتیں زیادہ وضاحت کے ساتھ علم میں نہیں آ رہی تھیں اور مترجم کا وسیلہ اس مقصد میں ذرا تکلیف پیدا

کر رہا تھا۔ تاہم جب ہم مختلف وارڈوں میں ایک سرسری نظر ڈال کر واپس صحت گاہ کے صدر دروازے پر پہنچے اور اس خاتون کا، جس کا نام پوچھنا بھی یاد نہیں رہا، شکریہ ادا کر رہے تھے تو ہمیں ادارے کے ڈائرکٹر کا پیغام ملا کہ اگر ہم کل کسی وقت آئیں تو ہمیں ہر چیز واضح طور پر بتانے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ ہماری آمد کی اطلاع ان تک کیسے پہنچی؟ یہ ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ دوسرے روز آنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا، اس لیے ہم نے میاں محبوب سے کہا کہ راہنامے میں گنجائش نہ ہونے کا عذر پیش کرتے ہوئے ہماری طرف سے معذرت کر لی جائے۔ چونکہ ان کی تحریر جرمن زبان میں تھی، اس لیے میں نے اس کا جواب میاں محبوب سے لکھوانا مناسب سمجھا۔ جی میں تو آئی تھی کہ اس دعوت نامے کا جواب اردو میں لکھ دوں کیونکہ اگر ہمارے یہ بھائی ساتھ نہ ہوتے تو جرمن زبان کو سمجھنے کے لیے کسی اور کا سہارا لینا پڑتا۔ اسی طرح وہ بھی کسی اردو داں کی تلاش میں رہتے۔ ممکن ہے کہ ان کو اطلاع دیتے وقت یہ واضح نہ کیا گیا ہو کہ ہم پاک و ہند کے رہنے والے ہیں اور جرمن زبان کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اطلاع دینے والے نے یہ بھی بتا دیا ہو کہ اس مختصر سی جماعت کا ایک رکن اس سرزمین کی زبان جانتا ہے۔ اسی گمان کے پیشِ نظر میں نے میاں محبوب سے جواب لکھوا دیا۔

ہم باہر آئے تو ٹیکسی تو موجود تھی لیکن ٹیکسی ڈرائیور صاحب موجود نہیں تھے۔ غالباً انھوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم جتنی دیر بادھو مبرگ میں ٹھیرے ہیں، قریب قریب اتنا ہی وقت یہاں بھی صرف کریں گے۔ اس لیے وہ بقول موسیو اقبال حسین "کہیں کھیل گئے تھے"! معاً موسیو یاد آ گئے۔ تقسیم برصغیر سے قبل جو تفریحی دورے یا سیر و سیاحت کے مشغلے رہتے تھے، ان میں موصوف ہمیشہ ہمارے شریکِ سفر رہے۔ اس زمانے کی باتیں یاد کر کے ہم سب بہت ہی محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے ملک کی سرحد سے باہر نکل کر اس روایت کو نبھانا فی الحال ممکن نہیں تھا۔ اس لیے وہ ساتھ نہیں آئے اور آج ایک دم ان کی یاد آ گئی۔ یورپ کے اس طویل سفر میں ان کی معیت یقیناً ہم سبھی کے لیے باعثِ دلچسپی ہوتی۔ ان کی طبیعت بہت سے لطائف پیدا کر دیتی۔ اس سفر کے دوران میں چونکہ خطوط لکھنے کا فریضہ بھائی جان محترم نے اپنے لیے

مخصوص کر رکھا تھا، اس لیے میں نے ان سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو اور وقت مل سکے تو موسیو کو مختصر حالاتِ سفر سے باخبر کر دیا جائے۔

میں موسیو سے مشترک پچھلی باتوں کو یاد کرنے میں اس درجہ محو ہوا کہ ڈرائیور کی "تلاش میں جانا محبوب کا اور واپس آنا اس کے ساتھ" مجھے اس وقت معلوم ہوا جب کہ انھوں نے پکار کر مجھ سے کہا کہ اب چلیے، گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ معلوم ہوا کہ ڈرائیور صاحب قریب کے ایک بار روم میں کچھ "پینے" چلے گئے تھے۔ جرمنی میں شراب نوشی بہت عام ہو گئی ہے اور امریکی تسلط کے بعد سے تو اس کا رواج عورتوں میں بھی زیادہ تیزی پکڑ گیا ہے۔ یہ امریکی جہاں بھی جاتے ہیں، معاشرے کے نظام اور قومی روایات کے احترام کو صدمہ پہنچائے بغیر نہیں رہتے۔ جرمنوں میں تو دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے باوجود خاصی سکت باقی رہ گئی تھی، اس لیے وہ ان خدائی فوجداروں کے ہتھے زیادہ نہیں چڑھے۔ البتہ جاپان کے باشندے اپنی روایات کو کھو بیٹھے۔ میک آرتھر نے ان کی دو ہزار سال پرانی روایات کا بیڑا غرق کر دیا۔ پھر بھی جرمنی میں امریکیوں کا پھیلایا ہوا زہر زیادہ نمایاں معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ ملک بہرحال یورپ کا یعنی مغربی دنیا کا ایک حصّہ ہے۔ جاپان میں، جو ایک بالکل ہی مختلف تہذیب کا حامل تھا، دوسری عالمگیر لڑائی کے بعد کا معاشرتی انقلاب زیادہ گہرا ناسور بن گیا۔ ۱۹۳۳ء سے پہلے بھی جرمنی میں شراب پی جاتی تھی اور یہاں کی بعض مخصوص شرابیں یورپ بھر میں مشہور تھیں لیکن عام طور سے اعتدال کے ساتھ اس منزل میں قدم اٹھانا جرمنوں کا شیوہ تھا اور اب بہت سی باتوں میں بے اعتدالی ایک خاص طبقے کے لیے طرۂ امتیاز بنی ہوئی ہے۔ تاہم اس قوم کے افراد کو اس لحاظ سے اپنے انحطاط کا احساس ہے۔ جب بھی موقع ملا، وہ اوپر چڑھا ہوا ملمع اتار پھینکیں گے۔

**چقندر کے کھیت:** کون جانے میاں محبوب کے ڈھونڈ نکالنے سے ڈرائیور کا شغل ادھورا رہا یا پورا ہو چکا تھا۔ بہر نوع ہم شہر فرینکفرٹ کی طرف چل پڑے اور اب بھی ڈرائیور کو ہدایت کی کہ گاڑی ذرا آہستہ چلائی جائے تاکہ ہم راستے کے ماحول کا لطف اٹھاتے چلیں۔ اس "آٹو بھان"، پر جس پہ ہٹلر کو بڑا فخر و ناز تھا، گاڑی میں بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ اس کے پہیے زمین پر ٹکے ہوئے نہیں، فضا میں ادھر ہیں،

جیسے ہوائی جہاز کہ اس میں پرواز کے وقت کوئی جھٹکا محسوس نہیں ہوتا۔ ابھی تھوڑا فاصلہ طے کیا گیا تھا کہ ہمیں راستے کے ایک جانب جس پر سڑک کے وسیع العرض ہونے کے باعث آتے وقت نظر نہیں پڑ سکتی تھی، دور تک سرسبز و شاداب کھیت نظر آئے۔ ہم نے یہ پتہ لگانے کے لیے کہ یہاں کس چیز کی کاشت ہو رہی ہے، گاڑی کو ذرا رکوایا۔ دور تک چقندر کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ اگر آپ صبح سے شام تک چلتے رہیں تو ان کھیتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ یہ کٹائی کا زمانہ تھا اور اس نرم و نازک چیز کو بھی مشینوں کے ذریعہ کاٹا جا رہا تھا۔ ایک ہلکی سی مشین بہت تیزی سے پتے کاٹتی اور ایک طرف جمع کرتی جا رہی تھی اور دوسری مشین ٹھوس چقندر کے ڈلے مٹی میں سے نکال نکال کر گیند کی طرح اچھالتی اور پتوں والی مسلسل ڈھیری کے ساتھ ساتھ ان کا انبار لگاتی جا رہی تھی۔

لڑائی سے پہلے جرمنی کے محض تین فیصد باشندے مجبوراً گنے کی شکر استعمال کرتے اور باقی چقندر کی شکر پسند کرتے تھے۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد کچھ عرصے تک گنے کی شکر بھی درآمد کی گئی اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اس لیے گنے کی شکر استعمال کرنے والوں کی اوسط دس فیصد ہو گئی ہے۔ بظاہر یہ تناسب ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ چقندر کی کاشت کے لیے رقبے میں پہلے سے بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اور مشینی دور چل پڑا ہے۔ نیز بیج کی صرف وہی قسمیں استعمال کی جا رہی ہیں جو زیادہ رسیلے اور میٹھے چقندر پیدا کر سکتی ہیں۔ اس لیے اگر کاشت کی مجموعی مقدار کا اندازہ لگایا جائے تو وہ بہت بڑھ گئی ہے لیکن اس کی شکر کا ایک اچھا خاصا حصّہ برآمد کر دیا جاتا ہے اور اس طرح لوگوں کو گنے کی شکر بھی قبول کرنی پڑتی ہے جو قیمت کے اعتبار سے نسبتاً ذرا سستی ہوتی ہے۔ گنے کی شکر کے نقصانات، خصوصاً وہ جو دانتوں کو پہنچتے ہیں چقندر کی شکر میں نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ بھی اس میں خوبیاں ہیں جو صحت بخشی کے اعتبار سے نعمت کہی جا سکتی ہیں۔ ذائقے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ڈرائیور اس شئے میں ہماری دلچسپی دیکھ کر آگے بڑھا اور کھیت میں سے ایک چقندر اٹھا لایا جو اوسط درجے کے ایک ناریل کے برابر تھا۔ اس نے ایک حصّہ کو جلدی جلدی چھیلا اور ایک قاش نکال کر ہم سے کھانے کے لیے کہا۔ پہلے تو کچھ جھجک سی محسوس ہوئی لیکن معلومات اور عملی تجربے کے طور پر اسے چکھ لینا پڑا۔ گنے جیسی یہ بات اس میں

نہیں تھی کہ بہت سارس چوس لینے کے بعد منہ میں خشک پھوک باقی رہ جائے، کیونکہ گنے کے ریشے سخت ہوتے ہیں۔ یہاں ریشے کا نام نہیں اور گود اسیب یا ناشپاتی کی طرح نرم کہ اسے چبا کر رس پیئے اور باقی حصے کو کھاتے رہو۔ البتہ عرق نکالنے کی کلیں عمدہ چقندر میں سے اسی فیصد کی حد تک رس نکال لیتی ہیں اور صرف بیس فیصد پھوک باقی رہ جاتا ہے۔ چقندر کے پتے تو خیر چارے کے کام آہی جاتے ہیں لیکن پھوک بھی جانور نہیں چھوڑتے۔ وہ ذائقے کے علاوہ ان کے لیے بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ چقندر کا رس تو قدرتی طور پر سُرخ نکلتا ہے لیکن کیمیاوی دور سے گزرنے کے بعد سفید شکر تیار ہوتی ہے۔ یہ جدید طریقہ ہے۔ ورنہ کچھ عرصے پہلے اس قسم کی شکر سُرخی مائل ہوا کرتی تھی لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکے گا کہ جس طرح دانہ دار چینی کے مقابلے میں گڑ اپنی تاثیر کے لحاظ سے بہتر کہا جا سکتا ہے، اسی طرح چقندر کی سُرخی مائل شکر سفید سے زیادہ اچھی ہوتی تھی محض ذوقِ نظر کی خاطر اس کا رنگ بدل کر اس کے بعض قدرتی جوہر قربان کر دیئے گئے۔

**پہاڑ کے دامن میں:** گاڑی میں کچھ دیر تک چلتے رہنے کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ ہم ذرا بلندی کی طرف جا رہے ہیں اور کسی بالکل ہی نئے مقام سے گزر رہے ہیں کیونکہ جاتے وقت ہمیں اس قدر اترائی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ دونوں طرف گھنا جنگل بھی تھا اور ساڑھے تین بجے کا عمل ہونے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بالکل شام ہوگئی ہے اور سورج چھپنے کے قریب ہے۔ یہ کیفیت کسی بادل کے چھا جانے سے پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ سبب یہ تھا کہ دیو دار کے بلند قامت درختوں نے سورج کی شعاعوں کو بڑی حد تک روک لیا تھا۔ یہ اندازہ لگا لینا آسان تھا کہ ڈرائیور ہم کو بالکل ہی نئے راستے سے لے جا رہا ہے لیکن اس کا مقصد کیا ہے؟ کیا وہ ہمیں لمبا چکر دے کر زیادہ رقم وصول کرنی چاہتا ہے؟۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے میاں محبوب سے کہا، "اس سے پوچھو، ہم اس وقت کہاں ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟ راستہ بدلنے کی کیا وجہ ہے؟"

ڈرائیور ان کے استفسارات پر مسکرایا اور کہا کہ آپ لوگ سیر و سیاحت کے لیے آتے ہیں تو مناسب یہی ہے کہ مختلف راستوں سے گزرا جائے۔ یہ راستہ بے شک ذرا لمبا ہے لیکن آپ ٹونس پہاڑ کے دامن میں اسی نام سے مشہور جنگل کے جنوبی

سرے سے گزر رہے ہیں۔ یہ علاقہ سیاہ جنگل جتنا ہی گھنا ہے اسلئے بعض لوگ اسے بھی سیاہ جنگل کا حصّہ ہی سمجھتے ہیں۔ دوسری بڑی لڑائی میں اس جنگل کے کسی گوشے میں آگ نہیں لگی اور نہ درختوں کو کسی اور طرح نقصان پہنچا، ورنہ دوسرے علاقے تو بری طرح جل کر ختم ہو گئے تھے جس کا نتیجہ ہر لحاظ سے برا نکلا۔

اس نے خود ہی ایک مقام پر گاڑی روک لی اور ہم سے باہر نکل کر سیر کرنے کے لیے کہا۔ حقیقتاً یہ جگہ بہت ہی شاداب اور پر فضا تھی۔ دو پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی نظر آ رہی تھیں اور دامن سے چوٹی تک سرسبز تھیں۔ دور سے کسی پہاڑ کے اطراف کا نظارہ کیا جائے تو درختوں کے خدوخال دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تمام سطح سبزے سے ڈھک دی گئی ہے۔ ٹونس پہاڑ کی یہ دو چوٹیاں کلیر۔ فلڈبرگ اور آلٹ کونگ کہلاتی ہیں اور دامن سے ڈھائی ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں۔ ان سے جلانے کے علاوہ نہایت عمدہ عمارتی لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ یہ سارا علاقہ عمارتی لکڑی کے اعتبار سے نعمت ہے دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب ملک میں امن وسلامتی کی فضا طاری ہو گئی اور تعمیر کا سلسلہ شروع کر لیا گیا تو سب سے زیادہ اسی علاقے کی عمارتی لکڑی کام آئی صوبہ ہیسے کے علاوہ ملک کے دوسرے صوبوں بلکہ دوسرے ملکوں تک کے لیے فراہم کی گئی۔

ماہرین کا اندازہ ہے کہ لڑائی میں جو جنگلات تباہ ہوئے، ان کا مجموعی رقبہ تیس لاکھ ایکڑ کے قریب ہوگا۔ کم وبیش اتنا ہی جنگلاتی حصّہ مشرقی جرمنی میں ہے جو اس علاقے کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہے۔ وہاں تو عمارتی لکڑی بھی ایندھن کے طور پر استعمال ہو رہی ہے جسے قومی نقصان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ البتہ مغربی جرمنی میں یہ سلسلہ زیادہ مدّت نہیں چلا۔ چونکہ کان کنی کا کام رک گیا تھا، کانوں میں کھدائی کرانے کے کارخانے تباہ ہو گئے تھے، کوئلہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے ہر قسم کے درخت کاٹ کاٹ کر جلا دیئے گئے۔ تاہم حکومت نے بہت جلد حالات پر قابو پا لیا۔ کانوں سے کوئلے کی برآمد کا سلسلہ شروع ہوتے ہی جنگلات پر احتساب کر دیا گیا اور اس اثنا میں جو نقصان پہنچا تھا، اس کی تلافی کرنے کے لیے درخت کاری کی مہم چلائی گئی۔ ویران علاقوں میں وہ بیج بوئے گئے جن کے پودے جلد پروان چڑھ کر

درخت بن سکتے ہیں۔ اب جنگلات کا مسئلہ حکومت کے لیے پریشان کن نہیں رہا ہے۔ عمارتی لکڑی کی برآمد سے کافی زرمبادلہ حاصل ہونے لگا ہے۔

اسی جنگل میں لیکن بہت دُور جانبِ شمال گوشت خور درختوں کے کئی جھنڈ پائے جاتے ہیں۔ ہم نے ایسے درختوں کا حال پڑھا ہے، انھیں قریب سے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مقررہ راہ نامے میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ہم یہ آرزو پوری کر لیتے۔

ہمارے قریب کی جھاڑیوں میں خوشنما پھول کھل رہے تھے اور ان میں سے بعض میں تیز قسم کی بُو تھی جو شاید دور تک پھیلتی ہوگی۔ کوئی جرمن ماہرِ نباتات ہمارے ساتھ ہوتا تو ہمیں ان جھاڑیوں اور پودوں کی حقیقت سمجھاتا اور ہم اس سے پوچھ سکتے کہ دوائی استعمال کے اعتبار سے ان میں کتنے پودوں اور ان کے اعضا کی چھان بین ہو چکی ہے، کیونکہ یہ تو حقیقت ہے کہ جرمنی میں دوسری عالمگیر لڑائی کے بعد اس موضوع پر تحقیقاتی تجربے بڑے پیمانے پر کیے گئے ہیں۔

ڈرائیور نے بتایا کہ اس جنگل میں داخل ہو کر ذرا احتیاط کے ساتھ چلا پھرا جاتا ہے اور ٹانگ پھیلا کر کہیں آرام کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ مختلف قسم کے سانپوں کی کثرت ہے جن میں سے بعض زہریلے بھی ہوتے ہیں۔ اس نے خاص طور پر اس سانپ کا ذکر کیا جس کے چلنے میں جسم کی ہڈیاں بجتی ہوئی سی سنائی دیتی ہیں۔ وہ بے حد زہریلا ہوتا ہے۔ عموماً اچھل کر افعی کی طرح وار کرتا ہے۔

اسی جنگل کے غربی حصّے میں ایک صحت گاہ دریائے رہائن کے قریب شلانگن باد کے نام سے مشہور ہے جو اسی علاقے میں پائے جانے والے ایک سانپ کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ اسی قسم کے سانپ کا جوڑا یونان کے دیوتائے طب ایس کیولے پی اس کے عصا پر بل کھاتا دکھایا جاتا ہے اور اس زمانے سے لے کر آج تک صحت بخشی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے زیادہ دیر ٹھیرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ ہمیں بتایا گیا کہ شہر فرینکفرٹ اس مقام سے تقریباً ستره میل دُور ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈرائیور صاحب نے ہمیں خاصا لمبا چکر دے دیا تھا۔ ہمیں تشویش تھی کہ منزلِ مقصود پر پہنچنے تک نہ جانے کتنی بڑی رقم کا بل بن جائے گا۔ میاں محبوب نے موٹر کا کرایہ نامہ دیکھ لیا تھا لیکن ہمیں نہیں بتایا تھا۔ راستے میں اور کئی مقامات ایسے آئے

جن کے مناظر دامنِ دل کھینچ کر کہتے تھے کہ قابلِ دید جگہ یہ بھی ہے لیکن ہم اپنا دامن بچا کر چلتے ہی چلے گئے۔

ساڑھے چار بجے ہم فرینکفرٹ کے ایک بڑے بازار میں پہنچ گئے جو شاہراہِ زیلن کے نام سے مشہور ہے۔ ہم نے وہیں اتر کر موٹر کار کو چھوڑ دینا مناسب سمجھا اگرچہ ہم کسی قدر تھک گئے تھے لیکن فرینکفرٹ میں یہ شام ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر گزارنی نہیں چاہتے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے چالیس مارک کا مطالبہ نہیں کیا لیکن میاں محبوب نے جرمن زبان میں اسے سمجھا دیا کہ ہم تمہاری حق تلفی نہیں کریں گے۔ قاعدے سے جو رقم بنتی ہے، اس سے کچھ زیادہ ہی ادا کریں گے اور یہ کہہ کر انھوں نے بیس مارک اس کے حوالے کیے اور بتایا کہ پورے دن میں صبح ۸ بجے سے رات کے ۸ بجے تک اگر ایک سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا جائے تو بیس مارک کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ ہم نے گاڑی سوا آٹھ بجے لی تھی اور اب ساڑھے چار بجے ہیں۔ جو فاصلہ ہم نے طے کیا، وہ اسی کلومیٹر سے بھی کم ہے، لہٰذا جو رقم تم کو دی جا رہی ہے، وہ واجبی کرائے سے بہت زیادہ ہے۔ غنیمت ہے کہ ڈرائیور نے بہت جلد اس بحث کو ختم کر کے بیس مارک قبول کر لیے۔

نئی لائبریری: شاہراہ زیلن پر ایک لائبریری کی شاندار عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ بہت حصّہ بن چکا ہے لیکن اسے پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں مزید تین سال لگیں گے۔ اس لائبریری میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد ملک میں چھپنے والی ہر کتاب مل سکے گی۔ اس مقصد کے لیے کتابیں جمع کر لینے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور فی الحال ان کو ایک اور عمارت میں کسی ترتیب کے بغیر رکھا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اب تک تین لاکھ کتابیں جمع ہو چکی ہیں اور افتتاح کے وقت تک ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ ہو جائے گی۔ عمارت بہت وسیع اور کئی منزلہ ہوگی اور اس میں شائقینِ علم کی رہائش کا انتظام بھی ہوگا تاکہ وہیں رہ کر وہ تحقیقاتی کام اچھی طرح کر سکیں۔ ہمارے ملک میں لوگ رہائشی لائبریری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اربابِ حل و عقد دوسرے ملکوں سے سبق لینا اور ان کے نقوشِ قدم پر چلنا بھی نہیں چاہتے۔ ورنہ یہ مسئلہ اتنا دشوار نہیں ہے کہ ذرا کوشش سے اسے حل نہ کیا جا سکے۔ میں نے اپنے ذاتی کتب خانے میں جو کتابیں جمع کی ہیں، وہ کسی نہ کسی

دن قوم کے نام وقف ہو جائیں گی اور ان سے ایک ایسی طبی لائبریری کی تشکیل ہو گی جو انشاء اللہ رہائشی ہو گی۔

**طلبا کی کلب :** چلتے چلتے ہم ایک شاندار عمارت کے قریب سے گزرے معلوم ہوا کہ یہ جرمن اور غیر ملکی طالب علموں کی مشترک کلب ہے۔ شروع میں تعلیمی تبادلے کے نام پر ایک انجمن قائم ہوئی تھی جس کا کام یہ تھا کہ جرمن طلباء کے لیے دوسرے ملکوں میں اور غیر ملکی طلبا کے لیے جرمنی میں تعلیم، رہائش اور وظیفوں وغیرہ کا انتظام کرے۔ بعد میں سوچا گیا کہ انجمن کی خدمات اس حد تک ہی محدود نہ رہیں، بلکہ وہ طلباء کے مابین دوستی اور تعاون کا جذبہ بھی پیدا کرائے۔ ایسی صورت رونما ہو کہ تعلیمی سلسلہ ختم ہونے کے بعد بھی آپس میں مل کر پڑھنے لکھنے والوں کی یاد ایک دوسرے کے دل میں قائم رہے۔ اس مقصد کو ایک کلب کے قیام سے بہ آسانی پورا کیا جا سکتا تھا چنانچہ ارادے نے عمل کی صورت اختیار کر لی۔ کلب کے زیر اہتمام ہر قسم کے کھیل ہوتے ہیں، تقریری مقابلے اور ڈرامے ہوتے ہیں اور ایک ساتھ مل جل کر پہاڑوں کی چوٹیوں اور ان کے درمیان گھاٹیوں کی سیر کی جاتی ہے۔ موضوعِ مطالعہ سے الگ ہٹ کر عام معلومات حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔

اس کلب کو مغربی جرمنی کی انجمنِ تحریکِ نوجوانان کی حمایت حاصل ہے اس کی بدولت غیر ملکی طلبا جرمنی کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی سے اور جرمن طلبا دوسرے ملکوں کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی سے روشناس ہوتے ہیں۔ کلب میں کھانے پینے کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور اس طرح سب اراکین کے کام و دہن مختلف اقسامِ طعام کی لذت سے آشنا ہو جاتے ہیں۔

تعطیلات کے زمانے میں اس کلب اور کلب سے الحاق رکھنے والی انجمنوں کا کام بڑھ جاتا ہے۔ اِن دنوں جرمن طلبا خود اپنے ملک کے دوسرے شہروں اور دیگر مقاماتِ سیر و تفریح کا اور دوسرے ملکوں کے طلبا اپنی تعطیلات کے زمانہ میں جرمنی کا دورہ کرنا چاہتے ہیں۔ جرمنی میں بہت سے ملکوں کے لیے جن میں پاکستان اور ہندوستان شامل ہیں، ویزا کی پابندیاں دور کر دی ہیں۔ اس لچک کا مقصد بھی یہی ہے کہ سیر و سیاحت کرنے والوں کو سہولت مل جائے اور محض اس رکاوٹ کی وجہ سے انھیں مایوسی

کا سامنا کرنا نہ پڑے۔ دیگر مراعات جو دوسرے ملکوں میں بھی طلبا کے لیے روا رکھی گئی ہیں، جرمنی میں زیادہ وسیع پیمانے پر عطا کی گئی ہیں۔ مثلاً موسم سرما کی بھی چھٹیاں شروع ہوتے ہی ریلوں اور جہازوں کے طویل المدت واپسی ٹکٹ خرید کر کہیں بھی جایا جا سکتا ہے اور اگر تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی یا فنونِ لطیفہ کی انجمنوں کے زیر نظام طلبا کی جماعتیں دورے کریں تو رہائش اور اہتمام خورونوش کے اعتبار سے مزید تعاون کیا جاتا ہے۔

ایسے نادار طلبا کے لیے جو اپنی تعلیم و تربیت کا خرچ خود برداشت نہیں کر سکتے اور زرِ مبادلہ کی دقتوں کے باعث انھیں کوئی رقم یا کافی رقم اپنے وطن سے موصول نہیں ہو سکتی، یہ کلب اور دوسری انجمنیں جزوی اوقات کے ایسے روزگار فراہم کر دیتی ہیں جو طلبا کی شان کے خلاف نہ ہوں اور ان میں منہمک رہ کر تعلیم پر برا اثر بھی نہ پڑے، جو ان کی زندگی کا اصل مقصد ہوتا ہے۔

طلبا کے علاوہ اساتذہ بھی چونکہ اس کلب کے ممبر بن سکتے ہیں، اس لیے کلب غیر شعوری طور پر اعلیٰ تربیت کا مرکز بھی بن گئی ہے۔ اس طرح طلبا اور اساتذہ کے درمیان ایسے خلوص کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے جس کی مثال تہذیب حاضرہ کی کرم فرمائیوں کے باعث دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک کے طلبا اپنے مختلف مطالبات پر حکومت تک کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر لیتے ہیں لیکن اساتذہ کی شان میں کبھی گستاخی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس آج کل ہمارے ملکوں میں عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ محکمۂ تعلیمات سے استادوں کی شکایت کرتے ہوئے طالب علموں نے اجتماعی مظاہرے کیے، ہینڈ بل چھاپے، عام ہڑتال یا بھوک ہڑتال تک شروع کر دی اور اس طرح اپنی بداخلاقی کا ثبوت دینے کے علاوہ تعلیم میں بھی کوتاہی پیدا کر لی۔

کلب کی عمارت کے اندر اور باہر میدان میں مختلف قسم کے کھیل ہو رہے تھے جن میں لڑکے اور لڑکیاں برابر کی شریک تھیں۔ صرف اس اعتبار سے اپنی رائے مختلف ہونے سے قطع نظر اس کلب کی افادیت سے ہرگز انکار نہیں ہو سکتا اور جہاں تک بلا تخصیصِ جنس باہمی اختلاط کا معاملہ ہے، یورپ کے ہر ملک میں، ساری مغربی دنیا میں بلکہ اب تو مشرق کے بہت سے ملکوں میں بھی اس فرق و امتیاز کا رنگ مٹتا

جارہا ہے، اس لیے ہماری رائے کا اختلاف تقاضائے وقت کے سامنے زیادہ اہمیت نہیں رکھ سکتا۔ یہی سوچ کر ہمیں آگے بڑھ جانا پڑا۔

**سینما گھر:** ایک سینما گھر کے قریب سے گزرے جس کا نام انتہائی کوشش کے باوجود یاد نہیں رہا، اس لیے نہیں کہ میرا حافظہ کمزور ہے بلکہ وہ اتنا ثقیل لفظ تھا کہ ایک غیر ملکی کے لیے اس کا صحیح تلفظ ادا کرنا مشکل تھا۔ پھر حافظے کی لوح پر اس کا برقرار رہنا کس طرح ممکن تھا۔ ہم نے سوچا کہ ترکی کی طرح یہاں بھی کم سے کم سینما گھر کے باہر شوکیس میں لگی ہوئی تصاویر پر ایک نظر ڈال کر کچھ اندازہ لگا لیا جائے کہ کس قسم کی تصویر چل رہی ہے۔ اپنی سمجھ میں تو کیا آسکتی تھی اور یہ ممکن نہیں تھا کہ میاں محبوب کو بیچ میں بٹھا کر ہم دونوں بھائی ان سے کہتے کہ تم جو کچھ سنو، جلدی جلدی لیکن زیر لب ترجمہ کرتے جاؤ۔

شوکیس پر نظر ڈالنے سے پتہ چلا کہ دوسری عالمگیر لڑائی کے بارے میں فلم چل رہی ہے اور انگریزی زبان میں ہے۔ یعنی امریکا کی بنی ہوئی ہے جرمن زبان کے الفاظ تصویر کی سطح پر کبھی کبھی آکر مفہوم سمجھا جاتے ہیں۔ بات چیت ساری انگریزی میں ہے۔ یہ معلوم کر کے جی تو چاہا کہ اسے ضرور دیکھ لیا جائے لیکن بھائی جان محترم فلم دیکھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ تصویروں سے اندازہ لگایا گیا کہ اس میں ہٹلر کے بزبانِ امریکی ناقص فوجی نظام، نامعقول غیر ملکی حکمت عملی اور اس کی نام نہاد ظلم پسندی کا خاکہ بہت ہی مضحکہ خیز انداز میں پردۂ سیمیں پر اڑایا گیا ہے۔ ہمیں حیرت اس بات کی تھی کہ یہاں کے باشندے اسے خوب ذوق و شوق سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ وہ اظہار برہمی کرتے ہوئے اس فلم کو چھین جھپٹ کر جلا کیوں نہیں دیتے اور اگر مالکان نے اس کی حفاظت کا انتظام کر رکھا ہے تو سارے سینما گھر کو جلا کر خاک کیوں نہیں کر دیتے؟ کیا امریکی گیہوں کے نشاستے کا اثر ایک کیفیت مسکرین بن کر ان کے دل و دماغ پر اس درجہ حاوی ہوا ہے کہ انھیں یہ بھی احساس نہیں کہ ایک جرمن ہیرو کے کردار کا مذاق اڑانا کسی امریکی فلمساز کا حق نہیں ہے۔ البتہ یہ بات قابلِ غور ضرور تھی کہ پہلا شو دیکھنے کے لیے آنے والے سب کے سب نوجوان تھے۔ ان میں چالیس سال سے زیادہ عمر کا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ ہٹلر کے خلاف امریکی پروپیگنڈے نے نوجوانوں پر خوب اثر ڈالا ہے لیکن زیادہ عمر

کے لوگ متاثر نہیں ہوسکے ہیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یورپی اور امریکی فلمساز کمپنیاں جب بھی کوئی تاریخی فلم بناتی ہیں تو وہ ہر فرد کے عادات و اطوار، اقوال و افعال اور چال چلن کا گہرا مطالعہ کر کے صحیح کردار پیش کرتی ہیں لیکن جہاں سیاست بھی کارفرما ہو، یہ اصول اپنا نقش نہیں جماتا۔ بلکہ دل کی سیاہی پردۂ سیمیں پر اپنی تاریک جھلک دکھاتی ہے۔ ہم ایسے فلم سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے تھے۔ اسے نہ دیکھنا ہی بہتر تھا۔

ہوٹل میں واپس پہنچ کر سب نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور گرم گرم دودھ منگا کر پیا۔ سہ پہر کا یہ ناشتہ ہمارے لیے کافی تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر میاں محبوب اپنے کسی دوست سے ملنے اور دو گھنٹے بعد واپس آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ بھائی جان محترم نے آرام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور میں لفٹ میں بیٹھ کر ہوٹل کی سب سے بالائی منزل پر چلا گیا تاکہ سارے شہر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جا سکے۔ لیکن اوپر پہنچتے ہی اپنا طائر خیال پر تپنچ ہو گیا۔ آخری منزل کی کھلی چھت یہاں بھی عیش و نشاط کے نام سے لہو و لعب کا مرکز بنی ہے۔ اس کا اہتمام شروع ہو گیا تھا۔ جال بچھ گئے تھے۔ دانہ ڈالا جا رہا تھا۔ شکاریوں اور خود گرفتار ہونے والے شکاروں کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ خیر مقدم کرنے والوں نے میری پذیرائی کرنی چاہی لیکن میں الٹے قدموں لوٹا اور فوراً لفٹ کے ذریعہ اتر کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

**ایک روایتی کہانی:** مسافروں اور سیاحوں کے مطالعہ کے لیے جو کتابیں ہوٹل کے ہر کمرے میں رکھی جاتی ہیں، وہ یہاں بھی موجود تھیں۔ میں نے روایتی کہانیوں کا ایک مجموعہ کتابوں کے شیلف سے اٹھا لیا۔ یہ برادر بزرگ کی کہانیوں سے مختلف تھیں، اور مصنفین کے نام تک درج نہیں تھے۔ یعنی وہ ایسی کہانیاں تھیں جو ہر قوم میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہتی ہیں اور بیان کرنے والے کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ کس کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ درصل ایسی کہانیوں کا مصنف کوئی ایک شخص نہیں ہوتا بلکہ وہ زمانے کی ارتقائی منزلیں طے کر کے نت نئے چولے بدلتی رہتی ہیں۔ ایک ہی کہانی کے بہت سے زبانی مسودے تیار ہو جاتے ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ ان میں سے بعض دائرۂ تحریر میں بھی آجاتے ہیں۔ میں نے اپنے عہد طفولیت

میں جنوں، پریوں اور دیوزادوں کی بہت سی کہانیاں پڑھی اور سُنی تھیں اور ان کے نقوش اب تک دل و دماغ پر مرتسم تھے۔ میں کیا، کوئی شخص بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ایسی کہانیاں خواہ کتنی ہی بعید از قیاس کیوں نہ ہوں، عقل پر جلا کرنے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں نے ترکی کے دورانِ قیام میں ملا نصرالدین کی حکایات سے خوب لطف اٹھایا اور ان سے بہت کچھ سیکھا تھا[1]۔ اسی خیال سے میں نے کتاب نکال کر ورق گردانی کی اور ایک مختصر سی کہانی منتخب کر کے اسے پڑھنا شروع کر دیا جسے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

**مکئی کا چور**: ایک شہر میں ـــ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کہاں ہے اور واقعہ کس زمانے کا ہے ـــ ایک بہت ہی مالدار سوداگر ایک بہت ہی وسیع حویلی میں رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک عمدہ شاندار پائیں باغ بھی تھا جس میں انواع و اقسام کے درختوں، پودوں، بیلوں اور جھاڑیوں پر ہر وقت بہار کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اسی کے ایک حصّے میں سوداگر نے مکئی کے بہت سے پودے بھی لگا رکھے تھے۔ اُسے کچے "بھٹے" کھانے کا بہت شوق تھا۔

ایک روز کہ جب موسمِ بہار کا زمانہ ختم ہونے کے قریب تھا، سوداگر ٹہلتا ٹہلاتا اپنے باغیچے میں گیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اسے غصّہ بھی آیا کہ کسی نامعلوم ہستی نے مکئی کے ان پودوں کا صفایا کر دیا ہے جو چند روز پہلے شاداب اور ہرے بھرے تھے۔ اس نے سوچا کہ چور یقیناً بہت ہی چالاک اور ہوشیار ہو گا کہ کسی کو اس کے آنے کی ذرا بھی اطلاع نہ ہو سکی۔ لیکن یہ بات بہت بُری تھی جس طرح موت کسی کا گھر دیکھ لے تو بلائے جان بن جاتی ہے، اسی طرح چور کسی کی دیوار پھلانگ کر ایک بار اندر گھس آئے تو اس کے دوبارہ آنے کا کھٹکا لگا رہتا ہے اور جب تک اصلیت کا پتہ نہ لگ جائے دِلی اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس نے فیصلہ کر لیا کہ چور کا پتہ لگا کر اسے ضرور سزا دی جائے۔ اور پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

اس کے تین بیٹے تھے ـــ میکائیل، جورج اور جون ـــ اس نے ان تینوں کو بلایا

---

[1] ملاحظہ ہو یورپ نامہ۔ صفحات ۲۸ تا ۳۲۔

اور سارا ماجرا بیان کر کے اپنا عندیہ بھی واضح کر دیا۔ اس نے کہا، کل رات ایک چور ہمارے باغیچے میں گھس آیا اور مکئی کے کچھ پودوں کا صفایا کر گیا۔ مجھے سخت غصہ آرہا ہے۔ اس چور کو پکڑنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں تمھاری مدد درکار ہے۔ کئی رات برابر چوکیداری کرنی ہوگی۔ ممکن ہے آج رات وہ نہ آئے۔ لہٰذا باری باری یہ کام انجام دو۔ ساری رات جاگنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کے آنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔ تم میں سے جو بھی اسے پکڑ کر دکھائے گا، عمدہ انعام کا مستحق ہوگا۔

پہلی رات سب سے بڑے بیٹے میکائیل نے چوکسی کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ اس نے احتیاط کے خیال سے کئی پستول گولیوں سے بھر کر پیٹی میں لگا لیے، تیز دھار کی ایک تلوار بھی کمر کے ساتھ کس لی، کچھ کھانے پینے کا سامان باندھ لیا تاکہ ضرورت ہو تو کام آئے۔ آدمی سو جائے تو کوئی بات نہیں، جاگتا رہے تو خواہ مخواہ بھوک پیاس محسوس ہوتی ہے۔ جاڑے کا موسم تھا۔ اس لیے گرم جُبہ پہن کر ایک موٹا کمبل بھی ساتھ لے لیا اور دبک کر ایک جھاڑی میں بیٹھ گیا۔ کپڑوں کی گرمائی، باغیچے کے پھولوں کی خواب آور خوشبو اور پھر انسانی فطرت کا تقاضا —— ان سب چیزوں نے مل جل کر اسے اپنے فرائض بھول جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ بہت جلد سو گیا اور رات بھر سوتا رہا۔ صبح کو آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ مکئی کے چند اور پودے رات بھر میں غائب ہو گئے ہیں۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر چور اپنا وار کر گیا۔ سوداگر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوا اور بیٹے کو بُری طرح ملامت کی اور کہا کہ آئندہ تم پر بھروسا نہیں کیا جائے گا۔

دوسری رات منجھلے لڑکے جورج کی باری تھی۔ اس نے بھی بڑے بھائی کی طرح دور اندیشی سے کام لیا۔ پستول اور تلوار اور اشیائے خورونوش کے علاوہ سردی سے بچنے کی تدابیر اختیار کر لیں، لیکن نیند کا جادو اس پر بھی چل گیا۔ وہ سوتا رہا۔ رات بھر سوتا رہا اور صبح کو مکئی کے پودوں میں مزید کمی دیکھ کر بڑے بھائی کی طرح گھبرا گیا۔ پہلے دن کی طرح اس کی بھی خوب سرزنش ہوئی۔ سوداگر باپ کو رنج تھا کہ میرے بیٹے اس لائق نہیں ہیں کہ میرے حکم کی تعمیل صحیح احساسِ فرض کے ساتھ کریں۔ اس نے کہا کہ اب محض چند پودے باقی رہ گئے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے بڑے بھائیوں کے

نقش قدم پر چلیں گے اور یہ بھی سو جائیں گے۔ اب کوئی امید باقی نہیں رہی۔ سخت افسوس کا مقام ہے۔ میں بوڑھا ہوں۔ میرے لیے رات بھر جاگنا ممکن نہیں ہے ورنہ میں اپنی اولاد کو یہ زحمت نہ دیتا۔

بہر حال تیسری رات سب سے چھوٹے بیٹے جوؔن کی باری تھی۔ بڑے بھائیوں کی ناکامی اس کے سامنے تھی۔ اس نے زیادہ غور و خوض سے کام لیا۔ اس نے کہا کہ اس چور کو پکڑنے کے لیے رسّی کا پھندا کافی ہے۔ زیادہ ہتھیار پیٹی میں لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ نیز گرم کپڑا یقیناً آرام دہ ہو کر نیند کی کیفیت طاری کرے گا۔ لہٰذا اس سے دور ہی رہنا پڑیگا۔ اس کے علاوہ اس نے بیدار رہنے کے لیے ایک اور عمدہ تدبیر نکالی۔ اس نے بہت سی کانٹے دار جھاڑیاں جمع کر لیں اور جب باغ کی دیوار کے قریب چھپ کر بیٹھا تو انھیں اپنے قریب اس طرح رکھ لیا کہ ذرا سی بھی حرکت ہونے پر وہ جسم میں چبھنے لگتیں اور اونگھ جانے پر تو سارے منھ کو زخمی کر ڈالتیں۔ چنانچہ یہ ترکیب بہت ہی کارگر رہی۔ اوّل تو سردی کے احساس نے اسے سونے نہ دیا اور اگر نیند کا جھونکا آیا بھی تو کانٹوں نے چبھ کر چونکا دیا۔ اس طرح وہ نصف شب تک بیدار رہا۔

کوئی آدھی رات گزرنے پر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ صاف معلوم ہوا کہ کوئی اطمینان سے قدم اٹھاتا چلا آرہا ہے۔ اس نے آہستہ سے کانٹوں والی جھاڑیاں الگ ہٹا کر رکھ دیں اور پھندے والی رسّی نکال کر کھلے میدان میں چلا آیا تاکہ چور کا مقابلہ کرکے اس پر قابو پایا جاسکے لیکن جب اس کی نظر سامنے آنے والے پر پڑی تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ چور کوئی انسان نہیں، ایک خوب صورت بچھیرا تھا جس نے قریب آتے ہی مکئی کے پودوں پر منھ مارنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر میں جوؔن کی حیرت خوشی میں بدل گئی۔ اس نے بچھیرے کے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال دیا اور پھر ہنکا کر اپنے طویلے میں لے گیا۔ وہاں اسے بند کرکے اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر اوپر کی منزل میں جا کر، جہاں اس کے دوسرے بھائی سو رہے تھے، وہ اپنے بستر پر لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔

صبح کو اس سے پہلے اس کے بھائی بیدار ہوئے اور یہ دیکھ کر ہنس پڑے کہ چھوٹے بھائی نے بھی اپنا فرض رات بھر سو کر ادا کیا ہے اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ باغیچے میں زمین پر نہیں، کمرے میں بستر پر سو کر ادا کیا ہے۔ انھوں نے باپ کو آواز دی تاکہ وہ

بھی آ کر یہ کیفیت بچشم خود دیکھ لے۔ بوڑھے سوداگر نے چھوٹے لڑکے کو سوتے دیکھا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ بہت چیخا چلایا۔ اس شور سے جون کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور رات کی واردات یاد کر کے ہنس پڑا۔ باپ اور دونوں بھائیوں کو تعجب ہوا کہ یہ نادم ہونے کے بجائے ہنس رہا ہے۔ آخر جون نے سب کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا اور سیدھا اصطبل کی طرف لے گیا، جہاں دروازہ کھلنے پر سب نے ایک سفید خوب صورت بچھیرے کو کھڑے دیکھا۔ جون نے بتایا کہ یہی چور ہے جو روزانہ مکئی کے پودے کھا رہا ہے۔ آج بھی اس نے چوری شروع کی تھی لیکن میں نے عین وقت پر اسے گرفتار کر کے یہاں بند کر دیا تھا اور چونکہ باقی رات چوکسی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، اس لیے اطمینان سے اوپر جا کر سو گیا۔ یہ سن کر دونوں بھائی تو جل گئے لیکن باپ بہت خوش ہوا اور اس نے وہ بچھیرا اپنے چھوٹے بیٹے ہی کو انعام میں دے دیا۔ جون نے اس کا نام "چور" رکھ دیا۔

چند دن بعد اطلاع ملی کہ وہ خوب صورت شہزادی جو شیشے کے پہاڑ کی چوٹی پر شاہی محل میں رہتی ہے، آسیب زدہ ہو گئی ہے اور جادو کے اثر سے پہاڑی کی ڈھلان اتنی پھسلواں ہو گئی ہے کہ کوئی انسان یا جانور اس پر پاؤں رکھ کر اوپر نہیں چڑھ سکتا۔ اگر کوئی بھی شخص وہاں پہنچ کر محل کے تین چکر لگا لے تو سارا طلسم ٹوٹ جائے گا اور جادو کا اثر زائل ہوتے ہی شہزادی ہوش میں آجائے گی اور اپنے نجات دینے والے سے شادی رچا لے گی۔ یہ بھی سنا گیا کہ بہت سے جیدار اس لالچ میں آ کر پہاڑی پر چڑھے اور پھسل کر دامن میں جا پڑے۔ بعض بری طرح زخمی ہو کر اپاہج ہو گئے اور بعض بالکل ختم ہو گئے۔

ان تینوں بھائیوں کو بھی ہوس نے اکسایا اور وہ جان کی بازی لگا کر اپنی قسمت آزمانے پر آمادہ ہو گئے۔ دونوں بڑے بھائیوں نے اپنے سبک رفتار گھوڑوں کے سموں پر خول چڑھا دئے جن کے نچلے حصوں میں کیلیں لگی ہوئی تھیں تاکہ وہ ہر قدم پر زمین میں گڑ جایا کریں اور پھسلنے کا امکان نہ رہے لیکن گھوڑوں کے پاؤں جم نہ سکے اور وہ اپنے سواروں سمیت لڑھکتے ہوئے گھاٹی میں جا پڑے۔ البتہ چھوٹا بھائی جو اپنے "چور" پر سوار ہو کر گیا تھا بے تکان چڑھتا چلا گیا۔ بچھیرے کے قدم لڑکھڑائے تک نہیں۔ جون نے اوپر پہنچتے ہی محل کے تین چکر کاٹے اور اس کے صدر دروازے کے سامنے آ کر رک گیا۔ ایک دم دروازے کے پٹ کھلے اور ایک حسین نوجوان شہزادی آنکھوں میں مسرت کی چمک لیے مسکراتی باہر آگئی۔

اس نے جوّن کو دیکھ کر ادب سے جھک کر سلام کیا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ میرے محسن ہیں۔ آپ نے مجھے جادو کے اثر سے نجات دلائی ہے۔ آج سے میں آپ کی ہوں چلیئے، میرے محل میں چلیئے۔ میرے ساتھ یہاں کی ہر چیز آپ کی ملکیت ہے۔ پھر شہزادی نے بچھیرے کو تھپتھپاتے ہوئے بڑے پیار کے انداز میں کہا، کیوں رے شریر! تو کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ تو فرار نہ ہوتا تو شاید جادو کا اثر مجھے بے ہوش نہ کرتا۔ تو خود بھی تو جادو کا پتلا ہے۔ اسی لیے میرے شہزادے کو مسحور کر کے محل تک لے آیا ہے۔ اب میں تیری نگرانی کروں گی۔

یہ سُن کر جوّن نے محسوس کیا کہ پہاڑی کی چوٹی تک پہنچنا صرف اس لیے ممکن ہوا ہے کہ "چور" جادو کا گھوڑا ہے۔ اس پر سوار ہونے والا ہر بڑی سے بڑی مہم سر کر سکتا ہے۔ وہ شہزادی کے ساتھ محل کے اندر چلا گیا اور وہیں رہنے لگا۔ اس کے باپ اور بھائی اس کے دیدار کو ترس گئے۔ کیونکہ شیشے پہاڑ کی چوٹی، اس کا محل اور محل میں رہنے والے سب جادو کے زیرِ اثر تھے اور جو اس جال میں ایک بار پھنس جاتا پھر باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

مانا کہ یہ کہانی بچوں کے لیے ہے اور وہ اسے پڑھ کر خوب لطف اٹھا سکتے ہیں لیکن جو سبق اس سے ملتا ہے، وہ سب کو مشعلِ راہ دکھا سکتا ہے۔ فرض کی ادائیگی کا صحیح احساس، تکمیل کے لیے مناسب تدابیر پر غور و خوض اور ان پر عملدرآمد اور پھر اپنی سعی و کاوش کا میٹھا پھل ـــ یہ سب باتیں دل میں جم کر رہ جاتی ہیں۔ اگر یہ نتائج برآمد نہ ہوتے تو شلر کی سرزمین پر رہنے والے قوی دل اور عزمِ صمیم کے حامل انسان بے مطلب کہانیوں کو کب خاطر میں لا سکتے تھے۔

نیند آ رہی تھی۔ کہانی ختم کر کے، اس کے مقاصد پر غور کرتا ہوا میں لمبی تان کر لیٹ گیا اور چونکہ مکئی کے پودوں کی حفاظت کرنے کی کوئی ذمہ داری مجھ پر ڈالی نہیں گئی تھی اور نہ میرے دل میں کسی شہزادی کو حاصل کرنے کی تمنا تھی جو اکثر نیند اچاٹ کر دیتی ہے، اس لیے بہت جلد سو گیا۔ خواب میں بھی کوئی شہزادی نظر نہیں آئی۔

۲۳ر ستمبر ۱۹۵۶ء ــــ اتوار

# فرینکفرٹ ــ وینرباڈن ــ بون

آج اپنے معمول سے بھی کچھ دیر پہلے یعنی ساڑھے چار بجے اٹھ جانا پڑا بلکہ یوں کہیئے کہ جو ارادہ کر کے سوئے تھے اس کے مطابق آنکھ کھل گئی۔ میں اور بھائی جان محترم بہت سویرے اٹھنے کے عادی ہیں۔ باری باری ہم نے غسل کیا، حسب عادت ٹھنڈے پانی سے۔ ہماری اس عادت پر ہر جگہ کے ہوٹل والے سخت متعجب ہوتے ہیں۔ ہم دونوں بھائی تو زیادہ سرد موسم میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہا لیتے ہیں، بس ایک لمحے کے لیے سسکی آتی ہے اور پھر جسم کی قدرتی حرارت قوت مدافعت پیدا کر دیتی ہے لیکن یہ غسل ہو غسلخانے میں اور ہوا کے تیز جھونکوں کا گزر نہ ہو کیونکہ یہ تو طبی اعتبار سے بھی منع ہے۔ دریا کے کنارے یا سمندر کے ساحل پر کھلی فضا میں نہانے کا موقع نہیں ملتا، اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہاں بھی ہماری قوتِ مدافعت کام کر سکتی ہے یا نہیں۔ ٹھنڈے پانی کا غسل، صحت کے نقطۂ نظر سے بہت مفید ہے۔ شیخ الرئیس نے تندرست لوگوں کے لیے سفارش کی ہے اور بیماروں یا کمزوروں کو اس سے اجتناب کرنے کے لیے کہا ہے۔

میاں محبوب نے چونکہ سب سے پہلے غسل کیا تھا، اس لیے ناشتہ جلد تیار کرانے کا فرض انھی کو ادا کرنا پڑا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بس ٹیلی فون پر ہدایت کر دی۔ مصلّے بچھا کر ہم سب نے نماز باجماعت ادا کی۔ اس وقت تک کا سارا ماحول پُرسکون تھا۔ ایک متنفس بھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ اور کوئی بیدار ہوتا تو کس طرح جب سونے کے پروگرام پر دو بجے کے بعد عمل ہوا اور وہ بھی تھکا دینے والی کیفیات کے بعد تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نماز سے فراغت پائی ہی تھی کہ ناشتہ آ گیا۔ اس وقت اور لوگوں کے لیے بیڈ ٹی

(پلنگ پر پینے کی چائے!) تیار ہو رہی تھی۔ ناشتے میں مکھن، توس، دودھ، اور ابلے ہوئے انڈے شامل تھے۔ عالمگیر نوعیت کا یہ وہ ناشتہ ہے جس کی فرمائش ہر جگہ کی جا سکتی ہے اور آسانی سے اس کی تعمیل بھی ہو جاتی ہے۔ شاید بیڈ ٹی کے وقت اس سے زیادہ لوازمات کا انتظام بھی ذرا دشوار تھا۔ چونکہ ہوٹل کے روزانہ کرائے میں صبح کا ناشتہ شامل ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے، خصوصاً اس مہنگائی کے زمانے اور زیادہ مہنگے شہر میں، انکار نہیں ہو سکتا تھا، پھر یہ خیال بھی تھا کہ ہمیں سفر پر روانہ ہونا ہے۔ اگرچہ وہ بہت ہی مختصر تھا لیکن کون جانتا تھا کہ آگے چل کر کیا گزرے اور خور و نوش کی اشیاء پھر کہاں پہنچ کر میسر آئیں۔ چنانچہ اس شکاری کی طرح جو پہلے سے بندوق بھر کر جنگل کی راہ لیتا ہے، ناشتے کے معاملے میں ہم نے پوری احتیاط برتی۔ دلیہ سب سے زیادہ لذیذ تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی میاں محبوب اور بھائی جان محترم سامان سمیٹنے اور باندھنے میں لگے اور میں سیڑھیاں اتر کر نیچے ہوٹل کے دفتر میں پہنچ گیا۔ ہوٹل میں تین چار لفٹ ہیں لیکن اس وقت وہ سب کے سب بند تھے۔ لفٹ والے بھی دوسرے لوگوں کی طرح کہیں پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ غالباً وہ بھی آدھی رات کے بعد تک ہوٹل کی فضائے رنگین سے لطف اندوز ہونے والوں کو اپنے اپنے لفٹ میں سوار کر کے عروج و زوال کی منزلیں دکھلاتے رہے ہوں گے۔

ہم نے رات ہی کو منیجر کو یاد دہانی کرا دی تھی کہ فرینکفرٹ میں ہمارا مختصر سا قیام "شمع کی عمر طبعی" کے برابر باقی رہ گیا ہے۔ اس لیے ہمارے نام کا بل رات کا کام ختم کرنے سے پہلے تیار کر لیا جائے تاکہ علی الصبح ہم اس کی ادائیگی کر دیں اور زیادہ سے زیادہ پونے سات بجے ہوٹل سے روانہ ہو جائیں۔ فرینکفرٹ سے ویزباڈن کے لیے گاڑی چھوٹنے کا وقت سات بج کر چودہ منٹ تھا۔ ٹکٹ ہمارے پاس پہلے سے موجود تھے اور سیٹیں محفوظ تھیں۔ اس طرف سے گویا اطمینان تھا لیکن اندیشہ یہ تھا کہ حسب ضرورت وقت پر ٹیکسی کا انتظام نہ ہوا تو بڑی پریشانی ہو گی۔ ہوٹل والے بین الاقوامی قسم کے سیاحوں کی طرف سے مطمئن ہوتے ہیں۔ وہ اگر حساب بیباق کر کے نہ جائیں تو سفر و قیام کا انتظام کرنے والوں سے ساری رقم وصول کر لی جاتی ہے ہمارے ٹریول ایجنٹس امریکن ایکسپریس کمپنی والے تھے

جن کی لاپروائی اور بدنظمی کا ہمیں تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس ضمن میں ان سے کیا واسطہ۔ ہم ہر جگہ بلوں کی ادائیگی خود براہِ راست کرتے آئے تھے اور یہی طریقہ مناسب بھی ہے۔ لیکن دفتر میں جنرل منیجر تو موجود ہی نہیں تھے۔ ان کی ڈیوٹی دس بجے شروع ہوتی ہے اور اسسٹنٹ منیجر آرام کرسی پر پڑے سو رہے تھے۔ آرام کرسی پر لیٹنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ قاعدے کی رو سے اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صرف سو گئے تھے۔ مجھے دیکھ کر چوکیدار نے ان کو بیدار کر دیا تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے اور مجھے خوش خبری سنائی کہ بل تو کل رات تیار نہیں ہو سکا۔ لیکن ذرا سی دیر میں بن جائے گا۔ آپ چند منٹ کے لیے بیٹھ جائیے۔

میں نے دیواروں پر چسپاں تصویری پوسٹر دیکھنے شروع کیے اور وہ اپنی عینک سنبھال کر بل بنانے میں لگ گئے اور جب تیار ہو جانے پر وہ میرے حوالے کیا گیا تو بالکل غلط تھا یعنی جو رقم انھوں نے محسوب کی تھی، وہ زیادہ نہیں، کم تھی۔ اس سے پہلے بھی دو تین مقامات پر ایسا ہو چکا تھا کہ خود ہم نے بل ٹھیک کرا کے اصل مطالبات سے زیادہ رقمیں ادا کیں۔ یہاں یہ ہوا کہ انھوں نے میاں محبوب کے قیام کے سلسلے میں کوئی رقم نہیں لگائی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا کمرہ صرف دو مسافروں کے لیے مخصوص تھا لیکن ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ برادرِ عزیز الگ کمرے میں رہیں۔ ہم نے باقاعدہ لکھ کر منظوری لے لی تھی کہ وہ ہمارے ساتھ رہیں گے اور ہم ان کا خرچ ادا کریں گے۔ ہم نے فالتو پلنگ بھی نہیں منگایا تھا۔ ہم تو فرش پر بستر بچھا کر سونے کے عادی تھے۔ بالفاظ دیگر ہوٹل کا نہ تو کمرہ گھیرا گیا اور نہ کوئی چیز استعمال ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مزید شخص نے وہاں قیام کیا اور ناشتہ بھی کیا۔ لیکن ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ دو آدمیوں والے کمرے میں قیام کی اجرت تین آدمیوں سے کیوں اور کس حساب سے وصول کی جائے جبکہ نرخ نامے میں اس کی وضاحت کسی عنوان نہیں کی گئی تھی۔ میں نے کہا کہ تم ساری رقم کو ڈیڑھ گنا کر دو۔ وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ آخر بہت ردّ و قدح کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ مدتِ قیام کو ڈیڑھ گنا کر دیتا ہوں اور جب تک وصول شدہ رقم کا حساب پورا نہ ہو جائے، اس کمرے کو خالی رکھا جائے گا۔ گویا ہمارے چلے جانے کے بعد بھی اس میں ہمارا قیام

دکھایا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اگر تم اسی قسم کی صورت کسی اور شخص کے ساتھ روا رکھو اور وہ ہوٹل سے رخصت ہو جانے کے بعد کسی اور مقام پر کسی شخص کو قتل کر دے تو تمہارا ریکارڈ اس کی بے گناہی ثابت کرے گا۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہوگی اور اس طرح پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے کہا کہ جب اس کے قیام کا اندراج یہاں ہوگا تو وہ کسی دوسری جگہ قتل کیسے کر سکے گا۔ اس بگڑے دماغ منطقی کے سامنے مجھے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ڈیڑھ گھنٹے کی مدت کا بل بنا کر مجھے دکھایا اور رقم ادا کرنے کے لیے کہا۔ میں بولا کہ مجھے بل دے دو۔ میں اپنے ریکارڈ کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ پھر یہ ثبوت بھی میرے پاس رہے گا کہ میں نے بل کی رقم ادا کر دی ہے۔ اس نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ آخر میرے پاس کیا رہے گا۔ میں کس طرح حساب دوں گا کہ میں نے کتنی رقم کس مد میں وصول کی ہے۔ معلوم ہوا کہ دوہرے پرت والے بلوں کا انتظام نہیں تھا۔

مجبوراً میں نے ہوٹل کے ایک مطبوعہ لیٹر فارم پر ادا شدہ رقم کی رسید لکھوالی۔ مجھے اس کے اصل مطالبے سے بقدر چھبیس مارک زیادہ ادا کرنے پڑے۔ رقم لیتے ہوئے اس نے کہا "یس، یو آر رائٹ"۔ میں نے دل میں سوچا کہ اگر یہ شخص انگریزی نہ جانتا ہوتا تو اشاروں میں میرا منشا قیامت تک نہ سمجھ سکتا اور مجھے مجبوراً میاں محبوب کو اوپر سے بلانا پڑتا۔ اس تاخیر کا نتیجہ ظاہر ہے کہ جب میں کاؤنٹر سے مڑا تو بھائی جان محترم اور میاں محبوب نیچے اتر کر میرے قریب پہنچ چکے تھے اور ہوٹل کا ملازم ہمارا سامان لا دے کھڑا تھا۔ یہ غنیمت ہے کہ میں نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اگر دوسرے لوگوں کی طرح، جو نائٹ سوٹ پہن کر ہوٹل کے برآمدوں میں گھومتے پھرتے ہیں، میں بھی اپنے شب خوابی کے لباس تہبند میں نیچے اتر آتا تو بڑی پریشانی ہوتی!

ہوٹل کے باہر پورٹیکو میں ٹیکسی موجود تھی۔ سامان اس میں رکھا گیا اور ہم اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ بہت جلد وہاں پہنچ گئے۔ فرینکفرٹ کے ریلوے اسٹیشن کی عمارت بہت عمدہ جدید وضع کی ہے لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تیسرے درجے کے مسافر خانے کو ہندوستان اور پاکستان کی طرح یہاں بھی چائے خانے میں کیوں بدل رکھا ہے۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ یہ رواج عالمگیر

نوعیت کا ہے۔ مسافر خانے میں چائے والے کی دوکان کے سامنے وہ تمام بنچیں کھسکا کر قریب قریب کر لی گئی تھیں جو درصل مسافروں کے لیے مخصوص تھیں لیکن لوگ ان پر بیٹھے ہاتھوں میں پرچ پیالیاں لیے چائے پی رہے تھے اور اپنی باتوں میں پوری محویت کے ساتھ اس طرح مصروف تھے گویا وہ آمادۂ سفر نہیں ہیں بلکہ قریب سے ٹہلتے ٹہلاتے محض چائے پینے وہاں آ گئے ہیں۔

قلی نے سارا سامان لے جا کر ریل کے ڈبے میں رکھ دیا۔ ہم بمشکل اس کی اجرت ادا کر سکے تھے کہ ریل کے روانہ ہونے کی سیٹی بج گئی جو موٹر کے انداز کی تھی یعنی وہ جو عموماً کارخانوں میں ملازمین کے کام پر آنے اور کام ختم کرنے کے بعد جانے کے وقت بجائی جاتی ہے۔ اگر ہمیں ذرا سی دیر ہو جاتی تو یقیناً آج کی گاڑی سے رہ جاتے اور ایسی صورت میں اپنے راہ نامے کو باقاعدہ رکھنے کے لیے ٹیکسی سے روانہ ہونا پڑتا۔ فرنیکفرٹ سے ویز باڈن بہت زیادہ نہیں صرف پچیس میل دُور ہے۔ ریل کا کرایہ درجہ اوّل میں جو تیسرے درجہ سے بالکل دوگنا ہوتا ہے، تقریباً چار رُپے فی کس پھیلتا اور اس طرح بارہ رُپے کی بجائے ہمیں ٹیکسی میں انعام کی رقم ملا کر تیس رپے ادا کرنے پڑتے یعنی پورے ڈھائی گنے۔ مجبوری کے عالم میں تو ایسا کر لیا جاتا لیکن خواہ مخواہ فضول خرچی سے کیا حاصل تھا۔ جہاں تک وقت کا تعلق تھا ٹیکسی ذرا پہلے پہنچ جاتی لیکن بہت زیادہ فرق نہ پڑتا۔ ریل دو درمیانی اسٹیشنوں پر ٹھیرتی ہوئی صرف چون منٹ میں پہنچتی ہے۔ اور موٹر سے شاید یہ فاصلہ پچیس منٹ میں طے کر لیا جاتا لیکن اگر راستے میں کہیں کراسنگ پر ریل کی وجہ سے موٹر کو ٹھیرنا پڑ جاتا تو کسر پوری ہو جاتی۔

گاڑی سات بج کر چودہ منٹ پر فرنیکفرٹ سے روانہ ہوئی تھی اور ویز باڈن پر ٹھیک آٹھ بج کر آٹھ منٹ پر پہنچ گئی۔ مقررہ وقت کی اس درجہ پابندی ویانا (آسٹریا) سے فرنیکفرٹ اور آگے تک جاری ہے۔ اسی طرح سوئزرلینڈ میں بھی وقت کی سخت پابندی کا اندازہ اس حد تک ہوا تھا کہ محض گھڑی دیکھ کر اسٹیشن کا نام پڑھے بغیر لوگ اپنی منزلِ مقصود پر اتر سکتے تھے۔ غلطی کا امکان ہی نہیں تھا۔ ہمارے اس سفر میں ویز باڈن کو ٹرانزٹ کیمپ کی حیثیت حاصل تھی۔ یعنی ہمیں ریل گاڑی سے اتر کر فوراً ہی اسٹیمر میں بیٹھ کر لیون چلا جانا تھا۔

**ویز باڈن:** وقت کی کمی نے کئی بار افسوسناک صورتیں پیدا کی ہیں۔ ویز باڈن کے ضمن میں بھی اس احساس نے کسی قدر دکھ پہنچایا کہ ہم اس تاریخی شہر اور گرم پانی والے چشموں کے ایک اعلام کزکی زیارت سے محروم جارہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مقام روانگی سے آخری منزل تک راہ نامے کی جملہ تفصیلات پہلے سے طے کرلینے میں بڑا فائدہ اور سہولت ہے لیکن کہیں کہیں اس میں لچک پیدا کرنے کو جی چاہتا ہے اور دقت یہ ہے کہ جس طرح بنیا د ٹیڑھی ہو جانے سے ثریا تک عمارت ٹیڑھی بنتی ہے، اسی طرح ایک بار پروگرام کی تبدیلی آخر وقت تک جھول پیدا کئے رہتی ہے اور سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بعض منزلوں پر پریشانی کے علاوہ مالی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ کاش! ہم اس دلپذیر شہر میں زیادہ نہیں تو ایک ہی دن قیام کرسکتے۔

ویز باڈن پرانی تاریخ کے اعتبار سے سلطنت پرشیا کے صوبہ ہیسے نساؤ کا ایک مشہور شہر تھا اور استعمال ہونے والے گرم چشموں کے لحاظ سے جرمن کے قدیم ترین مقامات میں شامل تھا۔ یہاں کے چشموں کا ذکر مشہور مورخ پلائنی تک نے اپنی تحریروں میں "فونٹس متھی آسی" کے نام سے کیا ہے۔ اس کی قدامت یوں بھی مسلمہ اور قابلِ ذکر ہے کہ اہلِ روما نے حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے تقریباً گیارہ سال پہلے اس کے گرد فصیل تعمیر کردی تھی۔ دیوار کا نام "ہائیڈن موئرا" تھا اور غالباً اس شہر پناہ کا جزو بھی جو دایو قلیطی عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔ ۸۳۰ء کے ایک نوشتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت شہر کا نام "ویسی بادا" یعنی حمام مرغزار" تھا۔ یہی نام بدل کر ویز باڈن ہو گیا۔ صحت بخش غسل خانوں کے اعتبار سے نام کی رعایت اب تک برقرار ہے۔

کیرولنگی بادشاہوں کے عہد میں یہاں شاہی محل تعمیر ہوا اور اوٹو اول نے اسے باقاعدہ شہر کا درجہ عطا کر دیا۔ اس کے بعد سے اس کی شہرت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ گیارھویں صدی میں نساؤ کے نوابوں نے اسے اپنی آماجگاہ بنا لیا اور ۱۳۵۵ء میں یہ اس وقت کی تاریخ کے اعتبار سے سلطنت نساؤ اڈسٹین کا صدر مقام ہو گیا لیکن جرمنی کی مشہور سی سالہ جنگ نے اسے بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ یہ جنگ جو مذہبی تنازعات کی وجہ سے شروع ہوئی تھی ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء تک جاری رہی تھی۔ تقریباً ایک سو سال بعد ۱۷۴۴ء میں اسے ایک بار پھر عروج نصیب ہوا اور نساؤ یوگن

حکومت نے اسے اپنا مرکز بنا لیا۔ پرشیا کے دائرۂ اقتدار میں آنے کے بعد بھی ۱۸۱۵ء سے ۱۸۶۶ء تک اس کی عظمت قائم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف عہدوں کی تاریخی یادگاریں یہاں موجود ہیں۔

یہ شہر سلسلہ کوہ ٹونس کے جنوب مغربی دامن میں دریائے رہائن سے صرف تین میل دور دریائے مینز سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ اقتصادی لحاظ سے بڑا خوش حال شہر ہے۔ اس کی دولت قدرتی نعمتوں کے علاوہ ان سیاحوں اور مریضوں سے حاصل ہوتی ہے جو القلی کی آمیزش والے گرم پانی کے چشموں سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہاں آتے ہیں اور چونکہ موسم عموماً معتدل رہتا ہے، اس لیے بھی اس کی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں جراحی کے آلات، مصنوعی کھاد، آرائشی ساز و سامان اور سیمنٹ وغیرہ کے کارخانے قائم ہیں لیکن گرم پانی والے چشموں کا مقابلہ کسی چیز سے نہیں کیا جا سکتا۔

ویز باڈن میں ایسے چشموں کی تعداد ستائیس ہے جن کا پانی گرم ہوتا ہے اور پانی میں گندھک کی آمیزش کے ساتھ ہائیڈروجن پائی جاتی ہے۔ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی چشموں کے پانی سے علاج کرنے کے لیے شفاخانے قائم ہیں جن میں مجموعی طور سے ایک سو سے زیادہ معالج کام کرتے ہیں۔ نرسوں اور دوسرے خدمت گاروں کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔ اس شہر میں جس کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب ہے، شفاخانوں میں مریضوں کے لیے پلنگوں کی تعداد سوا تین ہزار کے قریب ہے۔ پانی پینے، نہانے اور بخارات لینے کے کام آتا ہے۔ گرم پانی میں بٹھا کر جسم کی خوب مالش بھی کی جاتی ہے تاکہ کیمیاوی اجزا جلد میں جذب ہو کر خون میں سرایت کر جائیں۔ زیادہ چشمے نقرس اور وجع المفاصل جیسے امراض کے استیصال کے لیے مفید ہیں۔ جوڑوں کا درد خواہ کسی قسم کا ہو اور ہڈیاں کتنی ہی زیادہ سخت کیوں نہ ہوں ان چشموں کے تیز گرم پانی کے اثر سے نرم پڑ کر اصل حالت میں آجاتی ہیں۔ اور درد دور ہو جاتا ہے۔ یہ امراض عموماً عیش پسند لوگوں کو جو زیادہ نرم غذائیں کھاتے اور جسمانی ورزش کم کرتے ہیں، بڑی عمر میں لاحق ہوتے ہیں اور مردوں سے زیادہ عورتیں ان میں مبتلا ہوتی ہیں۔

یونانی طب میں ان امراض کو کھونے کے لیے پینے اور مالش کرنے کی بہت سی دوائیں موجود ہیں۔ جدید طب نے بہت سے انجکشن بھی ایجاد کر لیے ہیں لیکن تقابلی تجربات کرنے والے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان چشموں کے گرم پانی میں دس دس منٹ صبح و شام بیٹھنا ان سب ادویہ سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ حرارت کے باعث پانی کا دوائی اثر جسم کے اندرونی اعضا تک نہایت سرعت کے ساتھ نفوذ کر جاتا ہے یعنی اس قدر تیزی سے جیسے انجکشن کی دوا وریدوں اور شریانوں کے ذریعہ گردش خون کے ساتھ ساتھ پہنچتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ انجکشن کی خرابی یا ان کے لگانے میں غلطی کبھی کبھی مضر صحت ثابت ہوتی ہے، حتیٰ کہ بعض صورتوں میں جان تک ضائع ہو جاتی ہے۔ لیکن گرم چشموں کا پانی شاذونادر ہی نقصان دہ ہوتا ہے۔ دیگر امراض کی طرح ان بیماریوں کے باب میں بھی ضروری ہے کہ وہ زیادہ منزلیں طے نہ کر گئی ہوں۔ علاج شروع کرنے سے پہلے یہاں بھی ہر مریض کے خون کا عمیق معائنہ اور تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ جو فاسد مادے ان میں موجود ہیں اور جن سے ہڈیاں متاثر ہوتی ہیں، ان کا صحیح حال پوری کیفیت کے ساتھ معلوم ہو جائے۔ یہ پتہ لگانے کے بعد ہی معالج مریض کے لیے چشمے کا تعین اور طریق علاج کے بارے میں ہدایات نافذ کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے یہاں کے نظام کا ایک پہلو افسوسناک ہے۔ اور وہ یہ کہ یہاں مریضوں کی تفریحات اور دلچسپ مشاغل کے لیے خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ یعنی عیش پسندی کے وہ تمام لوازم موجود ہیں جو عموماً اس مرض کا باعث بھی ہوتے ہیں۔

یہاں مریضوں کا جمگھٹ سارے سال رہتا ہے اور رہائشی جگہ مشکل سے ملتی ہے۔ مریضوں اور ان کے ساتھ تیمارداروں پر ٹیکس پانچ مارک فی ہفتے کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے اور علاج کی اجرت نوے مارک فی ہفتے تک ہوتی ہے۔ دوسری صحت گاہوں کی طرح یہاں بھی اس رقم میں رہنا سہنا، کھانا پینا اور علاج معالجہ شامل ہے۔ علاج کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے اگر فاضل دوائیں دی جائیں یا انجکشن لگائے جائیں تو ان کا بھی کوئی علیحدہ معاوضہ نہیں ہوتا۔ معالج کی ہدایت پر ہر چیز کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

حسب توقع ویز باڈن کے ریلوے اسٹیشن پر امریکن ایکسپریس کا آدمی نہیں ملا حالانکہ یہاں اس کی ضرورت تھی کیونکہ اب ہمیں اسٹیمر (پانی کے دخانی جہاز) میں بیٹھ کر

کے لیے روانہ ہونا ہے۔ فرینکفرٹ کے اسٹیشن پر بھی ہمیں خود تلاش کر کے قلی کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ یہ بین الاقوامی نوعیت کی سیاحتی کمپنیاں خدا جانے اپنی ساکھ کیونکر قائم رکھتی ہیں۔ ان کا نظامِ عمل تو اکثر اوقات بہت ہی ناقص ہوتا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ریلوے اسٹیشن اور بندرگاہ کی برتھ تک زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ ریلوے قلی نے ہمارا سامان ساحل تک پہنچا کر جہاز والوں کے سپرد کر دیا۔ اس وقت تک جہاز ساحل پر آکر نہیں لگا تھا۔ وہ تھوڑے فاصلے پر دریائے رہائن کی لہروں پر چلا آرہا تھا۔ وہ خاصا بڑا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا اور دریا کے نیلگوں پانی پر دور سے بطخ کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ اس وقت جہاز میں پہلے سے مسافر بڑی تعداد میں بیٹھے تھے اور یہاں بھی بہت سے لوگ سوار ہونے کے لیے دروازہ کھلنے کے انتظار میں کھڑے تھے۔ جب دروازہ کھلا تو سب بے تابانہ داخل ہونے کے لیے دوڑ پڑے۔ ان میں مقامی باشندوں کے علاوہ غیر ملکی بھی شامل تھے۔ ہم میں پھرتی سے کام کرنے اور چستی دکھانے کی صلاحیت موجود ہے لیکن ایسے موقعوں پر مسابقت کا مظاہرہ کرنے کی جرأت کبھی نہیں ہوتی۔ اس لیے یقین ہو گیا تھا کہ جہاز پر ہمیں یہ موقع نہیں مل سکے گا کہ کنارے کی نشستیں حاصل کر لیں اور رہائن کی موجوں کے آس پاس کے ماحول سے زیادہ اچھی طرح لطف اندوز ہو سکیں۔

**دریائی سفر:** ہم نے دیکھا کہ لوگ اس دھکا پیل میں خواتین کا بالکل احترام نہیں کر رہے ہیں۔ "خواتین پہلے" کے اصول پر عمل کرنا تو درکنار انھیں بری طرح دھکیل کر آگے بڑھ جانے کی کوشش ہر شخص کر رہا ہے اور عورتیں بھی مردمار ہونے کا ثبوت دے رہی ہیں۔ ہم یہ سارا نقشہ دیکھتے ہوئے اخلاق کے دائرے میں رہ کر آگے بڑھتے گئے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہمارے داخلے کے وقت تمام اچھی نشستیں گھر چکی تھیں ہمیں کنارے سے ذرا ہٹ کر بڑے ہال میں جگہ مل گئی۔ اس میں سمندر کے رخ کی کھڑکیاں بھی بند کر رکھی تھیں۔ گویا وہاں بیٹھنے والوں کو قدرتی مناظر سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ باہر کی طرف سرسری نظر بھی ڈالنی نہیں چاہتے۔ ہم خواہ مخواہ اس ماحول میں گھر گئے۔ ہمارا "جرم" صرف اسی قدر تھا کہ ہم نے اندر داخل ہونے میں بداخلاقی کا ثبوت نہیں دیا۔

اب سوچئے کہ میں جس نشست پر ہوں۔ اس کا ماحول کیسا ہے سامنے ایک میز اور چار کرسیوں پر دو خاصی موٹی اور معمر خواتین بیٹھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی عمر چالیس سال سے کم نہیں ہے۔ ان کے ساتھ پندرہ سولہ سال کی ایک نوجوان لڑکی ہے اور ایک معمر مرد ہے۔ دونوں خواتین بے حد خوش معلوم ہوتی ہیں اور بار بار اپنی کرسیوں پر اچھلنے لگتی ہیں۔ مرد بے تحاشا ہنسنے کے علاوہ کوئی حرکت نہیں کر رہا ہے۔ لڑکی کو اپنی جوانی کا احساس ہے، اس لیے وہ ہنسنے میں ذرا نزاکت سے کام لے رہی ہے۔ لیجئے، انھوں نے اپنے سامان میں سے کچھ چیزیں نکال کر ناشتہ شروع کر دیا ہے۔ انڈے مکھن اور ڈبل روٹی کے توس۔ غالباً یہ لوگ گھر سے ناشتہ کئے بغیر جلدی میں چلے آئے ہیں۔

میرے بائیں جانب ایک جوان جوڑا اور ایک چھوٹی سی لڑکی بیٹھی ہے۔ خاتون نے اپنے بالوں پر مرغ کا ایک پورا بازو باندھ رکھا ہے۔ گویا یہ بھی ایک فیشن ہے۔ بچی کے سر پر چوڑے حاشیے کا ایک ہیٹ ہے جس کے کناروں پر لال رنگ کی جھالر لٹک رہی ہے۔

کچھ مسافر ہمارے بھی بعد آئے ہیں۔ یہاں تک کہ سارا جہاز سیلانیوں سے کھچا کھچ بھر گیا ہے۔ بعض کرسیوں کی تلاش میں کھڑے ہیں۔ خالی کرسی دیکھتے ہی لپکتے ہیں۔ شراب کی بوتلوں کے کارک کھلنے کی آوازیں مسلسل جاری ہیں۔ ہر شخص پینے میں مصروف ہے۔ جو بیٹھے ہیں، وہ پی رہے ہیں، جو کھڑے ہیں، وہ پی رہے ہیں۔ شراب کی کڑواہٹ کو دوبالا کرنے کے لیے سگریٹ بھی پئے جا رہے ہیں۔ سارے ہال میں دھواں گھٹ رہا ہے جو ہمارے لیے سخت ناگوار خاطر ہے۔ لیکن انھیں ذرا سا بھی احساس نہیں ہے جو اس دھوئیں کو تخلیق کرنے والی شے سے دل بہلا رہے ہیں۔ عہد جدید کے مذموم مشاغل میں سے ایک شغل سگریٹ نوشی بھی ہے۔ اصراف بے جا اور جی کا جلاپا یعنی اپنی رقم لگا کر یہ کھیل کھیلو اور نفع کے بجائے خسارے میں سرطان جیسا موذی مرض حاصل کرو۔ تمام سگریٹ نوش اس حقیقت سے واقف ہیں لیکن اس سے اجتناب کرنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ اپنا عقیدہ یہی ہے کہ اگر نادانستہ طور پر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو زیادہ قابل سرزنش نہیں لیکن جانتے بوجھتے ارتکاب ہو تو ناقابل معافی ہے۔

اندر کی ہوا چونکہ گرم ہے اور باہر کی سرد کسی قدر نمی کے ساتھ، اس لیے بہت جلد کھڑکیوں کے شیشے مدھم پڑ گئے اور باہر کی ہر چیز ایک پرچھائیں کی مانند اس طرح نظر آرہی ہے جیسے آنسو بھری ڈبڈبائی آنکھ سے کسی کا نظارہ کیا جائے۔ یہ سفینہ سمندر میں چلتا ہوتا تو اب تک ساحل اور اس کی ہر چیز آنکھ سے اوجھل ہو چکی ہوتی لیکن چونکہ وہ دریا میں سینۂ آب پر سرگرم سفر ہے، اس لیے کنارے سے دوری کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ماحول ہر آن بدل رہا ہے۔ ہم بھی کبھی اپنی کرسیوں سے اچک کر باہر کی فضا پر نظر ڈالنے کی کوشش کر لیتے ہیں ورنہ آس پاس کا شور کوئی مرکز توجہ قائم ہونے نہیں دیتا۔ کان پڑی آواز سنائی دینی مشکل ہے۔ بے ہنگام قہقہوں کے علاوہ شراب کی بوتلوں کے کارک کھلنے اور شراب انڈیلے جانے کی آواز مستزاد کا درجہ رکھتی ہے۔ قہقہوں اور ان آوازوں میں مقابلہ سا ہو رہا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ ان قہقہوں اور آوازوں کا مقابلہ دل کی دھڑکنوں سے نہ ہو جائے۔ پھر تمام نظامِ حیات ایک دردناک چیخ مار کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گا۔

چلتے چلتے ہمارا جہاز کسی جگہ ٹھیر گیا کرسی سے اٹھنا ہرگز مناسب نہیں تھا، اس لیے ایک بار پھر اچک کر باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ لکڑی کے ایک سیاہ تختے پر مختلف زبانوں میں حروفِ تہجی کے ذرا سے فرق کے ساتھ لفظ "بخارا" پڑھا گیا۔ ذہن فوراً حافظ شیرازی کی طرف منتقل ہو گیا۔ حالانکہ وہ بخارا نہیں ہے جس کے ساتھ سمرقند کو ملا کر دونوں صوبے "خالِ ہندوش" پر بخشے گئے تھے۔ باہر گودی کے پلیٹ فارم پر مسافر کی قسم کے بہت سے لوگ نظر آئے۔ دماغ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ سب کے سب اس کشتی پر ہم سب کے ساتھ سوار ہوں گے کہ آناً فاناً انھوں نے ہلّا بول دیا اور اس اطمینان کے ساتھ اندر چلے گئے گویا سارا جہاز ان کے لیے خالی پڑا تھا۔ پہلے سے بیٹھنے والے بھی ذرا نہیں گھبرائے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ اس جگہ کا معمول ہے۔ مسافر اسی طرح بھرتے ہیں اور لوگ اس کھچاکھچ کے عادی ہو گئے ہیں، ہم خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتے رہے۔ ہمیں اس جہاز کے عرشے پر ڈیرے ڈال کر ہمیشہ کے لیے یہاں نہیں رہنا تھا، چند لمحے بعد اتر کر اپنی منزل کی طرف چلا جانا تھا۔

جہاز پھر چل پڑا۔ امواجِ دریا نے اسے خوب ہچکولے دئے۔ باہر کا ماحول مسلسل زیر و زبر ہونے لگا۔ نئے آنے والوں میں بھی ملے جلے مقامی اور غیر ملکی باشندے شامل تھے۔ وہ بھی متقدمین کی طرح لہو ولعب میں مشغول ہو گئے۔ وہ بھی تشنہ کام تھے، رندانِ بلانوش کے ہم مشرب بن گئے۔ یہ سب بھی کھڑے رہے، کیونکہ بیٹھنے کی جگہ پہلے سے مفقود تھی۔

یکایک بہت سے لوگوں نے ہم آہنگ ہو کر کوئی گیت الاپنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ لوگ کھڑے ہو کر باہر کی طرف دیکھنے بھی لگے۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر دو تین دریچے بھی کھول دئے۔ ظاہر ہے کہ ہم اسے خود سمجھنے سے قاصر تھے میاں محبوب نے قریب کے ایک شخص سے سرگوشی کے انداز میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہی وہ مشہور و معروف مقام لورے لائی ہے جس کا ایک لطیف قصہ اپنی جملہ سحر انگیزیوں کے ساتھ جرمنی کے روایتی ادب میں مشہور ہے اور جس کا خلاصہ میں دو تین روز پہلے قلمبند بھی کر چکا ہوں۔ لورے لائی تو مر چکی، اس کا اصل محبوب بھی مر گیا لیکن اس کے بہت سے نادیدہ عاشق اب بھی اظہارِ بے چینی کرتے رہتے ہیں مجھے ڈر لگا کہ کہیں ہماری اس کشتی کا کپتان بھی کسی سراب میں مبتلا ہو کر اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھے لیکن کشتی کا کپتان غالباً اپنے کیبن میں ضرورت سے زیادہ شراب پی کر لورے لائی کے خیالی پیکر سے خالی الذہن ہو کر مدہوش پڑا تھا۔

سنٹ گوار کے مقام پر جہاز ٹھیرا تو بہت لوگوں نے اترنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ سب کے سب اس جگہ اتر کر اس مقام پر پہنچ جانا چاہتے ہیں جہاں لورے لائی کے مرئی پیکر نے غیر مرئی ہو کر ابدی زندگی حاصل کی تھی۔ بہت سے لوگوں کے اتر جانے سے کچھ کرسیاں خالی ہوئیں تو بہت سے کھڑے ہوئے لوگ بیٹھ گئے۔ اور باقی پھر بھی کھڑے رہ گئے۔ ہمارے قریب ہی دو نئے چہرے آ کھڑے ہوئے۔ ایک امریکن ایک جرمن کا بازو پکڑے انگریزی زبان میں بات چیت کر رہا تھا۔ دونوں کی زبانیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ دونوں نشے میں تھے۔ اتنے میں کینٹین کے بیرے نے دو بوتلیں دو گلاسوں کے ساتھ لا کر ہمارے سامنے کی میز پر رکھ دیں۔ ہم تینوں اپنی اپنی جگہ حیران تھے کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ امریکن نے فوراً آگے بڑھ کر بوتل اٹھائی اور گلاس بھر کر اپنے ساتھی کو دے دیا۔ دوسرا بھر کر خود پینے لگا۔ کچھ دیر میں دوسری بوتل بھی خالی ہو گئی۔ خالی بوتلیں اور

جھاگ والے خالی گلاس ہماری میز پر رکھے رہ گئے۔ اگر کسی ضرورت سے بھائی جان محترم اس وقت میز سے دور ہوتے اور اس موقع پر آجاتے تو معاً خیال کرتے کہ میں یا میاں محبوب اس شغل میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ امریکن یا جرمن کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوا ہوگا کہ انھوں نے اپنی اس حرکت سے ہمارے احساسات پر کتنی کاری ضرب لگائی تھی۔ کسی سے شکایت کرنی بھی فضول تھی۔

دس بجے کے قریب جن چار اشخاص نے خاصا اچھا ناشتہ کیا تھا، انھوں نے شوربہ پیا اور ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کو نگلنا شروع کر دیا۔ گویا اتنی دیر میں انھیں بھوک لگ آئی۔ نہ چلے، نہ پھرے اور نہ محنت و مشقت کا کوئی کام آیا۔ پھر نہ جانے ان کا معدہ کس نظام کے ماتحت خالی ہو گیا۔ جرمنوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بلانوش ہوتے ہیں اور ٹھہر ٹھہر کر دن میں کئی بار کھاتے ہیں۔ یہ طریقہ اور لوگوں کا بھی ہے لیکن وہ ہر بار بہت ہی قلیل مقدار میں صرف منھ جھٹالتے ہیں، اناڑی کی بندوق نہیں بھرتے۔ یہاں کا ہر فرد جتنا کہ ایک دن میں کھاتا ہے، اگر اسے علیحدہ جمع کیا جائے تو اوسط درجے کی ایک پتیلی بھر جائے گی۔ اسی پرخوری کے باعث اس قوم کے مرد اور عورتیں بھی بڑے ہاڑ کی اور تن و توش میں گاما پہلوان کی بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔ صرف جدید خیالات کی لڑکیاں ان سے مختلف نظر آتی ہیں کیونکہ انھوں نے نازک اندامی کو حسن کی ایک خوبی سمجھ لیا ہے۔ یہ لوگ اب بھی جبکہ کئی دریچے کھلے ہوئے تھے، سامنے کے حسین ماحول سے بے اعتنائی برت کر اپنی بدذوقی کا ثبوت دے رہے تھے۔ دونوں طرف ہری بھری مسلسل پہاڑیاں، نتھرا ہوا سفید پانی اور اس کی سطح پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے تیرتی ہوئی کشتیاں انھیں شاید ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ بوتلوں سے گلاسوں میں آجانے والی لال پری ان کے دل و دماغ پر بری طرح چھائی ہوئی تھی۔

ہمارے جہاز کے قریب سے ایک چھوٹی سی کشتی گزری جس میں ایک عورت چھوٹی سی بچی کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ ننھی بچی تیزی سے اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارے جہاز والوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ شاید اس کی نظر صرف ہم پر مرکوز ہو۔ کیونکہ لباس کے اعتبار سے ہم باقی سب لوگوں سے مختلف دکھائی دے رہے تھے اور لباس کی جاذبیت سب سے پہلے انسان کی توجہ موڑتی ہے۔ ہم نے اس کے جواب میں

ہاتھ ہلانا شروع کیا تو بچی خوش ہو کر زیادہ ہمکنے لگی۔ ماں نے فوراً سینے سے لگا کر اپنی بچی کو دبوچ لیا۔ اس کا یہ اندیشہ صحیح تھا کہ کہیں بچی ضرورت سے زیادہ ہمک کے دریائی لہروں کی نذر نہ ہو جائے۔ عورت غالباً اس مچھیرے کی بیوی تھی جو کشتی میں بیٹھا اپنا جال درست کر رہا تھا۔ یہ لوگ اب ماہی گیری کے لیے روانہ ہوئے تھے کیونکہ کشتی اس وقت تک سمندری پیداوار سے بالکل خالی تھی۔ جرمن لوگ بھی مچھلی کھانے کے بہت شوقین ہیں، دریائے رہائن کے ملاح اور مچھیرے سارے یورپ میں مشہور ہیں۔

دریا کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں پر موٹروں کے راستے بنے ہوئے ہیں اور دو ایک جگہ ریل کی پٹری بھی نظر آتی ہے۔ کچھ دیر پہلے ایک ریل گاڑی سامنے سے گزری تھی۔ موٹروں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ بات تو نہیں تھی جو شہروں میں نظر آتی ہے کہ اکثر اوقات سڑک کو عبور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ایک لمحہ کے لیے سڑک کا کوئی ٹکڑا خالی نظر نہیں آتا تھا۔ ان میں سے بہت سے تفریحی مقامات تک پہنچ کر رک جاتے تھے اور بعض طویل مسافت طے کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ انہی پہاڑیوں پر کہیں کہیں کوئی کوٹھ نظر آ جاتا ہے۔ عام آبادی سے بالکل الگ تھلگ ان میں شاید تنہائی پسند لوگ ہی رہتے ہوں گے۔ تھوڑے فاصلے پر کوئی آبادی ضرور ہو گی ورنہ "دنیا کی محفلوں سے اکتا کر"، "لطفِ انجمن" نہ اٹھانے والے یہ دل بجھے لوگ اپنی روزمرہ کی ضروریاتِ زندگی کس طرح پوری کرتے ہوں گے۔

بیرے نے ایک شخص کے سامنے آلو کی پلیٹ لا کر رکھ دی۔ ابلے ہوئے آلوؤں کو ثابت حالت میں تل لیا گیا تھا۔ وہ اندر سے یقیناً پھیکے ہوں گے۔ اسی لیے کئی قسم کی چٹنیاں ساتھ رکھی گئی ہیں۔ عام طور پر جرمن لوگ آلو کو چھری سے کاٹ کر نہیں کھاتے بلکہ کانٹے سے دبا دبا کر اس کا بھرتا سا کر لیتے ہیں اور پھر نمک کالی مرچ سوس وغیرہ ڈال کر کانٹے ہی سے اٹھا اٹھا کر کھاتے ہیں۔ کانٹے سے آلو متھنے کا انداز عجیب ہوتا ہے۔ گویا کوئی نازک انگلیوں سے ساز کے پردوں پر مشق موسیقی کر رہا ہے۔ لیکن ہمارے سامنے بیٹھا ہوا شخص جرمن نہیں امریکن تھا۔ اس نے اپنے دستور کے مطابق چھری سے کاٹ کر آلو کی باریک قاشیں کانٹے سے لے کر کھانی شروع کر دیں۔ اپنے آپ کو حکمراں سمجھنے والے یہ لوگ اہلِ جرمن کے جذبات کا ذرا بھی لحاظ نہیں رکھتے۔ مشرقی

دنیا کا کوئی شخص امریکہ جا کر اپنے طور طریقے استعمال کرنے لگے تو اس پر غیر مہذب ہونے کا ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ یہ خود آداب محفل کا یا آداب طعام کا خیال نہ رکھیں تو ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے۔ جرمنوں میں چونکہ رواداری کا مادہ بہت ہے اس لیے وہ غیر ملکیوں کی ناشائستہ باتوں پر بھی زیادہ سختی سے احتساب نہیں کرتے، عموماً محض احساس کرا کے خاموش ہو جاتے ہیں مجھے یقین ہے کہ جنگ عظیم کے مابعد اثرات کا جب تجزیہ کیا جائے گا تو جاپان اور جرمنی کی تاریخوں میں امریکیوں کا ذکر سیاہ حروف میں کیا جائے گا۔ تھوڑا بہت لکھا جا چکا ہے، اس سے کہیں زیادہ آئندہ لکھا جائے گا۔

ساڑھی میں ملبوس ایک خاتون ہمارے قریب سے ہو کر گزر گئیں۔ ان کے ساتھ ایک جرمن خاتون تھیں۔ کوئی مرد ہمراہ ہوتا تو شاید پہچانا جاتا اور کچھ پتہ چلتا کہ یہ کون ہیں اور غایت سفر کیا ہے۔ رنگ روپ سے یہ اندازہ لگانا آسان تھا کہ وہ پارسی خاتون تھیں۔ سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا جسم جو پھیکے نقش و نگار پیش کرتا ہو۔ مرمریں مجسمے میں اگر گل سُرخ کی رنگینیاں بھی جھلک دکھائیں تو پارسی خاتون نہیں ہو سکتی۔ نوے فیصد صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ غالباً ان کی خوراک میں ایسی چیزیں شامل ہوتی ہیں جن سے خون کے سُرخ ذرات ذرا کم ہو جاتے ہیں۔ سپیدۂ سحر میں جب تک شفق کی رنگینیاں شامل نہ ہوں صبح کی لطف فرمائی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس فرق کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے ایک چیز اپنی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچائی جائے اور ایک کسی ٹھیکیدار کے ذریعہ مکمل کرائی جائے۔ اُدھر ہر کام بھرپور ہوتا ہے اور ادھر کوئی نہ کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے۔

ایک دم ساز کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس وقت ہماری نظریں ہال میں نصب کیے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کی طرف اٹھ گئیں۔ اس سے پہلے وہ دکھائی بھی نہیں دیا تھا۔ کچھ دیر ساز بجتا رہا۔ ہمیں موسیقی داں ہونے کا دعویٰ تو نہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ وہ لطیف و دلپذیر تھا لیکن دو منٹ ساز بجانے کے بعد ہی ایک اعلان کیا گیا۔ یہ عام دستور ہے کہ کسی بھی قسم کا اعلان کرنے سے قبل جہاز کے اسٹوڈیو سے کوئی ساز بجایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کی توجہ مبذول ہو جائے اور وہ ہدایت سننے کے لیے

تیار رہیں۔ اعلان جرمن زبان میں ہوا جسے ہم تو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ میاں محبوب نے بھی پوری طرح نہیں سمجھا کیونکہ بولنے والا کوئی بہت ہی بوڑھا شخص تھا اور دمے کا مریض معلوم ہوتا تھا۔ اعلان کے الفاظ سے زیادہ اس کے سانس کی آواز سنائی دیتی تھی۔ سانس کی آواز بین الاقوامی زبان میں ہوتی ہے جسے ہم بھی سمجھ سکتے تھے۔ محبوب نے قریب بیٹھے ہوئے ایک جرمن سے پوچھا کہ اعلان میں کیا کہا گیا ہے؟ اس نے ہنس کر جواب دیا "کیا معلوم۔ اس اعلانچی کی بات صرف جہاز کا کپتان ہی سمجھ سکتا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ اعلان اسی نے مرتب کر کے دیا ہے اس کے سارے اعلان میں محض ایک لفظ ہماری سمجھ میں آیا۔" "اختونگ" یہ لفظ دو دفعہ کہا گیا۔ مطلب یہ ہے کہ "توجہ سے سُنیے۔"

**بوپارڈ:** بعد میں پتہ چلا کہ ایک بڑا شہر قریب آ گیا تھا۔ وہاں عام سیاحوں کے علاوہ بہت سے تاجروں کو اپنے سامان کے ساتھ اترنا تھا۔ جہاز والوں کو یہ بات معلوم رہتی ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو جو بھاری سامان کے ساتھ تھے اور سامان مال خانے کی بجائے ان کے اپنے ساتھ تھا، آگاہ کیا گیا تھا کہ وہ تیار ہو جائیں۔ بوپارڈ قریب آچلا ہے، یہ دریا کے بائیں کنارے پر ہے۔ عمارتیں بالکل ساحل سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہاں سے جہاز والوں کو کچھ سامان خور و نوش بھی خریدنا تھا جس کا انتظام پہلے سے ہو گیا تھا۔ ابھی مشکل سے نصف راستہ طے ہوا تھا۔ اگلے ایک مقام کوبلنز پر پہنچنے کے بعد آدھا سفر مکمل ہو جاتا ہے۔

بوپارڈ پر جہاز رکا تو ہم ذرا ستانے کے خیال سے اٹھے اور عرشے کے قریب ٹہلنے لگے تا کہ اتنی دیر بیٹھے رہنے سے ٹانگیں شل نہ ہو جائیں۔ اپنی کرسیوں پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے ہم نے اپنی ایک ایک چیز ان پر رکھ دی تھی لیکن یہ محض احتیاطی تدبیر تھی نشست سے محروم ہونے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔ کیونکہ یہاں بہت مسافر اتر گئے تھے اور نئے مسافر نسبتاً کم آئے۔ معلوم ہوا کہ یہاں روزانہ یہی ہوتا ہے۔ اب اگلے اسٹاپ پر جہاز خوب بھرے گا۔ صحیح معنوں میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ جب ہم کٹہرے کے قریب کھڑے ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ساحل پر مسافروں کے ملنے والے دوست اور رشتہ دار یا تاجر پیشہ افراد بڑی تعداد میں موجود ہیں اور پہچان پہچان کر ان کو اشارے کر رہے ہیں۔

یہاں بھی سوار ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اترنے والے بھی بہت تھے۔ ہمارے اس جہاز کو ویز باڈن سے روانہ ہوئے چار گھنٹے گزر چکے تھے گویا ایک بج رہا تھا، کچھ بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے میاں محبوب سے کہا کہ آپ جہاز کے کینٹین میں جا کر خصوصی انتظام کرائیے۔ دوران سفر میں اور خصوصاً اس جہاز میں کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ اس لیے قدرتی نعمتوں پر اکتفا کیا جائے۔ لیکن معلوم ہوا کہ پھل اس جہاز میں نہیں ملتے۔ دودھ البتہ میسر آ سکتا ہے لیکن سربند ڈبوں کا۔ چنانچہ ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر جما ہوا دودھ لگا کر خوب کھایا گیا۔ اس دودھ نے ربڑی کا مزہ دیا لیکن نمکین، بلکہ چٹپٹی چیز کو جی چاہتا رہا۔ تھوڑی سی آسودگیٔ شکم حاصل کرنے کے بعد ہم نے موقع کو غنیمت جانا اور جہاز کے عرشے پر ایک حصے میں جہاں چہل پہل بالکل نہیں تھی، ہم تینوں نے نماز باجماعت شروع کر دی۔ بھائی جان محترم اصولاً امام بنے اور اب جو انھوں نے سلام پھیرا تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہماری پشت پر ایک اچھا خاصا مجمع لگ گیا ہے۔ لوگ بڑے استعجاب کے ساتھ ہمارے طریقۂ عبادت کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ دوسری حیران کر دینے والی بات یہ تھی کہ ایک غیر ملکی شامل جماعت ہو کر ہمارے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک رکعت بعد شریک ہوا تھا۔ اس نے سلام پھیر کر ہمیں سلام کیا اور مصافحہ بھی کیا۔ پتہ چلا کہ وہ البانیہ کا رہنے والا ہے اور ترکِ وطن کر کے جرمنی میں آباد ہو گیا ہے۔ اسے اگلے ساحلی اسٹیشن پر اترنا تھا۔ اس لیے کچھ دیر کے واسطے اس کا ساتھ ہو گیا۔ اس نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔ اس نے بتایا کہ سب سے زیادہ مسلمان برلن میں ہیں۔ برلن کی تقسیم کا ان پر زیادہ اثر نہیں پڑا ہے۔ مشرقی اور مغربی حصّوں میں ان کی تعداد کا تناسب پچیس اور پچھتر فی صد ہے۔ یہ شخص عربی زبان جانتا اور قرآن پاک کو ترجمے کے بغیر پڑھ سکتا تھا۔ مشرقی ثقافت اور تہذیب و تمدن سے اسے بڑا شغف تھا۔ اس نے کئی کتابیں بھی اس موضوع پر لکھی تھیں۔ اس نے البانیہ کی اسلامی حکومت کے بارے میں بھی ایک کتاب لکھی تھی مگر جرمن زبان میں ہے، اس کا انگریزی ترجمہ شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اسے جرمنی کی موجودہ سیاست سے کوئی دل چسپی نہیں تھی لیکن ہمارے استفسار پر بھی امریکیوں کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ اس نے کہا، میں ہی نہیں، اصل جرمن باشندے بھی انھیں بُرا سمجھتے ہیں کیونکہ

انھوں نے اخلاقی اعتبار سے قوم کو تباہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ اپنے اس انحطاط کا احساس جرمنوں کو ہے اور اب وہ سنبھالا لے رہے ہیں۔

اس شخص سے گفتگو کے دوران میں میری نظر ایک اور شخص پر پڑی جو اس وقت جہاز میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک دم میرے منھ سے نکلا "آوارہ"، چہرے مہرے اور چال ڈھال کے اعتبار سے ہمارے شاعر آوارہ اور اس میں کوئی فرق نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس کا رنگ زیادہ صاف تھا۔ وہ انتہائی محویت کے عالم میں آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی گردن اور لٹکے ہوئے منھ کو دیکھ کر بھی مجھے شبہ ہوا تھا کہ آوارہ صاحب فکرِ شعر میں کھو گئے ہیں۔

ہال میں بہت سے نئے چہرے نظر آنے لگے لیکن مشاغل کا سلسلہ بدستور تھا۔ یعنی بوتل پر بوتل کھل رہی تھی اور گلاس بھر بھر کر خالی کئے جا رہے تھے۔ اس اعتبار سے ماحول اور سانس روک دینے والی مذموم فضا میں، جو شراب کی بو اور سگریٹ کے دھوئیں کے امتزاج سے بنی تھی، اس سفر سے بیزاری سی پیدا ہونے لگی تھی لیکن ظاہر ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس غیر سرزمین پر ہمیں اختیار کس طرح حاصل ہوتا جبکہ اپنے وطن میں بھی ہم کوئی ایسا تیر چلانے کے لائق نہیں تھے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے قانون شکنی ہوتی تھی اور ہمیں خاموش رہنا پڑتا تھا۔ سننے والے کان بہر بند تھے اور بہت سے ملکوں میں بھی عام لوگوں کا یہی حال ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتے اور خاموش رہتے ہیں، پھر یہاں تو شراب نوشی جائز بھی ہے۔

نئے چہروں میں بھی مرد عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔ جوانوں سے زیادہ بوڑھے لطفِ زندگی اٹھا رہے تھے اور عورتیں مردوں سے دو قدم آگے تھیں۔ آج اس گہما گہمی کے کئی سبب ایک ساتھ جمع ہو گئے ہیں۔ مثلاً اتوار کا دن ہے۔ مطلع معمول سے زیادہ صاف ہے۔ دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ ہوا بھی چل رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ موسم بدلنے والا ہے۔ سردی کی آمد آمد ہے۔ چند دن بعد شاید بارش ہو اور برف بھی گرنے لگے۔ اس وقت یہ تمام پہاڑیاں جو اس وقت سبز پوش ہیں، روئی کے گالوں کی مانند برف کے پتروں سے ڈھک جائیں گی۔ اس کے علاوہ ضرورت سے زیادہ بھیڑ بھاڑ کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ دیر باڈن اور بون کے درمیان یہ آج کی تاریخ کا آخری اسٹیمر

ہے۔ وہ اس سے پہلے جا چکے ہیں۔ ایک شاید منزل مقصود پر پہنچ بھی گیا ہوگا۔ ہر شخص نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہے۔

مجھے کچھ پیاس لگ رہی تھی۔ دریافت کرنے پر بھائی جان محترم نے بھی تشنگی کا اظہار کیا اور میاں محبوب سارنگی کے اس تار کی طرح جو محض ہمدردی کے طور پر دوسرے تاروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، اپنی پیاس کا اعتراف کرنے لگے۔ چنانچہ ان سے کہا گیا کہ کسی بیرے کو بلا کر لیمن کی بوتلوں کی فرمائش کی جائے لیکن ان کے متعدد اشاروں کے باوجود کسی بیرے نے توجہ نہیں دی۔ غالباً وہ ہمارے لنچ کی نوعیت سے جل گئے تھے اور اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ یہ بھی کوئی آدمی ہیں۔ نہ بیر پیتے ہیں نہ وھسکی۔ غالباً اس برہمی کے باعث وہ طرح دیتے رہے۔ ان کی بے التفاتی ان کے خیال کے اعتبار سے حق بجانب تھی۔ وہ سادہ پانی یا زیادہ سے زیادہ لیمن کیوں پلائیں کینٹین کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ جب میاں محبوب سے نہ رہا گیا تو وہ سیدھے منیجر کے پاس گئے اور لگے اس سے شکایت کرنے۔ منیجر کے جواب نے انھیں بالکل ہی کبیدہ خاطر کر دیا۔ اس نے کہا، اگر بیرا نہیں سنتا تو ہم کیا کریں۔ جس طرح بھی ہو، آپ اپنی فرمائش اسی کے سامنے پیش کریں۔ ہال میں خدمات انجام دینے کا وہی مجاز ہے۔ ہم اس کے کام میں دخل نہیں دے سکتے۔ دوسرے یہ کہ ہم نے جو کچھ مینو میں لکھ دیا ہے، وہی آپ منگوا سکتے ہیں۔ ڈبل روٹی کے ساتھ جما ہوا دودھ اب نہیں چل سکتا۔ پہلے بھی ہم نے رواج کے خلاف دے دیا۔ میاں محبوب نے سمجھایا کہ ہم دودھ نہیں لیمن چاہتے ہیں لیکن وہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ خدا جانے اس کی منیجری کس مرض کی دوا تھی۔

جہاز والوں کے اس سلوک پر میاں محبوب بہت ہی برہم تھے لیکن برہم ہونے سے کیا حاصل تھا۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ اگر یہ بیرے بد دماغ ہیں تو ہونے دو۔ ہمارا ان کا زیادہ دیر ساتھ نہیں رہے گا۔ جس طرح ہوا کا جھونکا ڈالیوں میں سے ہو کر گزر جاتا ہے، ہم بھی اس جہاز سے رخصت ہو جائیں گے اور پھر اس میں قدم تک نہیں رکھیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ تم ماحول سے دلچسپی لو۔ یہ قدرتی مناظر پھر دیدار کی لذت نہیں دیں گے۔ ان سے منہ موڑنا قدرت کی نعمتوں سے اپنے آپ کو محروم رکھنا ہے۔ لیکن توبہ کیجیے، کچھ دیر تک ان کا موڈ خراب رہا۔ وہ میری ان باتوں سے متاثر نہیں ہوئے،

جو میں نے ایشیا کی سربلندی کا وقت قریب آجانے کے بارے میں کہیں۔ میں نے کہا کہ مغربیت کے چہرے کی سفیدی جو بد دماغی اور بد تمیزی کی انتہا تک پہنچ چکی ہے ایشیا کی سربلندی اور شرافت و شائستگی کی برتری کا لوہا مان کر رہے گی۔ یہ سفید فام قومیں جو ایشیا کی رنگین اقوام پر حکومت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں، بہت جلد اپنے اس خود ساختہ فرض سے سبکدوش ہو جائیں گی۔ ان لوگوں کے اس نازیبا سلوک میں مجھے ایشیا کا عروج جھلک دکھاتا نظر آتا ہے۔

اتنے میں دوسرے حصے جہاز کا ایک اور بیرا ہمارے قریب سے ہو کر گزرا۔ برادر عزیز نے اسے روک لیا اور کہا کہ ہم پیاسے ہیں اور شراب بالکل نہیں پیتے۔ اس نے مسکرا کر پوچھا "سادہ پانی چاہیئے، دریا کی لہروں سے ایک جگ بھر دوں"۔ میاں محبوب نے اور بھی چیں بہ جبیں ہو کر کہا "ہم سیدھا سادا لیمن چاہتے ہیں، صاف کہو کہ تم لا سکتے ہو یا نہیں؟"

بیرا حامی بھر کر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں تین ٹھنڈی بوتلیں لے آیا لیکن ہم سے کہا کہ اس کا بل نہیں مل سکے گا کیونکہ یہ جہاز کے کینٹین کی نہیں، علیحدہ حساب کی ہیں۔ ہمیں بل یا رسید سے غرض نہیں تھی۔ ہم تو اپنی تشنگی بجھانی چاہتے تھے۔ اس بیرے کا خوش گوار طرز عمل دیکھ کر مجھے ذرا جرأت ہوئی اور میں نے میاں محبوب کی وساطت سے پوچھا کہ تم لوگ صبح نو بجے سے مسلسل کام کر رہے ہو اور بار بار جہاز کے نچلے حصے میں گودام سے سامان لینے جاتے ہو۔ آخر تم تھکتے کیوں نہیں۔ اس نے ہنس کر جواب دیا "یہ ہمارا روزمرہ کا کام ہے۔ تھک کر بیٹھ جائیں تو کام کس طرح چلے۔ نوکری ختم ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ ہم بھی ختم ہو جائیں"۔ اس نے کہا "میں تھکا تو نہیں، البتہ اب بھوک لگنے لگی ہے لیکن اتنا وقت کہاں ہے کہ اطمینان سے بیٹھ کر چند لقمے کھا لیے جائیں۔ لوگوں کی فرمائشیں کسی طرح کم نہیں ہوتیں کیونکہ لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے گھر سے بھوکا پیاسا آتا ہے اور ابد تک کے لیے اپنا پیٹ بھر لینا چاہتا ہے، دریا میں چلنے والے ہر اسٹیمر پر یہی حال رہتا ہے اس کے برعکس گہرے سمندر پر چلنے والے جہاز مسافروں کی ہر آن آمد و رفت سے بچے رہتے ہیں۔ اس لیے ان میں کھانے پینے کا نظام اوقات بھی با قاعدہ ہوتا ہے۔ وہاں

کام کرنے والوں کو اچھی فرصت مل جاتی ہے۔ میں صبح آٹھ بجے سے کام کر رہا ہوں۔ اب تک کچھ نہیں کھایا ہے۔ کولون کے کنارے یہ جہاز شام کے ساڑھے سات بجے لنگر انداز ہوگا۔ وہاں اطمینان کے ساتھ پیٹ بھرنے کا موقع ملے گا۔ اگر ممکن ہوا تو کوبلنز کے مقام پر کوئی چیز منھ میں ڈال لی جائے گی۔ وہاں جہاز ذرا زیادہ دیر ٹھیرے گا اور بہت سے لوگ اتریں اور چڑھیں گے۔"

بیرے کو جرمن زبان میں "ہر اوبر" کہتے ہیں۔ "ہر" تعظیمی لفظ ہے اور مسٹر یا جناب کے معنوں میں اونچے درجے کے ناموں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ہر ہٹلر، ہر میں ہر ہملر وغیرہ۔ بیرے اونچے درجے کے لوگوں میں شمار نہیں ہوتے لیکن چونکہ ہر شخص کو خواہ وہ سفر میں ہو یا حضر میں، ان سے واسطہ پڑتا ہے بلکہ کھانے پینے کے معاملے میں ان کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ اس لیے ان کی خوشنودی کی خاطر ان کا احترام کرنا پڑتا ہے۔
مجھے معاً کراچی کا ایک نوجوان شخص یاد آگیا جو ذات کے اعتبار سے حجام ہے لیکن ذرا پڑھ لکھ کر اپنے خیالات کے اعتبار سے کچھ ابھر گیا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ بال تراشنے والوں کو نائی یا حجام کہا جائے بلکہ باربر یا زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہیر ڈریسر کہا جائے۔ اس نے اپنے مؤقف کا پرچار اس درجہ کیا ہے کہ اگر کوئی بھولے سے کسی حجام کو حجام کہہ دے تو ساری برادری کے لوگ اس سے ناراض ہو جاتے ہیں اور پھر وہ غریب "فارغ البال" ہونے سے محروم رہتا ہے۔

کافی تاخیر سے جہاز روانہ ہوا اور اب یقین ہو گیا کہ یہ ہماری منزل تک مقررہ وقت سے ایک گھنٹے بعد پہنچے گا۔ یوں پہنچنے کا وقت چار بج کر چھبیس منٹ ہے۔ وقت کی پابندی کا جس قدر لحاظ ریل کے سفر میں رکھا جاتا ہے، اسی قدر بے قاعدگی جہاز کے سفر میں ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ بادبانی کشتیوں کا زمانہ نہیں ہے کہ انسان ہوا کا رُخ بدلنے کا محتاج رہے۔

جہاز کوبلنز کے مقام پر پہنچا تو عجیب افراتفری کا عالم ظہور میں آیا۔ جہاز پر سوار آدھے سے زیادہ لوگ اترنے کے لیے اور ساحل پر کھڑے ہوئے تقریباً اتنے ہی لوگ سوار ہونے کے لیے بیتاب تھے۔ معلوم ہوا کہ جہاز کے "ارباب رفتار" نے اعلان کیا تھا کہ یہاں جہاز اپنے مقررہ وقت سے ذرا کم ٹھیرے گا تاکہ تاخیر کی کچھ کسر پوری کر سکے۔

ادھر ساحل والے انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں جہاز ہمیں چھوڑ کر آگے نہ بڑھ جائے۔

کوبلنز دریاؤں کا سنگم ہے۔ یہاں رہائن کو ایک اور دریا کاٹتا ہے جس کے شرقی اور غربی حصّوں کے الگ الگ نام ہیں۔ اسی لیے پانی کا بہاؤ بھی اس جگہ تیز تر ہے۔ سطحِ آب پر جگہ جگہ بھنور پڑتے نظر آرہے تھے۔ کوبلنز اپنے اوپیرا کی قسم کے ڈراموں کی وجہ سے بہت مشہور ہے، بلکہ ڈرامے کی ایک قسم کوبلنز کہلانے لگی ہے۔ اس شہر کا ایک اور مقام وین ڈورف اپنی دل چسپیوں کے باعث مرکزِ توجہ ہے، چنانچہ اترنے چڑھنے والوں میں سیلانی جیوڑے زیادہ ہیں۔

اِس جہاز میں مسلسل سواریاں آرہی ہیں اور جارہی ہیں۔ آخر میں ایک جگہ تو ایسا ہوا کہ آنے کا سلسلہ زیادہ ہو گیا اور کپتان نے مزید سواریاں بٹھانے سے انکار کر دیا اور جہاز گودی سے ہٹا لیا۔ اس آمد و رفت کی وجہ سے ہمارا جہاز لیٹ بھی ہو گیا ہے اور ۴ بج کر ۲۵ منٹ کی بجائے ساڑھے پانچ بجے بون پہنچ رہا ہے۔

بھائی جان محترم اس سفر سے کچھ تھکے تھکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ یہ جہاز اس انداز کا ہوگا کہ میزیں اور کرسیاں بے ترتیب پڑی ہیں اور مُسافر اپنی مرضی کے مطابق ادھر ادھر کھسکا کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ الگ الگ کیبن سے ہوں گے۔ بڑے اطمینان سے سفر کٹے گا اور وہ سکون و اطمینان میسّر آئے گا جس کی خاطر یہ طویل دریائی راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ اگر اس صورت حال کا علم ہوتا کہ سارا دن ہنگاموں میں گزرے گا تو شاید ہم ریل کے سفر کو ترجیح دیتے جس میں وئیر باڈن سے بون تک صرف پونے دو گھنٹے لگتے ہیں، تاہم یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اتنے قریب سے جرمنوں کے مطالعہ کا موقع مل گیا۔ اتنا گہرا مطالعہ اس سفر کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

میرے ذاتی محسوسات یہ ہیں کہ یہ قوم ایک طرف جفاکش ہے اور دوسری طرف پہلے درجے کی عیاش ہے۔ عیّاشی میں سارے معنی محفوظ ہیں۔ دل کھول کر آرام کرتے ہیں اور زندگی کا حاصل بس یہی سمجھتے ہیں۔ میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جنگ سے پہلے اور رائش کے بعد ان کی زندگی میں کیا فرق ہوا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس

درجہ اور مسلسل بمباری نے انھیں متاثر ضرور کیا ہوگا اور زندگی کا نظریہ ان کی نگاہ میں بدل بھی گیا ہوگا۔ اس نظریے کے پلٹنے میں دیر لگے گی۔

**نورتھ رہائن ویسٹ فالیا:** دُنیا کی تقسیم بر اعظموں، ملکوں، صوبوں، ضلعوں اور شہروں یا قصبوں کی صورت میں جو کی گئی ہے، وہ محض انسانی ذہن کی پیداوار ہے اور اس کے نشانات نقشوں یا جغرافیائی مضمونوں میں نظر آتے ہیں۔ ہمیں ایک دم معلوم ہوا کہ ہم صوبہ ہیسے کی حدود سے نکل کر اب نورتھ رہائن ویسٹ فالیا نام کے صوبے میں داخل ہوگئے ہیں۔ اس حد کا تعین نہ دریا کی لہروں نے کیا اور نہ سر بلند پہاڑیوں نے۔ شاید وہ اس تقسیم سے متفق بھی نہ ہوں۔

وفاقی جمہوریہ جرمنی میں نورتھ رہائن ویسٹ فالیا جسے جرمن زبان میں نورڈ رہائن ویسٹ فالن کہتے ہیں، سب سے زیادہ گنجان آباد صوبہ ہے یعنی آبادی کی اوسط ایک ہزار ساٹھ نفوس فی کلومیٹر ہے۔ شاید اس لیے کہ تاریخ اور ثقافت کے اعتبار سے اس صوبے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ شروع میں یہ دونوں علاقے یعنی نورتھ رہائن اور ویسٹ فالیا الگ الگ تھے لیکن دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب ان علاقوں پر برطانیہ کا تسلط تسلیم کیا گیا تو ۱۹۴۶ء میں اس کے اربابِ حل و عقد نے دونوں کو ملا کر ایک بڑا صوبہ بنا دیا کیونکہ ان دونوں میں اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے قریبی تعلق قائم تھا۔ متحد ہونے کے بعد اس صوبے کا رقبہ تیرہ ہزار ایک سو تیس مربع میل اور آبادی تقریباً ایک کروڑ چالیس لاکھ ہوگئی۔ شروع میں بے روزگاری کی عام فضا قرینِ قیاس تھی لیکن اس وبائی کیفیت پر جلد قابو پا لیا گیا۔ چنانچہ اس وقت صرف وہی لوگ بے روزگار ملیں گے جو یقیناً کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ مشرقی جرمنی سے ترکِ وطن کر کے اس صوبے میں پناہ لینے والوں کی تعداد یکم اپریل ۱۹۵۳ء تک سولہ لاکھ سترہ ہزار آٹھ سو چھتیس ہوگئی تھی اور وہ بھی میدانِ معیشت میں قدم بڑھا کر کارآمد انسان بن گئے تھے۔ کیونکہ ادھر کے صنعتی مرکزوں کی وجہ سے یہاں ہر قسم کی صنعت ترقی پانے لگی تھی اور روزگار کے دروازے ہر باشندے کے لیے کھل گئے تھے۔

۲۹ اگست ۱۹۴۶ء کو برطانوی فوجی حکومت کی ہدایت پر اس صوبے کی پہلی نمائندہ مجلس، جو "ڈائٹ" کہلاتی ہے، باقاعدہ عمل میں آئی۔ اس کے اراکین کو صوبے کی

سیاسی جماعتوں کی تجویز پر فوجی حکومت نے نامزد کیا تھا۔ دونوں حصّوں سے ایک ایک سو نمائندے لیے گئے۔ لیکن اسی سال کے آخر میں نئے انتخابات ہوگئے اور ۲۰ر اپریل ۱۹۴۷ء کو صحیح معنوں میں پہلی مجلس کی تشکیل ہوئی جس کے وزیر اعلا کارل آرنلڈ پسند کیے گئے۔ انھوں نے تمام سیاسی جماعتوں پر مشتمل اپنی کابینہ مرتب کی تاکہ کسی شورش یا ہنگامے کا خدشہ باقی نہ رہے اور حکومت کا نظام بخیر و خوبی قائم رہ سکے۔

۱۸ر جون ۱۹۵۰ء کو صوبے کا دستور العمل پیش ہوا جو ستاون فی صد ووٹوں کی اکثریت سے منظور کرلیا گیا۔ اس دستور العمل کے مطابق صوبے کے دو بڑے بڑے ضلعے نورتھ رہائن اور ویسٹ فالیا تسلیم کیے گئے اور مجالس بلدیہ کو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں کافی اختیارات تفویض کردیے گئے۔ ضلعوں کے سربراہوں کو ڈائرکٹر کہا جانے لگا جو ایک طرف مقامی حکومتوں کے کام کی کڑی نگرانی رکھتے ہیں اور دوسری طرف صوبے کی کابینہ کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔

قدرتی وسائل کے اعتبار سے یہ صوبہ بڑا دولت مند ہے۔ ملک کی کل پیداوار کا چالیس فی صد حصّہ یہیں سے حاصل ہوتا ہے۔ الگ الگ غور کیا جائے تو مغربی جرمنی کی کانوں سے نکلنے والے کوئلے کا پچیانوے فی صد اور لوہے اور فولاد کا تیراسی فی صد حصّہ اسی سرزمین سے متعلق ہے۔ اسی لیے یہاں لوہے اور فولاد کے بڑے بڑے کارخانوں کے علاوہ شیشہ سازی، پارچہ بافی اور کیمیائی اشیا کی صنعتیں بھی خوب فروغ پا رہی ہیں چنانچہ سارے ملک سے جس قدر انکم ٹیکس مرکزی حکومت کو حاصل ہوتا ہے اس کا پینتیس فی صد حصّہ یہاں کے کارخانے اور افراد ادا کرتے ہیں۔ بڑی صنعتوں کے علاوہ گھریلو قسم کی چھوٹی صنعتیں بھی ہر شہر اور ہر قصبے میں اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔

زمین کی زرخیزی اور آب و ہوا کی عمدگی کے اعتبار سے یہ صوبہ لائق رشک ہے۔ چنانچہ تقریباً پچاس لاکھ ایکڑ کا رقبہ زراعت کے لیے اور بیس لاکھ ایکڑ کا علاقہ جنگلات کے لیے مخصوص ہے۔ اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں زرعی پیداوار پر بہت برا اثر پڑا تھا لیکن مصنوعی کھادوں اور مشینوں کے استعمال سے اور معقول منصوبہ بندی کی بدولت حالات بہت جلد سدھر گئے۔ چنانچہ زمانۂ قبلِ جنگ کی بہ نسبت ۱۹۵۲ء

ہی میں اناجوں کی پیداوار سولہ فی صد اور آلو کی اکتالیس فی صد زیادہ ہوگئی۔ اسی طرح غذا کے طور پر کام آنے والے مویشیوں اور پرندوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی۔ لڑائی سے پہلے ایک کروڑ سترہ لاکھ باشندے تینتیس لاکھ چھپّن ہزار گھروں میں آباد تھے۔ ان میں سے گیارہ لاکھ بیالیس ہزار گھر لڑائی کے دوران میں ختم ہو گئے۔ لیکن یکم جنوری ۱۹۴۷ء سے تعمیر نو اور مرمّت کا کام شروع ہوا تو اب اس منزل پر آ گیا ہے کہ کوئی بھی شخص بے گھر نہیں رہا۔

چھ ہزار کے قریب تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ ان میں سے نصف تو بالکل برباد ہو گئی ہیں۔ باقی کو درست کر لیا گیا ہے یا کیا جا رہا ہے اور کوشش ہے کہ پچھلی شان بحال ہو جائے۔ اس صوبے کے صدر مقام ڈسلڈورف میں جو آرٹ گیلری تھی، اس کی رسم تجدید ادا کرتے وقت مسٹر کارل آرنلڈ نے ہر سال انعامی مقابلوں پر پچاس ہزار مارک صرف کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ ہمارے قدیم روایتی نوادر محفوظ رہیں اور نئے ثقافتی شاہکار وجود میں آئیں تاکہ فنونِ لطیفہ کے میدان میں ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اسی لیے ہم عظیم فن کاروں اور ماہروں کی سرپرستی کرنی چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں حکومت خاطر خواہ خیال رکھے گی۔ کوئی ایسا حکم نافذ نہیں کرے گی جس سے فنون کی نزاکتوں کو ٹھیس لگے۔ چنانچہ ثقافتی امور کا میزانیہ ہر سال بڑھتا جا رہا ہے۔

**سات پہاڑیاں:** ہمارا جہاز بون سے کوئی چھ میل کے فاصلہ پر تھا کہ ہمیں حدِ افق کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی سات پہاڑیاں نظر آنے لگیں جن کو جرمن زبان میں زی بن گے برگے" کہتے ہیں۔ زی بن کے معنی ہوئے سات۔ برگ بڑے پہاڑ کو کہتے ہیں اور گے برگ پہاڑی کو۔ دریا کے کنارے ان سب کا فاصلہ خاصا ہے اور ان میں ایک دوسرے کے درمیان بھی فاصلہ ہے لیکن یہ فریبِ نظر ہے کہ وہ ساحل سے بالکل ملی ہوئی ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سب سے نیچی پہاڑی دراخن فلز ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے ایک ہزار سرسٹھ فیٹ ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک قدیم کلب کے کھنڈر پھیلے پڑے ہیں۔ اس کے بالکل پیچھے وولکن برگ ایک ہزار چھہتر فیٹ بلند ہے۔ شمال کی جانب ایک ہزار چھیانوے فیٹ بلند پٹرز برگ ہے۔ یہاں ایک گرجا ہے جس کی زیارت کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ باقی چار پہاڑیاں

جانبِ جنوب ایک سلسلے میں ہیں۔ ان میں سے اُول برگ (ایک ہزار پانچ سو بائیس فیٹ) سب سے اونچی ہے۔ اس سے ذرا نیچی یعنی ایک ہزار پانچ سو چھ فیٹ بلند نودن برگ ہے۔ لوھر برگ کی چوٹی ایک ہزار چار سو چوالیس فیٹ اونچی ہے اور سب سے آخر میں نونن اسٹردم برگ ہے جو ایک ہزار ایک سو سات فیٹ بلند ہے۔ دراخن فلزبہ کے دامن میں جانبِ شمال کونگز ونٹر کے نام کا ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے جہاں سے پہاڑی ریلوے لائن شروع ہو کر سب سے اونچی چوٹی تک پہنچتی ہے۔ تقریباً ہر پہاڑی کی چوٹی پر کھنڈر پائے جاتے ہیں لیکن اب کوئی بھی چوٹی آباد نہیں ہے۔ کونگز ونٹر دریا کے دائیں جانب اور گوڈس برگ بائیں جانب دو عمدہ صحت بخش مقامات ہیں۔

کچھ دیر بعد ہمارا جہاز بون کے بالکل قریب پہنچ کر بندرگاہ کے عین سامنے آ گیا، جہاں پلیٹ فارم پر بے شمار لوگ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے یقیناً بہت دیر سے کھڑے تھے کیونکہ جہاز وقت مقررہ سے ایک گھنٹے بعد پہنچا تھا۔ سارے مسافروں پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید تمام مسافر یہیں اتر جائیں گے۔ کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔ وہ لوگ جو اب تک تاش کھیلنے یا شراب پینے میں مصروف تھے، اپنے مشاغل کو چھوڑ کر اور اپنا مختصر سامان سنبھال کر عرشے پر کٹہرے کے قریب آ گئے تھے۔ جن کے پاس سامان زیادہ تھا وہ اسے باندھنے جوڑنے میں لگ گئے تھے تاکہ قلیوں کے سپرد کر کے لے جانے میں آسانی ہو۔ یہ تو ظاہر تھا کہ سارے مسافر اسی گودی پر نہیں اتریں گے کیونکہ یہ اس جہاز کی آخری منزل نہیں تھی۔ اسے ابھی بہت آگے جانا تھا۔ چنانچہ بہت سے مسافر اس پر سوار ہونے کے لیے پلیٹ فارم پر تیار کھڑے تھے اور بہت سے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن ہو یا بندرگاہ، شاذ و نادر سفر کرنے والے عموماً ان مقامات پر سراسیمہ اور پریشان نظر آتے ہیں۔ سوار ہونے والوں کو گاڑی یا جہاز پکڑنے، سوار ہونے اور عمدہ نشست حاصل کرنے کی گھبراہٹ ہوتی ہے اور اترنے والے اپنے عزیز و اقارب سے ملنے نیز پوری مقدار اور صحیح حالت میں اپنا سامان لے جانے کے لیے بیتاب نظر آتے ہیں۔ ہماری کیفیت سب سے الگ تھی۔ ہم جانتے تھے کہ

اس پرائے دیس میں ہماری جان پہچان کا کوئی متنفّس موجود نہیں ہے اور نہ ہمارے ساتھ کسی قسم کا سامان تھا۔ بھاری قسم کے سوٹ کیس سامان والے حصّے میں دوسروں کی نگرانی میں تھے۔ ان کو چڑھانا اور اتارنا انھی کا کام تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ اپنے وقت پر ہمیں مل ہی جائیں گے لہٰذا گھبراہٹ دکھلانے کی ضرورت نہیں تھی۔

**دریائی جہاز رانی:** اس میں شک نہیں کہ اس دریائی سفر میں، جو تقریباً سارے دن کا تھا، ہم بری طرح تھک گئے لیکن اس کے برعکس ہمیں بڑا تجربہ بھی حاصل ہوا۔ اور اچھے نظاروں سے لطف اٹھانے کا موقع بھی مل گیا۔ اس کے علاوہ ہمیں تسلیم کرنا پڑا کہ اس ملک میں خشکی کی سطح پر آٹوبھان جس قدر کارآمد ہے اتنے ہی مفید وہ دریائی راستے ہیں جن پر جہاز رانی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مسافروں کے جمِ غفیر کو دیکھتے ہوئے یہ ماننا پڑا کہ کتنی بڑی تعداد میں لوگ اس ذریعۂ آمد و رفت پر بھروسہ کیے رہتے ہیں۔ اور اگر یہ ذریعہ منقطع یا معطل ہو جائے تو انھیں کتنی دقتوں کا سامنا ہو گا۔ اس تلخ حقیقت کا صحیح احساس دوسری جنگِ عظیم ختم ہو جانے کے بعد ہوا تھا۔

لڑائی کے بادل چھٹ جانے اور فضائے امن طاری ہونے کے بعد جب ملک کے اربابِ حل و عقد نے زبردستی مسلط ہو جانے والے نام نہاد اتحادیوں کے ساتھ مل کر بحالیات کا کام شروع کیا اور اس ضمن میں دریائی جہاز رانی کے نظام پر پوری توجہ دی تو انھیں پتہ چلا کہ صرف وفاقی جمہوریہ کے دریاؤں پر بنے ہوئے ایک ہزار دو سو ستر پلوں میں سے نو سو اڑسٹھ بُری طرح مسمار ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر دریائے رہائن کا ہر پل ٹوٹ کر دریا میں جا پڑا تھا۔ تعمیرات کے اس نقصانِ عظیم کے علاوہ دریاؤں کی روانی میں بھی خلل پڑ گیا تھا۔ مجموعی طور پر تقریباً تین لاکھ ستر ہزار ٹن فولاد، جو ان پلوں کی تیاری میں استعمال ہوا تھا، دریاؤں کی تہ میں جا پڑا تھا۔ فولاد کے علاوہ جو پتھر، چونا اور سیمنٹ وغیرہ ان میں لگا تھا، ان کی مجموعی مقدار ڈیڑھ کروڑ مکعب فیٹ سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ پھر چار ہزار کے قریب چھوٹے بڑے جہازوں اور کشتیوں کے ڈھانچ دریاؤں میں نامعلوم مقامات پر پڑے تھے۔ ان سب کے باعث دریاؤں میں نئے سرے سے جہاز رانی خطرے سے کسی طرح بھی خالی نہیں تھی، تاوقتیکہ ان کی صفائی نہ ہو جائے۔

چنانچہ بحالیات کے محکمے کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ دریاؤں کی تہ سے ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو پلوں یا جہازوں نے پیدا کر دی ہیں۔ لہٰذا صفائی کے منصوبے مرتب کیے گئے اور سارا کام بڑی حد تک ۱۹۵۲ء کے وسط تک مکمل کر دیا گیا۔ اب چونکہ سارا کام نئے سرے سے ہوا تھا، اس لیے آبی راستوں اور جہاز رانی کے محکموں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ تعمیرِ نو بالکل جدید انداز میں شروع کی جائے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہر اس مقام پر پل ضرور تعمیر کیا جائے جہاں وہ پہلے بھی موجود تھا تاکہ اس کے ساتھ آب رسانی اور قوتِ برقی بنانے کے کارخانے دوبارہ چل پڑیں۔ جو پشتے ٹوٹ گئے تھے، ان کو اسی طرح تعمیر کیا جائے اور نہروں کو کھولنے بند کرنے کا نظام درست کیا جائے تاکہ آبپاشی کے کام میں رخنہ نہ پڑے۔ دورانِ جنگ میں اس نظام کے بگڑ جانے سے شدید نقصان پہنچا تھا۔ کہیں ضرورت سے زیادہ پانی کے بہاؤ نے فصلوں کو دریا برد کر دیا اور کہیں پانی کی کمی یا بالکل فقدان نے انھیں خشک کر دیا۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں یکساں تھا یعنی باغیچوں اور کھیتوں کی تباہی اور ان کے ساتھ اناجوں، ترکاریوں اور پھلوں کی پیداوار میں بے حد کمی ہو گئی۔

پلوں اور بندوں کی تعمیر اور دریاؤں کی تہ کی صفائی کے ساتھ ساتھ اربابِ حل و عقد نے نئی کشتیاں اور جہاز بنانے پر بھی گہری توجہ مبذول کی۔ یہ ہفتے عشرے کا کام نہیں تھا کہ پلوں کی تکمیل کے وقت تک کے لیے ملتوی رکھا جاتا۔ سب سے پہلے انھوں نے ایسے جہاز تیار کرائے جن کا وزن زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ٹن اور پانی میں دباؤ کی کیفیت آٹھ فیٹ کی گہرائی تک ممکن ہو سکتی تھی۔ ان کی فوری تعمیر سے یہ فائدہ ہوا کہ قلیل فاصلے طے کرنے کا سلسلہ جلد شروع کر دیا گیا۔ پھر ایسے بڑے جہازوں کی خبر لی گئی جو چھتیس سے چھیالیس فیٹ تک کی گہرائی میں چل سکتے تھے۔ ان کا طول و عرض زیادہ اور ان پر بار لادنے کا پیمانہ وسیع تھا۔ ایسے جہاز دریا سے نکل کر سمندر میں بھی جا سکتے تھے۔ جرمنی کے بحری بیڑے کی عظمت سے کسے انکار ہو سکتا تھا۔ اس کے جہاز دنیا کے ہر حصے میں پہنچ جاتے اور ہر قسم کے مال کی باربرداری کے لیے موزوں تھے۔ لڑائی کے دوران میں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا تھا۔ پچھلے سال کے آخر تک ان کی تعداد تین ہزار ہو گئی تھی اور ان کا مجموعی وزن چھتیس لاکھ ٹن سے زیادہ تھا۔ مسافروں کو لانے لے جانے والے جہازوں

کی تعداد چار سو تک جا پہنچی۔

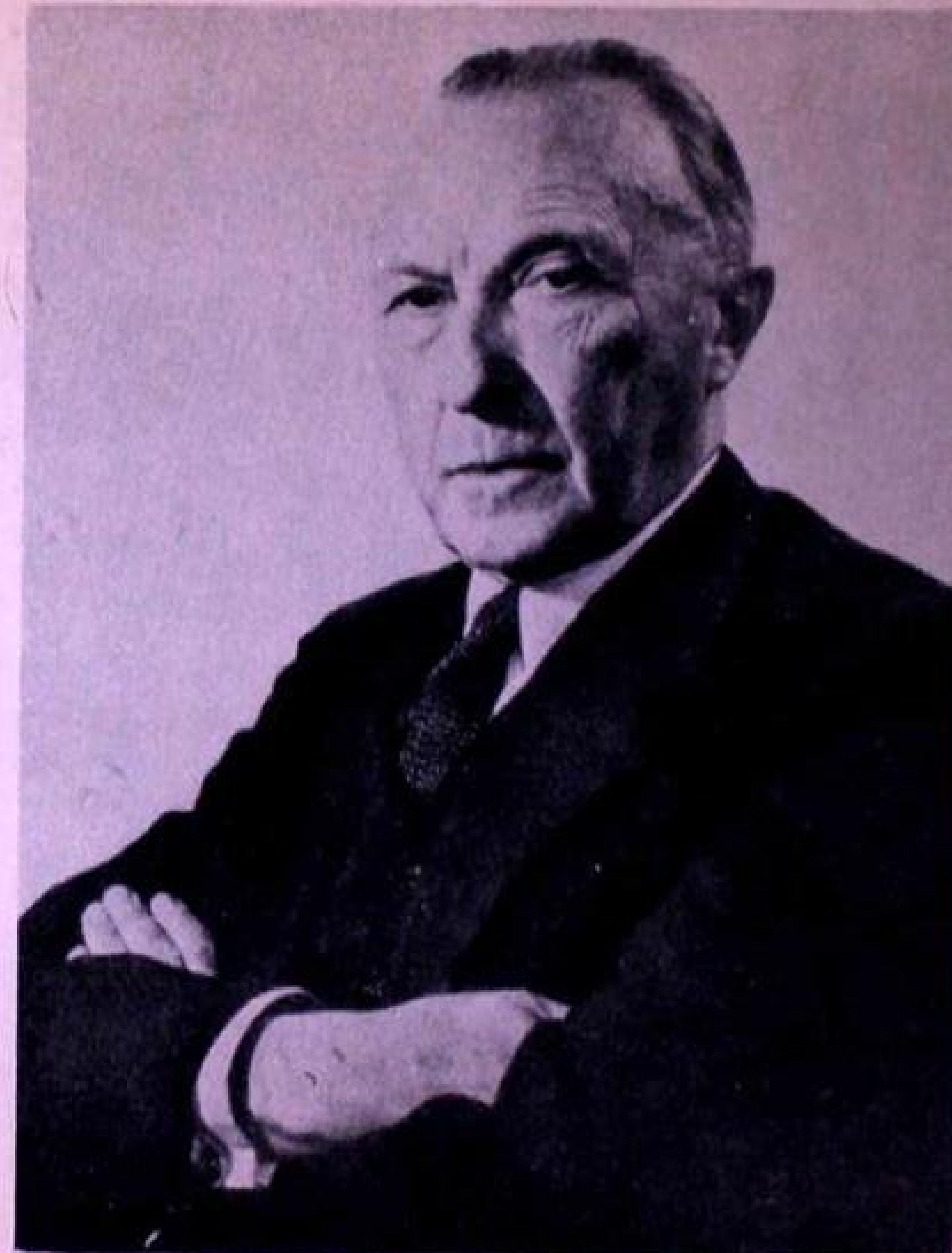
ان ترقی پذیر کاموں پر حکومت نے ۱۹۴۹ء سے پچھلے سال تک ڈیڑھ ارب جرمن مارک صرف کیے۔ لیکن یہ سرکاری خزانے پر زیادہ بڑا بار نہیں تھا۔ صرف ۱۹۵۲ء میں حکومت نے سترہ کروڑ ساٹھ لاکھ جرمن مارک حاصل کرلیے۔ اس کی آمدنی برابر بڑھتی رہی، جو ۱۹۵۶ء میں ایک ارب اکیاون کروڑ مارک سے بڑھ گئی۔ اس وقت تک بین الاقوامی جہازرانی میں وفاقی جرمنی نے دسواں نمبر حاصل کرلیا ہے۔ یہ دوسرے ملکوں کی انتہا کے مقابلے میں ہے۔ جرمنی کی انتہا کے بارے میں ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ صرف یہ خیال پیش کیا جاسکتا ہے کہ شاید وہ کبھی نہ کبھی سرفہرست آجائے۔

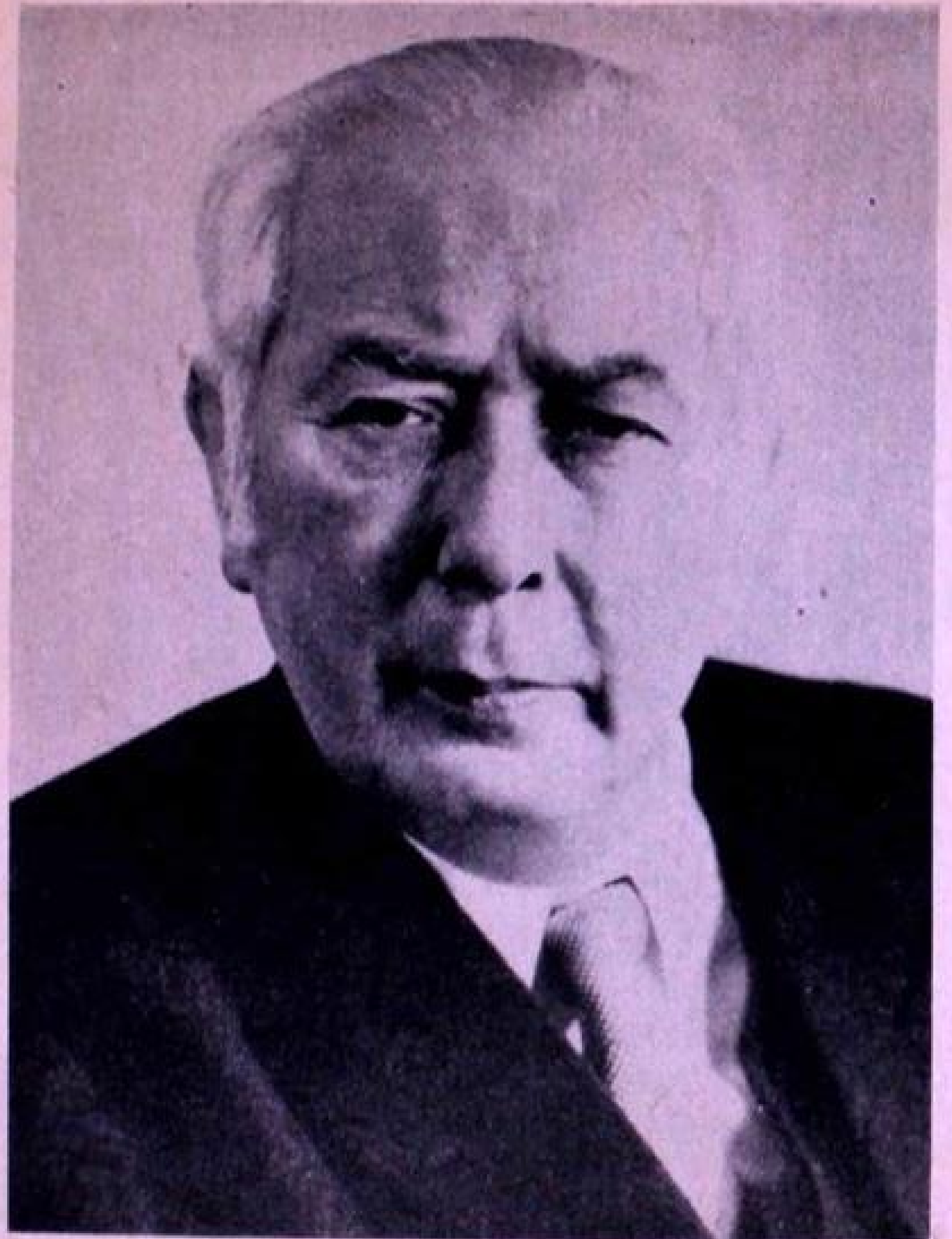
**بون میں:** بون کی بندرگاہ پر جہاز لنگر انداز ہوگیا تو ایسی بھگدڑ سی مچی جیسے جہاز کے اندر آگ لگ رہی ہو اور ہر شخص اس مصیبت سے بچنے کے لیے سب سے پہلے باہر نکل جانا چاہتا ہو۔ جہاز سے اترنے کا زینہ بھی ان سے پناہ مانگنے لگا۔ ہم ذرا اطمینان سے کھڑے ہوگئے۔ جب کسی قدر چھیڑ ہوئی تو نیچے پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ جہاز کے قلی سب کا سامان کرین کے ذریعہ باہر نکال رہے تھے۔ اتنے آدمیوں کے سامان پر صرف ایک نگراں تھا۔ چنانچہ جب بھی کوئی شخص آگے بڑھ کر کسی سامان پر ہاتھ رکھ دیتا اور کہتا کہ یہ میرا سامان ہے، نگراں اس کی بات مان لیتا اور کاغذات دیکھے بغیر اسے لے جانے دیتا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اسے لوگوں پر پوری طرح اعتماد تھا کہ وہ دھوکہ نہیں دیں گے۔ اگر یہی بات ہے تو جرمنوں کے کردار کا پتہ چلتا ہے۔ جب ہمارا سامان آیا تو ہم نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا اور سامان اپنی تحویل میں لے لیا۔ اب دقت یہ تھی کہ باہر لے جانے کے لیے قلی کا پتہ نہیں تھا۔ ایکسپریس ٹریول ایجنسی کے کارندے بھی ناپید تھے۔ آخر میاں محبوب کو باہر جاکر ٹیکسی کرنی پڑی اور اس کے ڈرائیور کو اپنے ساتھ لانا پڑا۔ وہ زائد اجرت کی شرط پر ہمارا سامان اٹھاکر باہر لے گیا اور ہم ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ اب ہم بون کی سرزمین پر قدم رکھ چکے تھے۔

بون وفاقی جمہوریہ جرمنی کا صدر مقام ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں جب اس ملک نے ہتھیار ڈالے اور اس پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا تو رہائن لینڈ کا یہ علاقہ برطانیہ کے زیر اقتدار آگیا۔ ۸ مئی ۱۹۴۵ء کو اس کی فوجیں پوری طرح اس پر

قابض ہوگئیں۔ برطانوی ارباب اقتدار نے غالباً اس شہر کی قدیم تاریخی روایات اور آثار کو مدنظر رکھ کر اسے اپنے دور انتداب کا مرکز بنالیا اور یہاں رہتے ہوئے اس شہر کو اتنی ترقی دی کہ جب چار سال بعد انھوں نے جملہ اختیارات حکومت وفاقی جمہوریہ جرمنی کو تفویض کیے تو اس نے بھی اس شہر کو صدر مقام بنائے رکھنا مناسب سمجھا۔ چنانچہ ۱۰ رمئی ۱۹۴۹ء کو اعلان کیا گیا کہ یہ شہر حکومت کا عارضی صدر مقام ہوگا۔ اس کے بعد کبھی رائے بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور یہ مستقل صدر مقام بن گیا۔ حالانکہ جرمنی کے اور بہت سے شہر آبادی، جغرافیائی محل وقوع سیاسی حیثیت، ثقافتی اعتبار اور صحتی لحاظ سے بدرجہا بہتر ہیں۔ مثلاً کولون کو جو پندرہ میل کے فاصلے پر آباد ہے، ترجیح دی جاسکتی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور تھکا دینے کی حد تک پریشانیوں نے اہل جرمنی کی کمر اس بری طرح توڑ دی تھی کہ ان میں ایک حد تک قناعت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ جب انھوں نے سوچا کہ پچھلے چار سال کی مدت میں یہ شہر صدر مقام کی حیثیت سے ترقی پا گیا ہے، سفارتی رشتے بھی اسی سرزمین پر استوار ہو گئے ہیں تو پھر کوئی تبدیلی کیوں گوارا کی جائے۔ انھوں نے اسی کو مستقل طور پر مرکز حکومت بنائے رکھنا مناسب سمجھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جرمنی کے عافیت پسند ارباب اقتدار نے صنعتی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ شہروں کے ہنگاموں اور شور وشغب سے دور رہنے کی خاطر ایسا کیا ہو۔ بہر نوع ان کے فیصلے کے سامنے باقی دنیا کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

**بون:** اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ بون کوئی گھٹیا درجے کا شہر ہے یا المانوی تاریخ میں اسے کوئی بلند مقام حاصل نہیں ہے۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ ولادت مسیح کے وقت سے اس کے آثار ملتے ہیں۔ اہل روما نے جب اپنی سلطنت کو وسیع کرنا شروع کیا اور اس جانب یلغار کی تو انھوں نے ۷۰ء میں دریائے رائن کو اپنی سرحد بنا کر اسی شہر کو فوجی کیمپ بنایا تھا۔ شاید فوجی کیمپ کی رعایت سے انھوں نے اس علاقے کا نام ''کاسترا بونن سیا'' رکھا جو بعد میں مختصر ہو کر صرف بون رہ گیا۔ رومیوں کا سکہ اس سرزمین پر عرصۂ دراز تک چلتا رہا لیکن اس دوران میں مقامی باشندے اور شمالی علاقے





جرمنی کے ارباب
حل و عقد

ڈاکٹر کونرڈ آڈ ناﺋر
فیڈرل چانسلر

پروفیسر تھیوڈر ھائس
صدر جمہوریۂ جرمنی

کے وحشی قبائل ان کی تاک میں رہے اور جب انھیں موقع ملا تباہی کے بیج بو گئے۔ ۳۵۹ء میں روم کے شہنشاہ جولین نے اس کو سنبھالا دیا لیکن اس صدی کے آخر تک شہر نے ایک بار پھر دم توڑ دیا۔ رومی حکمرانوں کو فرینکوں نے شکست دے کر مار بھگایا تو ان کے جاہ وجلال کی بہت سی نشانیاں بھی مٹا دیں۔ پھر نورمنوں نے نویں صدی میں چڑھائی کی تو جو رنگ روپ باقی رہ گیا تھا ملیامیٹ کر دیا گیا۔ چنانچہ ایک عرصے تک اس شہر کا نام لیوا کوئی نہ رہا۔

تیرھویں صدی میں کولون کے لاٹ پادریوں کی نظرِ عنایت اس طرف مبذول ہوئی۔ ۱۲۷۳ء میں انھوں نے شہر کے گرد فصیل بنوا کر اسے کسی قدر محفوظ کر دیا، اس کو نئے سرے سے ترقی دینی شروع کی اور اٹھارھویں صدی میں ۱۷۹۴ء تک اسے بامِ عروج پر برقرار رکھا۔ اس دوران میں شہر کو شاہی سرپرستی خاطر خواہ حاصل رہی۔ خصوصاً بادشاہوں کی تاجپوشی کے لیے، جس کی رسم کولون کے لاٹ پادریوں کو ادا کرنی پڑتی تھی، اس سرزمین کو بھاگوان قرار دیا گیا۔ ایسے فرمانرواؤں میں سے جن کو یہاں آکر تاج پہننے کا فخر حاصل ہوا، فریڈرک سوم اور چارلس چہارم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۷۹۴ء میں فرانسیسیوں نے اس پر قبضہ جما لیا۔ ۱۸۱۵ء میں منعقد ہونے والی ویانا کانگریس نے یہ شہر پرشیا کے سپرد کر دیا۔ صاحبِ اقتدار قوموں کے یہ کھیل کتنے مذموم ہوتے ہیں کہ کسی سرزمین پر رہنے والوں سے استصوابِ رائے کیے بغیر ان کی قسمت کا یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ آئندہ سے تم فلاں حکمراں کے تابع فرمان ہو۔ کچھ اسی قسم کی صورت ارضِ کشمیر کے ساتھ ہوئی جبکہ انگریزوں نے اس جنت نظیر وادی کو ۷۵ لاکھ روپے کے عوض فروخت کر دیا اور باشندگانِ کشمیر سے پوچھا بھی نہیں کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح بکنے کے لیے رضامند ہو یا نہیں۔

پہلی جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۶ء تک فرانس اور برطانیہ کے فوجی دستے اس پر مسلط رہے اور جب دوسری عالمگیر لڑائی کے شعلے بھڑکے تو ۴۵-۱۹۴۴ء میں اس پر خوب بمباری ہوئی۔ تیرھویں صدی عیسوی میں جو شہر پناہ تعمیر ہوئی تھی، وہ ۱۸۸۱ء میں منہدم کر دی گئی تھی اور بہت سی تاریخی عمارتیں اب تباہ ہو گئیں۔ ان میں سے بعض کے کھنڈر باقی ہیں اور باقی کو فضائے امن قائم ہونے کے بعد

مکرر تعمیر کر لیا گیا ہے۔

**اسٹرن ہوٹل میں:** ہمارا جہاز ایک گھنٹے بعد یعنی ساڑھے پانچ بجے بندرگاہ پر پہنچا تھا۔ باہر نکلنے اسامان اٹھوانے اور ٹیکسی وغیرہ لینے میں شاید پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ پھر راستے میں خاصی بھیڑ بھاڑ تھی اور ہر چوراہے پر ٹیکسی کو رکنا پڑ گیا۔ اس لیے ہم کوئی سوا چھے بجے ہوٹل پہنچے۔ سفری کمپنی نے ہمارے قیام کا انتظام اسٹرن ہوٹل میں کیا تھا جو شہر کے وسط میں مارکٹ کے علاقے میں واقع ہے۔ عموماً وہ لوگ اسے پسند نہیں کرتے جو شہر کے شور وشغب سے دور رہ کر عیش وآرام بلکہ عیاش قسم کی زندگی بسر کرنی چاہتے ہیں۔ ان کے لیے کوبلنز اسٹراس میں کونگز ہوف یا منسٹر پلاٹز میں برگیز کر ہوف نامی ہوٹل مناسب وموزوں ہیں۔ یوں بھی یہ ہوٹل اتنے ہنگامہ خیز اور نشاط انگیز نہیں ہیں جیسے کہ ہائیڈل برگ یا فرینکفرٹ میں ہیں۔ کیونکہ اس سارے شہر کی عام زندگی کے بارے میں سُنا گیا ہے کہ ایک خاص اعتدال پہ پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یوجین فوڈور نے جرمنی پر جو گائڈ بک لکھی ہے اس میں یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ بون نوجوان سیاحوں کے ٹھیرنے کی جگہ نہیں ہے۔ اگر یہ شہر دیکھنا ضروری ہی ہو تو بہتر ہے کہ قیام قریب کی بستیوں میں کیا جائے جو زیادہ دور نہیں ہیں۔ سیّاح صبح کو وہاں سے شہر میں آئیں اور شام ختم ہونے سے پہلے واپس چلے جائیں تاکہ رات بون سے باہر بسر ہو۔ شہر کے مضافات پھر بھی کچھ سامان تفریح فراہم کر سکتے ہیں۔

اس اعتبار سے بون ہمارے لیے موزوں اور اس کے ہوٹلوں میں سے اسٹرن سب سے زیادہ مناسب تھا۔ ہماری سفری کمپنی نے بہت سی باتیں ہمارے مزاج کے خلاف کی تھیں لیکن یہ فیصلہ عین مطابق طبیعت تھا۔ ہمیں اپنے راہ نامے کے بموجب تین رات اور دو دن یہاں ٹھیرنا تھا۔ اس لیے ہم نے اس ہوٹل کے انتخاب کو غنیمت جانا جس کے کسی حصے پر نائٹ کلب ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیں ڈبل بیڈ کا کمرہ نمبر ۲۴۳ مل گیا۔ فرینکفرٹ کی طرح یہاں بھی ہم نے ہوٹل کے منیجر سے یہ بات طے کر لی کہ دو پلنگوں والے کمرہ میں تین آدمی رہیں گے اور پلنگ باہر نکال کر فرش پر بستر بچھائیں گے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق برکات احمد صاحب کو، جو ہماری سیاحتِ ترکی کے دوران میں بہت زیادہ ہمارے ہم جلیس تھے، کل صبح یہاں پہنچ جانا چاہیئے تھا لیکن ہوٹل

میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلی اطلاع یہ ملی کہ وہ ۲۴ کی بجائے ۲۵ تاریخ کو بون آئیں گے، جبکہ ۲۶ کی صبح کو ہمیں ہر حالت میں یہاں سے چلا جانا ہے۔ گویا صرف ایک دن کے لیے ان کا ساتھ رہے گا۔ میں نے سوچا کہ جب وہ آئیں گے تو ان سے یہ ضرور دریافت کروں گا کہ پروگرام کی اس تبدیلی میں محکمۂ خارجہ یا محکمۂ داخلہ یعنی "ہوم ڈپارٹمنٹ" کا "ہاتھ" ہے؟ کون سی پابندی مانعِ سفر بنی ہے؟

ہم نے وقت ضائع نہیں کیا بلکہ فوراً نہا دھو کر سات بجے بازار چلے گئے تاکہ اتوار کی شام کو چند بازاروں کی رونق دیکھ لیں اور وہاں کی عام زندگی کا ہلکا سا اندازہ کر لیں۔

**کوچہ و بازار:** شہر کے اس وسطی حصّے میں کوچہ و بازار بہت تنگ ہیں زمانۂ قدیم میں آج کل کی شہری منصوبہ بندی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دنیا کے ہر حصّے میں لوگ گھٹا بڑھا کر اپنی عمارتیں تعمیر کر لیتے تھے۔ اسی لیے بازار تنگ اور ٹیڑھے ہو جاتے تھے۔ اب ہر جگہ نئی بستیاں قائم ہوتی ہیں تو خاص منصوبہ بندی کے تحت راستوں کو چوڑا چکلا اور سیدھا رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تاہم بون کے تنگ بازاروں میں بھی طویل و عریض اور دیو قامت عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر منسٹر کو لیجیے۔ یہ عمارت بارھویں صدی کے آخر اور تیرھویں صدی کے شروع میں بھورے پتھر سے رومنی طرزِ تعمیر پر بنائی گئی تھی جس کے پانچ مینار اب بھی برقرار ہیں۔ ان میں سے درمیانی تین سو پندرہ فیٹ بلند ہے اور شہر کے ہر حصّے سے دکھائی دیتا ہے بلکہ رہائن کی وادی میں ایک نشانِ منزل سمجھا جاتا ہے۔ ایک اور گرجا گھر جو ۱۲۷۸ء سے ۱۳۱۸ء تک کی طویل مدت میں تعمیر ہوا تھا ابھی تک موجود ہے۔

چوک منڈی میں مجلسِ بلدیہ کی عمارت کے قریب سب سے زیادہ سجے ہوئے پھلوں کے اسٹال نظر آئے۔ یہ دکانیں پٹری پر لگائی گئی ہیں لیکن اتنی صاف ستھری ہیں کہ پھل خریدنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر اسٹال پر رنگین چھتریاں لگی ہوئی ہیں جیسی کہ باغیچوں یا ساحلِ سمندر پر نازک مزاج لوگوں کے لیے لگائی جاتی ہیں۔ ان سے دھوپ کا بچاؤ ہوتا ہے اور خوشنما بھی معلوم ہوتی ہیں۔ پھلوں سے لدے ہوئے ٹھیلے بھی نظر آئے۔ لیکن ہمارے ملک کی طرح ان پر سڑی گلی چیزیں نہیں تھیں بلکہ ہر چیز تازہ چیندہ اور

نفیس معلوم ہوتی تھی۔ ہم نے انگور کا نرخ پوچھا۔ اپنے وطن کے اعتبار سے اس کا بھاؤ تقریباً ڈھائی روپے سیر تھا۔ میں نے آدھا سیر انگور اور ایک درجن کیلے لے لیے۔ کیلوں کی قیمت چھ روپے کے قریب تھی۔ سیب بہت ہی مہنگا تھا تاہم ایک سیب بھائی جان محترم کے لیے خرید لیا۔ وہ دہلی میں روزانہ ایک سیب کھاؤ، ڈاکٹر کو دور بھگاؤ،، والے قول پر عمل کرتے ہوئے سیب کھانے کے عادی تھے لیکن سیر و سیاحت میں جہاں اور معمولات میں فرق آتا ہے، کھانے پینے کے اصول بھی نظرانداز ہوجاتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ آج موقع اچھا ہے۔ اسے غنیمت سمجھا جائے۔ جرمن زبان میں انگور کو وین ٹروبے، سیب کو آپ فل اور کیلے کو بنانے کہتے ہیں۔ پھل والوں کے قریب ہی رس نکالنے کی ایک مشین لگی ہوئی تھی۔ لوگ وہیں کھڑے ہوکر سیب کا رس نکلوا کر پی رہے تھے۔ طبیعت اپنی بھی مچلی، لیکن ہر بار اس طرح لذت کام و دہن حاصل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ خدا جانے یہاں گنے کا رس نکال کر پلانے والے اسٹال بھی کہیں ہیں یا نہیں۔ اپنی طرف گرمی کے موسم میں رس کے ٹھیلے جگہ جگہ نظر آتے ہیں اور لوگ بھنکتی ہوئی مکھیوں کا خیال نہ کرتے ہوئے خوب ڈگڈگا کر پیتے ہیں گنے کے رس کا اسٹال ہوتا تو ہم دیکھتے کہ سرزمین ہٹلر کی مکھیاں بھی اس مٹھاس کی دلدادہ ہیں یا نہیں۔

ہم نے بعض بڑی سڑکوں پر دو چیزیں خاص طور پر دیکھیں۔ ایک تو یہ کہ جگہ جگہ کھمبوں پر بیرو میٹر لگے ہوئے ہیں جن سے دن رات کسی بھی وقت درجۂ حرارت اور حبس کی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے ایک نقشہ دیکھا گیا جس میں روشنی کے انتظام سے راستوں کی سمت اور ان کے محل وقوع بتانے کا پر اسرار طریقہ دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً آپ کو کسی جگہ جانا ہے۔ اس کا نام آپ کے ذہن میں ہے۔ نقشے پر اس کے نام کا بٹن موجود ہے۔ اسے دبا دیجیے۔ بس منظر میں روشنی ہوجائے گی اور وہ مقام سب سے زیادہ نمایاں نظر آئے گا اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ اس وقت آپ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ کون سا قریب کا راستہ آپ کو منزل مقصود پر لے جائے گا۔ یقیناً یہ چیز بہت ہی مفید ہے۔ ہر بڑے شہر میں اس کو رواج دینا چاہیے۔ ہمارے ملک کو ترقی پذیر ملکوں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے لیکن یہاں ابھی تک

راستوں پر روشنی کے ذریعہ ٹریفک کنٹرول کرنے کے سگنل بھی نہیں لگے ہیں۔ سنا ہے کہ اسکیم بن رہی ہے، بہت جلد عملی جامہ پہن لے گی لیکن خدا نہ کرے کہ وہ جامہ تنگ یا ضرورت سے زیادہ ڈھیلا ثابت ہو جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ڈاک خانوں میں کام کی مصروفیت بہت رہتی ہے۔ جگہ جگہ شبینہ ڈاک خانے نظر آئے جن میں سورج چھپنے کے بعد اتنی بھیڑ لگی ہوئی تھی جتنی کہ عموماً ہمارے ہاں دن کے وقت ہوتی ہے۔ پھر یہ ڈاک خانے محض ٹکٹ ہی فروخت نہیں کر رہے تھے بلکہ رجسٹریوں، معمولی پارسلوں اور پوسٹل سرٹیفکیٹ پر خطوط لینے کا بھی انتظام تھا۔ منی آرڈر تک کئے جا سکتے تھے۔ ہمارے ملک میں یہ سلسلہ کچھ ہی عرصے پہلے شروع ہوا ہے لیکن کام کی نوعیت محدود ہے، یہاں کے ڈاک خانوں میں بھی ٹکٹ خریدنے کی مشینیں لگی ہوئی ہیں جو پوری صحت کے ساتھ کام کرتی ہیں کیونکہ لوگ انھیں صحیح طریقے سے استعمال کرنا جانتے ہیں۔ یہ سلسلہ کراچی میں شروع ہوا تو بہت جلد تلخ تجربہ ہوا۔ یار لوگ سکوں کے ہم وزن دھات کے معمولی ٹکڑے ڈال کر ٹکٹ نکالنے لگے۔ مشین تو وزن کے مطابق حرکت میں آتی ہے۔ کھرے کھوٹے اور اصلی نقلی کی پہچان اس میں نہیں ہوتی۔ بعض لوگ کسی نہ کسی طرح ان مشینوں کو کھول کر سکے نکال کر بھی لے گئے۔ اور اب جب کوئی مشین خراب ہوئی تو بس ڈاک خانے نے اطمینان کا سانس لے کر اسے خراب ہی رہنے دیا۔ چنانچہ اکثر ڈاک خانوں میں ایسی مشینیں آثار قدیمہ بن کر رہ گئیں۔ ہم نے غیر ملکی ڈاک خانے کے چار ہوائی لفافے کاؤنٹر سے خرید لیے تاکہ دہلی اور کراچی خط لکھے جا سکیں اور پھر جلدی ہی یعنی ڈیڑھ گھنٹے کی سیر و تفریح کے بعد ہوٹل واپس چلے گئے۔ بری طرح تھک گئے تھے۔ آرام کرنا چاہتے تھے۔ ہوٹل میں معمولی قسم کا کھانا کھایا اور نماز پڑھ کر سو گئے۔ آج بھائی جان محترم نے بھی زیادہ دیر جاگنا مناسب نہیں سمجھا۔

۲۴ ستمبر ۱۹۵۶ء — پیر

# بون میں

رات کو معمول سے ذرا پہلے سو جانے کا نتیجہ ظاہر تھا یعنی صبح کو کافی سویرے آنکھ کھل گئی لیکن اتنے بے وقت بھی نہیں کہ طبیعت پر اس کا اثر ہونے لگتا۔ میں نے محسوس کیا کہ بھائی جان محترم پہلے ہی بیدار ہو چکے ہیں۔ کمرے میں اندھیرا تھا، کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی روشنی میں سونے کا عادی نہیں ہے، ہر قسم کی روشنی گل کر دی جاتی ہے تب ہمیں اطمینان کی نیند آتی ہے۔ لہٰذا ان کے دو تین بار کروٹ بدلنے نے مجھے احساس دلایا کہ وہ میری طرح بیدار ہیں اور شاید خاموشی کے ساتھ آئندہ منصوبوں پر غور کر رہے ہیں۔ میری فطرت میں یہ بھی شامل ہے کہ آنکھ کھل جائے تو پھر زیادہ دیر بستر پر دراز نہیں رہ سکتا۔ اب سوال یہ تھا کہ اٹھ کر روشنی کروں اور ضروری خطوط لکھنے بیٹھ جاؤں یا سناٹے کی آواز سننے کے لیے ہوٹل کی سب سے بالائی چھت پر پہنچ جاؤں۔ خطوط کی طرف سے زیادہ تشویش نہیں تھی، کیونکہ یہ فریضہ تو بھائی جان محترم نے اپنے ذمے لے لیا تھا لیکن وہ زیادہ تر کاروباری اور ہدایتی خطوط اپنے عملے کے ذمہ دار افراد کو لکھا کرتے تھے۔ عزیز و اقارب کو نجی خطوط انھوں نے بہت ہی کم بھیجے۔ اور میں تو بالکل ہی گول کر گیا، نہ اپنی خیریت بھیجی اور نہ کسی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے قلم اٹھا سکا۔ صرف عدیم الفرصتی کو اس ظاہری بے تعلقی کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔

بہت ڈرتے ڈرتے میں نے میز پر رکھے ہوئے لیمپ کا بٹن دبا دیا۔ ایک دم کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ بھائی جان محترم کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھے اور مسکرا کر پوچھا "میاں سعید! کب سے جاگ رہے ہو؟ کیا اطمینان کی نیند نہیں آئی؟"

میں نے جواب دیا، "نیند تو اچھی طرح آ گئی تھی لیکن اس کا وقت پورا ہو جانے کے باعث آنکھ کھل گئی۔"

انھوں نے تکیے کے نیچے سے نکال کر گھڑی دیکھی ۔صبح ہونے میں دیر تھی ۔ نماز فجر کا وقت بھی نہیں ہوا تھا، لہٰذا انھوں نے لیٹے لیٹے ایک راہنما کتابچے کی ورق گردانی شروع کر دی ۔میں موقع کو غنیمت جان کر یادداشت کی کاپی میں ضروری باتیں لکھنے میں مصروف ہو گیا ۔میاں محبوب بے خبر سو رہے تھے ۔

جب صبح کاذب کا ہلکا اجالا کھڑکی کے شیشوں میں سے نمودار ہوا تو ہم نے اٹھ کر حسب معمول غسل کیا اور نماز پڑھ کر سوچا کہ اب وقت کیوں کر گزارا جائے ۔بھائی جان محترم نے تو آج کا پروگرام مرتب کرنا شروع کر دیا اور میں کمرے سے نکل کر سیڑھیاں طے کر کے ہوٹل کی سب سے بالائی کھلی چھت پر پہنچ گیا ۔رات کا تاروں بھرا آسمان بڑی حد تک صاف ہو گیا تھا ۔سیاہی مائل نیلگوں سطح پر کہیں کہیں ایک آدھ چراغ سا ٹمٹما رہا تھا یعنی صرف وہ بڑے بڑے سیارے اپنی جھلک دکھا رہے تھے جن کی جسامت اور فاصلے کی حدوں کا تعین اہل سائنس نے کچھ ایسے اصولوں کی بنیاد پر کیا ہے جو آئے دن بدلتے رہتے ہیں ۔جلاّد فلک اور رقاصۂ فلک کے درمیان لاکھوں میل کا بُعد نظر کو فریب دیتے ہوئے ایسے قرب میں بدل رہا تھا جس کے بعد باہمی تصادم کا اندیشہ لاحق ہونے لگتا ہے ۔

اس کھلی چھت سے نہ صرف شہر بون کے بیشتر حصّے کا ایک طائرانہ نظارہ ممکن تھا بلکہ دریا کی پُرسکون سطح کے پار سات پہاڑیاں بھی عہدِ عتیق کی کہانیوں میں بیان ہونے والے خوفناک ہیولوں کی مانند دکھائی دے رہی تھیں ۔افق نظر کے ساتھ ساتھ ان کا سلسلہ اس طرح محسوس ہو رہا تھا جیسے اندھیاں اٹھ کر فضا میں جم کر رہ گئی ہوں ۔پھر جس طرح فلم کے پردۂ سیمیں پر فلم پروجیکٹر کے فوکس کی خرابی سے تصویروں کے نقوش پہلے دھندلے اور پھر صاف نظر آنے لگتے ہیں، اسی طرح یہ سلسلۂ کوہ بھی اپنا رنگ بدلنے لگا ۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب سے بڑا ناظمِ کائنات قدرت کی غیر مرئی مشینری کو درست کر کے انعکاسات کو صحیح فوکس میں لا رہا ہے ۔اسی لیے دھندلکے اجالے میں بدلتے جا رہے ہیں ۔رفتہ رفتہ ایک مسلسل بھورا سا خط الگ الگ سات حصّوں میں تقسیم ہو گیا اور ہر حصّے کی پہاڑی اپنی انفرادیت قائم کر کے علیحدہ صاف نظر آنے لگی ۔

خلافِ توقع ہوٹل کے ایک ملازم کے آجانے سے میرے خیالات کی زنجیر ٹوٹ گئی اور افکار کے موتی بکھر گئے ۔وہ سب سے اونچی چھت پر رکھی ہوئی پانی کی بڑی ٹنکی

کو دیکھنے اور اسے درست کرنے آیا تھا کیونکہ ٹنکی کے لبریز ہو جانے کے باعث اندر پانی بہنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس شخص سے کچھ بات چیت کی جائے۔ اگر خیالات ایسے الفاظ کا جامہ نہ پہن سکیں جو ہم دونوں کی مشترک تفہیم کے دائرے میں ہوں، تو پھر اظہار کے لیے اشارات کا سہارا لیا جائے۔ لیکن مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ وہ انگریزی جانتا تھا۔ اس کی ماں انگریز عورت تھی اور وہ زیادہ تر ماں کے ساتھ ہی رہتا تھا کیونکہ باپ فوج میں ملازم تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں وہ خود بھی فوج میں شامل ہو گیا تھا اور شکست کے بعد نظر بندی کیمپ میں ڈال دیا گیا تھا۔ کافی عرصے بعد وہاں سے نکلا اور چونکہ لڑائی کے نام ہی سے بیزار ہو گیا تھا، اس لیے ہوٹل میں ملازمت اختیار کر لی۔ آگے پیچھے اس کا کوئی باقی نہیں رہا تھا۔ لہٰذا اب اسے زندگی کا کوئی غم نہیں تھا لیکن وہ پہلا شخص تھا جس نے میرے استفسار پر ہٹلر کو برے الفاظ سے یاد کیا۔ غالباً نظر بندی کیمپ میں جو صعوبتیں اسے اٹھانی پڑیں، وہ اس نفسیاتی تاثر کی ذمہ دار تھیں۔ پھر اس کی ماں بھی تو اس لڑائی کے دوران میں بم سے منہدم ہونے والے مکان کے نیچے دب کر مری تھی۔

اس سے خاصی دیر گفتگو رہی۔ اس نے منجملہ اور باتوں کے مجھے سامنے کی ان سات پہاڑیوں کا حال بھی ذرا تفصیل سے سنایا جو مُودِ سحر کے ساتھ ساتھ اب ذرا صاف نظر آنے لگی تھیں۔ ان میں سے ایک پہاڑی کا نام جو اس سے پہلے درج کیا جا چکا ہے، دراخن فلز ہے جس کی چوٹی پر ایک قدیم عبادت گاہ کے کھنڈر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دیومالائی انداز کی ایک کہانی اس عمارت سے وابستہ ہے۔ جب اس اجنبی نے اپنے عقیدے کے مطابق کہانی نہیں، بلکہ صحیح واقعات سنانے شروع کیے تو میں نے اس کے بیان میں اتنی دلچسپی لی کہ اسے آخر تک سنے بغیر نہ رہ سکا۔

**دراخن فلز:** اس نے کہا، حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے ایک سو سال بعد دریائے رہائن کے بائیں کنارے پر بسنے والوں نے نصرانی مذہب قبول کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ ایک مبلّغ مذہب گول کے علاقے سے وہاں پہنچ کر نئے دین کا پرچار کرنے لگا تھا۔ ابتدا میں عیسیٰؑ کے اس نیک پیامبر کو توہمات کے پرستاروں میں ذرا بھی کامیابی نہ ہوئی۔ وہ خود ساختہ بتوں کی پوجا کرنے کے لیے جمے رہے بلکہ انھوں نے عیسائی پادریوں کو اپنے علاقے میں گھسنے

بھی نہیں دیا۔ لیکن ایک واقعہ نے ان کے عقائد کی کایا پلٹ دی۔

ان دنوں پہاڑی کی چوٹی پر ایک گہرے غار میں ایک خوفناک اژدھا رہتا تھا جسے دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک بار اپنے غار سے نکل کر پہاڑی کے سب راستوں پر چکر کاٹتا اور اگر کھانے کے لیے کوئی جانور نہ ملتا تو پہاڑی کے دامن میں اتر کر بستی والوں کو ستاتا اور ایک نہ ایک مرد یا عورت کو ہڑپ کر جاتا تھا۔ اس اژدھے کے سامنے انسانی طاقت معذور تھی۔ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ کوئی معمولی اژدھا نہیں ہے بلکہ کوئی روٹھی ہوئی دیوی اپنا گھر بار چھوڑ کر اس اژدھے میں سما گئی ہے اور اسی کا روپ دھار کر پہاڑی راستوں پر رواں دواں رہتی ہے۔ لہٰذا وہ اسی طرح اس اژدھے پر مہربان ہونے لگے جیسے کسی دیوی یا دیوتا کو عزت بخشی جاتی ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ ملزموں اور مجرموں کو اس کے سامنے بھینٹ چڑھایا جایا کرے تاکہ اژدھے کے روپ میں یہ دیوی ہم سب پر مہربان رہے۔

پہاڑی کے دامن میں رہنے والے بت پرستوں میں ایک ایسا جنگجو قبیلہ بھی شامل تھا جو آس پاس کے علاقوں پر حملہ کر کے لوٹ مار اور قتل و غارت کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے تھا۔ یہی اس کے افراد کا وسیلۂ معاش تھا۔ ایک بار اس قبیلے کے لوگ دریا کو عبور کر کے اس بستی میں پہنچ گئے جہاں اس وقت بون آباد ہے۔ یہاں نصرانی مذہب خوب فروغ پا چکا تھا لیکن عام لوگ لڑائی جھگڑے کے عادی نہیں تھے۔ اس لیے جب دریا پار کے بت پرستوں نے ان پر حملہ کیا تو وہ زیادہ دیر مدافعت نہ کر سکے اور اپنی ہار ماننے کے لیے مجبور ہو گئے۔ بت پرستوں نے بہت سے عیسائی مردوں اور خاص طور پر عورتوں کو قید کر لیا اور مالِ غنیمت کے ساتھ انھیں بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔

ان قیدیوں میں ایک بہت ہی خوب صورت نازک اندام نوجوان لڑکی بھی تھی۔ دو سردارانِ قبائل بیک وقت اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور اس سے شادی رچانے کی آرزو میں ایک دوسرے کے خلاف خنجر آزمائی کو تیار ہو گئے۔ ان میں سے ایک کا نام ہومرسرگ اور دوسرے کا رنبولٹ تھا۔ اوّل الذکر ریچھ کی طرح زور آور اور شیر کی مانند خونخوار تھا۔ موخر الذکر بھی طاقت و توانائی میں اپنے رقیب سے کچھ کم نہ تھا۔

لیکن وہ فطرتاً ذرا نرم دِل تھا۔ اس لیے بہت سے لوگ اسے ترجیحاً پسند کرتے تھے لیکن نوجوان حسینہ جب ان دونوں کے چہروں پر نظر ڈالتی تو خوف سے لرز جاتی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا اور خون گویا خشک ہونے لگتا تھا۔ اس کا ہمدرد یا غمگسار ساری بستی میں کوئی نہیں تھا، کیونکہ اس کے دوسرے ساتھی جو قید ہوئے تھے، کسی اور مقام پر نظر بند تھے، یا کھیتوں میں کام کرنے کے لیے پابجولاں بھیج دیے گئے تھے۔

جب دونوں سرداروں کی رقابت بہت بڑھ گئی اور اندیشہ ہوا کہ ان میں سے ایک کہیں دوسرے کو مار نہ ڈالے تو سب سے بوڑھے ایک شخص نے جو کبھی اس بستی کا واحد سردار رہ چکا تھا، بیچ میں پڑ کر اس جھگڑے کو چکا دینا چاہا۔ اس نے بھرے مجمع میں کہا کہ ایک عیسائی لڑکی کو بیوی بنانا اور اس کی اولاد سے اپنی نسل کو خراب کرنا کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ مناسب یہ ہے کہ اسے آئندہ ہفتے مقدس اژدھے پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ کل صبح طلوعِ آفتاب کے وقت یہ اژدھا چوٹی سے اتر کر پہاڑی کے دامن میں آئے گا۔ بس وہی لمحہ اس کارِ خیر کے لیے مناسب رہے گا۔ اس طرح ہمارے دو سرداروں کی باہمی چپقلش ختم ہو جائے گی اور قبائل کے دامن پر کوئی بدنما داغ بھی نہیں آئے گا۔

یہ معقول بات سُن کر سب نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔ خود سرداروں نے بھی اس بوڑھے کی دانش مندی کی داد دی اور مان لیا کہ یہ فیصلہ عمل میں لایا جائے۔

نوجوان لڑکی نے جب اپنی قسمت کے بارے میں یہ فیصلہ سنا تو غم و اندوہ کے ساتھ سَر جھکا لیا۔ خاموش رہنے کے سوا اس کے پاس چارہ کار بھی کیا تھا۔ قبیلے کی جوان لڑکیاں اسے حسد کی نظر سے دیکھتی رہی تھیں اور بوڑھی عورتوں کو اس پر ترس آ رہا تھا۔

دوسرے روز علی الصبح سورج کی کرنوں کے زمین تک پہنچنے سے پہلے ساری بستی میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ ہر عورت اور مرد، ہر بچہ اور بوڑھا یہ دیکھنے کے لیے اپنے معمول سے پہلے بیدار ہو گیا تھا کہ ایک غیر مذہب کی لڑکی کس طرح اژدھے کی خوراک بنتی ہے اور پھر اژدھے کے روپ میں نظر آنے والی مقدس دیوی قبیلے کے لوگوں پر کس طرح اپنی عنایتوں کی بارش کرتی ہے۔ سب لوگوں نے ایک جگہ جمع ہو کر جلوس کی صورت میں چلنا شروع کیا۔ سب سے آگے وہ بوڑھا شخص تھا جس کی تجویز کے مطابق خوب صورت لڑکی بھینٹ چڑھائی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے لڑکی چلتی رہی — خاموش، مغموم، جیسے نرگس کی کلی

کھلنے سے پہلے مرجھا جائے۔ اس کی آنکھوں میں پہاڑی غار کی سی ویرانی تھی اور سفید پڑ جانے والے لب اس طرح کپکپا رہے تھے جیسے کسی پرندے کے اڑ جانے کے بعد درخت کی ڈالی دیر تک لرزتی رہے ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک سیاہ پٹی باندھ دی گئی تھی جو کسی ایسے ملزم کا پتہ دیتی ہے جس پر فرد جرم لگا کر موت کی سزا دے دی گئی ہو اور خاص طور پر اس سزا کی صورت یہ ہو کہ مقدس اژدھے کے سامنے ڈال کر اسے ختم کر دیا جائے۔ اس کے سیاہ بالوں کی لٹوں میں کچھ سفید پھول گوندھ دیئے گئے تھے جو اس حقیقت کے غماز تھے کہ بھینٹ چڑھائی جانے والی لڑکی نازک اندام اور کنواری ہے۔

اسے اس طرح تصویر غم بنی ہوئی حالت میں دیکھ کر بہت سے لوگوں اور خصوصاً عورتوں کے دل کٹنے سے لگے۔ فطری الوہیت کا پوشیدہ جذبہ انسانی خباثت پر غالب آنے لگا۔ بعض سنگ دل قسم کے لوگ اسے اس حالت میں دیکھ کر محظوظ بھی ہو رہے تھے۔ لیکن لڑکی ان ملے جلے متضاد جذبات سے خالی الذہن ہو کر خاموشی کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ صرف ایک ہی آرزو اس کے دل و دماغ میں لہر بن کر امڈی چلی آ رہی تھی اور وہ یہ کہ آزمائش کے اس میدان عمل میں سچائی کے راستے پر اس کے قدم ڈگمگا نہ جائیں۔

جب منزل مقصود آ گئی تو چلتا ہوا قافلہ ایک دم رک گیا۔ سب کی نگاہوں کے سامنے ایک درخت کے زیر سایہ وہ سنگین چٹان تھی جسے بارہا انسان کے خون سے رنگا جا چکا تھا۔ جہاں کورانہ عقیدت کے بھیانک سائے میں بہت سی جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ بتوں کی پوجا کرنے والے فاتر العقل نام نہاد راہنماؤں نے بے قصور پاک دامن لڑکی کو درخت کے قریب لا کر رسی سے باندھ دیا۔ لڑکی بالکل بے زبان معلوم ہوتی تھی بلکہ گم سم سی تھی۔ کوئی حرف شکایت اس کی زبان پر نہیں آیا۔ آنسو کا کوئی قطرہ اس کی آنکھ سے نہیں ٹپکا۔ حفظ حیات کی کشمکش میں کوئی تڑپ اس کے نازک اعضا میں پیدا نہیں ہوئی۔ سارا مجمع اپنا سانس روک کے اس ہوشربا منظر کی آئینہ سامانی میں مصروف رہا۔ سب دیکھنے والوں کے حواس خمسہ صرف قوت باصرہ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ہر بن مو سے اس کیفیت کا دیدار کیا جا رہا تھا جو ناقابل یقین تھی اور روح فرسا بھی اور وجہ استعجاب ثابت قدمی اور اولوالعزمی تھی اس لڑکی کی جس نے زندگی کی ابھی چند بہاریں ہی دیکھی تھیں۔

سارا مجمع الٹے قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک دو قدم نہیں، دس بیس قدم نہیں اژدھے کی رسائی سے پرے، بہت دور تاکہ وہ ان پر حملہ نہ کر سکے۔ لیکن وہ اس مقام سے ٹلے نہیں، جمے کھڑے رہے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اژدھے کے روپ میں جلوہ دکھانے والی دیوی، اس نرم کومل بھینٹ کو کس طرح قبول کرتی ہے۔

کچھ دیر بعد سورج کی پہلی کرن اس علاقے کی سب سے زیادہ مظلوم لڑکی کو اس کے عقیدے کی پختگی پر خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے چٹان کی خون آشام سطح سے ٹکرائی تو دور کھڑے ہوئے لوگوں نے یقین کر لیا کہ اب وہ لمحہ قریب آپہنچا ہے جس کا انتظار تھا اور اس کے ساتھ ہی غار کی گہرائی سے ایک سرسراہٹ سی سنائی دی۔ پہلے مدھم، ایک آہِ ناتواں کی طرح اور پھر تند و تیز، دلخراش ہونے کی حد تک۔ یہ گویا پیش خیمہ تھا خونخوار اژدھے کی آمد کا جو غار کے اندر اور باہر بکھرے ہوئے سنگریزوں پر اپنے بے ڈول مگر قوی جسم کو گھسیٹ کر لا رہا تھا۔ اور پھر اس کا ہولناک چہرہ نظر آیا۔ شعلے بھڑکاتی ہوئی اس کی آنکھیں دکھائی دیں اور دیکھنے والوں نے ان تیز دانتوں کا نظارہ بھی کیا جو آن واحد میں نرم و نازک پیکرِ حسین سے لے کر سخت چمڑی والے مکروہ اجسام تک ہر چیز کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے تھے۔ لوگوں کے سانس ایک لمحے کے لیے رک گئے اور نبضوں کی رفتار ہلکی پڑ گئی۔ دیکھیے، اب کیا ہوتا ہے۔

لڑکی نے اپنے ایک ہاتھ کو جو اس کی بندشوں سے آزاد تھا، بمشکل حرکت دی اور اپنے سینے پر لٹکی ہوئی صلیب کو پکڑ کر زنجیر کی کڑیوں سے الگ کر لیا اور جب سولی دئے جانے کے اس علامتی نشان کو اپنے پژمردہ لبوں سے چوم کر سامنے کیا تو پہاڑی کے دامن میں بجلی سی کوندنے لگی، بادل سے گرجنے لگے اور سب تماش بینوں کو محسوس ہوا کہ کائنات کا ارتعاش طوفان بن کر آرہا ہے۔ زمین پھٹے گی اور زمین کے فشار انھیں زندہ درگور کر دیں گے۔ وہ چیخنے چلانے لگے۔ سب سے زیادہ رقت اس بوڑھے شخص پر طاری ہوئی جس کے ناقص فیصلے نے ہٹ دھرمی کا یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ اژدھا بھی جو ذی حیات تھا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جنگل کے رمیدہ وحوش کی طرح دلخراش چیخیں اس کے پھٹے ہوئے منھ سے نکلیں اور دامن کوہ کی آخری حد تک گونجتی چلی گئیں سنگین چٹان پر اس نے اپنا سر دے دے پٹکا اور چین نہ لیا جب تک کہ وہ پاش پاش نہ ہو گیا پھانسی کا پھندا

لگانے والی رسّی کی مانند اس کا جسم ایک تشنجی کیفیت کے ساتھ بل کھا کر رہ گیا۔ بے حس و حرکت، بے جان۔ اس اثنا میں اس حسینہ کے نازک جسم کو جکڑنے والی رسّی کے بندھن خود بخود ٹوٹ چکے تھے۔ وہ آزاد تھی۔ ہوا کے ایک لطیف جھونکے یا کسی پھول کی بھینی خوشبو کی طرح جسے قید کرنے کے لیے دنیا والوں کا کوئی جال کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی پہاڑی کی چوٹی پر گئی اور دوسری جانب اتر کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی۔ کوئی نہیں جانتا کہ کارسازِ حقیقی نے اسے زندہ آسمان پر اٹھا لیا یا فضا میں تحلیل کر کے ساری دنیا پر بسیط کر دیا۔ حسرت بھری نگاہیں اسے دوبارہ نہ دیکھ سکیں۔ وہ چلی گئی لیکن اپنا لافانی نقش سب کے دلوں پر چھوڑ گئی۔ وہ سب اپنا کورانہ عقیدہ ترک کر کے اسی کے مسلک میں شامل ہو گئے اور اس کی یادگار قائم کرنے کی خاطر دوسرے ہی دن سے ایک کلیسا تعمیر کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں وہ عمارت منہدم ہو گئی لیکن اس کے کھنڈر اب بھی روایتِ قدیم کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

میں اس روایت کو، جسے ایک دیومالائی کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی، ہمہ تن گوش بن کر سننے میں اس درجہ محو ہوا کہ وقت کے تقاضے میری توجہ کو اس مرکز سے نہ ہٹا سکے جس کے گرد میرے دل و دماغ گھومنے لگے تھے۔ جب استغراق کا عالم رو بہ اعتدال ہوا تو میں نے دیکھا کہ سورج کی پہلی کرن دراخن فلز پہاڑی کی چوٹی کو چومنے لگی ہے جہاں کلیسا کے کھنڈر اب صاف نظر آنے لگے تھے اور اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس قصہ کا راوی ہوٹل کی چھت پر کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ اب خدا جانے میں نے یہ سارا قصہ اپنے گوشِ ہوش سے سنا یا یہ محض میرے واہمے کا کرشمہ تھا جو کبھی کی بھولی بسری یاد دلا کر مجھے مبہوت کر گیا تھا۔

جب میں زینہ طے کر کے نیچے کی منزل پر آنے لگا تو آخری سیڑھی پر میاں محبوب ملے۔ انھوں نے بتایا کہ ناشتے پر میرا انتظار ہو رہا ہے اور آج کا پروگرام انقطاعی منزل سے گزر چکا ہے۔ جب میں کمرے میں پہنچا تو بھائی جان محترم نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور کہا، تم ہر ہوٹل کی کھلی چھت کو ہواخوری کا میدان بنا دیتے ہو۔ اب ان ہوٹل والوں کو تمھاری چہل قدمی پر ٹیکس لگانا پڑے گا۔ میں ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔ میں بھلا ان سے کس طرح کہتا کہ میں اس بیسویں صدی عیسوی میں تقریباً ساڑھے اٹھارہ سو سال پہلے کی ایک حکایتِ دلپذیر

کو دل کے کانوں سے سُن کر آرہا ہُوں اور ایک دم اسے دوہرانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ میں نے اس کا سرسری ذکر تک گوارا نہ کیا۔

ناشتہ کرنے کے دَوران میں مجھے بتایا گیا کہ آج صبح ہی صبح گوڈس برگ کا چکر لگانے کا فیصلہ ہوا ہے، تاکہ اس سے نمٹ کر پھر اطمینان کے ساتھ بوُن میں طبی اور دوائی ادارے تفصیل سے دیکھے جائیں۔ ہوٹل سے نکل کر ٹیکسی لینے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔

**گوڈس برگ**: بون سے بہت ہی قریب یعنی صرف پانچ میل کے فاصلے پر ایک علیحدہ شہر آباد ہے جسے گوڈس برگ کہتے ہیں۔ بون کی سرحد سے وہاں تک پہنچنے میں اتنا وقت بھی نہیں لگتا جتنا کہ ہمیں کراچی میں ہمدرد مطب سے ہمدرد لیبارٹری تک جانے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ وطن میں ہمارا یہ چکّر روز کا ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں تھی کہ بون میں رہتے ہوئے ہم اسے نظر انداز کر دیتے۔ میرے خیال میں تو اسے بوُن کا ایک حصّہ ہی سمجھنا چاہیے۔ پانچ میل کا فاصلہ بھی کوئی فاصلہ ہے۔ کبھی میں اور بھائی جان محترم روزانہ چہل قدمی کے طور پر اتنی دور جاتے اور اتنا ہی فاصلہ طے کرکے واپس آتے تھے۔ آب وہوا کے اعتبار سے یہ ایک عمدہ صحت بخش مقام ہے لہٰذا ہمارا آج کا فیصلہ ہر لحاظ سے مناسب تھا۔ راستے میں حسبِ دستور ڈرائیور سے بات چیت کرنے کے لیے میاں محبوب وسیط بنے اور اس طرح یقین ہو گیا کہ وہ ہم کو اجنبی جان کر زیادہ اجرت وصول نہیں کرے گا۔ کوئی دس بارہ منٹ کے بعد ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار دھیمی کرکے پوچھا کہ ہم ٹھیک کس جگہ جانا چاہتے ہیں۔ گویا ہم اس وقت گوڈس برگ میں پہنچ چکے تھے۔ ہم نے کہا اوّل تو ہم گرم پانی کے چشمے دیکھیں گے اور پھر اس شاہی قلعے کا دورہ کریں گے جس میں ہٹلر اور برطانیہ کے وزیرِ اعظم نیوائل چیمبرلین نے قیامِ امن کی خاطر بات چیت کی اور ایک اقرار نامے پر دستخط کیے تھے۔ چنانچہ ڈرائیور نے ہم کو گرم چشموں کے مرکزی مقام پر پہنچا دیا۔

ایسے چشموں کے بارے میں اور ان کے نظم ونسق سے متعلق اپنے خیالات ہم اتنی بار لکھ چکے ہیں کہ اب ان کی نوعیت وافادیت پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہاں کے چشمے ان چشموں سے کسی طرح بھی کم تر مفید نہیں کہے جا سکتے جو ہم اب تک دیکھ چکے تھے بلکہ ایک لحاظ سے انھیں برتری حاصل تھی۔

کیونکہ امراضِ قلب، امراضِ تنفس اور نظامِ ہضم کی شکایت دور کرنے کے علاوہ یہاں چشموں کے پانی میں پیشاب سے متعلق عارضے رفع کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ یہاں سوڈیم میگنیشیم اور ہائیڈرو کاربونیٹ کے علاوہ نائٹروجن کا جزو بھی پایا جاتا ہے جو مشرقی طب کے اعتبار سے پیشاب آور ہے، پیشاب کو صاف کرتا ہے، گردوں کی اصلاح کر کے پیشاب کی نالی کو درست رکھتا ہے۔

ساٹھ ہزار افراد کی آبادی والے اس شہر کے شفاخانے میں ایک ہزار ایک سو چھیاسی مریضوں کے رہنے کا انتظام ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ ان کے علاج کے لیے صرف دو معالج مقرر ہیں۔ افرادِ عملہ کی تعداد معین کرنے کا اصول ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مثلاً یہاں اوسط پانچ سو ترانوے مریض فی معالج پھیلتی ہے جب کہ درخیم میں صرف ایک سو پینتالیس مریضوں کے لیے تین معالج ہیں۔ گویا اوسط اڑتالیس مریض فی معالج آتی ہے وہاں خون کی خرابیوں اور اعصاب کی بدنظمیوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ اسی طرح باڈن باڈن میں ڈھائی ہزار مریضوں کے لیے اکتالیس معالج گویا ہر اکسٹھ مریضوں کے لیے ایک معالج مقرر ہے۔ ان کے برعکس بالٹرم میں دو ہزار تین سو مریضوں کے لیے صرف دو معالج ہیں۔ یہ تناسب گوڈس برگ سے بھی گرا ہوا ہے۔ ہومبرگ میں جس کا حال لکھا جا چکا ہے، ایک ہزار چار سو بیس مریضوں کے لیے ترپن معالج کا تقرر حیرت انگیز ہے۔ یہ اوسط ستائیس مریض فی معالج سے بھی کم ہے۔ گوڈس برگ میں ہمارے دریافت کرنے پر معالجین کی تعداد معین کرنے کا اصول کوئی نہ سمجھا سکا۔ خیر ہمیں اس نظامِ عمل سے کیا غرض، ہمیں تو دلچسپی صرف اس چیز سے تھی کہ پیشاب کی بہت سی بیماریاں محض پانی پینے سے دور ہو جاتی ہیں۔ معالج نے بتایا کہ اگر مریض یہاں زیادہ عرصے رہ کر چشمے کا پانی پیتا رہے تو نہ صرف مثانے کی بلکہ گردہ تک کی پتھری کٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر پیشاب کے ساتھ نکل جاتی ہے۔

معاً مجھے اپنے برادرِ نسبتی محترم حکیم محمد یحییٰ یاد آگئے۔ بھائی یحییٰ کو گردے کے درد کی شکایت عرصۂ دراز سے لاحق ہے۔ گردہ میں پتھری موجود ہے۔ بہت سے جتن کر لیے لیکن پتھری خارج نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی دواؤں کے اثر سے اس کے ٹکڑے باریک ذروں

کی صورت میں منتقل ہوکر نکلتے رہتے ہیں لیکن پورا افاقہ نہیں ہوتا۔ میں نے چاہا کہ کراچی پہنچ کر بھائی یحییٰ کو کسی طرح آمادہ کرلوں کہ وہ جرمنی آکر ایک ماہ تک گوڈس برگ میں قیام کریں۔ میں نے فوراً بھائی جان محترم سے تبادلۂ خیال کیا۔ ان کی رائے بھی یہی ہے کہ بھائی یحییٰ کو یہاں ضرور آجانا چاہیئے۔ جی چاہا کہ ابھی ٹرنک کال کے ذریعہ کراچی میں ان سے بات کروں اور بے تار برقی کی قوت کے زیر اثر ان پر زور دوں کہ وہ فوراً جہاز میں بیٹھ کر یہاں پہنچ جائیں۔ ان کی خاطر ہم اپنے پروگرام میں کسی قدر لچک پیدا کرسکتے ہیں جو ہم نے اب تک کسی عنوان گوارا نہیں کی ہے۔ ہمیں بھائی یحییٰ کی زندگی عزیز ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ وہ ہماری اس ترغیب پر مشکل ہی سے عمل کریں گے۔ انھیں اپنی صحت سے زیادہ اپنا کام پیارا ہے جس کی دیکھ بھال میں وہ علالت کے باوجود منہمک رہتے ہیں۔ ہمدرد (وقف) میں ادویہ کی تیاری کا سارا انتظام انھی کے سپرد ہے۔ وہ دواسازوں کے سر پر کھڑے نہ ہوں یا ذرا غفلت برتیں تو دوا کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اہم دواؤں کا تو ذکر ہی کیا جن کی تیاری پر انھیں خاص توجہ دینی پڑتی ہے، معمولی شربتوں کے قوام کی جانچ پڑتال بھی وہ بذاتِ خود کرتے ہیں اور جب تک پوری طرح مطمئن نہ ہوجائیں، انھیں بوتلوں میں نہیں بھرواتے۔ جب کام کی نوعیت اور ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم ہو تو ظاہر ہے کہ وہ کراچی سے باہر اپنا قدم کس طرح نکال سکتے ہیں جبکہ میں بھی وہاں موجود نہیں ہوں لیکن کچھ بھی ہو، ہمیں کراچی پہنچ کر انھیں مجبور کرنا ہے کہ وہ اپنے فرائض عارضی طور پر اپنے ماتحتوں میں تقسیم کرکے جرمنی کی سیاحت بغرض علاج ضرور کریں، اور گوڈس برگ میں اس وقت تک رہیں جب تک کہ معالج پوری طرح معائنہ کرکے یہ انقطاعی فیصلہ نہ کردیں کہ اب ان کے گردے بالکل صاف ہیں۔ پتھری تو کیا کوئی ذرہ تک باقی نہیں ہے۔ ہم نے معالج سے بھائی یحییٰ کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے ان کی علالت کا ذکر کیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہمارے بھائی یحییٰ کا بطور خاص خیال رکھیں گے اور انھیں مریض نہیں، اپنے مہمانِ خصوصی کا درجہ دیں گے۔ ان کی اس بات سے ہمیں بڑی تقویت ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ بھائی یحییٰ کا صحت مند مستقبل بس ان سے اور اس علاقے کے چشموں کی تاثیر سے وابستہ ہے۔

ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ شفاخانے میں گزارا۔ وہاں دو چار مریض ایسے بھی نکل آئے جو انگریزی زبان جانتے تھے۔ ان کا حال پوچھا اور معلوم کیا کہ وہ وہاں کے نظام سے کس حد تک مطمئن ہیں۔ سب نے تعریف کی اور بتایا کہ وہ جب سے آئے ہیں، خاصا افاقہ محسوس کر رہے ہیں۔ مشرقی طریقۂ علاج کی طرح اس قدرتی علاج میں بھی زیادہ وقت لگتا ہے لیکن نتائج دیرپا بلکہ دائمی ہوتے ہیں۔

شفاخانے سے نکل کر ہم نے شاہی محل کی زیارت باہر ہی سے کی کیونکہ اس میں داخل ہونے کی عام اجازت نہیں ہے۔ البتہ سرکاری حکام کے نام تحریری درخواست بھیجی جائے تو ہفتے میں ایک دن اسے دیکھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ ہمارے لیے زیادہ دیر ٹھیرنا ہی ناممکن تھا۔ اس محل کو اپنی تعمیر کے وقت اور بعد کے کچھ زمانے تک جو اہمیت حاصل رہی، ہمیں اس سے غرض نہیں تھی۔ عہدِ جدید میں اس کی شہرت کا سبب یہ تھا کہ ۲۲، ۲۳ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اس میں بیٹھ کر ہٹلر اور چیمبرلین نے ایک اقرار نامے کی شرائط طے کیں اور اس کے مسودے پر دستخط کیے تھے جس نے بظاہر لڑائی کے امکانات کا خطرہ دور کر دیا تھا یعنی وہ تقریباً ایک سال کے لیے ٹل گئی تھی۔ ہٹلر اور چیمبرلین کے یہ مذاکرات یورپ کی تاریخ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں ذرا تفصیل کی ضرورت ہے۔ یہ مذاکرات بنیادی طور پر سوڈیٹن لینڈ کے مستقبل کے بارے میں تھے۔ یہ اس مملکت کا حصہ تھا جسے چیکوسلواکیہ کہتے ہیں اور جس کا وجود ۱۹۱۸ء سے پہلے کے کسی نقشے میں یا جغرافیے کی کسی کتاب میں نظر نہیں آ سکتا۔ اس کے برعکس بوہیمیا اور موراویا کی ریاستیں جو بہت قدیم تھیں، پہلی جنگِ عظیم ختم ہونے والی بندربانٹ کے تحت ایسی ناپید ہوئیں کہ اب عینک لگا کر دیکھو تب بھی یورپ کے موجودہ نقشے پر وہ نظر نہیں آئیں گی۔ اس اجمال کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیئے۔

**سوڈیٹن لینڈ:** سوڈیٹن پہاڑ کے دامن میں ایک بہت بڑے علاقے کا نام سوڈیٹن لینڈ تھا۔ اس کے مختلف حصے مختلف ناموں سے مشہور تھے۔ یہ نام ان جرمن باشندوں نے رکھا تھا جو اسی پہاڑ کے دامن میں آباد تھے۔ جرمن زبان میں اس نام کا تلفظ "زوڈیٹن لانٹ" ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کی اصل بنا اگرچہ یہ تھی کہ آسٹریا کا شہزادہ فرڈیننڈ سرویا میں مارا گیا

لیکن اس کے پس منظر میں جرمنی نے سب سے بڑا کردار ادا کیا۔ شہزادے کے قتل کے بعد قیصرِ جرمنی کی حکومت نے خفیہ طور پر آسٹریا کو ابھارا کہ وہ سرویا کی حکومت کو الٹی میٹم دے دے کہ شہزادے کے اصل قاتل گرفتار کر کے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر اس کے حوالے کر دئیے جائیں ورنہ انتقام لینے کی غرض سے ملک پر چڑھائی کر دی جائیگی۔ شہزادے کے قاتل پہلے ہی ملک سے چلتے کر دیئے گئے تھے قلیل مدت میں ان کو بازیاب کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ سرویا خاموش رہا اور آسٹریا نے جرمنی کی شہ پر ہلّا بول دیا۔ روس سرویا کی حمایت میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرے ملک بھی خاموش نہ رہ سکے۔ کچھ اس صف میں آئے اور کچھ اس میں چلے گئے۔ جرمنی کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا لیکن دوسری بڑی طاقتوں کے مل جانے اور اس کے مدِ مقابل آجانے سے یہ گھمنڈ خاک میں مل گیا۔ شکست ہوئی اور بری طرح ہوئی۔ نام نہاد اتحادیوں نے صرف جرمنی کو جنگ کا ذمہ دار ٹھیرا کر سب سے بڑا تاوانِ جنگ اس پر ڈالا اور اس مملکت کے کچھ حصّے بھی اس میں ہی کتر لیے گئے اور کچھ حصّے آسٹریا کے ہتھیا لیے گئے۔ اس لوٹ کھسوٹ پر اتحادی بہت خوش تھے۔ لیکن وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ دراصل ایک نئی جنگ کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔

ان کا اس وقت کا فیصلہ تاریخ میں صلحنامۂ وارسائی کے نام سے مشہور ہے اس صلحنامے کے مطابق آلسیس اور لورین کے علاقے دوبارہ فرانس کو مل گئے اور اس ملک کی بہت سی کانیں بھی اس کے حوالے کر دی گئیں۔ رہائن لینڈ میں کوئلے اور لوہے کی جو کانیں تھیں، انھیں بظاہر بین الاقوامی درجہ دے کر برطانیہ نے اپنے زیرِ اثر رکھا۔ آسٹریا کے سابق صوبوں بوہیمیا اور موراویا کو جو علیحدہ ریاستوں کی حیثیت سے آزاد تھے، لیکن جرمنی کے زیرِ اثر تھے، نیز سلیشیا کو جس پر جرمنی کا پوری طرح اقتدار تھا، ملا کر ایک نئی حکومت قائم کی اور چونکہ ان علاقوں میں اکثریت چیک اور سلاوی قبیلوں کو حاصل تھی، اس لیے اس کا نام چیکوسلواکیہ رکھ دیا۔ یہ نئی جمہوریت ۲۸ راکتوبر ۱۹۱۸ء کو وجود میں آگئی اور جب اس کا دستور العمل بن گیا تو طامس جی مساریک اس کے پہلے صدر بنے جو اتحادیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے۔ اس وقت کی مردم شماری کے اعتبار سے جمہوریت کی آبادی ڈیڑھ کروڑ تھی جس میں ساڑھے بتّیس لاکھ کے قریب جرمن نسل کے باشندے بھی شامل تھے۔ وہ زیادہ تر بوہیمیا اور موراویا کے سودی اضلاع میں رہتے

تھے۔ انھوں نے اپنے علاقے کا نام سوڈیٹن لینڈ رکھ لیا تھا۔ نسلی تعصب کی بنا پر اور کچھ برطانیہ و فرانس کے اشارے پر نئی حکومت ان لوگوں پر ظلم ڈھانے لگی۔ ملک کی قومی زبان چیک قرار دی گئی اور یہ زبان نہ جاننے والوں کے لیے سرکاری ملازمت ممنوع ہو گئی۔ تجارت و صنعت میں بھی ان کی حق تلفی ہونے لگی۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو شاید دوسری جنگِ عظیم اس قدر جلد شروع نہ ہوتی۔

۱۹۳۳ء میں سوڈیٹن لینڈ کے باشندوں نے اپنی ایک سیاسی جماعت بنالی۔ اسی زمانے میں ہٹلر جرمنی میں برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اس نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی سوڈیٹن لینڈ جرمن پارٹی کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ پارٹی کا سربراہ کونراڈ ہین لین تھا۔ ۱۹۳۵ء میں جب پارلیمانی انتخاب عمل میں آئے تو ہین لین کی جماعت کو سوڈیٹن لینڈ کی ۶۲ فی صد نشستیں مل گئیں۔ اس کامیابی کو دیکھ کر اس نے حکومت کے سامنے آٹھ مطالبات پیش کر دیے لیکن حکومت نے انھیں ٹھکرا دیا۔ یہ فروری ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ اس واقعہ کے چار ماہ بعد جرمنی نے طے کیا کہ چیکوسلواکیہ میں رہنے والے سوڈیٹن بچوں کو اپنے ہاں لا کر تعلیم دی جائے اور بعد میں روزگار فراہم کیے جائیں۔ ایسے پانچ ہزار بچوں کی پہلی کھیپ جب جرمنی جانے لگی تو سرکاری طور پر انھیں روک دیا گیا۔ اس تعلیمی اسکیم سے الگ بھی جن لوگوں نے جرمنی جانے کا ارادہ کیا تو انھیں سرحد پر چنگی کی چوکی نے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد سے ہین لین اور اس کی جماعت کے اراکین پر جو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تھے، کڑی نگرانی ہونے لگی۔ جلسہ کرنے کی صورت میں انھیں منتشر کیا جانے لگا۔ ذرا کوئی مدافعت کرتا تو بے عزتی کے ساتھ ساتھ اس کو سخت تکالیف پہنچائی جاتیں۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں جرمنی نے آسٹریا پر قبضہ کر لیا تو یورپ کے اور ملکوں کے علاوہ چیکوسلواکیہ کے سرکاری حلقوں میں بطورِ خاص کھلبلی مچ گئی لیکن سوڈیٹن کے جرمن باشندوں میں نئی روح بیدار ہو گئی اور وہ حکومت کی مخالفت کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ ادھر جرمنی نے ایک فوجی مظاہرے کے ذریعہ اپنی بے پناہ طاقت کا نقش جما دیا۔ جس سے برطانیہ سمیت یورپ کی بہت سی حکومتیں خوفزدہ ہو گئیں۔ برطانیہ نے سفارتی اثر و رسوخ سے کام لے کر پہلے تو دوستی جتانی چاہی اور پھر باہمی مفاہمت کے لیے ہاتھ

بڑھایا۔ اس نے چیکو سلواکیہ کی حکومت کو بھی ہدایت کی کہ سوڈیٹن لینڈ کے جرمن باشندوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے کر خاموش رکھے۔ لیکن دونوں جگہ منھ کی کھانی پڑی۔

آخر برطانیہ کے وزیر اعظم سر نیوائل چیمبرلین نے خود جرمنی جا کر ہر ہٹلر سے صلح پسندانہ گفتگو کا فیصلہ کیا۔ چیمبرلین ۱۳ ر ستمبر کو میونک پہنچا۔ لیکن بات چیت کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ ہر ہٹلر نے چیلنج کیا کہ جب تک سوڈیٹن لینڈ کو خود مختار حکومت کا حق نہیں دیا جائے گا، کوئی مصالحتی گفتگو کامیاب نہیں ہوگی۔ چیمبرلین واپس چلا گیا لیکن یہ وعدہ کیا کہ میں اپنے ساتھیوں سے تبادلۂ خیالات کر کے جواب دوں گا اور ضرورت پڑی تو خود آؤں گا۔ اس نے لندن جا کر فرانس کے اربابِ اقتدار کو بھی وہاں طلب کر لیا۔ تاکہ بڑے پیمانے پر اس مسئلے کو سوچا جائے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ چیکو سلواکیہ کے ان علاقوں کو جن میں پچاس فی صد جرمن آباد ہیں، جرمنی کے حوالے کر دیا جائے۔ چیکو سلواکیہ کو بھی مجبوراً یہ بات ماننی پڑی۔ چیمبرلین ۲۲ ر ستمبر کو دوبارہ جرمنی پہنچا۔ اس موقع پر اسے گوڈس برگ کے شاہی محل میں ٹھہرایا گیا اور ہٹلر نے وہیں بات چیت کا فیصلہ کیا۔

بات چیت شروع ہوئی تو چیمبرلین نے کہا کہ سوڈیٹن لینڈ کا جرمن علاقہ جرمنی کو اس شرط پر دیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے بعد چیکو سلواکیہ کے معاملات میں دخل نہ دے بلکہ اس کی سلامتی اور آزادی کی ضمانت دے۔ ہٹلر نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا۔ چیمبرلین واپس چلا گیا۔ ہٹلر نے اسی روز چیکو سلواکیہ کو الٹی میٹم دیا کہ سوڈیٹن لینڈ کا تمام علاقہ بلا کسی شرط کے جرمنی کو دے دیا جائے۔ فرانس کی جو کم بختی آئی، اس نے سوچے سمجھے بغیر اعلان کر دیا کہ اگر جرمنی نے چیکو سلواکیہ پر حملہ کیا تو فرانس اس کی مدد کرے گا۔ جرمنی کے مقابلے میں فرانس کا یہ دعویٰ چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف تھا۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ انگلستان، یوگوسلاویہ، رومانیہ اور روس نے فرانس کی پیٹھ ٹھونک دی اور "چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کرے گا" کا نعرہ لگا دیا۔ گویا جرمنی کے خلاف باقاعدہ محاذِ جنگ قائم کر لیا۔

آج کی دنیا ہر ہٹلر کو خواہ کتنا ہی چالباز کہے، میرے نزدیک اس لحاظ سے اس

کا درجہ دوسروں سے کم ہے اور شاید اس ضمن میں چیمبرلین کا نام سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔ اس تمام ڈرامے میں اس نے کبھی ڈاکٹر جیکل اور کبھی مسٹر ہائیڈ بن کر اداکاری کی تھی جب فرانس کے اور حامی پیدا ہو گئے تو جرمنی بھی تن تنہا نہیں رہ سکتا تھا۔ پولینڈ ہنگری، اٹلی اور جاپان نے اس کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ گویا ترازو کے دونوں پلڑے ڈنڈی سے یکساں فاصلے پر آ گئے۔ عدم توازن کا سوال باقی نہیں رہا جرمنی کے ساتھ چار ملکوں کا اعلان حمایت ایک طرح سے قرص ملیتن کی مانند تھا جس نے ایک بار پھر چیمبرلین کے پیٹ میں کھلبلی سی پیدا کر دی اور اس نے سر ہوریس ولسن کو اپنا ایلچی بنا کر ہٹلر اور مسولینی کے پاس پیغام امن بھیجا۔ لڑائی تو ہٹلر اور مسولینی بھی نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم دونوں، چیمبرلین اور فرانس کے وزیر اعظم ڈلاڈیر ایک کانفرنس کی صورت میں مل بیٹھیں اور متنازعہ امور کو طے کر لیں۔ ہٹلر نے فوراً لڑائی روک دینے کا اعلان کرا دیا۔

مجوزہ کانفرنس منظور کر لی گئی جو میونخ میں منعقد ہوئی۔ وقت کم تھا، سمتیں مختلف اور مواصلاتی رشتوں کی نوعیت بھی مختلف تھی، تاہم ہٹلر نے جسے میزبان کی حیثیت حاصل تھی سفارتی آداب کا پوری طرح لحاظ رکھا۔ جب مسولینی اور اس کے ساتھی اسپشل ٹرین سے میونخ پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر ہٹلر نے ان کا استقبال کیا اور اس کے فوراً ہی بعد ہوائی مستقر کی راہ لی جہاں تھوڑی دیر بعد چیمبرلین اور ڈلاڈیر کا خاص جہاز پہنچ گیا۔ بروقت ان کا استقبال بھی ضروری تھا۔ یہ ۲۹ ستمبر کی صبح کا ذکر ہے۔ اسی روز لنچ سے فارغ ہوتے ہی خفیہ مذاکرات شروع ہو گئے۔ کئی نشستیں ہوئیں جو کامیاب رہیں اور ایک معاہدہ عمل میں آ گیا۔ طے پایا کہ چیکوسلواکیہ سوڈیٹن لینڈ کا علاقہ وہاں کی کوئی چیز تباہ کیے بغیر ۱۰ اکتوبر تک خالی کر دیگا اور جرمنی کا اس پر قبضہ ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لیے جرمنی کی فوجیں یکم اکتوبر سے وہاں داخل ہونے لگیں گی۔ ایک کمیشن بھی قائم کیا گیا تاکہ وہ جرمن اکثریت والے دوسرے علاقوں میں استصواب رائے کرائے۔ اس تمام ڈرامے میں برطانیہ اور فرانس نے اپنے کردار کا جواز یوں قائم کیا کہ ہم اس سے قبل جرمنی سے یہ وعدہ لے چکے ہیں کہ وہ چیکوسلواکیہ پر حملہ نہیں کریگا اور اس کے مفادات کا خیال رکھے گا۔ اس اعتبار سے جرمنی کے کچھ مطالبات بھی ماننے ضروری ہیں اور ان کی تعمیل ہمارا اخلاقی فرض ہے۔

ہاتھی سے گنا چھیننا آسان کام نہیں ہے لیکن جب ہاتھی یہ محسوس کرے کہ میں ہر طرف سے زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہوں اور آزادی کا کوئی لمحہ صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ میں گنا چھوڑ دوں تو وہ اپنی آن کو توڑ کر سر کو جھکا دیتا ہے۔ چیکو سلواکیہ کو اسی منزل سے گزرنا پڑا اور اس نے بظاہر اپنے حق میں کیئے ہوئے دوسروں کے فیصلے پارلیمان کے کھلے اجلاس میں تسلیم کر لیے۔ اس میں یہ پوچھنے کی ہمت کہاں تھی کہ جناب خدائی فوجدار کیوں بنے ہیں۔ یہ اختیارات آپ کو کس نے تفویض کئے ہیں۔ ظالم مارے اور رونے نہ دے۔ ملک کے ٹکڑے الگ کئے جائیں اور اس تاکید کے ساتھ کہ تباہ کاری کی پالیسی پر عمل نہ ہو، کوئی احتجاج نہ کیا جائے کسی قسم کی بداخلاقی تک کا مظاہرہ نہ ہو۔ برطانیہ کا دلی مقصد یہ تھا کہ لڑائی کسی طرح نہ چھڑے اور اگر نوبت آجائے تو اثرات ان کی سرزمین سے دور رہیں۔ اس مقصد کی تکمیل صرف اسی طرح ممکن تھی کہ قربانی کا بکرا کسی اور کو بنا دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ لڑائی کی بلا اس وقت تو ٹل گئی لیکن کسی وقت بھی بھڑک اٹھنے والا آتش گیر مادہ زندہ چٹانوں کے نیچے دب کر رہ گیا۔ چنانچہ جب چیکو سلواکیہ نے ہنگری سے معاہدہ کرتے ہوئے خود ہی اپنے دو علاقے اس کے حوالے کر دیے تو ساری دنیا نے اندازہ لگا لیا کہ یہ اس شاطر کی سی چال ہے جو جان بوجھ کر اپنا مہرہ پٹوا کر فریق مخالف کے کسی مہرے کو زچ کر دینا چاہتا ہے۔ چیکو سلواکیہ کا اقدام "استادانِ ازل" کے اشارے پر ہوا تھا۔ جرمنی نے اس سیاسی پس منظر میں اصل صورتِ حالات کو سمجھ لیا اور ضرورت کے مطابق چوکنا ہو گیا۔ چونکہ سوڈیٹن لینڈ میں کارلسباد معدنی اعتبار سے بڑا دولت مند علاقہ ہے اور اب جرمنی کو مل گیا تھا، اس لیے اس نے سامان حرب کی تیاری میں رات دن ایک کر دیئے۔ اس کے اندازے کے مطابق لڑائی ناگزیر تھی اور وہ اس کے لیے ہر لحاظ سے لیس ہونا چاہتا تھا۔

ابتدائی معاہدے میں برطانیہ اور فرانس ہٹلر سے یہ شرط منوانی چاہتے تھے کہ جرمنی چیکو سلواکیہ کی آزادی کا احترام کرے گا۔ یہ بات ہٹلر نے نہیں مانی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس قسم کا ایک غیر جارحانہ معاہدہ براہ راست چیکو سلواکیہ سے کیا جا سکتا ہے جیسا کہ اس وقت رواج تھا اور اب بھی عمل ہوتا ہے! اس کے بعد جب جرمنی نے محسوس کیا کہ چیکو سلواکیہ کو

آلۂ کار بنا کر سازشیں کی جارہی ہیں تو اس نے فوراً پیشقدمی کی اور مارچ ۱۹۳۹ء میں بوھیمیا اور موراویا کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ سلواکیہ کو پہلے کی طرح آزاد چھوڑ دیا۔ گویا چیکوسلواکیہ جو بمشکل بیس سال پہلے نقشے پر آنا شروع ہوا تھا، بیک جنبش فوج معدوم ہو گیا۔ اس کے بعد جرمنی نے قدم زیادہ بڑھائے اور اس کی طرف سے نت نئے مطالبات ہونے لگے۔ اس نے پولینڈ سے دانتسگ وغیرہ کا مطالبہ کیا۔ ابتدا میں زیادہ اصرار نہیں ہوا لیکن سال کے وسط میں اس نے شدت اختیار کر لی۔

اگست میں جرمنی نے رُوس سے معاہدہ کر لیا۔ روس کا پولینڈ سے کوئی اتحاد نہیں تھا۔ لہٰذا اس کی طرف سے غیر جانبداری یقینی ہو گئی اور اس کو پولینڈ سے نمٹنے کا اطمینان ہو گیا۔ یکم ستمبر کو جرمنی نے باقاعدہ اس پڑوسی ملک کے خلاف لڑائی شروع کر دی۔ اب برطانیہ اور فرانس کے لیے الگ تھلگ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ دو دن بعد وہ بھی میدان میں کود پڑے۔ دراصل یہی دوسری جنگ عظیم کا آغاز تھا۔

**چیمبرلین:** برطانیہ کا مشہور مدبر سیاست جو اپنے ۱۹۰۱ء کے ساتھ رائٹ آنریبل نیوائل چیمبرلین کہلاتا تھا، ۱۸۶۹ء میں برمنگھم کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ جوزف چیمبرلین بھی ایک قدامت پسند سیاست داں تھا۔ نیوائل چیمبرلین نے اپنے وطنِ مالوف ہی میں تعلیم پائی۔ اس کا ابتدائی رجحان صنعت وحرفت کی طرف تھا۔ لیکن خاندانی روایت کے مطابق سیاست کے میدان میں قدم رکھتے ہوئے ۱۹۱۱ء میں برمنگھم کونسل کا رکن بن گیا۔ اس وقت وہ بلحاظ عمر کافی پختہ کار تھا۔ چار سال بعد وہ لارڈ میئر ہو گیا۔ ۱۹۱۶ء میں جبکہ لائڈ جارج وزیراعظم تھا، وہ قومی محکمے کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ لیکن یہ منصب زیادہ عرصے راس نہ آسکا۔ حزبِ اختلاف نے محض بغضِ معاویہؓ کے طور پر اس کی مخالفت شروع کر دی اور اسے ایک سال بعد ہی استعفےٰ دے دینا پڑا۔

۱۹۱۸ء میں اس نے قدامت پسند جماعت کے ٹکٹ پر انتخاب میں حصہ لیا اور کامیاب ہو گیا۔ چار سال بعد وہ ملک کا پوسٹ ماسٹر جنرل اور اس سے اگلے سال وزیرِ صحت بنا دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت اس نے غیر معمولی خدمات انجام دیں، مثلاً

ملک کے بڑے شہروں خصوصاً صدر مقام حکومت سے گندے علاقے ختم کرا کے صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے پیش نظر نئے قسم کے مکانات تعمیر کرائے۔ وہ کئی سال تک وزیر مال بھی رہا لیکن صحت کے میدان میں اس کی خدمات کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی کوششوں سے بعض قوانین منظور ہوئے جو بیواؤں اور یتیموں کے لیے خاص طور پر مفید کہے جا سکتے ہیں۔

۲۸ر مئی ۱۹۳۷ء کو یعنی دوسری جنگِ عظیم کے بیج بوئے جانے سے تقریباً دو سال پہلے جب بالڈون نے منصبِ وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا تو قرعۂ فال اسی کے گلے میں پڑا۔ اس وقت بھی وہ قدامت پسند جماعت کا سربراہ تھا۔ اس عہدے پر پہنچے ہوئے اس کی سیاسی حکمت عملی اس درجہ صلح پسندانہ رہی کہ بعض لوگ اسے بزدل اور احساسِ کمتری کا شکار کہنے لگے۔ وہ جرمنوں اور اطالویوں سے کسی بھی قیمت پر لڑائی مول لینی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تخفیفِ اسلحہ کے خیال سے ایک بین الاقوامی معاہدہ کیے جانے پر خاص زور دیا۔ ایک سال بعد جب ہٹلر کے عزائم ایک ہولناک مستقبل کا پتہ دینے لگے تھے، اس نے لڑائی کے بادل دور کر دینے کی انتہائی کوشش کی لیکن چونکہ برطانوی مفاد کو یا زیادہ وسیع پیمانے پر یوں کہنا چاہیئے کہ اتحادیوں کے مفاد کو سراسر مدِ نظر رکھا جاتا تھا، اس لیے ہر سعی و کاوش سے محض ریت پر بنی ہوئی عمارت کی طرح ایک خام منصوبہ وجود میں آتا تھا۔ ایڈن، چرچل اور ڈف کوپر اس لحاظ سے اس کے مخالف رہے کہ وہ مدافعت کے بجائے جارحانہ اقدامات سے کیوں کام نہیں لیتا لیکن اپنے بچاؤ کی خاطر دوسروں کی پیٹھ ٹھونکتے رہنا اور کبھی ان کو آگے کر کے مروا دینا کبھی بھی ایک لائق تحسین پالیسی نہیں کہی جا سکتی۔

برطانیہ کا دستِ تعاون پولینڈ، رومانیہ، یونان اور ترکی تک کے لیے بڑھتا رہا اور ایک بار تو روس کو بھی اس دائرے میں شامل کر لیا گیا لیکن اسے اپنی کوتاہ دستی یا تنگ دامنی کا احساس واضح طور پر نہ ہو سکا، صرف اس کے لاشعور میں جاگزیں رہا اور اسی لیے بعض اوقات خفیف الحرکتی تک پہ اتر آیا۔ ایسے چھل بٹے زیادہ عرصے نہیں چلتے۔ قلعی اتر کر اصل سطح کبھی نہ کبھی نکل ہی آتی ہے اور اس طرح کا ردِ عمل بہت ہی ہولناک ہوتا ہے۔ ذرا سی دیر ہی میں نیت کا تار و پود ٹوٹ جاتا ہے اور پھر اصل ذہنیت

سامنے آجاتی ہے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء سے پہلے برطانیہ نے جرمنی کے ساتھ دوستی کا دم بھرا۔ لیکن جونھی اس نے پولینڈ پر حملہ کیا، برطانیہ کو اس کی حمایت میں آگے بڑھنا ہی پڑا۔ جرمنی کے لیے یہ اقدام خلاف توقع نہیں تھا۔ ایک ہی سال پہلے چیمبرلین کے ساتھ مذاکرات کے وقت ہٹلر اچھی طرح جانتا تھا کہ فریق ثانی اپنی دانست میں دوسرے کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کے مذاکرات کے دوران میں دونوں فریق اپنے اپنے طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دوسرے کو مغالطے میں رکھ کر ایک کامیاب پالیسی عمل میں لا رہے ہیں، حالانکہ خود اپنے اوہام خیالی میں گرفتار رہ کر زبردست مغالطے میں گھر جاتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے، اگر برطانوی مدبرین اپنے ایوانِ خاص و عام میں رہ کر خفیہ طور پر یہ اعلان کر دیں کہ نازی حکومت کا قلع قمع ہمارا مطمح نظر ہے اور پھر میونک یا گوڈس برگ تک پہنچ کر اسی حکومت کے ارباب اقتدار کے سامنے اپنی صلح پسندی کا ڈھونگ رچائیں تو بھلا کون بے وقوف ہے جو شکر چڑھی گولیوں کی اصل تلخی کو محسوس نہیں کرے گا۔ چنانچہ اپنی رائے تو یہ ہے کہ اگر ۱۹۳۹ء میں چیمبرلین جیسا بہروپیا برسر اقتدار نہ ہوتا اور اس کی بجائے چرچل جیسا صاف گو اور ڈنکے کی چوٹ اپنی قوت اور برتری کا اعلان کرنے والا وزیر اعظم رکنِ رکین ہوتا تو ہٹلر میں دوسری جنگِ عظیم شروع کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اور آج دنیا کا نقشہ بدلا ہوا ہوتا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ چرچل نے لڑائی کے دوران میں وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھال لیا تھا لیکن یہ بعد از وقت تھا۔ آگ لگ چکی تھی، شعلے بھڑک رہے تھے۔ چرچل نے زیادہ سے زیادہ فائر بریگیڈ کے افسر اعلا کا کام کیا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ چیمبرلین سے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ زمانۂ جنگ کی سیاسی حکمت عملی سے جسے ریاکاری کے مترادف کہا جا سکتا ہے واقعات کا رُخ بدلنے میں کامیاب ہوتا۔ کاش! وہ اپنے ابتدائی مشغلے کے مطابق کسی صنعتی ادارے کا ڈائرکٹر بن جانے پر اکتفا کرتا۔ شاید اس طرح وہ روک فیلر یا فورڈ جیسے لوگوں کی صف میں آ جاتا۔

ڈلاڈیر: نانبائی کا بیٹا اور ایک معمولی مدرسے کا استاد اپنی قابلیت کی بنیاد پر نہیں،

سیاسی توڑ جوڑ کے باعث نام نہاد جمہوریت کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر ملک کا وزیر اعظم بن گیا تو اس کے حق میں رائے دینے والوں نے اس کے ساتھ غلط توقعات کیوں قائم کیں؟ اگر اپنی ہمت سے بلند بات کی جائے تو عموماً منھ کی کھانی پڑتی ہے، جیسا کہ اس شخص کے ہاتھوں سارے ملک کو خسارے میں رہنا پڑا۔ عین اس وقت جبکہ لڑائی کی گھنگھور گھٹائیں سارے یورپ پر چھائی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں تیزی سے گرجتے ہوئے بادل اپنی گرج سے تباہ کن بجلیاں بھی گرا رہے تھے، یہ ناعاقبت اندیش اپنے حلیف پر محض تکیہ کیے یہ سمجھتا رہا کہ فرانس کے لیے بہت بڑے پیمانے پر لام بندی ضروری نہیں ہے۔

وزارتِ عظمیٰ کے ساتھ ساتھ قلمدانِ وزارتِ جنگ بھی اس کی تحویل میں تھا۔ لیکن وہ ملک کی اقتصادی اور مالی بدحالی کو سدھارنے کے لیے صرف ایسے منصوبے بناتا رہا جو زمانہ امن میں اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ صحیح سامانِ جنگ کے بغیر فوجیں پریڈ کرتی رہیں۔ وہ دوسری جنگِ عظیم چھڑنے سے تین سال پہلے ۱۹۳۶ء میں وزیر جنگ بنا تھا اور جب ملک پر گولہ باری شروع ہوئی تو اس کی بہادر فوجوں نے ذرا بھی مظاہرۂ مقاومت نہ کیا، فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ عیش پسندی نہ صرف شہریوں بلکہ فوجیوں تک میں عام تھی۔ جب نازی فضائی فوج نے بمباری کی تو ملک کا صدر مقام اس کے لیے کھلا چھوڑ کر اعلان کر دیا کہ ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا جائے لیکن ہمارے عشرت کدے بند ہونے نہ پائیں۔

ڈلاڈیر نے، جو اس واقعے سے چند ماہ پہلے آنے والے سیلاب کا اندازہ لگا کر خود ہی وزارتِ عظمیٰ سے الگ ہو گیا تھا۔ قوم کی کشتی کو بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا۔ پہلے رینو اور پھر پیتاں نے دو دو مہینے کے وقفے سے عنانِ حکومت سنبھالی لیکن اتنی سکت بھی جانِ ناتواں میں نہیں تھی کہ پاؤں کم سے کم رکاب ہی میں رہ سکتے۔ ڈلاڈیر پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں ایک فوج کا کپتان ہو گیا تھا۔ اور اس لیے یہ سمجھ لیا کہ وزیر جنگ سے وزیر اعظم تک ہر منصب کا اہل ہے اور ہر فرض کی ادائیگی سلیقے سے کر سکتا ہے۔

اگر چیمبرلین دوسرے ممالک کی سیاسی بساط پر مہرے چلانے چاہتا تھا تو اس کے لیے یہ تجزیہ کرنا بھی ضروری تھا کہ ان مہروں میں کتنی صلاحیت اور استعداد موجود ہے کیا اس نے میثاقِ میونک عمل میں آنے سے پہلے سیاسی مذاکرات کے دوران میں

اس کے سیاسی تدبر اور اس ملک کی عسکری قوت کا اندازہ نہیں لگا لیا تھا؟ آخر اس نے ہٹلر سے بات چیت کرتے وقت یورپی محاذ سے صرف اسی مہرے کو چننا کیوں پسند کیا؟ بلاشبہ چیمبرلین کا یہ جرم ناقابلِ معافی ہے کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو خود اس نے اور اپنی شہ سے فرانس کو ابھار کر جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ تو کرا دیا لیکن اس محاذ کو برقرار رکھنے کی خاطر کوئی عملی تدبیر اختیار نہیں کی۔ اس نے فرانس کی فوج کو سامانِ حرب کی بجائے بانس کی کھپچیوں کے سہارے کھڑا رکھنا چاہا اور اس طرح خود ڈوبا تو ڈوبا، اپنے سمندر پار والے صنم کو بھی لے ڈوبا۔

ڈلاڈیر ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوا اور معمولی تعلیم پا کر مدرس بن گیا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک فوج میں کپتان رہا۔ پھر انتہا پسند اشتمالی جماعت میں شریک ہو کر انتخابات میں کھڑا ہوا اور اگلے سال وزیر نوآبادیات بن گیا۔ سیاسی جماعت ہی کے بل بوتے پر وہ کئی بار وزیر جنگ اور وزیراعظم بنتا رہا۔ آخری بار یہ منصب اپریل ۱۹۳۸ء میں ملا اور مارچ ۱۹۴۰ء میں استعفےٰ دینے کے وقت تک اس پر برقرار رہا۔ اس نے جولائی ۱۹۳۹ء میں قومی انتخابات کو دو سال کے لیے ملتوی کر دیا تاکہ اپنا اقتدار قائم رہے۔ وہ اقتدار جو تالاب پر جمی ہوئی کائی کی طرح محض سطحی اور اس لیے نہایت کمزور تھا۔

**مسولینی:** اٹلی کا مطلق العنان آمر اور فاشی نظام کا بانی بنیٹو مسولینی اگرچہ لوہار کا بیٹا تھا لیکن علم کی ذاتی لگن کے باعث وہ اعلا تعلیم سے محروم نہ رہا۔ اس نے صحافت کا پیشہ اپنے لیے پسند کیا جس کا میدان سیاسی سرحدوں سے ملا رہتا ہے۔ اسی لیے دنیائے سیاست میں اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ اس کی ابتدا ۱۹۱۲ء میں اپنی سیاسی جماعت کے جریدے "آوانتی" کی ادارت سے ہوئی۔

پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو وہ پکا قوم پرست ہو گیا۔ اس نے اشتراکی جماعت سے قطعِ تعلق کر کے اس کے رسالے کی ترتیب کا کام بھی چھوڑ دیا اور "اٹلی کے عوام" کے نام سے ایک نیا رسالہ نکال لیا۔ مئی ۱۹۱۵ء میں اٹلی شریکِ جنگ ہوا تو اس نے بھی شہری زندگی ترک کر کے فوج میں نام لکھوا لیا اور اپنی کارکردگی کے باعث ترقی پاتا رہا لیکن کسی کی نظر لگ گئی۔ مشکل سے دو سال گزرے تھے کہ ایک معرکے میں بری طرح زخمی ہو گیا۔ میدانِ جنگ سے مراجعت اسے پھر صحافت کی طرف لے آئی۔ لڑائی ختم ہونے پر ملک کی اقتصادی

بدحالی نے ایک لمحۂ فکر دیا اور وہ اشتراکی نظام کی تکذیب کرتے ہوئے ایک نئے نظام کو فروغ دینے میں مصروف ہوگیا۔

اس نے ۲۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو صرف چالیس ساتھیوں کی حمایت پر میلان میں ایک نئی جماعت کی بنیاد رکھی جس کا مقصد ایک نئے انداز میں اقتصادی نظام مرتب کرنا تھا۔ دو سال بعد قومی انتخابات میں اس نے ایوان کی اڑتیس نشستوں پر قبضہ کرلیا۔ پھر بھی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی، شاید اس لیے کہ ملک کی عام فضا سازگار نہیں تھی۔ انقلاب برپا کرنے والی آندھیاں ہر سمت سے اٹھ رہی تھیں اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ طوفان کی صورت کب اختیار کرلیں گی۔ حتیٰ کہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو جب فاشی جماعت کا بڑا اجماع نیپلز میں ہوا تو اس وقت منظور ہونے والی ایک قرارداد کے بموجب چالیس ہزار اراکین نے ملک کے صدر مقام روم کی طرف کوچ کردیا۔ ظاہر ہے کہ اس مہم کی قیادت مسولینی کے سپرد تھی۔ اسی موقع پر قوم نے اسے ڈیوس (قائد) کا خطاب دیا۔ کمزور حکومت نے کوئی مدافعت نہیں کی۔ بادشاہ نے مسولینی کو وزیر اعظم مقرر کرتے ہوئے نئی حکومت بنانے کی دعوت دے دی۔ یہ رتبہ دباؤ کے ماتحت کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اپریل ۱۹۲۴ء میں انتخابات کے موقع پر اس کی جماعت نے باقاعدہ اکثریت حاصل کرکے اپنی برتری کا لوہا منوالیا۔ اسی سال پارلیمان میں بڑے ہنگامے رہے۔ مختلف جماعتیں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتی رہیں۔

آخر ۱۹۲۵ء میں مسولینی کو فوج کی مدد سے انقلاب برپا کرنا پڑ گیا اور وہ آمرانہ قوت کے ساتھ برسر اقتدار آگیا۔ پھر جیسا کہ ان موقعوں پر ہر ملک میں ہوتا ہے، مسولینی بھی مخالف جماعتوں کو برداشت نہ کرسکا۔ ان میں سے بعض کے سربراہ قید ہوگئے اور بعض نے ترکِ وطن کرنے میں سلامتی سمجھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر مسولینی نے اپنے عقائد کی ترویج میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ ملک کا اقتصادی نظام تو فاشیت کے زیر اثر آجانا ہی چاہیئے تھا لیکن اس کا اثر برابر کے ملکوں تک پھیلا۔ چنانچہ جرمنی میں ہٹلر کے نازیی نظام اور فاشیت میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔

شروع میں یہ دونوں ڈکٹیٹر ایک دوسرے کو سمجھ نہ سکے اور اسی لیے جب ہٹلر نے آسٹریا پر حملہ کیا تو مسولینی اپنی فوجیں لے کر آسٹریا کی سرحد پر آمر جرمنی کے خلاف

آکھڑا ہوا لیکن بہت جلد دونوں نے محسوس کر لیا کہ اگر دوسری مغربی طاقتوں کے اتحاد کے خلاف محاذ تیار کرنا ہے تو یہ حکمت عملی مفید نہیں رہے گی۔ مسولینی نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور جذبۂ تعاون کو دونوں طرف تسلیم کر لیا گیا۔ اسی لیے جب مسولینی نے حبشہ کو فتح کرنے کے لیے قدم بڑھایا تو ہٹلر نے بالکل غیر جانبداری کا اظہار کیا۔ دیکھا جائے تو یورپ کی ان بڑی طاقتوں کا اشتراک مجلس اقوام کے انحطاط کا اصل سبب تھا۔

مئی ۱۹۳۸ء میں ہٹلر کا دورۂ اطالیہ اور اس ملک میں اس کا شاندار خیر مقدم ساری دنیا کے لیے تہلکہ انگیز تھا۔ ان کی یہ دوستی دوسری جنگِ عظیم تک چلتی رہی۔ اور اگر یہ دونوں اپنی حدود کو اچھی طرح پہچان لیتے اور ایک دائرے میں رہ کر اقدامات سے کام لیتے تو آج ان کا بول بالا ہوتا اور یورپی ملکوں کے نقشے بالکل مختلف رنگوں میں ہوتے۔ لیکن یقیناً برصغیر پاک و ہند کی تقسیم عمل میں نہ آتی اور افریقی ملکوں کو آزادی کی جدوجہد میں قدم آگے بڑھانے کا موقع نہ ملتا۔ ان کی شاندار شکست پست اقوام کی فتح کا باعث بن گئی۔ دونوں ملکوں کے زوال نے بہت سی قوموں کو عروج دلایا۔ قدرت کا یہ بھی ایک عجیب نظام ہے۔ غالب نے صحیح کہا تھا ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے صورت اک خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

**آلسیس لورین:** جنوب مغربی جرمنی کی سرحد سے ملا ہوا فرانس کا ایک صوبہ ہے جس کا الحاق کئی بار جرمنی سے ہوا اور رشتہ ٹوٹ گیا اور یورپ کے اور کئی علاقوں کی طرح اس کی حالت بھی یہی رہی کہ کبھی مغربی سرحد کے حکمراں اس پر قابض رہے اور کبھی مشرقی سرحد کے۔ بالکل ایک طوائف کی طرح اس کا وجود سب کے لیے تھا اور خود اپنے لیے اس کی حیثیت کچھ نہیں تھی۔ ایک شہر پناہ کی طرح دریائے رائن اس کے مشرقی سرے کی پاسبانی تو کرتا رہا لیکن دریا کا مختصر سا پاٹ اس کے لیے سدِ سکندری کی حد تک بھی رکاوٹ نہ بن سکا۔ اس کا سب سے بڑا شہر اسٹراسبرگ ہے جو جرمنی کے علاقے سے محض چند میل کے فاصلے پر ہے اور چونکہ سارا صوبہ قیمتی معدنیات کا مخزن ہے، اس لیے حریص نگاہیں برابر اس پر پڑتی رہیں تاہم یہاں

جتنے باشندے فرانسیسی جانتے ہیں، ان سے زیادہ تعداد میں جرمن زبان کے دلدادہ اور ماہر ہیں۔ اس سے عوامی رجحانات کا پتہ ضرور لگتا ہے۔

عہدِ وسطیٰ میں اس علاقے کے بہت سے ٹکڑے ہو گئے تھے اور ہر علاقہ اپنی خود مختاری کا نعرہ لگا تا رہا تھا۔ فرانس نے اسے مستقل طور پر اپنے زیر نگیں رکھنے کے لیے ۱۵۵۲ء میں شدید جدّوجہد شروع کی۔ جرمنی کے ساتھ اس کی تیس سالہ جنگ کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اس کے بموجب وہ باقاعدہ فرانس کا حصّہ تسلیم کر لیا گیا۔ صرف اسٹراس برگ اس سے الگ رہا اور ۱۶۸۱ء میں اس کا بھی الحاق ہو گیا۔ فرانس کے فرمانرواؤں نے اس علاقے کے باشندوں کے حقوق کا ہر طرح خیال رکھا لیکن خود مختاری کی امنگ ان کے دل و دماغ میں کروٹیں لیتی رہی۔ حکومتِ فرانس کی طرف سے اعلیٰ امداد اعانت ملنے کے باوصف عوام کا دل اس کی طرف سے منحرف رہا اور محض باغیانہ خیالات کو تسکین دینے کے لیے وہ جرمنی کی طرف راغب رہے۔ ان میں سے بیشتر جرمن زبان بولتے اور جرمن طرزِ زندگی اختیار کیے رہے۔ چنانچہ جب انقلابِ فرانس برپا ہوا تو انھیں سابق فرمانرواؤں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ نئے اربابِ اقتدار نے ان کے مقامی حقوق سلب کر لیے۔ آلسیس اور لورین کو الگ الگ حیثیت دے دی گئی۔ اس سے حکومت کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ صرف آلسیس کے کچھ لوگ اس کے فرمانبردار ہو گئے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کو اچھی ملازمتیں دے کر حکومت نے ان کو اپنا لینا چاہا۔

آلسیس وہی علاقہ ہے جہاں ایک خونخوار کتّے کی نسل کو یورپ بھر میں بلکہ یورپ کے باہر بھی آلیشن کہا جاتا ہے۔ لورین کے لوگوں نے آلسیس کے انسانوں کو بھی آلیشن کہنا شروع کر دیا، کیونکہ ان کے نزدیک وہ بھی لالچی کتّے سے کم نہیں تھے۔ انھوں نے فرانس کے دسترخوان سے چند لقمے مل جانے پر اخلاقی زوال کا ثبوت دیا تھا۔ اس نفرت کے ساتھ ساتھ دونوں علاقوں کے الحاق اور فرانس سے علیحدگی کی تحریکیں چلتی رہیں۔

۱۸۷۰ء میں جرمنی اور فرانس کے مابین پھر لڑائی چھڑ گئی۔ اصل نتیجے سے غرض نہیں لیکن اس علاقے کی مراد بر آئی۔ اس نے جرمنی کے ساتھ اپنے رجحانات کا اظہار کیا۔ اور فرانس سے علیحدگی نصیب ہو گئی۔ اب ایک بار پھر مدرسوں میں جرمن زبان نصاب میں شامل کر لی گئی۔ بعض جگہ تو ذریعہ تعلیم ہی اس زبان کو قرار دے دیا گیا۔ ولیم اوّل اور

پھر بسمارک نے لسانی اور ثقافتی اعتبار سے کئی بار اس پر اپنا حق جتایا لیکن باقاعدہ کوئی مہم شروع نہیں کی۔

۱۹۱۱ء میں جب اس علاقے کا دستور العمل مرتب ہوا تو اس میں یہ شق رکھی گئی کہ اگر کسی منزل پر یہ علاقہ مناسب شرائط پر جرمنی کے ساتھ الحاق چاہے تو ایسا کر لیا جائے۔ اور چنانچہ ایسا ہو گیا۔ لیکن چند سال بعد پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ اس دوران میں فرانس کے سیاسی پروپیگنڈے نے کام کیا اور لوگ جرمنی سے منحرف ہونے لگے۔ اس صورتِ حالات کے پیشِ نظر جرمنی نے کچھ ظلم و ستم بھی ڈھائے اور جن باشندوں کو شرارت پسند کہا جا سکتا تھا، انھیں شہر بدر کر کے نظر بند بھی کیا گیا لیکن بازی کا رخ پلٹ جانے پر جہاں اور معاملات میں انقلاب رونما ہوا، اس علاقے کی حیثیت بھی بدل گئی۔ لہٰذا جب معاہدۂ صلح کی شرائط کی بموجب فرانسیسی فوجیں اس میں داخل ہوئیں تو تابِ مدافعت کسی میں نہیں تھی۔ یہ ہنگامی دور ختم ہوا تو پرانا جذبہ پھر رنگ دکھانے لگا اور دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے تک یہ صورت پیدا ہو گئی کہ جب جرمن فوجوں نے ادھر یلغار کی تو مدافعت کا ذکر تو کیا، انھیں خوش آمدید کہا گیا۔ لیکن یہ خوشی دیرپا ثابت نہیں ہوئی اور پھر یہ علاقہ فرانس کے زیرِ نگیں ہے۔ یہاں کی سیاست میں جو نشیب و فراز رہے ہیں، ان کے پیشِ نظر اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ صرف اعداد و شمار کا جہاں تک تعلق ہے جرمنی سے دلچسپی رکھنے والوں کی اب بھی اکثریت ہے۔

**بون یونیورسٹی**: گوڈس برگ کے چشموں اور شفاخانوں کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد کوئی دس بجے ہم واپس آ گئے۔ لیکن قلبِ شہر میں پہنچنے کے بجائے دوسری سمت میں بون یونیورسٹی دیکھنے چل پڑے جو شہر کے تقریباً مضافات میں واقع ہے۔ اس جامعہ میں جسے اپنی وسعت کے اعتبار سے بجائے خود ایک شہر کہا جا سکتا ہے، عام نصابی تعلیم کے علاوہ طبی اور سائنسی علوم کے مختلف موضوعات کی اعلا تعلیم دی جاتی ہے۔ سب سے زیادہ توجہ طب اور سائنس کے شعبوں پر مبذول کی جاتی ہے۔ گویا ان علوم میں ملک کے موجودہ نوجوانوں کو طاق کر دینے کا بیڑا اٹھایا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بھی مہیا ہیں اور سب سے زیادہ ملکی اور غیر ملکی وظیفے انہی علوم کی تحصیل کے لیے ملتے ہیں۔

ہمارے آج کے پروگرام میں اس یونیورسٹی کو ایک نظر دیکھنا پہلے سے شامل تھا۔ یہ ملک کی سب سے بڑی تو نہیں لیکن ایک اہم یونیورسٹی ہے۔ اس وقت تمام شعبوں اور جماعتوں کو ملا کر اس میں تقریباً ساڑھے سات ہزار طالب علم داخل ہیں۔ بون کی آبادی کے پیش نظر طلبا و طالبات کی یہ تعداد بہت زیادہ ہے۔ یونیورسٹی کے احاطے میں داخل ہوتے ہی کلیتہً علمی ماحول کا احساس ہونے لگتا ہے۔ صدر دروازے سے گھستے ہی جو میدان پڑتا ہے، اس میں درختوں کے نیچے طلبا عمیق مطالعہ میں نظر آئے۔ بعض تنہا تھے اور بعض ٹولیاں بنائے پڑھ رہے تھے۔ چونکہ پہلی ٹرم کے امتحانات قریب ہیں، اس لیے کلاسوں میں تعلیم کا سلسلہ بند ہے اور طلبا و طالبات کو ان کی مرضی کے مطابق اپنی اپنی کسر پوری کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ تاہم اس دوران میں جب بھی ضرورت پڑتی ہے، وہ اپنے پروفیسروں سے رجوع کر لیتے ہیں۔ محبوب بھائی اس زریں وقت کو ہماری معیت میں گزار رہے تھے۔

ہمارے استفسار پر انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی متوقع آمد کے پیش نظر ان دنوں اس طرح محنت کی تھی کہ اب نصابی کتب کے صفحات چاٹنے کی ضرورت باقی نہیں ہے۔

یونیورسٹی کی عمارتیں قدیم ہیں لیکن ان میں ساز و سامان سب نیا ہے۔ بعض عمارتیں بھی نئی ہیں لیکن وضع قطع کے اعتبار سے ان کو پرانی عمارتوں کا ہم رنگ کر دیا گیا ہے۔ طبیعات و مابعد الطبیعات، کیمیا و دواسازی، منافع الاعضا و تشریح البدن، نباتیات و حیوانیات سے لے کر جوہری طاقت کے اسرار و رموز کی چھان بین تک ہر چیز کا مطالعہ یہاں ممکن ہے۔

ہم نے سب سے پہلے فارماسیوٹیکل انسٹی ٹیوٹ کو دیکھا۔ یہ بالکل نئی عمارت میں قائم ہے، اس لیے آرام اور کام میں سہولت کا بدرجۂ کمال خیال رکھا گیا ہے۔ طلبا کے لیے اعلا درجے کی لیبارٹریاں ہیں اور آلات و سامان جو فارمیسی کی اعلا تعلیم کے لیے ضروری ہیں اور کیمسٹری میں بھی ان سے کام لیا جاتا ہے، سب یہاں موجود ہیں۔ ہم نے اب تک فارمیسی کی تعلیم کا اتنا بڑا ادارہ نہیں دیکھا ہے۔ انگلستان میں تو یقیناً ایسے ادارے موجود ہوں گے لیکن ان کے بارے میں ابھی کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ انھیں دیکھنا ابھی باقی ہے۔

ہمارے سامنے ایک فارمیسی کالج کے قیام کا پروگرام ہے اور ہم اسی خیال سے ایسے اداروں کو بغور دیکھ رہے ہیں۔ انشاء اللہ اپنے ہاں کراچی میں اور دہلی میں اعلا فارمیسی کالج قائم کریں گے چونکہ امتحانات کی وجہ سے پڑھائی کا سلسلہ بند تھا اس لیے تجربہ گاہوں کے کمرے طلبا سے خالی تھے اور ہم نے خوب گھوم پھر کر ہر چیز کو دیکھا۔ اس ادارے کی رُوحِ رواں ایک خاتون ڈاکٹر مسز رونک ہیں۔ انھوں نے ہمارے ذوق و شوق کو دیکھتے ہوئے خود بھی دل چسپی لی اور ہر چیز پر اچھی طرح روشنی ڈالی اور ہر کام کو تفصیل کے ساتھ سمجھایا۔ برادر عزیز محبوب الٰہی نے دو سال اسی ادارے میں فارمیسی کی تعلیم پوری کی ہے اور اب کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہم نے ان کے کام کے کمرے دیکھے جہاں وہ دواء الشفاء بوٹی کے الکلائڈ نکالنے پر کام کر رہے ہیں۔ اگر انھیں کامیابی ہوگئی تو دواء الشفاء بوٹی سے ایک نیا جوہر مل جائے گا اور برادر عزیز اس میدان میں انشاء اللہ شہرت پائیں گے۔

ہم بون یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقی کے ادارے میں گئے تو یہاں پروفیسر ایلیشنبز سے ملاقات ہوئی جو ادارے کے ڈائرکٹر ہیں۔ وہ جرمنی میں اور بیس سال قبل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عربی شعبے کے انچارج رہ چکے ہیں۔ یہاں پروفیسر موصوف نے اسلامیات پر اپنی لائبریری دکھائی۔ بہت اچھا ذخیرہ جمع کیا گیا ہے چونکہ ان سے ہمارا تعارف معالجین کی حیثیت سے ہوا تھا، اس لیے انھوں نے خیال کیا کہ اسلامیات میں ہماری دل چسپی خواہ مخواہ ہے۔ وہ ہم کو بعض نادر کتابیں بھی دکھاتے رہے۔ لیکن اشارتاً وہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ ہمیں صرف طبی اور سائنسی شعبے دیکھنے چاہئیں۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ مشرقی علوم کا ادارہ دیکھنا ہمارے پروگرام میں پہلے سے شامل نہیں تھا اور نہ اس کی اطلاع ہم نے کی تھی۔ اس لیے ان کی مصروفیت کہیں اور تھی اور وہ جانے ہی والے تھے کہ ہمیں دیکھ کر رک گئے۔ اس قربانی پر ہم نے بطور خاص ان کا شکریہ ادا کیا۔

دراصل ہم مجاہد حسین صاحب زیدی کی تلاش میں ادھر آنکلے تھے جو دہلی کے ہیں اور یہاں اسلامیات پر ڈاکٹریٹ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ چونکہ اطلاع نہیں تھی، اس لیے ان کا نہ ملنا تعجب خیز نہیں تھا۔ اگر وہ مل جاتے تو شاید ہم کچھ زیادہ وقت

اس ادارے میں صرف کرنے اور کچھ مفید حوالے مل جاتے اور آئندہ کام آتے۔ ہم نے "قطب اور اسلام" کے موضوع پر یہاں پندرہ بیس کتابیں دیکھیں۔ ان کے نام نوٹ کر لیے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی پتہ چلا کہ ان میں سے بعض کتابیں کسی کتب فروش سے نہیں ملتی ہیں۔ ان کی چھپائی بند ہو گئی ہے۔ یا تو پرانی کتابوں کی کسی دکان میں ان کو ڈھونڈا جائے یا پھر کسی اور لائبریری کا سہارا لیا جائے۔ اپنے ملک میں شاید یہ بالکل ہی ناپید ہوں۔ اپنے علم میں ایسی کوئی لائبریری نہیں ہے۔

یونیورسٹی کے کچھ اور شعبے بھی دیکھے اور جب ان سے فارغ ہو کر شہر میں آئے تو بری طرح بھوک لگ رہی تھی۔ یہ معاملہ زبردست کشمکش کا ہے۔ بھوک کا لگنا ایک قدرتی بات ہے لیکن پیٹ بھرنا یا کچھ نہ کھانا اپنے ہاتھ میں ہے۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ کھائے بغیر زندہ رہنا مشکل بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کھانے کا مسئلہ ایک مہینے سے پیچیدگی اختیار کرتا جا رہا ہے۔ کیا کھائیں کیا نہ کھائیں۔ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے یہ کس چیز سے بنا ہے۔ اسے کس چیز میں تلا ہے۔ یہ شکوک تو ہمیں کھائے جا رہے ہیں۔ لہٰذا میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ آج ہی ایک خط حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو اور ایک خط خان بہادر حبیب الرحمٰن صاحب کو لکھوں گا۔ مولینا موصوف سے براہ راست فتویٰ منگایا جائے گا کہ یورپ کی سیاحت کرنے والے مسلمان، جن کو یقین کے ساتھ معلوم نہ ہو کہ ہوٹلوں میں کیا کچھ گھال میل ہوتا ہے، کیا طریقہ اختیار کریں۔ ظاہر ہے کہ وہ مستقل روزہ رکھنے کا مشورہ نہیں دیں گے۔ اور نہ ایسی چیزیں کھانے کے لیے کہیں گے جن میں غذائیت کی کمی انسانی صحت کو تباہ کر دے۔ خان بہادر صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ حضرت ملا واحدی سے مشورہ کر کے لکھیں۔ انھیں حضرت خواجہ حسن نظامی اور مولینا محمد علی مرحوم کی زبانی یہ ضرور معلوم ہوا ہو گا کہ مشرق کے مسلمان یورپ میں سفر کرتے ہوئے کیا کھاتے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے یورپی ملکوں کے سفر کئے ہیں اور اپنی دقتوں کا ذکر ملا واحدی سے کیا ہو گا اور ضرور اس کا حل بھی بتایا ہو گا۔ ان کے جواب کی توقع دس دن بعد کی جا سکتی ہے۔ اس لیے پتہ ان کو ایسے ملک اور شہر کا لکھا جائے گا جہاں ہم اپنے راہ نامے کے مطابق دس دن بعد سفر کر رہے ہوں گے۔

زندہ رہنے کے لیے غذا بہر نوع ضروری ہے، اس لیے چند جائز قسم کی

چیزوں پر اکتفا کر کے ہم بہت جلد ریستوران سے باہر آ گئے۔ کیونکہ وہاں کا ماحول بھی ہمارے لیے دل پسند نہیں تھا۔ ہم کچھ دیر ایک پارک میں بیٹھے اور وہیں نماز ظہر ادا کی ہوا اتنی عمدہ چل رہی تھی کہ غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس لیے وہاں سے اٹھ کر ذرا بازاروں کی سیر کی یہ فیصلہ تھا کہ کوئی چیز خریدی نہیں جائے گی کیونکہ ہمارے پاس سامان کی مقدار بڑھ رہی تھی۔ پھر سب سامان کو ساتھ رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ کرایہ ادا کیا جائے۔ اس طرح اگر حساب پھیلایا جائے تو وطن پہنچنے تک ہر چیز کی قیمت دس گنی ہو جائے گی۔ لہٰذا مزید خریداری کا خیال تو دل سے نکال دیا تھا لیکن بازاروں کی سیر کرنے اور مصنوعات پر ایک نظر ڈال لینے میں کیا مضائقہ تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے بھی تھا کہ بیتھوون کا عجائب گھر کھلنے کا وقت ہو جائے جسے دیکھنے کا پروگرام تھا اور جو ۳۰ بون گاسے پر واقع ہے۔ جب کسی خاص لمحے کا انتظار ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزر ہی نہیں رہا اور گھڑیاں بہت سست چل رہی تھی۔ بہر حال چار بج گئے اور ہم بون گاسے پہنچ گئے۔

**بیتھوون** لڈوگ فان بیتھوون —— جرمنی کا سب سے بڑا خالق نغمات جس کا ثانی باقی یورپ بھی پیش نہ کر سکا اور جو مرنے کے بعد شہرۂ آفاق ہو گیا، اسی بون میں ۱۶ دسمبر ۱۷۷۰ء کو پیدا ہوا تھا۔ اس کے آبا و اجداد جرمن نژاد نہیں تھے۔ اس کے پردادا بلجیم کے شہر لووین کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ۱۶۵۰ء میں وہ وطن سے نکلے اور اینٹورپ میں آباد ہو گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ موسیقی سے ان کو قدرتی لگاؤ تھا اور اس فن کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ بہت جلد انھیں دربار میں رسائی ہو گئی اور وہ شاہی موسیقار مقرر کر دیے گئے۔ اس علاقے کا دارالسلطنت اس وقت کولون تھا جو بون سے صرف چند میل کے فاصلے پر ہے۔ اس لیے بہت سے لوگ اس وقت بھی بون میں رہتے اور حسب ضرورت کولون چلے جاتے تھے۔

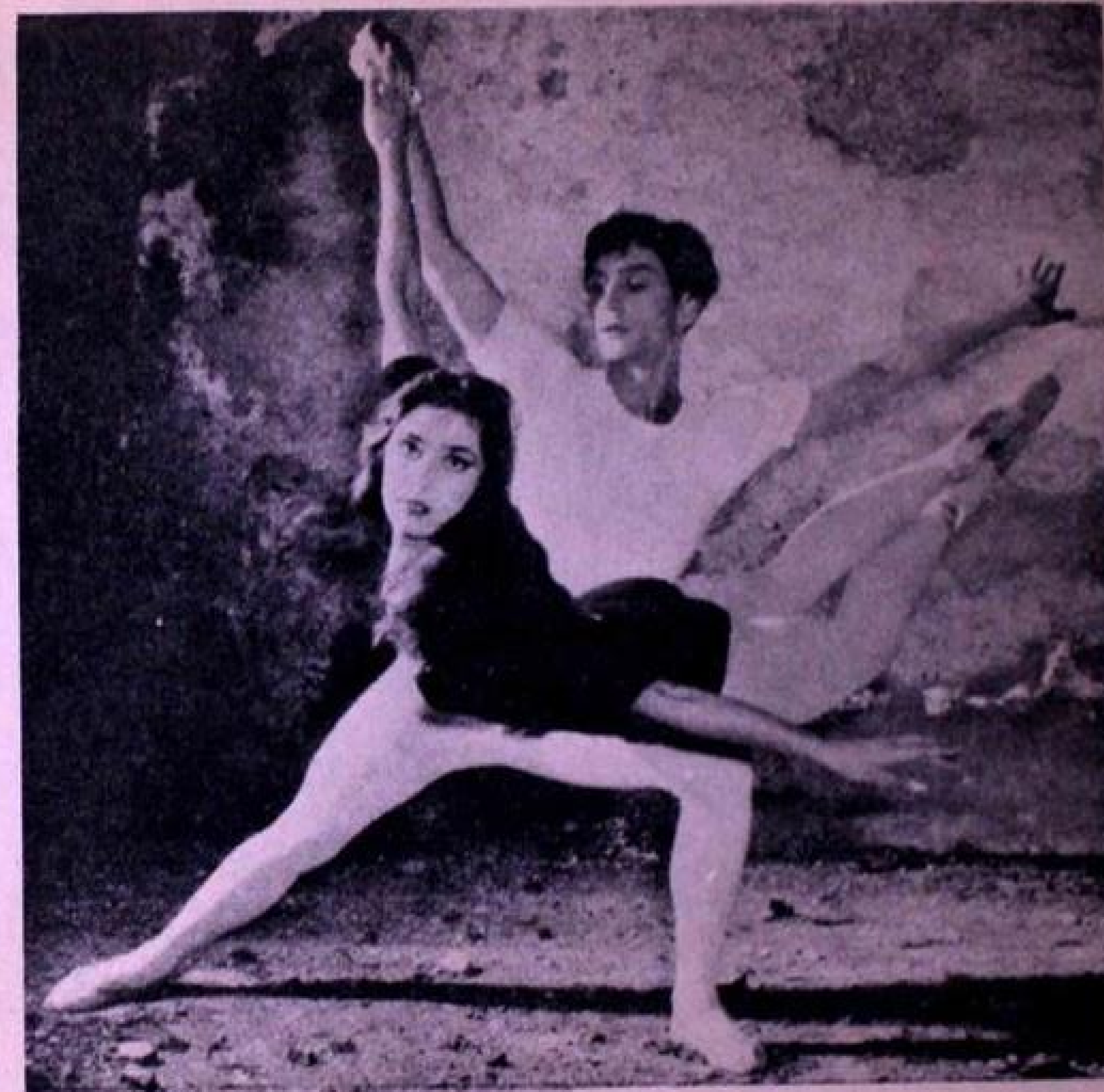
بیتھوون کے باپ کو موسیقی کا فن لطیف ورثے میں ملا تھا لیکن اپنی ترش مزاجی کی وجہ سے وہ سرکاری حلقوں میں زیادہ مقبولیت نہ پا سکا۔ بیتھوون کی ماں جو سوتیلی تھی، محل کے زنانہ حصے میں نجی خدمات انجام دیتی اور عموماً کم سن لڑکے کو ساتھ لے جاتی تھی۔ جب بیتھوون ذرا بڑا ہوا تو باپ نے بیٹے کو خود موسیقی کی تعلیم دینی شروع کی اور آلاتِ موسیقی میں سے رباب کو خاص ترجیح دی۔ اس کے علاوہ گیتوں سے

اسے بڑی دل چسپی تھی۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی تک بندی کا ارادہ کیا، لیکن اتفاق سے اس کی تک بندی بڑی جاندار چیز ثابت ہوئی۔ اس کی پہلی ہی کوشش کامیاب رہی اور اپنے ساتھ اسے لے اڑی۔ یہ ۱۷۸۳ء کا ذکر ہے جب کہ اس کی عمر صرف ۱۳ سال تھی۔ اگلے ہی سال باپ کے ساتھ ساتھ اسے بھی شاہی آرکسٹرا میں شامل کر لیا گیا۔ فہرست میں اس کے باپ کا نام آٹھویں نمبر اور خود اس کا چودھویں نمبر پر رکھا گیا۔ پرانے مغنیوں کے مقابلے میں یہ بہت بڑی جیت تھی اور یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ کبھی یہ نام سرِ فہرست ہو جائے گا۔

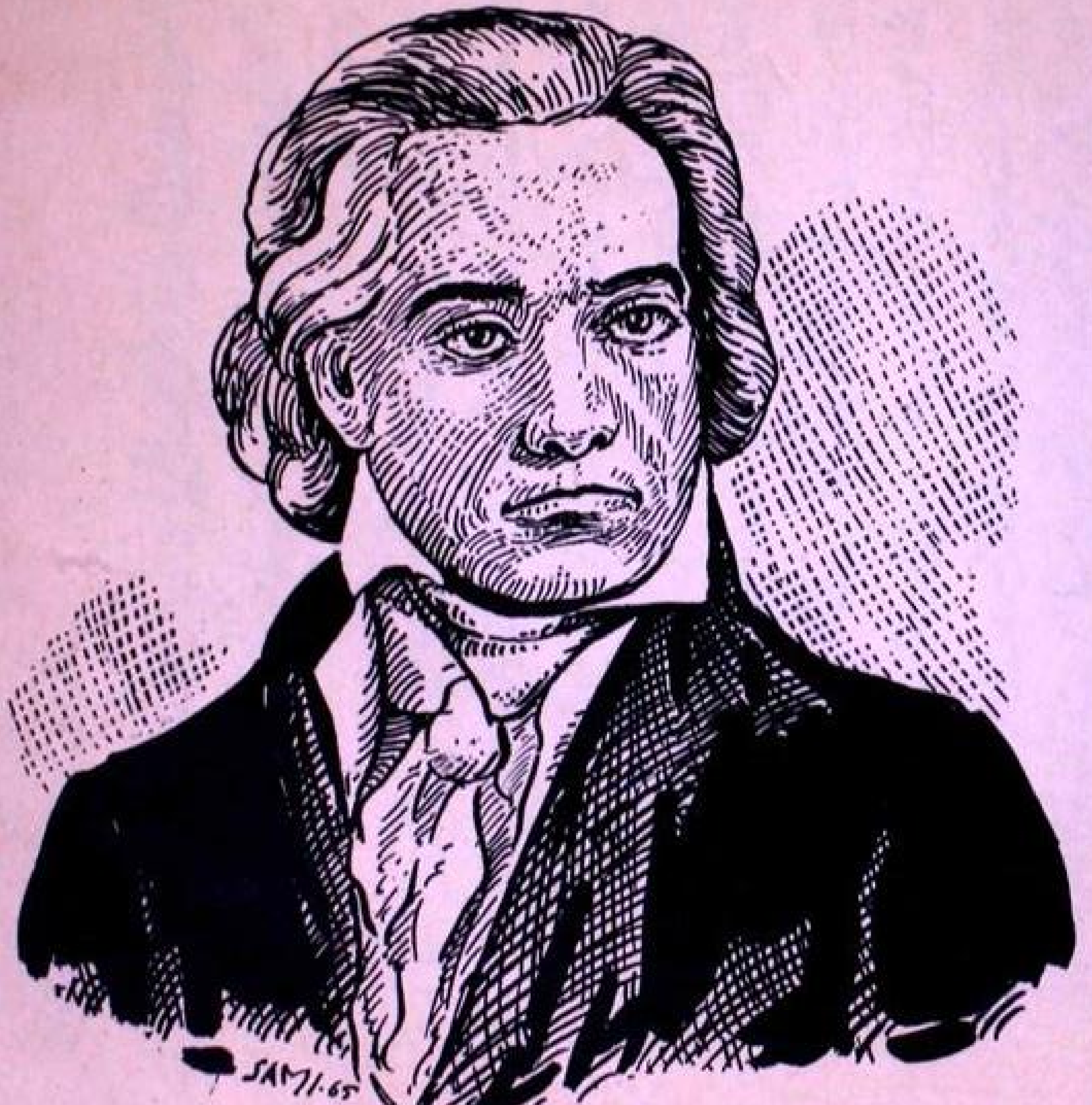
۱۷۸۷ء میں وہ ایک مختصر دورے پر آسٹریا گیا اور وہاں کے مشہور موسیقار موزارٹ سے ملا۔ موزارٹ نے آزمائش کے طور پر اسے ایک نئی دُھن بجانے کے لیے کہا۔ ذرا سی دیر میں بیتھوون نے سُر نکال لیے اور راگ کو ایسے کمال کے ساتھ پیش کیا کہ موزارٹ جیسا فن کار بھی اس کا قائل ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیتھوون کچھ عرصے وہیں اس کی نگرانی میں رہ کر تربیت حاصل کرے لیکن ماں کی شدید علالت اسے وطن واپس لے آئی جو تین ماہ بعد مر بھی گئی۔ بیتھوون کی سوتیلی بہن کے طور پر اس نے ایک چھوٹی سی بچی چھوڑی۔

کچھ عرصے سے اس کے باپ کے اطوار بگڑے ہوئے تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ نشہ کرنے لگا تھا۔ ان حالات میں سرکاری حکم ہوا کہ پنشن کی رقم اسے نہ ملے بلکہ بیتھوون کو دی جائے۔ جو دراصل پندرہ سال کی عمر سے اپنے غریب گھرانے کا کفیل تھا۔ اس رعایت کے علاوہ شاہی خزانے سے اس کی تنخواہ میں اضافہ بھی کر دیا گیا۔ نیز یہ اجازت مل گئی کہ دربار کے علاوہ کہیں وہ اپنا کمال دکھانا چاہے تو دکھا سکتا تھا اور معاوضہ لے سکتا ہے۔ ان مراعات سے اس کی حالت کسی قدر سدھر گئی، وہ عام مجمعوں میں نہیں، صرف رؤسا کی محفلوں میں باریاب ہونے لگا۔ انھی دنوں حکومت نے اس کے نام سے پہلے ''فان'' لکھنے کا اختیار بھی دے دیا اور اس طرح اس کا پورا نام لڈوگ فان بیتھوون ہو گیا۔ یہ اعزاز ملنے پر اسے ایک بار پھر آسٹریا کا دورہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس بار اس کے کمالات کی جولانگاہ زیادہ وسیع رہی۔ آسٹریا کے نواب اور دوسرے امراء اس زمانے میں موسیقی کے دلدادہ ہونے کے ساتھ فراخ دل بھی

# رقص و موسیقی



جرمنی میں بیلے رقص کا ایک منظر




جرمنی کا شہرۂ آفاق نغمہ ساز بیتھوون

تھے۔ انھوں نے دل کھول کر اس پر رقمیں نچھاور کیں اور وہ مالا مال ہو کر واپس آیا اور جب کسی غیر ملک میں انسان کی قدر ہونے لگے تو پھر وطن میں بھی قسمت زیادہ مہربان ہو جاتی ہے۔

بیتھوون نے ہیڈن تک سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ یہ بھی ویانا کا ایک مشہور نغمہ ساز اور موزارٹ سے زیادہ باکمال موسیقار تھا۔ جولائی ۱۷۹۲ء میں وہ یورپ کے کئی ملکوں کے سفر سے فارغ ہو کر آسٹریا واپس جاتے ہوئے جرمنی سے گزرا تو چند دن کے لیے بون میں ٹھیر گیا۔ اس نے بیتھوون کی تعریف سنی تھی اور ملنے کا اشتیاق تھا۔ ایک مختصر سی نشست کی صورت میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور پہلی ہی بار ہیڈن بے حد متاثر ہو گیا۔ اس نے فرمانروائے کولون سے درخواست کی کہ اپنے اس درباری مغنّی کو میرے ساتھ بھیج دیا جائے تاکہ میں اسے مزید تربیت دے کر ہر اعتبار سے طاق کر دوں۔ اس وقت بیتھوون کی عمر ۲۲ سال اور ہیڈن کی تقریباً ۷۱ سال تھی۔ موقع غنیمت تھا اور بیتھوون نے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

اسی دوران میں موزارٹ کا انتقال صرف ۳۶ سال کی عمر میں ہو گیا۔ یہ بیتھوون کے لیے بھی ایک سانحہ تھا کیونکہ وہ اپنے پہلے دورے کے وقت سے اس کی قدر کرنے لگا تھا۔ بون کے مقابلے میں ویانا کی فضا موسیقاروں کے لیے زیادہ سازگار تھی اور موزارٹ کے مرنے سے جو خلا پیدا ہوا تھا، اسے پُر کرنا بھی مقصود تھا۔ اس لیے بیتھوون سے کہا گیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لے۔ اس نے یہ نیک مشورہ بلا تامل قبول کر لیا۔ چنانچہ اس کے بے مثل گیت اسی غیر سرزمین پر لکھے گئے جو اس کو اس فنِ لطیف کی دنیا میں غیر فانی بنا دینے کے لائق تھے۔

۱۷۹۸ء میں اسے ثقلِ سماعت کی شکایت لاحق ہو گئی جس کا احساس اسے اتفاقاً ہوا۔ اس کی تفصیل خود اسی کی ایک تحریر میں شامل ہے۔ ایک روز وہ چند احباب کے ساتھ شہر کے باہر کھلے میدان میں تفریح کر رہا تھا کہ اس کے ساتھی ایک چرواہے کی بانسری سن کر سر دھننے لگے جو ذرا دُور پہاڑیوں میں اپنا ریوڑ ہنکاتے ہوئے بجاتا جا رہا تھا۔ بیتھوون نے حیرت کا اظہار کیا کیونکہ وہ کچھ بھی نہیں سن سکا تھا۔ یہ شکایت بڑھتی رہی اور ایک دن آیا جب کہ وہ نزدیک کی آواز بھی

نہیں سُن سکتا تھا۔ وہ بالکل بہرا ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی اس محرومی کو ایک عرصے تک عوام سے چھپایا۔ صرف قریبی دوستوں کو راز معلوم تھا۔ لیکن کب تک ایسا ممکن تھا۔ رفتہ رفتہ دنیا کو معلوم ہوگیا کہ جرمنی کا مشہور خالقِ نغمات ایک عالم کو اپنی دلپذیر تانوں سے محظوظ کرنے کے باوجود خود لطف اندوز ہونے سے معذور رہے۔ یہ ۱۷۹۸ء کا ذکر ہے۔ گویا ۲۶ مارچ ۱۸۲۷ء کو انتقال سے ۲۸ سال پہلے یہ شکایت لاحق ہوئی اور اتنی مدت تک وہ خود ناشنیدہ نغمے دوسروں کو سناتا رہا۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں اس نے بہت علاج معالجے کرائے۔ مستند طبیبوں سے لے کر عطائیوں تک سبھی کو آزمایا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ صرف آخر عمر میں کہ جب ایک مدت گزر جانے کے بعد وہ اپنی آواز کے زیروبم کو محسوس کرنے سے بھی عاجز ہو گیا تو کبھی کبھی بے سُرا ہونے لگا تھا۔ اصلیت سے واقف لوگ اس کی حالت پر اظہارِ افسوس کرتے جس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ اور ناواقف حیران رہ جاتے تھے کہ آخر اس کا سبب کیا ہے۔

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ وہ عشق و محبت کے معاملے میں بالکل بے لگام واقع ہوا تھا۔ لیکن سوچا جائے تو یورپ میں ایسا کون نہیں ہوتا۔ وہاں ان کا معاشرہ انسان کو جس منزل پر لے گیا ہے، بیتھوون اپنے عہد کے اعتبار سے اس سے بہت پیچھے تھا۔ پھر اگر عیاشی کی سزا بہراپن ہوسکتی ہے تو مغربی دنیا کے سارے باشندے سماعت سے محروم کیوں نہیں ہیں جبکہ ان کی نفس پرستی کی داستانیں بیتھوون کے رومانی قصّوں سے کہیں زیادہ نفرت انگیز اور لائقِ احتساب ٹھیرائی جا سکتی ہیں۔

بیتھوون کو ایک نوابزادی کاؤنٹس جوزفین ڈیتم سے خاص النسبت تھی۔ اس نے اپنے پہلے شوہر کے انتقال کے بعد ایک اور رئیس کاؤنٹ اسٹیکل برگ سے شادی رچالی تاہم بیتھوون سے اس کی دل چسپی کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی بنیاد پر اس کے بعض معاصرین کی رائے ہے کہ اس نوابزادی کی دوسری شادی کے بعد جو تیسرا بچہ پیدا ہوا، وہ دراصل بیتھوون کا تھا۔ یورپ کی تہذیب میں یہ کوئی نرالی اور حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ اور اسی پر کیا منحصر ہے، اس کے بعد بیتھوون کو امالی سیبالڈ نامی ایک اور خاتون سے محبت ہو گئی۔ اس تعلق کا بھی ایک نقش اس وقت کے معاشرے پر ثبت ہے۔

کچھ لڑکیاں ایسی بھی تھیں جو اس کی شبستان عیش میں عارضی طور پر شامل ہوئیں اور پھر نئی راہ پر چل پڑیں۔ یورپ نے عام معیار اخلاق کا جو پیمانہ مقرر کر دیا ہے، آخر بیتھووین کے کردار کو اس سے کیوں نہ جانچا جائے؟

**عجائب گھر:** بیتھووین کے اس خاندانی مکان کو جہاں وہ پیدا ہوا اور پروان چڑھا، قوم کے نام وقف کر کے عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔ وہ ایک بارونق علاقے میں واقع ہے۔ ہم اس کے کھلنے کے صحیح وقت پر پہنچ گئے اور اس لیے سب چیزوں کو جو تعداد میں بہت زیادہ نہیں ہیں، اطمینان سے دیکھ سکے۔ ایک نجی کمرے میں جہاں سونے کی مسہری اور لکھنے کی میز کرسیاں رکھی ہیں، الماریوں میں اس کے ملبوسات کی نمائش بھی کی گئی ہے اور انھیں مختلف ادوار کے حساب سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ایک کمرے میں اس کے بہت سے ساز قرینے سے رکھے گئے ہیں جو اس نے مختلف اوقات میں مختلف ملکوں میں رہ کر بجائے تھے۔ ان متعلقات میں بعض سازوں کے ٹکڑے اور ٹوٹے ہوئے تار بھی شامل ہیں۔ ان سازوں میں تھوڑا سا فرق و امتیاز قائم کیا گیا ہے جو اس نے خریدے اور وہ جو اسے تحفے کے طور پر دیے گئے تھے۔ ہر چیز کے ساتھ رکھی ہوئی چٹ پر اس کی تاریخ اور داستان درج ہے۔

ایک تیسرے کمرے میں اس کے بے شمار گیتوں کے اصل مسودے اور طبع شدہ نقلیں موجود ہیں۔ گیتوں پر نظر ثانی کے بعد جو نئے مسودے تیار ہوئے ان کی نمائش اسی اعتبار سے کی گئی ہے تاکہ فن کے قدردان اس کے ذہنی ارتقا کا اندازہ لگا سکیں۔ ابتدائی دور میں اس کے بعض گیتوں پر اصلاح ہوئی تھی، اسے چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی کیونکہ یہ کوئی عیب نہیں ہے جس پر پردہ ڈالنا ضروری ہو۔ اسی حصے میں بہت سی تصویریں بھی دیواروں پر خوب صورت چوکٹوں میں آویزاں ہیں جن کی نقاشی ماہر فن کاروں نے دوران عمل ہی کی تھی۔ اس کی بعض ان محبوب ہستیوں کو بھی یہاں بے نقاب کیا گیا ہے جن کی چاہت اسے صحیح معنوں میں فن کار بنانے میں ممد و معاون رہی تھی۔ یہیں ان ہستیوں کے نام یا ان کے لکھے ہوئے خطوط کی نمائش بھی کی گئی ہے جو اس کی نجی زندگی کو سمجھنے میں کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ خطوط کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ خدا جانے اس کے قدردان

کن کن ذرائع سے ان کو نکال لائے ہیں۔ ان کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے۔ ۱۷۸۷ء سے ۱۸۲۷ء تک کے درمیان لکھے ہوئے ان خطوط کی تعداد ایک ہزار پانچسو ستر کے قریب ہے۔ ان پر بڑی محنت بھی کی گئی ہے یعنی ان کا ایک اشاریہ تیار کیا گیا ہے جس پر نظر ڈال کر ہر خط کے مکتوب الیہ اور نفس مضمون کو اور اس میں مذکور دوسری باتوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خطوط کے علاوہ ایسے تنقیدی مضامین بھی یکجا کئے گئے ہیں جو اس خالق نغمات کی تعریف میں مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کے ترجمے بھی موجود ہیں۔ ایمیلی اینڈرسن نامی ایک خاتون نے مسلسل پندرہ سال کام کیا، تب کہیں ترتیب و تالیف اور ترجمے کی منزل پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ان سب نوادر کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی اور اس بات کا افسوس ہا کہ ان میں سے بعض کا بالاستیعاب گہرا مطالعہ کرنے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔

**کونرڈ آڈنائر:** بیتھوون عجائب گھر سے نکل کر ہم بڑی سڑک پر آئے تو ہم نے محسوس کیا کہ بازار کا رنگ کچھ بدلا ہوا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ سڑک پر کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔ پھر یہ کہ دونوں جانب پٹریوں کے قریب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پولیس والے پہرہ دے رہے تھے۔ علاوہ ازیں چلتے ہوئے لوگ پٹریوں پر رک گئے تھے۔ ہمیں خیال ہوا کہ کسی کی سواری یہاں سے گزرنے والی ہے۔ یہ خیال صحیح تھا۔ پتہ چلا کہ وفاقی حکومت کے چانسلر ڈاکٹر کونرڈ آڈنائر گزرنے والے ہیں۔ ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہم بھی رک گئے اور دیکھا جائے تو یہ بھی ضروری تھا کیونکہ سڑک پر کوئی گاڑی چل نہیں سکتی تھی اور اسے عبور تک کرنا ممکن نہیں تھا۔ دو تین منٹ بعد پانچ پولیس والوں کا ایک ہراول دستہ موٹر سائیکلوں پر گزرا اور اس کے فوراً بعد بڑے سائز کی سیاہ مرسیڈیز کار میں چانسلر اور ان کے فوجی سکریٹری بس پلک جھپکاتے میں سامنے سے گذر گئے۔ وہ اپنے دفتر سے گھر جا رہے تھے۔ ان کی کوٹھی شہر سے کچھ دور مضافات میں دریائے رہائن کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع ہے جسے رھونڈورف کہتے ہیں۔ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ پہاڑی کے دامن میں وہ گاڑی سے اتر جاتے اور

اٹھتر سیڑھیاں طے کرکے اپنی کوٹھی میں پہنچتے ہیں۔ وہ چاہتے تو ایک چکردار راستہ جیسا کہ اکثر پہاڑیوں پر جانے کے لیے ہوتا ہے، دامن سے کوٹھی تک پختہ بنایا جاسکتا تھا۔ لیکن انھوں نے سیڑھیوں پر چڑھنے کو ترجیح دی ہے۔ ۱۹۴۹ء سے یعنی جب سے وہ چانسلر ہوئے ہیں، اب تک ان کا یہی معمول ہے۔ اٹھتر سیڑھیوں سے اترنا آسان لیکن چڑھنا مشکل ہے، خصوصاً جب کہ ان کی عمر اس وقت اناسی سال ہے اور قومی زوال کے رنج وغم نے انھیں کافی نڈھال بھی کر رکھا ہے۔ قومی پارلیمان میں جب بھی کسی موضوع پر بحث وتمحیص ہوتی ہے، وہ اپنی گرمیِ گفتار سے مخالفین کا بازار سرد کر دیتے ہیں، لیکن یہ نوبت شاذونادر ہی آتی ہے کیونکہ وہ اراکین پارلیمان میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ حزبِ اختلاف کبھی کبھی ان کی کسی بات پر اعتراض کرتا ہے۔

وہ جنوری ۱۸۷۶ء کو کولون میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ صحیح معنوں میں اُن کا خاندان اتنا غریب تھا کہ ایک بار کم سنی کے عہد میں کرسمس کے تہوار کے موقع پر وہ بڑے دن کا روایتی درخت خریدنے سے معذور تھے۔ لیکن اپنا شوق پورا کرنے کے لیے انھوں نے یہ ترکیب نکالی کہ چار ہفتے تک اتوار کے روز گوشت نہیں کھایا اور اس طرح جو رقم بچی اسے جمع کرکے درخت خرید لیا تاکہ پڑوس کے بچوں اور دوسرے رشتہ داروں میں سبکی نہ ہو۔ عزتِ نفس کا یہ احساس بھی ان کی آئندہ زندگی میں اپنا رنگ جمائے رہا۔

زمانۂ طالب علمی ہی میں انھیں ادب، سیاسیات، اقتصادیات اور قانون سے خاص دلچسپی رہی۔ وہ میونک، فریبرگ اور بون میں تعلیم پاتے رہے۔ اور ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد انھوں نے باقاعدہ وکالت شروع کر دی لیکن اس پیشے کو چھوڑ کر انھوں نے سیاسی میدان میں قدم رکھا اور بلدیہ کے انتخابات میں شریک ہو کر کامیاب ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ کولون کے نائب امیر بلدیہ ہوئے اور اس کے بعد بھی ہر بار اتفاقِ رائے سے منتخب ہوتے رہے اور اس عہدے پر قابض رہے ۱۹۱۷ء میں وہ امیر بلدیہ ہو گئے۔ یہ اعزاز اگلے سولہ سال تک کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔

۱۹۳۳ء میں جب ہٹلر اور اس کی جماعت کو اقتدار نصیب ہوا تو چند اصولی باتوں کی بنیاد پر ان سے بدمزگی ہوگئی اور انھیں کچھ عرصے کے لیے سیاست سے کنارہ کش ہو جانا پڑا۔ ہٹلر کے دست راست فیلڈ مارشل گوئرنگ نے منجملہ اور بہت سی ذمہ داریوں کے یہ عہدہ بھی سنبھال لیا۔ نازی حکومت سے اختلاف رکھنے کے باعث انھیں دوبارہ قلیل مدت کے لیے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی اور پھر دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے تک رھونڈورف والی اپنی کوٹھی میں خاموش زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کی طبیعت اپنی فطری افتاد کے باعث برسرِ اقتدار جماعت سے کسی طرح بھی میل نہ کھا سکی۔ وہ دن بھر مطالعہ میں اور شام کے وقت کوٹھی کے باغیچے کی دیکھ بھال میں مصروف رہنے لگے۔ انھیں گلاب کے تختے لگانے اور سنوارنے سے خاص دلچسپی تھی۔

لڑائی چھڑی اور شہر پر بمباری ہونے لگی تو دوسروں کی طرح انھیں بھی اپنی قیام گاہ کو جو بہت ہی نمایاں تھی، خیرباد کہہ کر کہیں اور پناہ گزیں ہو جانا پڑا۔ یہ دور بھی خاموشی اور سیاست سے بے تعلقی کا تھا لیکن دنیا میں بدخواہوں کی کمی نہیں ہوتی۔ انھیں موقع سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کو نقصان پہنچانے میں مزا آتا ہے۔ جھوٹ سچ ملا کر اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے خلاف بھی زہر اُگلنے کے لیے بعض لوگ تاک میں لگے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں جب ہٹلر کو قتل کرنے کی سازش پکڑی گئی تو بدخواہوں نے ان کا نام بھی لیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اور بہت سے بے گناہوں کے ساتھ انھیں بھی بیوی بچوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ دو ماہ تک خوب پوچھ گچھ ہوتی رہی لیکن جب ان پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا تو انھیں چھوڑ دیا گیا۔

پھر لڑائی کا رنگ بدلا اور اتحادی برسرِ اقتدار آ گئے تو ان کی تلاش شروع ہوئی اور انھیں ڈھونڈھ نکالا گیا۔ مئی ۱۹۴۵ء میں امریکی افسروں نے ان سے ملاقات کی اور تبادلۂ خیالات کے بعد انھیں گاڑی میں بٹھا کر بہت شان کے ساتھ بلدیہ ہال میں لے گئے اور ان سے کہا کہ آپ ایک بار پھر اس شہر کے لارڈ میئر بن جائیے۔ اس شہر کے، جسے خود اتحادیوں، خصوصاً امریکیوں کی بمباری نے تباہ کر دیا تھا۔ یہ دور زیادہ عرصے نہ چل سکا۔ کیونکہ ملک کی تقسیم کے بعد یہ حصہ برطانیہ کے زیرِ نگیں آیا اور انگریزوں کو

ان سے یہ شکایت ہوئی کہ وہ ہمارے ساتھ پوری طرح تعاون نہیں کرتے۔ اسی بنا پر انھیں اس عہدہ سے الگ بھی کر دیا گیا۔ یہ مذموم حرکت ان کے پندار کو ٹھیس لگانے کے لیے کافی تھی۔ انھوں نے باقاعدہ اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے اس واقعہ کے بعد ایک سیاسی جماعت کرسچین ڈیموکریٹک یونین کے نام سے بنالی اور اگلے ہی سال جب عام انتخابات عمل میں آئے تو ان کی جماعت کے اراکین نے بیشتر نشستوں پر کامرانی حاصل کرلی۔ یہ انتخابات ۱۹۴۹ء میں ہوئے تھے۔ انھیں وفاقی جمہوریہ کا چانسلر بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں بھی وہ اتفاقِ رائے سے اس منصب پر قائم رہے اور جو مقبولیت اس وقت انھیں حاصل ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اگلے سال نئے انتخابات ہوں گے۔ شاید ہی کوئی ان کے مدِ مقابل آنے کی کوشش کرے اور اگر کسی نے ایسا کیا بھی تو اسے یقیناً ناکام ہونا پڑے گا۔

ان کی متاہل زندگی کافی خوش گوار رہی ہے۔ ان کی پہلی بیوی کا جس سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے، ۱۹۱۷ء میں انتقال ہوگیا تو وہ ایک عرصے تک بالکل مایوسی کی زندگی گزارتے رہے۔ پھر دوسری شادی کرلی مگر وہ بیوی بھی ۱۹۴۸ء میں داغ مفارقت دے گئی۔ ان دونوں بیویوں کی یادگار سات بچے ہیں۔ چار لڑکے اور تین لڑکیاں جن کی عمریں اس وقت اکیس سال سے اڑتالیس سال تک ہیں۔ ان میں سے بعض خود بھی صاحب اولاد ہیں۔

ان کے بعض مخالفین کا کہنا ہے کہ وقت اور حالات نے ان کا ساتھ دیا ہے لیکن ان کے بارے میں یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت ان کی صلاحیت و استعداد کی برتری عزم و ارادے کی پختگی اور کردار و اخلاق کی بلندی انھیں اس منزل پر لے گئی ہے۔ انھوں نے بڑی سے بڑی مصیبت و پریشانی کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ماحول سے ہم آہنگ کرلینا جانتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی زندگی ایک پورے نظم و ضبط کے ساتھ گذرتی رہی ہے جس میں حسب ضرورت تنوع بھی پایا جاتا ہے یعنی دماغ کو تھکا دینے والی سیاسی الجھنوں میں مبتلا رہنے کے بعد وہ اپنی کوٹھی بر باغیچے کی دیکھ بھال خود کرتے ہیں اور جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں، انھیں گلاب کے پھولوں سے بے پناہ رغبت ہے۔ اس لیے باغیچے میں سب سے زیادہ اسی کے

تختے نظر آتے ہیں۔ پارلیمان میں ہر قسم کی بحث وتمحیص سے نمٹ لینے کے بعد وہ موسیقی سے دل بہلاتے ہیں جس کو سمجھنے اور لطف اٹھانے کا صحیح ذوق ان میں موجود ہے وہ ماہرین سیاست ہی کی نہیں فن کاروں اور ادیبوں کی بھی قدر کرتے ہیں۔ صرف اپنے ہی ملک کی فلاح وبہبود ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ وہ سارے یورپ کی بھلائی چاہتے اور ساری دنیا میں امن وعافیت کی فضا دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

**نظامِ حکومت** : اگر راستہ رک جانے کے باعث وفاقی جمہوریہ کے چانسلر یعنی وزیر اعظم کا ذکر بر سبیل تذکرہ آگیا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نظامِ حکومت پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ مغربی جرمنی کا یہ نظام اس بنیادی قانون پر منحصر ہے جو ۱۹۴۸ء میں وضع کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کی نوعیت عارضی قرار پائی تھی کیونکہ اس کی تشکیل میں غیر ملکیوں کا بھی دخل تھا جو لڑائی ختم ہو جانے کے بعد سے اس کی لگام تھامے ہوئے تھے۔ یہ طے پایا تھا کہ ہر لحاظ سے جرمن آئین مرتب ہو جائے تو اس بنیادی قانون کو کالعدم کر دیا جائے گا۔ ہوا یہ کہ اسی بنیادی قانون میں ۱۹۵۱ء سے اب تک حسب ضرورت ومصلحت تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس ترمیم شدہ قانون کو آئین مانا جائے۔ گویا اس کی تکمیل اسی سال ہمارے یہاں آنے سے چند ماہ پہلے ہوئی ہے۔ اس ترمیم کے بعد بھی اس کا نام بنیادی قانون ہی رکھا گیا ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ اب وہ عارضی نہیں رہا بلکہ مستقل ہو گیا ہے۔

اس قانون میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو آج کل کے جمہوری تقاضوں کے اعتبار سے ضروری کہی جا سکتی ہیں تاہم اس میں آئین کی روایتی روح بھی موجود ہے جس کا اعلان ۴۹-۱۹۴۸ء کے انقلاب کے بعد فرینکفرٹ کے سنٹ پال گرجا گھر میں کیا گیا تھا اور جس کا رنگ ۱۹۱۹ء کے وائمار آئین میں اپنی جھلک دکھا رہا ہے۔ قانون بناتے وقت اس کو مرتب کرنے والوں کو اچھی طرح اس بات کا احساس تھا کہ اس غلطی کا اعادہ نہ ہونے پائے جو اس سے پہلے دورِ آمریت میں ہو چکی ہے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک جو انتظامی حلقے عمل میں آئے تھے، ان کے اختیارات کو بڑی حد تک برقرار رکھا گیا ہے۔ ان کو جرمنی میں لانڈر کہتے ہیں، انھیں ایک لحاظ سے صوبہ کہا جا سکتا ہے، ان کی تعداد گیارہ ہے۔ اپنے دائرۂ عمل میں انھیں بعض ابتدائی

حقوق حاصل ہیں۔ لیکن اہم معاملات میں فیصلہ ایوانِ نمائندگان کو کرنا ہے جسے جرمنی زبان میں بند سٹاگ کہتے ہیں۔ ایوانِ نمائندگان کے اراکین کا عام انتخاب ہر چوتھے سال ہوتا ہے۔ ان کی تعداد اس وقت چار سو ستانوے ہے۔ تعداد کا پیمانہ آبادی کے اعتبار سے بنایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بائیس نمائندے مغربی برلن کے لیے جاتے ہیں لیکن انھیں ایوان میں صرف مشاورتی ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے صوبوں سے اکتالیس اراکین منتخب کئے جاتے ہیں جن کے علاوہ چار نمائندے مغربی برلن کے ہوتے ہیں۔ ان سے ایک اور ایوان کی تشکیل عمل میں آتی ہے جو بند سراٹ کہلاتا ہے۔ اسے زیادہ تر صوبوں کے بارے میں ایسے معاملات کی حد تک، جو ان کے دائرۂ عمل میں ہوں، انقطاعی فیصلے کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

حکومت کا سب سے بڑا سربراہ صدر ہے جس کے اختیارات کئی لحاظ سے چانسلر سے زیادہ وسیع ہیں لیکن چانسلر کا دائرۂ عمل الگ ہے۔ ایوانِ نمائندگان کے صدر کو ایوان کے اراکین منتخب کرتے ہیں۔ چانسلر کو کابینہ بنانے کا حق دیا جاتا ہے جس کے اراکین کی تعداد حسب ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس وقت ان وزیروں کی تعداد سترہ ہے۔ موجودہ حکومت کے سربراہ یعنی صدر ڈاکٹر تھیوڈر ہائس ہیں اور ایوان نمائندگان کے صدر ڈاکٹر یوجین گرسٹن مائر ہیں۔ یہ دونوں بھی کرسچین ڈیموکریٹک یونین کے نمائندے ہیں۔

وفاقی جمہوریہ کے آئین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت اور ضمانت پر زور دیا گیا ہے یعنی اس کو مرتب کرتے وقت اقوام متحدہ کے چارٹر کو بطور خاص مدِنظر رکھا گیا ہے۔ آئین میں یہ گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ وفاقی حکومت اگر چاہے تو ایوان میں فیصلہ کر کے ان اداروں میں شامل ہو سکتی ہے جن کی نوعیت بین الاقوامی ہو اور جن کا مقصد قیام امن و عافیت ہو۔ اسی اعتبار سے وفاقی جمہوریہ نے انجمن معاہدۂ شمالی بحر اوقیانوس (نیٹو) اور انجمن اقوام مغربی یورپ کے ساتھ اپنی وابستگی قائم کر رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی خارجہ پالیسی دوسری مغربی طاقتوں کی دفاعی پالیسی سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہے۔ ان معاہدوں کی رو سے اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے مسلح افواج کا قیام عمل میں لائے۔ لہٰذا وفاقی جمہوریہ کی فوجوں کی تعداد اس وقت

بانوے ہزار کے قریب پہنچ گئی ہے۔ یہ ان منصوبوں کی ابتدا ہی جو اس نے مرتب کر رکھے ہیں۔

اگرچہ مغربی جرمنی بین الاقوامی حکمتِ عملی کی رسہ کشی کے باعث اقوام متحدہ کا باقاعدہ رکن نہیں بن سکا ہے لیکن مستقبلِ قریب میں اسے یہ حق ضرور مل جائے گا۔ تاہم وہ اقوام متحدہ کے ان دس مخصوص اداروں کا رکن بن گیا ہے جو بین الاقوامی مسائلِ عمال، حفظ صحت، خوراک و زراعت، تعلیم، سائنس اور ثقافت، موسمیات، شہری پرواز اور مالیات وغیرہ سے متعلق ہیں۔

اس سال یکم جون سے بیرونی ملکوں میں اس کے تینتالیس سفارت خانے، بیس ثانوی سفارت خانے، انتیس عام قونصل خانے، ترپن قونصل خانے اور تین تجارتی دفاتر قائم ہیں۔ ان میں مزید اضافہ ہونے والا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ سوویت یونین کے ساتھ بھی اس نے سفارتی رشتہ استوار کر لیا ہے۔ حالانکہ مشرقی جرمنی اور مشرقی برلن کے قضیوں کا طے ہونا یا دونوں حصوں کا ایک ہو جانا بظاہر ممکن معلوم نہیں ہوتا۔

**بلجیم سے معاہدہ**: آج شام جرمن ریڈیو سے انگریزی زبان میں نشر ہونے والی خبروں میں کہا گیا کہ وفاقی جمہوریہ اور بلجیم کی حکومتوں کے مابین سرحدی تنازعہ پر سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اور اقرار نامے پر دستخط کر دیے گئے ہیں۔ البتہ چند تصفیہ طلب امور باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی تکمیل کے بعد دونوں حکومتوں کی طرف سے اس کی توثیق ہو جائے گی اور اس تاریخ کے ایک ماہ بعد سے اس پر عمل ہونے لگے گا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب بٹوارا ہوا تو جرمنی کا کچھ علاقہ بلجیم کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد بھی جرمنی خاموش رہا کیونکہ دم خم دکھانے کی سکت اس میں باقی نہیں تھی اور یوں بھی امن پسندی کو اب اس نے اپنا فرض بنا لیا ہے۔ گویا وہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں مذکور اس اصول پر کاربند ہو گیا ہے کہ آپس کے تمام تنازعات کو باہمی گفتگو، مذاکرات یا ثالثی کے ذریعہ پرامن طریقے پر ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اور کسی بھی حالت میں جارحانہ اقدامات سے کام نہ لیا جائے۔ اس اقرار نامے سے پہلے دونوں ملکوں کے نمائندے کئی بار مل بیٹھ کر متنازعہ مسائل پر بات چیت کر چکے تھے اور رفتہ رفتہ مفاہمت کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے بموجب جرمنی کے وہ ضلع جو بلجیم کے زیر انتداب چلے گئے تھے، واپس اسے مل جائیں گے اور ان علاقوں میں جو قدرتی ذخائر پائے جاتے ہیں، ان پر اس کا قبضہ

ہو جائے گا۔ اس طرح ایک نئی سرحد قائم ہو جانے سے پرانا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔

بلجیم سے سرحدی معاہدے کی اہمیت کے پیش نظر بعض اخبارات نے شام کو ضمیمے شائع کر دیے جس میں اس معاہدے کی تفصیلات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اس بات پر زور دیا گیا کہ یہ ضلعے جو اس معاہدے کی رو سے اب جرمنی کی تحویل میں آئے ہیں، چونکہ اسی ملک کے حصے تھے، اس لیے جرمنی کو کوئی نیا فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ میاں محبوب نے ایک ضمیمہ اخبار خرید لیا جو جرمن زبان میں تھا۔ وہ اسے پڑھ کر ترجمہ کرتے رہے تاکہ ہم بھی سمجھ لیں۔

مغربی برلن سمیت جمہوریہ جرمنی سے روزانہ شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد ایک ہزار چار سو ہے۔ ان میں سے بعض کثیر الاشاعت ہیں۔ چھ سو اسی اخبارات ایسے ہیں جن کی مجموعی تعدادِ طباعت ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے۔ ہفتہ وار پندرہ روزہ اور ماہانہ رسالوں کی کل تعداد پانچ ہزار کے قریب اور مجموعی تعدادِ طباعت ساڑھے سات کروڑ ہے۔

انگریزی زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد لامحدود اور ان کی اشاعت بھی ناقابلِ ذکر ہے۔ لندن کے بہت سے انگریزی اخبارات جو سمندر پار کے ایڈیشن چھاپتے ہیں، یہاں آسانی سے بروقت پہنچ جاتے ہیں لیکن وہ بہت زیادہ مقبول نہیں ہیں کیونکہ ان میں عموماً جرمنوں کے خلاف طنزیہ مضامین لطیفے اور کارٹون شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ لطیفہ ایسے ہی ایک اخبار نے شائع کیا تھا۔

**ایک لطیفہ:** بچہ گاڑیاں بنانے والے ایک کارخانے میں ایک جرمن کاریگر ملازم تھا۔ اس کی بیوی نے ایک بار اسے ترغیب دی کہ اپنے بچے کے لیے ایک گاڑی چرا لاؤ۔ اس نے انکار کر دیا کیونکہ اتنی بڑی چیز چھپا کر لانی مشکل بات تھی۔ تب بیوی نے ترغیب دی کہ تم الگ الگ اس کے حصے کبھی کبھی اٹھا لایا کرو جب بہت سے ٹکڑے جمع ہو جائیں گے تو ان سب کو ملا کر اور پیچ کس کر ہم خود ہی گاڑی تیار کر لیں گے کاریگر اس بات پر رضامند ہو گیا اور روزانہ کوئی نہ کوئی پرزہ یا ٹکڑا اٹھا کر لانے لگا۔ جب کافی ذخیرہ جمع ہو گیا تو ایک چھٹی کے دن اس نے کمر ہمت باندھ کر سب کو جوڑنا شروع کر دیا صبح سے شام ہو گئی اصل مقصد پورا نہ ہو سکا۔ رات ہونے سے پہلے بیوی نے دریافت کیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ خاوند نے جواب دیا تو کیا کروں سخت پریشانی ہو۔ سات آٹھ مرتبہ سارے پرزے کھول کھول کر نئے سرے سے جوڑے ہیں۔ ہر بار بچہ گاڑی کے بجائے مشین گن بن جاتی ہے!!

**پاکستانی کھانا:** بلجیم سے معاہدہ جرمنوں کے لیے بھاگوان ہو یا نہ ہو لیکن آج کا دن ہمارے لیے ضرور "یوم سعید" ثابت ہوا۔ وہ اس طرح کہ بہت عرصے کے بعد ہمیں پاکستانی کھانا نصیب ہو گیا۔ یہاں جرمنی میں اے ایچ خان صاحب پاکستان کے سفارت خانے میں شعبۂ خرید و فروخت کے ڈائرکٹر ہیں۔ میرے ان سے بہت پرانے مراسم ہیں اور آدمی خوب ہیں۔ ان سے مل کر ہر شخص کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔

انھوں نے برادر عزیز میاں محبوب کے ذریعہ ہمیں ہائیڈل برگ ہی میں اطلاع دے دی تھی کہ ۲۴ ستمبر کی شام کو ان کے ہاں ہماری دعوت ہے۔ ہم پھر گھوم کر ہوٹل واپس آئے تو ان کا پیغام ہمارے لیے لکھا رکھا تھا۔ انھیں ہمارے راہ نامے کی تفصیلات معلوم تھیں۔ پیغام میں دعوت کی یاد دہانی کرائی گئی تھی۔ چنانچہ ہم ان کے ہاں آٹھ بجے شب کھانے پر پہنچ گئے۔ خلافِ امید انھوں نے بہت بڑا اجتماع کر رکھا تھا۔ بہت ہی شاندار پارٹی تھی۔ مہمانوں میں ہز ایکسی لنسی اے رحیم صاحب سفیر پاکستان متعینہ جرمنی اور ان کی بیگم صاحبہ شامل تھیں۔ سفارت خانے کے دوسرے افسران اور ان کی بیگمات بھی موجود تھیں۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہمارے محترم ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب جو کونسل اوف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر ہیں، اور ان دنوں جرمنی میں ہیں، بہ نفس نفیس تشریف فرما ہیں۔ بہت دن سے بلکہ کئی ماہ سے ان سے مُلاقات نہیں ہو سکی تھی۔ کراچی میں نہ انھیں فرصت ملتی ہے اور نہ ہمیں اپنے کاموں سے مہلت۔ ملاقات ہوئی تو ہزاروں میل پرے۔ لہٰذا اس دعوت کو ہم نے اپنے لیے ایک سعادت بھی سمجھا۔ یہاں ان سے ملاقات خوب دل کھول کر ہوئی۔ وہ ایسے سائنس داں نہیں جو میل ملاقات میں بخل کرتے ہیں۔ لندن میں پاکستانی ہائی کمیشن کے ڈائرکٹر اوف انسپکشن مسٹر ایم این احمد اور ان کی بیگم سے بھی ملنا ہو گیا۔ دراصل ان سے لندن میں ملاقات کی توقع تھی لیکن وہ سرکاری دورے پر یہاں آئے ہوئے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ خان صاحب کی بدولت بہت سے دوستوں کی زیارت بھی ہو گئی۔

بڑی خوشی کی بات یہ تھی کہ تمام کھانے پاکستانی انداز پر تیار کرائے گئے تھے۔ اور یہ اطمینان تھا کہ ان میں کوئی شے ناجائز نہیں ہو گی۔ خوب ڈٹ کر کھانا کھایا گیا۔

مجھے ایک بار کسی سوچ میں دیکھ کر بیگم خان نے پوچھا:" آپ کھانا کھا رہے ہیں یا کسی مریض کے حالات پر غور کر رہے ہیں؟" میں نے عرض کیا "بیگم صاحبہ۔ مجھے یہ فکر ہے کہ کل ایسی نعمتیں کس طرح نصیب ہوں گی۔ اس سرزمین پر نہ تو صحیح ذبیحہ مل سکتا ہے اور نہ دوسری پاک اشیاء۔ الابلا کھاتے کھاتے طبیعت گھبرا گئی ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ کسی طرح پیرسے پیرتک کا کھانا معدے کے کسی حصے میں جمع کر لوں۔" وہ اور دوسرے مہمان کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بیگم صاحبہ نے ہمارے چلتے وقت اصرار کیا کہ چونکہ ہم لوگ کل بھی یہاں رہیں گے، اس لیے کل رات کا کھانا بھی ان کے ہاں کھائیں۔ ہم سے انکار نہیں ہو سکا۔ موقع کو غنیمت جانا۔ دعوت قبول کر لی۔

۲۵ ستمبر ۱۹۵۶ — منگل

# بون میں ایک دن اور

بلجیم کے ساتھ جرمنی کا جو سرحدی معاہدہ کل ہوا تھا، اسے بعض اخبارات نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کل شام کے ضمیموں میں تو یہاں تک لکھا گیا تھا کہ جو علاقے ہمیں اب ملے ہیں، ان کے حق دار ہم ہمیشہ سے تھے اس لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی ہے۔ آج صبح شائع ہونے والے اخبارات نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ پہلے صفحے پر لیکن ثانوی حیثیت کے ساتھ اس خبر کو معمولی طور پر شائع کیا۔ کوئی جلی سرخی بھی نہیں دی گئی۔ البتہ حکومت نے اسے بڑی اہمیت دی۔ ریڈیو کے ذریعہ، جو پاکستان اور ہندوستان کی طرح ایک سرکاری محکمہ ہے، اسے کئی بار نشر کیا گیا اور حوالہ صبح کی خبروں میں بھی دیا۔ پھر یہی نہیں، آج حکومت کے اشارے پر تمام سرکاری عمارتوں پر اور ان عوامی عمارتوں پر بھی جو حکومت سے محض دور کا واسطہ رکھتی ہیں، سرکاری پرچم لہرائے گئے۔ خوشنودی چاہنے والے نجی افراد نے بھی ایسا کیا۔ چنانچہ ہمارے ہوٹل پر بھی آج پرچم لہرا رہا ہے اور اتفاق سے ہمارے کمرے کی کھڑکی سے نظر آ رہا ہے۔

خود ہمارے نزدیک اس واقعہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے جو چیز اپنی ہو اور کچھ عرصے کی محرومی کے بعد واپس مل جائے تو اس پر فخر و ناز کیا معنی رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے اخبارات کے تبصرے بجا اور درست کہے جا سکتے ہیں۔

**پرچم**: معاہدہ اہم ہو یا نہ ہو، یہ ایک الگ بات ہے، البتہ جب سے ہم نے جرمنی کی سرزمین پر قدم رکھا ہے، آج نظر بھر کر یہاں کے پرچم کو دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ ورنہ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باعث ہم نے ہمیشہ ہر عمارت کے در و دہلیز سے واسطہ رکھا، اور اس کے سقف و بام پر گہری نظر ڈالنے کی نوبت کبھی نہ آئی تھی۔ آج جو لہراتے ہوئے

پرچم پر نگاہ پڑی تو میں یہ سوچنے لگا کہ موجودہ وفاقی حکومت نے خون آشام عقاب کو کیوں پسند کیا؟ اس نے سنہرے رنگ کی ڈھال پر سیاہ عقاب دکھایا ہے جس کی چونچ اور پنجے سُرخ ہیں۔ آنکھوں سے ہیبت ٹپک رہی ہے اور سُرخ منہ سے نکلی ہوئی لال زبان نے اسے اور بھی زیادہ ڈراؤنا بنا دیا ہے۔

جرمن قوم کبھی اپنی خونخواری کی وجہ سے مشہور تھی لیکن اب تو اس کا مسلک امن پسندی کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اگر یہ علامہ اقبال کا وہ شاہین ہے جو خودی کو بلند کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو اس کے منہ اور پنجوں کو کیوں سُرخ کیا گیا ہے؟ معلوم ہوا کہ کئی جرمن ریاستوں کے علامتی نشانات (کوٹ اوف آرمز) میں بھی عقاب دکھایا گیا ہے۔ اس ضمن میں مشرقی پروشیا، مغربی پروشیا، سلیشیا اور براندن برگ نامی ریاستوں کے نشانات قابلِ ذکر ہیں۔

عقاب کے پانچ پانچ پروں والے بازوؤں کی علت تو شاید یہ ہو سکتی ہو کہ وفاقی حکومت دس ریاستوں میں منقسم ہے لیکن تیز ناخن والے پنجوں کی چار چار انگلیوں کی وجہ تسمیہ سمجھ میں نہیں آئی اور پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ ان پر نسوانی زینت پسندی کے اعتبار سے سُرخ نیل پالش کیوں لگایا ہے۔

سُرخ، سیاہ اور سنہرے رنگوں پر مشتمل یہ پرچم جرمنی نے ۱۹۴۵ء ہی میں اختیار کر لیا جبکہ غیر ملکی حکومتیں اس پر اپنا سکہ جمائے ہوئے تھیں۔ ممکن ہے کہ انہی کے اشارے پر عقاب کا انتخاب عمل میں آیا ہو۔

اس دور سے قبل نازی جرمنی نے جو پرچم اختیار کیا تھا، وہ ایک فن کارانہ نوعیت کے اعتبار سے مجھے ذاتی طور پر پسند تھا۔ اسے عقیدت سے کوئی واسطہ نہیں تھا، حالانکہ ہٹلر نے صرف اسی اعتبار سے اسے اختراع کیا تھا۔ اس کے دل میں یہ احساس تو بہت پہلے ابھر آیا تھا کہ اپنی جماعت کا کوئی خاص علامتی نشان ہونا چاہیئے اور چونکہ نازی جماعت کا سربراہ اور اس کے پیرو کارل مارکس کی تعلیمات سے بے حد متاثر تھے، اس لیے سُرخ رنگ وہ کسی نہ کسی روپ میں لے آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے کچھ عرصے بعد برلن شہر میں نام نہاد اشتحادیوں کے خلاف ایک زبردست مظاہرہ ہوا جس کے اہتمام کا اشارہ ہٹلر کی جانب سے ملا تھا تو ہر شخص سرخ لباس پہن کر

سُرخ پھولوں کے ہار گلے میں ڈال کر اور سُرخ پرچم ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلتا تھا اور اس وقت ہر شخص کا خیال تھا کہ محض سُرخ رنگ کا جھنڈا نازتسی جماعت کا نشان بن جائے گا۔ لیکن ہٹلر کی جدّت پسند طبیعت نے اس میں ذرا سی ترمیم کر دی۔ پرچم کی زمین سُرخ رہی البتہ اس کے درمیان پاکیزگی کو ظاہر کرنے والا سفید گول چکتا بنایا اور اس پر ٹیڑھے کناروں والی صلیب کو ترچھا کر کے ایک اور نقش جما دیا انجمن صلیبِ احمر کا علامتی نشان ایسی صلیب کی صورت میں ہے جو علم ہندسہ میں جمع کی علامت سے مشابہہ ہے۔ ہٹلر نے اس جمع کی علامت کو ضرب کی علامت میں بدلا اور کنارے موڑ کر ایسی وضع دی جو آریہ لوگوں کے سواستک نشان سے بالکل مل گئی۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ ہٹلر نے اپنے نصرانی مسلک کا اظہار کیا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اگر ہٹلر کے دل میں محض عیسائیت کی علمبردار صلیب کا احساس ہوتا تو وہ اسے اصل حالت میں رکھتا۔ درحقیقت آریائی نسل سے متعلق ہونے کا جذبہ ہمیشہ اس کے دل و دماغ پر چھایا رہا ہے۔ اس نے اسی وجہ سے یہ نشان اختیار کیا تھا۔ اب ہر شخص کی مرضی ہے کہ اس نشان کی جو توجیہہ چاہے کرے۔ خود ہٹلر یا اس کی جماعت کے کسی فرد نے اس کی وضاحت کبھی نہیں کی۔

نازتسی جماعت کے برسر اقتدار آنے سے پہلے جرمنی کا پرچم بہت سیدھا سادا تھا۔ اوپر سے نیچے کی طرف افقی انداز میں سیاہ، سُرخ اور سنہری برابر کی تین پٹیاں تھیں۔ یہ نشان پہلی جنگِ عظیم کے بعد اختیار کیا گیا تھا۔ اس سے قبل اور ۱۸۷۱ء کے بعد سے تین افقی پٹیاں سیاہ، سفید اور سُرخ رنگ میں بنائی گئی تھیں۔ گویا ایک پٹی کی سُرخی اس وقت بھی اپنا رنگ جمائے ہوئے تھی۔

**دو تحقیقاتی ادارے :** ہمارے آج کے پروگرام میں دو تحقیقاتی اداروں کو دیکھنا شامل ہے۔ ایک انسٹی ٹیوٹ اوف دی ہسٹری اوف میڈیسن ہے اور دوسرا انسٹی ٹیوٹ اوف نیورولوجی ہے۔ یہ دونوں ادارے ولہلم پلاٹس نمبر سات والی عمارت میں قریب قریب واقع ہیں ”جرمنی کی راہنمائے سیاحت“ میں ان کا پتہ آسانی سے لگ گیا تھا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم تینوں بھائی ذرا دیر میں اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ وقت کی پابندی کا کوئی سوال نہیں تھا، کیونکہ ان اداروں کے اربابِ حل و عقد

کو پہلے سے لکھ کر کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ ہماری مرضی پر منحصر تھا کہ جب چاہیں، وہاں پہنچ جائیں۔ وہ عام سیاحوں کے لیے زیارت کے مقامات نہیں ہیں۔ صرف ہم ہی جیسے لوگ وہاں جا سکتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے اطمینان ہو گیا تھا کہ جو کوئی بھی وہاں پہنچتا ہے، اسے ادارے دیکھنے کی سہولت دے دی جاتی ہے۔

کمرے سے نکل کر نیچے آئے تو روانہ ہونے سے قبل دو کام کرنے پڑ گئے! ایک تو چیک بھنایا گیا کیونکہ پہلے کی سب رقم ختم ہو گئی تھی اور دوسرے یہ کہ برادر عزیز میاں محبوب کے لیے پان امریکن سے ایک سیٹ ڈسلڈورف سے براستہ ہمبرگ برلن تک اور پھر واپس برلن سے ہمبرگ تک محفوظ کرائی! اگرچہ معلوم تھا کہ اس فضائی راستے پر زیادہ بھیڑ نہیں ہوتی لیکن بھائی جان محترم کی طبیعت میں جو احتیاط اور دوراندیشی موجود ہے اس کے پیشِ نظر ایسا کر لینا ضروری تھا۔ ٹکٹ کی مجموعی قیمت ۸۵۰ مارک ہوئی جو فوراً ادا کر دی گئی۔

ٹیکسی کے بغیر ہم ان اداروں تک پہنچ گئے۔ جو زیادہ دور نہیں تھے۔ قریب کا بازار زیادہ بارونق نہیں تھا۔ اس لیے گاڑیوں کی آمد و رفت بھی اس پر کم تھی۔ ایک لحاظ سے یہ کیفیت ان اداروں کے لیے، جن کی عمارت کے کمرے سڑک کے بالکل قریب تھے، بڑی سازگار تھی۔ ان میں کام کرنے والے محققین بیرونی شور و غل سے محفوظ تھے۔ تحقیقاتی کاموں کے لیے جو پُرسکون ماحول درکار ہے، وہ وہاں میسّر تھا۔

پہلے ہم لوگ انسٹی ٹیوٹ آف نیورولوجی میں پہنچے۔ میاں محبوب حسبِ معمول کام آئے۔ انھوں نے اپنی غیر قومی زبان میں تعارف کراتے اور وہاں آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے ادارہ دیکھنے کی اجازت مانگی جو خندہ پیشانی کے ساتھ دے دی گئی۔ ادارے کے ڈائرکٹر نرے جرمن تھے۔ صرف اپنی ہی زبان جانتے تھے لیکن اشاروں کی بین الاقوامی زبان اور محبوب کی ترجمانی نے مشکل کام کو یہاں بھی آسان کر دیا۔

علامہ اقبال نے تو آج کل کے نوجوانوں کے لیے صرف اتنا کہا تھا کہ ان کے اعصاب پر عورت سوار ہے، لیکن یہاں کی تحقیقات ثابت کر رہی تھیں کہ اس زمانے کے انسان کے اعصاب پر عورت کے علاوہ اور بھی بہت کچھ سوار ہے جس کے باعث اس کی زندگی عجیب نرغے میں ہے۔ وہ ہر جگہ یہی کہتا نظر آتا

ہے کہ ع

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

دماغ اور اعصاب کی شکایات اب سے پہلے بھی انسان کو لاحق ہوتی تھیں لیکن وہ نہ تو اتنی عمیق اور دیرپا ہوتی اور نہ بیشتر صورتوں میں جان لیوا ثابت ہوتی تھیں۔ شاید اسی لیے اطبائے عہدِ قدیم نے دل و دماغ کے اعصاب پر اور جسم کے دوسرے اعضا کے اعصاب پر تقریباً مساوی توجّہ ڈالی تھی۔ اس کے برعکس آجکل دل و دماغ کے اعصاب پر جتنی توجّہ دی جا رہی ہے، اس کی مثال تاریخ طب میں مشکل سے ملے گی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس زمانے کے انسان کی ایک بڑی اکثریت ان عوارض میں مبتلا ہے جو خللِ اعصاب سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ موجودہ سیاست کے تحت جو پریشانیاں کھڑی کی جاتی ہیں، ان کو اعصابی جنگ کا نتیجہ ہی کہا جاتا ہے۔ اس صورتِ حالات کے پیشِ نظر بھی ضرورت لاحق ہو گئی ہے کہ اعصاب کی نوعیت و کیفیت پر زیادہ سے زیادہ تحقیق کی جائے۔

یہ ادارہ بہت زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ایک پروفیسر کی نگرانی میں، جو ادارے کے ڈائرکٹر بھی ہیں، اٹھارہ بیس طلباء محققین کی حیثیت سے اپنی دھن میں لگے ہیں۔ حیاتیات اور نفسیات کے شعبے الگ الگ ہیں۔ پھر ہر شعبے کو کئی کئی درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حیاتیات والے حصّے میں جسم کے مختلف اعضا کے اعصاب نقشوں، شکلوں اور تصویروں کے ذریعے واضح کئے گئے ہیں۔ ان کی بناوٹ تقریباً وہی ہے جو دوسرے طبّی اداروں میں طلباء کی سہولت اور بصری تعلیم کے خیال سے آویزاں کئے جاتے ہیں اور جو مختصر انداز میں تشریح اور منافع الاعضا والی کتابوں کے اوراق کے درمیان نظر آتے ہیں لیکن جو تحریری مواد وہاں جمع کیا جا رہا ہے اور اس مواد کی بنیاد پر جو نئی تحقیقات عمل میں آ رہی ہیں، وہ قابلِ داد ہیں۔ یہ کام کرنے والے طلباء کے مضامین مختلف زبانوں میں دنیا کے مختلف حصّوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان مضامین کے تراشے عمدہ ترتیب کے ساتھ رکھے گئے ہیں تاکہ آئندہ وہاں آ کر کام کرنے والے لوگوں کے لیے حوالے کا کام دیں۔ نفسیاتی اعتبار سے اعصاب کو متاثر کرنے والا شعبہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس شعبے میں جو کام ہو رہا

ہے، وہی اس انسٹی ٹیوٹ کے اغراض ومقاصد کے اصل معیار پر پورا اترتا ہے۔ یہاں بعض ایسے برقی آلات بھی کام میں لائے جا رہے ہیں جن کو مقیاس الاعصاب کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے ان میں سے بعض آلات پہلی بار دیکھے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ شاید ہندستان و پاکستان میں کہیں موجود بھی نہ ہوں۔

ہم دونوں بھائیوں کا فیصلہ ہے کہ جب ہم برِ صغیر پاک و ہند کے دونوں حصوں میں طبی تحقیقات کے ادارے قائم کریں گے تو ان میں نیورولوجی کا شعبہ بالکل الگ ہوگا اور اس پر زیادہ توجہ دی جائے گی کیونکہ فی زمانہ یہ شکایات سب سے زیادہ دشوار مسائل پیدا کر رہی ہیں۔

کچھ دیر بعد ہم انسٹی ٹیوٹ اوف دی ہسٹری اوف میڈیسین میں چلے گئے۔ اس کے ڈائرکٹر چند دن سے رخصت پر تھے لیکن محققین اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ دفتر کی دیکھ بھال کے لیے ڈائرکٹر کی سکریٹری صاحبہ موجود تھیں۔ ان سے گفتگو کرنے پر اندازہ ہوا کہ وہ محض روایتی قسم کی سکریٹری نہیں ہیں بلکہ خود بھی اس ادارے کے اصل کام میں حصہ لیتی ہیں۔ ہم سے تعارف ہو جانے پر انھوں نے صحیح اندازہ لگا لیا کہ ہمیں مشرقی طب سے خاص دل چسپی ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی لائبریری کا وہ حصہ خاص طور پر ہمیں دکھایا جس میں یونان و روما کے عہدِ زریں سے لے کر اسلامی دور تک کے تمام اطبا کی معلومات کا ذخیرہ اصل نوشتوں اور ترجموں کی صورت میں موجود ہے۔ گویا حوالہ جات کے اعتبار سے یہ کتب خانہ بہت ہی اعلا کہا جا سکتا ہے۔ کتابوں کو جمع کرنے کے علاوہ یہاں بھی مختلف اخبارات و رسائل کے تراشے محفوظ کرنے کا معقول انتظام ہے۔ ان تراشوں کو رکھنے کا یہ انداز ہے کہ جو زبانیں یورپ میں سب سے زیادہ مقبول ہیں اور جنھیں تحقیقات کرنے والے عموماً جانتے ہیں، ان کے تراشے بجنسہٖ رکھ لیے جاتے ہیں اور باقی زبانوں کے تراشے جرمن زبان میں ان کے ترجموں کے ساتھ منسلک کیے جاتے ہیں۔ خود ادارے میں کام کرنے والے اکثر لوگ کئی کئی زبانوں کے ماہر ہیں اور باقی ترجموں کے لیے باہر سے امداد لی جاتی ہے۔ ان تراشوں کو دیکھتے ہوئے مجھ سے نہ رہا گیا اور دریافت کر ہی لیا کہ کیا پاکستان کی زبان اردو میں شائع ہونے والے کسی طبی مضمون کا ترجمہ یہاں موجود ہے؟ ۔

سکریٹری صاحبہ نے اپنی لاعلمی ظاہر کی لیکن افسرِ شعبۂ تراجم سے دریافت کیا گیا تو

انھوں نے ذراسی جستجو کے بعد بتایا کہ صرف ایک تراشہ شاملِ دفتر ہے لیکن اس کا اندراج "ناقابلِ فہم" خانے میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ اردو سے جرمن زبان میں ترجمہ کرنے والا کوئی نہیں ملا۔ میں نے اشتیاق ظاہر کیا تو انھوں نے وہ تراشہ نکال کر دکھایا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ہمدرد صحت ہی کا ایک تراشہ ہے۔ جب میں نے یہ حقیقت واضح کی تو افسرِ ترجمہ نے خوش ہوتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ ہمارے دورانِ قیام میں اس مضمون کا ترجمہ ہو جانا چاہیئے۔ میں نے میاں محبوب کو اشارہ کیا کہ اپنے ملک کے وقار کی خاطر ضروری ہے کہ یہ کام تم ضرور انجام دو۔ چنانچہ انھوں نے اپنا نام اور پتہ لکھوا دینا چاہا۔ لیکن افسرِ مذکور نے اصرار کیا کہ ہم یہ تراشہ تمھیں نہیں بھیج سکتے بلکہ تمھیں خود یہاں آکر ترجمہ کرنا ہوگا اور اس خدمت کا اتنا معاوضہ دیا جائیگا کہ اس میں سے سفرخرچ بھی نکل سکے گا۔ انھوں نے میاں محبوب سے آئندہ سلسلہ قائم رکھنے کا خیال بھی ظاہر کیا۔

یہاں کی لائبریری میں بعض کتابیں بہت ہی پرانی ہیں، بلکہ بعض کو نادر کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً لاطینی زبان میں قانونِ شیخ کا ایک نسخہ موجود ہے جو قدیم ترین ہے۔ باقی ترجمے اس کے بعد ہوئے ہیں۔ یہ نسخہ بہت ضخیم ہے یعنی مترجم نے ذرا بھی اختصار سے کام نہیں لیا۔ بعد کے ترجموں میں یہ ستم ڈھایا گیا کہ مترجم بعض حصّوں کو بالکل نظرانداز کر گئے اور کہیں اپنے مختصر الفاظ میں محض مفہوم سمجھا گئے۔ ایسا کرنے میں ان کی اپنی رائے بھی شامل رہی۔ یہ خیال خود افسرِ شعبۂ تراجم نے ظاہر کیا اور مجھے ماننے میں پس و پیش نہ ہوا۔

ایک حصّے میں طبِ عربی پر بہت سی قلمی کتابیں موجود ہیں جو کسی اور لائبریری میں نہیں مل سکتیں۔ یہاں کے منتظمین نے کوئی فہرست تیار نہیں کی بلکہ کارڈ رکھنے کا طریقہ رائج کیا ہے۔ ہر کتاب کے دو کارڈ بنائے گئے ہیں۔ ایک کتاب کے نام سے ہے اور دوسرا مصنّف یا مترجم کے نام سے۔ میری اس رائے سے سکریٹری صاحبہ نے اتفاق کیا کہ کتابوں کی علیحدہ فہرست تیار کرنی بھی ضروری ہے۔

اس انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں بتایا گیا کہ اس وقت یہاں بیس طلبا کام کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد طب کے کسی نہ کسی موضوع پر ڈاکٹریٹ کرنا ہے۔ اگرچہ عام

درس گاہوں کی طرح ایک پروفیسر صاحب ہفتے میں صرف دو بار لیکچر دیتے ہیں لیکن زیادہ کام طلبا کو خود ہی کرنا پڑتا ہے اور وہ ہر وقت کتابوں کے کیڑے بنے رہتے ہیں۔

یہ دونوں انسٹی ٹیوٹ دیکھ لینے کے بعد جرمنی کا باقی سفر اب تجارتی رہے گا۔ ویسے بھی ہم نے یہ طے کیا تھا کہ جرمنی میں دُواسازی کی کمپنیوں پر زور دیں گے اور ان سے ذاتی تعلقات قائم کریں گے لیکن جرمنی کی تین دُواساز کمپنیوں، مرک ہوکسٹ اور بائر کو دُواسازی سے دل چسپی رکھنے وَالا ہر سیّاح دیکھ لینا چاہتا ہے۔ ہم نے اوّل الذکر دو کمپنیوں کو دیکھ لیا ہے اور ان کا حال بھی اپنے روزنامچے میں درج کر لیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بائر کو وہاں جا کر دیکھنا ممکن نہیں ہو گا۔ وہ ہمارے راہ نامے میں شامل نہیں ہے اور نہ اس کے لیے وقت نکالا جا سکتا ہے۔ شروع سے ہمارا اصول رہا ہے کہ اپنے مرتبہ پروگرام میں ردوبدل نہ کیا جائے۔ جس طرح بنیاد غلط ہو جانے سے ساری عمارت ناقص بنتی چلی جاتی ہے، اسی طرح پروگرام میں ایک بار جھول آجانے سے اصلاح مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر پروگرام کی کسی شق کو کالعدم کیے بغیر اس کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔ اور کوئی شق ایسی نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دینا ممکن ہو۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ بائر کو کسی آئندہ پھیرے میں تقریب سے دیکھا جائے گا۔ فی الحال وہ معلومات ہی کافی ہیں جو روانگی سے قبل مطالعہ میں آگئی تھیں۔

**بائر:** جس طرح حضرت اکبر الہ آبادی اور شہر الہ آباد بڑی حد تک لازم و ملزوم سے معلوم ہوتے ہیں یعنی ایک کا تصوّر دوسرے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا، اسی طرح بائر اور لیور کیوزن ایک ساتھ تصورات کی لوح پر ابھرتے نظر آتے ہیں جس طرح اکبرؔ سے پہلے الہ آباد کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اسی طرح بائر کمپنی کے قیام سے قبل لیور کیوزن کو بھی کوئی نہیں جانتا تھا حتیٰ کہ یکم اگست ۱۸۶۳ء کو جب فریڈرک بائر اور ان کے ایک ساتھی فریڈرک ویسکوٹ نے جو پیشے کے لحاظ سے رنگ ساز تھا، اس کمپنی کا آغاز کیا تو کام کرنے والوں کی تعداد بھی دو افراد پر مشتمل تھی اور شہر جسے ایک گاؤں سے زیادہ حیثیت نہیں دی جا سکتی تھی، چند خاندانوں کی ایک مختصر سی بستی کا نام تھا۔ آج اس علاقے کی آبادی ستر ہزار سے زیادہ ہے اور ان میں سے ساڑھے سینتیس ہزار سے زیادہ انسان اسی کمپنی کے ملازم ہیں۔

ان دو منچلے نوجوانوں نے شروع میں صرف کپڑا رنگنے اور چھاپنے کے لیے مختلف رنگوں کا کاروبار چھوٹے پیمانے پر کیا تھا اور اب کپڑا اور چمڑا رنگنے والے کیمیاوی مسالوں کے علاوہ ادویہ کی صنعت بھی کمپنی کے لیے طرّۂ امتیاز بنی ہوئی ہے۔ جملہ مصنوعات کی مجموعی تعداد تیرہ ہزار کے قریب ہے۔ ایک مختصر سی عمارت کے ایک کمرے میں کام کی ابتدا ہوئی اور اب لیورکیوزن اور جرمنی کے تین بڑے شہروں کے علاوہ، جہاں کمپنی کی بڑی شاخیں قائم ہیں، اس کے نمائندے دنیا کے ہر حصّے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ بے پناہ ترقی اسی صدی میں رونما ہوئی ہے، کیونکہ انیسویں صدی کے آخر تک اس کے ملازمین کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں تھی اور مصنوعات کو ایک شخص کے دونوں ہاتھوں کی پوروں پر گنا جا سکتا تھا۔

ترقی کا راز جذبۂ تحقیقات میں مضمر ہے۔ کمپنی نے اس صدی کے شروع میں بڑے پیمانے پر تجربہ گاہیں قائم کیں، ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور نت نئے نمونے تیار کرنے پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جانے لگا۔ اس وقت صرف رنگوں کی مختلف قسموں کی تعداد چھے ہزار ہے اور ہر قسم کی روزانہ مقدار پیداوار کئی من کے برابر ہے لیکن پھر بھی یہ کمپنی عالمگیر مانگ پوری کرنے سے قاصر ہے۔

رنگوں کے ساتھ ساتھ ادویہ کی تحقیقات اور ان کی تیاری کے کام کا آغاز ہوا تو وہ بھی اسی قدر بے تحاشہ کہا جا سکتا ہے۔ اس نے صرف دوائیں ہی نہیں بنائیں بلکہ دواسازی کی صنعت پر بھی قابلِ تعریف اثر ڈالا۔ اس کمپنی کے زیر ایوان تحقیقات کا کام کرنے والوں نے اس فن میں بڑا نام پیدا کیا ہے اور دنیا بھر سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور معالج پروفیسر ڈاکٹر گرہارڈ ڈوماگ کا نام لیا جا سکتا ہے جسے ۱۹۳۹ء میں اس کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے نوبل انعام دیا گیا تھا۔

کمپنی کے شعبۂ تحقیقات میں جانوروں اور پودوں پر برابر چھان بین کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ انسانوں کے علاوہ حیوانات کے عوارض اور طریقۂ علاج کا پتہ چلانا کمپنی کے مقاصد میں شامل ہے۔ مختلف قسم کے کیڑوں کو مارنے کے لیے بھی اس کمپنی نے بہت سے سفوف تیار کیے ہیں جن کو چھڑک کر انسانوں اور پودوں کو بیماریوں سے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

مختلف رنگوں اور دواؤں کی دنیا سے قطع نظر بائر لیبارٹیریز میں بہت سی اور چیزیں بھی تیار ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس صدی کے بالکل شروع میں اس نے فوٹو کی پلیٹ دھونے کے مصالحے اور پھر فوٹو چھاپنے کے کاغذ بنائے۔ اس منزل میں اگفا کے کیمروں اور فوٹو گرافی کے سامان سے بھلا کون واقف نہیں ہے۔ اس کے بعد مصنوعی ربڑ بنانے کا فخر بھی اس کمپنی کو حاصل ہوا۔ یہ کام پہلی جنگ عظیم سے قبل ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی اس ضمن میں تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ جوف دار اور ریشے والی اشیاء سے ریان اور پلاسٹک کی مصنوعات وجود میں آنے لگیں۔ آج کل بائر کے تحقیق و تیاری کے پروگرام میں پلاسٹک کے محکمے کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔

دونوں بڑی لڑائیوں کے درمیان کولتار سے مختلف رنگ بنانے کے کام پر زیادہ توجہ دی گئی۔ اس ضمن میں اس نے دوسرے تجارتی اداروں کو خام مال فراہم کرنا بھی شروع کر دیا۔ کیمیائی کھاد، روغن، مصنوعی پارچہ جات، بجلی کے آلات، ربڑ کا سامان، خوشبوئیں اور ریان کے دھاگے بھی اسی زمانے میں بنائے جانے لگے۔

اگر ہمیں بائر لیبارٹیریز کو بچشم خود دیکھنے کا موقع ملتا تو اس میں شک نہیں کہ ہم زیادہ توجہ دواسازی کے شعبوں پر دیتے لیکن دوسری مصنوعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کم سے کم سرسری نگاہ ان پر بھی ضرور ڈال لیتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ دواسازی کے علاوہ دواؤں کو پیک کرنے کے طریقے بھی اس کمپنی کے بہت اعلیٰ ہیں۔ یہ کام بھی دیکھنے اور سمجھنے کے لائق ہے اور ہمارے لیے یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ اگر دوبارہ جرمنی آنا ہوا تو یقیناً یہ کسر جو اس دفعہ کے پروگرام میں رہ گئی ہے، پوری کی جائے گی۔

**منرل واٹر:** پورے جرمنی میں منرل واٹر کا استعمال بہت عام ہے اور بیئر کے بعد اسی کا درجہ ہے لیکن بیئر کے برعکس اس کو ناجائز تو کیا مکروہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ ہم نے بھی اسے بارہا پیا ہے۔ اس کی پیکنگ بہت باقاعدہ ہوتی ہے۔ لیبل پر اس کے اجزا لکھے گئے ہیں۔ میرے دل میں شبہ پیدا ہوا، ہو سکتا ہے کہ بوتلوں میں چشموں کا پانی بھرا جانا محض برائے نام ہو اور عام سادہ پانی میں مختلف قسم کے نمک حل کر دئے جاتے ہوں۔ لہٰذا اپنے اطمینان کے لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ بون کی مشہور کمپنی "رائس ڈورف" کو دیکھا

جائے جس کا پانی ہر جگہ مشہور ہے اور سب سے زیادہ پیا جاتا ہے۔ بون کے علاوہ اور شہروں میں بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔

دو بجے میاں محبوب سے اس کمپنی کو فون کرایا اور خواہش ظاہر کی کہ ہم کمپنی کو دیکھنا چاہتے ہیں فیکٹری شہر بون سے پندرہ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہاں سے فوراً اجازت مل گئی۔ انھوں نے کہا کہ چونکہ آپ غیر ملکی سیاح ہیں اس لیے آپ کو پوری فیکٹری دکھائی جائے گی۔ تین بجے تشریف لے آئیے۔ لہذا ہم فوراً ٹیکسی لے کر روانہ ہو گئے اور وقت سے چند منٹ پہلے "رائس ڈورف" پہنچ گئے۔ یہ اس مقام کا نام ہے۔ اسی نام پر پانی کا نام "رائس ڈورفر" رکھا گیا ہے۔

صدر دروازے پر ہمارا استقبال ہوا اور ایک گائڈ ہمارے ساتھ کر دیا گیا جو کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے قدرتی پانی کا چشمہ دکھایا۔ اصل چیز یہی ہے۔ کمپنی نے اسے اپنے احاطے میں کر کے پوری طرح قبضہ کر رکھا ہے۔ کوئی اور شخص وہاں سے ایک قطرہ بھی بغیر اجازت نہیں لے سکتا۔ اس چشمے کی تعریف یہ ہے کہ ایک اندازے کے مطابق یہ کوئی تین سو سال پرانا ہے یعنی اور چشموں کی طرح بہت زیادہ پرانا نہیں ہے۔ کسی شدید زلزلے کے بعد جب طبقاتِ زمین میں انتشار ہوا تو اچانک اس کی سوت پھوٹ نکلی۔ ایک عرصے تک اس کا پانی انسانی تصرف سے محروم رہا۔ موجودہ کمپنی کے پاس یہ کنواں تقریباً پینسٹھ سال سے ہے۔ اس وقت کھدائی کے بعد کچھ سکے اس مقام سے برآمد ہوئے تھے وہ بھی ایک شوکیس میں لگے ہوئے ہیں۔ ان سکوں کا زمانہ بھی تین سو سال ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ زلزلے کے وقت کچھ چیزیں زمین میں دفن ہو گئیں اور کچھ ابھر آئیں۔ قدرت کے یہ کھیل نرالے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ پچھلے پینسٹھ سال سے پانی میں ملے ہوئے قدرتی اجزا میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ رنگ بالکل سفید ہے اور بظاہر بالکل مقطر معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ کئی قسم کے نمک شامل ہیں۔

بجلی سے چلنے والے پمپ کے ذریعہ روزانہ اس کنوئیں سے سات لاکھ پانچ ہزار لٹر پانی نکالا جاتا ہے۔ آٹومیٹک پمپوں کے ذریعہ پانی کھینچ کر بڑے بڑے اسٹوریج ٹنکوں میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ شروع میں یہ کسی قدر گرم ہوتا ہے لیکن گرم پانی کے دوسرے

چشموں کی طرح اس میں تیزی نہیں ہوتی۔ فیکٹری میں داخل ہوتے ہی ہم نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ کام معمولی نہیں ہے لیکن یہ شبہ کہ یہ "فراڈ" ہے اور سادہ پانی میں نمک ملا کر بوتلیں بھر دی جاتی ہیں، ٹنک سے پانی لے کر اور چکھ کر رفع ہو گیا تھا۔ چونکہ اس پانی میں لوہے کے اجزاء بھی ہیں اس لیے ان کو نکالنے کا انتظام کیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس صورت میں مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس عمل کے بعد سوڈا واٹر کی طرح بوتلیں اس معدنی پانی سے بھر لی جاتی ہیں۔

بوتلیں بھرنے کا انتظام بہت بڑا ہے اور سارا کام بجلی سے چلنے والی مشینوں کے ذریعہ قابو میں کیا گیا ہے۔ یہ فیکٹری ہمارے اندازے سے بہت زیادہ وسیع نکلی اور اس کا اہتمام بھی خلافِ توقع رہا۔ بوتلیں دھونے، صاف کرنے، بھرنے، کاربن گیس پاس کرنے، کارک لگانے، لیبل چپکانے، پیٹیوں میں رکھ کر نیچے کی منزل تک بوتلیں پہنچانے کا سارا کام خودکار مشینوں سے ہوتا ہے اور ایک گھنٹے میں ایک پلانٹ سے تقریباً سات ہزار بوتلیں تیار ہوتی ہیں۔ یہ فیکٹری دس گھنٹے روزانہ کام کرتی ہے اور اس میں دو پلانٹ بیک وقت کام کرتے رہتے ہیں۔

ہم نے اس کارخانے کو اپنے انداز سے پر بڑے اطمینان سے دیکھا اور ہمارے ادارے کے لیے اس میں متعدد چیزیں ہیں جنھیں میں نے نوٹ کر لیا ہے نیز کارل کو سب کو ہدایت لکھ دی ہے کہ ڈاکٹر شینل باخ جو ہمارے رُوح افزا، نونہال اور سنکارا کے لیے پلانٹ کے خاکے بنا رہے ہیں، اسے ضرور دیکھیں، کیونکہ مشینری کے علاوہ سامان کی فٹنگ نہایت نفیس ہے۔ علاوہ ازیں لیبل لگانے کا مسئلہ بھی یہاں حل ہوتا نظر آتا ہے جس کے متعلق ڈاکٹر شینل باخ نے رائے دی تھی کہ ہاتھ سے لگانے چاہئیں۔ رائس ڈورفر میں ہر مشین ایک ساتھ دو دو لیبل چپکا رہی ہے۔

۶ بجے ہوٹل واپس آ گئے۔ آج برکات احمد صاحب ½ ۹ بجے کی ریل سے فرینکفرٹ سے آنے والے ہیں۔ ترکی کے سفر میں ہمارا قیام انھی کی کوٹھی پر رہا تھا اور انھوں نے اس دوران میں بڑے تکلف سے کام لینے کے علاوہ حسبِ ضرورت سہولتیں بھی پہنچائی تھیں۔ کام کے آدمی ہونے کے علاوہ مخلص دوست بھی ہیں۔

**کراچی ریڈیو:** ہمارے کمرے میں جو ریڈیو سیٹ رکھا ہے، اسے ہم نے بہت

کم استعمال کیا ہے۔ آج ساڑھے سات بجے تک کے لیے وقت کچھ خالی خالی محسوس ہوا تو میں نے گھنڈی گھما کر کراچی سے رشتہ قائم کر لیا۔ خبروں کا وقت تو نہیں تھا، البتہ خبروں پر تبصرہ کیا جا رہا تھا۔ بھائی جان محترم بھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

ہندوستان میں ایک روز پہلے جو فرقہ وارانہ فسادات، خصوصاً بھوپال کے علاقے میں رونما ہوئے تھے، انھوں نے آج نازک صورت اختیار کر لی۔ جھگڑا دراصل ایک کتاب "مذہبی راہنما" کی اشاعت پر شروع ہوا لیکن اس کو غیر معمولی ہوا دے دی گئی۔ شعلوں کی لپیٹ میں بہت سی معصوم ہستیاں آگئیں اور مالی نقصان بھی کافی ہوا۔ ان تنازعات کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر حسن شہید سہروردی نے حکومت بھارت سے احتجاج کیا ہے کہ مسلمانوں کی جان و مال کو اپنے ملک میں محفوظ رکھنے کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ایسے افسوسناک ہنگامے حکومتوں کے ایما اور اشارے پر برپا نہیں ہوتے بلکہ دوسرے لوگ اپنے اغراض کی تکمیل کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ تاہم احتجاج سفارتی سطح پر حکومتوں ہی سے کیا جاتا ہے اور عموماً یہ احتجاج رسمی ہوتا ہے اور اس کا جواب بھی رسمی دیا جاتا ہے۔ بس یہی کہ حکومت کے ارباب حل و عقد انتہائی کوشش کر رہے ہیں اور یقین ہے کہ صورتِ حالات بہت جلد بدل جائے گی۔ یوں بھی سہروردی صاحب کا یہ مراسلہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے براہ راست مطالعہ میں کئی دن بعد آئے گا۔ کیونکہ وہ کل سعودی عرب کے دورے پر چلے گئے ہیں اور شاید وہاں ایک ہفتے قیام کریں گے۔ سہروردی صاحب نے اپنے احتجاجی مراسلے میں لیاقت نہرو معاہدے کا ذکر کیا ہے کہ اس کا احترام کرتے ہوئے حکومت اپنی ذمہ داری محسوس کرے۔ خبروں میں بتایا گیا تھا کہ صرف جبل پور کے علاقے میں ایک سو سے زیادہ مسلم خاندان بے گھر ہو گئے ہیں اور وہ پاکستان آنا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ ابھی طے نہیں ہو سکا ہے۔ مزید ہجرت اس مسئلے کو نازک سے نازک تر کر دے گی۔ سابق وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے دمِ واپسیں کہے ہوئے الفاظ ایسے موقعوں پر یاد آجاتے ہیں کہ "خدا پاکستان کی حفاظت کرے"

کراچی کے عید گاہ میدان میں منعقد ہونے والے ایک جلسۂ عام میں مسٹر حمید نظامی نے تقریر کرتے ہوئے اسلامی ملکوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اقوامِ متحدہ پر زور ڈالیں کہ وہ بھارت میں مسلمانوں کی منظم نسل کشی کو ختم کرانے کے لیے تدابیر اختیار کریں۔ اسلامی ممالک اپنی اپنی پیچیدگیوں میں گھرے ہوئے ہیں، انھیں بھی قومی اور بین الاقوامی مسائل کا سامنا ہے۔ انھیں خود سکون حاصل ہو تو وہ دوسروں کی پریشانیوں کو دور کرنے کی تدبیر نکالیں یا اس سے وابستگی ظاہر کریں۔

پاکستان مسلم لیگ کے سکریٹری جنرل قاضی محمد عیسےٰ نے لیگ کی طرف سے چوبیس بنیادی اصولوں کا ایک منشور شائع کیا ہے جسے لیگ کونسل نے پچھلے سال نومبر میں منظور کیا تھا۔ اس منشور کا منشا یہ ہے کہ قائدِ اعظم کا بیان کردہ یہ مقصد پورا ہو جائے کہ پاکستان معاشرتی انصاف کے اسلامی اصولوں کے مطابق ایک جمہوری ریاست بنے گا۔

یہ بھی اعلان ہوا تھا کہ افغانستان کے فرمانروا ظاہر شاہ غالباً دسمبر کے وسط میں پاکستان کا دورہ کریں گے۔ شاہ موصوف کو پاکستان آنے کی دعوت صدر سکندر مرزا نے بھیجی تھی۔ یہ بھی بتایا گیا کہ وزیرِ اعظم سہروردی ۲۲ اکتوبر کو چین کے سرکاری دورے پر روانہ ہوں گے۔ ان کی صاحبزادی مسز اختر سلیمان ان کے ہمراہ ہوں گی۔ وہ مشرقی پاکستان میں اسمبلی کا اجلاس ختم کرتے ہی ڈھاکہ سے بذریعہ ہوائی جہاز پیکنگ چلے جائیں گے۔ میرے لیے چین کے نام میں بڑی جاذبیت ہے خصوصاً میں اس زاویۂ نظر کی قدر کرتا ہوں کہ چین میں صحتِ عامہ کے تحفظ کا راز روایتی طریقۂ علاج کی ترقی، بقا اور فروغ میں مضمر ہے۔ پاکستان میں اور ہندستان میں ہم دونوں بھائیوں کا مشن بھی تو یہی ہے کہ مقامی حالات کے تقاضوں کے مطابق اگر ہم طبِ مشرق کے اصولوں پر کاربند ہوں اور اسی طریقۂ علاج کو فروغ دیں تو عوام کی صحت لائقِ رشک ہو سکتی ہے کیونکہ مغربی پیمانوں پر بنی ہوئی ادویہ کسی طرح بھی ہمیں راس نہیں آ سکتیں بلکہ عوام کی جیبوں پر ناقابلِ برداشت بار پڑنے کے علاوہ ان میں سے بعض مضرِ صحت بھی ہوتی ہیں۔ بعض آب و ہوا کے فرق کے باعث پورا فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ دلی آرزو ہے کہ کبھی موقع ملے تو ہم دونوں بھائی چین ضرور جائیں۔

اور ان کے طریق علاج، خصوصاً سوئیاں چبھونے اور داغنے کے اصولوں اور ان کے اثرات کا غائر مطالعہ و مشاہدہ کریں۔

واشنگٹن سے کراچی پہنچنے والی خبروں میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے وزیر مالیات سیّد امجد علی نے اقوام متحدہ کے عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے ایک مشترکہ اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے قرضے دینے کی ایک لچکدار پالیسی اختیار کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے یہ بڑی اچھی بات کہی کہ اگرچہ دنیا کے افق سے لڑائی کے بادل چھٹ گئے ہیں تاہم امن کی فضا ابھی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ انھوں نے ترقی پذیر ملکوں کی اقتصادی ترقی اور توازنِ ادائیگی کے استحکام پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اگر غریب اور امیر ملکوں کا درمیانی تفاوت کم ہو جائے تو فضائے امن ممکن ہو سکتی ہے۔

آج صبح برما میں ایک اقتصادی معاہدہ ہوا تھا۔ برما کے زراعتی مارکٹنگ بورڈ کے صدر اوباخن نے اپنے ملک کی طرف سے اور برما میں پاکستان کے سفیر مسٹر الیس کے۔ رحمٰن نے اپنے ملک کی طرف سے معاہدے کی دستاویز پر دستخط کئے جس کی رو سے برما دس ہزار ٹن چاول پاکستان کے ہاتھ فروخت کرے گا۔ غالباً چاول کی یہ ساری مقدار مشرقی پاکستان کے لوگوں کے لیے ملک کے اس بازو میں بھیج دی جائیگی کیونکہ بنگالی بھائی چاول کے بہت شوقین ہیں۔ انھیں چاول ہر موسم میں راس آتا ہے اور یہ ان کی روزانہ کی خوراک ہے۔ ان کے برعکس مغربی پاکستان میں گیہوں کو اتنی ہی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے لیے شاید پہلے کی طرح امریکی گندم آئے گا جس میں کہا جاتا ہے کہ غذائیت کم اور فضلہ زیادہ ہوتا ہے۔

ایک اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ۱۰ اکتوبر کو کراچی میں بغداد پیکٹ سے متعلق مواصلات کی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہو گا جس میں بغداد پیکٹ میں شامل مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں سے پاکستان کو بذریعہ ریل ملانے کے امکانات پر غور کیا جائے گا۔ اسکیم بہت عمدہ ہے۔ خدا کرے جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو نہ صرف اس خطۂ ارض کے اسلامی ملکوں میں سیاسی اور ثقافتی اعتبار سے ایک قریبی تعلق قائم ہو جائے گا بلکہ فرائض مذہبی ادا کرنے کے لیے بھی ایک نیا راستہ کھل جائے گا جو بحری یا ہوائی جہازوں سے سفر نہ کرنے والوں کے لیے مفید

ثابت ہوگا۔ خشکی کے راستے یہ سفر تو اب بھی ممکن ہو جاتے ہیں لیکن راہ کی صعوبتیں ہمیشہ کے لیے پناہ مانگنے کی صورت پیدا کر دیتی ہیں۔

**پاکستانی کھانے دوسری بار**: ہمیں جو اطلاع ملی تھی، اس کے مطابق برکات صاحب کو بذریعہ ریل فرینکفرٹ سے روانہ ہو کر ساڑھے نو بجے بون کے اسٹیشن پر پہنچنا تھا۔ لہٰذا ہم ساڑھے سات بجے اے۔ اچ۔ خان صاحب کے دولت کدے پر پہنچ گئے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ دیارِ غیر میں پاکستانی کھانوں کی حلاوت سے ایک بار پھر کام و دہن کو لطف اندوز کرنے کے لیے وہاں جا پہنچے۔ آج بھی بیگم خان نے بہت نفیس کھانے تیار کرائے تھے۔ کراچی ہی نہیں، اپنے وطن مالوف شاہجہاں کی آباد کی ہوئی دہلی کے خوانِ نعمت یاد آ گئے۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا کیونکہ یقین تھا کہ اس سفر میں اس نوع کے کھانے کسی اور جگہ شاید ہی میسر آئیں۔ کھانے پر ایم۔ این احمد صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ بھی موجود تھیں۔

کھانے کے بعد کی نشست بھی پُر لطف رہی۔ میں نے ریڈیو کی غیر مرئی زبان سے جو خبریں سنی تھیں، اپنے الفاظ میں "ریلے" کر دیں۔ اپنی مصروفیات کے باعث کسی اور ریڈیو کو سننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کچھ دیر خبروں پر تبصرہ ہوتا رہا۔ اپنے ملک کے سیاسی حالات پر اظہارِ خیالات بھی نہایت بے باکی کے ساتھ ہوتا رہا۔ کم سے کم اس وقت کسی کو بھی اپنے الفاظ پر سرکاری احتساب کا ڈر نہیں تھا۔

**برکات صاحب "غائب حاضر"**: ساڑھے نو بجتے ہی ہم تینوں بھائی اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن خان صاحب کی قیام گاہ سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ ہم پلیٹ فارم پر پہنچے تو گاڑی کی سیٹی سُنائی دی اور وہ دندناتی ہوئی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو گئی، ایک ایک ڈبہ بار بار جھانکا گیا۔ حالانکہ برکات صاحب سوئی کی مانند باریک نہیں ہیں اور یوں بھی وہ اپنی وضع قطع کے باعث گاڑی کے اندر آسانی سے نظر آ سکتے تھے۔ لیکن جب ان کا وجود ہی نہ ہو تو دبیز شیشوں کی عینک بھی انھیں دیکھ نہیں سکتی تھی۔ تھوڑی سی مایوسی ہوئی لیکن ڈھارس بندھی اس اطلاع سے کہ دوسری گاڑی دس بج کر بیس منٹ پر اور تیسری دس بج کر چالیس منٹ پر آتی ہے۔ ہوٹل جا کر دوبارہ آنا نہ تو ممکن تھا اور نہ قرینِ مصلحت، لہٰذا پلیٹ فارم ہی کے

طول و عرض کو ناپتے رہے۔ اس طرح کھانے کے بعد چہل قدمی بھی ہو گئی جس طرح بعض لوگ سرکاری اعلانات کی تعمیل میں رفاہی کاموں کے لیے چندے دے کر ثواب دارین بھی حاصل کر لینے کا یقین رکھتے ہیں، ہم نے وقت گزاری کی مجبوری کے تحت حفظِ صحت کے ایک اصول پر کاربند ہونے کا یقین کر لیا۔ حالانکہ یہ ہماری ایک ایسی پرانی عادت ہے جو صرف دورانِ سفر میں ترک ہو جاتی ہے۔

دس بج کر بیس پر آنے والی گاڑی پندرہ منٹ لیٹ ہو گئی اور تیسری اپنے وقت کی پابند رہی۔ اس طرح وہ دونوں تقریباً آگے پیچھے آئیں مگر برکات صاحب پھر بھی غائب تھے۔ دو گاڑیوں کے ڈبوں کو بھاگ کر دیکھنا مشکل ہو گیا۔ ہوائی جہازوں کا انتظام اس لحاظ سے اچھا ہے کہ مسافروں کے ناموں کی فہرست پہلے سے ایئروڈروم کے کمرۂ انتظار میں لگا دی جاتی ہے۔ اس پر نظر ڈالی اور معلوم کر لیا کہ ہم جن کے منتظر ہیں، وہ سرگرم سفر ہیں یا نہیں۔ کم سے کم یہ بات تو ہو کہ بے حد انتظار کے بعد توقعات کی پامالی نہیں ہوتی۔ پہلے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس درخت میں لگنے والے پھلوں میں سے کسی پر بھی ہمارا نام ثبت نہیں ہے۔

ہمیں ذرا تشویش بھی ہوئی کیونکہ برکات صاحب اپنی وضع کے پابند ہیں۔ اگر انھیں آنا نہیں تھا، تو وہ ہمیں بر وقت اطلاع ضرور دیتے۔ اب صبح ہونے سے قبل کسی اور گاڑی کے آنے کا امکان نہیں تھا، لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ ہوٹل واپس جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی تار یا ٹرنک کال کے ذریعہ کوئی پیغام ہماری روانگی کے بعد پہنچا ہو۔ کیونکہ ہم تو ہوٹل سے کئی گھنٹے پہلے نکل آئے تھے لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم باہر آئے تو برکات صاحب سامانِ سفر سے لدے پھندے کھڑے تھے۔

ہوا یہ کہ وہ آخری گاڑی سے آئے اور فوراً ہی باہر نکل آئے۔ ہم اس دوران میں دوسرے نمبر کی گاڑی کے ڈبوں میں گھس کر تفتیش کر رہے تھے۔ یہ گاڑی تیسری گاڑی والے پلیٹ فارم سے ذرا ہٹ کر ایک اور پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تھی۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم ایک وقت میں دو مقامات کا جائزہ لیتے اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ ہم تین بھائی دو ٹکڑیوں میں بٹ جاتے۔ ہم کو یقین تھا کہ برکات صاحب

اس پلیٹ فارم پر اتریں یا اس پر اپنی کندھے کی حرکات کی وجہ سے جلدی شناخت کر لیے جائیں گے۔ لیکن وہ ترکی چھوڑنے کے بعد جرمنی میں کچھ المانوی بانکے بن چلے تھے! اسی لیے ہماری نظر اُن پر جم نہ سکی۔

برکات صاحب نے بتایا کہ وہ ویانا سے ڈسلڈورف کے ایل ایم والے جہاز سے آئے، حالانکہ استنبول سے فرینکفرٹ آنا طے کیا تھا مگر یہ دو دن ویانا ہی میں ٹھیرے رہے اور پونے نو بجے بوُن پہنچے۔ بوُن پر گاڑی صرف دو منٹ رکی اور یہ نہ خود اتر سکے اور نہ سامان اتار سکے۔ گاڑی چلی اور یہ بھی آگے چلے گئے اور وہاں سے پھر اس گاڑی میں واپس آئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ جرمنی میں گاڑیاں اتنی تعداد میں چلتی ہیں کہ بارہا یہ شبہ کرنے کو دل چاہتا ہے کہ ریلوے کے اربابِ انتظام خواہ مخواہ گاڑیوں کو چکر دے رہے ہیں۔ برکات صاحب کے انتظار میں ہم کوئی ایک گھنٹے اسٹیشن پر کھڑے رہے۔ اس دَوران میں چار مال گاڑیاں اور سات سواری گاڑیاں وہاں آئیں اور گزر گئیں۔ مال گاڑیوں کے بارے میں بھی قیاس ہوا کہ ایک ہی گاڑی گردشِ تقدیر کی طرح چکر لگا رہی ہے۔

لیکن ہر گاڑی کے ٹھیرنے کے اوقات واقعی خطرناک حد تک کم ہیں۔ دو یا زیادہ سے زیادہ تین منٹ۔ اب غور کیجیے کہ سامان کے ساتھ اترنا چڑھنا کس قدر دشوار کام ہے۔ ہمیں تو گاڑی ٹھیرنے سے پہلے دروازے پر کھڑا رہنا پڑتا ہے کیونکہ سامان ذرا زیادہ ہے۔ اگر ایسا نہ کریں تو گاڑی ہمیں اڑائے ہی پھرا کرے اور ہم کبھی اتر ہی نہ سکیں۔ وہ لوگ مزے میں ہیں جو چھڑے دم سفر کرتے ہیں یا ان کے ساتھ ایسا سامان ہوتا ہے جسے کھڑکی میں سے پلیٹ فارم پر پھینکا جا سکے۔

اسٹیشنوں پر صفائی ستھرائی کے معاملے پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہماری یہ رائے برقرار رہتی ہے کہ ویانا کی صفائی حرفِ آخر ہے۔ جرمنی میں بھی صفائی ستھرائی کی وہ بات نہیں ہے۔ کہہ لیجیے کہ بم زدہ ملک ہے مگر جس قوم نے دس سال میں اپنے ملک کو ہر لحاظ سے اپنے پرانے انداز پر کھڑا کر دیا ہو اور جنگ سے پہلے کے معیار کی نسبت زیادہ ترقی پسند بنا دیا ہو، وہ صفائی کے معاملے میں پیچھے کیسے رہ سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ صفائی کے ضمن میں ویانائی تخیل یہاں کارفرما نہیں ہے۔

شہر کی سڑکوں تک پر کاغذ کے ٹکڑے، دیا سلائی کی تیلیاں، سگریٹ اور سگار کے "پس سوزے" پڑے رہنا عام بات ہے۔ کہیں کہیں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بھی نظر آجاتے ہیں۔

آج بون پر قلی نہیں ملا اور نہ ٹیکسی اسٹیشن کے باہر میسّر آسکی۔ جو دس بارہ موجود تھیں، وہ ہمارے پیش رو لے کر چلتے بنے۔ لہٰذا ہم سب نے مل کر برکات صاحب کا سامان اٹھالیا اور ہوٹل پیدل چل پڑے۔ یہ غنیمت ہے کہ ان کا رختِ سفر کسی منافق کے گناہوں کے بوجھ کی طرح وزنی نہیں تھا۔

---

۲۶ ستمبر ۱۹۵۶ء — بدھ

# بون سے کولون

رات ہوٹل میں دیر سے پہنچنے کے باعث برکات صاحب سے محض رسمی بات چیت ہوئی وہ چیخ چاخ کر سوجانا چاہتے تھے۔ امریکن ایکسپریس پر انھوں نے بڑی لے دے کی اور اتفاق سے امریکن ایکسپریس کا نمائندہ آگیا۔ تو وہ اس کے پیچھے پڑ گئے اور اس جوش و خروش میں یہ بھول گئے کہ ہوٹل کے برابر کے کمروں میں بھی رہتے ہیں۔ خیر صبح اٹھتے ہی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اس طرح کہ وہ "مکبّر الصوت" بن گئے اور بلند لہجے میں برابر بولتے رہے۔ بھائی جان محترم پروگرام پر نظر ڈالتے اور ہم دونوں کی گفتگو میں دور ہی دور سے حصّہ لیتے رہے اور میاں محبوب الٰہی ٹیلی فون سنبھال کر اور ہماری طرف سے خالی الذہن ہو کر دوسروں سے دوسری زبان میں گفتگو کرتے رہے۔ غرض یہ کہ کمرے میں چار افراد اور چاروں کی کیفیات مختلف النوع تھیں، حالانکہ دائرۂ عمل سب کا ایک اور موضوعِ سخن بھی تقریباً یکساں تھا یعنی اگلی منزل کا پروگرام اور وہاں کے حالات پر تبصرہ۔ یوں کہیئے کہ اس چوکور کے زاویے ذرا بدلے ہوئے تھے۔

برکات صاحب نے ترکی کا ذکر بھی چھیڑ کر ہمارے دل میں ان دنوں کی یاد تازہ کر دی جبکہ ہم ان کے مہمان بن کر وہاں قیام پذیر تھے۔ ان کی پھبے دار گفتگو ویسے ہی پُر لطف ہوتی ہے اور پھر جہاں بے تکلفی ہو تو وہ خوب کھل کر رنگ جماتے ہیں۔ بات چیت میں ادبی رنگ غالب رہتا ہے اور چونکہ وہ فارسی زبان کے شیدائی ہیں، اس لیے اکثر اپنی گفتگو کو زیادہ مرصع اور زیبِ سماعت کرنے کے لیے فارسی کے اشعار خاص ایرانی لب و لہجہ میں سُناتے ہیں لیکن ایک زیادتی ہے۔ وہ عموماً سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا مخاطب فارسی زبان نہیں جانتا۔ اس لیے اکثر فارسی شعر سُنا کر اس کے معنے اور

پھر مطلب بھی بیان کرنے لگتے ہیں۔ یہ عادت ان کی طبیعت میں اتنی رچ گئی ہے کہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں وہ کسی باذوق ایرانی کو حافظ و خیام کے کلام کا مفہوم نہ سمجھانے لگیں۔ میں نے ان کو محسوس کرانے کے لیے ایک بار یہ دل لگی کی کہ جوں ہی انھوں نے فارسی کا شعر پڑھا، فوراً اس کا مطلب خود میں نے بیان کر ڈالا اور اگر اس موضوع پر کوئی شعر ذہن میں آیا تو مستزاد کے طور پر برجستہ پڑھ دیا، تاکہ وہ سمجھ لیں کہ دوسرا بھی ان کے سمجھنے کو پہلے سے سمجھتا ہے۔

پروگرام کے مطابق آج ہمیں بون سے کولون جانا ہے اور بہ کانت صاحب کو بھی ہمارے ساتھ جاکر فوراً لوٹ آنا ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنا سامان باندھ جوڑ کر (بلکہ وہ تو پہلے سے باندھا جوڑا ساتھ آیا تھا) ہوٹل میں اپنے کمرے کے اندر رکھ کر مقفل کر دیا اور ہوٹل والوں کو خاص احتیاط برتنے کی تاکید کر دی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ بالکل چھڑے دم ہمارے ساتھ چلیں گے۔ سامان ساتھ لیے پھرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔

**کمپنی کی غلطی سے :** امریکن ایکسپریس کمپنی جس نے ہمارے اس سفر کا پروگرام بنایا ہے اور انتظامات کئے ہیں، بعض مقامات پر غلطیاں کر گئی ہے اور اس کی یہ غلطیاں تکلیف دہ ہو گئی ہیں۔ مثلاً بون سے کولون بذریعہ ریل پروگرام رکھا ہے اور کولون سے ڈسلڈورف بھی ریل سے جانا ہے۔ حالانکہ بون سے کولون بذریعہ موٹر کار جانا ہو صرف بیس منٹ کا راستہ ہے اور اسی طرح کولون سے ڈسلڈورف کا فاصلہ تیس منٹ میں طے کیا جا سکتا ہے موٹریں عام ہیں اور فوراً مل جاتی ہیں اور جب پہلے سے انتظام کیا جائے تو کسی قسم کا تردد یا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

سوچنے کی بات ہے کہ سارا سامان باندھ کر ہوٹل سے ریلوے اسٹیشن جانا، دونوں جگہ سامان قلیوں کے سپرد کرنا، ریل کے ڈبے میں لدوانا اور اس سے پہلے چنگی اور پروانوں کی دیکھ بھال کرانا اور اس کے بعد دوسرے مقام پر پہنچ کر ان تمام مراحل سے دوبارہ گزرنا بڑا تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ اس طرح خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ابھی پرسوں کی بات تھی کہ ہم فیکٹری دیکھنے کے لیے موٹر میں اتنا فاصلہ طے کر گئے، جو بون سے کولون کے مقابلے میں زیادہ تھا اور سمت ذرا مختلف نہ ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہم کولون سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ کیونکہ وہاں سے

ڈسلڈورف صرف پندرہ منٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ اس بڑی بین الاقوامی کمپنی کو اس قسم کی غلطیاں ہرگز نہیں کرنی چاہییں۔ اس کے لیے مناسب یہ تھا کہ بون کو مرکز بنا کر موٹر سے کولون اور ڈسلڈورف کی سیر کرا دیتی یا اس طرح آنے جانے کا مشورہ دیتی یعنی ہم دن کے وقت ایک روز ان مقامات کا چکر لگاتے اور رات کو بون والے ہوٹل میں واپس آجاتے۔ ہوٹل کے کمرے کا کرایہ ہر جگہ ادا کرنا نہ پڑتا بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دو دن میں تین دن کا کرایہ ادا کرنا پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ قاعدے کے مطابق چند گھنٹے کا کرایہ بھی پورے دن کے برابر وصول کیا جاتا ہے۔ تاہم ہمارے لیے ان تین شہروں کے تین ہوٹلوں میں جانا اور کرایہ ادا کرنے کے علاوہ قلیوں کو اجرت اور بیروں کو ٹپ ادا کرنا ایک بڑا بار تھا جو تکلیف دہ بھی تھا۔

چار آدمیوں کا سامان لا کر ریلوے اسٹیشن گئے۔ قلیوں کے ساتھ معرکہ ہوا۔ گاڑی نو بج کر آٹھ منٹ پر آئی اور دو منٹ بعد روانہ ہو گئی۔ سامان ساتھ نہ ہو یا قلیل مقدار میں ہو تو یہ دو منٹ بہت زیادہ ہوتے ہیں لیکن ہمارے لیے پلک جھپکاتے میں گزر گئے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ کوئی زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔ اب محض چوبیس منٹ کا سفر سامنے تھا۔ گاڑی شمالی سمت میں چل رہی تھی۔ بھائی جان محترم برکات صاحب کے ساتھ ذرا دُور بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں کھڑکی کے قریب ہو کر باہر میدانوں میں پھیلی ہوئی دھوپ کا نظارہ کر رہا تھا۔ بلکہ تصورات کی دنیا میں غرق ہو کر کوئی چالیس میل پرے اس شہرِ قدیم کو اپنی آنکھیں بند کر کے دیکھ رہا تھا، جس کی رونق و شہرت تقریباً بارہ صدی پہلے اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی اور دنیا کے بہت کم شہر اس اعتبار سے اس کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ میری مراد شہر آخن سے ہے جسے اب بھی سیاح بہت ذوق و شوق سے دیکھنے جاتے ہیں۔

**آخن**: یہ شہر جسے جرمن آخن کہتے ہیں، فرانسیسی زبان میں ایکس لاشے پل کہتے ہیں اور جو بلجیم کی سرحد سے اس قدر ملا ہوا ہے کہ اپنی گزرگاہ بدلتے ہوئے دریاؤں کی طرح سیاسی تغیرات کے ساتھ یہ شہر بھی کبھی پڑوسی ملک کا حصہ بن سکتا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان جو سرحد ہے اس کی بہت زیادہ نگرانی نہیں ہوتی۔ ان دونوں کے مابین کافی مفاہمت ہے۔ یہ گاڑی جس میں ہم سفر کر رہے ہیں اور اس کے

علاوہ دوسری بہت سی گاڑیاں مختلف مقامات پر سرحد عبور کر کے دوسری طرف چلی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ آرجار اسی شہر آخن سے ہوتی ہے۔ یہاں گاڑی کے ڈبے تبدیل نہیں کیے جاتے بلکہ پوری گاڑی سرحد پار کر جاتی ہے۔

اب اس شہر کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن آٹھویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں اس کی شہرت بامِ عروج پر تھی کیونکہ اس وقت وہ شارلیمین جیسے مشہور المانوی فرمانروا کا پایۂ تخت تھا۔ اس نے اس شہر کی بنیاد تو نہیں رکھی لیکن اسے دیدہ زیب بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ ویسے اس کی تاریخ رومیوں کے عہدِ زرّیں سے ملتی ہے جب کہ وہ حدودِ سلطنت کو وسیع کرتے ہوئے چہار دانگِ عالم میں اپنی فتح و نصرت کا نقارہ بجوا رہے تھے، انھوں نے بھی اس وادی کو پُر فضا اور خصوصاً یہاں کے گرم پانی والے چشموں کو قدرت کا بے بہا عطیہ سمجھتے ہوئے اسے اپنی فوجوں کا ایک مستقر بنایا تھا۔ انھوں نے اپنے گرم پانی والے چشموں کے دیوتا اپالو گرانن کے نام سے منسوب کرتے ہوئے اس مقام کو تاریخ میں پہلی بار اکویس گرانم کا خطاب دیا تھا، جس کا مطلب ہوا "گرانس کا آبِ گرم"۔

یہ نام ولادتِ مسیحؑ سے بھی بہت پہلے مشہور ہوا اور عرصۂ دراز تک رائج رہا۔ حتیٰ کہ شاہ پیپن نے اس کو اپنی راجدھانی بنا لیا۔ اور یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا جس کے در و دیوار نے شارلیمین کی تاریخِ ولادت اپنی پیشانی پر ثبت کر کے جریدۂ عالم میں شامل کر دی۔ جرمن نژاد اور رومی فرمانرواؤں کا اصل پایۂ تخت تو روم ہی میں تھا، جہاں شارلیمین اور اس کے فرمانرواؤں کی رسمِ تاجپوشی بھی ادا کی گئی تھی، لیکن جرمنی کے یہ فرمانروا رومیوں سے ذرا دُور رہ کر اپنی حکومت کا رنگ جمانا چاہتے تھے۔ اسی لیے شارلیمین نے کلیسائے رُوم کے ہاتھوں ہی کے شاہی گرجا میں، تاج پہن لینے کے بعد آخن کو زیادہ عروج دیا اور پھر باقاعدہ اسے اپنا پایۂ تخت بنا لیا۔ شارلیمین کی تاجپوشی ۸۰۰ء میں ہوئی اور وہ ۸۱۴ء تک سریر آرائے سلطنت رہا۔ لیکن چودہ سال کے اس مختصر سے دَور میں جو ترقی اس نے اس سرزمین کو دی وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اب ایک بڑا تجارتی شہر ہو جانے کے باعث اس کی پہلی سی شان برقرار نہیں رہی ہے، پھر بھی کھنڈرات اس کی عظمت کی نشان دہی کرتے ہیں اور

اس حقیقت سے بھی ہر شخص واقف ہے کہ موجودہ شہر کا "راٹ ہوس" یعنی ٹاؤن ہال شارلیمین کے محل کی بنیادوں پر نئے سرے سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود عہدِ وسطیٰ کی بہت سی یادگاریں باقی ہیں جنھیں سیاح عبرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ شارلیمین کے عہد میں یہ شہر مغربی ثقافت اور علوم کا مرکز بن گیا تھا۔ اس وقت کی بعض یادگاریں عجائب گھر کی زینت ہیں یا آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہیں۔

شارلیمین کے بعد لوئی (مقدس) کی تاجپوشی اسی مقام پر ہوئی۔ اس نے چند دور اندیشیوں کی بنا پر روم جا کر وہاں کے گرجا میں تاج پہننا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے بعد سے فرڈیننڈ اوّل تک تمام فرماں روا یہیں تاج و تخت کی ذمہ داری سنبھالتے رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۸۱۴ء سے ۱۵۳۱ء تک بتیس بادشاہوں کی رسم تاجپوشی یہاں ادا ہوئی۔

بارھویں صدی کے تقریباً آخری حصے میں (۱۱۶۷ء تا ۱۱۷۲ء) فریڈرک اوّل کے حکم سے اس شہر کے گرد فصیل تعمیر کر دی گئی۔ اس زمانے میں راجدھانی کو بیرونی حملے سے بچانے کے لیے یہی ایک تدبیر کارگر سمجھی جاتی تھی حالانکہ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ طویل محاصروں یا شدید حملوں کے سامنے ایسی شہر پناہیں ریت پر بنی ہوئی عمارتوں سے زیادہ کچھ ثابت نہ ہو سکیں۔

سولھویں صدی عیسوی میں اس شہر کا زوال شروع ہو گیا، کیونکہ اس وقت یہ پایۂ تخت نہیں رہا تھا اور چونکہ اس وقت بامِ عروج پر جانے والے سلطنتِ فرانس کے صدر مقام سے قریب اور قلبِ جرمنی سے دور تھا، اس لیے اس پر زیادہ توجہ دینے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ عیسائیت کے نام لیوا اپنی عبادت گاہیں بنا بنا کر اس جگہ کی حرمت قائم کرتے رہے۔ چنانچہ سترھویں صدی عیسوی کے بہت سے گرجا گھر اب بھی برقرار ہیں بلکہ بڑے چوک کے وسط میں جو فوارہ ہے، وہ بہت ہی پرانا ہے۔ اس کے قریب ہی شارلیمین کا مجسمہ اس کی قدامت کا پتہ دیتا ہے۔

چونکہ بعد کے زمانے میں اس شہر کے قریب کوئلے کی کانیں دریافت ہو گئیں اور چند دوسری معدنیات کا بھی پتہ چلا، اس لیے کان کنی کے علاوہ کئی اور صنعتیں

خصوصاً کپڑے، شیشے، سوئیوں اور پنوں کے کاروبار نے اس علاقے کی آبادی کو ایک نیا رنگ دے دیا۔ پھر اس صدی کے شروع میں چونکہ یہاں ایک اہم ہوائی اڈا اور بہت سی ریلوں کا ایک جنکشن تعمیر کر دیا گیا تھا، اس لیے اغیار کی نگاہوں میں کھٹکا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران میں اسے نشانہ بنا کر خوب بمباری کی گئی کھنڈرات زیادہ کھنڈر ہو گئے اور جو نئی عمارتیں تھیں، وہ بھی منہدم یا شق ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

لیکن خیر، اگر امریکن ایکسپریس کمپنی، جس نے ہمارے راہ نامے میں بہت سے جھول پیدا کر رکھے ہیں، آخن کو ہمارے پروگرام میں شامل کرتی تو ہم اس مقام کو یہاں کے گرم معدنی چشموں کی وجہ سے ضرور دیکھتے اور ان کے نظام کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ پانی کی علاجی کیفیات کا اندازہ لگاتے۔ اب اس کے سوا کیا چارہ کار تھا کہ فضا کی وسعتوں پر حسرت بھری نظر ڈالتے اور ریل کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے اپنے سلسلۂ خیال کو توڑتے آگے بڑھ جائیں۔

چونکہ آخن کے ضمن میں شارلیمین کا حوالہ آگیا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ایک نگاہِ بازگشت بہ سبیلِ تذکرہ ڈال لی جائے۔

**شارلیمین**: یورپ کے اکثر فرمانرواؤں اور دوسرے لوگوں کے نام سُن کر ان کو ذہن میں لاتے وقت مغالطہ ممکن ہو سکتا ہے کیونکہ وہاں خاندانی نام زیادہ مشہور ہو جاتے ہیں اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک خاندانی نام ایک ہی کنبے کے لیے مخصوص ہو۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک نام "چارلس" ہے۔ عوام سے قطع نظر اگر فرمانرواؤں کا ذکر کرتے وقت کسی سے چارلس یا زیادہ اتہ پتہ دیتے ہوئے چارلس اوّل کے بارے میں پوچھا جائے کہ وہ کس زمانے میں کس ملک کا فرمانروا تھا تو کوئی بھی مؤرخ مزید سوال کیے بغیر جواب نہیں دے سکتا۔ کیونکہ چارلس اوّل نام کے کئی فرمانروا یورپ کے مختلف ملکوں میں اور مختلف زمانوں میں گزرے ہیں۔ البتہ ایک چارلس اوّل، جسے چارلس اعظم بھی کہتے تھے، شارلیمین (لکھنے کے اعتبار سے چارلس مین) کے نام سے زیادہ مشہور ہوا اور اس لحاظ سے وہ اپنے نام کا واحد حکمراں تھا۔ وہ فرنگوں کا بادشاہ تھا اور اس کی سلطنت میں موجودہ جرمنی، فرانس اور اٹلی کے

مختلف حصّے شامل تھے۔

جرمن قوم نظامِ حکومت کے اعتبار سے شارلیمین کو اپنا مورثِ اعلا سمجھتی ہے کیونکہ سب سے پہلے اسی نے المانوی قوم کے مختلف قبائل کو جمع کر کے ایک مستحکم اور وسیع سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ یوں تو اس کے باپ اور دادا بھی سریر آرائے سلطنت تھے لیکن ان کا اقتدار اسی قدر رہا تھا جتنا کہ برصغیر پاک و ہند میں مغل خاندان کے آخری چند بادشاہوں کو نصیب تھا۔

شارلیمین کو یورپ کی مختلف زبانوں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے خود جرمن زبان میں اسے کارل ڈر گروس کہتے تھے۔ اطالوی میں کارلومیگنو اور لاطینی میں کیرولس میگنس کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر صورت میں پہلے لفظ کے معنی "انسان" اور دوسرے کے "اعظم" ہیں۔ گویا شارلیمین ایک بڑا حکمراں ہی نہیں، ایک عظیم انسان تھا۔ اسے یہ اعزاز نہ جانے کس اعتبار سے دیا گیا تھا۔ ہمارے نزدیک عظیم صرف وہ ہے جس کے اخلاق و کردار میں عظمت کی شان پائی جاتی ہو۔ حدودِ سلطنت کو وسیع کر لینے یا زیادہ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت دکھانے سے انسان صحیح معنوں میں عظیم کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اور اگر یہ صحیح ہو تو چنگیز اور ہلاکو تو عظیم ترین کہے جا سکتے ہیں۔ اصول کی اس کسوٹی پر شارلیمین کے اخلاق و کردار کو پرکھا جائے تو اس خطاب کی صداقت قابلِ غور ہو جائے گی۔

اس زمانے میں یورپ کی بعض سلطنتیں ایسی بھی ہوتی تھیں جن کے بیک وقت دو دو فرمانروا ہوتے تھے۔ چنانچہ شارلیمین کا باپ پیپن بھی اپنے بھائی کارلومین کے ساتھ شریکِ حکومت تھا مگر اس کے فوت ہوتے ہی اس نے تمام اختیارات پر قبضہ کر لیا اور اپنے بھتیجوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیا۔ شارلیمین کو غصب کرنے کی یہ عادت اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملی تھی وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر، جو ان کے چچا کا ہم نام یعنی کارلومین تھا، تخت نشین ہوا۔ پیپن نے ۷۶۸ء میں مرتے وقت اپنی سلطنت اپنے ان دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم کر دی تھی۔ لیکن چھوٹے بھائی کو یہ فیصلہ پسند نہیں تھا۔ اس کی دلیل تھی کہ چونکہ میں باپ کی تاجپوشی کے بعد پیدا ہوا ہوں اور شارلیمین نے اس تقریب سے قبل جنم لیا تھا، اس

لیے اس سلطنت کا واحد حکمراں میں ہوں۔ پیپن کی تاجپوشی ۷۵۱ء میں ہوئی تھی اور شارلیمین ۲ راپریل ۷۴۲ء کو پیدا ہو چکا تھا۔

باپ کی وفات کے ایک سال بعد شارلیمین کے علاقے میں بعض قبائل نے سر اٹھایا تو اس نے سختی کے ساتھ سب کو نیچا کر دکھایا۔ اس موقع پر چھوٹے بھائی نے ذرا بھی مدد نہیں کی۔ شارلیمین نے مزید استحکام حاصل کرنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ لومبارڈ قبیلے کے بادشاہ ڈیسی ڈیریس کی لڑکی سے شادی کر لی وہ چاہتا تھا کہ اٹلی کی سیاست میں بھی داخل ہو جائے لیکن ایک سال بعد ہی اسے اس شہزادی سے علیحدگی اختیار کر لینی پڑی، کیونکہ صوابی صوبے کی ایک خاتون ہلڈے گارٹ اس کے من کو بھا گئی اور وہ اس وقت کے قانون کے مطابق ایک سے زیادہ رسمی شادیاں نہیں کر سکتا تھا۔ ڈیسی ڈیریس کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہا۔ اتفاق سے اسی سال کارلومین کا انتقال ہو گیا اور شارلیمین نے ورثے میں ملی ہوئی عادت کے مطابق بھائی کے بچوں کو ان کے جائز حق سے محروم کر کے بلا شرکتِ غیر عنانِ حکومت سنبھال لی۔ کارلومین کی بیوی ملکہ گربرگا سخت برہم ہونے کے باوجود اچھی طرح جانتی تھی کہ کوئی قانونی چارہ جوئی اس کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا انتقام لینے کے لیے اس نے دوسری تدبیر اختیار کی اور فوراً ڈیسی ڈیریس کے پاس پہنچ کر امداد چاہی۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے، لہٰذا دونوں نے مل کر مخالفت شروع کر دی۔

سب سے پہلے انھوں نے پاپائے روم سے اعانت چاہی کیونکہ تاج وتخت تفویض کرنا اسی کے اختیار میں ہوتا تھا۔ اس سے کہا گیا کہ وہ کارلومین کے لڑکوں کو اس کے علاقے میں مشترک فرمانروا قرار دے کر تاج پہنا دے اور شارلیمین کو اس ناجائز تصرف سے محروم کر دے لیکن پاپایانِ روم ہمیشہ طاقت کے سامنے جھکتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس وقت کے پوپ کو بھی اس تجویز پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اتفاق دیکھیے کہ اسی زمانے میں سکسن قوم کی سرکوبی کے لیے شارلیمین کو نبرد آزمائی کرنی پڑی۔ ڈیسی ڈیریس کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ دوسری طرف سے اس نے چڑھائی کر دی۔ دونوں کی فوجوں میں معرکہ ہوا لیکن چونکہ پوپ کا تعاون شارلیمین

کو حاصل تھا، اس لیے عوام اس کے طرفدار رہے اور اس کا پلّہ بھاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی معرکے میں کارلوبین کے لڑکے گرفتار ہو گئے اور پھران کا سُراغ نہ مل سکا۔ اس غیر معمولی کامیابی نے شارلیمین کو واقعی چارلس اعظم بنا دیا کیونکہ ڈیسی ڈیریس کی شکست سے وہ لومبارڈوں کا بھی فرمانروا بن گیا تھا۔

کچھ عرصے بعد شارلیمین کو بعض یونانی علاقے ہتھیانے کا خیال آیا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں اس کے لیے کوئی خوف دامن گیر نہیں تھا لہٰذا وہ یہ بھی کر گزرا۔ اس تمام عرصے میں وہ پوپ کے سامنے نوازشات کے انبار لگاتا رہا، تاکہ کلیسائی تعاون حاصل ہوتا رہے جو اس زمانے میں بہت بڑی بات تھی۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ شارلیمین کے سامنے پوپ کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایک لحاظ سے بالکل بک گیا تھا۔ چنانچہ اس نے بعض وہ اختیارات بھی بادشاہ کو دیدیئے جو صرف پوپ کے لیے مخصوص تھے۔ ۸۰۰ء میں روم کے بڑے گرجا گھر میں شارلیمین کو پوپ نے نئے سرے سے تاج پہنا کر بہت بڑے علاقے کا فرمانروا بنا دیا، جس میں اٹلی کا بھی کچھ حصہ شامل تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں یہ دستور عام ہو گیا تھا کہ وسطی یورپ کی مختلف ریاستوں کے حکمراں پاپائے روم کے ہاتھ سے تاج پہننا اپنے لیے ایک بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھیں بذاتِ خود روم جانا پڑتا تھا تاکہ وہاں سب سے بڑے گرجا میں یہ رسم ادا کی جا سکے۔

پوپ نے شارلیمین پر نظرِ عنایت رکھنے کا یہ جواز عوام کے سامنے پیش کیا کہ اس سے قبل اس نے اسپین کے عرب مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کی تھی اور اگرچہ اس صلیبی لڑائی میں اسے کافی شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس کے ہزاروں فوجی موت کے گھاٹ اتر گئے لیکن پوپ کی یہ دلیل کافی تھی کہ وہ نصرانیت کی بقا اور اس کے عروج کے لیے نبرد آزما رہا ہے۔ اس لڑائی اور سابقہ معرکوں میں خود اس نے اور اس کی فوجوں نے ظلم وستم کو روا رکھا، اس کی تفصیل بیان کرنے میں خود یورپی مورخین نے بخل اور تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

شارلیمین اپنی فطرت سے مجبور تھا جب کبھی اس کے لیے انسانی خون بہانے کے امکانات کم ہو جاتے، وہ سیر و شکار میں دل چسپی لینے لگتا۔ آخن کی شہر پناہ کے باہر وسیع جنگلوں میں اس کی ہلاکت پسندانہ ہوس کو بجھانے کا وافر سامان موجود تھا۔ وہ اپنے مصاحب کے ساتھ کئی کئی ہفتے اس شغل میں محو رہتا اور اس وقت بھی جنگل میں منگل منانے کے مصداق عیش و عشرت کی محفلیں منعقد کرتا جن کے لیے کسی دردسری کی ضرورت نہیں تھی۔ شکار کے دوران میں وہ گرم پانی کے چشموں میں بھی نہاتا اور ان کے کنارے ناچ رنگ کی محفلیں جماتا تھا۔ شاید اسی کی رسم کو پورا کرنے کے لیے آج بھی گرم پانی کے چشموں کے قریب رقص و سرود کی کلبیں قائم ہیں۔ ان میں سے ایک مقام قیصر باد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام اسی زمانے میں دیا گیا تھا۔

آخر عمر میں وہ ذات الجنب جیسے موذی مرض میں گرفتار ہو گیا اور چونکہ اس بیماری کا صحیح تدارک اس کے معالجین کو معلوم نہیں تھا، اس لیے وہ بیمار ہونے کے بعد بہت جلد کام آ گیا۔ ۲۸ جنوری ۸۱۴ء کو جب کہ اس کی عمر تقریباً بہتر سال تھی، اس نے اس جہان سے کوچ کیا اور جرمن قوم کے لیے ایک منظم و مربوط حکومت چھوڑ گیا۔ جرمن قوم کی تاریخ عموماً اسی عہد سے شروع کی جاتی ہے۔ مرنے کے بعد وہ اپنے پایۂ تخت آخن ہی میں دفن ہوا۔ تاہم اس کی قبر کے نشانات تاریخی سمجھے جانے کے باوجود شبہ کی نظر سے بھی دیکھے جاتے ہیں۔ گویا زندگی میں اس کی شخصیت جس قدر پراسرار تھی، مرنے کے بعد اس کی آخری نشانی بھی اتنی ہی پُراسرار ہو گئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی ساری عمر جنگ کے میدانوں اور عشرت کدوں ہی میں نہیں گزری۔ امن و عافیت کے دنوں میں اپنے محل کے اندر رہتے ہوئے اس نے علوم و فنون کو ترقی بھی دی۔ دین مسیح ؑ کے بارہ ولیوں کی طرح اس کے بھی بارہ مصاحب تھے، جو اکبر کے نورتن کا شاید نقشِ اوّل تھے۔ ان میں بیربل اور ملّا دوپیازہ کی طرح مسخرے تھے اور ابوالفضل و فیضی کی طرح عالم و فاضل ہستیاں بھی۔ ان بارہ رتنوں کی وجہ سے شارلیمین کی زندگی کی بہت سی حکایات مشہور ہوئیں جن میں سے

بعض حقیقت پر مبنی ہیں اور بعض محض فرضی ہیں۔ ہر بیان کرنے والے نے اسے اپنے رنگ میں پیش کیا ہے لیکن زیادہ مشہور وہی قصّے ہیں جن میں اس کا کردار اعلا و ارفع دکھایا گیا ہے۔ جرمنی کے علاوہ آس پاس کے ملکوں میں بھی یہ کہانیاں ان کے ادبِ عالیہ کا جزو بن گئی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بعض بہت اچھی ہیں جو ندرتِ خیال اور پاکیزہ اندازِ بیان کی خوبیوں کے علاوہ اس کے کردار کی آئینہ دار ہیں۔ مثال کے طور پر مجھے یہ کہانی بے حد پسند ہے۔

**دُخترِ شارلیمین:** شارلیمین نے اپنی سلطنت کا صدر مقام توآخن کو بنایا تھا لیکن موسمِ گرما بسر کرنے کے لیے مُلک کے وسط میں ایک اور پہاڑی مقام انگل ہائم میں بھی سنگِ مرمر کا ایک خوب صورت محل بنوا رکھا تھا جو قصرِ ابیض کے نام سے مشہور تھا۔ یہ قصّہ اسی محل کے بام و در سے وابستہ ہے اور بیان کرنے والوں نے اسے بالکل سچا بتایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب بادشاہ امورِ سلطنت کے بعض پریشان کن حالات سے گھبراتا اور سکون کا متمنّی ہوتا تو وہ صدر مقام سے یہاں چلا آتا تھا۔ پہاڑوں کے دامن میں یہ پُرفضا وادی اس کے لیے سامانِ راحت پیدا کر دیتی تھی وہ یہاں آتے وقت اپنے خاص عملے اور مصاحب کے علاوہ افرادِ خاندان کو بھی ساتھ لے آتا تھا۔ خاص طور پر اس کا معتمدِ خاص ایگن ہارٹ ضرور اس کے ہمراہ ہوتا تھا۔

اس کے بارے میں شارلیمین کی بہت اچھی رائے تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ نوجوان اور خوب صورت تھا بلکہ اس لیے کہ وہ بڑا عالم اور مخلص انسان تھا۔ اس کے اطوار بھی پسندیدہ تھے۔ اسی لیے شاہی حرم میں آنے جانے کی اسے عام اجازت تھی۔ بلکہ بادشاہ نے اپنی سب سے محبوب لڑکی ایما کو جو اس کی بیوی گسمونڈا کے بطن سے پیدا ہوئی تھی، تعلیم و تربیت کے لیے اس کے سپرد کر دیا تھا۔

ایما عام لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ اُس کے بال سنہرے نہیں، سیاہ تھے اور آنکھوں کی پتلیاں بھی نیلی نہیں تھیں۔ خد و خال کی موزونیت اور قد و قامت کی رعنائیوں کے علاوہ حُسنِ اخلاق بھی رکھتی تھی۔ پھر ذہین و فطین اور عالی دماغ تھی۔ ان سب خوبیوں کے اعتبار سے وہ ملک کی حسین ترین دوشیزہ سمجھی جاتی تھی۔ ایسی صورت میں نوجوان معتمدِ خاص اس کے سحر

جمال وکمال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ لمبا اوقات تنہائی کے وہ لمحات جو تعلیم و تدریس میں بسر ہونے چاہیئے تھے، راز و نیاز کی باتوں میں گزرنے لگے۔ ایگن، ہارٹ تو بہت کوشش کرتا کہ اپنے فرائضِ منصبی کو نہ بھولے لیکن حسن کا جادو اور خود ایما کی ترغیبات کے سامنے مجبور ہو جاتا تھا۔

درحقیقت خود شہنشاہِ اعظم کو سوچنا چاہیئے تھا کہ امنگوں بھرے دل والی سیاہ چشم نوجوان لڑکی کی خلوت میں ایک نوجوان شائق علم کو اجازت قرب دینے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ رات کے خاموش لمحات میں جب محل کے سب مکیں نیند کی چادروں میں لپٹ کر سو جاتے تو دو بے قرار دل کہیں بیٹھ کر سینے میں چھپے ہوئے رازوں کی عقدہ کشائی کرنے لگتے۔ ایما دل کی تپش کو روشن الفاظ میں ڈھلتے ہوئے سنتی اور بے چین ہو کر خود بھی اس آگ میں جلنے لگتی۔ لیکن ان کی چاہت، پاکیزگی، تقدیس اور الوہیت کی علمبردار ہوتی۔ اس کو رکیک خواہشات سے دُور کا بھی واسطہ نہ ہوتا لیکن بدقسمتی اپنے جال کا تانا بانا ان کے خلاف بُن رہی تھی۔ بھلا وہ اُس کی سخت گرفت سے کس طرح بچ سکتے تھے۔

ایک روز وہ دونوں ایما کی خواب گاہ میں رات گئے تک میٹھے رازدارانہ گفتگو کرتے رہے۔ دراصل انھیں محسوس بھی نہ ہوا کہ شب کی سبک رفتار دیوی اپنے غیر مرئی قدموں کے ساتھ کس تیزی سے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ محل کے در و دیوار تاریک۔ خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کسی قسم کے نور کی رمق تک نظر نہ آتی تھی ستارے تک اپنے جھروکے بند کر کے آسمانی پردوں میں دبک کر سو گئے تھے اور جب ایگن ہارٹ نے رخصت کی اجازت لے کر باہر قدم رکھنا چاہا تو ان دونوں نے محسوس کیا کہ صحن برف کی سفید چادر سے ڈھکا ہوا ہے۔ آسمان سے گرے ہوئے برف کے پترے شروع میں بڑے نرم و نازک ہوتے ہیں۔ کوئی کتنی ہی احتیاط سے ان پر چلے، قدموں کے نشانات چھوڑے بغیر وہ گزر نہیں سکتا۔ پھر ستم یہ کہ ایسے نشانات دیرپا بھی ہوتے ہیں۔ وہ صبح کو چغلی کھا سکتے ہیں کہ یہاں سے گزرنے والا صنفِ نازک سے نہیں جنسِ قوی سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر ایما وہاں سے گزرتی تو شاعر کے الفاظ میں کہا جاتا ہے

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

لیکن ایگین ہارٹ کے بھاری بھرکم پاؤں شوخیٔ نقشِ پا کا مظاہرہ کس طرح کر سکتے تھے اور بہرنوع اسے نمودِ سحر سے قبل اپنی خواب گاہ میں پہنچ جانا ضروری تھا ورنہ افشائے راز کا خطرہ تھا اور وہ صحن کے بالکل دوسری جانب واقع تھی۔ تاہم محبت اندھی سہی لیکن کج فہم نہیں ہوتی۔ دونوں نے مل کر اس صورتِ حال پر غور کیا اور بظاہر لاینحل مسئلے کا معقول حل نکال لیا۔ ایما نے اپنی فطری نزاکت سے الگ ہو کر اپنے محبوب کو پیٹھ پر سوار کر لیا اور صحن کے پار چلی گئی اور اس طرح چھوٹے چھوٹے نسوانی نقوشِ پا برف کی سطح پر پڑتے چلے گئے۔

اُن کی دانست میں تیر تو یقیناً بھرپور تھا مگر افسوس نشانے پر نہ لگا۔ ہوا یہ کہ چارلس اعظم نظامِ سلطنت کی بعض پریشانیوں کے باعث جاگ رہا تھا اور برآمدے میں بیٹھا ان آلام سے نجات پانے کی فکر میں سرگرداں تھا۔ اچانک اس نے تاریکی میں ایک سفید سائے کو متحرک دیکھا۔ اس کے تجسس کی نگاہیں جاگ اٹھیں۔ اس نے بہت جلد اپنی چہیتی بیٹی کو پہچان لیا۔ قریب تھا کہ وہ اسے بیٹیا بانہ آواز دے اور اتنی سرد رات میں باہر نکلنے کا سبب دریافت کرے لیکن اس نے ایما کی پیٹھ پر کسی کو لدے ہوئے دیکھا اور ششدر و حیران رہ گیا۔ سببِ استعجاب یہ تھا کہ اس نے ایک ہی نظر میں ایگین ہارٹ کو بھی پہچان لیا تھا۔ اضطراری طور پر اس کے دل نے کہا کہ ابھی صحن میں جائے اور اسے موت کے گھاٹ اتار دے لیکن مختلف النوع جذبات کسی قدر مصلحت آمیز ہو گئے۔ اس نے دماغ کے ساتھ اپنے دل پر قابو پا لیا۔

وہ برآمدے سے اپنے ایوانِ استراحت میں چلا گیا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ بادشاہ نے رات کی تاریکی میں کیا دیکھا۔ اب سیاسی نہیں، خانگی مسائل پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ نڈھال ہو کر مسہری پر لیٹ گیا۔

دوسرے روز چارلس اعظم نے اپنے مشیروں کو جمع کیا جو اس کے ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تیور دیکھ کر سہم سے گئے۔ چہرے کی کیفیات جذباتِ قلب کی غمازی کر رہی تھیں۔ سب عمیق فکر میں ڈوب گئے، ایگین ہارٹ بھی جس کا دل سب سے زیادہ دھڑک

رہا تھا۔ شارلیمین نے سب کو مخاطب کر کے دریافت کیا ''رات کی تاریکی میں کوئی شخص چوری چھپے شہزادی سے ملنے آئے تو اس کی سزا کیا ہو سکتی ہے؟''

مشیرانِ خاص گم سم ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے۔ جواب میں پہل کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ ایگن ہارٹ کا چہرہ نعش کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر باہمی صلاح و مشورے کے بعد مصاحبین نے جواب دیا ''عالیجاہ! اپنی ناقص رائے میں اگر صنفِ نازک سچی محبت سے مجبور ہو کر رسم و رواج کے خلاف بھی کسی حرکت کا ارتکاب کر بیٹھے تو وہ شاہی مراعات کے تحت معافی کی مستحق ہے''۔

شارلیمین کا چہرہ سرخ ہو گیا ''اور اس معتمد خاص کی کیا سزا ہے جو شاہی اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی حد سے آگے بڑھ گیا ہو؟''

ایگن ہارٹ کپکپا اٹھا۔ اس پر مزید مردنی چھا گئی۔ تمام ایوان پر خاموشی طاری تھی، لیکن جلد ہی بادشاہ کے سکریٹری نے دل کڑا کر کے کہا: ''موت! جہاں پناہ! ایسی ہستی کو صرف موت کی سزا مل سکتی ہے''۔

اچانک زلزلہ آجانے سے جو کیفیات طاری ہو سکتی ہیں، وہ سب پر طاری ہو گئیں۔ خود شہنشاہ بھی حیران رہ گیا۔ تجویزِ سزا میں ارتکابِ جرم کا جو اعتراف پنہاں تھا، اسے بھلا کون محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ شارلیمین نے مشیروں کو رخصت کر دیا۔ صرف ایگن ہارٹ کو اپنے ہمراہ حرم میں چلنے کا اشارہ کیا اور وہاں پہنچ کر ایما کو بھی طلب کر لیا۔ بیٹی کو صورتِ حال کی سُن گُن مل چکی تھی۔ وہ کپکپاتی ہوئی آئی اور رحم کی درخواست کرتے ہوئے باپ کے قدموں پر گر پڑی۔ شہنشاہ خاموش رہا اور پھر کچھ دیر بعد بولا: ''محبت کے رشتے نے جن دو دلوں کو آپس میں باندھ دیا ہے، ان کو جدا کرنے کی تاب مجھ میں نہیں ہے۔ ابھی ابھی پادری کی زبان سے نکلے ہوئے چند بول تم کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیں گے لیکن دوسرے ہی لمحے تم کو اس محل سے بلکہ اس شہر سے ہمیشہ کے لیے چلا جانا ہوگا۔ یہ شاہی فرمان ہے اور اس کی تعمیل ہو کر رہے گی''۔

پھر وہی کچھ ہوا جو بادشاہ نے کہا تھا کس کی مجال تھی کہ اس حکم پر نظرِ ثانی کا مشورہ دیتا۔ آنسوؤں کے طوفان میں قول و قرار کی منزلیں طے ہوئیں اور

اس کے بعد محل کی چار دیواری کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دینا پڑا۔

دن، مہینے اور سال گزرتے چلے گئے۔ شاہ یمین نے سیکنی کے خلاف جنگ کا نقارہ بجوا کر دشمن کا سارا علاقہ جیت لیا۔ نئی سرزمین پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ روحی سلطنت کا تاج اپنے سر پر رکھ لیا۔ ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ لیکن راتوں کی نیند اور دن کا آرام اس کے لیے حرام ہو گیا تھا۔ غم کی مہر اس کے دل و دماغ پر ایسی لگی تھی کہ کسی عنوان دور ہونے میں نہ آئی۔ ماضی کے نقوش بھلانے کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا سورج مغرب کی وادیوں میں روپوش ہونے سے پہلے جب طشتِ افق سے لالے کے پھول لے کر شامِ سیاہ قبا کو مارتا تو ہر طرف بکھر جانے والی کرنیں بادشاہ کو اس کی خلوت گاہ میں مایوس و مغموم پاتیں اور جب موسم سرما کی خنک راتوں میں آسمان سے برف گرتی ہوتی تو وہ برآمدے میں نکل کر صحن کی طرف کبھی رخ نہ کرتا، مبادا کوئی سفید سایہ یخ بستہ فرش پر چلتا نظر آ جائے اور اسے ایک بار پھر اپنے جذبات پر قابو پا کر اصولوں پر عمل کرنا پڑ جائے۔ شاعر کی لکھی ہوئی کوئی منظوم داستان یا کسی فلسفی کا مرتبہ دفترِ پند و نصائح اس کے لیے جاذبِ نظر نہ بنتا۔ رقص و موسیقی کی محفلیں بھی اس کا دامن نہ کھینچ سکتیں۔ وہ ان سب چیزوں کو یاد کرتا لیکن بھلا دینے کے لیے۔ اب یہ سطحی رنگینیاں اس کی نگاہ میں ماند پڑ چکی تھیں۔

ایک روز مصاحبین خاص نے آپس میں غور و خوض کے بعد فیصلہ کر کے بادشاہ کو ترغیب دی کہ وہ سابقہ معمول کے مطابق سیر و شکار کے لیے چلے۔ کسی نہ کسی طرح اسے آمادہ بھی کر لیا گیا اور اس کے ساتھ ہی بڑے اہتمام سے لائحہ عمل مرتب کیا جس میں غم نصیب دل کے بہلاوے کا پورا سامان شامل تھا۔ لیکن پراگندہ خیالات کے ساتھ جب جنگل بیابان میں — اور وہ بھی گھنے جنگل میں — گھوڑا دوڑایا جائے تو ساتھیوں سے بچھڑ جانے اور راستہ بھول جانے کے امکانات یقینی ہوتے ہیں۔ سینکڑوں اساطیر الاولین ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ اس موقع پر بھی یہی ہوا۔ ہرن کے پیچھے شہنشاہ نے گھوڑا ڈالا اور مصاحبین سے بچھڑ گیا۔ بالکل نیا ماحول تھا۔ شام ہو چلی تھی۔ درختوں کے سائے رات کی تاریکی سے گلے مل کر معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ تاج و تخت کے مالک کو تشویش لاحق ہوئی کہ بستر کے بغیر یہ رات جنگل ہی بسر کرنی پڑی

تو کیا ہوگا۔

وہ ایک امیدِ موہوم میں رواں دواں تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ گویا امید کی کرن نمودار ہوئی۔ اسی سمت چل پڑا اور بالآخر ایک جھونپڑی کے قریب جا پہنچا۔ گھوڑے کی ٹاپ صدائے جرس بن چکی تھی جو کسی کی آمد کا سندیسہ لاتی ہے۔ جھونپڑی کے مکین برآمد ہوئے —— ایک نوجوان ۔ ایک حسینہ ۔ اور ایک معصوم بچہ ۔ مرد اور عورت پہلے تو ٹھٹکے، پھر آگے بڑھے اور گھٹنے ٹیک کر آداب بجالائے۔ شاہ لیمین نے دونوں کو پہچان لیا اور ننھے معصوم کے وجود کی حقیقت کو بھی سمجھ لیا۔ آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے رواں ہو گیا۔ گم شدہ جنت اس کے قدموں پر سرنگوں تھی اور وہ اشک بہا کر اپنے بیمار دل کو غسل صحت دے رہا تھا۔

اس نے ان دونوں کو گلے لگا لیا اور پھر بچے کو سینے سے چمٹا کر چومنے لگا۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کو اپنے کھوئے ہوئے جزو کے مل جانے سے تسکین ہو گئی۔ وہ رات سب نے جاگ کر آنکھوں میں کاٹ دی لیکن سرگرانی و پریشانی کی رات نہیں۔ بلکہ ایک ایسی رات جو صبح کو منائے جانے والے کسی مقدس تہوار سے پہلے آتی اور ایک مژدۂ جانفزا ساتھ لاتی ہے۔ وہ صبح ایک مقدس تہوار سے بھی زیادہ دل خوش کن تھی۔ جبکہ چار افراد کا چھوٹا سا قافلہ شاہی محل کی طرف روانہ ہوا اور جس کی خوشی میں سات دن تک نوبت بجتی رہی۔

**کولون:** گاڑی جو نو بج کر دس منٹ پر بون سے چلی تھی، نو بج کر چونتیس منٹ پر کولون پہنچ گئی۔ یہاں ہمارا قیام ہوٹل ایکسلسیئر ارنسٹ میں ہوا جو ڈوم پلاٹز نامی سڑک پر واقع ہے۔ ہوٹل پرانا ہے مگر شاندار اور قیمتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ ٹھاٹ باٹ دکھائے جاتے ہیں جن سے ہم دونوں بھائی گھبرا لیتے ہیں۔ پھر اس تکلف پر مستزاد یہ کہ اخراجات بھی زیادہ ہیں۔ ایک شخص کا صرف خرچ قیام پینتیس مارک یومیہ ہے۔ ایک مارک ایک روپے دو آنے کا ہوتا ہے۔ اب حساب لگائیے کہ کھانے سمیت اور ٹپ ملا کر روزانہ کتنا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ کھانا بجائے خود گراں اور بے مزہ ہوتا ہے۔ ہر شخص کو کم سے کم پندرہ مارک ادا کرنے پڑتے ہیں اور پھر بھی بھوکا اٹھنا پڑتا ہے۔ مگر خیر۔ کولون کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یورپ کے اکثر اور جرمنی کے بہت سے بڑے شہروں کی طرح کولون کی تاریخ کافی پرانی اور خاصی دلچسپ ہے۔ جرمن زبان میں اسے کولن (لام ساکن) اور لاطینی میں کولونیا ایگری پینیا کہتے ہیں۔ اس کا قدیم ترین نام اوپی ڈم یوبی اورم تھا جب روم کے شہنشاہ آگسٹس نے اسے فتح کرکے اپنی سلطنت میں ملالیا تو اس کا نام اوگسٹا یوبی اورم ہوگیا۔ لیکن اس وقت تک اس مقام کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ البتہ آگسٹس کی بیٹی جولیا کے بطن سے ایک لڑکی اسی مقام پر پیدا ہوئی جس کا نام وپسانیا ایگری پینا رکھا گیا اور چونکہ اس زمانے میں اس علاقے نے ترقی کرلی تھی، اس لیے نومولود کی رعایت سے اس بستی (کولونی) کا نام کولونیا ایگری پینا یعنی ایگری پینا کی بستی مشہور ہوگیا۔ شہروں کے اتنے بڑے نام عموماً برقرار نہیں رہتے کیونکہ انسانی طبیعت بڑی حد تک اختصار پسند ہے۔ اس لیے نام مختصر ہوکر صرف کولونیا رہ گیا۔ اسی سے کولون بن گیا۔

یہ ۵۰ء کا ذکر تھا۔ دو سو اسّی سال بعد یعنی ۳۳۰ء میں فرینکوں نے اسے ہتھیالیا لیکن وہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر تک اس پر پوری طرح قبضہ نہ کرسکے۔ ۴۷۵ء میں فرینک فرمانروا چلڈیرک نے اس جگہ رہائش اختیار کرلی جس کا قدرتی ماحول اسے بہت پسند تھا۔ کولون کے نوابوں کا خاندان نویں صدی تک اسے اپنی راجدھانی بنائے رہا۔

چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں جب پاپائیت نے روم میں عروج پایا اور ۳۱۳ء میں ہولی سی (شہر مقدس) کے نام سے ایک علاقہ پاپائے روم کے لیے مخصوص کردیا گیا تو نچلے درجے کے پادریوں کے لیے بھی علاقے نامزد کیے جانے لگے۔ یہ سلسلہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا۔ شارلیمین کے عہد میں جب یہ ویسٹ فالیا کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا تو اس نے ایک بڑا پادری، ہلڈے بولٹ اس مقام کے لیے مقرر کیا جو ۷۸۵ء سے ۸۱۹ء میں اپنی وفات کے وقت تک مذہبی فرمانروا بنا رہا۔ اس کے جانشینوں میں سب سے زیادہ عالم و فاضل برونو تھا جو ۹۵۳ء سے ۹۶۵ء تک اپنا عہدہ سنبھالے رہا۔

۱۱۸۰ء میں سلطنت کے ٹکڑے ہوئے تو سارا نظام بدل گیا۔ ۱۳۵۶ء میں نئے

قوانین نافذ ہوئے اور کولون کو ایک آزاد شہر تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۸۰۳ء میں دریائے رھائن کے دائیں کنارے پر جتنے شہر آباد تھے، وہ مختلف جرمن ریاستوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ کولون کا علاقہ فرانس کو مل گیا۔ لیکن بہت جلد یعنی ۱۸۱۵ء میں ویانا کانگریس نے فیصلہ کیا کہ یہ سارا علاقہ پرشیا کے سپرد کر دیا جائے۔ اس وقت سے اس شہر کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ حکومتِ وقت نے اسے صوبے کا صدر مقام بھی بنا دیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد صلحنامہ عمل میں آیا تو شرائطِ صلح کے بموجب کولون اور آس پاس کے اٹھارہ مربع میل کے رقبے پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ بلکہ برطانیہ کی فوج نے وسطی یورپ میں اسے اپنا صدر مقام بنا لیا اور ۳۰ جون ۱۹۲۶ء تک اس قبضے کو بحال رکھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں انگریزوں نے بُری طرح اس پر بمباری کی۔ سب سے زیادہ تباہی کی تاریخ ۳۰ مئی ۱۹۴۳ء تھی، جب کہ ایک ہزار ایک سو تیس ہوائی جہازوں نے بیک وقت حملہ کر کے نوّے منٹ میں لاتعداد بم پھینکے۔ نہ صرف کولون بلکہ قرب وجوار کا علاقہ جو مجموعی طور پر پانچ ہزار ایکڑ کے قریب بتایا جاتا ہے، بالکل برباد ہو گیا۔ چند بہت ہی مضبوط عمارتیں، جن میں بعض گرجا گھر شامل ہیں، برقرار رہ گئیں۔

مؤرخین اور سیاست داں الزام لگاتے ہیں کہ ہٹلر نے اپنے دورِ آمریت میں جرمنی سے یہودیوں کو خارج الملک کر کے بڑا ظلم وستم ڈھایا لیکن اس سے بہت پہلے ۱۴۲۴ء میں بھی یہودیوں کو کولون سے ترکِ وطن کر جانے کا حکم ملا تھا کیونکہ حکومتِ وقت کو ان کے کردار اور اعمال پر اعتماد نہیں تھا۔ اس وقت بھی یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ وہ مالی منفعت کی خاطر قوم فروشی روا رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جب مذہبی تنازعات شروع ہوئے تو پروٹسٹنٹوں کو بھی یہاں سے نکل جانے کا حکم ملا۔ یہودی اور عیسائی بھی، جنھوں نے پروٹسٹنٹ عقیدے کو تسلیم کر لیا تھا، صاحبِ ثروت تھے۔ دونوں موقعوں پر ان کے خارج الملک ہو جانے سے یہاں کی اقتصادی حالت کو نقصان پہنچا۔ صنعت اور تجارت کو دھکا لگا اور دونوں موقعوں پر کافی مدّت کے بعد یہ شہر سنبھالا لے سکا۔ چونکہ اس کے قدرتی وسائل بہت وسیع ہیں، اس لیے ان دونوں موقعوں پر اور دونوں عالمگیر لڑائیوں کے بعد بھی اس شہر نے اپنے اقتصادی نظام کو

بہت جلد بحال کر لیا ہے۔

**ڈاکٹر مڈاؤس اینڈ کمپنی:** اس نام سے کولون میں ہومیوپیتھی کی دوائیں بنانے کا ایک بڑا کارخانہ قائم ہے۔ ان سے پروگرام کے مطابق گیارہ بجے ملنا تھا، اور ان کا کارخانہ دیکھنا تھا۔ چنانچہ ہوٹل میں سامان رکھ کر فوراً ان کے ہاں روانہ ہو گئے۔ ہماری دلچسپی کی خاص بات یہ تھی کہ اس کمپنی میں دواؤں کے خلاصے پانی میں نکالے جاتے ہیں اور یہ ترکیب ہماری لائن کی ہے، کیونکہ ہم بھی ہمدرد لیبارٹری میں دواؤں کے خلاصے بجائے الکحل کے پانی سے نکالتے ہیں۔ ہومیوپیتھی میں جب کسی جڑی بوٹی کا خلاصہ پانی میں نکل آتا ہے تو اسے مدر ٹنکچر کہتے ہیں۔ یہ ان کی دواؤں کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد اس قسم کی دوائیں الکحل میں تیار کی جاتی ہیں یعنی مدر ٹنکچر کا ایک قطرہ الکحل کے ایک سو قطروں میں ملایا تو ایک طاقت کی دوا تیار ہو گئی۔ اس سیال میں سے ایک قطرہ لے کر پھر ایک سو قطرے الکحل کے ملائے اب اس کی طاقت دو ہو گئی۔ اسی انداز میں جس قدر الکحل ملاتے جائیں گے، طاقت بڑھتی جائے گی۔ بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ زیادہ مقدار میں الکحل ملاتے رہنے سے دوا کی طاقت گھٹنی چاہیئے لیکن ہومیوپیتھی کے اصول پر یہ طاقت بڑھتی رہتی ہے۔ ایلوپیتھ ڈاکٹر اسی نظریے کا مذاق اڑاتے ہیں جس کا اصولی طور پر انھیں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

فیکٹری میں داخل ہونے پر ڈاکٹر اوٹو ہاور نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے واسطے ڈاکٹر مڈاؤس اینڈ کمپنی کے اعلیٰ نمائندے کی حیثیت سے متعین ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کراچی کے ڈاکٹر عبدالحمید جو ایک مشہور ہومیوپیتھ ہیں، پاکستان میں ڈاکٹر مڈاؤس اینڈ کمپنی کے ایجنٹ ہیں۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر موصوف کا مطب ہمارے ہمدرد مطب کے بالکل سامنے ہے۔ اس اطلاع پر انھیں ہمدرد کا نام یاد آ گیا کیونکہ یہ خود کئی بار پاکستان اور ہندوستان آ کر قیام کر چکے ہیں۔ ان کا کام ہی مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ملکوں میں دورے کرنا ہے۔ یہ دورے خالص تجارتی نقطۂ نظر سے کئے جاتے ہیں۔

ہم نے ان کی فیکٹری کو شروع سے آخر تک دیکھا اور انھوں نے دکھایا بھی خوب ذوق و شوق کے ساتھ۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کا اپنا بہت بڑا باغ ہے جہاں وہ کام آنے والے پودوں کی کاشت کرتے ہیں اور دوا سازی کے لیے تازہ پودوں کا رس نکال کر کام میں لاتے ہیں۔ ہم نے ان کا باغ بھی دیکھا اور ہر چیز کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا۔ کام یقیناً کافی بڑا ہے۔ ہم وہاں کی صفائی ستھرائی سے بھی بے حد متاثر ہوئے۔ ان کے ہاں کھرلیں عمدہ قسم کی لگی ہوئی ہیں۔ فولادی کھرلیں بجلی کی قوت سے چلتی ہیں اور ذرا سی دیر میں ہر چیز کو پیس کر سرمہ کر دیتی ہیں۔ کھرل سازوں کے پتے ہمیں نہیں مل سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ برادر عزیز محبوب الٰہی کو سب پتے پوسٹ روانہ کر دیں گے اور میاں محبوب کھرل ساز کمپنی سے خط و کتابت کر کے کراچی اطلاع دیں گے۔ ہم نے ان کو کھرل کے سائز وغیرہ کے بارے میں ہدایات دے دیں۔

یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ ڈاکٹر مڈاؤس اینڈ کمپنی اپنی دواؤں کے انجکشن بھی تیار کرتی ہے۔ اگرچہ ہومیوپیتھی کی ہر دوا، بشرطیکہ وہ صحیح طور پر منتخب کی گئی ہو، فوری اثر دکھاتی ہے لیکن انجکشن اس سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ ان انجکشنوں کی بنیاد بھی مدر ٹنکچر ہوتی ہے۔ بعد کا طریقہ ذرا مختلف ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اوٹو ہاور نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اگر کسی دوا یا انجکشن کا لیبل الگ ہو جائے تو پھر کوئی بھی شخص اس کی اصلیت کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکتا۔ نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ یہ کیا دوا ہے اور نہ یہ کہ وہ کس طاقت کی ہے۔ دونوں میں سے کسی بات کو جانچنے کا نہ کوئی آلہ تیار کیا گیا ہے اور نہ معیار مقرر ہے۔

**کلیان اینڈ کمپنی:** ڈاکٹر مڈاؤس اینڈ کمپنی سے فارغ ہو کر ہم کلیان اینڈ کمپنی گئے کیونکہ ہم قرصوں اور گولیوں پر شکر چڑھانے والی مشینوں کی جدید تکنیک کو سمجھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہاں جا کر خود مشین کو چلا کر دیکھا اور اس کے تمام طریقوں کو سمجھا۔ کراچی میں اس قسم کی مشینوں کے آ جانے پر یہ کام ہمیں خود اپنے کارکنوں کو سمجھانا ہوگا کیونکہ انھیں تربیت کے لیے جرمنی بھیجنا ممکن نہیں ہوگا اور

اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ کام بہت آسان ہے۔ البتہ اس کمپنی میں لگی ہوئی مشینیں ہماری ضرورت سے بہت بڑی ہیں۔ ایک گھنٹے میں پچیس ہزار قرصوں پر شوگر کوٹنگ کر دیتی ہیں۔ ہماری ضرورت فی الحال اتنی نہیں ہے۔ ہم ہر قسم کے قرص پر شکر چڑھانا نہیں چاہتے۔ سائز بڑا ہونے کے باعث ہر مشین کی قیمت بھی بہت زیادہ رکھی گئی ہے یعنی چوبیس ہزار مارک (ایک مارک = ایک روپیہ دو آنے) چھوٹی مشینیں کم قیمت کی ہیں اور ہم انہی کی فرمائش کر سکتے ہیں۔

اس کمپنی کے مالک ایک انگریز ڈاکٹر ہیں اور ان کی اہلیہ جرمن خاتون ہیں۔ دونوں کے اشتراک عمل سے کمپنی خوب چل رہی ہے۔

اپنے ہوٹل جا کر کھانا کھانے کے بجائے راستے ہی میں ایک ریستوراں میں چلے گئے۔ ایک چیز ہم سب نے پسند کی۔ اسے یاد نہیں رہا کہ جرمن زبان میں کیا کہتے ہیں۔ آلو کا بھرتہ بنا کر پھینٹے ہوئے انڈے کے ساتھ ملا کر تل لیا جاتا ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس میں نمک مرچ خوب زیادہ تھا۔ عام طور پر اتنا چٹ پٹا کھانا اس ملک میں تیار نہیں ہوتا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر کے لیے ایک باغیچے میں چلے گئے۔ دھوپ میں ذراستائے، وہیں نماز بھی پڑھی۔ اور پھر اس شہر میں پروگرام کی آخری شق کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چل پڑے۔

**اوڈی کولون:** چار بجے کولون کی اس عظیم الشان فیکٹری کو دیکھنے کا پروگرام تھا جو اوڈی کولون یعنی "کولون کا پانی" تیار کرنے کے سبب دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اکثر لوگ اسے غلطی سے یوڈی کولون کہتے ہیں "او" جس کے ہجے انگریزی حروف تہجی کے اعتبار سے ای اے یو ہیں، فرانسیسی لفظ ہے جو لاطینی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے معنے ہیں "پانی" محض پانی۔ لیکن درحقیقت یہ ایک خوشبودار سیال ہے جسے بعض منچلے اپنے لباس کو معطر کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ اس کا مصرف دوائی ہے۔ ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ خصوصاً سرسام کی صورت میں اسے بالکل اسی طرح کام میں لایا جاتا ہے جیسے طب مشرقی میں روغن گل اور عرق گلاب استعمال کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اوڈی کولون کی تاثیر سرد ہے۔ بالفعل اور بالقوی بھی اور روغن گل کی تاثیر محض سرد بالقوی ہے۔ اگر روغن گل ہتھیلی پر ڈالا جائے تو کوئی خاص

کیفیت محسوس نہیں ہوگی۔ لیکن اوڈی کولون ڈالا جائے تو محسوس ہوگا کہ وہ یخ پانی ہے اور اس کی یہ کیفیت ہر موسم میں اور جب تک اس کی شیشی سر بند ہے، قائم رہتی ہے۔

چار بجے ہم کولون کے ایک علاقے مل ہنس میں گلوکن گاسے نامی سڑک کے چوراہے پر پہنچے تو فیکٹری کے نام کے بجائے چار ہندسے "4711"، اس کی بالائی منزل پر لکھے ہوئے نظر آئے۔ فیکٹری کا نام ہے "اوڈی کولون انڈ پرفیومری فابرک" یعنی اوڈی کولون اور عطر تیار کرنے والا کارخانہ"، ہم ان ہندسوں کی وجہ تسمیہ سمجھنے کی کوشش میں تھے کہ فیکٹری کے سکریٹریٹ کے ایک افسر اعلا نے باہر نکل کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ مختصر تعارف کے بعد وہ ہمیں دفتر میں بٹھا کر چائے پانی سے تواضع کرنی چاہتے تھے لیکن ہم نے صاف کہدیا کہ ہمارے پاس وقت کم ہے اور ہم فیکٹری دیکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہتے ہیں۔ لہذا رسمی باتوں کو ترک کیا جائے۔ وہ ہمارے اس اظہار شوق سے بہت متاثر ہوئے اور ہمیں ساتھ لے کر چل پڑے۔

عطر ہو یا سنٹ، عام طور پر خوشبو کی شیشیاں انگلی کی دو یا تین پوروں کے برابر اور اتنی ہی پتلی یا ہتھیلی کی طرح پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن یہاں عطروں اور سنٹوں سے بھرے ہوئے لکڑی اور جست کے بڑے بڑے پیپے دیکھے اور ان پیپوں کو جن حوضوں میں بھرے ہوئے سیال سے لبریز کیا جا رہا تھا، وہ اتنے بڑے تھے کہ اگر ان میں ہاتھی کود پڑے تو ڈوب کر مر جائے۔ سنٹ کی ہر قسم کے لیے ایک حوض مخصوص تھا۔ خوشبوؤں اور اوڈی کولون کے علاوہ یہاں بعض ایسنس بھی تیار ہوتے ہیں۔ بجلی سے گرم ہونے والے بڑے بڑے بھبکے عمل تقطیر کے ذریعہ عطر کشید کرتے ہیں بعض صورتوں میں صرف جوشاندے تیار ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں بڑے بڑے حوضوں میں جڑی بوٹیاں پانی میں بھیگی ہوئی نظر آئیں۔ بعض مشینیں سبزیوں کے رس نکال رہی تھیں، جنھیں صاف مقطر کر کے مختلف مرکبات میں آمیز کیا جاتا ہے۔

فیکٹری کے افسر صاحب ہر چیز دکھاتے چلے گئے لیکن تفصیل سے کوئی چیز

بیان نہیں کی۔ حتیٰ کہ ہمارے دریافت کرنے پر یہ بھی نہیں بتایا کہ حوضوں میں کون سی جڑی بوٹیاں بھیگی ہوئی ہیں۔ یا یہ کہ اوڈی کولون کوئی مفرد شے ہے یا مرکب اور اگر مرکب ہے تو اس میں کون کون سی چیزیں شامل ہیں۔ ہم نے اندازہ لگالیا کہ یہاں مصنوعات کے نسخوں اور فارمولوں کو پوری طرح صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے۔ خود ان کا کہنا تھا کہ ہماری ترقی کا راز اخفائے راز میں پنہاں ہے۔ ہم نے بھی زیادہ کرید نامناسب نہیں سمجھا عطر اور سنٹ سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں تھا۔ البتہ ایسنس دل چسپی کا مرکز بن سکتے تھے لیکن ان کی تیاری ہمارا کام نہیں تھا۔ ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو جاتا تو اچھا تھا۔

افسر موصوف نے یہ ترکیب چلی کہ مختلف شعبے دکھانے کے ساتھ ساتھ اپنی فیکٹری کی تاریخ اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے رہے تاکہ ہم اُن کی باتیں سنیں، اور جو چیز سامنے آئے، اس کا مشاہدہ کرلیں اور بس۔ اس منزل سے آگے نہ بڑھیں۔ تاہم جو باتیں انھوں نے بیان کیں، وہ ہمارے سفرنامے کے لیے مفید تھیں۔ انھوں نے پراسرار ہندسوں — ۴۷۱۱ — کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس فیکٹری کے موسس اوّل دو مردوں کے جس مکان میں رہتے تھے، اس کا نمبر ۸ اکتوبر ۱۷۹۲ء کی مکان شماری کے وقت ۴۷۱۱ درج کیا گیا تھا۔ اسی کے ایک کمرے میں فیکٹری کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر آس پاس کی عمارتیں اس میں مدغم ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ پورا بلاک ایک سرے سے دوسرے سرے تک کمپنی کی ملکیت ہو گیا پھر سب کو ڈھا کر ایک عظیم عمارت تعمیر کرلی گئی۔ اس عمارت کے بڑے حصے دونوں عالمگیر لڑائیوں میں مسمار ہو گئے لیکن بہت جلد شکر تعمیر کرلیے گئے۔ کمپنی نے شروع ہی میں فیصلہ کرلیا تھا کہ ۱۷۹۲ء میں جو نمبر اس عمارت پر پڑا تھا، وہ ایک علامتی نشان کی حیثیت سے قائم رکھا جائے گا۔ بلکہ اس وقت ایک سنٹ کا نام بھی ۴۷۱۱ ہے اور بعض مصنوعات پر "ساختہ ۴۷۱۱" درج کیا جاتا ہے۔

اوڈی کولون کے بارے میں ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح تھا کہ شہر کولون اور اوڈی کولون اس طرح لازم و ملزوم سے ہو گئے ہیں کہ ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ممکن نہیں۔ کولون کے اس "پانی" کی ابتدائی تاریخ بڑی دل چسپ ہے۔

اس ضمن میں مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ فیکٹری کے ارباب اقتدار نے جو روایت منضبط کر رکھی ہے، اسے مصدقہ سمجھا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی ابتدا ایک شخص ولہلم مل ہنس سے ہوئی ہے۔ اسی لیے علاقے کا نام بھی مل ہنس ہی پڑ گیا ہے۔ وہ ۱۶۹۰ء میں میلان سے چل کر یہاں آیا اور ہمیشہ رہنے کے خیال سے آباد ہو گیا۔ ۸ر اکتوبر ۱۶۹۵ء کو اس کی شادی ہوئی تو تقریب میں کارٹ ہوس کا ایک راہب کارل گیریون ماریا فارینا بھی شامل تھا۔ اس نے شادی کے تحفے کے طور پر ایک نسخہ دولھا کو عطا کیا اور کہا کہ اس ترکیب سے جو سیّال تیار کرو گے، وہ جادو اثر ہوگا۔ ولہلم مل ہنس نے کچھ عرصے بعد نسخے کو عملی جامہ پہنایا اور جو چیز تیار ہوئی وہ حقیقتاً جادو اثر تھی۔ اسی لیے اس کا نام "اکوا ایڈمیرابلس" یعنی جادو کا پانی رکھا گیا۔ وہ صرف دوا کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ اس وقت کیفیت کے اعتبار سے نہ اس میں خوشبو تھی اور نہ تاثیر کے لحاظ سے اسے سرد بالقویٰ کہا جا سکتا تھا۔

مل ہنس نے مرتے وقت یہ راز اپنے بھتیجے گیووٹی پاؤلو فیمی نس کو سونپ دیا۔ اور ہدایت کی کہ اسے راز رکھنا اور عمل کرتے رہنا۔ بھتیجے صاحب نے نسخے کی اشیا میں چند مفردات کا اضافہ کیا اور اس کا نام اوڈی کولون رکھ دیا۔ حسن اتفاق ہے کہ موسس اول کی تاریخ شادی اور دوسرے کارخانے کی عمارت پر نمبر ڈالنے کے لیے مکان شماری کی تاریخ یکساں تھی، یعنی ۸ر اکتوبر۔ اسی لیے جب فیکٹری کی سالگرہ ۸ر اکتوبر کو منائی جاتی ہے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ یہ تقریب کس خوشی میں ہے۔

اس کام کی ابتدا دو نفر نے کی تھی اور اس وقت فیکٹری کے ملازمین کی تعداد ایک ہزار دو سو ہے۔ شاخوں پر کام کرنے والے افراد عملہ ان کے علاوہ ہیں۔ لیکن ان کارکنوں میں سے کوئی بھی شخص اوڈی کولون کی تیاری کا راز نہیں جانتا۔ البتہ یہ سب کو معلوم ہے کہ بعض پھولوں، جڑی بوٹیوں، معدنی دواؤں اور گرم مسالوں کو الگ الگ اور یکجا الکحل میں بھگویا اور ابالا، پھر نتھارا یا عمل تقطیر کے ذریعہ عرق تیار کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک جزو ایسا ہے جو خاندان کا ایک رکن سب کی غیر موجودگی میں اس تیار شدہ "پانی" میں آمیز کرتا ہے۔ یہی سب سے بڑا راز ہے جواب

تک کوئی معلوم نہ کر سکا۔

اپنی رائے یہ ہے کہ محض دلچسپی کے خیال سے ایک افسانوی رنگ دینے کی خاطر یہ عمل بیان کیا جاتا ہے ورنہ روح کیوڑہ، روح گلاب یا عرق بید مشک کی طرح اوڈی کولون بھی ایک عام کشید ہے جس کی حقیقت کو معمولی تجزیے کے بعد سمجھا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ملک میں بھی بعض عطائی قسم کے دوا سازوں نے اپنی تیار کردہ دواؤں کے بارے میں ایسے قصے گھڑ رکھے ہیں کہ ان کے نسخے کسی فقیر کا عطیہ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض مفید ہوتے ہیں۔

فیکٹری دیکھنے کے دوران میں سورج کی شعاعیں روپوش ہو گئی تھیں۔ بادل آسمان پر چھا گئے تھے۔ باہر نکلے تو بوندیاں پڑ رہی تھیں۔ ابھی رخصت بھی نہ ہونے پائے تھے کہ بارش تیز ہو گئی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر افسر موصوف نے اپنی کمپنی کی موٹر کار پیش کی اور کہا کہ ٹیکسی یہاں آسانی سے نہیں ملے گی۔ بہتر یہ ہے کہ اسے استعمال کر لیا جائے۔ ہم نے بھی اس پیش کش کو غنیمت سمجھا اور شکریہ کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔ ہم سیدھے اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ بازاروں میں گھومنے کا موقع نہیں تھا۔ گاڑی سے اترنے کے بعد سے برابر گردش میں تھے۔ تھک گئے تھے۔ آرام کرنے کی ضرورت تھی۔ خصوصاً بھائی جان محترم اپنے معمول کے مطابق غسل نہیں کر سکے تھے۔ وہ اس کے لحاظ سے کچھ متاثر سے معلوم ہو رہے تھے۔ روزانہ غسل کرنے کا عادی تو میں بھی ہوں، لیکن اگر کسی روز ناغہ ہو جائے تو اسے گوارا کر لیتا ہوں۔ ہوٹل چلا جانا اس لیے بھی مناسب تھا کہ کل صبح پھر سامان باندھ کر لاد کر ریل پر جانا تھا کیونکہ اگلا دن ڈسلڈورف کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

**میلوں نمائشوں کا شہر:** کولون اس مہینے میں بین الاقوامی میلوں کا شہر کہلاتا ہے جن میں نمائشیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ہمارے آنے سے پہلے اس مہینے کے بالکل شروع میں ۳ سے ۶ ستمبر تک سائنسی فوٹوگرافی کا ایک بین الاقوامی میلہ ہوا تھا۔ اس میں ریاست ہائے متحدہ اور یورپ کے سبھی ملکوں نے حصہ لیا تھا۔ یہ تو حقیقت ہے کہ جملہ سائنسی اختراعات کی تصاویر اس موقع پر نہیں دکھائی گئی ہوں گی بہت

سی چیزوں کے بعض پہلوؤں کو پردۂ راز میں رکھا گیا ہوگا۔ صرف انہی تصاویر کا انتخاب کیا گیا ہوگا جو عام معلومات سے متعلق ہوں گی۔ اس کے ختم ہوتے ہی ۷ سے ۹ ستمبر تک روزمرہ استعمال میں آنے والے گھریلو سامان اور لوہے فولاد کی چیزوں کا بین الاقوامی میلہ ہوا۔ اس کے ایک ہفتے بعد ۱۶ سے ۱۸ ستمبر تک پارچہ جات اور ملبوسات کا بین الاقوامی میلہ منعقد ہوا۔ اس میں ہر ملک نے اپنی مصنوعات، اپنے قومی لباسوں اور ایسے لباسوں کی نمائش کی جو ہر جگہ پہنے جا سکتے ہیں۔ ان تینوں قسم کے میلوں میں چیزوں کی فروخت کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ سنا ہے کہ بہت دھڑلے کے ساتھ دوکانداری ہوتی ہے اور زائرین خوب دل کھول کر انہیں خریدتے ہیں۔

آج شوقیہ عکاسی کرنے والوں کی عالمی انجمن کی طرف سے ایک نمائش کا افتتاح ہوا ہے جو تین دن کے لیے عوام کی خاطر کھلی رہے گی۔ اگر آج بارش نہ ہوتی تو شاید وہاں جانے کا موڈ ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ بہت ہی انوکھے زاویوں سے لی ہوئی بہت سی دلچسپ چیزوں اور شخصیتوں کی تصاویر دکھائی جا رہی ہوں گی۔ ہمیں خود تصویر کشی کا شوق نہیں ہے لیکن اچھی چیز پر پسندیدگی کی نگاہ سب ہی کی پڑ جاتی ہے۔

ہمارے چلے جانے کے تین دن بعد ۲۹ ستمبر سے "فوٹو کینا" کے نام سے عام تصویروں اور فلموں کی ایک بین الاقوامی نمائش ہوگی اور وہ دس دن جاری رہے گی۔ اس میں مختلف ملکوں اور زبانوں کے فلم مختلف زبانوں کی کومنٹری کے ساتھ دکھائے جائیں گے۔ ہمارے نپے تلے پروگرام میں اتنی لچک کہاں سے آئے کہ اسے دیکھنے کے لیے ٹھیر جائیں۔ نمائش یقیناً اچھی ہوگی۔ کولون کے علاوہ دوسرے شہروں کے لوگ بھی اسے دیکھنے آئیں گے۔ ان ثقافتی اور معاشرتی موضوعات سے قطع نظر خالص مذہبی رنگ میں جرمن کیتھولک کا ستتر واں اجلاس بھی پچھلے مہینے اس شہر میں شروع ہوا تھا جو ۲ ستمبر تک جاری رہا۔ معلوم ہوا کہ کولون میں ہر سال کے اس مہینے میں اتنی ہی گہما گہمی رہتی ہے۔

بارش بڑھ جانے کے باعث خنکی میں کسی قدر اضافہ ہو گیا۔ وہ زیادہ ناگوار تو نہیں تھی لیکن طبیعت گرمائی چاہتی تھی۔ میں ٹیبل لیمپ قریب کر کے، کمبل اوڑھ کر کہانیوں کی کتاب لے کر لیٹ گیا کہ چلو آج کچھ مطالعہ ہی کیا جائے۔ موسم خراب ہونے

کے باعث کراچی تو کجا لندن کی نشریات بھی صاف طور پر سنی نہیں جاسکتی تھیں۔ کتاب میں ایک کہانی کولون سے متعلق تھی۔ بس اسی کو پڑھنا شروع کر دیا۔

**کولون کا سانحہ:** یہ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط کا ذکر ہے۔ مقدس شہر کولون پر موت کا سایہ پڑ رہا تھا۔ گہرے سیاہ رنگ کے لباس میں ایک عجیب و غریب ہستی تیز تیز قدموں کے ساتھ گلی کوچوں سے گزرتی اور ہر طرف صفایا پھیرتی چلی جا رہی تھی۔ یہ طاعون کی مظہر، موت کی شبیہہ تھی۔ اس کا زہرناک سانس غرباء کے جھونپڑوں سے لے کر شاہی محلات تک یکساں اپنا اثر جما رہا تھا۔

گورکنوں نے متعدد مکانات کے دروازوں پر سیاہ صلیب کے نشانات بنا دیئے تاکہ گزرنے والوں کو معلوم ہوسکے کہ یہاں موت کا فرشتہ اپنی تباہ کاریوں کا رنگ جما چکا ہے۔ مرنے والوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ رسم و رواج کے مطابق سب کو دفن کرنا غیر ممکن ہوگیا۔ ایسی صورت میں اس کے سوا چارۂ کار نہیں تھا کہ ایسے بدنصیب انسانوں کو گٹھڑی بنا کر ایک ہی قبر میں ٹھونس دیا جائے۔ ان کے لیے تابوت اور تختوں کا اہتمام بھی نہ کیا جائے اور ان پر سیدھی سادی چوبی صلیب نصب کر دی جائے جس پر کوئی کتبہ نہ ہو۔

اس طرح قدیم شہر کولون پر غم و اندوہ کی فضا کچھ عرصے تک چھائی رہی۔

نئی مارکیٹ میں کلیسائے استقف کے قریب ایک شاندار حویلی تھی جس میں قاضی شہر آدخت کا مینگس رہتا تھا۔ یہاں جاہ و ثروت کی فراوانی تھی لیکن دولت کی قوت خوفناک وبا کی طاقت پر غالب نہ آسکی۔ قاضی کی نوجوان خوب صورت شریکِ حیات رچمودس وبا کے جنگل میں پھنسی اور موت کے گھاٹ اتر گئی۔ اس کے حرماں نصیب شوہر کا غم و اندوہ بے پایاں تھا۔ اس نے ساری رات اپنی محبوب ہستی کے جسد خاکی کے قریب رہ کر گزار دی۔ اس نے شب عروسی کا سفید لباس، جو ایک نعمت سمجھ کر گھر میں رکھ کر چھوڑا تھا، مردہ جسم پر ڈال دیا۔ جسے چند سال پہلے پہن کر وہ ایک آفریدۂ سماوی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے نایاب جواہر اور قیمتی انگوٹھیاں بھی اسے پہنا دیں جنھیں وہ زندگی میں بہت ہی عزیز رکھتی تھی۔ اس طرح بنا سنوار کر ایک نئی دلہن کی طرح اسے قبر کی پُرسکون تاریکی میں اتار دیا گیا۔

رات آئی۔ شفاف آسمان پر تارے چمکنے شروع ہوئے اور ان کا پُرامن نور شہر آشوب پر پھیلنا شروع ہوگیا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا کہ اچانک ایک کرخت سی آواز سُنائی دی جیسے کوئی برسوں سے پڑا ہوا زنگ آلود قفل کھول رہا ہو۔ قبروں کے درمیان دو تاریک سائے پھیلتے نظر آئے۔ وہ پھیلتے رہے، پھیلتے رہے حتیٰ کہ وہ گیلی مٹی کے اس تازہ ڈھیر کے قریب آکر رک گئے جس میں آدخت کی رخمودس سرِشام دفن ہوئی تھی۔

یقیناً ان دونوں سایوں کو وہ مقام اچھی طرح یاد تھا، کیونکہ وہ اسی قبرستان کے گورکن تھے۔ انھی نے قبر کو کھودا اور اسے مٹی سے بھرا تھا۔ وہ اس وقت بھی موجود تھے جب کہ تابوت کا ڈھکنا کھول کر سب عزیزوں کو آخری دیدار کرا کے اس میں کتابیں ٹھونسی گئی تھیں۔ اس وقت ان کی بھوکی نگاہوں نے ان قیمتی جواہر کا جائزہ لے لیا تھا جو رخمودس کی میت کے ساتھ دفن کیے جا رہے تھے۔

رات کی تاریکی میں وہ اس مردہ جسم کو، جو جانِ عزیز جیسی نعمت کو کھو چکا تھا، قیمتی جواہر سے بھی محروم کرنے آئے تھے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ کدال پھاوڑے سے کام لے کر نہ صرف پھولوں اور گلدستوں کو بلکہ مٹی کے تودوں کو بھی اس خاموشی کے ساتھ ایک طرف ہٹا دیا جیسے وہ اس فن میں ماہر ہوں۔ مٹی بالکل نرم تھی۔ تابوت کا ڈھکنا جلدی ہی نظر آگیا اور حرص و آز کی آگ سے تڑپنے والوں نے بے تابی کے ساتھ اسے کھول بھی لیا۔ ان کی ٹمٹماتی لالٹین کی مدھم روشنی کی ایک کرن تابوت کے اندر مردہ خاتون کے زرد چہرے پر پڑی جس کے مرمریں سانچے میں ڈھلے ہوئے موم کی مانند سفید ہاتھ دُعا مانگنے کے انداز میں سینے پر اٹھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ کیفیت ان نگاہوں سے اوجھل رہی جن پر ناجائز تصرف کی خباثت کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک گورکن نے، جو ان دونوں میں ذرا زیادہ جیدار تھا، آگے بڑھ کر انھی ہاتھوں میں سے قیمتی نگ جڑی ہوئی طلائی انگوٹھیاں اتارنی چاہیں۔

یکلخت مردہ جسم میں ایک کپکپی سی پیدا ہوئی اور مُردنی چھائے ہوئے سفید ہاتھ آگے بڑھ آئے۔ حیرت زدہ ہو کر خبیث گورکنوں نے اپنے کدال پھاوڑے وہیں

چھوڑے اور سر پر پاؤں رکھ کر بالین قبر سے بھاگ پڑے۔ وہ اس طرح گرتے پڑتے بھاگے جیسے کوئی غیر مرئی ہستی ان کا پیچھا کر رہی ہو۔

ایک طویل درد بھری آواز گوشۂ قبر سے برآمد ہوئی اور بڑی جد و جہد کے بعد برنموڈس کا سفید نحیف جسم، جسے زندہ درگور کر دیا گیا تھا، بیلی ہوئی سطحِ زمین سے اٹھا اور افتاں و خیزاں قبرستان سے باہر نکل آیا جہاں اس وقت بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ اس کے سُبک قدموں کے نیچے دب دب کر عشقِ پیچاں کے خزاں زدہ خشک پتے کبھی کبھی سَرسَراہٹ سی پیدا کر دیتے اور پھر موت کا سکوت ہر چیز پر غالب آجاتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کر کے امداد کے لیے التجا کی مگر کسی سمت سے کوئی جواب نہ ملا اور نہ دستِ تعاون آگے بڑھا۔ اس کا دماغ، جو جسم میں زندگی کی لہر دوبارہ آجانے کے بعد جاگ اٹھا تھا، سوچ کی حالت میں سارے ماحول کا جائزہ لے چکا تھا۔ اور ایک ناقابلِ فہم خوف سے کانپ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو جمع کر کے اور ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کو ہاتھ میں لے کر جسے کفن چور گورکن گھبراہٹ کے عالم میں وہیں چھوڑ گئے تھے، کمزور قدم اٹھائے اور کلیسائے اسقف کے صدر دروازے تک پہنچ گئی۔

گلی کوچے ویران تھے۔ صرف شامیانۂ فلک میں جڑے ہوئے تارے اس آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے جسم کو دیکھ سکتے تھے جو تاریکی میں لپٹے ہوئے مکانات کی دیواروں کا سہارا لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ نئی مارکیٹ کے علاقے میں اپنے مکان کے دروازے کے عین سامنے پہنچ گئی۔ وہاں تک پہنچنے کا راستہ وہ بھولی نہیں تھی۔

ہر چیز کی طرح اس گھر کی چار دیواری پر بھی خاموش فضا طاری تھی لیکن قاضی کی خواب گاہ میں کھلنے والی ایک کھڑکی کے شیشوں سے چھن چھن کر باہر آنے والی مدھم روشنی باہر کی تاریکی میں ایک رنگ تضاد پیدا کر رہی تھی۔ اس دھڑکتے ہوئے دل میں یہ تمنا موج بن کر ابھری کہ زندگی بھر اس کو بری طرح چاہنے والا شوہر باہر آئے اور اس کے نحیف جسم کو اپنے قوی بازوؤں میں لے کر دبوچ لے۔ وہ اس طرح اسے بھینچے کہ مُردنی چھائے ہوئے جسم کی سَرد رگوں میں زندگی کا خون تیزی سے دوڑ جائے اور اس کے فوت نہ ہونے کا یقین سب کو آجائے۔

بڑی جدوجہد کے بعد اس نے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی کی زنجیر تھام لی اور بمشکل اسے جنبش دی۔ عالمِ سکوت میں کسی بیوہ کی ایک چیخ سی سُنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ دوسرے ہی لمحے گھر کی ایک ملازمہ نے کھڑکی کے شیشوں میں سے جھانکنا شروع کیا۔ اس نے اپنی مالکہ کے کپکپاتے ہوئے جسم کو، جو ایک سفید سائے کی مانند تھا، دروازے پر کھڑا پایا۔ وہ خود بھی خوف سے کپکپانے لگی اور کوشش کے باوجود کوئی لفظ زبان سے ادا نہ کر سکی۔ آخر رِخمودس کو خود ہی طلسمِ سکوت توڑنا پڑا۔ اس نے اپنے گھر میں پناہ لینے کی آرزو ظاہر کی۔

ملازمہ گرتی پڑتی اوپر کی منزل پر گئی اور قاضیِ شہر کی خواب گاہ میں کسی اجازت کے بغیر گھس کر بمشکل سمجھ میں آنے والی لڑکھڑاتی زبان میں گویا ہوئی "میرے آقا! مردہ زندہ ہو گیا۔ ہماری پیاری مالکہ نیچے موجود ہیں۔ وہ قبر کی تاریکی سے نکل آئی ہیں اور اندر آنا چاہتی ہیں۔ بظاہر یقین نہیں آتا۔ آپ چل کر تصدیق کر لیجیے"۔

آدخت کا مینگس نے آہ سرد لے کر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور غم سے کراہ کر کہا: "نہیں۔ رِخمودس، میری شریکِ حیات مر چکی ہے۔ وہ کبھی اس دنیا میں واپس نہیں آسکتی۔ کبھی نہیں۔ میں یہ تسلیم کر سکتا ہوں کہ میرے سفید گھوڑوں کی جوڑی اصطبل سے نکل کر زینے کی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی گنبد میں پہنچ گئی ہے لیکن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اس وبائی دور میں فوت ہونے والی کوئی ہستی دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے"۔

اور یہ الفاظ پوری طرح اس کی زبان سے ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ اچانک ایک خوفناک آواز نے گھر کی خاموش فضا کا پردہ چاک کر دیا۔ گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح ایک شور سنائی دیا اور قاضی نے دیکھا، اس کی ملازمہ نے دیکھا کہ اس کے دونوں سفید گھوڑے زینے پر چڑھتے چلے آئے اور آنِ واحد میں اوپر کے گنبد تک پہنچ کر کھڑکی میں سے چھلانگ لگا کر کہیں غائب ہو گئے۔ گویا یہ ثابت کر گئے کہ اس وبا کے دور میں اَن ہونی باتیں بھی جب ممکن ہو سکتی ہیں تو رِخمودس کے دوبارہ زندہ ہو جانے پر کیوں شبہ کیا جائے۔ وہ نیند سے چونکے ہوئے انسان کی طرح اپنے پلنگ سے اٹھا اور ڈگمگاتا ہوا نیچے کی منزل میں پہنچ گیا جہاں اس کی مُردہ شریکِ حیات پیکرِ ذی حیات بنی

عالمِ یاس میں اس کی منتظر تھی۔ اس نے اپنے قوی بازوؤں میں اس نحیف جسم کو لے کر بھینچ لیا۔ خوشی کے آنسو سب کی آنکھوں سے بہ نکلے۔

رخمودس اس واقعہ کے کئی سال بعد تک زندہ رہی اور کئی بچوں کی ماں بنی۔ عمیق تقدس کا رنگ آخر وقت تک اس پر طاری رہا اور شہر کے باشندے خاموش نظروں سے اظہارِ احترام کرتے رہے۔ دونوں میاں بیوی نے اپنی گم شدہ جنت کی بازیابی کی یادگار بڑے ڈرامائی انداز میں قائم کی۔ عرصہ دراز تک شہر کولون کے رہنے والے اور زائرین بھی نئی مارکٹ کے قریب سے گزرتے وقت آدخت کی قدیم حویلی کی ایک بالائی کھڑکی میں دو سفید چوبی گھوڑوں کے سر دیکھتے رہے جنھیں باہر کو دیکھنے کے انداز میں تراشا گیا تھا۔

افسوس ہے کہ نئی مارکیٹ کے قریب یہ قدیم عمارت بمباری کے زمانے میں اس طرح مسمار ہوئی کہ در و دیوار اور سقف و بام تک کے آثار نہ مل سکے اور اس لیے ہم بچشم خود کھڑکی میں سے نکلے ہوئے گھوڑوں کے سر نہ دیکھ سکے۔ معلوم ہوا ہے کہ کولون کے رہنے والے اب بھی اس واقعہ کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور بڑے وثوق سے کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے سفید گھوڑوں کے سر کھڑکی سے باہر نکلے ہوئے دیکھے ہیں۔

۲۷ر ستمبر ۱۹۶۵ء ——— جمعرات

# ڈسلڈورف

ہم دس بج کر ۶ منٹ پر ڈسلڈورف پہنچ ہی گئے۔ پروگرام کے مطابق ہمارے قیام کا انتظام ایڈن ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ وجہ انتخاب قابلِ غور ہے۔ ہوٹل بہت ہی پرانی وضع کا ہے۔ اسی اعتبار سے اس میں آسائشیں بھی دقیانوسی قسم کی ہیں مگر نرخ غضب کے ہیں۔ کمرے کے کرائے سے لے کر کھانے کی اجرت تک ہر چیز کی شرح ہوشربا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ ہمیں ہوٹل میں قدم رکھتے ہی اس کا علم ہوگیا اور اس لیے ہمیں یہ فیصلہ کرلینا پڑا کہ کھانا یہاں نہیں چلے گا۔ دوسرا ستم یہ ہے کہ سیر و سیاحت کا اہتمام کرنے والی کمپنی ——— امریکن ایکسپریس ایک نمائندہ یہاں ملا۔ وہ ہم کو لے جانے کے لیے ایک موٹر اپنے ساتھ لایا تھا۔ لہٰذا ہم اسی موٹر میں بیٹھ کر ہوٹل پہنچ گئے۔ اس نے گاڑی کے کرائے کی اجرت بارہ مارک ہم سے وصول کرلی۔ حالانکہ اگر ہم ٹیکسی میں آتے تو قاعدے کے مطابق صرف چار مارک بنتے۔ کیونکہ اسٹیشن سے ہوٹل تک فاصلہ صرف ایک کلومیٹر ہے۔

دیکھا جائے تو ہم ہوٹل میں صرف اپنا سامان رکھنے کے لئے گئے۔ اتنی مہلت بھی نہیں تھی کہ ہم ذرا ہاتھ منھ دھوتے یا چند منٹ بیٹھ کر کمر سیدھی کرلیتے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں فشر اینڈ کمپنی کے دفتر میں ساڑھے دس بجے پہنچنا تھا۔ ہم نے ٹیلی فون بوتھ میں جاکر اس کمپنی سے رابطہ قائم کرلیا۔ حسنِ اتفاق سے خود مسٹر فشر ٹیلی فون پر موجود تھے انھوں نے ہم کو خوش آمدید کہتے ہوئے ہدایت کی کہ ہم ہوٹل کے دفترِ استقبالیہ ہی میں بیٹھے رہیں۔ وہ خود موٹر لے کر ہمیں لینے آرہے ہیں اور کمپنی اس ہوٹل سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ انتظام بہت ہی مناسب اور قابلِ تعریف کہا جاسکتا ہے اس طرح ہم کارخانہ ڈھونڈنے کی زحمت سے بچ گئے۔

**فشر اینڈ کمپنی:** اس کمپنی کا دفتر جس سڑک پر واقع ہے، وہ منڈنر اسٹراس کہلاتی ہے۔ کارخانہ دوسرے مقام پر ہے لیکن اب ہمیں فکر نہیں تھی۔ جب مسٹر فشر ساتھ ہوں تو پھر تشویش کس بات کی ہو سکتی تھی۔ یہ کمپنی ٹنکچر پریس تیار کرتی ہے اور اسی اعتبار سے ہمارے لیے دل چسپی کی چیز ہے۔

ان کا کارخانہ بہت بڑا نہیں ہے۔ گنتی کے چند آدمی چند مشینوں پر کام کرتے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ مشینیں ہمارے دواخانہ ہمدرد کے ورکشاپ میں موجود ہیں۔ لیکن جو ٹنکچر پریس انھوں نے ایجاد کیا ہے، وہ ایک خاص چیز ہے۔ جب ہم نے اس مشین کو دیکھا تو بہت ہی پسند آئی۔ اسی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہاتھ سے چل سکتی ہے اور دوسری بجلی سے۔ ہر سائز میں تیار ہوتی ہے۔ بہت چھوٹی اور بہت بڑی ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق پسند کر سکتا ہے۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ان میں سے اگر ایک مشین بھی ہمیں مل جائے تو ہماری دشواریوں میں کمی ہو جائے۔ ہمارے دواخانے کے بعض مرکبات مثلاً "صافی" "مستورین" وغیرہ ادویہ کو جوش دے کر بنائی جاتی ہیں۔ دواؤں کو خوب جوش دے کر ان کو پریس کرنے اور ان سے پورا پانی حاصل کرنے کے لیے یہ ایجاد بے نظیر ہے۔ بے نظیر اس لیے کہ ہمارے کام کے لیے طاقت اور سائز کے لحاظ سے موزوں ہے۔ اسی طرح انگور، انار وغیرہ کا رس نکالنے کے لیے بھی یہ مشین بڑی کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس وقت جو مشینیں ہمارے پاس ہیں، وہ پورا حق ادا نہیں کرتیں۔ یعنی پھل کے فضلے کے ساتھ عرق باقی رہ جاتا ہے اور اس طرح ضائع ہوتا ہے۔ بات تو جب ہے کہ پھل اس طرح پریس ہوں کہ بعد میں صرف خشک پھوک باقی رہ جائے۔ اس میں سیل تک محسوس نہ ہو۔ یہی خوبی فشر کمپنی کی مشین میں پائی جاتی ہے۔

مسٹر فشر نے ایک چھوٹی مشین چلا کر اس کے کام کا مظاہرہ کیا۔ بڑی تمام مشینیں گاہکوں کو دی جا چکی تھیں۔ وہ فرمائشیں ملنے کے بعد ہی انھیں تیار کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ اپنے اسٹاک میں پہلے سے ان کو جمع رکھیں تو عمدہ بزنس ہو سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ تھوڑے فاصلے پر ایک کارخانے میں ان کی بنائی ہوئی بڑی مشینیں چل رہی ہیں۔ اگر ہمارے پاس وقت ہو تو ابھی وہاں چل کر انھیں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور یہی چیز ہمارے لیے ممکن نہیں تھی۔ ہمارے راہنامے میں اتنی گنجائش

نہیں تھی۔ لیکن درحقیقت اس کے مشاہدے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی۔ اصول کار دونوں مشینوں میں یکساں تھا۔ بڑی مشین میں زیادہ سامان بیک وقت ڈالا جاسکتا ہے اور چھوٹی میں قلیل مقدار میں۔ البتہ جب انھوں نے زیادہ زور دیا تو ہم نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ہمیں گیرکس گلاس کمپنی میں سہ پہر کے وقت فون کریں۔ کیونکہ طے شدہ پروگرام کے بموجب ہمیں اس وقت وہاں جانا ضروری تھا۔ انھوں نے یہ تجویز قبول کرلی۔ ہم ان سے رخصت ہونا چاہتے تھے کہ انھوں نے اپنی گاڑی پیش کردی اور کہا کہ ہم جب تک چاہیں، اس گاڑی کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

**گیرکس گلاس کمپنی:** روانگی سے قبل ہم نے فشر اینڈ کمپنی سے اس کمپنی کے دفتر میں فون کرلیا۔ انھوں نے بھی گاڑی کے بھیجنے کی پیش کش کی لیکن ہم نے صورتِ حالات سے مطلع کردیا۔ کیونکہ اب ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ فشر اینڈ کمپنی کے مالک کی عنایت کو نظرانداز کردیں۔ ہم نے بطور مزاح یہ کہدیا کہ آپ کی گاڑی سے ہم کسی اور وقت استفادہ کرلیں گے۔

ہم نے تقریباً پانچ سال پہلے ۱۹۵۱ء میں گیرکس گلاس کمپنی سے روح افزا کے لیے بوتلیں منگوائی تھیں۔ بظاہر یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ اتنی بھاری چیز سمندر پار سے منگوائی جائے لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ اس وقت پاکستان میں نہ تو اتنی عمدہ صاف بوتل تیار ہوتی تھی اور نہ اس کا نرخ نسبتاً کم تھا یعنی ڈسلڈورف سے کراچی پہنچنے کے بعد بھی وہ بوتل ہمیں سستی پڑتی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں ہماری فرمائش بہت بڑی تھی لیکن کمپنی کے نزدیک وہ بہت معمولی تھی۔ پھر ہوا یہ کہ ان کا نمائندہ پاکستان سے چلا گیا اور اس کمپنی سے ہمارا واسطہ ختم ہوگیا کیونکہ اس نے نرخ بھی بڑھا دیے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ خود پاکستان میں اچھا مال تیار ہونے لگا۔

بہرحال یہاں آنے کے بعد اس کمپنی کو دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔ ہم ان کے ساتھ اپنے تعلقات کی تجدید چاہتے تھے تاکہ اگر روح افزا کے لیے بڑی بوتلیں نہیں تو مختلف چھوٹے سائزوں میں شیشیاں ہی درآمد کرلیا کریں۔

جب ہم اس کمپنی میں پہنچے تو بہت اچھی طرح ہمارا خیر مقدم کیا گیا۔ حالانکہ اب ہم ان کے گاہک نہیں رہے تھے مگر کاروبار میں حسنِ اخلاق ایک علیحدہ چیز ہے جس کا

مشاہدہ ہم نے کئی جگہ کیا اور یہاں بھی اس کا احساس ہوا۔ کمپنی کے ڈائرکٹر کا نام ہماری زبان سے بمشکل ادا ہوتا تھا اور اسی لیے ہم اس وقت بھول گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے دفتر میں ہمیں بٹھا کر اپنے چند ماتحتوں سے تعارف کرایا۔ چائے پلائی اور پھر کمپنی کے بارے میں جملہ حقائق سے آگاہ کیا۔

اس فیکٹری کا پورا نام تو گیری شیمر گلاشوٹن ورکس ہے لیکن انگریزی زبان میں مختصر کرکے گیرکس گلاس فیکٹری کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ اس طرح جرمن زبان نہ جاننے والوں پر مفہوم زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ ڈسلڈورف میں یہ فیکٹری مسٹر فرد ہے نے ۱۸۶۴ء میں قائم کی تھی۔ اس کی ترقی کی رفتار بہت تیز رہی۔ شروع میں جب مشینی آلات نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی، کاریگر اپنے منھ سے پھونک مار کر پگھلے ہوئے شیشے میں خلا پیدا کرتے اور سانچے کے مطابق ہر قسم کی بوتل، شیشی اور اسی قسم کی چیزیں بنا لیتے تھے۔ اُس وقت ان کی تیاری میں دیر لگتی تھی لیکن جب پھونک مارنے کا کام مشینوں سے لیا جانے لگا تو سُرعت کے ساتھ ساتھ نفاست اور صفائی بھی اپنا رنگ جمانے لگیں۔ قیام کے پچیس سال بعد ۱۹۰۸ء میں اس فیکٹری نے پہلی مشینی بھٹی نصب کی جس سے یورپ کی تاریخ بوتل سازی میں پہلی بار خودکار مشینیں چلنے لگیں۔ بہت عرصے تک یہ فخر اسی کارخانے کو حاصل رہا۔ اس وقت ڈسلڈورف کی اس سب سے بڑی فیکٹری کے علاوہ خود جرمنی اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں اس کے ضمنی کارخانے قائم ہیں۔ ان سب میں چھ ہزار سے زیادہ کاریگر اور اہلکار مختلف خدمات انجام دیتے ہیں۔ صرف ڈسلڈورف کی اصل فیکٹری میں کام کرنے والوں کی تعداد اس وقت ساڑھے تین ہزار کے قریب ہے۔ یہاں مشروبات کے لیے بالکل سفید، دودھیا، سبز، بھوری اور نیلی بوتلیں تیار ہوتی ہیں۔ ادھے اور چھوٹی شیشیاں بھی مختلف مقاصد کے لیے بنتی ہیں۔ پھر سوڈے کی بوتلوں کا شعبہ الگ ہے۔ سب قسموں کی تعداد کو جوڑا جائے تو روزانہ ان کا شمار بیس لاکھ ہوتا ہے۔ یہ ساری دنیا میں بھیجی جاتی ہیں۔ ان کی مانگ اس قدر زیادہ ہے کہ بعض فرمائشیں کئی کئی مہینے تک پوری نہیں ہو سکتیں۔ بوتلوں کے علاوہ بعض چیزوں کو محفوظ رکھنے کے لیے بڑے بڑے جار یعنی شیشے کے مرتبان بھی بنتے ہیں۔ البتہ اس فیکٹری کا ایک شعبہ بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ جہاں رقیق شیشے کو ڈی

کی طرح دھنک کر باریک کپڑے کی صورت میں تبدیل کرلیا جاتا ہے۔ لڑائی کے زمانے میں اسی کپڑے سے پیراشوٹ بھی بنتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مصرف ہیں۔

جب ہم سوڈے کی بوتلیں بنانے والے شعبے میں گئے تو وہاں بیروت اور ایران کے لیے مال تیار ہو رہا تھا۔ تین شفٹوں میں رات دن کام ہوتا ہے مگر پوری نہیں پڑتی۔ روزانہ کی آؤٹ پٹ بارہ لاکھ بوتل کے قریب ہے۔ ہم حیران تھے کہ اس قدر تعداد میں بوتلیں کیسے کھپ جاتی ہیں۔ آخر اس ملک میں اور دوسرے ملکوں میں بیشمار اور کارخانے بھی تو دن رات کام کرتے ہیں۔ بوتلوں کی تیاری کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ جس طرح دوا کے قرص بنانے والی مشین یکے بعد دیگرے نہایت تیزی سے ٹکیاں بنا کر ٹرے میں پھینکتی رہتی ہے، اسی طرح بوتلیں بھی لگاتار نکل نکل کر ایک مال کے ذریعے پیکنگ کے شعبے میں پہنچ رہی تھیں۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ اگر ساری فیکٹری کو ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو چار پانچ گھنٹے ضرور لگیں گے اور اگر تحقیقاتی نگاہ ڈالی گئی تو اس کا حساب لگانا مشکل ہے۔

ڈائرکٹر صاحب نے ہم سے وعدہ کیا کہ روح افزا کی بوتلوں کے نئے نرخ وہ باقاعدہ لکھ کر ہمیں کراچی بھیج دیں گے اور جملہ شرائط درج کریں گے۔ ہم نے فیصلہ کیا اگر اب بھی ان کا مال اچھا اور سستا رہا تو ہم انہی کو آرڈر دیں گے۔ اس طرح بوتل کی قیمت گھٹنے کے بعد ہم شربت کی قیمت میں کمی کر دیں گے تاکہ گاہکوں کو کچھ اور فائدہ ہو جائے۔

گیرکس گلاس کمپنی دیکھنے کے دوران میں مسٹر فشر کا پیغام بذریعہ ٹیلی فون آگیا تھا۔ انھوں نے مطلع کیا تھا کہ چار بجے مشین دیکھی جا سکتی ہے۔ ہم نے آمادگی ظاہر کردی اور ان سے استدعا کی کہ آپ گیرس گلاس میں چار بجے تشریف لے آئیں۔ کیونکہ وقت کا سوال پیچیدگی پیدا کر رہا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ اس طرح چند منٹ اور یہی فیکٹری دیکھتے رہیں۔ لیکن جب ہم کمپنی کے دفتر میں واپس آئے تو بیس منٹ کی دیر ہو گئی تھی اور مسٹر فشر ہمارے منتظر تھے۔ ہم نے ان سے معذرت چاہی اور انھوں نے بھی "کوئی بات نہیں" کے انداز میں ہماری معذرت کو قبول کرتے

ہوئے معاف کر دیا لیکن ہمارے دل و دماغ پر اس کا بار رہا۔ بات یہ ہے کہ غرضمند تو ہم تھے اور تکلیف پہنچی انھیں۔ ہم ان کے بلند اخلاق کے معترف ہوئے اور وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی سابقہ پڑا تو ایسی تاخیر نہیں ہو گی۔

مسٹر فشر نے اپنی موٹر میں ہم کو بٹھا کر خود چلانا شروع کیا حالانکہ ان کا شوفر موجود تھا۔ گاڑی نہایت تیزی کے ساتھ چلتی رہی۔ انھوں نے بتایا کہ عام طور پر ۴۵ منٹ کا راستہ ہے لیکن ہمیں ۲۵ منٹ میں طے کرنا ہے گویا رفتار تقریباً دوگنی کر دینی پڑی۔ اس تیز رفتاری کے لیے وہ اپنے شوفر پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے کردار کا یہ پہلو بھی قابل غور تھا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ تاخیر ہو جانے سے وہ فیکٹری بند نہ ہو جائے جہاں ٹنکچر پریس دیکھنا تھا۔ وہاں پانچ بجے کام بند ہو جاتا ہے۔ میں نے گھڑی دیکھی اور باقی فاصلہ معلوم کیا۔ ابھی تیرہ کلومیٹر باقی تھے اور پانچ بج گئے تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ وہاں سات منٹ تاخیر سے پہنچے۔ کارکن جا چکے تھے۔ البتہ منیجر موجود تھے۔ مسٹر فشر کے کہنے پر وہ شعبہ کھلوا لیا گیا جہاں وہ مشین دیکھی جا سکتی تھی۔ اس کے کام کا بھی مظاہرہ ہوا۔ مشین واقعی بہت بڑی تھی اور خوب تیزی کے ساتھ پورا رس نکالتی تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس سائز کی مشین کا ایک آرڈر ابھی جانے سے پہلے دے دیں گے تاکہ وہ روانہ کر دیں اور ہمارے واپس جانے تک وہ بھی کراچی پہنچ جائے۔ ہمدرد فیکٹری کے لیے وہ یقیناً کارآمد ہو گی۔

ہم نے نہ صرف ٹنکچر پریس دیکھا بلکہ قریب ہی انڈر برگ کی فیکٹری بھی دیکھ لی۔ "انڈر برگ" ایک مشہور و معروف دوائی شراب ہے جو پیٹ کی جملہ تکالیف کے علاوہ نزلہ، زکام اور اضمحلال کی عام کیفیات دور کرنے کے لیے عمدہ چیز سمجھی جاتی ہے۔ ہر جگہ ملتی ہے اور خوب استعمال ہوتی ہے۔ یہ فیکٹری بھی کافی بڑی ہے اور بہت سے کام حتیٰ کہ پیکنگ بھی خودکار مشینوں سے ہوتا ہے۔ دوا جس مقدار میں روزانہ تیار ہوتی ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً ستر ہزار شیشیاں روزانہ بھری اور مکمل کر کے بھیجی جاتی ہوں گی۔

اس سفر کے دوران میں ہم نے ڈوئز برگ بھی دیکھ لیا جو ڈسلڈورف کے قریب ہی ہے۔ دریائے رھائن پر بنے ہوئے ایک پل سے گزر کر پہنچنا پڑتا ہے۔

یہ سیاحت بلا قصد ہو گئی ۔ یہاں دوسری جنگ عظیم سے پھیلنے والی تباہی کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں ۔ شکستہ عمارتیں، بوسیدہ اور جلے ہوئے در و دیوار بربریت کے شاہد ہیں ۔ اسے دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی ۔ یہ شہر لوہے، فولاد اور کوئلے کی کانوں کا مرکز ہے ۔ اسی لیے لڑائی کے دوران میں نام نہاد اتحادیوں نے اس پر خاص توجہ دی ۔ اسے تباہ کرنا اصولاً ضروری تھا ۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بنسری ۔ ان کا خیال تھا کہ اس کی تباہی سے جرمنی میں اسلحہ سازی کے کارخانے مفلوج ہو سکتے ہیں لیکن جفاکشی کے ساتھ کش مکش کرتے رہنا اور پوری محنت سے کام کرنا جرمن قوم کا ایمان ہے ۔ وہ تباہ ہوئی اور بہت جلد پنپ بھی گئی ۔ کہیں کہیں اگر گزشتہ تباہ کاری اپنا نقش جمائے ہوئے ہے تو چنداں قابلِ توجہ نہیں ہے ۔ جبکہ بیشتر زخم مندمل اور بیشتر مدھم نقوش اجاگر ہو چکے ہیں ۔

**ڈسلڈورف کا تاریخی پس منظر:** کولون سے ڈسلڈورف کا فاصلہ جانبِ شمال صرف چوبیس میل ہے جو ریل گاڑی میں ایک گھنٹے سے بھی کم مدت میں طے ہو جاتا ہے ۔ جرمنی کے دوسرے شہروں کے بالکل برعکس اس شہر کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے ۔ حالانکہ عظمت و شان کے اعتبار سے برلن کے بعد اسی کا درجہ ہے تیرھویں صدی کے آخری ربع سے قبل صوبہ نورتھ رھائن ویسٹ فالیا میں اس شہر کا وجود ایک معمولی قصبے سے زیادہ نہیں تھا ۔ تاریخ و جغرافیہ میں کہیں اس کا نام نہیں آتا تھا ۔ ۱۲۸۸ء میں برگ کے ایک نوابزادے کاؤنٹ اڈولف نے اسے بلدیاتی مراعات دے کر اس کا مقام اونچا کر دیا ۔ آبادی ایک دم بڑھنے لگی اور لوگوں نے اسے صنعت و حرفت اور تجارت کا مرکز بنا ڈالا ۔ کچھ قدرتی محلِ وقوع نے بھی ساتھ دیا ۔ لوہے اور کوئلے کی کانیں، جن کی وجہ سے جرمنی کا یہ صوبہ ساری دنیا میں مشہور ہے، یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہیں ۔ سی سالہ جنگ میں اور پھر ہسپانوی لڑائی نے اسے سخت نقصان پہنچایا لیکن پیلے ٹی ناٹے کے فرمانروا جون ولیم نے اپنا قصر یہاں تعمیر کرا کے اسے دوبارہ ترقی کی راہ پر لگا دیا ۔ وہ فرمانروا ۱۷۱۶ء میں اپنی وفات کے وقت تک اس محل میں قیام پذیر رہا ۔

کوئی اسی سال بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے اس پر شدید بمباری کی اور

تقریباً سبھی عمارتوں کو مسمار کر دیا اور جب معاہدۂ امن ہوا تو ایک شرط کے بموجب اس کی شہر پناہ ڈھا دی گئی تا کہ اس کی نمایاں حیثیت برقرار نہ رہ سکے۔ نپولین کے عہد میں اسے ایک بار پھر سر بلند ہونے کا موقع ملا لیکن بہت جلد ۱۸۱۵ء میں اس پر پرشیا کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۸۷۰ء کے بعد سے اس شہر نے صنعتی اور تجارتی اعتبار سے ایسی ترقی کی کہ دو عالمگیر لڑائیوں کی تباہ کاریاں بھی اس کی رفتار میں رخنہ نہ ڈال سکیں۔

وُپّر اور رُہر کے علاقوں کی وجہ سے وہ فلزئی، بلوری اور کیمیاوی صنعتوں کا بڑا مرکز بنا ہوا ہے۔ بہت بڑے پیمانے پر ہر قسم کا شیشے کا سامان بنانے کے اعتبار سے نہ صرف جرمنی بلکہ سارے مغربی یورپ میں اسے شہرت حاصل ہے۔ بوتل سازی کے جس کارخانے کا اوپر ذکر ہوا ہے، وہ شیشے کا سامان تیار کرنے والی صنعتوں کا ایک جزو ہے۔ علاوہ ازیں کاغذ، ایمنل، پارچہ بافی، رنگ و روغن، فرنیچر اور شراب کشیدنی کے اعتبار سے بھی یہ قابلِ ذکر شہر ہے۔ یہ نہ صرف ایک بڑا ریلوے جنکشن ہے بلکہ اس کی دریائی بندرگاہ پر خاصے بڑے جہاز کھڑے ہو سکتے ہیں جو ایک طرف شمالی یورپ کی تمام بندرگاہوں تک جاتے ہیں اور دوسری طرف بحیرۂ روم کو عبور کر کے دور دراز ملکوں کی خبر لاتے ہیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں برتری سے قطع نظر یہاں کی ثقافتی اور ادبی سرگرمیاں بھی ہمیشہ سے محفوظ ہیں۔

مثال کے طور پر چارلس تھیوڈور نے ۱۷۶۷ء میں فنِ مصوّری کو ترقی دینے کے لیے جو نگار خانہ قائم کیا تھا اور جس کی تنظیم ۱۸۲۲ء میں شاہ فریڈرک ولیم سوم نے کی تھی، آج بھی برقرار ہے اور اس کے زیرِ اہتمام اس فنِ لطیف کو ہر لحاظ سے فروغ دیا جاتا ہے جس میں تصاویر کی نمائشیں بھی شامل ہیں۔ نگار خانے کے علاوہ کئی عجائب گھر قائم ہیں جن میں سے مجلسِ بلدیہ کے زیرِ اہتمام قائم ہونے والا فنون کا عجائب گھر سب سے اچھا ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ جب کولون دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں بمباری سے تباہ ہونے لگا تو اربابِ حکومت نے وہاں کے نوادر ڈسلڈورف منتقل کر دیے۔ کیونکہ یہاں نسبتاً

کم تباہ کاریوں کا اندازہ تھا اور حقیقتاً یہ اندازہ اگر بالکل نہیں تو خاصا صحیح ثابت ہوا۔
اس شہر پر بھی بم گرائے گئے لیکن زیادہ بربادی نہیں ہوئی۔ دشمن کی گہری توجہ قرب و جوار کے علاقوں پر مرکوز رہی۔ چنانچہ کولون کے نوادر بھی اس عجائب گھر میں محفوظ ہیں جس کی چار دیواری میں عہدِ وسطیٰ میں تراشے ہوئے مجسموں کے علاوہ روغنی مٹی کے بنے ہوئے دو ہزار سال پرانے برتن بھی نظر آتے ہیں اور سولھویں سے موجودہ صدی تک کی مصوری کے نمونے زائرین کی دل چسپی کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً ریوبن کی تصویر "وینس اور ایڈونس" ہی اس لائق ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے وہاں جایا جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ وقت کی کمی اور پروگرام میں گنجائش نہ ہونے کے باعث ہم اس عجائب گھر کی زیارت سے محروم رہے۔

اس شہر نے پیٹر کارنیلیس جیسے مصوّر اور ہنریک ہائنے جیسے شاعر کو جنم دیا اور یوہانیز براہم، رابرٹ شومان اور گوئٹے کو عارضی قیام کی دعوت دی۔ اب بھی نئے دور کے شعراء، ادیب اور مفکّر اس شہر کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں۔ ان سب کی اور دوسری ممتاز ہستیوں کی یاد میں جب تقریبات منائی جاتی ہیں یا دوسرے میلے تماشے یا نمائشیں منعقد ہوتی ہیں تو دور دور کے لوگ یہاں آتے ہیں۔ اتفاق سے ستمبر کا مہینہ اس اعتبار سے بڑا خشک ہے۔ مہینے کے کسی بھی دن کوئی خاص گہما گہمی نظر نہیں آتی۔ سوائے اس کے کہ ہمارے یہاں پہنچنے سے صرف ایک روز پہلے زنانہ ملبوسات کے فیشن کا ہفتہ ختم ہوا تھا۔ وہ ایک لحاظ سے صرف تجارتی میلہ تھا اور تیار کپڑوں کی فروخت کو فروغ دینے کے لیے چند کمپنیوں نے مل کر منایا تھا۔

ہم مسٹر فشر کی خوش اخلاقی اور اچھّے سلوک کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان کی اعانت کے بغیر ہمارا آج کا دن اچھّا نہ گزرتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی کمپنی دکھا کر خاموش ہو جاتے تب بھی ہم ان کے شکر گزار ہوتے لیکن انھوں نے بہت زیادہ دل چسپی لی۔ دوسرے ادارے بھی دکھائے۔ اپنی گاڑی سے بھی کچھ آسانیاں پیدا کر دیں اور آخر میں ہم نے ہوٹل ایڈن چھوڑ کر دم لیا۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ کھائیں مگر ہم نے قبول نہ کیا۔

خواہ مخواہ انھیں بھی تفصیل کے ساتھ یہ بتانا پڑتا کہ ہم جب سے جرمنی میں داخل ہوئے ہیں، کیا کچھ کھاتے ہیں اور کیا کچھ نہیں کھا سکتے۔ ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ اپنے ہوٹل ہی میں رہ کر حسب ضرورت و ذوق فرمائش کریں گے اور اسی کو غنیمت سمجھیں گے۔

**نہرو کے دورے کی خبر:** ہم ہوٹل میں اپنے کمرے کے اندر داخل ہوئے تو انگریزی زبان کا ایک رسالہ اور دو اخبارات میز پر رکھے تھے۔ فوراً اخبارات کے صفحہ اوّل پر نظر ڈالی گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید ہمارے وطن یا کسی پڑوسی ملک کے بارے میں کوئی خبر کسی کالم میں چھاپی گئی ہو۔ لیکن ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آج کے اخبارات خصوصاً انگریزی اخبارات نے بھی جلی سرخیوں کے ساتھ اس خبر کو اہمیت دی ہے کہ بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو آج چار روزہ دورے پر سعودی عرب پہنچے ہیں اور اگرچہ انھوں نے روانگی سے قبل یہ اعلان کر دیا تھا کہ میں وہاں جا کر تنازعۂ نہر سوئز کے سلسلے میں کوئی بات چیت نہیں کروں گا لیکن رائے عامہ یہی ہے کہ ان سے اس ضمن میں رائے لی جائے گی اور وہ خاموش نہیں رہ سکیں گے۔ ان کے پروگرام میں مصر کا سفر شامل نہیں ہے لیکن اپنی رائے یہ ہے بلکہ یقین ہے کہ وہ مصر جا کر جنرل ناصر سے ضرور ملیں گے۔ کیونکہ نہر سوئز کا قضیہ براہ راست مصر سے تعلق رکھتا ہے۔ سعودی عرب نے محض ہمدردانہ انداز میں ناصر کے موقف کی تائید کی ہے۔

پنڈت نہرو نے یہ اعلان کیا ہے کہ نہر سوئز کو قومی ملکیت بنانے کا حق بالکل جائز طور پر مصر کو حاصل ہے لیکن شاید وہ اس ضمن میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر کوئی درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش کریں گے۔ وہ نہ تو سو فیصد مصر کی حمایت کر سکتے ہیں اور نہ مصر کو ناراض کرنے کی حد تک برطانیہ کا ساتھ دے سکتے ہیں اور پھر برطانیہ کی ناراضگی کا خطرہ بھی مول نہیں لیا جا سکتا۔ سچ بات یہ ہے کہ آج کل کی سیاست بہت سے مرحلوں میں انسان کو تذبذب میں ڈال دیتی ہے اور "گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل" کی کیفیت دامن گیر ہو جاتی ہے۔ مصر نے برابر بھارت کی دوستی کا دم بھرا ہے اور کئی موقعوں پر اس حد

تک قدم اٹھایا ہے جو دنیائے اسلام کے دوسرے ملکوں کے لیے ناراضگی کا باعث ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اسے بھی بھارت سے توقع ہے کہ وہ اس وقت مصر کی پالیسی کو مان لے۔ گولے بارود کے ذریعے امداد ممکن نہ ہو تو اخلاقی حمایت بھی غنیمت ہوتی ہے۔

عالمی انصاف کی ترازو میں مصر کا پلڑا بھاری جا رہا ہے۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ انجام کار اس کی فتح ہوگی۔ تاہم برطانیہ کے لیے جان کی بازی لگی ہوئی ہے۔ اس کی درآمدی اور برآمدی تجارت کا بڑا انحصار نہر سوئز سے گزرنے کے اختیارات پر مبنی ہے۔ وہ آخر وقت تک ترپ کے پتے مارنے کی کوشش کرتا رہے گا اور اس بڑے شاطر سے ایسی چال بھی ناممکن نہیں ہے کہ اصل پتے چھپا کر کوئی ایسا ترپ مارے جو کسی کے حاشیہ خیال میں نہ آسکتا ہو۔

اپنے وطن سے کئی سو میل پرے جرمنی میں رہتے ہوئے ایسی خبر اخبارات میں پڑھ کر اور ریڈیو سے سن کر، جس سے بھارت و پاکستان کو برابر دلچسپی ہو، جی چاہا کہ آج ہم اپنے وطن میں ہوتے اور یہ معلوم کرتے کہ وہاں ان حالات کا ردِ عمل کیا ہے۔

**انگریز اور جرمن :** نہر سوئز کے ڈرامے پر غور کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ انگریزوں کے کردار کا یہ پہلو بہت ہی دلچسپ ہے کہ وہ جب بھی کوئی غلط قدم اٹھاتے ہیں، پہلے سے اس کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آخر تک اس کے صحیح ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ نہر سوئز پر قبضہ و اختیار سے قطع نظر اپنی سرزمین سے باہر ان کے جتنے بھی مفادات قائم ہیں، وہ ان کے لیے جائز ہیں کیونکہ بزعم خود اس طرح وہ دوسروں کو خوش حال بنانا چاہتے ہیں۔ کوئی اور ملک اس راہ پر چلتا ہے تو اسے غاصب قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے ملک میں ہر حکمت عملی اختیار کرنے کے مجاز ہیں لیکن دوسرے اس کا حق نہیں رکھتے۔ اگر موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زمانہ جنگ میں اور اس سے پہلے ہٹلر نے جن باتوں کو روا رکھا اور جن پر اسے مطعون کیا گیا، وہ سب لڑائی ختم ہونے اور فضائے امن و عافیت قائم ہو جانے کے بعد برطانوی وزیر اعظم مسٹر اٹیلی کی حکومت نے اپنالیں اور ان کے لیے

جواز قائم کرلیا ۔وہ سب انسانی آزادی کی راہ میں رخنہ کہی جاسکتی ہیں ایسی مثالیں تو بہت ہیں لیکن یہ پانچ سب سے زیادہ نمایاں ہیں :

(۱) ہنگامی اختیارات ۔جب جرمن پارلیمان کی عمارت کو آگ لگادی گئی اور ہٹلر کو اندیشہ ہوا کہ ان چیرہ دستیوں کا اعادہ نہ ہو تو اس نے ۱۹۳۳ء میں پارلیمان کے اقتدار سے الگ کچھ مخصوص ہنگامی اختیارات حاصل کرلیے تاکہ خفیہ سازشوں پر قابو پایا جاسکے ۔اسے انسانی آزادی پر ناجائز تصرّف سے تعبیر کیا گیا ۔لیکن اٹلی کی حکومت نے برسرِ اقتدار آکر، جبکہ لڑائی ختم ہوچکی تھی، ہر طرف امن وامان کی فضا قائم تھی اور کسی سازشی کارروائی کا اندیشہ نہیں تھا، بالکل ویسے ہی اختیارات اپنے لیے حاصل کرلیے اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ ذرا بھی اعتراض یا احتجاج کرتا۔

۲۔ راشننگ ۔ہٹلر نے زمانۂ امن میں سارے ملک میں غذائی روک تھام کے لیے راشننگ کا طریقہ رائج کیا تو برطانیہ کے اخبارات چلا پڑے اور برطانوی پارلیمان میں بھی یہ مسئلہ زیر غور آگیا کہ جرمنی انسان کی آزادی پر ڈاکہ ڈال رہا ہے ۔سب کا کہنا یہ تھا کہ اگر حسبِ ضرورت ومرضی اشیائے خوراک خریدنے اور کھانے کی آزادی نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کی سب سے اہم آزادی سلب کرلی گئی ہے لیکن اٹلی کی حکومت نے عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد بھی راشننگ کا طریقہ بدستور جاری رکھا حالانکہ لڑائی ختم ہوئے مدّت گزر چکی تھی اور حالات یکسر بدل گئے تھے ہر چیز وافر مقدار میں میسر آسکتی بلکہ آتی تھی ۔البتہ اسے حاصل کرنے کے لیے ناجائز طریقے اختیار کئے جاتے تھے ۔حکومت کو اس احساس کے باوجود اپنے حسنِ انتظام پر ناز تھا اور عرصے تک اسے ترک کرنا گوارا نہ کیا۔

۳۔ جبریہ کام : ہٹلر نے اپنے ملک کو دباغت کے دائرے سے نکالنے کی خاطر جہاد کرنے کا منصوبہ ذہن میں تیار کیا تھا، اسے عمل میں لانے کے لیے ضروری تھا کہ بعض لوگوں سے زبردستی کام لیا جائے ۔سامانِ جنگ کی تیاری کے لیے کان کنی اور پھر کارخانوں میں مزدوری لازمی ہے ۔لڑائی سے پہلے ہٹلر نے اس منزل میں قدم اٹھایا تو سب سے پہلے انگریزوں نے آواز بلند کی۔ لڑائی ختم ہوگئی اور عرصے تک دوسری لڑائی شروع ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا تو پھر انگلستان نے جبریہ کام لینے کے طریقہ

کو کیوں جاری رکھا۔ اس کے ہاں خاص طور پر کوئلے کی کانیں ایسے لوگوں سے بھری گئیں جنھیں ان کی مرضی کے خلاف کام کے لیے مجبور کیا گیا۔ یہ حکمتِ عملی اس زمانے کے ایک وزیر اینورن بیون کی رائج کردہ تھی۔ اسی لیے کان کے مزدوروں کو عرفِ عام میں "بیون کی اولاد" کہا جانے لگا۔ کوئلے کی کانوں کے علاوہ بھی یہ جبر روا رکھا جاتا تھا۔ اپنی رائے یہ ہے کہ اگر ہٹلر دوسری جنگِ عظیم میں کامیاب ہو جاتا تو جبر یہ کام کرانے کی لعنت کو لڑائی ختم ہوتے ہی ترک کر دیتا۔

۴۔ تبادلۂ زر پر احتساب: لڑائی شروع ہونے سے قبل دنیا کے بیشتر متمدن ملکوں کے مابین تبادلۂ زر پر کوئی احتساب نہیں تھا۔ جرمنی میں ہٹلر کے برسرِ اقتدار آنے سے بہت پہلے اس کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ ہٹلر نے خصوصی اختیارات کے تحت اس سلسلے کو جاری رکھنا مناسب سمجھا۔ اس ضمن میں ہٹلر کو وزیرِ مالیات ڈاکٹر شاخت کا مشورہ حاصل تھا۔ انگلستان نے اس کے خلاف احتجاج کیا کیونکہ جرمنی سے وابستہ اس کے مفادات کو زک پہنچنے لگا تھا لیکن جب لڑائی ختم ہو گئی اور ڈاکٹر شاخت کو اسیرانِ جنگ کی صف میں لا کر اس اعتبار سے اس پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا کہ اس نے ساری دنیا کے مالیاتی نظام پر کاری ضرب لگائی ہے تو وزیرِ اعظم ایٹلی نے مبادلۂ زر پر وہ پابندیاں عائد کیں جو ہٹلر یا شاخت کے تصور میں بھی نہ آ سکتی تھیں۔ ویسی پابندیاں اب بھی عائد ہیں بلکہ ساری دنیا میں ان پر عمل ہو رہا ہے۔ اب ایک نہیں، بہت سے ڈاکٹر شاخت مالیاتی جادوگر بنے ہوئے ہیں۔ آخر ان کو مطعون کیوں نہیں کیا جاتا۔ اگر آج کل زرِ مبادلہ پر سخت پابندی نہ ہوتی تو ہم دونوں بھائی بہت بڑی رقمیں اپنے ساتھ لاتے اور اپنے اپنے دواخانوں کے لیے خوب سامان خریدتے اور مریضوں کے لیے خاطر خواہ مفید ادویہ تیار کراتے جو صحتِ عامہ کی ضمانت بنتیں لیکن مجبوریوں نے "دست بستہ" کر رکھا ہے اور ہم بہت سی ضروری چیزیں خریدنے سے معذور رہیں۔

۵۔ زبردستی بھرتی: دُنیا کے بہت سے ملکوں میں یہ رواج عام تھا کہ وقتِ ضرورت فوج کے لیے نوجوان زبردستی بھرتی کر لیے جاتے تھے۔ جرمنی نے اس رواج پر عمل کیا اور پھر ترک کر دیا۔ ہٹلر نے اس کی تجدید کی۔ لیکن سوال یہ ہے

کہ کس ملک نے اپنے دفاع کے لیے ایسا نہیں کیا اور کون سا ملک اب اس پر عمل نہیں کر رہا۔ اٹلی کی حکومت بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکی ہٹلر پر اعتراض کرنے والے اگر ان سب حالات کا جائزہ لیں اور ٹھنڈے دل سے غور کریں تو انھیں دبے لفظوں میں کہنا پڑے گا ع

"ہم الزام ان کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا۔"

---

۲۸ ستمبر ۱۹۵۶ء ـــــ جمعہ

# ڈسلڈورف سے ہمبرگ کے راستے برلن میں

آدھی رات سے موسم کا مزاج جو خراب ہوا ہے تو ضدی بچے کی طرح صبح تک خراب رہا۔ ہم حسب معمول سویرے اٹھے لیکن کہیں جانے کا سوال نہیں تھا کیونکہ ہلکی ہلکی بارش نے جو رک رک کر ہو رہی تھی، مزا کرکرا کر دیا تھا۔ ہمارے پاس نہ برساتیاں تھیں، نہ چھتریاں۔ پھر ہوٹل کے کمرے سے باہر سڑک پر نظر ڈالی تو کوئی آدم یا آدم زاد نظر نہیں آیا۔ یا تو یہاں کے لوگ "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" کے قائل نہیں ہیں اور سورج کی کرنیں پھیل جانے کے بعد بھی اس وقت کو صبح سے تعبیر نہیں کرتے یا وہ اس موسم میں باہر نکلنے سے اجتناب کرتے ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ زندگی کا معمول کیونکر بدل لیتے ہیں۔ یا ممکن ہے کہ یہی ان کا معمول ہو۔ شاید نائٹ کلبوں کی گھما گھمی میں وقت ضائع کرنے کے بعد وہ صبح کو دیر سے اٹھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنے قومی کردار کے اعتبار سے ایک جفاکش، محنتی اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے والی قوم کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں۔

ہم نے سوچا کہ اگر اس وقت چہل قدمی کے لیے نکلے تو لوگ اپنے دریچوں میں سے دیکھ کر ہم پر ہنسیں گے۔ ہم پر ہنس لینے سے ہمارا کچھ نہیں بگڑتا لیکن مشکل یہ ہے کہ افراد کے کردار یا عادات واطوار سے پوری قوم کے کردار اور عادات واطوار کے بارے میں رائے قائم کر لی جاتی ہے اور یہ ہمیں گوارا نہیں تھا کہ برصغیر پاک وہند کے بارے میں کوئی ایسی رائے قائم کریں جو ہماری نگاہ میں بہت اچھی لیکن ان کے نزدیک بری ہو۔ ہم ان کو یہ محسوس کرانا نہیں چاہتے تھے کہ بارش میں بھی گھر کی چار دیواری میں ٹک نہیں سکتے۔

**مزاج کی برہمی:** موسم کی خرابی کے ساتھ ساتھ خود اپنا مزاج بھی ذرا برہم تھا لیکن ناساز نہیں تھا۔ ہمیں رہ رہ کر غصہ آرہا تھا کہ بیشتر مقامات پر ہمارا راہنما معقولیت کے ساتھ مرتب نہیں کیا گیا۔ ہمیں دس بج کر پچیس منٹ پر ایئر فرانس کے ہوائی جہاز سے ہمبرگ روانہ ہونا ہے، جو تقریباً ایک گھنٹے بعد یعنی ساڑھے گیارہ بجے منزلِ مقصود پر پہنچے گا۔ ڈیڑھ گھنٹے تک ہمیں ہوائی اڈے پر یا ہوٹل فرانس میں، جو ائر فرانس کے زیرِ اہتمام اپنے ہی مسافروں کو ٹھیرانے کے لیے ہے، خواہ مخواہ انتظار کی کٹھن گھڑیاں گزارنی ہوں گی۔ ایک بجے پان امریکن کا جہاز ہمیں برلن لے جائے گا۔ ہم وہاں دو بج کر دس منٹ پر پہنچیں گے، بشرطیکہ جہاز کسی منزل پر بھی لیٹ نہ ہو۔ اس طرح جمعہ کی نماز کے وقت ہم دوشِ ہوا پر ہوں گے۔ چلتی ہوئی گاڑی ہو یا اڑتا ہوا جہاز، معمولی طور پر نماز اس میں ادا کی جا سکتی ہے لیکن نمازِ باجماعت ممکن نہیں ہو سکتی۔

ہمیں غصہ اس بات پر آرہا ہے کہ اگر ڈسلڈورف سے براہ راست برلن پہنچنے کا انتظام بذریعہ ریل کر دیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا۔ ہم اس صورت میں ۲۷ ستمبر کی شام ہی کو ڈسلڈورف کو خیرباد کہتے اور صبح سویرے برلن پہنچ جاتے اس صورت میں اخراجات کی دو طرح بچت ہوتی۔ اوّل ریل کا کرایہ ہمیں نہ دینا پڑتا۔ اس کے علاوہ زمین کے سینے پر دندناتے وفاقی جمہوریہ جرمنی کے علاقے سے روسی علاقے میں اور پھر برلن کے جرمن علاقے میں وارد ہوتے۔ ہوائی جہاز میں اعلانات کے ذریعہ یہ پتہ تو چل جاتا ہے کہ اب ہم کس سرزمین کی بالائی فضا میں پرواز کر رہے ہیں۔ لیکن ریل کی پٹری بدلنے کے ساتھ جو سرحد بدل جاتی ہے، وہ مزا کچھ اور ہی ہے۔

**کمپنی کا تعصب:** ہمارا خیال ہے کہ امریکن ایکسپریس کمپنی کے اربابِ انتظام بے حد متعصب ہیں۔ انھوں نے ہر جگہ ہمارے قیام کا اہتمام ایسے ہوٹلوں میں کیا جو امریکیوں کی ملکیت ہیں یا شراکت میں امریکی سرمایے سے چل رہے ہیں۔ یہی تعصب ہوائی کمپنیوں سے بکنگ کرانے میں بھی کارفرما رہا۔ ہر ملک کے ہر شہر میں متعدد کمپنیوں کے ہوائی جہاز پہنچتے ہیں لیکن ان کی نظرِ انتخاب محدود دائرے میں پڑتی ہے۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ اس طولانی سفر کو ختم کرنے کے بعد جب بھی سیاحت کا موقع ملا، ہم

اس کمپنی کی خدمات سے اپنے آپ کو "محروم" رکھیں گے۔ ہم نے تو یہ سہارا اس لیے لیا تھا کہ موجودہ زمانے میں سیر و سیاحت پر جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ان سے کسی قدر چھٹکارا ملے گا، بھاگ دوڑ سے بچ جائیں گے اور دوسرے ملکوں میں ناواقفیت سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، ان کا سامنا بھی کرنا نہیں پڑے گا۔ یہ کسے معلوم تھا کہ ان کا سہارا لینے سے جیب پر بار پڑے گا اور دوسری نوعیت کی پریشانیاں لاحق ہوں گی۔ اگر ان کو یہ سفر ہوائی جہاز کے ذریعہ ہی کرانا تھا تو جرمن ہوائی کمپنی "لفٹ ہنزا"، زیادہ مناسب تھی۔ خیر۔ آئندہ را احتیاط۔ اب تو جو ہونا ہے، ہو کر رہے گا۔

لفٹ ہنزا کے جہاز میں سفر کرنے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ ہم رات کے وقت پرواز کرتے ہوئے ایک خاص حقیقت کی تصدیق کر لیتے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ برلن پر شدید ترین بمباری ہوئی تھی اور سارا شہر ملبے کے ضخیم انباروں کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا لیکن وفاق جرمنی کی حکومت نے بہت جلد اپنے حصّے کی نئے سرے سے تعمیر کر لی تھی اور اب ایک مقام کے سوا کہیں بھی شکستہ آثار نظر نہیں آتے۔ سارے شہر میں قیصر ولہلم میموریل چرچ کی عمارت بدستور شکستہ حالت میں جنگ کی تباہ کاریوں کا مجسم المیہ بنی نظر آتی ہے۔ اسے دیکھ کر تخریبی قوتوں کی شدت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا ہر عمارت زیادہ شاندار طور پر بن گئی ہے اور رات کو سارا شہر برقی قمقموں سے جگمگ جگمگ کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس آسمان کی بلندیوں سے جب مشرقی برلن کی جانب نگاہیں اٹھتی ہیں تو کسی ویران تاریک قبرستان کا ہیولا سامنے ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تاریکی میں کہیں کہیں تیز روشنی کے محدود سیلاب میں کوئی عمدہ عمارت نظر آتی ہو جو یقیناً کسی نہ کسی رُوسی افسر اعلیٰ کی قیام گاہ ہوتی ہے اور رات کے وقت اسے ممتاز و ممیز رکھنے کے لیے خاص روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو ہم سیاسی فراست کے اس تضاد کو دیکھنے سے بھی محروم رہے جس کا یقیناً ہمیں افسوس ہونا چاہیے۔

**جمہوریۂ جرمنی کا دل:** اگر کوئی شخص چند دن بھی وفاقی جمہوریۂ جرمنی میں رہے، شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرے اور جنگلوں کی خاک چھان مارے لیکن برلن نہ جائے

تو یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے جرمنی کی سیر کر لی ہے یا جرمنی کی موجودہ رُوح کو سمجھ لیا ہے۔ حصّے بخرے ہو جانے اور اصل سرزمین سے دور رہنے کے باوجود، برلن جمہوریہ جرمنی کا دل ہے جس کی دھڑکن اور تپش سارے ملک میں محسوس ہوتی ہے اور جس طرح جسم کے ایک حصّے کو دکھ پہنچے تو باقی حصّے بھی مبتلائے درد ہو جاتے ہیں، اسی طرح اہلِ برلن کے موجود مصائب ساری قوم کے لیے سوہانِ رُوح بنتے ہیں۔

ایک حد تک پاکستان کے دونوں بازوؤں سے جن کے درمیان ایک غیر حکومت شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً پھیلی پڑی ہے، اصل سرزمین جرمنی اور برلن کو مماثلت دی جا سکتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان بھی ایک وسیع علاقے پر ہم نسل باشندوں کے باوجود عنانِ حکومت دوسروں کے ہاتھ میں ہے جس طرح پاکستان سے ہندوستان اور ہندوستان سے پاکستان پہنچنا آسان نہیں ہے، پروانۂ راہداری کے باوجود بہت سی دشواریاں حائل ہیں، اسی طرح سرزمین جرمنی سے برلن تک پہنچنا چاند یا مریخ کے سفر سے کم پریشان کن نہیں ہے۔ انسانی آزادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں نے ایسی پابندیاں عائد کی ہیں کہ انھیں دور کرنے کا کوئی طریقہ بظاہر ممکن نہیں ہے لیکن چونکہ ہم آریائی نسل کے نہیں ہیں اور المانوی حدود سے بہت دُور رہنے والے ہیں، اس لیے ہمیں مقامی باشندوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ سہولتیں ملتی رہی ہیں یا بالفاظ دیگر کسی خاص دقت کا سامنا نہیں ہوا ہے۔

آنے جانے والوں کی ہر نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ برلن میں سونے یا جواہرات کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور یہ اندیشہ ہے کہ کوئی اپنے ساتھ چھپا کر انھیں لے جائے گا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ برلن نہ صرف جرمنی کے لیے بلکہ سارے یورپ کے لیے ایک مستحکم قلعے کی حیثیت رکھتا ہے جو بہت سے رازہائے سربستہ کو اپنے دامن میں لیے بیک وقت انسانی ضمیر کی آزادی اور مدنی تقاضوں کی ذمہ داری کو پورا کرتا ہے۔ کوئی کانٹا بذاتِ خود اس دامن سے وابستہ نہیں ہے، لیکن الجھ جانے اور الجھانے کی صلاحیت موجود ہے جو قدرتی نہیں، اکتسابی ہے۔ یہ پابندیاں لندن پروٹوکول کے نفاذ کے وقت سے اب

تک عائد ہیں اور نہ جانے کب تک ان کا سلسلہ قائم رہے گا۔

**لندن پروٹوکول:** شکستِ جرمنی کے بعد اتحادیوں نے زبردست کا ٹھینگا سر پر رکھنے کے لیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انصاف پسندی کا ڈھونگ رچانے کے لیے ایک مشاورتی کمیشن قائم کردیا جسے جرمنی کے مستقبل کے بارے میں سوچنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس شترِ بے مہار کو، جو اگرچہ بُری طرح کچلا جا چکا ہے، کسی ایسی کروٹ سے بٹھایا جائے کہ اس کے اعضاء بالکل شل ہو جائیں اور یہ ہمیشہ بیٹھا ہی رہے۔ دوبارہ کھڑے ہونے کی سکت اس میں باقی نہ رہے۔ جرمنی کی تقسیم جس بندر بانٹ طریقے سے ہوئی، اس کی جھلکیاں پچھلے صفحات میں دکھائی جا چکی ہیں۔ برلن کی تنظیم میں نوچ کھسوٹ تو زیادہ نہیں ہوئی لیکن عملِ جرّاحی نے خونِ ناحق کا رنگ جما دیا۔ کمیشن میں برطانیہ، روس اور ریاست ہائے متحدہ کے نمائندے شامل تھے۔ بظاہر ایک بندھن سے بندھی ہوئی جھاڑو کی تیلیوں کی طرح وہ ایک تھے لیکن تثلیث میں وحدانیت کہاں۔ لہٰذا اس تر پھلے کے تینوں اجزا بھی مختلف خواص و ماہیئت رکھنے والی ادویہ کی طرح مختلف الخیال تھے۔ انھوں نے لندن پروٹوکول پر دستخط تو کردیے جس کا منشا یہ تھا کہ سرزمینِ جرمنی کی طرح برلن کو بھی قبضہ کرنے والی حکومتوں کی تحویل میں رکھا جائے اور برلن سے مراد وہ عظیم تر برلن ہو جس کی حدود ۲۷ اپریل ۱۹۲۰ء کے قانون میں منضبط کی گئی تھیں لیکن نئے نظم و نسق کا اصل مقصد برلن کی عظمت کو خاک میں ملا دینا تھا۔

پروٹوکول میں لکھا تھا کہ برلن کے علاقے پر برطانیہ، روس اور ریاست ہائے متحدہ کا مشترک قبضہ رہے گا۔ اس پر ۱۴ نومبر ۱۹۴۴ء کو تینوں بڑی طاقتوں کے دستخط ہو گئے تھے۔ لیکن روس کو فوراً کم اختیار دینے کی خاطر فرانس کو بھی شامل کر لیا گیا اور اس ضمیمے پر ۲۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو دستخط ہو گئے۔ تعجب ہے کہ روس کے حکام نے مغربی شاطروں کی اس چال پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ روس ہر قیمت پر کم سے کم اس وقت ساری دنیا میں فضائے امن قائم کردینے پر ادھار کھائے بیٹھا تھا، کیونکہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس میں دم خم دکھانے کی سکت باقی نہیں تھی۔ اس نے اپنے اختیارات کا کچھ حصہ نکل جانے پر غور بھی نہیں کیا اور پوری

فرمانبرداری کے ساتھ ترمیم شدہ مسودے کو قبول کر لیا۔ طرّہ یہ کہ بعد میں شامل ہونے والے اس "چوتھے سوار" کو بھی برابر کے حقوق مل گئے۔ لیکن اس نظام میں دو عملی کا انداز پایا جاتا تھا یعنی شہر کے چار سیکٹر بن گئے تھے اور ہر سیکٹر ایک ملک کے زیر نگین تھا۔ چاروں سیکٹر مشترکہ طور پر ایک کمانڈاتورا کے تحت تھے اور یہ اقتدار ہر مہینے ایک ملک کے سپرد رہتا اور مہینے کی آخری تاریخ کو بدل جاتا تھا۔ بالفاظِ دیگر داخلی معاملات میں ہر سیکٹر کا اختیار ایک ملک کو تھا لیکن امور خارجہ، دفاع اور مالیاتی اعتبار سے چاروں سیکٹر ایک تھے۔

**بارِ خاطر:** بارش ہلکی سہی لیکن اس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اسی حالت میں ہمیں ہوٹل سے ہوائی اڈے جانا پڑا۔

جہاز اڑا اور کسی قدر اونچا ہو گیا لیکن موسم کی خرابی کی وجہ سے کچھ دیر ہچکولے کھاتا رہا اور اسی لیے نازک طبیعت کے کچھ لوگ متلی میں مبتلا ہو گئے۔ جہاز والوں کو اس کیفیت کا پہلے سے اندازہ تھا۔ انھوں نے کچھ "ترش مٹھائیاں" مسافروں میں تقسیم کر دی تھیں۔ میں نے چار لیمن ڈراپس لیے اور برابر میں بیٹھے ہوئے ایک بچے کو دے دئے۔ اس کی ماں نے تکلفاً صرف دو ڈراپس لیے تھے۔ بچہ ان سے زیادہ کا متمنی تھا۔ میری پیشکش سے خوش ہو گیا۔ چند منٹ بعد جہاز زیادہ بلند ہو کر ائر پوکٹس (جیب فضائی) سے باہر ہو گیا اور مسافروں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ البتہ مجھے جہاز کے اسٹیوارڈ پر غصہ آتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ امریکن ایکسپریس والوں سے اس کا سسرالی رشتہ تھا۔ کیونکہ وہ نامعقولیت کی حد تک بدتمیز تھا جب بھی اس نے مٹھائی یا ٹافی کسی کو پیش کی اپنے طرزِ عمل سے ظاہر کیا کہ جیسے وہ اس پر احسان کر رہا ہو، بالکل اسی طرح جیسے بعض جلسوں میں انعامات تقسیم کرنے والے، خصوصاً تقسیم کرنے والیاں، یہ انداز اختیار کرتی ہیں گویا کہ انعام کی رقم اُن کی جیب سے نکلی ہے اور انعام پانے والا ان کا رہینِ منت ہونا چاہیے۔ غالباً یہ اسٹیوارڈ کسی افسرِ اعلا کا بیٹا ہوگا اور اس نے انعامات تقسیم کرتے وقت اپنے باپ کی شان دیکھی ہوگی۔ مٹھائی یا ٹافی دیتے وقت وہ نہ تو مسکراتا، نہ ذرا سا جھکتا ہے جیسا کہ دستور ہے اور نہ مسافروں کی طرف سے شکریہ کے الفاظ ادا ہونے پر کوئی رسمی جواب دیتا ہے۔ گویا عوائدِ رسمیہ سے وہ بالکل بے بہرہ

ہے۔ ایئر فرانس کے جہاز میں سفر کا یہ پہلا موقع ہے۔ اس کمپنی کی خوبیوں کا جو ذہنی تصوّر تھا، وہ ختم ہوگیا۔ اور جو ذرا سا باقی رہ گیا تھا، وہ ائیر ہوسٹس صاحبہ نے ہماری نشستوں کے قریب ناشتہ کی کشتی پھینک کر اور میری شیروانی خراب کرکے ختم کر دیا۔

میں نے ہوائی جہازوں میں کئی کئی ہزار میل کا سفر کیا ہے مگر ایسی بدنظمی اور بدتمیزی کہیں نہیں دیکھی۔ یہ غنیمت ہے کہ جہاز پرواز کے وقت بہت ہی متوازن رہتے ہیں اور زمین پر چلنے والی گاڑیوں کی طرح سڑک کی ناہمواری اور ٹائروں کی لچک کے باعث ہچکولے اور جھٹکے نہیں کھاتے۔ اگر جہازوں کے ساتھ بھی یہی صورت ہوتی تو شاید یہ صاحبہ اور بھی غضب ڈھاتیں اور مسافروں کے لیے مصیبت بن جاتیں جن پر "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کی کیفیت دورانِ پرواز میں پوری طرح طاری رہتی ہے۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ جہاز ائیر پوکٹس سے بہت اونچا اڑ رہا تھا۔ اگر اس وقت ان کے باعث زیر و بم کی کیفیت پیدا ہوتی تو شاید یہ ائیر ہوسٹس صاحبہ خود ہی کسی کے اوپر گر پڑتیں۔

**ہمبرگ کا ہوائی میدان:** ہمارا جہاز ہمبرگ کے ہوائی میدان پر اترا اور ہم باہر نکلے تو تند و تیز ہوا کا زناٹا تھا بلکہ طوفانی کیفیت طاری تھی۔ بارش اس پر مستزاد تھی۔ رن وے سے عمارت تک آتے آتے خوب بھیگے۔ سبھی کی بُری حالت ہوگئی۔ محض چند لوگوں کے پاس چھتریاں تھیں۔ لیکن ایسے موقع پر چھتری کہاں کام دیتی ہے۔ پانی بوچھاڑ کی طرح آتا ہے اور چھتری کا وجود برائے نام رہ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بڑی بےبسی ہوتی ہے۔ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ ایک خاتون جو ذرا بھاگ کر عمارت میں گھس جانے کی کوشش کر رہی تھیں پھسل کر گر پڑیں۔ دوسرے تو کیا دستِ تعاون بڑھاتے، خود ان کے ساتھی کوئی مدد نہ کرسکے کیونکہ وہ بری طرح لدے پھندے تھے۔ وہ بڑی سُرعت کے ساتھ خود ہی اٹھ گئیں اور خاک جھٹکنے کی بجائے جس کا وہاں نام و نشان بھی نہ تھا، گیلا ہو جانے والا لباس جھٹک کر اپنی خفّت مٹانے لگیں۔ بزرگوں کا قول یاد آگیا، اتنا نہ بھاگو کہ گر پڑو۔

ہوائی اڈّے کے لونج میں پہنچتے ہی لوگوں نے گرم گرم قہوے کی فرمائش کی، ان کے برعکس ہم نے برف لگا ہوا لیمن منگوایا تو سب حیرت سے دیکھنے لگے۔

کچھ دیر بعد پھر اسی راستے کو ناپتے ہوئے بیشتر مسافر اور کچھ نئے مسافر برلن جانیوالے جہاز کی طرف چل پڑے۔ پھر وہی ہوا کے تھپیڑے تھے اور بارش کا طوفان۔ جن لوگوں نے گرم قہوہ پیا تھا، انھیں سردی لگنے لگی۔ ان کے برعکس ہم پر کوئی اثر نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد اوپر سے ہم برلن کا نظارہ کرنے لگے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم برلن کی تباہی دیکھنے کے لیے نیچے اتریں گے۔ جہاز نے بالائی فضا میں پورے شہر کے دو چکر کاٹے۔ شاید موسم کی خرابی فوراً اترنے میں مانع تھی کیونکہ بارش یہاں بھی ہو رہی تھی۔ یا بصورتِ دیگر کوئی جہاز رَن وے پر تھا اور کنٹرول روم سے لسے اجازت نامہ نہیں مل سکا تھا۔ برلن کا ہوائی میدان بہت بڑا ہے۔ میں نے اس سے بڑا ہوائی میدان کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ شاید اوٹوبان کے طول طویل فاصلوں کی طرح اس کی وسعت بھی ہٹلر کی رہینِ منت تھی۔ معلوم ہوا کہ رَن وے اسی زمانے کا ہے، بعد میں صرف مرمت ہوئی ہے۔ وہ تو ہر ملک میں ہوتی ہی رہتی ہے۔ اس میدان کی ایک اور خوبی ہے اور شاید اسی کے لیے مخصوص ہو۔ وہ یہ کہ میدان میں اتر کر اور دوڑ لگا لینے کے بعد جہاز ریل گاڑی کی طرح پلیٹ فارم پر سائے میں آ جاتا ہے۔ بارش ہو یا دھوپ، مسافروں کو ذرا بھی زحمت نہیں ہوتی پلیٹ فارم ایک نہیں، چالیس پچاس ہیں اور وہ بھی بہت وسیع اور طویل ہیں۔ کئی جہاز پہلے سے دوسرے پلیٹ فارموں پر کھڑے تھے۔ بعض خالی ہو چکے تھے اور بعض بھرے جا رہے تھے۔ بعض اڑنے کے لیے پَر تولنے کی بجائے اپنے پنکھے گھما رہے تھے۔

**برلن کی تاریخ:** برلن کی تاریخ بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ مشکل سے بارھویں صدی عیسوی میں اس کی اوّلین بستی کے آثار تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اس وقت شاہ البرٹ نے سلافی قوم کے دیسی باشندوں کو روکنے کے لیے دریائے ایلبے کے مشرقی ساحل پر ایک چھوٹی سی بستی بسائی تھی۔ اس وقت صرف حکومت کی طرف سے مامور کیے ہوئے فوجی نگراں اور ان کے افرادِ خاندان یہاں رہنے لگے تھے۔ بعد کے فرمانرواؤں نے اس دفاعی قلعے کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے آبادی کو بڑھایا اور علاقے کو وسعت دی۔ حتیٰ کہ تیرھویں صدی کے شروع میں تھوڑے فاصلے پر کئی

ضلعے آباد ہو گئے۔ پھر مرکز صرف مشرقی ساحل ہی نہیں رہا، دوسرے ساحل پر بھی عمارتیں کھڑی ہونے لگیں۔

برلن کا سب سے پہلا قابلِ ذکر حوالہ ایک نوشتے میں ملتا ہے جو ۱۲۳۰ء میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس علاقے کی صنعت و حرفت اور تجارت ترقی کرنے لگیں۔ شاید اس لیے کہ قدرت کی بعض نعمتیں بھی ان کاموں میں ممد و معاون تھیں۔ بہت جلد اس کی فوجی اہمیت نے ثانوی حیثیت حاصل کر لی۔ اس نے ملک کے شمالی علاقوں سے ناتا جوڑ لیا۔ اندرونی خلفشار کے باعث فرمانرواؤں کی توجہ بھی اس طرف سے ہٹ گئی تھی لیکن یہ محرومی باعث خوش قسمتی بن گئی۔ ۱۳۹۱ء میں اسے نظم و نسق کے اعتبار سے مکمل آئینی اختیارات مل گئے۔ اس طرح وہ نہ صرف ملک کے اچھے شہروں میں شمار ہونے لگا بلکہ دوسرے ملکوں کے ساتھ اس کا رشتہ زیادہ مضبوط ہو گیا۔ پندرھویں صدی کے شروع میں حالات بدلے۔ فرمانرواؤں کی توجہ تو اس طرف مبذول نہیں ہوئی لیکن قریب کے ایک اور شہر کو انھوں نے راجدھانی بنا لیا۔ ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے اس ہمسائیگی نے کام کیا۔ اس زمانے میں مرکزی حکومت کے علاوہ ریاستی نظام بھی قائم تھا اور بہت سے نواب بڑی حد تک خود مختار بنے ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں باہمی چشمک مقابلے کا رنگ جماتی ہے اور آبادیاں خواہ مخواہ ترقی کرتی ہیں۔

پندرھویں صدی عیسوی میں اس شہر کے گرد فصیل تعمیر کر دی گئی۔ اس سے کچھ فائدہ ہوا اور کچھ نقصان بھی۔ فائدہ یہ کہ دوسرے محصور شہروں کی طرح اس کی حیثیت زیادہ مستحکم ہو گئی اور نقصان یہ کہ مزید وسعت پانے کے امکانات رک گئے۔ لیکن یہ خسارہ دیرپا نہیں تھا۔ جب "جائے تنگ است و مرداں بسیار" کی صورت رونما ہوئی تو انسان نے اپنے پاؤں چادر سے باہر پھیلائے۔ یعنی شہر پناہ سے باہر نئی بستیاں آباد ہونے لگیں۔ شروع میں ان کی پالیسی علیحدگی کی رہی لیکن پھر جس طرح چھوٹے بلبلے بڑے بلبلے کے ساتھ مل کر ایک زیادہ بڑا بلبلہ بنا دیتے ہیں، بستیاں اصل شہر میں مدغم ہوتی گئیں اور فصیل کا وجود صرف اس طرح باقی رہ گیا جیسے ایک ہی مکان کے کئی کمروں کے درمیان دیوار برائے نام حائل ہوتی ہے۔

# برلن میں



براﻧڈن برگ گیٹ



جرمن پارلیمان کی عمارت



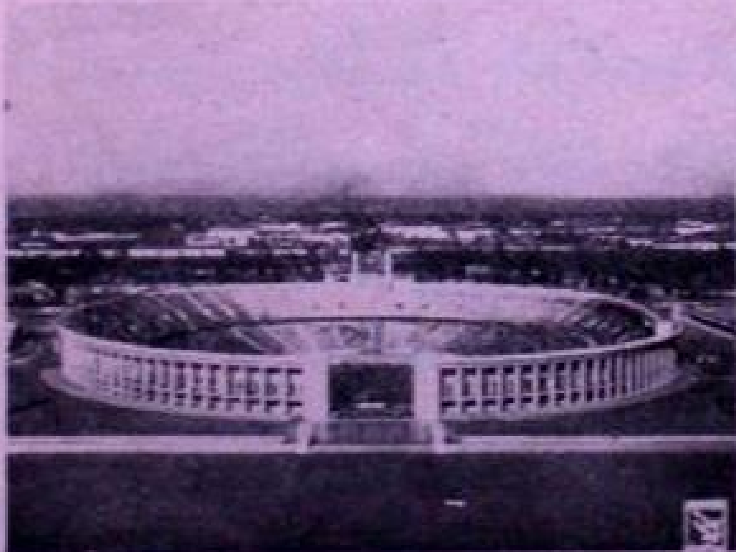
راٹ ھاؤس



کرفرسٹن بند



مغربی برلن کا ایک بارونق بازار



برلن میں کھیلوں کا میدان

اس کے باوجود اس کا رقبہ بہت زیادہ نہیں تھا اور آبادی بھی قلیل تھی یعنی ۱۶۵۴ء کی مردم شماری میں آبادی دس ہزار سے زیادہ نہیں تھی تاہم اس زمانے میں کسی شہر کی اتنی آبادی بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اس سترھویں صدی میں جرمنی کے پانچ شہر نورمبرگ، اوگس برگ، اسٹراس برگ، فرینکفرٹ اور کولون زیادہ مشہور تھے۔ تاہم برلن کے علاوہ ان شہروں کو بھی مشہور سی سالہ جنگ میں بڑا نقصان پہنچا۔ برلن کے لیے جنگ کے باعث تباہ ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس وقت کون جانتا تھا کہ اس سے کہیں زیادہ شدید تباہی اس کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔ وہ بارہا تباہ و برباد ہو کر نئے سرے سے مکرر تعمیر ہوا کرے گا۔

سترھویں صدی عیسوی کے تقریباً آخر میں فریڈرک ولیم نے زیادہ وسیع کر کے نئی شہر پناہ تعمیر کرائی اور پرانی فصیل کو مسمار کرایا تاکہ شہر کا رقبہ ایک دائرے میں آجائے لیکن بہت جلد محسوس ہوا کہ یہ حد بندی غیر ضروری تھی۔ شہر نے برابر پھیلتے رہنے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ فریڈرک کے نام سے تین بستیاں اس کے باہر آباد ہو گئیں اور ایک بار پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ انھیں شہر کا جزو سمجھا جائے یا شہر سے الگ حیثیت دی جائے۔

لوئی چہار دہم کے زمانے میں بلکہ اسی کے ایما و اشارے سے جب فرانس میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا جو ہوگے نوٹ کہلاتے تھے، قتل عام شروع ہوا اور وہ جان بچا کر جرمنی میں بھاگ آئے تو برلن ہی ان کا مسکن بنا۔ ان کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ تھی۔ اس طرح شہر کی آبادی ایک دم بڑھ کر پچیس ہزار ہو گئی۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصے بعد دریائے اسپری اور دریائے اوڈر کے درمیان ایک نہر بنائی گئی جس نے دوسرے شہروں کے لیے برلن کے ساتھ تجارت کی نئی راہ کھول دی۔

فریڈرک ولیم سے بعد کے فرمانرواؤں نے بھی اس شہر پر اپنی نظر عنایت رکھی اور اس کی علیحدہ مجلس بلدیہ قائم کر کے اس ملک کے دوسرے شہروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس زمانے میں شہر نے نیا چولا بدلنا بھی شروع کیا۔ کیونکہ نئے باشندوں نے نئی وضع کی عمارتیں تعمیر کیں جن میں سے بعض دوسری جنگ عظیم تک برقرار تھیں اور چونکہ ان کی مکرر تعمیر ہو گئی ہے، اس لیے انھیں اب تک برقرار کہا جا سکتا ہے۔ اٹھارھویں

صدی عیسوی کے آخر میں اس کی آبادی ایک لاکھ بہتّر ہزار تک پہنچ گئی اور ترقی کی یہ رفتار اس وقت بھی نہیں رکی جب کہ ہفت سالہ جنگ کے دوران میں پہلے آسٹریا نے اور پھر رُوس نے عارضی طور پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

انیسویں صدی کے شروع میں برلن کو ایک دشوار دور سے گزرنا پڑ گیا جبکہ فرانس نے جنگِ جینا کے بعد اس پر قبضہ کر لیا اور شہنشاہ جرمنی نے مجبور ہو کر پرشیا کے شہر کونگز برگ کو اپنا صدر مقام بنا لیا۔ یہ دور نپولین کے زمانۂ عروج تک چلتا رہا لیکن اس شہنشاہِ فرانس کے زوال کے بعد دنیا کا نقشہ بدلا تو عروسِ برلن کا لٹا ہوا سہاگ بھی بحال ہو گیا اور اس نے وہ روپ نکھارا جو پہلے کبھی میسّر نہ آیا تھا۔ ۱۸۰۹ء میں یونیورسٹی کی اور ۱۹۲۴ء میں عجائب گھر کی بنیادیں رکھی گئیں تو یہ شہر ملک کے سب سے زیادہ ذہین لوگوں کی توجّہ کا مرکز بننے لگا۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ریلوے لائن پڑ جانے سے وہ کسر پوری ہو گئی جو باقی کہی جا سکتی تھی۔ وہ یورپ کی بڑی بڑی ریلوے لائنوں کا مقامِ اتصال اور بعض کا آخری سرا بن گیا۔ گویا سب ملکوں کے بڑے شہروں سے اس کے ڈانڈے مل گئے۔ علاوہ ازیں بھاری مشینری بنانے والی فیکٹریوں کے قیام نے صنعتی اعتبار سے اس ملک کو بے حد خوشحال بنا دیا۔ اس خوشحالی کو عارضی طور پر پہلی اور دوسری عالمگیر لڑائیوں نے ختم کر دیا۔ دونوں بار جرمنوں نے اپنے دفاع کے لیے بڑا اہتمام کر رکھا تھا لیکن چونکہ انھوں نے برطانیہ پر زبردست بمباری کی، اس لیے انگریزوں نے بھی دل کھول کر بدلا لیا اور خوب تباہی پھیلائی۔ بجلی کے کارخانے، ریلوے اسٹیشن، ہوائی جہازوں کی فیکٹری، ہوائی میدان اور سبھی کچھ مسمار ہو کر رہ گیا۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں جو بمباریاں ہوئیں وہ بے حد تباہ کن تھیں۔ اسی دوران میں وزیر دفاع فیلڈ مارشل گورنگ کی فضائی وزارت کے دفاتر بھی مسمار ہو گئے جو بالکل قلب شہر میں واقع تھے۔

**تین برلن:** اس میں شک نہیں کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ہونے والے معاہدۂ صلح کے بموجب برلن کے دو ٹکڑے ہو گئے اور وہ ایک کے بجائے دو برلن یعنی مشرقی اور مغربی بالکل اسی طرح کہلانے لگے جیسے ہمارے ملک کے دو حصّے مشرقی اور مغربی پاکستان کہلاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہاں دو حکومتیں الگ الگ فرمانروائی کرتی ہیں اور یہاں ایک ہی حکومت نظم و نسق قائم رکھتی ہے۔ لیکن

اگر نقشۂ عالم پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ جرمنی کے برلن کے علاوہ دو برلن اور ہیں جو یورپ سے بہت دور امریکا کی سرزمین پر ریاست ہائے متحدہ کی دو مختلف ریاستوں میں واقع ہیں۔ ان میں سے ایک ریاست نیو ہمپشائر میں دریائے آنڈرو سکوگن کے کنارے پورٹ لینڈ سے سو میل جانب شمال مغرب ایک پہاڑی مقام ہے جس کی آبادی پچیس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ جگہ برقِ آبی تیار کرنے والے کارخانوں اور عمارتی لکڑی کے باعث مشہور ہے۔ یہ کاغذ سازی کا مرکز بھی ہے۔ تقریباً دو کروڑ ڈالر کا کاغذ ہر سال تیار ہو جاتا ہے۔ امریکا کا دوسرا برلن ریاست وسکونسن میں دریائے فوکس کے کنارے مل واکی سے اکیاسی میل جانب شمال مغرب واقع ہے۔ آبادی سات ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ بیشتر افراد بھیڑ بکریاں اور گائیں پالتے ہیں۔ اسی لیے یہ دودھ اور دودھ کی مصنوعات کا مرکز ہے۔ جانوروں کا گوشت ڈبوں میں بھر کر اور کھالیں خشک کر کے مختلف النوع مصنوعات کو فروغ دیا گیا ہے۔

برلن کے نام سے ایک چار پہیہ گاڑی بھی بہت مقبول ہے جس کا اولین نمونہ ۱۶۷۰ء میں تیار ہوا تھا۔ آج تک اسی نمونے کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جوناتھن سوئفٹ نے اس وضع کی گاڑی کے آرام دہ ہونے پر مہرِ تصدیق لگائی ہے۔

جرمنی کی تاریخ اور سیاست میں معاہدۂ برلن کے نام سے ایک دستاویز بھی بہت مشہور ہے جسے برلن میں منعقد ہونے والی ایک کانگریس نے ۱۳ر جولائی ۱۸۷۸ء کو منظور کیا تھا۔ اس کی تفصیل تو بہت لمبی چوڑی ہے۔ مختصراً صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ذریعہ میثاقِ اسٹیفانو پر نظرِ ثانی کی گئی ہے جس کی رو سے روسیوں اور ترکوں کے مابین لڑائی ختم کی گئی تھی اور جس کی بدولت روس کو یہ اختیار مل گیا تھا کہ وہ جزیرہ نمائے بلقان کی ریاستوں کی قسمت کا فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق کر سکتا ہے۔

**ہوٹل کمپنسکی:** ہم موٹر میں ہوائی میدان سے ہوٹل کمپنسکی روانہ ہوئے جہاں ہمارے لیے دو بڑے کمرے ریزرو ہو چکے تھے۔ یہ ہوٹل فسانن اسٹراس نامی سڑک پر یادگار بند گور ستن کے قریب واقع ہے۔ اسی سڑک پر اور اسی بند کے قریب کئی اچھے ہوٹل ہیں ایسے مقامات عموماً ہوٹلوں کے لیے مناسب و موزوں ہوتے ہیں۔ مسافروں کے لیے بہت

تفریحی دلچسپیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اس علاقے کے اچھے ہوٹلوں میں آم تسو، سیوائے، روکسی، ایسٹوریا اور کونٹی نینٹل تقریباً یکساں معیار کے ہیں کمپنسکی میں ایک خوبی یہ ہے کہ ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم ملحق ہے۔ یہ بات بعض دوسرے ہوٹلوں میں نہیں ہے۔ لیکن ہم نے کمپنسکی کو اس لیے خاص طور پر پسند کیا کہ اس میں لہو ولعب نسبتاً کم ہوتا ہے۔ نرخ ذرا زیادہ ہیں لیکن پُرسکون فضا میسّر آجاتی ہے منچلے نوجوان اس جگہ سے دُور رہتے ہیں۔ ہر جگہ ایسا ماحول ہمارے لیے ترجیحی حیثیت رکھتا ہے اگرچہ طرزِ تعمیر اور اندرونی آرائش کے اعتبار سے ہر کمرہ امریکی انداز کا ترجمان ہے لیکن اس معاشرہ کا آئینہ دار نہیں ہے۔ ایک اسی ہوٹل پر کیا منحصر ہے جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد تمام جرمنی، خصوصاً مغربی برلن ایک نیا جنم لے رہا ہے اور یہ نئی زندگی بڑی حد تک امریکا کی رہینِ منّت ہونے کے باعث اس تہذیب کی عکاسی کر رہی ہے۔

ہوائی میدان سے ہوٹل پہنچتے پہنچتے نہ معلوم کتنی عمارتیں تباہ حال دیکھیں۔ ان میں سے بعض دوبارہ اس طرح بن چکی ہیں کہ ان کے "چہروں" سے اب اضمحلال کی کیفیت تک ظاہر نہیں ہوتی بلکہ زیادہ بارونق نظر آتی ہیں۔ بعض مکرر تعمیر کی منزل سے گزر رہی ہیں۔ کچھ بدستور پڑی ہیں۔ ابھی تک ان پر نظرِ عنایت نہیں کی گئی۔ شاید کوئی مصلحت ہو یا ان کے مالکان میں اتنی سکت نہ ہو کہ انھیں نئے سرے سے تعمیر کرالیں البتہ سرکاری عمارتیں سبھی درست ہو گئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ امدادِ باہمی کی انجمنیں تعمیر نو میں اعانت کر رہی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ نام نہاد فاتحین کے بم جن عمارتوں کے سینے چاک کر گئے ہیں، ان پر عملِ جرّاحی کر کے جس قدر جلد ممکن ہو، شکستگی کی منزل سے نکال دیا جائے۔ بعض ایسی عمارتیں بھی نظر آئیں جن کے صرف ڈھانچ کھڑے ہیں۔ چھتیں اور بام و در غائب ہیں لیکن وہ بالکل خالی پڑی ہیں۔ ہمارے ملک کی طرح نہیں کہ مہاجرین نے ان پر قبضہ کر کے جھونپڑے بنا لیے ہوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعمیر نو کے منصوبوں میں شامل ہیں۔ وقت آنے پر ان کو درست کر لیا جائے گا۔ عمارتوں کے علاوہ سڑکوں کے نشانات بتاتے ہیں کہ ان کی مرمّت بھی حال ہی میں ہوئی ہے لیکن بعض پھر بھی اُدھڑی پڑی ہیں۔ شاید ان کے سینوں میں بموں کے ٹکڑے ہنوز پیوست ہوں۔ برلن کی تباہی کی داستان اخبارات و رسائل میں بھی پڑھی تھی اور لوگوں سے

سُنی تھی، آج اس کا عبرتناک حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دل پاش پاش ہو گیا۔

**مُٹ ہیزن کمپنی**: ہوٹل میں اپنا سامان جمانے اور کچھ دیر ستا لینے کے بعد ہم نے مُٹ ہیزن اینڈ کمپنی کے دفتر کو ٹیلی فون کیا۔ یہ کمپنی دوائی سفوف کا دانہ بنانے اور قرص بنانے والی مشینیں تیار کرتی ہے۔ آج کی ملاقات کے لیے ان سے بہت دن پہلے وقت طے ہو گیا تھا۔ لیکن یاد دلا کر وعدے کی تجدید ضروری تھی۔ ہمارا ٹیلی فون پہنچتے ہی کمپنی کے مالک مسٹر مُٹ ہیزن نے اپنی موٹر ہوٹل بھیج دی جو یقیناً ہمارے لیے سہولت کا باعث بنی اور ہم کسی سے دریافت کیے بغیر وہاں پہنچ گئے۔

یہاں ہم نے قرص بنانے کی کئی مشینیں دیکھیں۔ ایک مشین ڈبل پنچ سسٹم پر بنائی گئی ہے۔ یہ ہمارے لیے نئی چیز تھی۔ ہم نے اس کا لٹریچر لے لیا۔ دوسری مشین ایسی ہے کہ اس کے سب آلات نیچے لگے ہوئے ہیں اور قرص پر دباؤ اوپر سے ڈالنے کے بجائے نیچے سے پڑتا ہے۔ ہم نے اس کے طریق کار کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن سمجھ نہیں سکے۔ لٹریچر اس کا بھی لے لیا ہے۔ مسٹر مُٹ ہیزن نے ہمیں بتایا کہ اس نئی وضع کی مشین میں آواز بالکل نہیں ہوتی۔ حال ہی میں انھوں نے ایسی کئی مشینیں شیرنگ کمپنی کو بھی دی ہیں۔ ہم نے ان کو بتایا کہ کل اپنے پروگرام کے مطابق شیرنگ کمپنی دیکھنے جائیں گے۔ وہاں جا کر اسے چلتا دیکھیں گے تاکہ اسکی صحیح کارکردگی کا اندازہ ہو سکے۔ ورنہ بنانے والی مشینیں یعنی گرینیولیٹنگ مشین کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ ہم نے ڈنمارک سے ویسی ہی ایک مشین منگوائی تھی لیکن وہ بے کار پڑی ہے۔ ہمارے دواخانوں میں اس کا استعمال مفید ثابت نہیں ہوا۔ دانہ بنانے کا جو طریقہ ہم نے اختیار کر رکھا ہے، وہ زیادہ آسان ہے اور بہتر چیز تیار ہوتی ہے۔

مسٹر مُٹ ہیزن کے اصرار پر ہم ان کے گھر چلے گئے جو کمپنی ہی کے احاطے میں ہے۔ ہم ان کی شریکِ حیات سے ملے۔ یہ معمر شوہر اور بیوی ہم سے مل کر واقعی خوش ہوئے۔ انھوں نے رسمی طور پر ہماری تواضع بھی کی۔ کسی جرمن گھر جانے میں ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ان کا گھر مختصر سا ہے لیکن نہایت صاف ستھرا ہے۔ ہر چیز میں حسن

اور سلیقے کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران بمباری سے ان کا یہ مکان بھی متاثر ہوا تھا۔ اس کی چھت بالکل گرگئی تھی۔ اپنے مکان کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے وہ بہت مغموم ہوگئے۔ ان کے چہروں سے دلی کیفیات ظاہر ہونے لگیں۔ خاص طور پر خاتون زیادہ متاثر تھیں۔

انھوں نے ہمیں عمدہ قسم کے کیک کھلائے اور سیب کا رس پلایا۔ وہ سیب انہی کے ننھے سے باغ میں لگے ہوئے تھے جن کا رس نکالا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور پھلدار درخت بھی تھے۔ ہم پر اُن کی مہماں نوازی کا بڑا اثر ہوا۔ ہم ان کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے واپس جانے کی اجازت چاہتے تھے کہ مسٹر مسٹ ہینزن نے ہمیں ہوٹل تک پہنچانے کی پیش کش کی بلکہ انھوں نے اور ان کی شریک حیات نے ایک بار پھر اصرار کر کے ہمیں گاڑی میں بٹھا دیا۔ اس بار شوفر کے بجائے خود انھوں نے گاڑی چلائی۔ اس طرح ہمیں اور بھی رہین منت کر دیا۔

آج جمعہ کی نماز تو سفر کے غلط پروگرام کی نذر ہو ہی گئی تھی۔ نماز عصر کا ثواب حاصل کرنے سے بھی محروم رہ گئے۔ اس لیے ہوٹل پہنچتے ہی نماز مغرب کی تیاری شروع کی اور یہ فریضہ ادا کر کے سکونِ قلب حاصل کیا اور پھر ہوٹل کے منتظمین کو یہ اطلاع دے کر کہ ہم کھانا نہیں کھائیں گے، پیدل ہی بازار میں نکل گئے۔ ہم نے سوچا کہ جب شہر دیکھنا اور اس کی رونق کے بارے میں اندازہ لگانا ہی ہمارا مقصد ہے تو گاڑی میں سوار ہونے سے کیا حاصل۔ ایک ایک چیز پر مبصرانہ نظریں ڈالتے چلیں گے اور جب جی چاہے گا واپس چلے آئیں گے۔ برلن کے بازار حقیقتاً اتنے بارونق ہیں کہ ان کو دیکھے بغیر ان کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ہر دوکان کے شوکیس برقی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے اور رنگ برنگ کی نیون ٹائپ روشنیوں سے سائن بورڈ ایک نیا سماں پیدا کر رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ کیا یہ شہر واقعی بری طرح تباہ ہوا تھا۔ گیارہ سال کے مختصر عرصے میں مختلف النوع پابندیوں کے باوصف جو ترقی اس نے کی ہے، وہ مثالی کہی جا سکتی ہے، خود جرمنی میں بھی اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ پھر یہ رونق ظاہری زیب و زینت ہی تک محدود نہیں ہے۔ اندر

جا کر دیکھا تو دوکانیں ہر قسم کے سامان سے بھری پڑی تھیں۔ دوکانداری کا نظام بھی اعلا پیمانے پر چل رہا تھا۔ بیشتر دوکانوں میں سامان فروخت کرنے والی لڑکیاں متعین ہیں جو با اخلاق ہونے کے علاوہ بے حد مستعد بھی ہیں۔ کسی گاہک کو انتظار کی زحمت اٹھانی نہیں پڑتی۔

ہم ایک بازار سے گزرے جس کا نام انٹر ڈین لنڈن ہے جس کے لغوی معنی "لیموں کے درخت کے زیر سایہ" ہیں ممکن ہے کہ یہاں کبھی لیموں کے درخت ہوں۔ اب تو کوئی درخت نظر نہیں آتا۔ شاید بموں کی نذر ہو گیا ہو۔ بلا مبالغہ میں نے اتنا حسین بازار کبھی کسی شہر میں نہیں دیکھا۔ ہم بلا مقصد ایک دوکان میں داخل ہو گئے۔ یہ تیار شدہ ملبوسات کی دکان تھی۔ اس میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ منیجر نے ہم کو آتا دیکھا تو فوراً اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ہمارا خیر مقدم کیا لیکن ہم نے صاف کہہ دیا کہ ہم خریدار نہیں ہیں، کیونکہ جو لباس ہم پہنتے ہیں، وہ تمام جرمنی میں میسّر نہیں آسکتا بلکہ اس کو تراشنے اور سینے والے بھی نہیں مل سکتے۔ منیجر نے بہت دلچسپی سے ہماری شیروانیوں کا جائزہ لیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ اگر ہم کو موقع دیا جائے اور نمونتہً ایک شیروانی دے دی جائے تو ہم اپنے کاریگروں سے اسے تیار کرادیں گے۔ صرف ایک ہفتے کی مہلت دی جائے۔ ہم نے اس مہم جوئی کی داد دی لیکن معذوری ظاہر کی۔ ہم نے بتایا کہ ہم برلن میں صرف دو دن اور قیام کریں گے اور پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ دریافت کرنے پر ہم نے یہ اندازہ ضرور لگایا کہ وہاں سامان بہت مہنگا بکتا ہے۔ ایک قمیض کے دام چالیس روپے کے قریب بتائے گئے۔ مکمل سوٹ تین سو روپے کا تھا۔

اس بازار میں کئی سینما بھی ہیں۔ سارے مغربی برلن میں تقریباً دو سو پکچر ہاؤس ہیں جن میں جرمن کے علاوہ انگریزی زبان کے فلم بھی دکھائے جاتے ہیں۔ ہر سینما گھر اس طرح سجا ہوا نظر آتا تھا جیسے فلم کا افتتاح آج ہی ہوا ہو حالانکہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک سینما میں کوئی فلم دو ہفتے سے چل رہا ہے۔ اس پر بے پناہ رش تھا۔ ایک ہفتے پہلے بکنگ ہو تو ٹکٹ نہیں ملتا۔ سینما گھروں کے علاوہ یہاں کی نائٹ کلبیں بھی یورپ بھر میں مشہور ہیں۔ ان کی شہرت جو لڑائی سے پہلے تھی،

اب بھی برقرار ہے۔ لیکن سُنا ہے کہ پیرس کی طرح ان میں بے ہودگیاں نہیں ہوتیں۔ نیم عریاں جسموں کی نمائش تو ضرور ہوتی ہے مگر ذرا سلیقے سے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود ہماری طرح برلن میں بہت سے لوگ ان نائٹ کلبوں کے وجود ہی سے متنفر ہیں اور چاہتے ہیں کہ حکومت کوئی قانون بنا کر ان کے مذموم رواج کو ممنوع قرار دے دے۔

میاں محبوب کی پسند اور انتخاب کے مطابق ہم نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا جس کا نام اسٹوکلر ہے۔ ہمارے رہائشی ہوٹل کے قریب ہے۔ لیکن کھانا عمدہ ملتا ہے اور میاں محبوب کو یقین ہے کہ وہاں کوئی ایسی حرکت نہیں ہوتی کہ بکرا کہہ کر سُور کھلا دیں۔

واپس آ کر ساڑھے دس بجے تک بیٹھ کر ہم نے لندن کا پروگرام آخر "فائنلائز" کر ہی لیا اور لندن روانہ کر دیا۔ برکات صاحب نے اپنے ایک دوست کے نام بھی خط لکھ دیا تاکہ لندن میں وہ ہمارا خیال رکھیں اور کوئی پریشانی لاحق نہ ہو۔ لندن کا پروگرام دراصل کئی ہاتھوں میں جا کر خراب ہو گیا اور اسی لیے انقطاعی منزل میں نہ پہنچ سکا تھا۔ اگر معمول کے مطابق صرف بھائی جان محترم یہ پروگرام بھی طے کرتے تو یقیناً بہتر رہتا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ پروگرام تو کسی نہ کسی طرح اچھا بن ہی گیا لیکن اتنی تاخیر ہو گئی ہے کہ یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ اس پر کس حد تک عمل ہونا ہے۔ جن لوگوں سے ملنا ہے، ان کو ذرا دیر پہلے مطلع کرنا ضروری تھا۔ خدا کرے، اس میں کوئی جھول پیدا نہ ہو۔ یہ دعا مانگتے ہوئے ہم سو گئے اور خوب گہری نیند سوئے۔

---

۲۹ر ستمبر ۱۹۵۶ء ——— ہفتہ

# برلن میں

برلن کوئی ایسی مختصر یا محدود سی جگہ تو ہے نہیں کہ اس کے لیے دو دن ہی کافی کہے جا سکتے ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمیں اپنے پروگرام بناتے وقت اکثر مقامات کی اہمیت کو نظر انداز کر دینا پڑا ہے۔ وطن سے باہر نکلنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ "ملکِ خدا تنگ نہیں ہے" بلکہ ضرورت سے زیادہ وسیع ہے، اتنا وسیع کہ آسانی سے اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ خدا کے فضل و کرم سے ہمارے دست و پا صحیح و سالم ہیں لیکن بے پناہ مصروفیات نے "پائے مرا لنگ است"، کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسی لیے ہم نے اپنے دائرۂ سیاحت کو طب و جراحت اور دوا سازی کی دنیا تک محدود رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی کے مطابق راہ نامہ مرتب کیا تھا لیکن گھر سے باہر قدم رکھنے کے بعد ان موضوعات سے ہٹ کر بھی بہت کچھ دیکھنا، سننا، محسوس کرنا اور سمجھنا پڑ گیا۔ تاہم اپنے پروگرام میں کبھی جھول آنے نہیں دیا۔ بہت سی ان دیکھی چیزوں کو دیکھنے اور ناشنیدہ باتوں کو سننے کی حسرت دل میں رہی اور دل میں یہ طے کر لینا پڑا کہ دوسری ثقافتی سرگرمیوں پر توجہ پھر کبھی دی جائے گی۔ دنیا زندہ، سیاحت باقی۔ صرف برلن کے لیے ہمیں کم سے کم ایک ہفتہ مخصوص کرنا چاہیے تھا۔ لڑائی سے پہلے کا برلن نہیں دیکھا۔ اس کا صرف حال کتابوں میں پڑھا ہے، تو کم سے کم لڑائی کے بعد والے برلن کو تو اچھی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جائے۔ "شنیدہ کے بُود مانندِ دیدہ" سنی سنائی اور پڑھی پڑھائی باتیں برلن کے بارے میں تو کل کے روزنامچے میں لکھی جا چکی ہیں۔ ضرورت تو یہ ہے کہ اپنے مشاہدات و احساسات قلمبند کیے جائیں اور بہ سبیل تذکرہ

اب سے پہلے کے کچھ حالات کو پس منظر میں محفوظ رکھ لیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد اس شہر پرُ آشوب پر کیا بیتی اور چونکہ یہ شہر بین الاقوامی لڑائی کا مرکز تھا اس لیے جگ بیتی کا تصور بھی یہاں رہ کر کیا جا سکتا ہے۔

**برلن لڑائی کے بعد:** دوسری جنگِ عظیم سے قبل عظیم تر برلن کا رقبہ آٹھ سو اسّی مربع کلو میٹر تھا۔ اگر شہر کی تقسیم عمل میں نہ آتی تو آج اس کا رقبہ شاید اس سے زیادہ ہوتا۔ تقسیم چار بڑی طاقتوں کے درمیان چار برابر حصّوں میں نہیں ہوئی، بلکہ اس کے تقریباً دو ٹکڑے کر دیے گئے۔ امریکی، برطانوی اور فرانسیسی مشترک حصے کا رقبہ چار سو اسّی مربع کلو میٹر اور روسی حصّے کا باقی چار سو کلو میٹر قرار پایا لیکن بہت سے افراد نے اس تقسیم کو پسند نہیں کیا۔ چنانچہ جب خطِ فاصل کھینچا گیا تو مجبوراً نقلِ سکونت اختیار کی گئی۔ اس طرح مغربی برلن کی آبادی اس وقت بائیس لاکھ اور مشرقی برلن کی بالکل نصف یعنی گیارہ لاکھ ہے۔ اگر لڑائی میں مرنے والوں کا صحیح ریکارڈ مرتّب ہو سکے تو دونوں کی تعداد میں مزید کئی لاکھ کا اضافہ جنگ سے پہلے کے اعداد و شمار کو ظاہر کرے گا۔ پھر یہ بات غور طلب ہے کہ رقبے کے اعتبار سے تقسیم برابر ہونے کے باوجود آبادی میں ایک اور دو کی نسبت کیوں ہوئی جبکہ دونوں حصّوں میں رہائشی سہولتیں اور دوسری آسائشیں یکساں موجود تھیں اور لڑائی سے پہلے آبادی کا پھیلاؤ بھی یکساں ہی تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ تقسیم شہر کے کچھ عرصے بعد ایسے حالات رونما ہوئے کہ مشرق کے لوگوں کو مغرب کی جانب فرار ہونا پڑا۔ نقل سکونت کی بظاہر اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ شاید روسی حکّام نے اپنے عام برتاؤ میں ذرا بھی رواداری نہیں برتی۔

اس حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے جملہ حالات پر نظر بازگشت ڈالنے کی ضرورت ہے۔ برلن میں ۲ مئی ۱۹۴۵ء کی رات کو صفر ساعت کا لمحہ شروع ہوا۔ یہ لڑائی کے مکمل طور پر ختم ہو جانے کے بعد کی بات ہے۔ اس وقت ناخدائے روس جوزف اسٹالن نے شہر برلن کی مکمل تسخیر کا اعلان کیا۔ نئے نظام کے تحت روس کو اس شہر پر اقتدار حاصل ہو گیا، حالانکہ جیت تو اجتماعی طور پر اتحادیوں کی تھی اور اس میں روس کے علاوہ دوسری طاقتیں بھی شامل تھیں

روسی فوج کے کمانڈر انچیف مارشل گریگوری شوکوف نے ۱۳رمئی کو نئی شہری حکومت کے اراکین کی تقرری کی توثیق کردی۔ انھیں برلن میں متعین روسی کمانڈنٹ کرنل جنرل این برسارین نے مقرر کیا تھا۔ چھ دن بعد اراکین نے اپنے منصب سنبھال لیے۔

مغربی اتحادیوں نے عظیم تر برلن میں اپنے اپنے علاقوں کا انفرادی اختیار یکم جولائی سے حاصل کیا۔ اس وقت تک اور ایک لحاظ سے اس کے بعد بھی فوجیں ایک دوسرے کے علاقے میں پھیلی رہیں اور ریاست ہائے متحدہ کو اعلان کرنا پڑا کہ بہت جلد ان کی واپسی اپنے اپنے علاقے میں ممکن ہو جائے گی۔ روسی چاہتے تھے کہ جو کام کل ہونا ہے، وہ آج ہی ہو جائے۔ اس وقت جرمنی میں جنرل آئزن ہاور ریاست ہائے متحدہ کی طرف سے کمانڈر انچیف تھے۔ انھوں نے تینوں بڑی طاقتوں کے کمانڈروں کی ایک کانفرنس طلب کی اور اس میں ایک بار پھر اس فیصلے کی توثیق کی گئی کہ ہوائی جہازوں، سڑکوں اور ریلوں کے ذریعہ ہر قسم کی آمد و رفت آزادانہ ہوگی اور کسی بھی سرحد پر جنگی کے یا فوج کے حکام آنے جانے والوں کی تلاشی نہیں لیں گے۔

اتحادیوں کی فوجی کمان کے مشترک نظام نے ۱۱رجولائی کو شہر کے چاروں علاقوں کا اکٹھا اقتدار حاصل کرلیا۔ بعض مسائل پر غور کرنے کے لیے چھ دن بعد پوٹسڈم کانفرنس ہوئی جس میں صدر ٹرومین، وزیر اعظم چرچل اور مارشل اسٹالن نے حصہ لیا اور طے پایا کہ جب تک جرمنی اتحادیوں کے زیر تسلط ہے، اسے ایک اقتصادی یونٹ سمجھا جائے گا۔ اس اقرارنامے پر ۲راگست کو دستخط بھی ہو گئے۔ ۲۰راگست سے اتحادیوں کی احتسابی کونسل نے برلن میں اپنا کام شروع کر دیا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس احتسابی کونسل اور مشترکہ کمان کی جملہ تجاویز اتفاقِ رائے کے ساتھ منظور ہوا کرتیں۔ لیکن جہاں تک عظیم تر برلن کی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے آزادانہ فروغ کا تعلق تھا، روسی نمائندوں کی طرف سے برابر اختلافی نظریات کا اظہار ہوتا رہا اور ہر موقع پر ویٹو استعمال کی جانے لگی۔ چنانچہ اس سال کے بالکل آخر میں اس قسم کے اختلافات بالکل واضح طور پر محسوس ہونے لگے اور افتراق کی

خلیج برابر وسیع ہوتی چلی گئی

پوٹسڈم کانفرنس کے فیصلے کے مطابق مجلس بلدیہ کے انتخابات عمل میں آنے تھے اور اس موقع پر تمام سیاسی جماعتوں کو پورے اختیارات کے ساتھ آسائیش دی جانی تھیں۔ پہلے تو روس نے چاہا کہ اپنے علاقے کے باشندوں کو انتخابات کے بائیکاٹ پر آمادہ کرے لیکن جب یہ ممکن نہ ہوا تو متحدہ اشتراکی جماعت میدان میں آ گئی۔ اسے بیس فیصد سے بھی کم ووٹ ملے۔ اس شکست کے بعد خاص طور پر روس نے ہر اتحادی تجویز کی مخالفت کا بیڑا اٹھالیا۔ اسے غصہ اس بات کا بھی تھا کہ خود اس کے علاقے میں رہنے والوں نے اشتراکی جماعت کے خلاف ووٹ دیے تھے۔ شہری کونسل کے بعد میئر کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔ یہ کاروائی مشترک کمان کے تحت ہوئی۔ کثرتِ رائے ارنسٹ رائٹر کو عظیم تر برلن کا میئر بنانا چاہتی تھی لیکن روس کو ویٹو استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ اختلافات کی خلیج اور زیادہ وسیع ہوگئی۔ پھر تجارتی انجمنوں کے طریقۂ کار پر بھی احتسابی مہریں لگائی گئیں۔ شہر کے سب حصوں میں ایک ہی قسم کا زرمبادلہ رائج کرنے کا سوال پیدا ہوا تو اس وقت بھی مخالفت ہوئی۔ ۲۲ جون ۱۹۴۸ء کو اس سلسلے کے جملہ مذاکرات ناکام ہوگئے۔ روسی چاہتے تھے کہ جو سکہ انھوں نے اپنے علاقے میں چلا دیا ہے سارے برلن میں قابل قبول ہو جائے۔ مغربی اتحادیوں کا اصرار تھا کہ جو سکہ جرمن بنک نے جاری کیا ہے، رواج پائے۔ اس لحاظ سے جو دوعملی شروع ہوگئی تھی برقرار رہی اور ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے باہمی تجارت پر قدغن ہونے لگا، بلکہ پورا انکس لگ گیا۔

بہت جلد روس نے احتسابی کونسل اور مشترک کمان سے کنارہ کشی کر لی۔ مذاکرات ممکن نہیں تھے، لہٰذا مراسلات کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس میں بھی بے اعتنائی برتی جانے لگی، بلکہ یہاں تک ہوا کہ مغربی جرمنی سے مشرقی جرمنی کے راستے برلن پہنچنا روک دیا گیا اور ناقابلِ شکست دشواریاں پیدا کر دی گئیں۔

انجام کار معاملہ اقوامِ متحدہ میں پیش ہوا۔ اس وقت ارجن ٹائن کے نمائندے سلامتی کونسل کے صدر تھے۔ ناکہ بندی ختم کرنے کے لیے روس سے مطالبہ کیا گیا

لیکن روسی ویٹو نے کوئی انقطاعی فیصلہ برآمد نہ ہونے دیا۔ جھگڑا جس منزل میں تھا، برقرار رہا۔ دیکھا جائے تو اس کونسل میں ویٹو کا استعمال ایسا مذموم حربہ ہے جس کی داد فریاد ممکن ہی نہیں ہے اور ایسی صورت میں اس کا عدم وجود برابر ہے۔

اس وقت برلن کے دونوں حصوں میں غذائی حالت بہت خراب تھی۔ اشیائے خورونوش کا ذخیرہ اگلنے والے کھیتوں میں بموں کے ٹکڑوں اور جہازوں کے شکستہ ڈھانچوں نے ایسے ہل چلائے تھے کہ ان کی ساری زرخیزی کچھ عرصے کے لیے ختم ہو گئی تھی۔ لامحالہ کھانے پینے کا سامان باہر ہی سے آنا تھا۔ جب راستے بند ہو گئے تو ہوائی جہازوں کا سہارا لینا پڑا۔ حالانکہ یہ تجربہ بڑا مہنگا بھی تھا۔ بظاہر یقین نہیں آتا لیکن اعداد و شمار جمع کرنے والوں کا کہنا ہے کہ امریکا، برطانیہ اور فرانس کی فضائی فوجوں کے جہاز اس کام پر ڈٹ گئے اور انھوں نے ۲۶ر جون ۱۹۴۸ء سے ۱۲ر مئی ۱۹۴۹ء تک یعنی ناکہ بندی ختم ہونے تک تقریباً دو لاکھ بار پرواز کی، بیس لاکھ ٹن سے زیادہ اشیائے خوراک، کوئلہ اور دوسرا سامان مغربی برلن پہنچایا اور اس طرح وہاں کے باشندوں کو بھوک، سردی اور بیماریوں سے بچائے رکھا۔

۶ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو اشتراکیوں کے زیر اہتمام مجلس بلدیہ کے ہال پر ایک زبردست ہلہ بولا گیا اور صورت حالات اتنی نازک ہو گئی کہ عظیم تر برلن کو دو مخالف طاقتوں کے درمیان تقسیم کرنا بالکل یقینی سمجھا جانے لگا۔ روسیوں نے منتخب شدہ کونسلروں کی جماعت کو نظر انداز کرتے ہوئے کچھ نئے اراکین نامزد کیے اور ایک متوازی حکومت قائم کر کے شون برگ کو بیامرکز بنا لیا جو مشرقی جرمنی کے علاقے میں ہے۔ یہ تنازعہ ایک بار پھر اقوام متحدہ میں پیش ہوا اور جب کسی تجویز کے منظور ہونے کا وقت آیا تو اقوام متحدہ میں روس کے نمائندے جیکب ملک نے اعلان کیا کہ ناکہ بندی ختم کر دی گئی ہے اور حالات معمول پر آ گئے ہیں۔ ۱۲ر مئی ۱۹۴۹ء کو ناکہ بندی تو واقعی ختم ہو گئی لیکن کشیدگی کی فضا بدستور چھائی رہی۔

۱۹۵۱ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا۔ اس وقت

وفاقی جمہوریہ جرمنی کی طرف سے ایک مراسلہ لندن، پیرس اور واشنگٹن بھیجا گیا اور مغرب کی تینوں بڑی حکومتوں سے استدعا کی گئی کہ ناقابل برداشت صورتِ حالات کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ تیسری بار یہ مسئلہ پھر اقوام متحدہ کے سامنے آگیا۔ جنرل اسمبلی نے جس کے پاس اپنے فیصلوں کو منوانے کے لیے کوئی باقاعدہ طاقت نہیں ہے، اور اس کے اقدامات کاغذی کارروائی سے آگے نہیں بڑھتے، پینتالیس موافق، چھ مخالف اور آٹھ غیر جانبدار ووٹوں سے فیصلہ کرتے ہوئے ایک کمیشن قائم کر دیا اور اسے حکم دیا کہ وہ برلن کے دونوں حصوں میں جاکر اصل حالات کا جائزہ لے اور جلد رپورٹ پیش کرے لیکن روس جس نے اسمبلی میں تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے منفی ووٹ دیا تھا، اس کمیشن کے اراکین کو اپنے علاقے میں گھسنے کی اجازت کب دے سکتا تھا۔ کمیشن کی کارکردگی قابلِ غور تھی کہ اس نے جنیوا میں بیٹھ کر برلن کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ نتیجہ جو کچھ نکل سکتا تھا، وہ ظاہر ہے۔ کمیشن کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہو گیا۔

۲۷ مئی ۱۹۵۲ء کو اشتراکیوں نے برلن کے دونوں حصّوں کے درمیان ٹیلی فون اور تار کے سلسلے منقطع کر دئے۔ ایک جسم کے دو اعضا کو ایک دوسرے سے جُدا رکھنے کے لیے یہ پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد نقل و حرکت کی آزادی پر بھی مہرِ احتساب لگنے لگی اور پروانۂ راہداری کے بغیر آمد و رفت ممنوع قرار دے دی۔ یہ اجازت نامہ شاذ و نادر ہی ملتا تھا۔ مجبور ہو کر لوگوں نے مشرقی حصّے سے بھاگنا شروع کیا۔ بے سر و سامانی کے عالم میں بھاگنے والوں پر شروع میں کوئی احتساب نہیں ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی تعداد کم کر کے بغاوت کا خطرہ ختم کر دیں۔

برلن میں ہمارے پہنچنے سے آٹھ روز پہلے تک کے جو اعداد و شمار اخبارات میں آتے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ دس لاکھ مہاجرین اس وقت تک مغربی برلن میں داخل ہوئے ہیں۔ کچھ وہیں رہے اور باقی وفاقی جمہوریہ جرمنی کے دوسرے حصّے میں چلے گئے۔ اگرچہ کچھ عرصے بعد روس نے اپنے علاقے سے جانے والوں پر پابندی عائد کر دی تھی لیکن جان بچا کر بھاگ نکلنے والے کوئی نہ کوئی راہِ فرار نکال ہی لیتے ہیں۔ اب حکومتِ جرمنی کے لیے مہاجرین کی آبادکاری

ایک بڑا دردِ سر ہے۔ ہمیں اس مشکل کا احساس پوری طرح ہے۔ تقسیم ملک کے بعد سے اب تک مہاجرین کی آباد کاری برِ صغیر پاک و ہند میں بھی اطمینان بخش صورت میں ممکن نہیں ہو سکی ہے۔

**شیرنگ فیکٹری:** ہمارے آج کے پروگرام میں شیرنگ اینڈ کمپنی کو دیکھنا شامل ہے۔ یہ برلن کا مشہورِ دوا سازادارہ ہے۔ تقریباً ایک ماہ پہلے خط و کتابت کے ذریعہ اس فیکٹری کے اربابِ اقتدار سے آج صبح ساڑھے نو بجے کا وقت طے ہو گیا تھا۔ ہوٹل سے ہم نے اس کے منتظم اعلا کو ٹیلی فون کیا کہ ہم پروگرام کے مطابق ان کے ہاں پہنچ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا، آپ چند لمحے انتظار کیجیے، ہم ابھی گاڑی بھیجتے ہیں، چند ہی منٹ میں وہ آپ تک پہنچ جائیگی۔ اس طرح یہاں آپ کو آنے میں سہولت ہوگی۔ ہم نے اس پیش کش کو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا اور واقعی چند ہی منٹ بعد ہم کو ہوٹل کے استقبالیہ سے مطلع کیا گیا کہ آپ کے لیے گاڑی آگئی ہے۔ ہم لفٹ کے ذریعے نیچے اترنے کے لیے اس کے دروازے تک پہنچے تو فیکٹری کے افسر رابطہ مارٹن شملا و پر آگئے اور پھر ہم سے ہاتھ ملا کر فوراً ہی ہمارے ساتھ نیچے اتر گئے۔ وہ ہمیں لینے آئے تھے۔ ہم ان کے اس حسنِ انتظام کے قائل ہو گئے لیکن افسوس ہے کہ فیکٹری کو اطمینان سے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا اور ہم زیادہ لطف اندوز بھی نہیں ہوئے۔ شاید اس کی ایک وجہ تو یہ ہو کہ ہم اس سے بہتر فیکٹریاں اب تک دیکھ چکے تھے۔ یہ اتنے اعلا معیار کی نہیں تھی۔ لیکن ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ منتظم اعلا ہمیں وہ حصہ دکھانے سے گریز کر رہے تھے جس میں شیرنگ کو مقبولیت حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہارمونز بنانے میں شہرت رکھتے ہیں اور اسی کے طریقہ تیاری کو دیکھنا ہماری دلچسپی کا مرکز تھا۔ ہارمونز بعض افراد کا نام ہے جو قدرتی طور پر انسانی جسم میں پائے جاتے ہیں۔ وہ انسانی اعضا میں تحریک کا باعث ہوتے ہیں۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ان میں کمی ہو جاتی ہے تو ان کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے۔ ان کے بغیر زندگی بے کیف و بے رنگ رہتی ہے۔ منتظم اعلا کو خواہ مخواہ یہ شبہ ہو گیا کہ ہم ان کی دوا سازی کے راز معلوم کرنے آئے ہیں۔ اور انھیں سیکھ کر خود

تیاری شروع کر دیں گے۔ ہم نے ان کے دل کی بات معلوم کرلی۔ اس لیے فیکٹری کے اس حصّے کو دیکھنے کے لیے زیادہ زور نہیں دیا۔ وہ ہمیں پیکینگ ڈیپارٹمنٹ سے ڈائننگ ہال اور پاور ہاؤس تک سبھی کچھ دکھاتے پھرے۔ بھلا وہ بھی کوئی دیکھنے کی چیزیں تھیں۔ ہم نے ہر چیز پر اچٹتی سی نظریں ڈالیں اور رمزیہ انداز میں یہ ظاہر بھی کر دیا کہ ہم دلچسپی نہیں لے رہے۔ اس دوران میں ہماری ملاقات ان کے شعبۂ برآمدات کے انچارج کارل شوبارک اوسکی سے بھی ہو گئی۔ ان کے بھی دو ایک خط ہمدرد فیکٹری میں آئے تھے۔ پتہ چلا کہ وہ نومبر میں اپنی تجارتی ذمہ داریوں کے سلسلے میں پاکستان جا رہے ہیں ہم شاید اس وقت تک واپس نہیں پہنچیں گے لیکن ہمیں اس کا افسوس نہیں ہوگا۔ جب یہاں کی ملاقات کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا تو وہاں بھی ان کی آمد ہمارے لیے بے سود ہی رہے گی۔ پھر ہمارا زاویۂ عمل بھی دوسرا ہے۔

عجائب گھر: جرمنی میں اب تک ہم جتنے عجائب گھر دیکھ چکے ہیں، وہ ہماری معلومات میں اضافے کے لیے کافی ہیں۔ شاید ہم کسی اور عجائب گھر کا خیال بھی دل میں نہ لاتے۔ لیکن حاجی برکات احمد صاحب ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ خود عجائبات میں سے ہیں، اس لیے عجائبات کے دلدادہ ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ہر میوزیم، خصوصاً آرٹ میوزیم دیکھا جائے۔ برلن میں ایک عجائب گھر تو علم نسلیات سے متعلق ہے اور دہلیم کے علاقے میں واقع ہے جو علم و ادب اور ثقافت کا مرکز ہے اور منجملہ اور چیزوں کے برلن یونیورسٹی کو بھی قلب میں لیے ہوئے ہے۔ علمِ نسلیات کے عجائب گھر کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہیں لیکن معلومات میں حیرت انگیز اضافہ کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں اطمینان سے دیکھا اور سمجھا جائے اور پتہ چلایا جائے کہ دنیا بھر کی قوموں نے گھٹنیوں چل کر کس طرح ترقی کی ہے اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں۔ ان میں کیا رشتہ ہے اور کس کو کس پر فضیلت حاصل ہے۔ اس فضیلت کا معیار کیا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں فنونِ لطیفہ کی چیزوں کو ایک آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے

دیکھنے کا اہل نہیں ہوں۔ صرف اپنے ذوق کے مطابق اچھے بُرے میں امتیاز کر سکتا ہوں۔ برکات احمد صاحب کو ان سے خاص شغف ہے یا ہم پر رعب جمانے کے لیے ایسا کہتے ہیں۔ بہرنوع ان کی خاطر آرٹ میوزیم بھی دیکھنا پڑا جو قریب ہی واقع تھا۔ لیکن پتہ چلا کہ اب وہ شان نہیں ہے جو لڑائی سے پہلے تھی۔ ہر چند کہ نوادر کو بچانے کی انتہائی کوشش کی گئی لیکن جب عجائب گھر کی دیواریں چھلنی ہو گئی ہوں تو اندر رکھا ہوا سامان کس طرح محفوظ رہ سکا ہوگا۔ کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا لے کر بھان متی کا کنبہ جوڑ دیا گیا ہے۔ بیشتر چیزیں مشرقی برلن میں پہنچ گئی ہیں۔ وہاں تو بالکل کس مپرسی کے عالم میں ہوں گی۔ یہاں کافی سلیقے سے ان کی نمائش کی گئی ہے۔ عام طور پر عجائب گھروں میں جو چیزیں ہوتی ہیں، وہ سبھی موجود ہیں لیکن اس طرح جیسے کتاب کے کچھ صفحات شروع اور آخر کے پھٹ گئے ہوں اور یہ پتہ نہ چل سکتا ہو کہ کتاب کا نام کیا ہے اور مصنّف کون ہے۔ یہ ڈھاہی میوزیم لڑائی ختم ہونے کے بہت عرصے بعد سنوارا گیا ہے اس لیے دوسرے مقامات کی بچی کھچی چیزیں بھی اس جگہ محفوظ کر دی گئی ہیں۔

**نمائش :** برلن میں ان دنوں ایک نمائش ہو رہی ہے۔ کل تک جاری رہے گی۔ اس میں صنعتوں کے متعلق بھی اسٹال ہیں۔ میوزیم سے فارغ ہو کر وہاں تک پہنچ بھی گئے۔ نمائش کے بارے میں ہمارا تصور یہ تھا کہ چند عارضی اسٹال کسی میدان میں بن گئے ہوں گے جیسا کہ اکثر ان ملکوں میں ہوتا ہے جو اقتصادی اعتبار سے زیادہ ترقی پذیر نہیں ہوتے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جرمنی میں، جسے لڑائی کے بعد سے اب تک پست درجہ سمجھا جاتا رہا ہے اور یہی نقش غیر ملکوں پر جمایا جاتا رہا ہے، نمائش کے لیے ایک مستقل میدان مخصوص ہوگا اور ایک دو نہیں بہت سی شاندار عمارتیں اور پختہ ہال بنے ہوئے ہوں گے اور نمائش کھلے میدان میں نہیں، ان وسیع ہالوں میں ہوگی جن کے طول و عرض اور بلندی کے بارے میں ایک بار تو غرقِ استعجاب ہو جانا ہی پڑا۔ ایسی نمائشوں کے متعلق سنا تھا کہ وہ صرف پیرس اور نیویارک کے لیے مخصوص ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ جرمنی کا یہ انداز لڑائی سے پہلے بھی اپنا سکّہ جمائے ہوئے تھا اور اب بھی

وہ یورپ کے بہت سے ملکوں سے اس منزل میں بازی لے جاتا ہے۔

نمائش کے دروازے پر جب ہم ٹکٹ لینے گئے تو گیٹ کیپر نے ہمیں ٹکٹ خریدنے سے منع کردیا اور ہمیں ایک دفتر میں پہنچا دیا جہاں ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ انھوں نے اس طرح ہمارا پُرتپاک خیر مقدم کیا گویا ہم نے وہاں جانے کا وقت مقرر کیا ہوا اور وہ ہماری منتظر ہوں۔ ہم ابھی یہ فیصلہ کرنے بھی نہ پائے تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ خاتون محترم نے خود ہی سوال کیا "آپ شاید بزنس مین ہیں؟"

گو ہمارے اس سفر کا بڑا مقصد بزنس نہیں بلکہ طبی طریقوں اور اداروں کا مطالعہ تھا، تاہم بزنس مین ہونے سے انکار تو نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ عرفِ عام میں "بزنس مین" جس قماش کے تاجر کو کہا جاتا ہے، ہم اس رواجی مفہوم سے بہت دور تھے۔ جو خوبیاں اس ذات سے وابستہ ہوتی ہیں یا منسوب کی جاتی ہیں، ہم ان سے محروم تھے اور اپنی اس محرومی پر ناز تھا۔ یہ بات نہ ہوتی تو ہمدرد دواخانہ ملک میں اتنا مقبول نہ ہوتا۔ اگر وہ مجھ سے پوچھتیں کہ آپ شاید طبیب ہیں تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ میں ذاتی طور پر یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ طبیب کہلاؤں اور اسی مناسبت سے جانا پہچانا جاؤں۔ اسی اعتبار سے خدمات انجام دینی چاہتا ہوں۔ پاکستان میں ہمدرد دواخانہ یقیناً میرا تھا اور ایک لحاظ سے اب بھی میرا ہے لیکن اس سے کبھی ذاتی طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ خدمتِ خلق اور فروغِ فن کو ہمیشہ ذاتی مفاد پر ترجیح دی ہے۔ دواخانہ اسی جذبے کے تحت وقف کیا گیا ہے اور اب ایک مجلسِ متولیان کی نگرانی میں دے دیا گیا ہے۔ اس طرح اس سے الگ ہو کر اس کے زیادہ قریب ہو گیا ہوں۔

بہرحال اس نمائش میں ہم سب تاجر تھے۔ بھائی جان محترم بھی تاجر تھے۔ حالانکہ ان کے خیالات اس باب میں مجھ سے بھی زیادہ سخت تھے۔ یہ ٹھپہ ان کے نام پر کسی طرح لگ ہی نہیں سکتا۔ ان خاتون نے ہمارے پتے اپنی وزیٹر بک میں لکھوا لیے اور نمائش میں داخل ہونے کے خصوصی پاس دیدیے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارے ہمراہ چلنے کے لیے کھڑی ہو گئیں، تاکہ نمائش میں ہر چیز ذرا

تفصیل سے دکھائیں، خصوصاً وہ جو ہماری دل چسپی کی ہوں۔ وہ نمائش کے علاقے میں ہمیں ایک اور دفتر میں لے گئیں۔ وہاں ایک دوسری خاتون سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ معاف کیجیے گا۔ یہ لفظ "مڈبھیڑ" اس لیے استعمال کرنا پڑا کہ ان خاتون سے اپنا پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔ ہم نمائش کی ہر چیز کو محض سرسری طور پر دیکھ لینا چاہتے تھے۔ ہمارے مطلب کی کوئی چیز وہاں نہیں تھی۔ لیکن وہ چاہتی تھیں کہ ہم گہری نظر سے ہر چیز کو دیکھیں اور اپنی فرمائشیں درج کراتے جائیں۔ جو حصہ باقی رہ جائے، اس کو کل آکر دیکھیں۔ دوسرے روز ہمارے لیے آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ بیچ بیچ میں وہ خاتون بعض نجی سوال بھی کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ہماری بیویوں اور بچّوں کی تعداد بھی پوچھ ڈالی۔ انھوں نے اس لحاظ سے تعجب کا اظہار کیا کہ ہم دونوں بھائیوں کی صرف ایک ایک بیوی ہے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ ہر مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں رچاتا ہے، گویا اس کے لیے ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم نے بمشکل ان سے نجات پائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دونوں خواتین ایک انجمن کی ملازم ہیں اور اس کی طرف سے نمائش میں متعین ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ ان زائرین کا جو غیر ملکی ہوں اور کسی نہ کسی عنوان تجارت سے تعلق رکھتے ہوں، خیر مقدم کریں، خاص خاص اسٹالوں میں لے جا کر اپنی مصنوعات دکھائیں اور اگر کسی زائر کو دل چسپی ہو تو اس سے تجارتی امکانات کی بات چیت کریں۔ چونکہ وہاں ہمارے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی، اس لیے اس اعتبار سے بات چیت نہ ہو سکی۔

ہم نے نمائش میں ایک مشین دیکھی جو پلاسٹک کے پیڈ، جلدیں، بٹوے وغیرہ تیار کرتی ہے۔ ہم اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے رکے تھے کہ اس اسٹال کا ایک کارندہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گیا۔ ہم نے لاکھ کہا کہ ہمیں اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ اس طرح مظاہرہ کرنے لگا کہ گویا ہم اس کے کل پرزوں کو سمجھ کر خرید لینا چاہتے ہیں۔ اس نے بہت سا لٹریچر بھی ہمیں تھما دیا اور اصرار کیا کہ ہم دوسرے دن ضرور آئیں کیونکہ کل ایک بڑی مشین آنے والی ہے۔

اس کے بعد ہم ذرا محتاط ہو گئے کہ خواہ مخواہ ہر جگہ دلچسپی کا اظہار نہیں

کرنا چاہیئے۔ بہتر یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر بات کی جائے۔ یہ ہمارے ہاں کی نمائش نہیں ہے کہ محض تفریحات کا مقام ہو۔ ہمارے ہاں عورت مرد، بچے، بوڑھے سب سیر کے لیے جاتے ہیں۔ خوب پیٹ بھر کے حلوا پراٹھا، دہی بڑے، کباب، ٹکے آلو چھولے کھاتے، چائے اور قہوہ یا سوڈا پیتے ہیں۔ جھولوں میں جھولتے ہیں، چوتھے درجے کا کھیل تماشا دیکھتے ہیں اور بس دو کالوں پر سرسری نظر ڈال کر چلے جاتے ہیں۔ بیشتر کے لیے نمائش میں جانے کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ اگر یہاں کی نمائش کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو تین چار دن بھی کافی نہیں ہو سکتے۔

اِن دنوں اہلِ جرمنی اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور عظمت کو واپس لے لینے کے درپے ہیں۔ ان کا حق بھی یہی ہے کہ وہ یورپ کی ممتاز قوموں میں شمار ہونے لگیں۔ پہلی عالمگیر لڑائی میں تباہی کے بعد کون کہہ سکتا تھا کہ یہی قوم دوسری جنگِ عظیم کی بھی ذمہ دار ہو گی۔ وہ ایک بار پھر ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دے گی اس کی شکست نے دوسری قوموں کا اندازِ فکر بدل دیا ہے۔ میں ذاتی طور پر جیسا کہ اس سے پہلے اظہارِ خیال بھی کر چکا ہوں، دوسری جنگِ عظیم کو ایشیا اور افریقہ کے لیے ایک فالِ نیک سمجھتا ہوں۔ اگر دوسری جنگِ عظیم نہ چھڑتی تو ایشیا کی غلام رہتا مظلوم قوموں کو ابھرنے کا موقع کبھی نہ ملتا۔ برّصغیر دو حصّوں میں کبھی تقسیم نہ ہوتا۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک علیحدہ مملکت بن کر نظر نہ آتا۔ انڈونیشیا بدستور ہالینڈ کی غلامی میں رہتا۔ کچھ اور قومیں بھی جدّوجہد میں مصروف ہیں۔ افریقہ کی قوموں نے دنیا میں عزّت کے ساتھ زندہ رہنے کا احساس اپنے اندر پیدا کر لیا ہے وہ ابھر کر اپنے قومی وقار کو بلند کر لینا اور محکومیت کا جُوا اتار کر پھینک دینا چاہتی ہیں۔ ایک وقت آئے گا کہ افریقہ کے بھی بہت سے ملک آزاد ہو کر رہیں گے۔ یورپ کے اربابِ اقتدار کو ان علاقوں سے اپنا بستر بوریا باندھ لینا پڑے گا۔ اور جب افریقہ آزاد ہو جائے گا تو ایشیا کے ساتھ مل کر سارے یورپ اور امریکا کے لیے یعنی تمام مغربی دنیا کے لیے دردِ سر ثابت ہو گا۔ خدا کرے وہ دن جلد آئے مجھے یقین ہے کہ ہماری زندگی ہی میں وہ دن آئے گا۔ سب ملکوں کے پرچم اقوام متحدہ کے

صدر مقام پر لہرائیں گے اور اس عالمی انجمن کے اراکین کی تعداد بڑھ کر دوگنی ہو جائے گی۔

آج کل مغربی جرمنی کا حال یہ ہے کہ امریکا کے بعد سب سے زیادہ ڈالر اس کے پاس ہیں۔ سونے کا سب سے زیادہ ذخیرہ اس کی تحویل میں ہے۔ یہ صورتِ حال اہلِ جرمنی کی محنت اور جفاکشی کا واضح ثبوت ہے۔ اتحادی طاقتیں (ریاستہائے متحدہ امریکا، فرانس اور برطانیہ) اس کے سر پر چڑھی بیٹھی ہیں۔ اس کے سینے پر مونگ دل رہی ہیں اور جس طرح مہاوت انکس ہاتھ میں لیے ہاتھی کی گردن پر سوار رہتا ہے، وہ اس کی ہر نقل و حرکت پر مہرِ احتساب لگا رہی ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ صنعتی معاملات میں کم سے کم فرانس اور برطانیہ کو ہر عالمی منڈی میں شکست دے رہی ہے۔ دنیا کے ہر بازار میں ہر اس مال کو جو ساختۂ جرمنی ہو فوقیت حاصل ہو رہی ہے۔

تعمیرِ نو کے لیے یہ قوم جو کشمکش کر رہی ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ہر شخص انفرادی طور پر اور قومی پلیٹ فارم پر بھی تعمیرِ نو میں سرگرداں ہے۔ وہ اعلا ترین چیزیں تیار کرنے اور بین الاقوامی تجارت میں برتری حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ جرمنی بہت جلد اتحادی نرغے سے نکل کر آزاد ہو جائیگا۔ جرمنی کے دونوں حصے مل کر رہیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ قوم پھر کسی لڑائی کا خواب نہ دیکھے۔ دو بار کی شکست و تباہی نے اس کو امن پسندی کا سبق دے دیا ہے اور وہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے بموجب ہر مسئلے کو پُرامن صورت میں حل کر لینا چاہے گا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس لینے کا مطالبہ کرے اور یہ مطالبہ صرف بین الاقوامی سطح پر لا کر دوسری اقوام کے اثر و رسوخ اور دباؤ سے کام نکال لینا چاہیئے۔ ہنگامہ آرائی یا نبرد آزمائی سے کام نہ لے، ایسا ہونا چاہیئے۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے۔

---

۳۰ ستمبر ۱۹۵۶ ـــــ اتوار

# برلن میں ایک دن اور

آج چھٹی کا دن ہے۔ نہ بازار میں دوکانیں کھلیں گی، نہ مدرسے اور کالج، نہ طبی کمپنیاں اور دواساز ادارے۔ صرف تفریح گاہوں میں چہل پہل ہوگی۔ وہ بھی دوپہر بعد اور صحیح رنگ جمے گا سورج چھپنے کے بعد۔ گویا ہمارا آج کا دن پھیکا رہے گا۔ ہم نے سوچا کہ نام نہاد تفریحات کا دور شروع ہونے سے قبل ہم صرف بازاروں میں گھوم لیں۔ باغات کی سیر کرلیں اور جب عام لوگوں کی دلچسپیاں شروع ہوں تو ہوٹل میں واپس آکر کچھ مطالعہ کرنے لگیں یعنی چمگادڑیں باہر نکلیں تو ہم ان سے بچ کر اپنے کنجِ عزلت میں چلے جائیں۔ ان چیزوں میں حصّہ نہ لیں جن میں شرکت کی آرزو بہت سے لوگوں کو یہاں کھینچ لاتی ہے۔ پیرس کی طرح برلن کی شبینہ زندگی بھی بڑی جاذبِ نظر سمجھی جاتی ہے لیکن ہمارے راستے جداگانہ ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال مشکل ہی سے ملے گی کہ مصائب و آلام کا چکر دھیما پڑتے ہی عام لوگ پچھلی پریشانیوں کو ایک دم بھول جائیں اور جو پریشانیاں باقی ہوں، انھیں کوئی اہمیت نہ دیں۔

دُنیا کی تاریخ میں ایسی مثال بھی کبھی دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی کہ ایک ہی شہر دو مختلف حکومتوں کے ماتحت ہو اور حکومتیں بھی ایسی جو ایک دوسرے کے برعکس اصولِ حیات اور معاشرتی نظریات رکھتی ہوں۔ ایسی مثال تو موجود ہے کہ ایک ہی ملک پر دو حکمراں قابض ہوں لیکن ساڑھے تین سو مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا شہر دو حاکموں کے زیرِ تسلط ہو۔ اُس کی زندہ مثال صرف برلن ہے۔ ایک بڑے ملک کے

حصے بجرے ہوئے اور دو علاقے الگ الگ بھارت و پاکستان کہلانے لگے لیکن شہر میں خطِ فاصل کھینچنے کی یہ واحد مثال ہے۔ یہ اچھی ہے یا بُری، اس کا فیصلہ فی الحال نہیں کیا جا سکتا۔ حیرت تو اس بات کی ہے کہ جڑواں بچوں کی طرح شہر کے دونوں حصے ایک دوسرے سے پیٹھ ملائے اپنا اپنا نظام چلا رہے ہیں۔ ان کے سکے مختلف ہیں، ڈاک خانے بھی مختلف ہیں۔ حمل و نقل کے طریقے، برقی قوت کی بہم رسانی کے وسیلے اور دوسرے تمام ذرائع الگ الگ ہیں۔ صرف پیٹھ لگی ہوئی ہے، پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے۔ صرف حسرتِ دید دلوں میں لیے بیٹھے ہیں۔

برلن کو خشکی کا جزیرہ کہا جائے تو مناسب ہے۔ عام جزیرے چاروں طرف پانی سے گھرے ہوتے ہیں۔ یہ ایسی خشکیوں سے گھرا ہوا ہے جن میں نظر آنے والی آبی لہروں کی بجائے غیر مرئی جذبات کا تلاطم پایا جاتا ہے۔

پیدل چلنے کے موڈ میں : ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد بھائی جان محترم نے تجویز پیش کی کہ آج کوئی سواری گاڑی نہ لی جائے بلکہ شہر کی سڑکیں پیدل چل کر ناپی جائیں۔ ان کی تجویز خوب تھی۔ جب منزل کا تعین نہ ہو اور یہ فیصلہ بھی نہ کیا جا سکتا ہو کہ کس سمت میں کتنی دُور تک جانا ہے تو پھر بہتر یہی ہے کہ سیاحی کا موڈ طاری کر کے گھوما جائے اور جب طبیعت اکتائے واپس آ جائیں۔

ہمارا ہوٹل، جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے، ایک دریائی بند کورفرسٹن دام پر واقع ہے جو قیصر ولہلم میموریل چرچ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ گرجا گھر بھی اہلِ برلن کی نظر میں تباہ ہو جانے کے بعد زیادہ حسین معلوم ہونے لگا ہے یعنی اپنی اصل حالت میں اتنا شاندار نہیں کہا جا سکتا ہو گا۔ غالباً وہ اس مدرسۂ خیال کے حامی ہو گئے ہیں کہ بوڑھے لوگوں میں ضعیفی کی رعنائیاں ڈھونڈی جائیں۔ قیصر جرمنی نے یہ عبادت گاہ ۱۸۹۵ء میں اپنے دادا کی یاد میں تعمیر کرائی تھی۔

ٹائر گارڈن : اس تباہ حال گرجا گھر کا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ اس کی پشت پر ایک باغ واقع ہے جسے ٹائر گارٹن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جرمن زبان میں لفظ گارٹن انگریزی زبان کے گارڈن کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اس باغ کا بڑا حصہ برلن چڑیا گھر

کے لیے مخصوص ہے۔ عام تصور یہ ہے کہ چڑیا گھر صرف بچوں کی دل چسپی کی چیز ہے لیکن اگر چوپایوں اور پرندوں کے عادات واطوار کا قریب سے مطالعہ کرنا مقصود ہو تو چڑیا گھر بالغوں کے لیے بھی ایک دل چسپ ماحول پیش کر سکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہاں بلا تخصیص عمر سب کو جانا چاہیئے۔ اسی لیے ہم بھی وہاں جائے بغیر نہ رہ سکے۔

یہاں بھی بہت سے جانور وہی ہیں جو ہم اپنے ملک میں یا دوسرے ملکوں کے چڑیا گھروں میں دیکھ چکے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو کہیں اور نظر نہیں آئے تھے۔ اسی لیے اسے یورپ کا بہترین چڑیا گھر سمجھا جاتا ہے۔ جب سے سیاحت کو ایک صنعت سمجھا جانے لگا ہے' یہ ٹھپّہ اور بھی بہت سی چیزوں پر لگنے لگا ہے۔ اس لیے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ چڑیا گھر کا نظم ونسق بھی ایک صنعت اور فن سمجھا جائے۔ یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے فنِ لطیف کہا جائے یا فنِ مفید۔ یہاں بھی اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ تمام جانور، چوپائے اور پرندے حتیٰ کہ حشرات الارض بھی اپنے رہن سہن کے اصل طریقوں کے مطابق رکھے جائیں۔ انھیں ہرگز یہ محسوس نہ ہو کہ وہ کسی قید وبند میں زندگی گزار رہے ہیں۔ چنانچہ غذا بھی ان کو اس طرح نہیں دی جاتی جس طرح اور چڑیا گھروں کا دستور ہے کہ گوشت منگایا اور لوتھڑوں کی صورت میں شیروں کے سامنے ڈال دیا۔ اس کے برعکس زندہ جانور ان کے جنگلے میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ خود ان کا شکار کریں اور جنگل کے "قانون کے مطابق کھائیں۔ یعنی دوسروں کے مارے ہوئے جانور کو دانت تک نہ لگائیں۔

یہاں سبزی خور چوپایوں کے لیے بڑا وسیع علاقہ ہے جس میں بہت سے پودے اور جھاڑیاں ہیں۔ ہرن، نیل گائیں، اونٹ اور زیبرے خود درختوں میں سے توڑ توڑ کر پتے کھاتے ہیں۔ ہر طرف ہریاول برقرار رکھنے کے لیے ماہرینِ نباتات اپنی قابلیت کے جوہر دکھاتے ہیں اور باغبان اس احساس سے خالی الذہن ہو کر کہ یہ پودے اور درخت جانوروں کے لقمے بن جائیں گے، ان کو برابر پروان چڑھانے میں لگے رہتے ہیں۔ یہاں کے بعض جانوروں کے پالتو نام دلچسپ ہیں۔ مثلاً ایک

ہاتھی کو جو ہندوستان سے لایا گیا تھا ''شانتی'' نام دیا گیا ہے۔ دریائی گھوڑا یعنی ہپوپوٹےمس ''کنوٹشکے'' کہلاتا ہے۔ غالباً افریقہ کا کوئی ملک اور دریائے نیل کا کنارہ اس کا وطن ہوگا۔ ایک مادہ چمپانزی ''نینا'' کہلاتی ہے۔ ایک ہندی مہاراجہ نے خرید کر چڑیا گھر کو پیش کی تھی جب وہ لائی گئی تو حاملہ تھی، یہیں آ کر اس نے اپنا پہلا بچہ جنا تھا۔ سائبیریا کا سفید ریچھ ''اسکورخ'' اور ہمالیہ کا بھورا ریچھ ''شومپس'' کہلاتا ہے۔''

بعض جانوروں کو دیے ہوئے ناموں کا تلفظ اتنا ثقیل ہے کہ انھیں زبان سے ادا کرتے وقت خود اس جانور کے وجود سے زیادہ خوف محسوس ہوتا ہے۔ خصوصاً اس اعتبار سے کہ سننے والے کہیں کہنے والے کو انسان کی بجائے کچھ اور نہ سمجھنے لگیں۔ بعض حیوان اس درجہ ''انسان'' ہو گئے ہیں کہ وہ کسی بھی ابنِ آدم پر حملہ نہیں کرتے بلکہ خوب مانوس ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے جانوروں میں مادام چمپانزی تک شامل ہیں۔ لوگ جنگلے کے اندر گھس کر بعض جانوروں کے قریب کھڑے ہو جاتے اور ان کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ فرمائش کے بموجب قریب کھڑے ہوئے مستعد فوٹوگرافر تصویر اتار لیتے ہیں تاکہ انسان کے لیے یہ یادگار رہے کہ اس نے برلن جا کر ریچھ، چمپانزی یا کم سے کم کسی ہرن کو اپنا دوست بنایا تھا۔

میں نے چڑیا گھر کے ایک نگراں سے جو اس وقت ڈیوٹی پر تھا، دریافت کیا کہ شیر کے ساتھ بھی اسی انداز میں تصویر کھنچوائی جا سکتی ہے۔ اس نے بڑا اچھا جواب دیا کہ اس کا انحصار خود تصویر کھنچوانے والے پر ہے۔ اگر اس کا دل اور گردے مضبوط ہیں تو وہ بے شک اندر چلا جائے اور کسی شیر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ شیروں کا اعلان یہ ہے کہ ہمیں بزدلوں سے بیر ہے۔ کوئی جوانمردی کے ساتھ سامنے آئے تو ہم اس کی جرأت مندی کا احترام کریں گے۔ ہم نے نگراں کو یقین دلایا کہ جرأت و ہمت تو ہم میں موجود ہے لیکن ہم اس کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتے۔

ٹائرگارٹن چھے سو ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے وہ برلن کے لیے باعثِ فخر تھا اور اب بھی باعثِ فخر سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ حدیقۂ نباتات تو دوسری جگہ واقع ہے لیکن یہاں بھی ہر قسم کے درخت، جھاڑیاں اور پودے

وہی کیفیت پیدا کرتے ہیں جو کسی بوٹے نیکل گارڈن کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اس کی موجودہ حالت دیکھ کر اس کے گزرے ہوئے زمانے کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ شاید یہاں مختلف النوع پودوں اور درختوں کی موجودگی بارہ مہینے بہار کا موسم برقرار رکھتی ہوگی۔ کیونکہ موسم کے اعتبار سے نشو و نما کی صلاحیت قائم رکھنے کے لیے بہت سے پودوں اور نازک بیلوں کو شیش محلوں میں رکھا گیا ہے جہاں مصنوعی روشنی اور حرارت سے اس مقام کی فضا پیدا کی جاتی ہے جہاں کی وہ اصل پیداوار ہیں۔ لڑائی کے زمانے میں سارے برلن پر خوب بمباری ہوئی۔ یہ باغ بھی ان حملوں سے نہ بچ سکا۔ بموں اور جہازوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں نے زمین میں خوب ہل چلائے لیکن ان سے اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اصل تباہی خود اہل برلن نے پھیلائی اور وہ بیچارے بالکل مجبور تھے۔ لڑائی جب اپنے شباب پر تھی اور لڑائی ختم ہو جانے کے بعد بھی جب ہر علاقے پر بیوگی کی کیفیت طاری تھی، سردی کا موسم متواتر کئی سال تک بے حد شدید رہا۔ کوئلے کی کانیں بند پڑی تھیں، کام کرنے والے ناپید ہو گئے تھے۔ ایندھن کے لیے دوسری چیزیں بھی ملنی محال تھیں۔ ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ لوگوں نے وہ درخت کاٹ ڈالے جو اس باغ کا وقار قائم کیے ہوئے تھے اور جن کی چھاؤں میں وہ بارہا بیٹھ کر سستا چکے تھے۔ جان سب کو عزیز ہوتی ہے جب زندگی اور موت میں کش مکش شروع ہو جائے تو بقائے حیات کے لیے سارے جتن کیے جاتے ہیں۔ اس وقت باغ کی زلفیں قربان کی جا سکتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے موقعوں پر لوگوں نے، خود عیسائیوں نے مقدس صلیبیں جلا دیں اور اس طرح آگ کی تپش پیدا کر کے جسموں کی حرارت قائم رکھی۔ ٹائر گارٹن اجڑ گیا۔ درخت کیا کٹے، اس کا سارا سہاگ لٹ گیا تاہم اب نئے سرے سے شباب آچلا ہے۔ اس کی جوانی کی بہار ایک بار پھر اپنا رنگ جما کر رہے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض درختوں کو پوری بلندی تک پہنچنے میں سالہا سال لگیں گے۔ اسی زمانے میں جب اشیائے خورد کی کمی ہوئی تو کباب کے تختے کاٹ کر ان کی جگہ

آلو بو دیے گئے۔ اس وقت پھولوں کی مہک سے زیادہ آسودگی شکم کی ضرورت تھی۔ اب ایک بار پھر یہاں گلاب بویا جا رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں میں رسہ کشی تو نہیں ہوتی۔ ایسا نہ ہو کہ نئے پودوں کی ٹہنیوں پر گلاب کے پھول کھلیں اور ان کی جڑوں میں آلو بھی پیدا ہو جائیں۔ پھولوں میں گلقند بنانے کی صلاحیت نہ رہے اور لوگ ان کی پتیاں توڑ کر بھرتہ بنا ڈالیں یا ان کو پوٹیٹو چپس کی طرح تل لیں۔

**مصنوعی پہاڑیاں:** لڑائی کی توڑ پھوڑ نے اس باغ میں کوڑے کرکٹ اور ملبے کے انبار لگا دیے تھے۔ لڑائی ختم ہوئی اور تعمیر نو کا سلسلہ شروع کیا گیا تو سوال پیدا ہوا کہ جگہ جگہ لگے ہوئے انبار کہاں پھنکوائے جائیں اور اس کام پر جو بے پناہ رقم خرچ ہو، وہ کس مد سے نکالی جائے۔ آخر ارباب حل و عقد نے فیصلہ کیا کہ وہیں باغ میں ان ٹیلوں کی شکل میں جمع کر دیا جائے اور پھر ان پر مٹی اور کھاد ڈلوا کر مصنوعی پہاڑیوں پر باغیچے لگوائے جائیں۔ یہ ترکیب کارگر رہی۔ ایک تیر سے دو شکار مار لیے گئے۔ چنانچہ اب باغ میں بہت سے خوب صورت ٹیلے نظر آتے ہیں جن پر چڑھنے کے لیے چکّر دار روشیں ہیں اور روشوں کے ساتھ ساتھ عمدہ پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ چوٹیوں پر ایسے فوارے لگائے گئے ہیں جن کا پانی بہہ بہہ کر سب کیاریوں میں جاتا ہے اور جو بچ رہے، وہ نالیوں کی صورت میں اس طرح دامن تک آتا ہے جیسے پہاڑوں پر بارش کے بعد ندی نالے زور شور دکھاتے میدان تک آتے ہیں۔ ان میں سے ایک ٹیلہ تو اتنا اونچا ہے کہ اس پر چڑھ کر سارا برلن دیکھا جا سکتا ہے بلکہ مطلع صاف ہو تو مشرقی برلن کے قریبی حصے بھی نظر آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں سورج چھپنے کے بعد سے رونق بڑھنی شروع ہوتی ہے۔ لوگ اس وقت آتے اور گھنٹوں بیٹھتے ہیں تاکہ وہ جگمگاتے ہوئے مغربی برلن کا موازنہ تیرہ و تاریک مشرقی برلن سے کر سکیں جہاں کوئی کوئی ٹمٹماتی روشنی انسانی بستی ہونے کا پتہ دیتی ہے۔

**وسیع خیابان:** باغ کے عین وسط میں ایک وسیع خیابان ہے جو شارلوٹن برگر کلاڈسے کہلاتی ہے۔ یہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی لمبی لہکاری بھی ہے اور جانب شرق وہ باغ کی حدود سے نکل کر اتنی دور تک جاتی ہے کہ پوٹسڈامر پلاٹس سے آگے بڑھ کر برانڈن برگ ٹور تک پہنچتی ہے جو روسی علاقے پر خطِ فاصل کی طرح کھڑا ہے۔ اس

سے آگے بڑھنا منع ہے۔ اس دروازے پر سخت نگرانی ہوتی ہے تاکہ کوئی شخص ایک علاقے سے دوسرے میں نہ پہنچ جائے۔

باغ کے وسطی علاقے میں ایک خوشنما دائرہ ہے جس کے بیچوں بیچ ایک سو اکیاون فیٹ اونچا ایک ستون نصب ہے جو گہرے سُرخ پتھر سے بنایا گیا ہے اور مضبوطی کے لیے اس پر کانسی کی پٹیاں بھی منڈھی گئی ہیں۔ اس کی چوٹی پر فتح کی دیوی کا چمکدار مجسمہ لگا ہوا ہے۔ دراصل یہ ستون ۱۸۷۳ء میں تعمیر ہوا تھا اور شروع میں پارلیمان کی عمارت کے سامنے نصب تھا۔ لڑائی میں مسمار ہو گیا تو اس کی مکرر تعمیر اس باغ میں کی گئی۔ پتھروں کے ٹکڑے وہی پرانے لیے گئے ہیں اور دیوی کا مجسمہ بھی اس عہد کی یادگار ہے۔

باغ میں ایک سرے پر رائخ اِسٹاگ کی مسمار شدہ عمارت کھڑی ہے۔ اور غارت گری کا جو انجام ہوتا ہے، اس کی داستان زبان حال سے کہہ رہی ہے۔ اس کی تعمیر اطالوی طرز پر پچھلی صدی کے آخر میں ہوئی تھی۔ شروع میں پرشیا کی پارلیمان کے اجلاس اس میں ہوتے رہے، پھر جمہوریۂ وائمار نے اس کو مرکز بنا لیا۔ پھر سب جانتے ہیں کہ ۲۸ فروری ۱۹۳۳ء کی رات کو اس میں زبردست آگ لگ گئی۔ اس کا الزام خود نازی جماعت کے سر منڈھا گیا کہ اس طرح سے اس نے مخالفین کے خلاف کارروائی کرنے کا عذر تلاش کیا ہے۔ یہ "مارون گھٹنا پھوٹے آنکھ" کی بہت ہی عمدہ مثال ہے۔ بالادست جماعت کو یہ اوچھا ہتھیار استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ نقصان خود اس جماعت کا نقصان تھا کیونکہ اس کے لیے برسر اقتدار آنے میں کون سی کسر باقی رہ گئی تھی۔ خیر، یہ ایک علیحدہ موضوع ہے اور اس پر تھوڑا بہت اظہار خیال ہو بھی چکا ہے۔

**مشرقی برلن کی جھلک**: براندن برگ دروازے کے بعد ہی مشرقی برلن میں بے رونقی شروع ہو جاتی ہے۔ چند دکانوں اور اسٹورز کو چھوڑ کر باقی حصہ بڑی حد تک غیر آباد ہے اور بموں کے حملوں سے تباہی کے بعد پنپ نہیں سکا ہے۔ اس کس مپرسی کی حالت کے لیے ہیں مشرقی جرمنی کے ارباب حل و عقد کو مورد الزام نہیں ٹھیراتا۔ وہ علاقہ لڑائی سے پہلے بھی بے رونق تھا۔ وہاں زیادہ تر مزدور طبقے کے افراد کی

کچی بیرکس سی بنی ہوئی تھیں، بالکل اِسی طرح جیسے لندن جائیں تو ایسٹ اینڈ ویسٹ اینڈ میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ پیرس میں بھی بعض علاقوں کا یہی عالم ہے کہ ایک حصہ شاندار ہے اور دوسرا ملحقہ حصہ بہت ہی بدوضع ہے۔ لیکن عظیم تر برلن کا وہ علاقہ بھی گندہ نہیں تھا، گنجان آباد ضرور تھا۔ اسی لیے جب بم گرے تو بہت جلد بہت بڑا علاقہ کھنڈرات میں بدل گیا۔ بلندی سے نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوگا کہ اونچی نیچی غیر ہموار دیواروں کے بیچ و خم میں ایک بے جان بستی پھیلی پڑی ہے۔ شیشے اور کواڑ ٹوٹ جانے سے کھڑکیاں ایسی نظر آتی ہیں جیسے بصارت سے محروم آنکھیں دیکھنے والے پر ایک خوف سا طاری کر دیتی ہیں۔

دونوں حصوں کے بیچ میں حائل برانڈن برگ گیٹ تقریباً دو سو سال پُرانا ہے۔ اسے برلن کی محرابِ نصرت کہا جاتا ہے۔ جب فوجی دستے کسی ملک پر چڑھائی کرنے کے بعد فتح و کامرانی کے ساتھ واپس آتے تو اسی محراب کے نیچے سے گزر کر شہر برلن میں داخل ہوتے تھے۔ آخری دستہ جو اس کے نیچے سے گزرا، سُرخ فوج کا تھا جس نے مئی ۱۹۴۵ء میں داخل ہو کر شہر پر قبضہ جما لیا اور اسی محراب کو پھانسی گاہ بنا کر نازی حکومت کے پروپیگنڈا منسٹر کو پھانسی پر لٹکایا جو اتحادیوں کا مظہرِ کامرانی بن کر کئی روز تک لٹکا رہا۔ اب اسی دروازے سے ذرا آگے رُوسیوں نے اپنی کامیابی کی یادگار عمارت تعمیر کی تھی جس پر رات دن پہرا لگا رہتا ہے۔ انھیں شاید اندیشہ ہے کہ جرمن نژاد، جو ان کے علاقے میں آباد ہیں اور بری طرح بددل ہیں، کہیں موقع پا کر اس "فتح گڑھ" کو نہ ڈھا دیں۔ اس عمارت کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اسے رُوسیوں نے تعمیر کرایا لیکن تقسیم شہر کے بعد یہ حصہ انگریزوں کی تحویل میں آگیا تاہم باہمی سمجھوتے کے مُطابق رُوس کے فوجی اس کی نگرانی کرتے ہیں۔

**جرس آزادی:** ٹائر گارٹن کے جنوبی دروازے سے نکل کر ہم سب مارٹن لیوتھر اسٹریٹ پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک شاندار عمارت شونن برگ ٹاؤن ہال ہے جو کسی زمانے میں مجلسِ بلدیہ کا صدر مقام تھا۔ لیکن اب برلن سینٹ کا دفتر ہے یعنی تمام مغربی برلن کا سیاسی مرکز ہے۔ یہاں شہر کے امیر (میئر) ذی وقار مہمانوں کا خیر مقدم کرتے اور بلدیہ نامے

ہیں ان کے دستخط کراتے ہیں۔ مغربی برلن کے موجودہ میئر ڈاکٹر والٹر شریبر ہیں۔ اس عمارت کی مہتابی میں امریکہ کی جرسِ آزادی کا ایک نقلی نمونہ آویزاں ہے۔ وہیں ایک صندوق میں ایک فہرست محفوظ ہے جس پر ان ایک کروڑ سولہ لاکھ امریکی شہریوں کے دستخط ثبت ہیں جنھوں نے یہ قول اس گھنٹی پر نقش کرایا تھا۔

"میرا عقیدہ ہے کہ جملہ بنی نوع انسان اپنا
مساوی حقِ آزادی براہِ راست خدا سے حاصل کرتے ہیں"

ان الفاظ پر غور کیا جائے تو ہنسی آتی ہے۔ یہ الفاظ کس درجے کھوکھلے ہیں۔ کیا امریکہ میں کہیں بھی انسان کے مساوی حقِ آزادی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ درحقیقت عمل اس قول کے بالکل برعکس ہے۔ حقِ آزادی کا سب سے زیادہ گلا وہیں گھونٹا جاتا ہے۔ امریکہ کے پرستار اس جرسِ آزادی پر شہد لگا کر چاٹیں۔

**حدیقۂ نباتات:** ٹاؤن ہال سے ذرا آگے بڑھ کر مارٹن لیوتھر اسٹراس ایک اور سڑک ہوپٹ اسٹراس کو قطع کرتی ہے اور اس چوراہے سے آگے بڑھ کر رائن کہلانے لگتی ہے۔ اسی سڑک پر جنوب مغرب کی جانب ہم بڑھتے رہے اور حدیقۂ نباتات کے قریب پہنچ گئے۔ اس باغ میں حقیقتاً درختوں، پودوں، جھاڑیوں اور بیلوں کو بہت ہی زیادہ علمی اور فنی اعتبار سے لگایا گیا ہے۔ یہاں آکر واقعی محسوس ہوتا ہے کہ بلاشبہ ع

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

پھولدار پودوں وغیرہ کی تقسیم میں ان کے رنگوں کا زیادہ لحاظ نہیں رکھا گیا، جیسا کہ خوشنما باغوں میں عموماً ہوتا ہے بلکہ ان کی افادیت زیادہ پیشِ نظر رہتی ہے۔ ہر درخت یا پودے کے ساتھ اس کا نام اور مختصر کیفیت درج کی گئی ہے تاکہ سیر کرنے والے ایک نظر میں بہت کچھ معلوم کرلیں۔ نباتی عجائب گھر بھی اسی باغ میں واقع ہے۔ وہاں ہر پیداوار کو پھول سے لے کر جڑ تک خشک حالت میں محفوظ کیا گیا ہے اور طویل فہرست میں ہر چیز کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ وہاں ایسے پودے بھی دیکھنے میں آئے جن کا حال صرف کتابوں میں مل سکتا ہے، ان تک پہنچ کر دیکھنا محال ہے۔

**جھیل کے کنارے :** عظیم تر برلن کی وسعت کا اندازہ تو الگ رہا، صرف مغربی برلن بھی ایک وسیع علاقہ ہے اور اس میں دو تین جھیلیں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی جھیل کا نام گروِن والڈ ہے۔ ہم ٹیکسی لے کر فوراً اس کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں مچھلی کے شکاریوں کا بڑا جمگھٹ تھا۔ ڈور کانٹے اور چھڑیں لیے وہ خود بھی جھیل کی سطح پر چھا جانا چاہتے تھے اور اس طرح بیتاب نظر آتے تھے کہ اگر آج کوئی مچھلی نہ پکڑی گئی تو ان کے لیے دنیا اندھیر ہو جائیگی۔ جھیل کے کنارے ایک بارہ دری بھی موجود ہے جسے کاسپر تھیس نے ۱۵۴۲ء میں مچھلی کی شکارگاہ کے طور پر بنوایا تھا۔ اسی عمارت کے اندر سترھویں صدی کی مصوری کے بہت سے شاہکار اب تک محفوظ ہیں۔ میرا جی چاہا کہ کشتی میں بیٹھ کر ساری جھیل کا ایک چکّر لگاؤں مگر بھائی جان محترم نے، جو آج کے پروگرام سے زیادہ مطمئن نہیں تھے، اس تجویز کو پسند نہیں کیا۔ تاہم انھوں نے مجھے اجازت دے دی کہ میں چاہوں تو کشتی کی سیر کر لوں۔ لیکن ان کے بغیر میں یہ جرأت کیسے کر سکتا تھا۔

برلن کے اس علاقے میں قابلِ دید دو اور چیزیں بھی ہیں۔ ایک تو محل ہے جو کسی فرمانروا کے لیے انیسویں صدی کے بالکل شروع میں تعمیر ہوا تھا اور جسے کبھی فیلڈ مارشل رینگل نے اپنے لیے موسم گرما کی اقامت گاہ بھی بنایا تھا۔ یہ فن تعمیر کے اعتبار سے اچھا نمونہ ہے۔ دوسری چیز ایک بہت ہی قدیم گرجا گھر ہے جو تیرھویں صدی کی یادگار ہے۔ درحقیقت وہ ایک فوجی قلعہ تھا لیکن پندرھویں صدی سے عبادت گاہ بنا ہوا ہے۔

**نائٹ کلب :** اچانک ہم برلن کی سب سے بڑی نائٹ کلب سے گزرے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت رات کی سی چہل پہل کہاں ہو سکتی تھی اور یہ غنیمت ہی تھا۔ ورنہ ہمارے نقطۂ نظر سے اگر اس سمت سے چلنے والی ہوا بھی ہمارے لباس سے مَس ہو کر گزر جاتی تو ہمیں پاکیٔ داماں کا احترام قائم کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ کفارہ ادا کرنا پڑ جاتا۔ سُنا ہے کہ یہ کلب جس کا نام "رِسی" ہے، نہ صرف برلن بلکہ سارے یورپ میں ایسے گناہوں کے ارتکاب کا سب سے بڑا مرکز ہے جن کی معمولی تفصیل سُن کر ہی گھن

آنے لگتی ہے۔ یہ گویا ایک حمام ہے جس میں سب کو ننگا ہو جانا پڑتا ہے۔ تقدیس و اخلاقیات کے سارے اصول دروازے پر چھوڑ کر اندر داخل ہو جاتا ہے اگر شرم و حیا کی ایک رمق بھی کسی کے ساتھ لگ کر اندر چلی گئی تو اسے نکو بنا کر وہاں سے بھاگ جانے کی حد تک مجبور کر دیا جاتا ہے۔ گویا وہاں آنے والے شوقین یہ سمجھ کر دادِ عیش دینے آتے ہیں کہ آج دنیا اپنی تمام گردشیں پوری کر دے گی اور کل سے "عالم دوبارہ نیست" کی صداقت یقینی ہو جائے گی۔

منجملہ اور بہت سی عیش پرستیوں کے اس کلب کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ بڑے ہال میں بچھی ہوئی ایک میز پر ایک ٹیلی فون لگا ہوا ہے اور ہر میز پر ایک نمایاں نمبر ہے۔ ہر شریکِ محفل جب چاہے، جس نمبر کی میز پر چاہے، ڈائل گھما کر بیٹھنے والی کسی بھی ہستی سے جس قسم کی چاہے گفتگو کر لے، سودے بازی کر لے اور اسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دے دے۔ ناراض ہونے یا برا ماننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دادِ عیش دینے کے لیے زیادہ دُور جانا نہیں پڑتا۔ کلب کی طرف سے ہر قسم کا انتظام ہوتا ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ کلب کے اربابِ اقتدار ہر ہر قدم پر اپنا حق وصول کر لیتے ہیں کھال اس بری طرح کھینچی جاتی ہے کہ ہر تماش بین اپنی جیب اچھی طرح بھر کر اس چار دیواری میں داخل ہوتا ہے اور جب صبح ہوتے باہر نکلتا ہے تو گھر تک پہنچنے کے لیے ٹیکسی کا کرایہ بھی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ اگر وہ خودکشی کرنی چاہے تو اسے مایوس ہونا پڑے گا کیونکہ زہر کی پڑیا خریدنے کے لیے اس کی قیمت بھی اس کے پاس نہیں ہوگی۔ لیکن یہ ہمارا خیال ہے۔ وہاں آنے والے اتنے بے حس ہوتے ہیں کہ ایسا کرنے کی نوبت نہیں آتی۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم دن کے وقت وہاں سے گزرے، ورنہ ہو سکتا تھا کہ ہمارے ایک ساتھی حاجی برکات احمد "شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ" کہہ کر ہم سے رخصت ہوتے اور محض مطالعہ اور قریب سے مشاہدہ کرنے کی غرض سے وہاں پہنچ جاتے اور دوسرے روز ہمارے سامنے تفصیلات بیان کر کر کے مغربی معاشرے پر تبرا بھیجتے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اس قسم کے بہت سے مشاہدات

کئے ہیں لیکن ان کا کردار لائق تحسین ہے کہ دامن ذرا بھی آلودہ ہونے نہیں پایا ہے۔ وہ جہاں بھی گئے صرف مبصّر کی حیثیت اختیار کی۔ اپنے اوپر اتنا شدید احتساب حقیقتاً ہر شخص سے ممکن نہیں ہو سکتا۔ خدا کرے وہ اس جادۂ پارسائی پر رہتے ہوئے بہت سے مشاہدے مکمّل کر لیں۔

یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء —— پیر

# برلن میں آخری دن

ہم نے برلن پہنچتے ہی ہیمبرگ روانہ ہونے کے پروگرام میں معمولی سی تبدیلی کر لی تھی۔ ہمارے سفر کا مقصد محض سیر و تفریح نہیں تھا بلکہ جیسا کہ اس سلسلے کی پہلی جلد (یورپ نامہ) میں لکھا جا چکا ہے، ہم طبی ادارے، درسگاہیں، تحقیقات و تجربات کی لیبارٹریاں، جڑی بوٹیوں کے ذخیرے اور باغات، دوا ساز کمپنیوں کا نظم و نسق اور ان کے مجربات کی تیاری، پیکنگ اور دوا سازی کی مشینوں کو دیکھنے کے لیے وطن سے باہر آئے تھے اور چاہتے تھے کہ اس دوران میں کوئی لمحہ ضائع نہ ہو جائے۔ چنانچہ اگر پروگرام کے دو حصوں کے درمیان چند منٹ بھی فالتو ملتے تو ہم خواہ مخواہ سستانے یا اینڈنے کے بجائے انھیں مطالعہ کتب و رسائل میں گزارتے تھے تاکہ اپنی معلومات میں برابر اضافہ ہوتا رہے اور اس کی وسعت مقصد سفر کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ سفری کمپنی والوں نے پروگرام اس طرح بنایا تھا کہ ہم دوپہر کے وقت برلن سے چلیں اور شام ہوتے ہیمبرگ پہنچ جائیں۔ ظاہر ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد کا کوئی پروگرام ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم اس کے سوا اور کیا کرتے کہ بے نیل و مرام بازاروں میں گھوم لیتے۔ اگرچہ یہ مشغلہ بھی ہمارے پروگرام کا جزو بنتا رہا ہے لیکن ترجیحی اعتبار سے اس کو زیادہ مفید بنانے کا سوال تھا۔ اس کی ترکیب یہی تھی کہ ہم برلن سے ذرا دیر میں روانہ ہوں اور ادھر باقیات برلن کو دیکھ لیں تاکہ حسرت باقی نہ رہے۔

ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ برلن سے ایک جہاز شام کے چھے بجے بھی روانہ ہوتا ہے اور وہ سورج چھپنے کے بعد ہیمبرگ پہنچاتا ہے۔ چھے بجے شام سے اس وقت

تک کے دوران ہیں نہ کسی سے ملاقات ہو سکتی تھی اور نہ کسی مقام کو دیکھا جا سکتا تھا، البتہ اس سے پہلے بہت کچھ ممکن تھا۔ کل اتوار کی وجہ سے پروگرام زیادہ زوردار نہیں رہا تھا۔

آج کے لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ یہاں کی یونیورسٹیوں اور لائبریریوں پر نظر ڈالی جائے اور اگر ممکن ہو تو مشرقی برلن کی زیارت کر لی جائے۔ بہر نوع وہ عظیم تر شہر کا نصف حصّہ ہے۔ وہ "نصف بہتر" ہے یا نہیں، ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ پروگرام میں مشرقی برلن کے لیے جو روس کے زیرِ نگیں ہے، کوئی گنجائش نہیں تھی اور امریکن ایکسپریس کمپنی سے اس کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

**برلن میں امریکا:** برلن کے ایک علاقے پر اب بھی امریکا یعنی ریاست ہائے متحدہ کو غلبہ بلکہ اقتدار حاصل ہے۔ ایک لحاظ سے وہ یورپ میں ان کی ایک کولونی ہے اور کولونی بھی ایسی جس کو بڑی حد تک خود مختاری حاصل ہو۔ اس میں امریکیوں کے سوا شاید ہی کوئی جرمن رہتا ہو۔ بیرے، خانساماں اور خدمت گزار اس ضمن میں نہیں آتے۔ اس کولونی کی ساری فضا عمدہ اور خوش گوار ہے۔ بازار میں خریدنے والے اور بیچنے والے سب امریکن ہیں۔ ابتدائی اسکول اور کھیل کے پارک انہی کے بچّوں کے لیے مخصوص ہیں حتیٰ کہ عام ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کولونی میں امریکی ڈالر اور سنٹ چلتے ہیں۔ جرمن مارک کو کوئی ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کرتا۔ دوسرے کی سرزمین پر زبردستی رہ کر یہ ڈھٹائی کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ چونکہ ابھی امریکی امداد ہر صورت میں لینے کا سوال ہے، اس لیے مقامی باشندے اس کولونی کو کلنک کے ٹیکے کی طرح گوارا کیے ہوئے ہیں۔ یہاں فوجیوں اور سپاہیوں کی بھی بڑی تعداد آباد ہے۔ خدائی فوجدار کا کردار ادا کرنے کے سوا وہاں ان کا اور کیا کام ہے۔ ان سب کو تنخواہیں ڈالر میں ملتی ہیں۔ لہٰذا وہ اس کولونی کے باہر عیش و نشاط میں حصّہ لینے جاتے ہیں تو ڈالر ہی خرچ کرتے ہیں۔ اس زمانے میں اس سکّے کی کوئی بے قدری نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کے زرہائے مبادلہ پر چھا جانے کے باعث اس کی قدر کی جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انھیں جرمن مارک لینے سے کیوں عار ہے۔ اس کے استعمال میں ایک دقّت ضرور ہے۔ جب یہ امریکی خریداری کے وقت

اپنا کوئی بڑا نوٹ بھناتے ہیں تو باقی ریز گاری اپنے ہی سکّے میں لینی چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہر دوکاندار ان کی خاطر گلّے میں سنٹ اور ڈالر رکھنے کے لیے مجبور ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی مقامی باشندہ کسی ضروری کام سے ان کے علاقے میں چلا جائے تو اپنی جیب کے مارک خرچ نہیں کر سکتا۔ اسے بھی ایسے موقعوں کے لیے کچھ امریکی سکّے بٹوے میں رکھنے پڑتے ہیں۔

فری یونیورسٹی : صرف ایک منزل میں انھوں نے استثنیٰ سے کام لیا ہے۔ اپنے علاقے میں فری یونیورسٹی قائم کر رکھی ہے جو امریکیوں کے لیے نہیں ہے بلکہ اس میں جرمن طلبا داخل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں تعلیم مفت ہے۔ اسے فورڈ فاؤنڈیشن کے تچپن لاکھ مارک کے عطیے سے تعمیر اور آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے تعلیمی نصاب میں چھے ہزار طلبا داخل کیے گئے تھے اور تعلیم و تربیت کے لیے ڈھائی سو پروفیسروں اور لیکچراروں کی تقرری عمل میں آئی تھی۔ اب طلباء کی تعداد نو ہزار سات سو کے قریب اور اساتذہ کی تین سو سے زیادہ ہے اس کے نظم و نسق اور نصاب کے بارے میں کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت اکبرالہ آبادی کا یہ شعر لوحِ قلب پر ابھرتا محسوس ہوتا ہے۔ ؎

یوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
صد حیف کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

برِّ صغیر پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے بھی نظامِ تعلیم اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور نصاب بھی خود مرتّب کراتے تھے کہ جو زہر یہاں کے باشندوں کی رگوں میں پہنچانا ہے، وہ آسانی سے سرایت کرتا رہے۔ امریکی بہر نوع انگریزوں کے "برادرِ نسبتی" ہیں اور سب کچھ ان سے سیکھ چکے ہیں۔ ہر جگہ وہ ان کے ہتھکنڈے آزماتے ہیں۔ وہ یورپ میں جرمنی کا ایک حصّہ ہو یا مشرقِ بعید میں کوریا کا، اپنے مفاد کا لحاظ ہر جگہ رکھتے ہیں اور کیوں نہ رکھیں۔ بے پناہ اقتصادی امداد کے نام پر لاکھوں ڈالر خرچ کرتے ہیں۔

جرمنی کی اور یونیورسٹیوں کے برعکس یہاں مشکل سے ایک فی صد باشندے

غیر جرمن ہیں جبکہ ملک کی اور یونیورسٹیوں میں غیر ملکی طلباء کی بڑی تعداد داخل کی جاتی ہے۔ تاہم اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پینتیس فیصد طلبا مشرقی جرمنی سے آکر داخل ہوئے ہیں۔ شاید یہ سلسلہ آئندہ ختم کر دیا جائے کیونکہ مشرقی جرمنی کا روسی نظام یہ گوارا نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے علاقے کے طلبا ماسکو یا لینن گراڈ میں جاکر درسگاہوں میں داخلہ لیں۔ اس یونیورسٹی کی لائبریری بھی بڑی وسیع ہے۔ طالب علموں کے لیے اس میں ایک لاکھ کتابیں ہیں۔ تمام اہم رسائل اس لائبریری میں آتے ہیں۔ پڑھنے کے لیے کئی کمرے بلکہ وسیع ہال ہیں۔ مثلاً ایک ہال میں دو سو طالب علموں کی نشست کا انتظام ہے یعنی کرسیاں اور میزیں دو سو طالب علموں کے لیے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ایک اور ہال میں ساٹھ طلباء بیٹھ سکتے ہیں۔ ایک ہال میں الگ الگ کیبن شیشے کے بنے ہوئے ہیں جن میں ایک ایک طالب علم بیٹھتا ہے۔ یہ ان طلبا کے لئے ہیں جو کسی موضوع پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہوں۔

اس یونیورسٹی میں آج کل ایکسریز پر ایک بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اس میں لاشعاعوں کے ماہرین حصہ لے رہے ہیں۔ جب ہم پہنچے تو کانفرنس کا آج کا اجلاس شروع نہیں ہوا تھا کیونکہ شام کی نشست تھی۔ تاہم متعدد قسم کے آلات ہم نے یہاں دیکھے۔ وضع وضع کی مشینیں بھی نظر آئیں۔ ان میں سے بعض انسانی جسم کے مختلف اعضاء کے لئے مخصوص ہیں۔ وہ صرف انہی کی عکس کشی کر سکتی ہیں۔ ایک مشین اتنی چھوٹی تھی کہ اسے بند کر کے جیب میں رکھ کر لے جایا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے ہم اس کانفرنس میں مبصر کی حیثیت سے شریک نہیں ہو سکے تاہم مفید لٹریچر جو دو روز کی نشستوں میں تقسیم ہو چکا تھا، ہم نے حاصل کر لیا۔ وہاں بہت سی مشہور کمپنیوں نے نمائش کے لیے اپنے آلات اور مشینیں نصب کر رکھی ہیں لیکن اجلاس نہ ہونے کی وجہ سے کمپنیوں کے ذمہ دار لوگ بھی اس وقت موجود نہیں تھے۔ میں زی مین کمپنی سے ایک ایکسرے پلانٹ کا معاملہ طے کرنے کے لیے بے چین تھا لیکن موقع نہیں ملا۔

**مطالعۂ مشرق:** یونیورسٹی کے قریب ہی اورنٹیل اسٹڈیز کا ایک انسٹی ٹیوٹ واقع ہے۔ ہم اسے بھی دیکھنے گئے۔ ہماری توقع کے عین مطابق پروفیسر براؤن جن کا تعلق کبھی برلن کی ہمبولٹ یونیورسٹی سے تھا، اب اس ادارے میں متعین تھے۔ لیکن ان دنوں وہ ملک میں موجود نہیں تھے۔ ان سے ملاقات باعث شرف ہوتی۔ ان جیسے مستشرقین نے ہماری زبان اور ادبیات کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ رہتی دُنیا لائق وقعت سمجھی جائیں گی۔ ہم نے اس ادارے کی لائبریری کو دیکھا مگر افسوس ہوا۔ اس میں اسلامیات پر کتابوں کا ذخیرہ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ مذہبیات کی فہرست پر بھی نظر ڈالی۔ بہت سی مشہور کتابوں کا کوئی اندراج نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ اس موضوع کی سب کتابیں تو اس لائبریری میں رہ گئیں جو اب مشرقی جرمنی میں ہے۔ اور اس ادارے کو نئے سرے سے بیس کیا جارہا ہے اس لیے کمی کا احساس کچھ عرصے تک ہونا رہے گا۔

**برلن کی مسجد:** ہمیں پہلے سے معلوم نہیں تھا لیکن اتفاقاً جب ایک ایسی عمارت کے قریب سے گزرے جس کی وضع قطع مسجدوں جیسی تھی تو ہم رک گئے یہ دیکھنے کے لیے کہ حقیقتاً یہ کیا چیز ہے۔ ہمارا خیال درست نکلا۔ یہ برلن کے مسلمانوں کی بنائی ہوئی عبادت گاہ تھی جس کی صرف ایک مینار اور ایک دروازہ بمباری کے دوران میں شہید ہوگیا تھا لیکن لڑائی ختم ہوتے ہی دوبارہ اس طرح مکمل تعمیر کرلیا گیا کہ ذرا بھی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ نہ صرف برلن یا جرمنی میں بلکہ سارے یورپ میں یہ مسجد اپنے وسعت کے اعتبار سے سب سے بڑی اور بناوٹ کے لحاظ سے سب سے زیادہ شاندار ہے۔ یوں تو مسجدیں فرینکفرٹ اور ہمبرگ میں بھی ہیں اور جرمنی سے باہر انگلستان حتیٰ کہ نیدرلینڈز تک میں ہیں جہاں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم ہے لیکن برلن کی مسجد کا مقابلہ کسی سے نہیں ہوسکتا۔ اس میں بیک وقت دس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اتنا بڑا اجتماع کبھی نہیں ہوتا۔ شاید یوم افتتاح کے موقع پر ہوا ہوگا کیونکہ اس روز غیر ملکوں کے مسلمان بھی تقریب میں حصہ لینے کے لیے بلائے گئے تھے لیکن یہ ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ اس کا سنگ بنیاد تو ۱۹۲۴ء میں رکھا گیا تھا اور اس وقت رسم ادا کرنے کے لیے مولانا صدرالدین لاہور سے بطور خاص

بلائے گئے تھے۔ تعمیر کا سلسلہ تین سال سے زیادہ مدت تک جاری رہا۔ ۱۹۲۸ء میں جب شاہ امان اللہ خاں فرمانروائے افغانستان اپنی ملکہ ثریا کے ساتھ یورپ کا دورہ کرتے ہوئے برلن پہنچے تو وہاں کے مسلمانوں نے شاہ موصوف سے درخواست کی کہ وہ رسم افتتاح ادا کر دیں۔ اتفاق سے رسم ادا کرنے کی تیاری بہت پہلے سے شروع کر دی گئی تھی اور دور دراز ملکوں سے مہمان وہاں پہنچ بھی گئے تھے۔ ایک خیال یہ ہے کہ شاہ امان اللہ سے یہ منظوری اس وقت حاصل کر لی گئی تھی جب وہ کابل ہی میں تھے۔ اس سال مارچ کی کسی تاریخ کو زبردست اجتماع ہوا اور شاہ موصوف نے اپنی جیب خاص سے بطور چندہ ایک کثیر رقم ادا کی اور آئندہ بھی ہر سال امدادی رقم بھیجنے کا اعلان کیا مگر افسوس ہے کہ وہ خود اپنے تخت پر زیادہ عرصے متمکن نہ رہ سکے۔

**ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی:** طے شدہ پروگرام کے مطابق آج ساڑھے بارہ بجے پاکستان کے مایۂ ناز سائنس داں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ہم سے ملنے کے لیے ہوٹل تشریف لانے والے تھے۔ اس لیے ہم کوشش کر کے وقت سے پانچ منٹ پہلے وہاں پہنچ گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں تاخیر نہ ہوئی۔ ہمارے پہنچتے ہی ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے۔ ان کے ہمراہ ان کی سالی بھی آئیں جو جرمن نژاد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے جب بھی ہماری ملاقات ہوتی ہے، موضوعِ گفتگو کیمسٹری ہوتا ہے اس طرح ہم ان سے بہت سی مفید باتیں سیکھ لیتے ہیں۔ ان کا اندازِ بیان ایسا جاذبِ توجہ ہوتا ہے کہ اس علم کو جاننے والے تو ایک طرف، عام لوگ بھی اس سے استفادہ کر لیتے ہیں۔ یہ علم و فن کے علاوہ بیان و زبان پر قدرت رکھنے والوں کی خوبی ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب ہمارے بڑے کرم فرما ہیں۔ ہمدرد لیبارٹری میں جب کسی نئی دوا کی ریسرچ ہوتی ہے، موصوف کا پُرخلوص مشورہ شاملِ حال ہوتا ہے۔ ان کی بزرگانہ شفقت ان کی بالغ رائے پر مستزاد ہوتی ہے۔ ہمارے لیے ہی نہیں، سارے پاکستان کے لیے ان کا دم غنیمت ہے۔ انھوں نے اس ملک کے سائنسی وقار کا بھرم قائم کر رکھا ہے۔ ہم سب نے ایک ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ میز پر بھی بہت دل چسپ گفتگو ہوتی رہی۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی نے ابتدائی تعلیم اپنے وطنِ مالوف لکھنؤ میں پائی۔ اور ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ کالج سے بی اے کی سند حاصل کر لی۔ اسی سال انھوں نے

لندن یونیورسٹی کے سائنس کالج میں داخلہ لے لیا۔ دو سال بعد جرمنی چلے گئے جہاں انھوں نے فرینکفرٹ یونیورسٹی میں سلسلۂ تعلیم شروع کر دیا۔ حسنِ اتفاق سے وہاں انھیں پروفیسر جے فان براؤن کے تحت کام کرنا پڑا جو یونیورسٹی کے کیمیکل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے تعلیم سے فراغت پائی۔ ان کا تھیسس بہت ہی پسند کیا گیا اور اس کی بنیاد پر انھیں ڈاکٹر آف نیچرل فلاسفی کی اعلا امتیازی سند مل گئی جو ایشیا کے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ اگلے سال وہ اپنے وطن واپس آ گئے۔

یہاں پہنچے ہی تھے کہ آیورویدک و یونانی طبیہ کالج دہلی کی طرف سے ایک تحقیقاتی ادارہ قائم کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ ادارہ اس لیے قائم کیا جانا تھا کہ وہ ہندوستان کے دوائی پودوں کی تحقیقات کرے اور یہ کاوش جدید سائنس کی روشنی میں کی جائے۔ ڈھنگ کا ماہرِ فن نہ مل سکنے کے بعد ادارے کے قیام کا منصوبہ التوا میں تھا۔ ان کے آتے ہی مشکل آسان ہو گئی اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جو زمانہ انسٹی ٹیوٹ میں گزارا، وہ کالج کے لیے بہت ہی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ روزِ ازل سے ۱۹۴۰ء تک انھوں نے بہت سے فاضلانہ اور محققانہ مقالات پیش کیے جو نمایاں اہمیت کے حامل تھے۔ ادارے کے کام میں مالی مشکلات رخنے ڈالتی تھیں لیکن اربابِ حل و عقد کو یقین تھا کہ فن اور ترقیِ فن کی خاطر اسے قائم رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ موصوف کے مفید مشوروں سے جو فائدہ فن کو پہنچا، وہ غیر معمولی تھا۔ ان کی تحقیقات کی روشنی میں جو دوائیں تیار ہوئیں، انھوں نے مالی مشکلات کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔

انھوں نے کئی ہندوستانی مفردات، خصوصاً چھوٹا چاند (راولفیا سرپنٹینا) اور چاکیہ (کاسیا ایبسس)، پر عمیق تحقیقات کیں اور جدید الکلائڈز، رالوں، موادِ ملوّنہ اور دوسرے نباتی اجزا کی کیمیا کے سلسلوں میں بنیادی اہمیت کے اضافے کیے۔ ان کی تحقیقات سے بعض ایسے مسائل طے ہو گئے جو عرصے سے متنازعہ تھے۔ اس ضمن میں کونے سین کے سلسلے کے الکلائڈز پر جو کام ہوا، اس کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس کا کیمیائی ڈھانچ تیار ہو گیا۔

۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر صدیقی انڈیا میں کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سی ایس آئی آر) میں نامیاتی کیمیاداں مقرر ہوئے اور چار سال بعد اسی کونسل کی کیمیکل لیبارٹریز کے قائم مقام ڈائرکٹر بنا دیے گئے۔ یہاں اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے انھوں نے جو کام کیا، وہ اس علم کے وسیع تر مسائل پر محیط تھا۔ ایسے مسائل پر جن کا تعلق بیک وقت بنیادی اور اطلاقی پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سے ایسے اہم کاموں پر توجہ دی جو جنگی امور سے متعلق تھے۔ اسی زمانے کے اہم کاموں میں وہ وسیع تحقیقات بھی شامل ہیں جو انھوں نے بھلانواں پر انجام دی اور اس کے کیمیائی پہلوؤں اور صنعتی استعمال پر بیش بہا نتائج افکار پیش کیے۔ اس طرح بھلانواں نے جو کہ پاک و ہند کے جنگلوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے، چینی کی صنعت، وارنش سازی، ڈھالنے کے مرکبات اور اشیا کو رنگنے اور دباغت کی صنعتوں میں ایک اہم معاشی حیثیت حاصل کر لی۔ جنگ کے دوران میں اسی سے آتش دانوں کے لیے ایک سیاہ اینمل تیار کیا گیا جس میں التصاق اور لچک کی خصوصیت کے علاوہ حرارت کے مقابلے اور برقی حاجز ہونے کی غیر معمولی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کی نگرانی میں جو دوسرے کام ہوئے، ان میں نیم پر تحقیقات بھی شامل ہیں جس میں سے سفوفی اور قلمی تلخ جوہر موثرہ کے ایک سلسلے کا اخراج کیا گیا۔

۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر موصوف پاکستان میں سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر مقرر کیے گئے اور انھیں پاکستان کونسل اوف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (پی سی ایس آئی آر) کو منظم کرنے کا کام تفویض کیا گیا۔ جب ۱۹۵۳ء میں اس کونسل کا افتتاح ہوا تو بعض خطوط پر تحقیقات کا کام پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ اس وقت ادنیٰ درجے کے پتھر کے کوئلے کو گندھک سے صاف کرنے کا کام کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ کونسل کی تجربہ گاہوں کی تدریجی ترقی کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صدیقی نے چھوٹا چاند کی جڑ کی کیمیا، اس کے دوائی خواص اور اجزا کی تحقیقات کا کام جو درمیان میں رک گیا تھا، نئے سرے سے شروع کیا۔ اس سے قبل وہ

اس جرٹمیں سے اجملین اور سرپنٹین کے اساسی اجزا کا ایک سلسلہ معلوم کر چکے تھے۔ اب انھوں نے ایک نیا طریقہ استعمال کرکے کئی الکلائڈی مرکبات دریافت کئے جن میں سے ایک "سرپ اجملین" ہے۔ سرپ اجملین کو خشک جڑ کے بجائے تازہ اور سبز جڑوں سے نکالا گیا ہے جو کہ متواتر تقطیر تحلیلی کا حاصل ہے۔

سرپ اجملین میں فشار الدم کو کم کرنے اور قلبی عروق میں ریشہ سازی کو روکنے کی عجیب تاثیر موجود ہے۔ ترکیب کیمیائی اور قلبی فعلیات کے باہمی ربط کے منظم و غائر تحقیق و مطالعہ سے واضح ہوا ہے کہ اس تاثیر آفرینی کا کارمینولامن رنگ کی تحریک کیمیائی متشابہ الترکیب سے قریبی تعلق ہے جو کہ محرکات قلبیہ کی طرح عمل کرتی ہے۔

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کے سائنسی کارناموں کا سرکاری اور نجی علمی اداروں کی طرف سے بار بار اعتراف کیا گیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں یعنی تقسیم برصغیر سے ایک سال پہلے حکومت برطانیہ نے ایم بی ای کا خطاب دیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں روس کی سائنس اکاڈمی نے انھیں ایک طلائی تمغہ عطا کیا جو ان کی علمی خدمات کا مناسب اعتراف کہا جا سکتا ہے۔

تین بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے۔

**مشرقی برلن میں:** ہماری آرزو تھی کہ اگر مشرقی برلن کی سیاحت راہنمائے میں شامل نہیں ہے تو کم سے کم ہم اس کی ہمبولٹ یونیورسٹی تو دیکھ لیں جو سرحد کے بالکل قریب واقع ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ وہاں جا کر واپس آنے اور اسے دیکھنے میں صرف ہو سکتا تھا۔ سرحد پار کرنے کے لیے پابندیاں عائد ہیں۔ باقاعدہ اجازت لئے بغیر کوئی درمیانی سرحد کو عبور نہیں کر سکتا۔ ہم نے سوچا کہ ٹیلی فون کرکے دیکھیں۔ اگر کسی ذمہ دار ہستی نے اجازت دے دی تو اچھا ہے ورنہ جہاں اور بہت سی چیزوں کی حسرتِ دید لیے جا رہے ہیں، یہ بھی سہی۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مغربی اور مشرقی برلن کے مابین ٹیلی فون کا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ سلسلہ ۲۷ مئی ۱۹۵۲ء سے منقطع ہے۔ جرمنوں کا کہنا ہے کہ روس نے یہ یک طرفہ کارروائی محض اہلِ برلن کو پریشان کرنے کے لیے کی ہے۔

لیکن تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے ممکن ہے کہ اس نے کسی وجہ سے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھایا ہو۔ تاہم سرحد عبور کرنے کے لیے "پروانۂ داخلہ" کا طریقہ رائج ہے جسے انوکھا یا غیر معمولی نہیں کہا جا سکتا۔ بہر نوع پاسپورٹ کے انداز کی یہ چیز اور ملکوں کے درمیان بھی نافذ ہے اور قومی سالمیت کے خیال سے ایسا کرنا مناسب ہے۔ جب برصغیر کی تقسیم عمل میں آئی تو کچھ عرصے تک کوئی پابندی عائد نہ ہو سکی۔ پھر اسی قسم کا "پروانۂ داخلہ" ضروری قرار پایا اور اب دو مختلف ملکوں کے درمیان دستور کے مطابق پاسپورٹ کا نظام قائم ہے۔ روس نے "اپنے" علاقے میں داخلے کے لیے ایسا قدم اٹھایا تو کس جرم کا ارتکاب کیا۔

ہم نے سوچا کہ سرحدی چوکی تک پہنچ کر کوشش کی جائے۔ اگر اجازت مل گئی تو اچھا ہے، ورنہ لوٹ آئیں گے۔ زیادہ سے زیادہ جانے اور آنے کی زحمت ہو گی۔ لہٰذا اللہ کا نام لے کر ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ برانڈن برگ دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ دونوں طرف مسلح فوجیوں کا پہرہ تھا اور اچھی طرح نگہداشت ہو رہی تھی لیکن جب ہم نے روسی چوکی پر جا کر اپنا مقصد بیان کیا تو انچارج نے چار فارم ہم کو دے دیے تاکہ ضروری اندراج کر دیے جائیں۔ اس نے پاسپورٹ اور ویزا کے کاغذات کی بھی پڑتال کی لیکن سب کارروائی دس منٹ میں ختم کر دی اور مہریں لگا کر اجازت نامے ہمارے حوالے کر دیے گئے۔ نہ ہماری تلاشی ہوئی اور نہ بے معنی استفسارات کا چکر چلایا گیا۔

**ہمبولڈ یونیورسٹی:** سرحد سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہمبولڈ یونیورسٹی کی عمارت واقع ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ایک منتظم صاحب نے خندہ پیشانی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا اور یہ جان کر اظہارِ مسرت بھی کیا کہ ہم نے صرف یونیورسٹی دیکھنے کی خاطر اجازت نامہ لیا ہے۔ یہ یونیورسٹی لڑائی سے قبل آزاد جرمنی میں دوسرے نمبر پر تھی۔ پہلا نمبر میونک یونیورسٹی کا تھا جہاں گیارہ ہزار طالب علم داخل تھے اور تمام علوم پر تعلیم دی جاتی تھی۔ جرمنی اور برلن کی تقسیم ہوئی تو ہمبولڈ یونیورسٹی کی عمارت روسی تحویل میں چلی گئی۔ اس کا کچھ حصہ لڑائی میں تباہ ہو گیا تھا۔ لیکن روسیوں نے

اپنی علم دوستی کا ثبوت دینے کے لیے اسے بہت جلد نئے سرے سے تعمیر کرالیا۔ تعلیم کا سلسلہ کچھ عرصے تک بند رہا لیکن پھر پڑھائی شروع ہوگئی اور ہر مضمون کے طلبا داخل کیے جانے لگے۔ اس وقت طلباء میں ادبیات کا درس لینے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان کے بعد سیاست، قانون، سائنس اور فنون کے نمبر ترتیب وار آتے ہیں۔ چونکہ چھٹی ہوگئی تھی، اس لیے طلبا جاچکے تھے بعض اساتذہ اور کچھ منتظمین موجود تھے۔ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے بہت سے غیر ملکی طلبا کے لیے وظائف کا اہتمام کیا گیا ہے "غیر ملکی" کی تعریف میں مغربی برلن اور مغربی جرمنی کے طلبا آتے ہیں۔ چنانچہ وہاں کے بہت سے طلبا داخل ہیں جو ہوسٹلوں میں رہتے ہیں اور صرف طویل تعطیلات کے دوران میں انھیں وطن جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ فیس برائے نام ہے۔ گویا بیشتر خرچ خود حکومت برداشت کرتی ہے۔ قلیل تعداد میں روسی طلبا بھی داخل ہیں۔ بیشتر روسی افسران کے بچے والدین کے ساتھ نہیں رہتے اور وہیں تعلیم پاتے ہیں مجموعی طور پر اس یونیورسٹی میں دس ہزار سے زیادہ طلبا داخل ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ کمروں اور برآمدوں میں خوب صورت جلی حروف میں گوئٹے اور لینن کے اقوالِ زرّیں ساتھ ساتھ لکھ کر لگائے گئے ہیں۔ شاید اس لیے کہ گوئٹے کی شخصیت عالمگیر نوعیت کی ہے۔ ہر جگہ اس کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ وہ اس دور کا انسان نہیں تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی تعلیمات رہتی دنیا جریدۂ عالم پر ثبت رہیں گی۔ تاہم یہ ثابت ہوگیا کہ روسیوں نے اس کے ساتھ تعصب نہیں برتا۔ اس طرح نصاب میں بعض وہ کتابیں شامل ہیں جو مشرقی برلن اور مشرقی جرمنی میں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ در و دیوار اور سقف و بام پر سرخ رنگ و روغن کے استعمال سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ سرخ روس کا علاقہ ہے۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ یہاں مذہبی تعلیمات کا بھی شعبہ قائم ہے اور اس میں سب مذاہب، حتیٰ کہ مذہب اسلام بھی شامل ہے۔ عام طور پر روسیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بے دین ہیں اور وہ مذہبی تعلیم یا دینی فرائض کی ادائیگی سے روکتے ہیں۔

**یونیورسٹی لائبریری:** یونیورسٹی سے متعلق ایک لائبریری بھی ہے جو لڑائی سے پہلے کی ہے۔ عمارت منہدم ہونے اور جلنے کے ساتھ ساتھ بہت سی کتابیں بھی ضائع ہو گئی تھیں۔ لیکن ارباب اقتدار نے ان کی تعداد بڑھانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ اس میں اعشاری نظام کے مطابق کتابوں کی ترتیب عمل میں آئی ہے۔ فہرست کے علاوہ کارڈ انڈکس کا طریقہ بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ہر کتاب نہایت آسانی سے مل جاتی ہے۔ اعلا مہتمم کتب خانہ کے علاوہ سولہ اس کے نائبین کام کرتے ہیں۔ بڑی تعداد جرمن زبان میں چھپی ہوئی کتابوں کی ہے لیکن روسی حصّہ بھی قائم کر دیا گیا ہے۔ پھر یورپ کی اور زبانوں کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تعداد کم ہے اور ان کی ترتیب بھی اعشاری نظام کے مطابق نہیں ہو سکی ہے لیکن اس سے زیادہ توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی۔
مجموعی طور پر سب زبانوں اور سب موضوعات کی کتابوں کی تعداد سات لاکھ کے قریب ہے۔ ان کے علاوہ خود یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا کے مقالات اس یونیورسٹی نے چھاپے ہیں جن کی تعداد آٹھ لاکھ سے کم نہیں ہے۔ بیشتر حصّہ تقسیم سے پہلے کا ہے جو حسنِ اتفاق سے محفوظ رہ گیا ہے۔ اگر وہ ضائع ہو جاتا تو تحقیقات کرنے والے طلبا کے لیے سہولتوں کا ایک دروازہ بند ہو جاتا۔ کتابوں کے علاوہ فولڈر اور پمفلٹوں کی قسم کی چیزیں بھی یہاں موجود ہیں، لیکن خشک موضوعات کی بعض کتابوں پر ہم نے ہاتھ پھیر کر دیکھا تو ان پر مٹی کی تہ جمی ہوئی محسوس کی گئی۔ گویا ان کے پڑھنے والے نہیں ہیں تو ان کی صفائی کا لحاظ بھی نہیں رکھا جاتا۔

لائبریری سے ملحق ایک وسیع ہال دیکھا جو اب بیکار پڑا ہے۔ کسی زمانے میں وہاں علمی موضوعات پر مذاکرات ہوتے تھے اور جرمنی کے علاوہ سارے یورپ کے طلبا آکر ان میں حصّہ لیتے تھے۔ مگر یہ سلسلہ اب ختم ہو گیا ہے۔ یہ ہال اتنا وسیع ہے کہ بیک وقت کئی ہزار آدمی اس میں سما سکتے ہیں۔ روسیوں نے سب کچھ دوبارہ بنوایا لیکن اس ہال کو یونہی رہنے دیا۔ شاید اس کا کوئی اور مصرف ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ غالباً آئندہ کبھی وہ اپنی اصلی ضرورت کے مطابق

کام آنے لگے۔

ہمبولڈ فاؤنڈیشن : یونیورسٹی کے تحت ہمبولڈ فاؤنڈیشن بھی قائم ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ غیر ملکی طلبا کو اس یونیورسٹی یا جرمنی کے دوسرے تحقیقاتی اداروں میں داخلہ لے کر کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ لڑائی ختم ہونے اور تسلط و اقتدار بدل جانے کے باوجود اس مقصد کو اب بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اس وقت اس فاؤنڈیشن سے وظائف لے کر چھپن ملکوں کے تقریباً دو سو ساٹھ طلبا، اس یونیورسٹی اور دوسرے اداروں میں اکتساب علم کر رہے ہیں۔ اس کی بنیاد ۱۸۰۹ء میں رکھی گئی تھی۔ ہمبولڈ کا یہ کارنامہ بہت ہی قابلِ قدر ہے۔

الیکسانڈر ہمبولڈ : جرمنی کا مشہور پرستار قدرت اور سیاح، الیکسانڈر ہمبولڈ جسے حکومت سے "نواب" کا خطاب بھی ملا تھا، ۱۴ ستمبر ۱۷۶۹ء کو برلن میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ پرشیا کی فوج میں میجر تھا۔ وہ اس بچے کی پیدائش کے دس سال بعد فوت ہو گیا۔ الیکسانڈر کا بھائی کارل ولہلم فان ہمبولڈ اس سے صرف دو سال بڑا تھا۔ لیکن دونوں بھائیوں کی طبیعت میں زبردست تضاد تھا۔ بڑا بھائی ادب و شعر کا دلدادہ تھا اور اسی اعتبار سے دنیائے ادب میں مشہور ہے لیکن چھوٹے کی طبیعت سائنس کے مختلف پہلوؤں، طبقاتی اور کائناتی چھان بین اور سیاحت کی طرف راغب تھی۔

ماں کی زیر نگرانی برلن یونیورسٹی میں اعلا تعلیم پانے کے بعد وہ فری برگ چلا گیا تاکہ وہاں کانوں کے قریب روئیدگی کی تحقیقات کر سکے۔ اس نے اپنے نتائجِ تحقیقات کو ۱۷۹۳ء میں کتابی صورت میں چھاپ دیا۔ اس نے اعصاب کی تشنجی کیفیات کا بھی تجزیہ کیا اور جو خیالات پیش کیے، وہ بعد کے ماہرین تشریحات کے لیے مشعلِ راہ بنے۔ ۱۷۹۴ء تک وہ دانشمند کی مشہور اہلِ علم ہستیوں میں شمار ہونے لگا۔ چنانچہ ایک سال بعد شلر نے ایک نیا رسالہ جاری کیا تو اس کے سائنسی مقالات اس میں شائع ہونے لگے۔ اس نے انگلستان کا سفر جارج فوسٹر کے ساتھ کیا جو کپتان کک کے ساتھیوں میں سے تھا۔ فوسٹر کی ہم جلیسی نے اس میں بھی سفر و سیاحت کی امنگیں پیدا کر دیں لیکن نوعیتِ سفر ذرا مختلف رہی۔

۱۷۹۵ء میں اس نے سوئزرلینڈ اور اٹلی کا سفر وہاں کے طبقات الارضی اور نباتی جائزوں کی خاطر کیا۔ اس دوران میں حکومت نے اسے برلن کی کانوں کا ناظم مقرر کر دیا۔ اس موضوع کے سفارتی مذاکرات کرنے کے لیے اسے کئی بار دوسرے ملکوں میں بھی بھیجا گیا اور اس نے معدنی اشیا کے تبادلے کے لیے اچھے تعلقات استوار کر لیے۔

۱۷۹۶ء میں ماں کے مر جانے کے بعد اس پر کوئی ذمہ داری نہیں رہی تھی۔ اس لیے اس نے تمام تر سرکاری رشتے منقطع کر کے صرف سیاحت کی طرف توجہ دینی شروع کی۔ ہمیشہ ماہرینِ نباتات اس کے ہم سفر رہے۔ ۱۷۹۹ء میں اس نے تناریف کے مقام پر پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی سر کر لی اور اسی دوران میں ۱۲ اور ۱۳ نومبر کی درمیانی رات کو دُم دار ستاروں کی بارش کا نظارہ کر کے کائناتی نظام کے ساتھ نظریات میں ایسی ترمیمیں کیں جنھیں تسلیم کر لینے کے لیے جدید ماہرینِ فلکیات مجبور تھے۔ اس نے امریکا میں دریائے اورلینو کی گزرگاہ کی چھان بین کرنے کے بعد ۱۸۰۰ء میں مسلسل چار ماہ تک تقریباً ایک ہزار سات سو پچیس میل کا سفر کیا اور اس سلسلے میں ایسے علاقوں سے گزرا جہاں سینکڑوں میل تک انسانی وجود کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اسی سال ۲۴ نومبر کو اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ وہ کیوبا گیا لیکن بہت جلد دریائے ایمیزن کا منبع دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا اور فوراً چل کھڑا ہوا۔ اسی دوران میں اس نے بعض نمکیات کا پتہ لگایا جو مصنوعی کھاد بنانے میں مفید ہو سکتے تھے۔ اس کے ان نظریات سے یورپ نے خوب استفادہ کیا اور اس کی رائے کے مطابق مصنوعی کھاد تیار ہونے لگی۔

پھر ایک سال ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں گزارنے کے بعد وہ ۱۸۰۴ء میں وطن واپس آ گیا۔ اب اطمینان سے بیٹھ کر اس نے اپنے مشاہدات و تجربات کو قلمبند کیا اور ارضی و سماوی طبقات کے بارے میں ایسے نظریات پیش کیے جن سے ساری دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ اس نے مختلف ملکوں کے موسمیاتی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسے اصول منضبط کیے جو آج بھی درست تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ۱۸۰۹ء میں اس نے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کا بڑا حصہ فروخت کر کے ایک تحقیقاتی ادارہ قائم کر دیا۔ وہ ہمبولٹ فاؤنڈیشن آج بھی قائم ہے جس میں داخل ہو کر طلبا، علمی

تجربات میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔

اس نے پہلی بار یہ نظریہ بھی قائم کیا کہ قطبِ شمالی کے مقابلے میں خطِ استوا پر زمین کی مقناطیسی قوت کی اصل شدت میں کمی پائی جاتی ہے۔ اس نے نئی دنیا کے آتش فشاں پہاڑوں کا جائزہ لینے کے بعد طبقاتِ زمین کے بارے میں نئے نظریات بھی پیش کیے جن کی وجہ سے وہ اس عہد کے یورپ میں نپولین بوناپارٹ کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہو گیا۔ ہر ملک کے تحقیقاتی ادارے یہ خواہش کرنے لگے کہ وہ ان کا اعزازی رکن بن جائے۔ وہ شاہ فریڈرک ولیم سوم کا قریبی دوست تھا لیکن جب اسے وزیرِ تعلیماتِ عامہ کا منصب تفویض کرنے کا خیال پیش کیا گیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس طرح میرے تحقیقاتی مشن میں فرق پڑ جائے گا۔ اس کی تحریک پر حکومتِ روس نے شمالی ایشیا میں موسمیاتی مرکزوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا تاکہ طوفان سے پہلے ان کی آمد کا پتہ لگایا جا سکے۔ حکومتِ روس نے اس سے مزید تحقیقات کی استدعا کی، چنانچہ اس نے اس سرزمین پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک صرف پچیس ہفتے میں نو ہزار چھے سو چودہ میل کا سفر کیا۔ اس نے اس دوران میں بعض معدنی ذخائر کا پتہ لگایا لیکن اس عام خیال کی تردید کی کہ کوہِ یورال کے پہاڑی علاقوں میں ہیرے اور مٹی میں سونے کے ذرات ملتے ہیں۔

۱۸۳۰ء میں اس کے بڑے بھائی کی اچانک موت واقع ہو جانے سے اسے سخت صدمہ ہوا۔ چونکہ خود اس نے کوئی شادی نہیں کی تھی اس لیے بھائی کی اولاد کو اپنی ہی اولاد سمجھ کر ان کی پرورش کا خیال رکھنے لگا۔ اس کے علاوہ ۱۸۴۰ء میں فریڈرک ولیم چہارم کے تخت نشین ہو جانے کے بعد دربار میں آئے دن اس کو طلب کیا جانے لگا۔ اس طرح اس کی سیاحت میں فرق آ گیا جو یوں بھی اکہتر سال عمر ہو جانے کے باعث کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اب اس نے رموزِ کائنات پر اپنے خیالات تحریر کرنے شروع کیے اور ایک سلسلے میں کئی کتابیں لکھ ڈالیں جو سائنسی معلومات کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوئیں۔

۱۸۵۷ء میں جب انگریز ہندوستان میں ظلم وستم ڈھا رہے تھے، اس پر معمولی سکتہ کا حملہ ہوا اور اس نے اندازہ لگا لیا کہ اب معذور ہو جانا یقینی ہے۔ اس نے باقی زندگی وطن میں گزارنے کا تہیہ کر لیا۔ اس وقت اس کے ایک قدیم ملازم نے اس طرح خدمت انجام دی جو قریبی عزیزوں سے بھی ممکن نہیں تھی۔ اسی لیے ۶ مئی ۱۸۵۹ء کو فوت ہونے سے کچھ عرصے پہلے اس نے اپنا سارا باقیماندہ اثاثہ اس ملازم کے نام لکھ دیا۔ تمام عمر مصروف کار رہنے کے باوجود اسے آخر عمر میں اس بات کا قلق تھا کہ وہ کئی کام اپنی زندگی میں نہیں کر سکا۔ مثلاً وہ غلامی کا یکسر استیصال چاہتا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ گلیسیا اور ورانگونیا کے کان کنوں کی معاشی حالت سدھر جائے۔ اس زمانے میں چند احباب کو لکھے ہوئے بعض خطوط سے ان باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے اپنی جائداد کا جو قلیل حصہ ملازم کو بخش دیا تھا، وہ اس کے لواحقین میں تقسیم ہو کر ختم ہو گیا ہو گا۔ لیکن جس بڑی رقم سے فاؤنڈیشن قائم کی تھی، وہ آج بھی اس کا نام زندہ رکھے ہوئے ہے۔

**واپسی اور روانگی:** پونے پانچ بج چکے تھے اور ہمیں چھ بجے کے جہاز سے ہمبرگ روانہ ہونا تھا۔ اس لیے جملہ منتظمین کا شکریہ ادا کر کے اور ان سے اجازت لے کر ہم پھر مغربی برلن میں داخل ہوئے اور دس منٹ میں اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ چلتے وقت ہوٹل کے منیجر سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہمارا مکمل بل بنا کر تیار رکھے اس لیے آتے ہی اس کی ادائیگی کی، نماز عصر پڑھی اور سامان سفر اٹھوا کر ہوائی اڈے کی طرف چل پڑے۔ ان سب جھمیلوں میں چالیس منٹ لگ گئے، پھر بھی ہم وقت مقررہ سے کچھ دیر پہلے وہاں پہنچ گئے۔

ہمارے لیے نشستیں بی اے اے جہاز راں کمپنی کے ایک جہاز سے بک کرائی گئی تھیں۔ اس کی روانگی کا وقت چھ بجے تھا لیکن وہ کہیں سے چلتا چلاتا برلن کے ہوائی اڈے پر ساڑھے چھ بجے پہنچا۔ ظاہر ہے کہ اگلے سفر کے لیے فوراً اڑ جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ نہ جرمنی کا عقاب تھا اور نہ اقبال کا شاہین جس کے پر پرواز میں بے پناہ طاقت سمجھی جاتی ہے،

جسے اپنی ذات پر بھروسہ ہوتا ہے اور کسی سے اجازت لینی نہیں پڑتی۔ ہوائی جہاز کے بارے میں طے ہے کہ جب وہ کسی ہوائی اڈے سے اڑنا چاہے تو جب تک اس ہوائی اڈے کا گراونڈ مینیجر پرواز کی تحریری اجازت نہ دے دے اور یہ تصدیق نہ کر دے کہ ہر لحاظ سے چک کر لینے اور چک کرا لینے کے بعد مجھے کامل یقین ہے کہ جہاز روانہ ہونے کے لائق ہے، پائلٹ میں ہمت نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی مرضی سے اس کے کسی ایک بازو کا پنکھا بھی چلا سکے۔ چنانچہ دیکھ بھال اور سامان اتارنے چڑھانے، پٹرول وغیرہ لینے میں خاصا وقت لگ گیا اور خدا خدا کر کے جہاز وہاں سے سوا سات بجے روانہ ہوا، جبکہ عین اسی وقت اسے ہیمبرگ پہنچ جانا تھا۔ صرف سوا گھنٹے کا سفر ہے لیکن احتیاط اتنی ہی برتنی پڑتی ہے گویا کہ وہ دس گھنٹے کے مسلسل سفر پر روانہ ہو رہا ہو۔ قاعدہ بہر حال قاعدہ ہے۔ بسوں کی روانگی کے لیے اگر اس میں وقت مقررہ کے بعد کسی قسم کی تاخیر ہو تو بس کے سارے مسافر زور دے سکتے ہیں کہ بس چلاؤ مگر جہاز کے معاملے میں آج تک کسی مسافر کو پائلٹ سے لڑتے نہیں دیکھا گیا کہ اسے جلد چلاؤ۔ یہاں تک دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاز ہر طرح سے لیس اور تیار ہو کر اور پروانہ روانگی لے کر اور اپنے پنکھے چلا کر رن وے پر دوڑا اور پھر ایک دم رک گیا۔ پائلٹ نے کسی قسم کا نقص محسوس کیا اور اپنا فرض سمجھتے ہوئے اسے دوبارہ چک کرا لینا مناسب سمجھا۔ بات یہ ہے کہ بس یا کوئی موٹر گاڑی چلتے چلتے خراب ہو جائے تو سڑک پر رک جائے گی اور ایک ضدی بھیڑ کی طرح راستہ روکے کھڑی رہے گی۔ بہت کم صورتوں میں ایسا ہوا ہے کہ موٹر گاڑی اپنے انجن کی کسی خرابی کے باعث چلتے چلتے الٹ جائے۔ اگر رفتار غیر معمولی طور پر بہت تیز ہے، کوئی مختصر زاویے کا موڑ آ گیا ہے یا سڑک بہت خراب ہے تو گاڑی حادثے سے دو چار ہو جاتی ہے ورنہ عموماً، "گل محمد" ابھی بن جاتی ہے۔

**لفٹ ہنزا**: ہمیں سفری کمپنی امریکن ایکسپریس کی اس تعصب دماغی کا ماتم کرنا پڑا کہ وہ ہر جگہ امریکی مفاد کا خیال رکھتی ہے۔ ایک ملک میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک جانے کے لیے قومی جہاز راں کمپنیاں زیادہ مناسب

موزوں کہی جا سکتی ہیں۔ غیر ملکی کمپنیوں کو کم سے کم اندرونی سفر کے لیے ٹکٹ نہیں کرنا چاہیئے لیکن امریکن ایکسپریس نے لفٹ ہنزا کو نظر انداز کر کے پی اے اے کے ٹکٹ ہمارے لیے بنوائے۔ ہمیں معلوم تھا کہ جرمنی کی اپنی ہوائی کمپنی تمام بڑے شہروں کے درمیان اپنے جہاز چلاتی ہے اور دن میں ان کی کئی کئی پروازیں ہوتی ہیں مگر پھر بھی گھٹنے پیٹ کی طرف جھکے۔ یہ اچھا نہیں تھا۔

لفٹ ہنزا نام کی ہوائی کمپنی جرمنی میں سب سے پہلے ۱۹۲۶ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس وقت دُنیا کی اور کمپنیاں بھی زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھیں۔ چنانچہ اس نے بھی بتدریج ترقی شروع کی۔ البتہ ہٹلر کے برسرِ اقتدار آجانے کے بعد جہاں اور صنعتوں نے فروغ پایا، جہاز سازی کا کام بھی ترقی کر گیا۔ جرمنی کو جس کی مشینی صنعت ہر لحاظ سے عروج پر تھی اس دوڑ میں آگے بڑھنا ہی پڑا ورنہ دوسری صنعتوں پر بھی برا اثر پڑتا۔ دوسری جنگ عظیم میں محاربات کے طریقوں میں سے ہوائی جہازوں کے ذریعہ لڑائی کو ترجیحی حیثیت حاصل تھی۔ جرمنی نے اس میدان میں قدم بہت آگے بڑھائے تھے۔ رات دن اسلحہ بنتا رہا۔ اس میں ہوائی جہاز شامل تھے جب لڑائی نے بین الاقوامی سطح پر پہنچ کر غیر معمولی شدت اختیار کی تو لاتعداد جہاز بھی کم محسوس ہونے لگے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ شہری پرواز کا محکمہ دفاعی محکمے کا جزو بن گیا اور جو جہاز شہری مسافروں اور ان کے سامان کو لانے لے جانے کے کام آتے تھے، جنگی جہازوں میں بدل لیے گئے۔ لڑائی کے بعد جو حشر اور کارخانوں اور کمپنیوں کا ہوا، اس کا سامنا لفٹ ہنزا کو بھی کرنا پڑا جو اس وقت تک صرف کاغذ پر برقرار رہ گئی تھی۔ لڑائی کے بادل چھٹ جانے کے بعد اتحادیوں نے شہری پرواز کا ایک دفتر قائم کیا۔ لیکن اس کا دائرۂ عمل سرکاری ضروریات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ ۶ر جنوری ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ اس وقت تک اور اس کے بعد بھی اتحادی ملکوں کی فضائی کمپنیاں شہری پرواز کے کام آتی رہیں۔ آخر پچھلے سال ۵ر مئی کو سب پابندیاں دُور کر دی گئیں۔ اس کے امکانات پہلے سے محسوس ہونے لگے تھے اور لفٹ ہنزا نام کی نئی کمپنی چند ماہ پہلے وجود میں آگئی تھی۔ اس کا افتتاح ۶ر اگست ۱۹۵۴ء کو ہوا

تھا۔ کمپنی کی جو ساکھ لڑائی سے پہلے قائم تھی، نئے نظام کے تحت فوراً دوبارہ حاصل کر لی گئی۔ قوانین میں لچک پیدا کی گئی تاکہ دوسرے ملکوں کی کمپنیاں مقابلے پر نہ آسکیں اور اگر آئیں تو کامیابی نہ ہو۔ صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ اگر نیک نیتی اور خلوص شامل حال ہو جائے تو بیڑا پار لگانے میں کوئی دقت یا کوتاہی نہیں ہوتی۔ اہل جرمنی نے اپنی بے پناہ شکست، ہزیمت اور تباہی کے بعد تعمیر نو کے ہر میدان میں یہی اصول مدنظر رکھے تھے اور کامرانی ہر منزل پر حاصل کی تھی۔

لُفتھ ہنزا کا پہلا جہاز نئے نظام کے تحت ۱۵ رمئی ۱۹۵۵ء کو پیرس، لندن اور میڈرڈ کے سفر کے لیے اڑا۔ بہت جلد اس کے سپر کونسٹیلیشن جہاز آگئے۔ ۵ رجون کو اس کا پہلا جہاز شانن کے راستے بحر اوقیانوس کو عبور کرتا ہوا نیویارک جا پہنچا۔ اس سال کے موسم گرما میں کمپنی کا جو نظام اوقات مرتب ہوا، وہ ہر لحاظ سے ہمہ گیر تھا۔ اس نے تمام بیرونی اور اندرونی اڈوں پر اقتدار حاصل کر لیا۔ اس کے جہاز بہت ہی باقاعدگی کے ساتھ مونٹریل کے راستے شکاگو اور پیرس کے راستے نیویارک جانے لگے۔ خود ملک میں ہر قومی اڈا اس نے سنبھال لیا۔ ہماری آمد سے چند ہی دن پہلے اس کا پہلا جہاز جنوبی امریکہ پر چھا جانے کے لیے روانہ ہوا اور ریوڈی جنیرو، ساؤپاؤلو اور بوئنز آئرس کی خبر لانے لگا۔ مشرق وسطیٰ کے شہر بھی اس نے نظر انداز نہیں کیے۔ استنبول، بیروت، بغداد، تہران تک اس کے جہاز پرواز کرنے لگے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ بہت جلد ہندوستان اور پاکستان میں بھی اس کمپنی کے دفاتر کھل جائیں گے اور پھر اس کے جہاز چین و جاپان تک پہنچنے لگیں گے۔

۳۰ ستمبر تک اس سال کے نو ماہ میں لفتھ ہنزا کے جہازوں کے ذریعے دو لاکھ انتیس ہزار چھ سو پچھتر مسافروں نے سفر کیا اور ایک ہزار نو سو ننانوے ٹن عام سامان اور ایک ہزار پچاس ٹن ڈاک کا مال روانہ کیا گیا۔ یہ محض ابتدائی منزلیں ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس کمپنی نے کون ویر، وائکر، لوک ہیڈ جہازوں تک کی فرمائش کر دی ہے اور خود بھی بنانے شروع کر دیے ہیں۔ تمام سامان جمع ہو جانے کے بعد یہ کمپنی جس حد تک ترقی کرے گی، اس کا اندازہ خود کیا جا سکتا ہے۔

۲ر اکتوبر ۱۹۵۶ء ـــــ منگل

# ہیمبرگ

ہوٹل یور پائستر ہوف، جس میں ہمارے لیے کمرے مخصوص کرائے گئے تھے، کرچن آلے نامی سڑک پر واقع ہے جو ہوائی اڈّے سے خاصی دُور ہے۔ اسی سڑک پر اور قریب ہی ایک دوسرا ہوٹل رائخس ہوف ہے جو بظاہر زیادہ شاندار معلوم ہوا۔ ممکن ہے، اس میں امریکی سرمایہ لگا ہوا نہ ہو اور اسی لیے امریکن ایکسپریس کمپنی نے اس میں بکنگ نہ کرائی ہو۔ کل رات ہوٹل میں پہنچتے پہنچتے ہمیں کافی دیر ہو گئی اور ہیمبرگ کی شام ہاتھ سے نکل گئی۔ یقیناً وہ شام اودھ جیسی تو نہیں کہی جا سکتی لیکن ہمارے لیے جو ایک دن کے لیے اس شہر میں آئے ہیں، وہ شام بھی شامِ اودھ سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ آج شام کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہمارا وقت کہاں اور کیسے گزرے گا۔ اس لیے بھی گزری ہوئی شام سے فائدہ نہ اٹھانے کا ملال رہا۔ سنا گیا ہے کہ اس شہر میں بھی شبینہ کلبیں رنگ رلیاں منانے کے اعتبار سے بہت شاندار سمجھی جاتی ہیں۔ ہمیں ان سے تو کوئی دل چسپی نہیں تھی، البتہ بازاروں کی رونق دیکھنی چاہتے تھے۔

**نمائشِ سامانِ آرائشِ گیسو:** کل یہاں بال تراشنے اور بال سنوارنے سے متعلق سامان کی نمائش ہوئی تھی۔ صرف ایک دن کے لیے تھی، حالانکہ اس کا اہتمام کئی ہفتے پہلے سے کرنا پڑا ہو گا۔ ہمیں تعجب تھا کہ یورپ کے لوگوں نے زندگی کے ہر عمل اور ضرورت یا محض دل چسپی کے اعتبار سے اس کے ہر پہلو کو اتنی ترقی دی ہے کہ معمولی کام بھی باقاعدہ فن کے زمرے میں آ گئے ہیں۔ بھلا بتایئے، بال تراشنے اور سنوارنے کے اوزار اتنے مختلف النوّع ہو گئے ہیں کہ ان کی نمائش کی جانے لگی ہے۔ نمائش میں صرف

اوزار اور آلات ہی دکھائے گئے۔ ان کے طریقۂ استعمال یا استعمال کے بعد کے نتائج کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ ہمارے ملک میں اگر ایسی کوئی نمائش منعقد کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو اول تو اتنا سامان ہی میسر نہیں آئے گا کہ اس سے ایک بھی اسٹال سجایا جا سکے اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو کوئی وہاں جانا بھی گوارا نہیں کریگا کیونکہ اسے محض حجاموں کی نمائش سمجھ کر وہاں جانا کسرِ شان تصور کیا جائے گا حالانکہ آرٹ، خواہ کسی قسم کا ہو، آرٹ کے نقطۂ نظر سے جانچنا اور آرٹ کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ جرمنی کا یہ شہر بھی چونکہ تاریخی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے اس لیے ثقافتی لحاظ سے بھی اس کو دوسرے شہروں کے مقابلے میں کوئی کم تر درجہ نہیں دیا گیا۔ ایک اسی نمائش پر کیا منحصر ہے یہاں کی اور دلچسپیاں بھی قابل ذکر سمجھی جاتی ہیں۔

شہر کا تاریخی پس منظر: غالباً مورخین کے لیے یہ بتانا آسان نہیں ہو کہ جرمنی کے اس شہر کی داغ بیل کب پڑی۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ شاہ شارلیمین نے ۸۰۸ء میں یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جہازی بیڑے کے ذریعے ہونے والے کسی ممکنہ حملے کو اس جگہ روکا جا سکے۔ ہر چند یہاں سمندر کا ساحل نہیں ہے کیونکہ یہ دریا کے کنارے واقع ہے، لیکن دریا کا پاٹ اتنا وسیع ہے کہ یہ بڑے جہازوں کی ہمیشہ گذرگاہ رہا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسی بندرگاہ ہے جس پر جرمنی کی بیشتر درآمدی و برآمدی تجارت کا انحصار ہے۔ اسی لیے اسے دنیا میں پہنچنے کے لیے جرمنی کا صدر دروازہ کہا جاتا ہے۔

یہ علاقہ دو بڑے دریاؤں ــــ دریائے ایلب اور دریائے آسٹر ــــ کے درمیان واقع ہے اور جھیل آلسٹر نے بھی ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر رکھا ہے، اس لیے خوب سرسبز و شاداب ہے۔ پھر طبقاتی اعتبار سے قدرت کی لازوال نعمتیں اس کے سینے میں پوشیدہ ہیں جنہیں جگہ جگہ سے چیر کر ان نعمتوں کو نکالتے ہوئے بارہ صدیاں گزر گئی ہیں۔ یہاں کی سرسبزی و شادابی کا ثبوت تو ان کے نام ہی سے ملتا ہے۔ ہیمبرگ دو لفظوں "ہما" اور "بورگ" سے مل کر اور کچھ بگڑ کر بنا ہے۔ ہما جنگل کو کہتے ہیں اور بورگ شہر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قلعہ

# ھیمبرگ میں



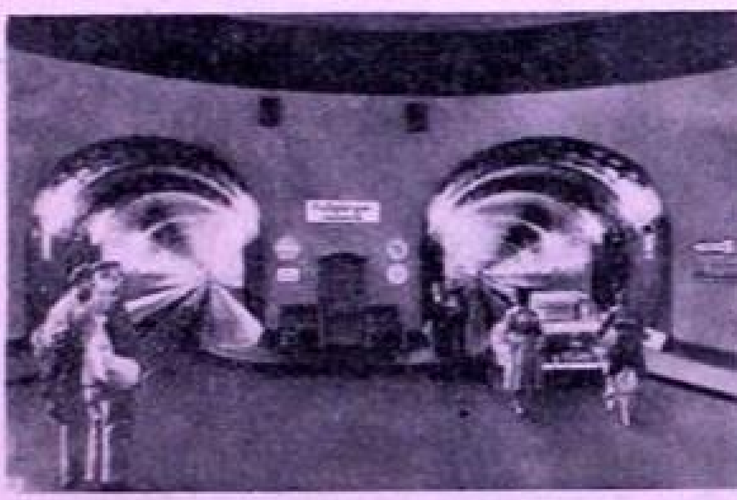
بندر گاہ کی مغربی گودی



میناروں کا شہر



دریائے آلسٹر کے کنارے



دریائے ایلب کے نیچے سرنگیں



جدید سڑک ریپر بھان



نہر کے کنارے قدیم عمارتیں

تعمیر کرنے کے تین سال بعد المانیہ کے روایتی شہنشاہ نے اس جگہ ایک گرجا گھر بھی تعمیر کرایا۔ اس گرجا کے آثار تو اب نہیں ملتے کیونکہ کچھ عرصے بعد سیکسن قوم کے افراد نے اسی جگہ اپنی قربان گاہ بنالی تھی۔ اس طرح یہ شہر نصرانیت کی تشہیر و اشاعت کا ہمیشہ سے ایک خاص مرکز بنا رہا ہے۔ یہیں کے پادری وفود کی صورت میں آس پاس کے علاقوں، خصوصاً سویڈن، ڈنمارک اور ناروے جاتے اور اپنے عقائد کا پرچار کرتے تھے۔ شارلیمین نے اپنی حکومت کے استحکام کا راز اس نکتے میں مضمر پایا تھا کہ عوام کے قدیم مذہبی عقائد مٹا کر عیسائیت کا خوب پرچار کیا جائے۔ اس کی اس پالیسی پر اس کے بعد بھی عمل ہوتا رہا۔

۸۴۵ء میں نورس قبیلے کے حکمرانوں نے یہاں کے گرجا گھروں، خانقاہوں اور ان کے ساتھ سارے شہر کو جلا کر خاک کر دیا۔ دو سال بعد اس علاقے کو تھوڑے فاصلے کے ایک اور شہر برمین کے ساتھ ملا دیا اور صوبے کی حکومت بھی اسی دوسرے شہر میں قائم کر دی لیکن ہیمبرگ جس حصۂ ملک کا نام تھا، اس میں ترقی کرنے کی قدرتی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس نے پنپنا شروع کر دیا۔ تاہم اس کی قسمت میں ایک دورِ زوال اور لکھا ہوا تھا۔ سلاؤ قوم کے لوگوں نے اس طرف قدم بڑھائے اور ہر چیز تباہ کر دی۔

آخر کار گمنامی کی دو صدیاں گزر جانے کے بعد شوئن برگ کے نواب ایڈولف اوّل کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ مقام صنعت و تجارت کے میدان میں زبردست ترقی کر سکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کا یہ اندازہ کسی طرح بھی غلط نہیں تھا۔ اس نے اور اس کے بعد کے فرمانرواؤں نے اس شہر کو عروج دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی اور جب اس کی شہرت کو چار چاند لگنے شروع ہوئے تو اس نے اپنے حقوق کی حفاظت کے اصول بھی تسلیم کرا لیے۔ وہاں آنے جانے والوں پر جو ٹول ٹیکس لگا ہوا تھا، معاف کر دیا گیا۔ دریا کی سطح پر شہر کے اس مرکز سے لے کر سمندر کے کنارے تک اہلِ شہر کو اجارہ داری مل گئی۔ اس کی عدالت اور مجلس بلدیہ کو علیحدہ حیثیت حاصل ہو گئی۔ وہ سارے صوبے کا دفاعی مرکز بھی بن گیا۔ پھر ۱۲۵۵ء میں جو میثاق مرتب ہوا، اس میں حکومت نے

اس علاقے کو مزید مراعات دے دیں اور جب ملک کا نیا آئین بنا تو اس میں اس کا خاص خیال رکھا گیا۔ حتیٰ کہ تیرھویں صدی کے آخر میں تو اسے ایک حد تک خود مختار علاقہ قرار دے دیا جرمنی کے دورِ اصلاحات میں میکسی ملین اوّل نے اسے بڑی حد تک آزاد کر دیا یعنی مرکزی حکومت سے براہِ راست اس کا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اسے صرف بادشاہ کے تابع فرمان رکھا گیا۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں اس نے تئے پرنکالے۔ حکومت نے ڈاک کے نظام میں شامل کر کے اس کے ڈانڈے سارے یورپ سے ملا دیئے۔ اور زرمبادلہ کی سہولتیں دینے کے لیے یہاں بنک کی قسم کے ادارے بھی کھول دیئے گئے۔ ان سب باتوں نے مل کر اسے اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے مزید ترقی دی۔ یہ اچھا ہوا کہ ہر حکومت نے اسے اپنی سیاست سے الگ رکھا۔ اس کی صنعتی اور تجارتی ترقی کا ایک بڑا راز یہی ہے۔

پہلی اور دوسری عالمگیر لڑائیوں میں اس علاقے کو بھی زبردست نقصانات پہنچے۔ جنگ کی تباہ کاریاں ایک طرف رہیں، مفاد پرستوں نے کارکنوں سے جو ہڑتالیں بغاوتیں اور تخریبی کارروائیاں کرائیں، ان کا جائزہ تیار کرنا مشکل ہے۔ تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ حکومت کی کوششوں سے اس کی پریشانیوں کے دور ختم ہو چکے ہیں اور وہ ایک بار پھر ترقی کی راہ پر چل رہا ہے۔

**موجودہ دور میں:** برلن سے قطع نظر ہیمبرگ اس وقت جرمنی کا سب سے بڑا شہر ہے اور اس کی دریائی بندرگاہ تو یورپ میں ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ دریا سے جو متعدد نہریں نکال کر اس شہر کو خوب صورت بنانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے پیشِ نظر بعض لوگ اسے شمالی یورپ کا وینس کہنے لگے ہیں۔ لیکن یہ محض مبالغہ آرائی ہے۔ دنیا کے تقریباً دس بارہ مقامات کو یہ طرۂ امتیاز دیا گیا ہے اور ان میں سے کسی پر بھی یہ استعارہ پورا نہیں اترتا۔ ہیمبرگ کو وینس سے دور کی بھی مشابہت نہیں ہے، حالانکہ اس کی انفرادی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن نوعیت جداگانہ ہے۔ وینس سے اس کی صرف ایک بات ملتی جلتی ہے اور وہ یہ کہ دونوں مقامات پر زیرِ زمیں پانی کی سطح زیادہ نیچی نہیں ہے، اس لیے دونوں جگہ زیادہ بلند

عمارتوں کی بنیادیں پانی کے آبلے خشک کر کے رکھی گئی ہیں اور ان کی مضبوطی کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے۔ بہت سی عمارتیں محض ستونوں پر استنادہ ہیں۔ مثلاً کونسل ہال کو آٹھ ہزار ستونوں کا سہارا حاصل ہے۔

ہیمبرگ کو ایک اور لحاظ سے بھی وینس کے مشابہ کہا جا سکتا ہے اور وہ دونوں جگہ کی شبینہ زندگی ہے جو دریائی اور نہری کناروں کے باعث اپنا رنگ جماتی ہے اور جھیل کے کنارے بھی دادِ عیش دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے بھی برلن کے بعد ہیمبرگ جرمنی کا سب سے بڑا عشرت کدہ ہے۔ اس کا ایک علاقہ "سنٹ پالی" تو دن کے وقت بھی نیون لائٹ سے جگمگاتا ہے اور رات کو تو حقیقتاً بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ وہاں غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک ہر ممکن طریقے سے عیش و عشرت کے طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم سے پہلے بھی یہاں کی زندگی اسی سیلابِ نور میں بہتی تھی۔ اسی لیے شہر سب سے بڑا مرکز توجہ تھا۔ دورانِ جنگ میں خوب بمباری ہوئی۔ ہر طرف تباہی پھیل گئی۔ شاید یہاں کی غم آلود سطحِ زمین کا کرشمہ تھا کہ بموں کے دھماکے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوتے۔ چنانچہ بہت سی عمارتیں مکمل تباہی سے بچ گئیں۔ لڑائی سے قبل ان کی تعداد کل پانچ لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ ان میں سے صرف تین لاکھ تباہ ہوئیں۔ برلن تو کلیتۂً ملبے کا انبار بن گیا تھا لیکن ایک بات حیرت انگیز کہی جا سکتی ہے۔ یہاں کے کاریگروں اور فن کاروں نے ہر مصیبت کا مقابلہ ہمت و جوانمردی سے کیا اور لڑائی ختم ہو جانے کے بعد بھی پریشانیوں کا دور دورہ رہا تو انھوں نے دل برداشتہ ہو کر اس شہر سے راہِ فرار اختیار نہیں کی۔ وہ ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے لیے یہیں جمے رہے۔ انہی کے استقلال کا کرشمہ ہے کہ اس وسیع شہر میں آبادکاری کا کام سب سے پہلے اور زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ آج اس کی صنعت و تجارت اور کاروبار کی فضا اس طرح بحال ہو گئی ہے جیسا کچھ ہوا ہی نہیں۔ کارخانوں اور تجارتی اداروں کے عارضی تعطل کو بس ایک وقفۂ طویل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس طرح برقی رو منقطع ہو جانے سے چلتی ہوئی کلیں ایک دم رک جاتی ہیں، اسی طرح یہاں کے

سارے نظام میں ایک ٹھیراؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ برقی لہر کے دوڑتے ہی جس طرح مشینیں دوبارہ چل پڑتی ہیں، اس شہر کی زندگی دوبارہ حرکت میں آ گئی ہے اور زیادہ سُرعت کے ساتھ عمل پیرا ہے۔

**اینکر کمپنی میں:** ہیمبرگ میں بوتلوں پر لیبل لگانے والے مشینوں کی فیکٹری اور سلفا گروپ کی ادویہ بنانے والی فیکٹری کو دیکھنا خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن ہم اپنے پروگرام اور پہلے سے وقت معین ہو جانے کے بموجب صرف اوّل الذکر دیکھ سکے۔ ہوٹل سے چلتے چلاتے نو بج گئے تھے اور فیکٹری تک جسے اینکر کمپنی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، پہنچنے میں خاص دیر لگ گئی۔ پھر کچھ دیر استقبالیہ میں بیٹھ کر ہمیں افسر تعارفات کا انتظار کرنا پڑا۔ وہ کسی وجہ سے وقت پر وہاں نہیں پہنچ سکے تھے۔

اینکر کمپنی میں اچھی طرح گھوم پھر کر ہم نے مختلف قسم کی مشینیں دیکھیں جو وہاں تیار ہوئی تھیں۔ ہم نے یہ محسوس کیا کہ اب ہمدرد لیبارٹریز میں بوتلوں پر مشین سے لیبل لگانے کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ایک مشین پندرہ ہزار روپے کے مساوی قیمت کی ہے۔ ایک ایسی مشین بھی دیکھی جو لیبلوں پر بڑی تیزی سے صرف گوند لگا لگا کر دیتی رہتی ہے اور بوتلوں یا شیشوں پر لیبل چپکانے کا کام ہاتھ سے کیا جاتا ہے۔ ہمارے لیے یہ بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن وہ مشین یقیناً زیادہ کارآمد ہے جس میں چپکانے کا کام بھی مشین کرتی ہے۔ جلدی کے علاوہ صفائی بھی آتی ہے۔ مجال نہیں کہ کاغذ میں ذرا بھی چرس پڑ جائے یا گوند کا کوئی جزو باہر نکل کر کسی اور چیز کو خراب کر دے۔ لیبل لگانے والی مشینوں کے علاوہ کچھ ایسی بھی مشینیں یہاں بنتی ہیں، جو ہمارے کام نہیں آ سکتیں۔ انھیں دوسری صنعتوں والے خرید سکتے ہیں۔

ہم نے اس کارخانے کی مشینوں کا لٹریچر کراچی اور دہلی بھجوانے کی ہدایت کر دی اور برادر محبوب الٰہی سے کہہ دیا کہ وہ ڈاکٹر شنل باخ کو فریکفرٹ لکھ دیں کہ وہ جو پلانٹ ہمارے لیے مرتب کر رہے ہیں اور جس میں مشین سے لیبل چپکانے کی گنجائش رکھی گئی ہے اس کو مکمل کرتے وقت اینکر کمپنی سے رابطہ قائم کریں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم کراچی کے لیے براہِ راست کسی مشین کی خریداری کا آرڈر نہیں دے سکتے تھے کیونکہ مکمل پلانٹ ڈاکٹر شنل باخ تیار کرا رہے ہیں۔ اصولی طور پر لیبل لگانے والی مشین کا انتظام بھی انہی

کو کرنا چاہیے

**فوجی ڈرائیور:** ہم انیکر کمپنی دیکھنے کے بعد جب ٹیکسی میں واپس ہوئے، اس کا ڈرائیور جرمن کم افغانی زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی مونچھیں بڑی اور گھنی تھیں اور غیر معمولی طور پر بہت توی نظر آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے کچھ باتیں ضرور کی جائیں۔ انگریزی زبان بالکل نہیں جانتا تھا۔ میاں محبوب نے مترجم کے فرائض انجام دیے۔ پتہ چلا کہ وہ کبھی نازی فوج میں شامل تھا لیکن اس بات کا اعتراف اس نے ذرا تامل سے کیا۔ سارے جرمنی میں یہ عجیب رجحان پایا جاتا ہے کہ جو لوگ نازی تحریک سے تعلق رکھتے تھے، وہ اس سے بے تعلقی ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ شاید یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ ایڈولف ہٹلر سے نفرت کرنے والے کہیں ان سے باز پرس نہ کر بیٹھیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نازیت کی شکست کو اپنی شکست سمجھ کر اس سے اپنا رشتہ جوڑنا نہیں چاہتے حالانکہ یہ کوئی شرم کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے استفسار پر یہ ڈرائیور بھی کسی قدر تذبذب میں مبتلا ہو گیا اور پھر بڑی مشکل سے اصل بات کا اعتراف کیا۔ وہ نازی فوج میں برابر آٹھ سال رہا تھا۔ لڑائی کا ذکر چھڑتے ہی اس میں اس طرح جوش و خروش پیدا ہو گیا جیسے وہ اس وقت محاذِ جنگ پر ہی جا رہا ہو۔ اس نے اپنے نازی ہونے کو ذرا دیر میں تسلیم کیا لیکن ہٹلر کا نام بڑے احترام کے ساتھ ہماری زبان پر آیا تو غیر اختیاری طور پر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور کچھ دیر کے لیے اس طرح خاموش ہو گیا جیسے بہت دور سوچ کی نگری میں پہنچ گیا ہو۔ ٹھنڈا سانس ظاہر کرتا تھا کہ ہمارے الفاظ نے اس پر اثر کیا ہے۔ ہماری زبان سے ہٹلر کی تعریف سن کر جیسے اسے ڈھارس ہو گئی اور اس نے دل کی بات بیان کرنی شروع کی۔ اس نے کہا، ہٹلر نے واقعی ملک کی ترقی کے لیے بہت اچھے کام کئے تھے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اسے کوئی جنگ، خصوصاً اس وقت کوئی جنگ شروع کرنی نہیں چاہیے تھی۔ اسے کچھ عرصے تک دشمنوں پر خوف طاری کر کے پھر کوئی قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ وہ قدم ایسا مضبوط ہوتا کہ ذرا بھی پیچھے نہ ہٹ سکتا۔ اس حالت میں جرمنوں کا یہ حال نہ ہوتا جواب ہو گیا۔ اس وقت اس ملک کے باشندے سارے یورپ

پر نہ صرف چھائے ہوئے ہوتے بلکہ دوسری قوموں کے لیے ایک خطرہ بنے رہتے۔ اور اب چار حکومتیں ہم پر قابض ہیں۔ ہمارے ملک کے حصّے بخرے ہو گئے ہیں۔ نصف سے زیادہ حصّے پر روس اپنا سکّہ چلا رہا ہے"۔

قدرتی طور پر غیر جرمنوں کا یہ غلبہ ناپسندیدہ ہے مگر جرمن خصوصیت کے ساتھ انگریزوں سے سخت متنفر ہے۔ فرانسیسیوں کو بھی وہ پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ عشرت طلب زیادہ ہیں۔ امریکنوں کے بارے میں وہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ امریکی سرمایہ بڑی مقدار میں وہاں صرف ہو رہا ہے اور فنی تعاون کے نام پر مالی اور اقتصادی امداد دی جا رہی ہے۔ غیر شعوری طور پر جرمن لوگ اس اعانت کے معترف ہیں۔ اسی سرمائے کی وجہ سے بہت سے تعمیری کام ہوئے ہیں اور پوری قوم خوش حالی کی منزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ تاہم انھیں یہ احساس ہے کہ دست تعاون بڑھانے میں خود امریکیوں کا مفاد مضمر ہے۔ شاید اس سے پہلے میں کسی جگہ لکھ چکا ہوں کہ اس وقت خود امریکا کے بعد امریکی ڈالروں کی سب سے بڑی مقدار جرمنوں کے پاس ہے۔ سرکاری خزانے ہی میں نہیں، عام افراد کے پاس بھی ڈالر اس طرح موجود رہتے ہیں جیسے وہ انہی کے ملک کا سکّہ ہوں۔ اس ڈرائیور کی جیب میں بھی پانچ پانچ ڈالر کے کئی نوٹ پڑے ہوئے تھے۔ جب ہم نے اس کو کرایہ ادا کیا تو باقی چینج دینے کے لیے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریزگاری کے ساتھ کئی ڈالر نوٹ نظر آ گئے۔ امریکی اور برطانوی فوجی یہ سکّہ اس ملک میں دھڑلّے سے چلا رہے ہیں۔ جرمن ارباب اقتدار فی الحال نہیں چاہتے کہ یہ فوجی جرمنی سے چلے جائیں۔ وہ پوری دانائی کے ساتھ انھیں روکے ہوئے ہیں۔ انھیں اچھی طرح احساس ہے کہ ملکی دفاع کے علاوہ آبادکاری اور بحالیات کے کام خاموشی کے ساتھ انجام پا رہے ہیں۔ یہ پالیسی کوئی چھپا ہوا راز نہیں ہے۔ دوسری قومیں بھی اس حقیقت کو سمجھتی ہیں لیکن امریکیوں اور انگریزوں کا وہاں رہنا روسیوں کے سوا کسی کو اکھرتا نہیں ہے۔ اشتراکی اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ شکرے کس کے لیے پالے جا رہے ہیں۔ دونوں فوجیوں کے قیام کا کوئی خرچ جرمنی کے خزانے پر نہیں پڑ رہا ہے اس لیے اعتراض کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ غیر ملکی سرمائے کی بدولت جرمنی کی صنعتیں

تیزی سے بحال ہو رہی ہیں اور اس ملک کا خام مال اور مصنوعات دوسرے ملکوں کو جانے لگی ہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ جرمنی دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شامل ہو کر ترقی پذیر ملکوں کو مالی امداد دینے لگے گا۔

ہاں تو بات اس ڈرائیور کی ہو رہی تھی۔ گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ وہ پوری دنیا سے باخبر تھا۔ دوسرے ممالک اور ان کے لیڈروں کے بارے میں اپنی رائے رکھتا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اس نے مہاتما گاندھی کو گاندھی جی اور بانیٔ پاکستان کو قائد اعظم ہی کہا اور جب میں نے اس کی پُر زور باتوں پر "ہیل ہٹلر" کہا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اور جب آخر میں میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ہٹلر واقعی مر گیا ہے اب اس دنیا میں نہیں ہے تو اس نے دل گیر ہو کر کہا "ہاں، وہ بڑا آدمی واقعی مر چکا ہے" گویا ہٹلر کی عظمت کا اسے اعتراف تھا۔

**خبر رساں ایجنسی:** موٹر گاڑی ایک بڑے بازار سے گزر رہی تھی کہ اچانک ایک شاندار عمارت پر جرمنی کی سب سے مشہور خبر رساں ایجنسی کا نام نظر آیا۔ بہت ہی عجیب وقت تھا۔ ورنہ ہم اس ایجنسی کے دفتر میں ضرور جاتے اور اس کا نظامِ عمل دیکھتے کہ یہ الفاظ کا اتنا بڑا کارخانہ کیسے چلا رہی ہے۔

ڈوئش پریسے ایجنٹور کا، جو مختصر طور پر "ڈی پی اے" کہلاتی ہے، ہیمبرگ میں صدر دفتر قائم ہے اور شاخیں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ خبر رساں ایجنسی نہ صرف جرمنی بلکہ سارے یورپ میں سب سے زیادہ دور اثر سمجھی جاتی ہے! اس کے تقریباً تین ہزار ایک سو نامہ نگار جرمنی میں اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں جو خبریں جمع کرتے، بھیجتے اور ان کی تشہیر میں تعاون کرتے ہیں۔ اس ایجنسی کے انیس ضمنی دفاتر جرمنی کے مختلف شہروں میں اور باون شاخیں دوسرے ملکوں میں قائم ہیں۔ یہ اپنے ملک کے حالات کے بارے میں روزانہ تقریباً اسی ہزار الفاظ پر مشتمل خبریں اور غیر ملکی حالات کے بارے میں تقریباً چالیس ہزار الفاظ پر مشتمل خبریں جو جرمن، انگریزی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں میں مرتب کی جاتی ہیں، دنیا بھر میں بھیجتی ہے۔ ان خبروں کے ساتھ تصاویر اور فیچر مضامین بھی حسبِ ضرورت روانہ کیے جاتے ہیں۔ اس ایجنسی نے دنیا بھر کی باون دوسری خبر رساں ایجنسیوں کے

ساتھ خبروں کے تبادلے کے لیے باقاعدہ سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ ان میں رائٹر اور طاس جیسی مشہور ایجنسیاں بھی شامل ہیں۔ دنیا کے ایک ہزار دو سو اخبارات اس کو چندہ ادا کرکے اس کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نیز جرمنی اور دوسرے ملکوں کے بہت سے اخبارات چندہ دیے بغیر بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس ملک کی ایک اور خبر رساں ایجنسی نورڈ پریس ہے (نورڈ بمعنی شمال) اس کا صدر دفتر بھی ہیمبرگ ہی میں قائم ہے۔ وہ خبروں کے روزانہ بلیٹین فوٹو اور کارٹون تیار کرکے بھیجتی رہتی ہے۔ جرمنی میں اس ایجنسی کا ایک ضمنی دفتر بون میں اور ملک سے باہر ایک ضمنی دفتر ٹوکیو میں قائم ہے۔ اس کے ترپن نامہ نگار اندرونِ ملک میں اور سولہ دوسرے ملکوں میں اپنے صحافتی فرائض انجام دیتے ہیں۔ اس ایجنسی سے تعلق رکھنے اور چندہ دینے والوں کی تعداد پانچ سو ترپن ہے۔

جرمنی میں چند اور خبر رساں ایجنسیاں بھی ہیں جن کے صدر دفتر ہیمبرگ میں نہیں ہیں، صرف ضمنی دفاتر قائم ہیں۔ مثلاً ایک ایجنسی کا جسے مختصر حروف میں وی ڈبلیو ڈی کہا جاتا ہے، صدر دفتر فرینکفرٹ میں ہے۔ یہ ایک لمیٹڈ کمپنی ہے اور مذکورہ بالا خبر رساں ایجنسی، ڈی پی اے، نیز چند اور ملکی اور غیر ملکی ایجنسیاں اس کی حصہ دار ہیں۔ وہ مشہور ایوان ہائے تجارت واقتصادیات کے وفاقوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کا معمول ہے کہ ہر ہفتے ہیمبرگ والی ایجنسی ڈی پی اے کے تعاون سے ترقیاتی امداد پر بلیٹین شائع کرتی ہے۔ غیر ملکی تجارت کے حالات اور نشیب وفراز پر بھی ایک ہفتہ وار رسالہ پرائیویٹ خریداروں کو بھیجتی ہے۔ یو پی آئی، اے پی اور اے ایف پی کے دفاتر بھی ہیمبرگ میں قائم ہیں۔

**یونیورسٹی لائبریری میں:** دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے اور فریضہ نماز ادا کرنے کے بعد ہم نے مناسب سمجھا کہ ہیمبرگ یونیورسٹی کی لائبریری دیکھ لیں یہ تو ظاہر تھا کہ اس وقت یونیورسٹی بند ہوگی۔ وہ پڑھائی کا وقت نہیں تھا لیکن ہمیں طالب علموں یا استادوں سے ملنے کا شوق نہیں تھا، ہم یونیورسٹی کی لائبریری میں خاص طور سے علوم مشرقی کی کتابوں پر ایک نظر ڈالنے کے خواہاں تھے۔ اس لائبریری کا

یہ شعبہ بہت مشہور ہے اور اہم سمجھا جاتا ہے۔

ہیمبرگ یونیورسٹی روتھن بوم چوسے نامی سٹرک پر واقع ہے! اسے دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ اس یونیورسٹی کی لائبریری بہت زیادہ وسیع تو نہیں البتہ بعض نایاب کتابوں کا خزینہ ہے۔ وہاں کچھ ایسے مسودے بھی موجود ہیں جن کے شائع ہونے کی نوبت اب تک نہیں آئی۔ ان پر مزید تحقیقاتی کام ہو سکتا ہے۔ بعض تحریریں ایسے عالموں کی ہیں جن کو شہرتِ دوام حاصل ہے لیکن خدا نے یہ توفیق کسی کو نہیں دی کہ وہ ان مسودات کو مناسب حاشیوں کے ساتھ چھپوا دے۔ اس لائبریری کا خاص طور پر وہ حصہ جو علومِ مشرق سے تعلق رکھتا ہے، ہماری دلچسپی کا سب سے بڑا مرکز رہا۔

فہرست کتب و مخطوطات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ جرمن زبان میں قرآنِ پاک کا پہلا براہِ راست ترجمہ عربی زبان سے ڈیوڈ فریڈرک میگرلن نے ۱۷۷۲ء میں کیا تھا۔ اسی ترجمے نے مشہور المانوی شاعر گوئٹے کو بے حد متاثر کیا اور اس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "ڈیوائن کومیڈی" اور بعض مختصر نظموں میں اسی کے تاثر کے تحت رنگ آمیزی کی۔ گوئٹے نے دیوانِ حافظ کا ترجمہ بھی پڑھا تھا اور اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا تھا۔

اس زمانے میں مشرقی علوم اور مشرقی روایات کا مطالعہ زیادہ تر نصرانی مبلغین کرتے تھے تاکہ انھیں آس پاس کے ملکوں خصوصاً عرب ملکوں میں عیسائیت پھیلانے میں مدد ملے۔ اپنے انداز میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر بھی اسی جذبے کے تحت مرتب کی گئی تھی۔ قرآنِ پاک کا ایک اور ترجمہ ۱۸۶۱ء میں تھیوڈور نولڈیکے نے کیا جس نے "تاریخ قرآن" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔ اس میں سخت تنقید کا رنگ زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ تھیوڈور نے، جو چورانوے سال کی عمر میں (۱۸۳۶ء تا ۱۹۳۰ء) فوت ہوا تھا، اپنا بیشتر وقت یہ ثابت کرنے کی کوشش میں صرف کیا کہ اس کلام کو کوئی الہامی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ معاوضہ لے کر عیسائیت کا پرچار کرنے والے سے اس کے سوا اور توقع بھی کیا کی جا سکتی تھی۔

کھبوڈورکا ایک ہم عصر جولیس ویلہوسن تھا۔ اس کی تصانیف میں "عربوں کی سلطنت اور اس کا زوال" خاص اہمیت کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں جلے پھپولے پھوڑے گئے ہیں۔ یہ کتاب پچھلی صدی کے آخر تک بہت مقبول رہی لیکن خود دوسرے جرمن مستشرقین نے اس پر ایسی کڑی تنقید کی کہ وہ قارئین کی نظر سے ہمیشہ کے لیے گر گئی۔ اب اس کے چند نسخے بعض لائبریریوں میں ملتے ہیں۔ کوئی ناشر اسے چھاپنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

**مشرقی علوم سے دلچسپی:** جرمنی میں مشرقی علوم سے دلچسپی کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ تقریباً دو سو سال سے وہاں کے باشندے مشرقی خصوصاً عرب ملکوں کے نوادر ــــــ زبان و ادب، دین و ثقافت ــــــ پر توجہ مبذول کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ اس سے بھی بہت پہلے یعنی سولھویں صدی عیسوی میں عربی مخطوطات ہائیڈل برگ کی لائبریری میں پہلی بار داخل کیے گئے تھے اور یہ کام ایک فرانسیسی نژاد جرمن مستشرق پوسٹیل نے انجام دیا تھا۔ اس نے مشرق قریب کا دورہ کرنے کے بعد جو نوادر جمع کیئے وہ اس لائبریری کو عطا کر دیئے۔ اس کے بعد پیلیٹی ناٹے کے فرمانروا فریڈرک سوم نے دو عالموں ــــ ٹری مےلیس اور جونی اس کو حکم دیا کہ عربی زبان سیکھو اور اپنی زبان میں ان مخطوطات کے ترجمے کرو۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل میں کافی وقت لگا۔ اسی دوران میں موخرالذکر عالم کے ایک شاگرد جیکب کرسٹ مان نے عربی رسم الخط کو باقاعدہ سیکھا اور خود اپنی تحریر کے بموجب لکڑی کے حروف کندہ کیے تاکہ چھپائی کا تجربہ کیا جا سکے۔ کچھ عرصے بعد یہی شخص ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔

سترھویں صدی کے شروع میں بریسلاؤ کے ایک جرمن ڈاکٹر پیٹر کرسٹن کو یہ مشورہ دیا گیا کہ ایک طبیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ لاطینی کی بجائے یونانی اور عربی زبان سیکھے کیونکہ ان دو زبانوں میں طب و جراحی کے بیش بہا خزانے موجود ہیں چنانچہ اس نے ترجیحی طور پر عربی زبان سیکھی۔ اس کا دلی مقصد یہ تھا کہ قانون شیخ بو علی سینا کو اصل زبان میں پڑھ لے۔ اس کی کوششیں کامیاب رہیں۔ اس نے اچھی طرح خود سمجھ لینے کے بعد قانون کا پہلا ترجمہ عربی سے جرمن زبان میں کیا جو آج تک

مستند مانا جاتا ہے۔

اٹھارھویں صدی میں جرمنی کا ایک اور عربی عالم یوہان جیکب ریسکے تھا۔ اس نے دینی روایات سے قطع نظر کر کے صرف تاریخ عرب کا مطالعہ کیا، کچھ ترجمے کیے اور کچھ طبعزاد چیزیں بھی لکھیں لیکن دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لینے والا مقصد واحد تھا اور وہ یہ کہ عرب ثقافت کو مسخ کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں فان ہامر پرگستال نے جو آسٹریا کے ایک چھوٹے سے گاؤں گراز میں ۱۷۷۴ء میں پیدا ہوا تھا، قسطنطنیہ کا سفر کیا اور کافی عرصے وہاں رہ کر نہ صرف ترکی بلکہ عربی اور فارسی زبانیں بھی سیکھیں۔ اس نے سیاحت مصر کے دوران میں الف لیلہ و لیلہ اور مشرق کی دوسری روایتی کہانیوں کا مطالعہ کیا اور جرمن زبان میں ترجمہ کر ڈالا۔ اس نے وطن واپس آکر اپنی کتابیں چھپوائیں اور "خزینۂ مشرق" کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کر دیا جو کچھ عرصے باقاعدگی سے چھپتا رہا۔ اس کے بعض شمارے آج بھی لائبریریوں کی زینت ہیں۔ جرمن زبان میں اسلامی موضوعات کا یہ پہلا جریدہ تسلیم کیا جاتا ہے! اس میں سارے یورپ کے مستشرقین مضامین لکھنے لگے تھے۔ اسی عالم نے دیوانِ حافظ کا پہلا ترجمہ جرمن زبان میں کیا جو گوئٹے کے لیے قرآنِ پاک کے علاوہ ایک نعمت ثابت ہوا۔ پرگستال نے جرمن زبان سے گوئٹے اور دوسرے شاعروں کے کلام کے ترجمے عربی اور فارسی میں کیے اور یہ دوطرفہ سلسلہ بہت عرصے تک جاری رہا۔

جرمن زبان میں مارکو پولو کے سفرنامے کا ترجمہ ہونے کے بعد سے جرمنی کے مستشرقین نے چینی ثقافت میں بھی دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ سولھویں اور سترھویں صدی میں یعنی منگ اور مانچو خاندانوں کے دورِ حکومت میں بہت سے عیسائی مشنری چین پہنچے اور وہاں عیسائیت کا پرچار کرنے کے علاوہ انھوں نے چینی ثقافت اور علم و ادب کا مطالعہ بھی کیا۔ واپسی پر ان کے خیالات نے جرمن نگارشات پر اثر ڈالا۔ ان مبلغین میں ایک شخص یوہان آدم سخال تھا، جس نے ماہر فلکیات ہونے کے باعث مانچو خاندان کے پہلے فرمانروا کا قرب حاصل کر لیا۔ وہ شہنشاہ کانگشی کے عہد تک وہیں رہا۔ وہ ستاروں کی رفتار

پر نظر رکھ کر زائچے کھینچنے کے علاوہ چینی افکار کا مطالعہ کرتا اور انھیں جرمن زبان میں ڈھالتا رہا۔

ایک اور جرمن مستشرق وولف نے کنفیوشی اخلاقیات کا مطالعہ کیا اور جب اس مفکرِ چین کے خیالات کو جرمن زبان میں منتقل کیا تو پادریوں نے اس پر کفر کا الزام لگایا اور ملک بدر کرا دیا۔ فریڈرک اعظم کے حکم سے اس کا قصور معاف ہوا اور اس کو وطن واپس بلا لیا گیا۔ جرمنی کے عجائب گھروں میں چینی فنون کے جو نوادر ملتے ہیں، وہ اسی عہد میں لے جائے گئے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم سے قبل مشرقی علوم کے وہ تمام نوادر جو جرمن زبان میں منتقل ہو گئے تھے یا اصل زبان میں وہاں لے جائے گئے تھے صرف برلن کی سرکاری لائبریری میں محفوظ تھے۔ لڑائی شروع ہونے پر جب ان کا وجود خطرے میں محسوس کیا گیا تو کچھ حصہ ماربرگ میں اور کچھ ہیمبرگ میں بھیج دیا گیا۔ ماربرگ کئی یونیورسٹیوں کا شہر تھا۔ وہ صنعت و تجارت یا سیاست کے اعتبار سے کوئی خاص مرکز نہیں تھا، اسی لیے اس پر بمباری نہیں ہوئی۔ ہیمبرگ کو بہت نقصان پہنچا لیکن غنیمت ہے کہ یہاں کی لائبریریاں اپنی عمارتوں کے منہدم ہو جانے کے باوجود آگ کے شعلوں سے محفوظ ہیں۔ اس طرح کتابوں کا حلیہ تو ضرور بگڑا لیکن وہ بالکل ضائع ہونے سے بچی رہیں۔ اسی لیے آج ان کا مطالعہ ممکن ہے۔

**فہرستِ کتب کی ضرورت:** یونیورسٹی لائبریری سے واپس جاتے وقت ہم نے زائرین کی رائے قلمبند کرنے والی کتاب میں یہ مشورہ درج کیا کہ اس کتب خانے میں جس طرح جرمن زبان کی کتابوں کی مکمل فہرست تیار کی گئی ہے، اسی طرح مشرقی زبانوں میں چھپی یا لکھی ہوئی کتابوں کی الگ الگ فہرستیں تیار کی جائیں تو تحقیقات کرنے والوں کے لیے سہولت ہو جائے۔ مثال کے طور پر صرف الماریوں کو دیکھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں عربی، فارسی اور چینی زبان کی کتابوں کے علاوہ تبتی اور منگولی زبانوں تک کے مخطوطات جمع ہیں۔ لہٰذا ان کی فہرستیں چھپوا کر تمام مشرقی ملکوں کو بھیجی جائیں تاکہ شائقینِ علم ان کو دیکھ کر اندازہ لگا سکیں کہ ان کے مطالعے کے لیے وہاں کس قدر مواد موجود ہے اور اس سے استفادہ کر کے دنیائے ادب پر کس قدر احسان کیا جا سکتا ہے۔

**ٹورسٹ کوچ میں:** جناب برکات احمد صاحب کی یہ تجویز معقول تھی کہ ہم ٹورسٹ کوچ کے چار ٹکٹ لے کر اس میں بیٹھیں اور صرف دو گھنٹے میں سارے شہر کی سیر کر لیں۔ یہ گاڑی عموماً ہم جیسے سیاح ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح مختصر ترین مدت میں شہر کے اہم حصوں پر سرسری نظر ڈال لی جاتی ہے لہٰذا تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

آج نامعلوم جرمن جھنڈے سرنگوں (ہاف ماسٹ) کیوں ہیں۔ عظیم سٹی ہال کا جھنڈا بھی نصف ڈنڈے تک کھسکا دیا گیا ہے۔ کوئی نہیں بتا سکا کہ آخر کیا حادثہ پیش آیا ہے، تاہم دوسری قوموں کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہیں۔ ہم نے پرانے اور نئے بازاروں کی سیر کی۔ ہیمبرگ کے بارے میں اب تک ذہن میں یہی تصور تھا کہ یہ ایک صنعتی شہر ہے۔ اب پتہ چلا کہ یہ ایک حسین شہر بھی ہے۔ جھیلیں، جھیلوں کے کنارے سبزہ زار اور پھولوں کے تختے، ایک عجیب سماں تھا۔ میں اس کا مقابلہ ہر طرح جنیوا سے کر سکتا ہوں۔ یقینی طور پر یہ شہر اپنے قدرتی حسن میں جنیوا سے کسی طرح کم نہیں ہے اور سوچنے کی بات ہے کہ ہم مفلسی اور تباہی کے عالم میں اس شہر کو دیکھ رہے ہیں۔ آزاد جرمنی میں اس کا حسن نجانے کس نکھار پر ہوگا۔ ہم چند ایسی بستیوں سے بھی گزرے جن میں صرف انگریز رہتے ہیں۔ ان کی بابت مشہور ہے کہ ہر برطانوی خاندان کرایہ ادا کیے بغیر مکانات میں رہتا ہے۔ اس چیز کا اظہار اس گائڈ نے جو کوچ میں ہمارے ساتھ تھا، متعدد مقامات پر کیا۔ میرے خیال میں کرایہ ادا نہ کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور کسی بھی باشندۂ برطانیہ کے لیے شایانِ شان نہیں ہے۔ امریکی بعض لحاظ سے بُرے ہیں لیکن وہ ایسی گھٹیا بات نہیں کرتے۔ اگر جرمنی لڑائی میں شکست کھا گیا ہے اور انگریزوں کو کسی وجہ سے فتح ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شہری افراد کے حقوق پر اس طرح ڈاکہ ڈالیں اور انہیں ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیں۔ عظیم لوگوں نے شکست خوردہ عظمتوں کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کیا، جو انگریز دوسرے ملکوں میں کرتے آئے ہیں۔ خود ہمیں اس کا تلخ تجربہ ہے۔ ان کو جو کبھی برسرِ اقتدار رہے ہوں، عدالت کے کٹہرے میں کھینچ لانا، سزائیں دینا، موت کے گھاٹ اتار دینا، یقیناً انصاف کے خلاف ہے اور شرافت کے منافی ہے۔ یہ ایسی گری ہوئی بات ہے جس پر کوئی قوم فخر نہیں کر سکتی۔ لیکن انگریزوں نے جرمنی سے کہیں زیادہ

ہندوستان میں اپنے کردار کا مظاہرہ کیا تھا۔

کسی شہر کی سیر سے ہمارا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم بچشم خود دیکھیں کہ عام لوگ کس حال میں ہیں اور ان کی زندگی کیونکر بسر ہو رہی ہے۔ انھیں کیسی کیسی مراعات حاصل ہیں۔

سائٹ سی اِنگ کے بعد ہم نے بازاروں کا رخ کیا اور پیدل چلنا مناسب سمجھا۔ ہر بازار آدمیوں سے پٹا پڑا تھا۔ کوئی خاص دن نہیں تھا مگر بڑی چہل پہل تھی۔ خرید و فروخت ہر دوکان پر اس طرح ہو رہی تھی جیسے ہمارے ہاں عید بقرعید کے موقعوں پر ہوا کرتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ یہاں کا معمول ہے۔ قوم کے پاس روپیہ زیادہ ہے تو توفیرِ زر نے ہر ایک کے حوصلے بڑھا دئے ہیں۔ ہر شخص جو کماتا ہے، خرچ کر دیتا ہے۔ تجوریوں میں سونا چاندی نہیں بھرتا۔ شاید مستقبل کی فکر نہیں رہی ہے۔ ہر شخص جفاکش ہے۔ خوب کام کرتا اور خوب کماتا ہے۔

ہم ایک دوکان میں گھس گئے جس کی پانچ منزلیں تھیں۔ اندر روشنی اس قدر تیز تھی کہ شام کے وقت دوپہر کا گمان ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دھوپ کھلی ہوئی ہے۔ رات دن کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ ہر منزل کے الگ الگ شعبے ہیں۔ عورتوں کے ہیٹ فروخت کرنے کا ایک حصہ تھا۔ ہم وہاں بھی گھس گئے۔ عورتیں وضع وضع کی ٹوپیاں پہن کر گردنیں مٹکا رہی اور شیشے میں اپنی جھلک دیکھ رہی تھیں کہ کون سا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ہم خاموش کھڑے یہ سیر دیکھتے رہے۔ لباس والے حصے میں یہ شبہ ہوا کہ موڈل لباس کا مظاہرہ کرتے ہوئے کلوں کے ذریعے گھوم رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی گاہک عورتیں ہیں۔ جگہ جگہ لفٹ لگے ہوئے تھے۔ خودبخود چلنے والی سیڑھیاں بھی کام کر رہی تھیں۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ کئی سو خریدار بیک وقت اس دوکان میں موجود تھے۔ کاؤنٹر پر بیشتر عورتیں کام کر رہی تھیں۔ فروخت شدہ ہر سامان کی رسید ملتی تھی اور دیر لگنے کی شکایت کسی کو نہیں تھی۔

برکات صاحب اور بھائی جان محترم دوکان سے باہر نکل کر زیر زمین پیشاب خانے میں چلے گئے اور میاں محبوب کچھ خریدنے کے لیے دوکان ہی میں رہ گئے۔ میں باہر کی پٹری پر تنہا کھڑا رہ گیا۔ اچانک ایک تین سال کی بچی اپنی تین پہیہ سائیکل

کے ساتھ نزدیک آئی۔ کس قدر ننھی گول مول اور حسین بچّی تھی۔ جی میں آئی کہ اسے گود میں اٹھالوں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر جرمن زبان میں نہ جانے کیا کہا۔ بھلا مَیں اس کا مطلب کیوں کر سمجھتا۔ میں نے اسے پیار کیا۔ میری اس غیر معمولی دل چسپی کو پٹری پر چلنے والوں نے بڑے غور سے دیکھا۔ اتنے میں میاں محبوب آگئے۔ انھوں نے اس بچّی کی بات سمجھی اور مجھے بتایا کہ وہ سڑک عبور کرنا چاہتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایسی ننھی بچّی تن تنہا باہر نکل آئی ہے اور اطمینان سے گھوم رہی ہے۔ تاہم وہ سڑک پار کرنے میں محتاط ہے۔ آزادی پانے کے ساتھ ساتھ یہ تربیت بھی اسے ملی ہے۔ میاں محبوب نے اس بچّی کی مشکل آسان کردی۔

ہم آج ایک کیمرہ بھی خریدنا چاہتے تھے لیکن قیمت سُن کر خاموش ہو جانا پڑا۔ امریکن ایکسپریس والوں نے سفر کا پروگرام مرتب کرنے کے بعد خرچ کا جو تخمینہ لگایا تھا وہ اس قدر غلط تھا کہ اگر ہم احتیاطاً کچھ زائد رقم نہ لاتے تو سخت دشواریوں کا سامنا ہوتا اور شاید ہمارا سفر بھی ادھورا رہ جاتا۔ ہم مجبوراً اُسے پورا کیے بغیر ہی لوٹ جاتے۔

کوئی پونے آٹھ بجے ہم واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ ہم نے سوچا کہ رات کو سونے سے قبل ہی اپنا سامان باندھ لیں کیونکہ کل صبح سویرے ہی جرمنی سے رخصت ہو جانا ہے۔ اس ملک میں پندرہ دن اس طرح گزرے کہ محسوس بھی نہیں ہوا۔

# اِشاریہ

## (انڈکس)

(پ)

(د)



(ڈ)



(ذ)

(ہ)

(ختم شد)

## حکیم محمد سعید دہلوی

# نے یورپ میں کیا دیکھا!

ترکی : مشرق و مغرب کا امتزاج ، یورپ کی بساط سیاست پر ایشیاء کا زبردست مہرہ۔ رومی مصطفےٰ کمال اور نصرالدین خواجہ کا وطن۔

یوگوسلاویہ : اپنی قوم کے نجات دہندہ مارشل ٹیٹو کی عملداری ، جہاں اس وقت بیداری جنم لے رہی ہے۔

آسٹریا : اوپیرا اور شعر و نغمہ کی دنیا جہاں فاتح موسیقی موزارٹ ، الہامی راگوں کے خالق بیتھوون اور ماہر جراثیم حکیم سلویز پیدا ہوئے۔

سوئٹزر لینڈ : یورپ کا کشمیر ، سیاحوں کی جنت ، جہاں لوگ آج بھی قدرت سے ہم آہنگ ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

ان چار ملکوں کی سیاحت پر مشتمل

# یورپ نامہ

اردو زبان میں پہلا معلومات افزا متنوع اور دل کش سفر نامہ جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے وہ پہلو اُجاگر کئے گئے ہیں جنھیں لکھنے سے اب تک مؤرخ کا قلم قاصر رہا ہے۔ انداز نگارش شگفتہ و پر مزاح۔

سائز بڑا۔ صفحات ۴۹۶ ، چار رنگی تصاویر ۱۶ ، دو رنگی تصاویر ۲۴ ، چار رنگا تاریخی گرد پوش ، خوبصورت بکس میں بند۔

قیمت : آٹھ روپے

ملنے کا پتہ

## مکتبۂ جدید ، لاہور

پوسٹ بکس نمبر 456

# سرچشمۂ حیات

## کلید اعظم

### روحانی قوت اور دل کی مرادیں حاصل کرنے کے انمول راز

"روحانی قوت پر ہم سب کا ایمان ہے ۔ دعا کے پر اثر اور نتیجہ خیز ہونے پر ہم سب کو یقین ہے ۔ حق تعالیٰ سے ایک زندہ اور منفعت بخش تعلق قائم کرنے کی آرزو ہم سب کے دلوں میں ہے لیکن یہ راستہ جس قدر دلنواز ہے ، اُسی قدر نشیب و فراز سے پر اور دشوار گذار گھاٹیوں سے اٹا پڑا ہے ۔ اور اکثر اوقات پہلے ہی قدم پر راہرو یا راستے سے بھٹک جاتا ہے یا بھول بھلیوں کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے ۔

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری مناسب رہنمائی نہیں ہوتی ۔ کوئی انسان ایسا نہیں ملتا جو اس راستے پر ہماری دستگیری کرے اور نہ ایسی کتابیں دستیاب ہیں (بالخصوص اُردو میں) جن میں کسی صاحب نظر اور صاحب ایمان نے اس وادیٔ دلکش کی خود سیر کر کے ہمیں سیدھے سیدھے اور صاف صاف طریقے پر نشان منزل کا پتہ دیا ہو ۔

ایسے میں جناب فیروز نظامی کی تصنیف "سرچشمۂ حیات" دیکھ کر حیرت انگیز مسرت ہوتی ہے ۔ نظامی صاحب جدید انداز کے تعلیم یافتہ اور ہمارے ملک میں موسیقی کے مانے ہوئے استاد اور ماہر فن ہیں مگر اس کو حسن اتفاق کہئے یا ہماری خوش بختی کہ وہ روحانیت کے بھی ویسے ہی رمز شناس نکلے ۔ انہوں نے کائنات کی حقیقت ، روح کی عظمت اور حق تعالیٰ سے مدد اور رہنمائی حاصل کرنے کے فہم و آداب پر ایسے سادہ ، واقعاتی اور دلنشیں اسلوب میں اظہار حقائق کیا ہے کہ اردو زبان میں اس سے پہلے ایسی کامیاب اور دل پر اثر کرنے والی کتاب میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی ۔

مجھے یقین کامل ہے کہ یہ کتاب ہمارے ملک کے بے شمار انسانوں کے لیے قوت ایمانی اور خوشحالی و کامیابی کی راہیں کشادہ کر دے گی ۔"

پروفیسر محمد عثمان

گورنمنٹ کالج ، لاہور

قیمت ۲۰۵۰

ملنے کا پتہ : مکتبۂ جدید ، لاہور

GHALIB ACADEMY ... DELHI